الرسالہ

شمارہ ۲۶ جنوری ۱۹۷۹

جمعیۃ بلڈنگ ● قاسم جان اسٹریٹ ● دہلی ۶

عن سعد قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیر الرزق ما یکفی وافضل الذکر الخفی

(احمد، ابن حبان، بیہقی)

حضرت سعدؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بہترین رزق وہ ہے جو بقدر ضرورت ہو اور افضل ذکر وہ ہے جو خفی ہو۔

یہاں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔ براہ کرم اپنا زر تعاون بذریعہ منی آرڈر بھیج کر شکریہ کا موقع دیں ——— منیجر الرسالہ

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امریکہ سے ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام ہے "ایک سو"۔ اس کتاب میں ساری انسانی تاریخ کے ایک سو ایسے آدمیوں کا تذکرہ ہے جنھوں نے، مصنف کے نزدیک، تاریخ پر سب سے زیادہ اثرات ڈالے۔ کتاب کا مصنف نسلی طور پر عیسائی اور تعلیمی طور پر سائنس داں ہے۔ مگر اپنی فہرست میں اس نے نمبر ایک پر نہ حضرت مسیح کا نام رکھا ہے اور نہ نیوٹن کا۔ اس کے نزدیک وہ شخصیت جس کو اپنے غیر معمولی کارناموں کی وجہ سے نمبر ایک پر رکھا جائے وہ پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مصنف کا کہنا ہے کہ آپ نے انسانی تاریخ پر جو اثرات ڈالے وہ کسی بھی دوسری شخصیت، خواہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی، نے نہیں ڈالے۔ مصنف نے آپ کے کمالات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

HE WAS THE ONLY MAN IN HISTORY WHO WAS SUPREMELY SUCCESSFUL ON BOTH THE RELIGIOUS AND SECULAR LEVELS

Dr. Michael H. Hart, The 100, New York 1978

آپ تاریخ کے تنہا شخص ہیں جو انتہائی حد تک کامیاب رہے۔ مذہبی سطح پر بھی اور دنیوی سطح پر بھی۔ ٹامس کارلائل (انگریز) نے پیغمبر اسلام کو نبیوں کا ہیرو قرار دیا تھا۔ مائیکل ہارٹ (امریکی) نے آپ کو ساری انسانی تاریخ کا سب سے بڑا انسان قرار دیا ہے۔ پیغمبر اسلام کی عظمت اتنی واضح ہے کہ وہ صرف آپ کے پیروؤں کے ایک "عقیدہ" کی حیثیت نہیں رکھتی۔ وہ ایک مسلمہ تاریخی واقعہ ہے اور ہر آدمی جو تاریخ کو جانتا ہے وہ مجبور ہے کہ اس کو بطور واقعہ تسلیم کرے۔

کوئی شخص اوپر نظر ڈالے تو اس کو ہر طرف آسمان چھایا ہوا نظر آئے گا۔ اسی طرح انسانی زندگی میں جس طرف بھی دیکھا جائے، پیغمبر اسلام کے اثرات نمایاں طور پر اپنا کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ ساری بہترین قدریں اور تمام اعلیٰ کامیابیاں جن کو آج اہمیت دی جاتی ہے وہ سب آپ کے لائے ہوئے انقلاب کے براہ راست یا بالواسطہ نتائج ہیں۔ مذہبی اداروں میں شخصیت پرستی کے بجائے خدا پرستی کس نے قائم کی۔ اعتقادیات کو توہمات کے بجائے حق کی بنیاد کس نے عطا کی۔ سائنس میں فطرت کی پرستش کے بجائے فطرت کو مسخر کرنے کا سبق کس نے دیا۔ سیاسیات میں نسلی شہنشاہیت کے بجائے عوامی حکومت کا راستہ کس نے دکھایا۔ علم کی دنیا میں خیال آرائی کے بجائے حقیقت نگاری کی طرح کس نے ڈالی۔ سماج کی تنظیم کے لئے ظلم کے بجائے عدل کی بنیاد کس نے فراہم کی۔ جواب یہ ہے کہ یہ تمام چیزیں انسان کو پیغمبر اسلام سے ملیں۔ آپ کے سوا کوئی نہیں ہے جس کی طرف حقیقی طور پر ان کارناموں کو منسوب کیا جاسکے۔ دوسرے تمام افراد آپ کے انقلابی دھارے کو استعمال کرنے والے ہیں نہ کہ اس کو وجود میں لانے والے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو تاریخ کا سب سے بڑا انسان بنا کر انسانی نسل پر اپنا سب سے بڑا احسان فرمایا ہے۔ اس طرح معلوم تاریخ میں ایک ایسا بلند ترین مینار کھڑا کر دیا گیا ہے کہ آدمی جس طرف بھی نظر ڈالے وہ آپ کو دیکھ لے۔ جب وہ اپنے رہنما کی تلاش میں نکلے تو اس کی نظر سب سے پہلے آپ پر پڑے۔ جب وہ حق کا راستہ جاننا چاہے تو آپ کا بلند و بالا وجود اس کو سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کرے۔ آپ ساری انسانیت کے لئے ہادی اعظم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی لئے آپ کو اتنے بلند تاریخی مقام پر کھڑا کیا گیا ہے کہ کوئی آنکھ والا جب آنکھ اٹھائے تو آپ کو دیکھے بغیر نہ رہ سکے۔

نعمتوں کا حق ادا کرو

والضحیٰ۔ واللیل اذا سجیٰ۔ ما ودعک ربک وما قلیٰ۔ وللآخرۃ خیر لک من الاولیٰ۔ ولسوف یعطیک ربک فترضیٰ۔ الم یجدک یتیماً فآویٰ۔ ووجدک ضالاً فھدیٰ۔ ووجدک عائلاً فاغنیٰ۔ فاما الیتیم فلا تقھر۔ واما السائل فلا تنھر۔ واما بنعمۃ ربک فحدث

الضحیٰ

قسم ہے دھوپ کی اور رات کی جب چھا جائے۔ تیرے رب نے تجھ کو نہیں چھوڑا اور نہ بیزار ہوا ہے۔ اور بیشک آخرت بہتر ہے تیرے لئے دنیا سے۔ اور تیرا رب تجھ کو دیگا پھر تو راضی ہوگا۔ کیا اس نے تم کو یتیم پا کر جگہ نہ دی۔ اور تجھ کو سرگرداں پایا تو راہ دکھائی۔ اور تجھ کو نادار پایا تو مال دار کر دیا۔ پس جو یتیم ہو اس کو نہ دبا۔ اور مانگنے والے کو نہ جھڑک۔ اور اپنے رب کی نعمت کو بیان کر

ایک شخص جب دعوت حق کا کام لے کر اٹھتا ہے تو لوگوں کی طرف سے اس کو کبھی اچھا جواب ملتا ہے، کبھی برا۔ کبھی روشن حالات سامنے آتے ہیں کبھی تاریک۔ فرمایا کہ اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ یہی دنیا کا نظام ہے۔ یہاں روشنی اور تاریکی دونوں ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ حق کے مسافر کو بھی کبھی امیدوں سے سابقہ پیش آئے گا، کبھی اندیشوں سے۔ یہ سفر کبھی ہموار فضا میں طے نہیں ہوتا۔ اگرچہ اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ دنیا میں بھی اپنے دین کے خادموں کی مدد کرے گا، تاہم داعی کو اپنی ساری توجہ آخرت کی منزل پر لگائے رکھنا چاہئے جو ہر قسم کے خیر اور سکون کا واحد ابدی مقام ہے۔ داعی کی نظر ان چیزوں پر نہیں ہونی چاہئے جو ابھی اس کو نہیں ملیں۔ بلکہ اس کو دیکھنا چاہئے کہ جو چیزیں مل چکی ہیں ان کا حق ادا ہو رہا ہے یا نہیں۔

اگلی آیتوں میں حق کی ادائگی کی صورت بتا دی۔ تم یتیم ہو گئے تھے، اللہ نے تمھاری یتیمی کی تلافی کا انتظام کیا اس لئے تمھارے دل میں ان لوگوں کی جگہ ہونا چاہئے جو اپنے پیدائشی حالات کے نتیجہ میں بے جگہ ہو گئے ہوں۔ تم بے مال تھے، اللہ نے تم کو معاشی سہارا فراہم کیا۔ اس لئے تم کو بھی محروموں اور ضرورت مندوں کا خیر خواہ بننا چاہئے تم راہ سے بھٹکے ہوئے تھے، اللہ نے تم کو ہدایت یاب کیا۔ اس لئے تم اس احسان کا شکر اس طرح ادا کرو کہ لوگوں کو ہدایت کے راستے پر لانے کی کوشش کرو۔ جو نعمت ہدایت تم کو ملی ہے اس ہدایت کو دوسروں تک پہنچاؤ۔

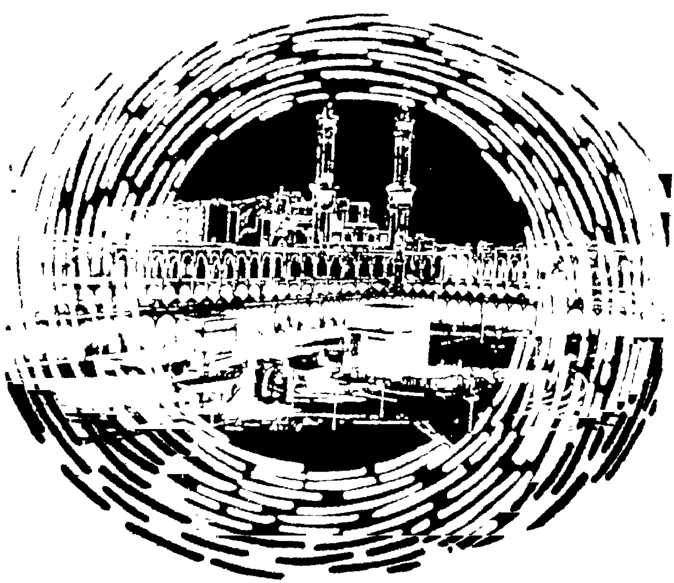
"سائل کو نہ جھڑکو" ——— کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی حق کی تلاش میں اللہ کے سامنے سائل بنے تو اللہ نے تم سے بے نیازی نہیں برتی۔ یتیم اور نادار اور بے راہ ہونے کے باوجود پوری طرح تمھاری طرف توجہ دی اور تم کو تمھارے "سوال" کا مکمل جواب عطا فرمایا۔ تمھارا بھی یہ حال ہونا چاہئے کہ جو کوئی تمھارے پاس اپنا سوال لے کر آئے، جو بھی تم سے حق کو جاننا چاہے اس کو تم نہ جھڑکو ——— یہ ایک انتہائی صورت کا حکم ہے۔ کیوں کہ نیاز مندانہ سوال پر تو کوئی بھی شخص کسی کو نہیں جھڑکتا۔ سائل کو جھڑکنے کی نوبت اسی وقت آتی ہے جب کہ اس نے اپنے سوال کو بے ڈھنگے اور نامعقول انداز سے پیش کیا ہو۔ گویا آیت کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص خواہ کتنی ہی سختی کے ساتھ سوال کرے تم اپنے جواب میں سختی کا طریقہ نہ اختیار کرو بلکہ ہر حال میں نرمی اور شفقت کے ساتھ اس کا جواب دو۔

سب سے بڑا اتحاد

میرے سامنے دیوار پر بیت اللہ کی تصویر ہے۔ وسیع مسجد کے درمیان کعبہ کی عمارت ہے اور اس کے چاروں طرف لاکھوں انسان گول دائرہ میں اپنے رب کے آگے جھکے ہوئے عبادت کر رہے ہیں۔ یہ سالانہ اجتماعی نماز ہے جو ہر بار حج کے مہینہ میں دنیا بھر کے ۲۵-۳۰ لاکھ مسلمان مکہ میں جمع ہو کر ادا کرتے ہیں اور جس کا فوٹو لیا جا سکتا ہے۔ لیکن تصور کی آنکھ سے دیکھئے تو یہی واقعہ اس سے زیادہ بڑے پیمانہ پر ہر روز پانچ بار ہوتا ہے۔ ساری دنیا کے مسلمان کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور اس طرح گویا ہر روز پانچ بار روئے زمین پر مسلمانوں کا گول دائرہ بنتا ہے۔ درمیان میں کعبہ ہوتا ہے اور ساری دنیا میں اس کے گرد دائرہ بنائے ہوئے مسلمان نماز ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسی عظیم اور مکمل اجتماعیت ہے جس کی مثال کسی بھی دوسرے مذہبی یا غیر مذہبی گروہ کے یہاں نہیں ملتی۔

اس کے باوجود یہ عجیب بات ہے کہ مسلمان ہی وہ گروہ ہیں جو آج ساری دنیا میں سب سے زیادہ غیر متحد ہیں۔ نہ کوئی دنیوی مقصد ان کو متحد کرنے میں کامیاب ثابت ہو رہا ہے اور نہ کوئی اخروی مقصد۔ اتحاد کے اتنے شاندار امکانات کے باوجود اختلاف کی ایسی بری مثال انسانی تاریخ میں دوسری نہیں ملے گی۔

لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ



کعبہ

وہ مرکزی نقطہ جس کے گرد دنیا بھر کے خدا پرستوں کا عبادتی دائرہ قائم ہوتا ہے۔

بعد کے دور میں لوگوں کی ہلاکت کا سب سے بڑا سبب باہمی اختلاف

عن عقبةَ بن عامر رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خرج الیٰ قتلیٰ احد فصلی علیہم بعد ثمان سنین کالمودّع للأحیاء والاموات ثم طلع الی المنبر فقال: انی بین ایدیکم فرطٌ و انا شہید علیکم۔ وان موعدکم الحوضُ و انی لا نظر الیہ من مقامی ھذا۔ وانی واللہ ما اخافُ علیکم ان تشرکوا بعدی ولکن اخاف علیکم الدنیا ان تنافسوا فیہا وتقتتلوا فتھلکوا کما ھلک من کان قبلکم۔ قال عقبۃ فکانت آخر ما رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی المنبر۔

(بخاری ومسلم)

عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنگ احد کے آٹھ سال بعد احد کے مقام پر گئے اور وہاں شہید ہونے والوں کے لئے دعا فرمائی۔ ایسی دعا جو کوئی رخصت ہوتے وقت کرتا ہے۔ پھر آپ منبر پر کھڑے ہوئے اور فرمایا۔ میں تمہارے لئے میر منزل ہوں اور تمہارے اوپر گواہ ہوں۔ اور تم سے میری ملاقات کی جگہ حوض ہے۔ اس حوض کو میں یہیں سے دیکھ رہا ہوں۔ اور خدا کی قسم مجھے یہ اندیشہ نہیں کہ تم میرے بعد شرک کرنے لگوگے بلکہ مجھے یہ اندیشہ ہے کہ تم دنیا کی حرص میں پڑ جاؤ گے اور آپس میں لڑو گے اور ہلاک ہوگے جس طرح پچھلی امتیں ہلاک ہوئیں۔

ذاتی شکایت کو دینی شکایت نہ بنانا

ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء (جلد ۱) میں طارق بن سہاب سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت خالد اور حضرت سعد رضی اللہ عنہما کے درمیان کسی بات پر اختلاف پیدا ہوا۔ ایک شخص حضرت سعد کے پاس گیا اور حضرت خالد کے خلاف ان سے کچھ کہنے لگا۔ انھوں نے کہا: ٹھہرو۔ ہمارے اور ان کے درمیان جو جھگڑا ہے وہ ہمارے دین پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ (مہ! ان ما بیننا لم یبلغ دیننا، طبرانی)

زبان اور ہاتھ کو آپس کی جنگ سے روکو

محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو ایک تلوار دی اور فرمایا:

یا محمد بن مسلمۃ جاھد بھذا السیف فی سبیل اللہ حتی اذا رأیت من المسلمین فئتین تقتتلان فاضرب بہ الحجر حتی تکسرہ ثم کف لسانک ویدک حتی تاتیک منیۃ قاضیۃ او ید خاطئۃ

(ابن سعد جلد ۳)

اے محمد بن مسلمہ! اس تلوار سے اللہ کے راستہ میں جہاد کرو۔ یہاں تک کہ جب تم دیکھو کہ مسلمان دو ٹولیاں میں بٹ کر آپس میں لڑ رہے ہیں تو اس تلوار کو پتھر پر مار کر توڑ دینا۔ پھر اپنی زبان کو اور اپنے ہاتھ کو روک لینا یہاں تک کہ تم کو موت آجائے یا کوئی خطاکار تم کو ہاتھ بڑھا کر قتل کر دے

باہمی جنگ میں دونوں فریق سے الگ رہو

وائل بن حجر رض حضرموت کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ علی بن ابی طالب رض اور امیر معاویہ رض کے درمیان خون عثمان کے مسئلہ پر جنگ ہوئی تو امیر معاویہ رض نے وائل بن حجر رض کو بلایا اور کہا کہ تم اس معاملہ میں ہمارا ساتھ کیوں نہیں دیتے۔ انھوں نے عذر کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ فتنے تمہاری طرف آگئے جو اندھیری رات کے ٹکڑے کی طرح ہیں"۔ میں نے پوچھا کہ ہم اس وقت کیا کریں۔ آپ نے فرمایا: اے وائل! اسلام میں جب دو تلواریں چلیں تو تم دونوں تلواروں سے الگ رہنا (یا وائل اذا اختلف سیفان فی الاسلام فاعتزلهما، طبرانی)

حاکم کے ذمہ دوسروں کی اصلاح، غیر حاکم کے ذمہ اپنی اصلاح

بیہقی نے سائب بن زید رض کے واسطے سے نقل کیا ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس ایک آدمی آیا اور کہا: میرے لئے کیا یہ بہتر ہے کہ اللہ کے معاملہ میں ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہ کروں یا اپنی ذات پر متوجہ رہوں۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جو شخص مسلمانوں کے اجتماعی معاملہ کا ذمہ دار مقرر کیا جائے، وہ اللہ کے بارے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہ کرے۔ اور جو شخص صاحب امر نہ ہو وہ اپنی ذات پر متوجہ رہے اور اپنے والی کی نصیحت کرے (اما من ولی من امر المسلمین شیئاً فلا یخاف فی اللہ لومۃ لائم۔ ومن کان خلوا فلیقبل علی نفسہ ولینصح لولیّ امرہ کنز العمال جلد ۳)

انفرادی شکایتوں کو ہر حال میں برداشت کرنا

واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ اسلام کے ارادہ سے اپنے گھر سے نکلے اور مدینہ پہنچے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت نماز پڑھا رہے تھے۔ وہ نماز میں آخری صف میں شامل ہو گئے۔ نماز کے بعد انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ کلمہ توحید کے اقرار کے علاوہ آپ نے ان سے حسب ذیل چیزوں کے لئے بیعت لی: تمہارے اوپر اطاعت لازم ہوگی تنگدستی میں بھی اور آسائش میں بھی۔ پسندیدگی میں بھی اور ناگواری میں بھی۔ اور خواہ تمہارے اوپر دوسروں کو ترجیح دی جائے (علیك الطاعة فی عسرك ویسرك، ومنشطك ومكرهك، واثرة علیك، كنز العمال جلد ۸)

اجتماعی امور میں امیر کی مکمل اطاعت

بیہقی نے عبداللہ بن یزید سے اور حاکم نے عبداللہ بن بریدہ سے روایت کیا ہے۔ غزوۂ ذات السلاسل میں رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فوجی دستہ روانہ کیا۔ اس دستہ میں ابوبکر رض اور عمر رض وغیرہ تھے۔ اس دستہ کا سردار آپ نے عمرو بن عاص کو مقرر کیا۔ وہ لوگ چلے یہاں تک کہ مقام جنگ کے قریب پہنچ گئے اور رات کو پڑاؤ کیا۔ عمرو بن عاص رض نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ آگ روشن نہ کریں۔ عمر رضی اللہ عنہ کو یہ غیر ضروری مشقت معلوم ہوئی۔ وہ غصہ ہو گئے اور اٹھے کہ عمرو بن عاص رض کے پاس جائیں۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کو روکا اور کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اسی لئے تمھارے اوپر امیر بنایا ہے کہ ان کو جنگی معاملات سے زیادہ واقفیت ہے (لم یستعملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علیک الا لعلمہ بالحرب)

حکمرانوں کو نصیحت تنہائی میں نہ کہ مجمع عام میں

حاکم نے جبیر بن نفیر سے روایت کیا ہے کہ عیاض بن غنم اشعری نے شہر دارا فتح کیا تو اس کے حاکم کو سزا دی ۔ ہشام بن حکیم ان کے پاس آئے اور کہا: اے عیاض! کیا تم کو نہیں معلوم کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

ان اشد الناس عذابا یوم القیامۃ اشد الناس عذابا للناس فی الدنیا	قیامت کے دن سب سے زیادہ سخت عذاب اس کا ہوگا جو دنیا میں لوگوں کو سخت عذاب دیتا تھا۔

ہشام سخت سست باتیں کہہ کر چلے گئے۔ چند روز کے بعد عیاض بن غنم ان سے ملے اور کہا اے ہشام ہم نے بھی وہ بات سنی ہے جو تم نے سنی ہے۔ اور وہ بات دیکھی ہے جو تم نے دیکھی ہے اور وہ صحبت اٹھائی ہے جو صحبت تم نے اٹھائی ہے۔ اے ہشام! کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے نہیں سنا: جس کسی کو حاکم سے کوئی نصیحت کرنی ہو تو وہ علانیہ طور پر اس سے نہ کہے، بلکہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کو تخلیہ میں لے جائے اور تنہائی میں اس سے کہے۔ اگر حاکم نے قبول کر لیا تو قبول کر لیا۔ اور اگر نہیں قبول کیا تو آدمی نے اپنی ذمہ داری پوری کر دی اور اس کا جو حق تھا اس کو ادا کر دیا۔ (من کانت عندہ نصیحۃ لذی سلطان فلا یکلمہ بہا علانیۃ ولیاخذ بیدہ ولیخل بہ، فان قبلہا قبلہا والا کان قد ادی الذی علیہ والذی لہ)

گروہی پکار جاہلیت کی پکار ہے

جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ ایک بار ہم لوگ کسی غزوہ میں تھے۔ مہاجرین میں سے ایک شخص نے انصار کے ایک شخص کی پیٹھ پر گھونسہ مار دیا۔ وہ شخص غصہ میں آگیا اور پکارا: یاللانصار (اے انصار مدد) دوسری طرف مہاجر نے آواز دی: یاللمہاجرین (اے مہاجرین مدد) دونوں گروہ جمع ہو گئے اور دونوں میں جھڑپ بھی شروع ہو گئی۔ پھر کچھ لوگوں نے درمیان میں پڑ کر فریقین کو ہٹا دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا: ما بال دعوی جاھلیۃ (یہ زمانہ جاہلیت جیسی باتیں کیوں ہو رہی ہیں) لوگوں نے کہا: اے خدا کے رسول ایک مہاجر نے ایک انصاری کو مار دیا تھا۔ آپ نے فرمایا: ان باتوں کو چھوڑو، یہ بدبودار باتیں ہیں (دعوھا فانہا منتنۃ، مسلم، احمد، بیہقی)

اختلافی محاذ بنانا سب سے زیادہ برا کام

امام احمد روایت کرتے ہیں کہ کچھ لوگ ابوذر رضی اللہ عنہ کے لئے کچھ چیزیں لے کر چلے۔ وہ ربذہ پہنچے تو وہاں ان کو نہ پایا۔ ان کو بتایا گیا کہ وہ حج کے لئے گئے ہوئے ہیں۔ وہ دوبارہ روانہ ہوکر منیٰ پہنچے۔ وہ لوگ ابوذر کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ان سے کہا گیا: خلیفہ عثمان رضی اللہ عنہ نے یہاں چار رکعتیں پڑھی ہیں۔ یہ بات ابوذر رضی اللہ عنہ کو بہت گراں گزری۔ انھوں نے سخت الفاظ میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا اور کہا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھ چکا ہوں۔ آپ نے صرف دو رکعت نماز پڑھی۔ پھر ابوبکر رض و عمر رض کے ساتھ بھی میں نے دو رکعت نماز پڑھی۔ اس کے بعد ابوذر رضی اللہ عنہ اٹھے اور چار رکعت نماز ادا کی۔ لوگوں نے کہا: آپ نے امیرالمومنین پر چار رکعت کے لئے اعتراض کیا اور خود وہی کر رہے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا:

مختلف عمل کرنا اس سے بھی زیادہ سنگین ہے۔

الخلاف اشد

اسی قسم کا واقعہ عبدالرزاق نے قتادہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے خلیفہ عثمان رضی اللہ عنہ کے منیٰ میں چار رکعت پڑھنے پر نکیر کی اور پھر خود چار رکعت پڑھی۔ جب پوچھا گیا تو فرمایا: اختلاف کرنا شر ہے (الخلاف شرٌّ)

اپنوں سے شکایت کا عذر لے کر دشمن سے مل جانا صحیح نہیں

کعب بن مالک رضی اللہ عنہ غزوۂ تبوک میں شریک نہ ہو سکے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس غزوہ کا اعلان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے وقت میں کیا جب کہ کھجوروں کا پکنا اور درختوں کا سایہ لوگوں کو اچھا معلوم ہوتا ہے۔ میں نے تیاری میں سستی کی۔ میرا گمان تھا کہ مجھ کو تو ہر طرح قدرت حاصل ہے۔ جب چاہوں گا روانہ ہو جاؤں گا۔ یہاں تک کہ لشکر روانہ ہو گیا اور میں ابھی تک تیار نہ ہوا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس تشریف لائے تو میں آپ سے ملا۔ آپ نے پوچھا: تم کو کس چیز نے غزوہ میں شرکت سے روک دیا۔ میں غلط بیانی نہ کر سکا۔ میں نے کہہ دیا: میرے پاس کوئی عذر نہیں۔ میں جانے پر پوری طرح قادر تھا" اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ کعب (اور ہلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع) سے کوئی بات نہ کرے۔ پچاس دن تک مدینہ میں ان کا مکمل بائیکاٹ جاری رہا۔ حتیٰ کہ ان کا وہ حال ہو گیا جس کی تصویر قرآن میں ان الفاظ میں ہے: زمین اپنی ساری وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی۔ ان کا اپنا وجود بھی ان پر بوجھ بن گیا۔ انھوں نے جان لیا کہ اللہ سے بچنے کے لئے کوئی جائے پناہ خود اللہ کے سوا نہیں (توبہ ۱۱۸)

کعب بن مالک رض کہتے ہیں۔ اسی دوران ایک روز میں مدینہ کے بازار میں تھا کہ مجھے شام کا ایک نبطی ملا جو تجارت کی غرض سے مدینہ آیا تھا۔ اس نے مجھے شاہ غسان کا ایک خط دیا جو ریشم کے کپڑے میں لپٹا ہوا تھا۔ اس میں لکھا تھا:

" مجھے معلوم ہوا کہ تمھارے صاحب نے تم پر ظلم کیا ہے۔ خدا تم کو ذلت اور ضائع ہونے کی جگہ پر نہ رکھے۔ تم ہمارے پاس آجاؤ۔ ہم تمھاری قدر کریں گے"

کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا اور اسی وقت اس کو آگ میں ڈال دیا ــــ پچاسویں دن اللہ تعالیٰ نے آپ کی توبہ قبول فرمائی۔

ورنہ دشمن تمھارے اوپر مسلط ہوجائیں گے

ابن ابی شیبہ نے شمر کے واسطے سے ایک شخص کی روایت نقل کی ہے۔ اس نے کہا کہ میں علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں عریف (قبیلہ کا چودھری) تھا۔ آپ نے ہم کو کسی چیز کا حکم دیا۔ کچھ دن کے بعد آپ نے پوچھا: کیا تم نے وہ کام کردیا جس کا میں نے تمھیں حکم دیا تھا۔ انھوں نے کہا نہیں۔ خلیفۂ چہارم نے فرمایا: خدا کی قسم تم لوگ ضرور اس کام کو کرو جس کا تمھیں حکم دیا جائے ورنہ یہود و نصاریٰ تمھاری گردنوں پر سوار ہوجائیں گے (واللہ لتفعلن ما تومرون به اولتركبن اعناقكم اليهود والنصارىٰ، کنز العمال)

باہمی لڑائی خدا کی مدد سے محروم کردیتی ہے

حضرت خباب بن الارت کہتے ہیں کہ ایک بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عادت کے خلاف بہت لمبی نماز پڑھی۔ صحابہ نے اس کے متعلق سوال کیا تو فرمایا: یہ رغبت اور ڈر کی نماز تھی۔ میں نے اس میں اللہ تعالیٰ سے تین دعائیں کیں۔ ان میں سے دو قبول ہوگئیں۔ ایک کے بارے میں انکار کردیا گیا۔

فرمایا: میں نے یہ دعا کی کہ میری ساری امت قحط سے ہلاک نہ ہوجائے۔ یہ قبول ہوگئی۔ دوسری دعا یہ کی کہ ان پر کوئی ایسا دشمن مسلط نہ ہو جو ان کو بالکل مٹا دے۔ یہ بھی قبول ہوگئی۔ تیسری دعا یہ کی کہ ان میں آپس میں لڑائی جھگڑے نہ ہوں۔ یہ بات منظور نہیں ہوئی"

اختلاف کی قیمت پر سرداری قبول نہ کرنا

ابن سعد نے حضرت میمون کے واسطہ سے ایک واقعہ ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

قال دسّ معاوية عمرو بن العاص وهو يريد يعلم ما في نفس ابن عمر يريد القتال ام لا۔ فقال يا ابا عبد الرحمٰن! ما يمنعك ان تخرج فنبايعك وانت صاحب رسول الله صلى الله عليه وسلم وابن امير المومنين وانت احق الناس بهذا الامر

وہ کہتے ہیں۔ امیر معاویہ رض نے عمرو بن العاص رض کو حیلہ کرکے عبد اللہ بن عمر رض کے پاس بھیجا، وہ جاننا چاہتے تھے کہ (خلافت کے بارہ میں) عبد اللہ بن عمر رض کے دل میں کیا ہے۔ وہ لڑنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ عمرو بن العاص رض ان کے پاس آئے اور کہا: اے ابو عبد الرحمٰن!

قال وقد اجتمع الناس کلھم علی ما تقول ۔ قال نعم الا نفیر یسیر ۔ قال لو لم یبق الا ثلاثة اعلاج بھجر لم یکن لی فیھا حاجة ۔ قال فعلم انہ لا یرید القتال

(طبقات ابن سعد جلد ۴)

آپ کو کیا چیز روکے ہوئے ہے کہ آپ نکلیں تاکہ ہم لوگ آپ سے بیعت کریں۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی اور امیر المومنین کے صاحبزادے ہیں۔ آپ اس کام کے لئے سب سے زیادہ حقدار ہیں۔ عبداللہ بن عمرؓ نے کہا: جو کچھ تم کہہ رہے ہو کیا اس پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے ۔ انھوں نے کہا ہاں، سوا تھوڑے لوگوں کے۔ عبداللہ بن عمرؓ نے کہا اگر ہجر کے تین موٹے عجمی آدمی بھی باقی رہ جائیں تو مجھے اس کام (خلافت) کی حاجت نہیں۔

عبادت ، اتحاد ، خیر خواہی

عن ابی ھریرة عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: ان اللہ یرضی لکم ثلاثا ۔ یرضی لکم ان تعبدوہ ولا تشرکوا بہ شیئا، وان تعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا، وان تناصحوا من ولاہ اللہ امرکم (صحیح مسلم)

حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ تم سے تین باتوں پر راضی ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ تم صرف اسی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ دوسرے یہ کہ اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور باہم متفرق نہ ہو۔ تیسرے یہ کہ اللہ تمھارے اوپر جس کو حکمراں بنائے، اس کے ساتھ خیر خواہی کرو۔ اسی مفہوم کی ایک روایت حضرت جبیر بن مطعم سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منی میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: ثلاث لا یغل علیھن قلب امرئ مسلم: اخلاص العمل للہ، ومناصحة ولاة الامر ولزوم جماعة المسلمین (مسند احمد)

تین چیزیں ہیں جن میں مومن کا قلب دھوکا نہیں کرتا۔ عمل میں اللہ کے لئے اخلاص، اپنے حاکموں کی خیر خواہی، مسلمانوں کی جماعت کو پکڑے رہنا۔

اجتماعی کام میں انفرادی جھگڑوں سے پرہیز

معاہدہ حدیبیہ کے بعد جب عرب میں امن قائم ہوگیا اور راستے محفوظ ہو گئے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ذی الحجہ ۶ ھ میں اپنے اصحاب کو جمع کرکے ان کو عمومی دعوتی کام کی طرف متوجہ کیا۔ آپ نے فرمایا "اللہ نے مجھ کو تمام دنیا کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ تم لوگ اس پیغام کو میری طرف سے تمام قوموں تک پہنچادو۔ اور اختلاف میں نہ پڑنا جس طرح بنو اسرائیل نے عیسیٰ بن مریم سے اختلاف کیا" آپ کے اصحاب نے جواب دیا: اے خدا کے رسول ہم آپ سے کسی بھی چیز میں کبھی اختلاف نہ کریں گے۔ آپ ہم کو حکم دیجئے اور ہم کو بھیجئے (یا رسول اللہ انا لا نختلف علیک فی شیئ ابدا فمرنا وابعثنا، البدایہ والنہایہ)

مطالعۂ حدیث

من لبس ثوب شهرة البسه الله ثوب مذلة يوم القيامة (احمد، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

جو شخص شہرت کا لباس پہنے، اللہ اس کو قیامت کے دن ذلت کا لباس پہنائے گا۔

اس حدیث کا ایک تعلق نمائشی لباس سے ہے۔ اسی کے ساتھ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ کوئی شخص اگر شہرت پسندی میں مبتلا ہو تو اس کا یہ مزاج اس کو آخرت کی دنیا میں رسوا کرنے والا ثابت ہوگا۔ خاموش کاموں سے بے رغبت ہونا اور ایسے کاموں کے لئے دوڑنا جس میں اخباری اہمیت (نیوز ویلو) ہے، جس سے آدمی کی امیج بڑھتی ہے، جس میں عوامی استقبالئے وصول ہوتے ہیں۔ یہ سب شہرت کے وہ لباس ہیں جو اللہ کو ناپسند ہیں اور آخرت کی ابدی زندگی میں وہ آدمی کے لئے رسوائی کا لباس بن کر ظاہر ہوں گے۔

مَن ذَكَرَ امرأً بشيءٍ لَيسَ فيهِ لِيَعيبَهُ بهِ حَبَسَهُ اللهُ في نارِ جهنّمَ حتّى يأتيَ بنفاذِ ماقالَ فيهِ (الطبرانی)

جس نے کسی شخص کے بارے میں ایسی بات کہی جو اس کے اندر نہیں ہے تاکہ اس کے ذریعہ اس کو عیب لگائے تو اللہ اس کو جہنم کی آگ میں روکے گا یہاں تک کہ اس نے جو کچھ کہا ہے اس کے حق میں وہ کوئی ثبوت لائے

گویا ایسی تنقید کرنا انگاروں سے کھیلنا ہے جب کہ کسی کی طرف ایسے خیالات منسوب کرکے اس کو نشانۂ تنقید بنایا جائے جو اس نے نہیں کہے یا اس کو ایسی علمی اور اخلاقی کمزوریوں کے لئے متہم کیا جائے جو محض الزام کی حیثیت رکھتی ہوں اور جن کی موجودگی کا کوئی واقعی ثبوت ناقد کی طرف سے پیش نہ کیا گیا ہو۔

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان الله تعالیٰ لا یمحو السیئ بالسیئ ولکن یمحو السیئ بالحسن۔ ان الخبیث لا یمحو الخبیث (احمد وغیرہ)

اللہ برائی کو برائی سے نہیں مٹاتا بلکہ برائی کو نیکی سے مٹاتا ہے۔ گندگی کبھی گندگی کو نہیں مٹا سکتی۔

اس حدیث کا ایک پہلو وہ ہے جو انفرادی زندگی سے متعلق ہے۔ ایک شخص کو اپنے پڑوسی سے یا کسی اور سے برے سلوک کا تجربہ ہوتا ہے۔ اس کے جواب میں اگر وہ بھی اس کے ساتھ برا سلوک کرنے لگے تو اس سے برائی میں صرف اضافہ ہوگا۔ اس سے برائی ختم نہیں ہو سکتی۔ برائی کو ختم کرنے کی واحد صورت صرف یہ ہے کہ ایک طرف سے اگر برائی کا اظہار ہوتا ہے تو دوسری طرف سے اچھائی کا اظہار کیا جائے۔

یہی اصول اجتماعیات کے لئے بھی صحیح ہے۔ ایک قوم اگر تعصب اور فساد کا طریقہ اختیار کرتی ہے تو دوسری قوم جوابی نفرت اور تعصب سے اس کی اصلاح نہیں کر سکتی۔ ایک حکمراں اگر ظلم کرتا ہے تو ہنگاموں اور توڑ پھوڑ کی سیاست سے اس کا خاتمہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایک گروہ اگر سماجی اور اقتصادی استحصال کرتا ہے تو دوسرا گروہ شور وغل یا منفی تدبیروں سے اس کو دور نہیں کر سکتا۔

ٹیڑھی کھیر

"آپ ہم کو اسلام کی طرف بلاتے ہیں" ایک غیر مسلم نے کہا "مگر اسلام وہی تو ہے جس نے موجودہ ایران میں مسلمانوں مسلمانوں کو لڑا رکھا ہے۔ پاکستان میں اسی اسلام کے نام پر مسلمان آپس میں لڑ رہے ہیں اور ان کی لڑائی ختم ہونے میں نہیں آتی۔ کیا اسی آپسی لڑائی والے دین کو اب آپ ہمارے ملک میں بھی داخل کرنا چاہتے ہیں؟"

غیر مسلم بھائی کی اس بات کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ مجھے "ٹیڑھی کھیر" کا لطیفہ یاد آیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک نابینا کو ایک شخص نے کھانے کی دعوت دی۔

"آپ کیا کھلائیں گے" نابینا نے پوچھا۔

"کھیر کھلاؤں گا"

"کھیر کیا چیز ہوتی ہے" نابینا نے دوبارہ سوال کیا۔

"کھیر سفید ہوتی ہے"

"کیسی سفید"

"جیسے بگلا"

"بگلا کیسا ہوتا ہے، میں نے تو اس کو کبھی نہیں دیکھا"

اب دعوت دینے والے نے اپنے ہاتھ کو بگلے کی شکل کا بنا کر نابینا کے ہاتھ میں دیا اور کہا کہ بگلا ایسا ہوتا ہے۔ نابینا نے ٹٹول کر دیکھا تو وہ اس کو ایک ٹیڑھی سی چیز معلوم ہوئی۔ اس نے سمجھا کہ کھیر کوئی ٹیڑھی میڑھی چیز ہوتی ہے۔ اس نے سوچا کہ ایسی ٹیڑھی چیز اگر میں نے کھائی تو کہیں وہ میرے گلے میں نہ پھنس جائے۔ اس نے کہا "بھائی! مجھے ایسی ٹیڑھی کھیر سے معاف رکھو۔ میں تمھاری دعوت نہیں کھاؤں گا"

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے بھی دین اسلام کو ایسا ہی ٹیڑھا دین بنا رکھا ہے۔ اسلام کے نام پر طرح طرح کے مذہبی، سیاسی اور معاشی جھگڑے برپا ہیں۔ اسلام دین رحمت تھا۔ مگر موجودہ زمانہ میں اس کو دین منازعت بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ "ٹیڑھا دین" ہر ایک لئے پھرتا ہے۔ مگر سیدھا سچا دین کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اسلام کے یہ نادان دوست اگر اسلام کا نام لینا چھوڑ دیں تو وہ زیادہ بہتر طور پر اسلام کی خدمت کریں گے۔

یہ دین داری نہیں نفس پرستی ہے

بہت سے لوگ شعبان کی پندرہ تاریخ کو حلوا پکاتے ہیں۔ مشہور یہ ہے کہ اس روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دانت شہید ہوا تھا اور اسی بنا پر کوئی سخت چیز کھانے کے بجائے آپ نے حلوا تناول فرمایا۔

یہ بات تاریخ کے بالکل خلاف ہے۔ کیونکہ محدثین اور ارباب سیر کے اتفاق کے مطابق آپ کا دانت غزوۂ احد میں شہید ہوا تھا اور غزوۂ احد شوال (۳ھ) میں پیش آیا ہے نہ کہ شعبان میں۔ نیز اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ اس دن آپ نے حلوا نوش فرمایا۔

دانت شہید ہونے کے واقعہ سے "حلوا" کھانے کی سنت تو نکال لی گئی۔ مگر کسی کو اس سے دلچسپی نہیں کہ یہ بھی معلوم کرے کہ وہ کون سا فرض تھا جس کی ادائگی کے لئے آپ نے اتنی سرگرمی دکھائی کہ آپ کے دانت تک شہید کر دیئے گئے۔ یہ دین داری نہیں، دین کے نام پر نفس پرستی ہے۔

جب دلیل، دلیل نظر نہ آئے

ایک گروہ جو آسمانی کتاب کا حامل ہو، اس کی گمراہی یہ نہیں ہوتی کہ وہ دین سے بالکل بے تعلق ہوجائے۔ اس کی گمراہی تحریف (نساء ۴۶) ہے۔ یعنی خود ساختہ دین پر چلنا اور لفظی تاویلوں اور تشریحوں کے ذریعہ یہ ظاہر کرنا کہ یہی عین خدا اور رسول کا دین ہے۔ بالفاظ دیگر، دین کا نام لیتے ہوئے بے دینی اختیار کرنا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے جو دین مقرر کیا ہے، اس کی ایک سیدھی شاہراہ (صراط مستقیم) ہے۔ یہ شاہراہ ہے ـــــ اللہ پر یقین، آخرت کا خوف، خشوع اور انابت، بندوں کے ساتھ خیر خواہی، معاملات میں انصاف، بے لاگ حق پرستی، دعوت الی اللہ وغیرہ۔ یہی وہ اصل چیزیں ہیں جو اللہ کو اپنے بندوں سے مطلوب ہیں سارا قرآن ان کی تاکید سے بھرا ہوا ہے۔ ان کیفیات و اعمال کے ساتھ جو زندگی بنتی ہے اس کو ایک لفظ میں آخرت رخی زندگی کہہ سکتے ہیں۔ مگر وقت گزرنے کے بعد جب قوموں میں قساوت (حدید ۱۶) آجاتی ہے اور دھیرے دھیرے آخرت کا فکر کمزور پڑجاتا ہے تو دنیا پرستی کا غلبہ ہوجاتا ہے۔ اب لوگوں کے اندر ایک اور دین ابھرنا شروع ہوتا ہے۔ یہ ہے دنیا رخی دین جس کو قرآن میں آخرت کے بدلے دنیا خریدنا (بقرہ-۸۶) کہا گیا ہے۔ یعنی اپنی دنیا پرستانہ زندگی پر دین کا لیبل لگانا، خود ساختہ تشریحات کے ذریعہ دنیوی اعمال کو آخرت کی کامیابی کا سبب بتانا۔ اسلام حقیقۃً یہ ہے کہ اپنی زندگی کو خدائی مرضیات کے سانچہ میں ڈھالا جائے۔ مگر اب ایک ایسا اسلام وجود میں آتا ہے جس میں آدمی خود اسلام کو اپنے اوپر ڈھالنا شروع کر دیتا ہے۔ آپ اسلام کے پیچھے چلنے کے بجائے اسلام کو اپنے پیچھے چلانا شروع کر دیتا ہے۔

لوگ اصل دینی شاہراہ کو چھوڑ کر اپنے اپنے ذوق کے تحت مختلف سمتوں میں منحرف ہونے لگتے ہیں۔ کسی کا منطقی مزاج غیر ضروری قسم کی مذہبی بحثیں ایجاد کرتا ہے اور وہ ان مباحث کا پہلوان بن کر ابھرتا ہے۔ کوئی دنیوی مسائل اور سیاسی جھگڑوں کو اسلامی اصطلاحات میں بیان کرتا ہے اور ان کا علم بردار بن کر مجاہد اسلام کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔ کوئی جھوٹے قصے کہانیاں گھڑ کر اسلام کا ایک طلسماتی مجموعہ تیار کرتا ہے اور ان کو سنا سنا کر عوام کی بھیڑ اپنے گرد جمع کر لیتا ہے۔ کوئی اسلام کا ایک برکتی ایڈیشن وضع کرتا ہے اور بہت سے لوگ اس کو ایک پراسرار دنیوی نسخہ سمجھ کر اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ کوئی انسان کے بنائے ہوئے "ازموں" کے ساتھ اسلام کا لفظ شامل کر کے ان تمام لوگوں کی قیادت حاصل کر لیتا ہے جو ان ازموں (نظاموں) کے فریب میں ہیں اور اسی کے ساتھ اسلام کو بھی ہاتھ سے جانے دینا نہیں چاہتے۔ کچھ لوگ سارا معاملہ اس خوش عقیدگی پر ڈال دیتے ہیں کہ وہ محبوب خدا کی امت ہیں اور قیامت کے دن وہ بہر حال بخش دیئے جائیں گے۔ غرض اصل شاہراہ دین کے دائیں بائیں بہت سی خود ساختہ راہیں نکال لی جاتی ہیں اور لفظی تاویلات یا گھڑے ہوئے افسانوں کے ذریعہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ یہ عین دینی ہیں۔ بلکہ یہی وہ دین ہے جس کے لئے تمام انبیاء اس دنیا میں بھیجے گئے۔

کوئی اہل کتاب گروہ جب دین کی اصل شاہراہ کو چھوڑ کر اس طرح منحرف راستوں پر چل پڑتا ہے تو وہ اللہ کی نظر میں سخت مبغوض ہو جاتا ہے۔ اس کا جرم عام انسانوں کے مقابلہ میں دگنا ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ بے دینی کو دین کے نام پر کر رہا ہے۔ وہ دین خداوندی کا نمائندہ ہو کر لوگوں کے سامنے غلط دین کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ یہود کا جرم یہی تھا جس کے نتیجہ میں ان کو یہ سخت انتباہ دیا گیا:

یایھا الذین اوتوا لکتٰب آمنوا بما نزلنا مصدقا لما معکم من قبل ان نطمس وجوھا فنردھا علیٰ ادبارھا او نلعنھم کما لعنا اصحٰب السبت و کان امر اللہ مفعولا (نساء ۴۷)

اے اہل کتاب ایمان لاؤ اس پر جو ہم نے نازل کیا ہے۔ وہ سچا کرنے والی ہے اس چیز کو جو تمھارے پاس ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم مٹا ڈالیں چہروں کو۔ پھر ان کو پیٹھ کی طرف الٹ دیں یا ان کو لعنت کریں جیسے لعنت کی ہم نے اصحاب سبت کی اور اللہ کا حکم پورا ہو کر رہتا ہے۔

"چہرہ کو بگاڑ کر پیچھے پھیر دینے" کا مطلب یہ ہے کہ تمھاری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم کر دی جائے گی۔ چہرہ آدمی کی باطنی قوتوں کا مظہر ہے۔ وہ سمع و بصر و فواد کا آئینہ ہے۔ اس لئے چہرہ کو الٹ دینے کا مطلب دیکھنے اور سننے اور سمجھنے کی صلاحیت کو الٹ دینا ہے۔ کتاب آسمانی کے حاملین کی گمراہی کا مطلب یہ ہے کہ حقائق سامنے کھلے ہوئے ہیں۔ پھر بھی وہ ان کو چھوڑ کر منحرف راستوں پر دوڑتے ہیں۔ عام لوگوں کی گمراہی اگر غفلت ہے تو ان کی گمراہی سرکشی۔ اس لئے اس اعراض کی سزا ان کو یہ ملتی ہے کہ ان کی قوتوں کو مسخ کر دیا جاتا ہے۔

سخت سزا کی وجہ ان کے معاملہ کی خصوصی نوعیت ہے۔ اللہ کی کتاب ان کے سامنے موجود ہے۔ رسول کی سنت ان کو راستہ دکھا رہی ہے۔ خدا کی نشانیاں ان کے سامنے کھلی ہوئی ہیں اس کے باوجود وہ جھوٹے الفاظ بول بول کر اس سے روگردانی کرتے ہیں۔ وہ آنکھوں والے ہو کر اندھے پن کا ثبوت دیتے ہیں۔ یہ چیزیں ان کے جرم کی شناعت کو بہت بڑھا دیتی ہیں۔ اللہ کا غضب ان پر بھڑکتا ہے۔ ان کو یہ سخت ترین سزا دی جاتی ہے کہ ان کی عقل کو الٹ دیا جاتا ہے۔ ان کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ چیزوں کی حقیقت ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ سیدھی بات ان کو الٹی نظر آتی ہے اور الٹی بات سیدھی دکھائی دیتی ہے۔ وہ اس قابل نہیں رہتے کہ اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت ان کے لئے روشنی کا کام دے سکے۔

آدمی کی عقل ہی وہ چیز ہے جس سے آدمی نیک و بد کو سمجھتا ہے۔ ایک راہ کو چھوڑنے اور دوسری راہ کو اختیار کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ جب عقل کو الٹ دیا جائے تو پھر وہ کسی معاملہ کی حقیقت کو کس طرح سمجھے گا۔ اس کے بعد آدمی کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ وہ گمراہیوں میں بھٹکتا رہتا ہے، حق کی کوئی آواز اس کی اصلاح کے لئے کارگر ثابت نہیں ہوتی —— وہ تعمیر ملت کے نام پر بے معنی چیخ پکار میں مشغول ہوتا ہے اور ساری تاریخ اس کو یہ سبق دینے سے عاجز رہتی ہے کہ دوسروں کے خلاف چیخ پکار سے کبھی کسی قوم کی تعمیر نہیں ہوتی۔ وہ سیاسی مظاہروں کو حق کی شہادت کا نام دیتا ہے اور تمام انبیاء کا اسوہ اس کو یہ بتانے کے لئے ناکافی ثابت ہوتا ہے کہ شہادت کا کام آخرت

کی گواہی دینا ہے نہ کہ سیاسیات اور معاشیات کی گواہی دینا۔ وہ لفظوں کے ورد سے جنت کے محل تعمیر کرتا رہتا ہے اور خدا کی کتاب اپنی تمام وضاحتوں کے باوجود اس کو بتا نہیں پاتی کہ جنت کسی آدمی کو جنت والے عمل سے ملتی ہے نہ کہ صرف لسانی اوراد سے۔

یہی حال رفتہ رفتہ اس کی تمام دینی و ملی سرگرمیوں کا ہو جاتا ہے —— وہ خود ساختہ موشگافیوں کو دینی تعلیم قرار دیتا ہے اور رسول اور اصحاب رسول کی پوری زندگی اس کو یہ بتانے میں ناکام رہتی ہے کہ دینی تعلیم کتاب اللہ کے حقائق و معارف کو ذہن میں اتارنے کا نام ہے نہ کہ ایسے مسائل میں لامتناہی بحث جاری رکھنے کا جن سے کتاب و سنت ناآشنا ہوں۔ وہ خود ساختہ عملیات اور وظائف پر روحانی ترقی کی عمارت کھڑی کرتا ہے اور یہ واقعہ اس کی آنکھ کھولنے والا ثابت نہیں ہوتا کہ اللہ کے رسول نے اپنے اصحاب کو روحانی ترقی کا جو طریقہ بتایا اس میں اس قسم کے عملیات و وظائف کا کوئی وجود نہ تھا۔ وہ دنیوی حقوق و مطالبات پر ملی سیاست کا بازار گرم کرتا ہے اور یہ عظیم حقیقت اس کے قدموں کو نہیں روکتی کہ اللہ کے پیغمبروں کا اسوہ جو اللہ کی کتاب میں بیان ہوا ہے اس کے یہ سراسر خلاف ہے کہ داعی گروہ اپنی مدعو قوم سے دنیوی مفادات کے جھگڑے چھیڑ دے۔ وہ سیاسی اقتدار قائم کرنے کو امت مسلمہ کا اصل مشن بتاتا ہے اور یہ واقعہ اس کے یقین میں کوئی تزلزل پیدا نہیں کرتا کہ آسمانی کتاب کے پورے متن میں کوئی فقرہ ایسا نہیں ہے جس کے عبارت النص سے یہ حکم نکلتا ہو کہ "اے مسلمانو تمھارا نصب العین یہ مقرر کیا گیا ہے کہ تم دنیا بھر میں اپنی سیاست کا جھنڈا گاڑ دو"۔ وہ "نظام اسلام" کا نام لے کر مسلم آبادیوں میں توڑ پھوڑ مچاتا ہے اور یہ حقیقت اس کے جوش تخریب میں کمی کرنے والی ثابت نہیں ہوتی کہ خدا کا پیغمبر سراپا رحمت بنا کر بھیجا گیا تھا اور اس بات کو اس نے مطلق حرام قرار دیا تھا کہ کوئی بھائی اپنے دوسرے بھائی کی جان و مال پر دست درازی کرے۔

جب کسی گروہ کی عقل الٹ جائے تو اس کو نہ حق حق کی صورت میں دکھائی دے گا اور نہ باطل باطل کی صورت میں۔ دلائل اس کو بے وزن معلوم ہوں گے۔ کھلی ہوئی نشانیاں اس کے سامنے آئیں گی مگر وہ اس کو دکھائی نہ دیں گی۔ الٹی باتیں اس کو سیدھی نظر آئیں گی اور جو سیدھی بات ہے وہ اس کو الٹی دکھائی دے گی۔ اس کا حال ان لوگوں جیسا ہو جائے گا جن کی نشان دہی قرآن میں ان لفظوں میں کی گئی ہے:

وان یروا کل آیۃ لا یومنوا بھا۔ وان یروا سبیل الرشد لا یتخذوہ سبیلا۔ وان یروا سبیل الغی یتخذوہ سبیلا۔ ذلک بانھم کذبوا بآیاتنا وکانوا عنھا غٰفلین (اعراف ۱۴۶)

اور اگر وہ دیکھیں ساری نشانیاں یقین نہ کریں ان کو۔ اور اگر دیکھیں راہ سنوار کی وہ نہ ٹھیرائیں اس کو راہ۔ اور اگر دیکھیں راہ الٹی اس کو ٹھیرائیں راہ۔ یہ اس واسطے کہ انھوں نے جھوٹ جانیں ہماری نشانیاں اور ہو رہے وہ ان سے غافل۔

اس دور کا مذہب : ہیرو ازم

پوپ کا عہدہ روایتی طور پر اطالوی مسیحیوں کے لئے مخصوص تھا۔ موجودہ پوپ پہلے غیر اطالوی ہیں جو ساڑھے چار سو سال کے بعد پوپ کے عہدہ پر فائز ہوئے ہیں۔ ان کا قدیم نام ووجی لا (Wojtyla) ہے اور موجودہ لقب پوپ جان پال دوم۔ وہ پولینڈ کے رہنے والے ہیں۔ پولینڈ کی آبادی میں ۹۰ فی صد لوگ کیتھولک عیسائی ہیں۔ مزید یہ کہ یہاں پادریوں کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے۔ پولینڈ ایک اشتراکی ملک ہے۔ فادر ووجی لا نے اس سے پہلے اپنے ملک میں مسیحیت کی آزادی کے لئے زبردست جدوجہد کی اور کامیابیاں حاصل کیں۔ ان کے فاتحانہ کارناموں نے ان کو مسیحی حلقوں میں ہیرو کا مقام دے دیا۔ اس تجربہ کے بعد پولینڈ میں ایسی فضا بن گئی کہ مسیحی کاز کے لئے اٹھنا ہیرو بننے کے ہم معنی ہو گیا۔ چنانچہ نوجوان طبقہ کثرت سے اس طرف مائل ہونے لگا۔ پولش چرچ کے ایک ذمہ دار نے کہا ہے:

Our young men are becoming priests, because in Poland this is an act of heroism.

The Illustrated Weekly of India, Oct.29,78

ہمارا نوجوان طبقہ پادری بن رہا ہے۔ کیونکہ پولینڈ میں پادری بننا ہیرو بننا ہے۔

ہیرو بننے کا شوق موجودہ زمانہ کا سب سے بڑا شوق ہے۔ عام نوجوان فلمی ہیروؤں کی نقل کر کے اپنے جذبہ کی تسکین کرتے ہیں اور بڑے لوگ اسٹیج پر چمتکار دکھا کر۔ فرق یہ ہے کہ کوئی روحانی اسٹیج پر یہ چمتکار دکھا رہا ہے اور کوئی سیاسی اسٹیج پر۔

فطرت سے بغاوت کے بعد

۲۵ سال پہلے ایک شخص نے امریکہ میں اپنی جنس تبدیل کرائی تھی۔ یعنی ایک مرد آپریشن کے ذریعہ عورت بن گیا۔ آج کل امریکہ میں سالانہ ایک سو کی تعداد میں جنسی تبدیلی کے آپریشن ہو رہے ہیں۔ جرمنی میں اس وقت ایسے لوگوں کی تعداد تین ہزار ہے جنھوں نے اپنی جنس تبدیل کرائی ہے۔ ان میں زیادہ تر مرد ہیں۔

مگر اس "تفریح" نے مغربی سماج میں نئے نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ ڈاکٹر گرناٹ ہاف من (جرمنی) ایک مرد تھا۔ اس نے آپریشن کے ذریعہ عورت کی جنس حاصل کر لی۔ مگر قانون ابھی اس کو عورت تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ قانونی طور پر اب بھی اس کے لئے ضروری ہے کہ بطور مرد ڈاکٹر کے کام کرے اور مرد ڈاکٹروں کا سا لباس پہنے۔ اس قسم کے بہت سے قانونی مسائل ہیں جن کو حل کرنے کے لئے نیا قانون بنایا جا رہا ہے۔ مگر ماہرین شبہ کر رہے ہیں کہ محض قانون سازی اس نئی نوع کے مسائل کو حل کر دے گی۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ تبدیلیٔ جنس کے کچھ عرصہ بعد ایسے لوگ انتشار ذہنی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جنس تبدیل کرنے والوں (Transsexuals) میں خودکشی کی شرح دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ پائی گئی ہے۔

دعا

سچی دعا یہ ہے کہ دعا کرنے والا دوسرے انسانوں کے ساتھ وہی مہربانی کرنے لگے جس مہربانی کو وہ اپنے رب سے خود اپنے لئے مانگ رہا ہے

قرآن میں مختلف مقامات پر دعا کی حقیقت بتائی گئی ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوا ہے:

ادعوا ربکم تضرعا وخفیة انہ لا یحب المعتدین ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا وادعوہ خوفا وطمعا ان رحمت اللہ قریب من المحسنین (اعراف ۵۶-۵۵)

پکارو اپنے رب کو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے — یقیناً وہ پسند نہیں کرتا حد سے نکل جانے والوں کو۔ اور مت خرابی مچاؤ زمین میں اس کی درستگی کے بعد۔ اور پکارو اس کو ڈرتے ہوئے اور امید رکھتے ہوئے۔ یقیناً اللہ کی رحمت قریب ہے نیکی کرنے والوں سے۔

اس موقع پر احسان کا مطلب ہے دعا کے موافق عمل کرنا۔ دوسری جگہ یہی بات ان لفظوں میں کہی گئی ہے:

ومن احسن قولا ممن دعا الی اللہ وعمل صالحا وقال اننی من المسلمین حم سجدہ ۳۳

اور کون شخص ہے بہتر بات میں اس شخص سے کہ پکارے اللہ کی طرف اور صالح عمل کرے اور کہے کہ میں حکم بردار ہوں

دعا کیا ہے۔ بندے کا اعترافِ عجز اپنے رب کے سامنے۔ جب ایک شخص اللہ پر اس حد تک یقین اور بھروسہ کر لیتا ہے کہ اس کی ساری امیدیں بس ایک اللہ سے وابستہ ہو جاتی ہیں۔ اللہ کے سوا کسی اور سے نہ اس کو پانے کی امید ہوتی ہے اور نہ چھننے کا اندیشہ۔ اس وقت اس کی زبان سے جو بیتابانہ کلمات نکل پڑتے ہیں، اسی کا نام دعا ہے بندہ اپنے پورے وجود کے ساتھ اپنے آپ کو اللہ کی سپردگی میں دے دیتا ہے اور کہہ اٹھتا ہے کہ میرے رب! مجھے اپنی رحمتوں کے سایہ میں لے لے۔ تیرے سوا کوئی کسی کو بچا نہیں سکتا۔ تیرے سوا کوئی کسی کو سایہ نہیں دے سکتا۔

دعا کے یہ الفاظ اللہ کی نظر میں اسی وقت دعا ہیں جب کہ عمل صالح (دعا کے موافق عمل) سے اس کی تصدیق ہو رہی ہو آدمی اپنے رب سے اپنے لئے جس رحمت اور عفو و درگزر کا طالب ہے۔ دوسرے انسانوں کے ساتھ رحمت اور عفو و درگزر کا وہی طریقہ اختیار کرنا زمین کی اصلاح ہے۔ اور جب ایسا ہو کہ آدمی اپنے لئے تو رحمت اور عفو و درگزر کا امیدوار ہو اور خود دوسرے انسانوں کے ساتھ سرکشی اور بے پروائی کا طریقہ اختیار کرے تو اس کا نام زمین میں فساد برپا کرنا ہے۔ اللہ کے سامنے حدِ بندگی میں ہونے کا اقرار کرنا اور دنیا کی زندگی میں جب دوسرے انسانوں سے عملی سابقہ پیش آئے تو حدِ بندگی سے نکل جانا ایسا تضاد ہے جو ایک طرف زمین کو فساد سے بھر دیتا ہے اور دوسری طرف آدمی کی دعا کو اللہ کی نظر میں بالکل بے معنی بنا دیتا ہے۔ آدمی اپنی دعا کو اللہ کے سامنے پیش کرتا ہے۔ مگر اس بات کا ثبوت اس کو انسانی تعلقات ہی میں دینا ہے کہ وہ اپنی دعا میں محسن ہے یا نہیں۔ جو شخص انسانی تعلقات میں اپنی دعائیہ حیثیت کو بھول جائے اس کی مثال ایسے آدمی کی ہے جس نے زبان سے بڑے بڑے دعوے کئے مگر جب اس کا امتحان لیا گیا تو وہ صفر سے زیادہ نمبر حاصل نہ کرسکا۔

آپ اپنے رب سے امید دار ہیں کہ وہ آپ کی کوتاہیوں کو نہ دیکھے بلکہ اپنی شان کریمی کے تحت آپ سے معاملہ فرمائے۔ اگر آپ فی الواقع اس پکار میں سچے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ دنیا کی زندگی میں جب آپ کا معاملہ ایسے شخص سے پڑے جس کے اوپر آپ قابو یافتہ ہوں تو آپ کو اللہ کے مقابلہ میں اپنی بے بسی یاد آجائے اور آپ اس کی کوتاہیوں سے درگزر کریں۔ آپ کو اللہ کے عذاب کا ڈر ہے۔ آپ اس کی پکڑ سے بچنے کے لئے اس سے دعا کر رہے ہیں۔ ایسی حالت میں ضروری ہے کہ جب کوئی انسان آپ کی گرفت میں آجائے تو آپ اس کے ساتھ غصہ اور انتقام کے تحت کارروائی نہ کریں بلکہ فیاضی اور حسن سلوک کے ساتھ معاملہ کر کے اللہ سے کہیں کہ خدایا تو بھی مجھ سے فیاضی کا معاملہ فرما۔ آپ اللہ کی بڑائی کے مقابلہ میں اپنی عاجزی کا اعتراف کر رہے ہیں، اس اعتراف میں آپ اس وقت سنجیدہ ہیں جب کہ آپ کا یہ حال ہو کہ آپ ایک انسان پر قدرت پالیں اور اس پر اپنی کبریائی کا مظاہرہ کر سکتے ہوں مگر اس وقت آپ کو اللہ کے مقابلہ میں اپنی عاجزانہ حیثیت یاد آجائے اور آپ اپنے رب سے یہ کہتے ہوئے اس شخص کو چھوڑ دیں کہ خدایا میں نے اس سے درگزر کیا تو بھی مجھ سے درگزر فرما۔"

اس کے برعکس اگر آپ کا حال یہ ہو کہ آپ اللہ کے سامنے عاجزی کے کلمات دہرائیں اور اس کے بعد بندوں کے ساتھ گھمنڈ اور سرکشی کا طریقہ اختیار کریں۔ اللہ سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگیں اور اپنے بھائی کی خطائیں معاف کرنے کے لئے تیار نہ ہوں۔ اللہ سے امید وار ہوں کہ وہ آپ کی حاجتیں پوری کرے اور آپ کا سابقہ جب کسی دوسرے محتاج انسان سے پڑے تو اس کی حاجت پوری کرنے کا کوئی جذبہ آپ کے اندر نہ ابھرے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ دعا کے ساتھ عمل صالح (دعا کے موافق عمل) نہیں کر رہے ہیں۔ آپ اپنی دعا میں مخلص نہیں ہیں۔ ایسی دعا کی اللہ کے نزدیک کوئی قیمت نہیں۔ ایسی دعا حقیقۃً دعا نہیں بلکہ سوانگ ہے اور سوانگ کسی شخص کو سزا کا مستحق بناتا ہے نہ کہ انعام کا۔

دعا کا مطلب یہ نہیں کہ کچھ برکت والے الفاظ ہیں، ان کو رٹ کر صحت ادا کے ساتھ دہرا دو اور پھر ان کے جادوئی اثرات ظاہر ہونے لگیں گے۔ خدا اور بندے کا معاملہ اس قسم کا مشینی معاملہ نہیں ہے۔ خدا الفاظ کو نہیں خود آپ کی ہستی کو دیکھتا ہے۔ خدا کو وہ کلمات درکار ہیں جو آدمی کی اپنی پکار بن کر نکلے ہوں۔ جو اس واقعہ کا ایک فطری اظہار ہوں کہ بندہ صرف ایک اللہ سے ڈرتا ہے اور صرف اسی سے امید رکھتا ہے۔ اس کے احساسات اپنے رب سے اس طرح وابستہ ہو گئے ہیں کہ ہر آن وہ اس سے مصروف کلام رہتا ہے، کبھی دل سے اور کبھی زبان سے۔ دعا دراصل پگھلے ہوئے دل کا بیتابانہ طور پر باہر نکل آنا ہے۔ جب کوئی بندہ اس معنی میں دعا کرنے والا بن جائے تو اس کا پورا وجود دعا میں ڈھل جاتا ہے۔ دعا کے الفاظ اور اس کی ہستی الگ الگ نہیں رہتے۔ وہ اندر سے بھی وہی ہوتا ہے جو بظاہر دعا میں دکھائی دیتا ہے۔ اس کی دعا جس طرح خدا کے سامنے اس کے سوال کا مظہر ہوتی ہے اسی طرح وہ بندوں کے مقابلہ میں اس کے کردار کو بتاتی ہے۔ یہ ایک ہی حقیقت ہے جو خدا کے سامنے تضرع کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور بندوں کے مقابلہ میں تواضع اور عدم استکبار کی صورت میں۔

ذمہ دار کون

۱۔ ایک شخص حقہ پی رہا تھا۔ اتنے میں مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی "اللہ اکبر، اللہ اکبر" اس کی چھوٹی لڑکی نے پوچھا: یہ مسجد کے ملاجی کیا کہہ رہے ہیں۔ "تم سمجھی نہیں" باپ نے نہایت اطمینان کے ساتھ جواب دیا "وہ کہہ رہے ہیں، اللہ حقہ بھر، اللہ حقہ بھر"

۲۔ ایک سیاح دہلی کی جامع مسجد دیکھنے آیا۔ وہ سیڑھی پر چڑھ رہا تھا کہ مسجد کے لاؤڈ اسپیکر پر اذان کی آواز بلند ہوئی "اللہ اکبر، اللہ اکبر" سیاح نے گیٹ پر کھڑے ہوئے ایک مسلمان سے کہا: "میاں جی! مسجد تو شاہجہاں نے بنوائی ہے۔ یہ اکبر کا نام کیوں لے رہے ہیں"

اس قسم کی باتیں خواہ مسخرہ پن کے طور پر کہی گئی ہوں یا سنجیدگی سے، ہر حال میں وہ ہماری ذمہ داری کو بڑھاتی ہیں۔ کہنے والے نے یہ بات اگر سنجیدگی سے کہی ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے ابھی اپنی پڑوسی قوموں کو اسلام سے آگاہ نہیں کیا۔ اور اگر انھوں نے تمسخر کے طور پر یہ بات کہی ہو تب بھی ہم ہی اس کے ذمہ دار ہیں۔ کیوں کہ اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ اہل اسلام کی عظمت لوگوں کے دلوں پر قائم نہیں۔ اگر ہم اپنے حالات اور اپنی زندگیوں سے اپنی عظمت لوگوں کے اوپر قائم کر چکے ہوں تو کسی کو جرأت نہیں ہوگی کہ ہمارے دین کے بارے میں اس قسم کے الفاظ اپنی زبان سے نکالے ـــــ پچھلے ہزار سال کی تاریخ اس کی گواہی دینے کے لئے کافی ہے۔

دین کی کوئی تشریح لفظوں ہی میں کی جا سکتی ہے۔ مگر انسانی الفاظ دین کی حقیقت کو بتانے کے لئے اسی طرح ناکافی ہیں جس طرح پھول کی حقیقت کو بتانے کے لئے یہ جملہ کہ: "پھول ایک رنگین اور خوش بو دار چیز ہے" گلاب کا درخت ساری کائنات سے غذائے کر رنگ اور خوشبو اور لطافت کے جس حسین مجموعہ کو اپنی ٹہنی پر کھلاتا ہے، اس کو وہ شخص تو کچھ سمجھ سکتا ہے جو اس کو سونگھ رہا ہو اور دیکھ رہا ہو۔ مگر جس آدمی کے سامنے صرف مذکورہ بالا الفاظ ہوں وہ نہیں جان سکتا کہ گلاب کا پھول حقیقۃً کس چیز کا نام ہے۔

آپ فقہ کی کتاب میں نماز کا باب پڑھیں تو آپ کو نماز کے بارے میں ساری تفصیلات لکھی ہوئی مل جائیں گی۔ مگر کتاب کے الفاظ کے ذریعہ آپ جس نماز سے واقف ہوں گے، وہ بعض حرکات کا محض ایک خشک ڈھانچہ ہوگا۔ لیکن یہی نماز جب ایک بندۂ مومن کی زندگی میں ڈھلتی ہے تو وہ لذتوں اور کیفیتوں کی ایک اتھاہ کائنات بن جاتی ہے۔

یہی پورے دین کا معاملہ ہے۔ دین کو "جاننے" کے لئے الفاظ کا مطالعہ کافی ہو سکتا ہے۔ مگر دین کو "پانے" کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اس "مقام" پر پہنچائے جہاں پہنچ کر آدمی اس کو دیکھنے اور سونگھنے لگتا ہے ـــــ آدمی اپنے آپ کو کسی تحفظ کے بغیر خدا کے حوالے کر دے۔ وہ دنیا میں سانس لینے کے بجائے آخرت میں سانس لینے لگے۔ وہ نفسیاتی پیچیدگیوں سے آزاد ہو کر فطرت اللہ کی حالت کو پہنچ جائے۔ وہ دین کو اپنی زندگی کا ضمیمہ بنانے کے بجائے اس کو اپنا سب کچھ بنا چکا ہو۔ اس کے بعد ہی کوئی شخص صحیح معنوں میں دین سے آشنا ہو سکتا ہے۔

—— چاہتے کہ جو کام نہیں کیا اس پر ان کی تعریف ہو (آل عمران ۱۸۸)

ایک بستی ہے جہاں کسی کو دوسرے سے شکایت نہیں۔ ایک کے ذہن میں دوسرے کے خلاف تلخ یادیں نہیں۔ ایسی بستی میں ایک عام آدمی بھی اخلاق اور انسانیت کی باتیں کر سکتا ہے۔ مگر ایک ایسی بستی جہاں لوگوں کے دل ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے ہوں۔ جہاں دلوں میں یہ احساس چھپا ہوا ہو کہ ان کے پڑوسی نے ان پر زیادتیاں کی ہیں۔ ایسی بستی میں اخلاق اور انسانیت کا وعظ ایک غیر معمولی کام کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہاں کوئی ایسا شخص ہی وعظ کہنے کا حق رکھتا ہے جو اخلاق کے اس بلند مرتبہ پر ہو کہ شکایتوں کے باوجود اپنے پڑوسی کو دوست رکھے۔ دل پر چوٹ لگنے کے بعد بھی چوٹ لگانے والے سے بیزار نہ ہوتا ہو۔ اس پر زیادتیاں کی جائیں مگر وہ زیادتیوں کو بھول کر اخلاق اور انسانیت کا پیکر بنا رہے۔ جو شخص ان بلند اوصاف کا حامل نہ ہو اس کا مذکورہ بستی میں اخلاق اور انسانیت کا وعظ کہنا ایک بے فائدہ حرکت ہے۔ ان وعظوں میں جو وقت اور پیسہ خرچ کیا جائے وہ سب وقت اور پیسہ کو ضائع کرنے کے ہم معنی ہے۔ آدمی کسی دوسرے کو ایسے اخلاق کی تلقین کیسے کر سکتا ہے جس پر وہ خود قائم نہ ہو۔ اور اگر کوئی جوش قیادت میں ایسا کرے تو اس کی تلقین کی قیمت کیا ہوگی۔

اس مثال میں ہم کو اس سوال کا جواب مل رہا ہے کہ بے شمار کوششوں کے باوجود ہمارے ملک میں ظالمانہ صورت حال کی اصلاح کیوں نہیں ہوتی۔ نصف صدی سے بھی زیادہ مدت سے ہمارے یہاں انسانی برادری، امن کانفرنس، پیام انسانیت جیسے ناموں سے مختلف تحریکیں اٹھتی رہی ہیں۔ دورے کئے جاتے ہیں۔ تقریریں اور کانفرنسیں ہوتی ہیں۔ مگر ابتدائی دھوم کے بعد جلد ہی یہ تحریکیں اس طرح ختم ہو جاتی ہیں جیسے ان کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس ملک میں واعظ بننے کے لئے غیر معمولی اخلاقیات والے مصلح درکار ہیں۔ جب کہ ہمارے رہنما صرف معمولی اخلاقیات کا سرمایہ اپنے پاس رکھتے ہیں۔ قوم اپنے دائرہ اختیار میں " دوستی کے بدلے دوستی، دشمنی کے بدلے دشمنی " کے جس اصول کو اپنائے ہوئے ہیں، ہمارے رہنما بھی اپنے دائرہ اختیار میں اسی اصول پر چل رہے ہیں۔ ایسی حالت میں دوسروں سے یہ کہنا کہ " دشمنی کے بدلے دوستی " کا اصول اپناؤ، خود را فضیحت دیگراں را نصیحت کا مصداق ہے۔ اس قسم کا وعظ ایک قسم کا مسخرہ پن ہے نہ کہ حقیقۃً وعظ و نصیحت۔

انسانیت اور اخلاق کی دو سطحیں ہیں۔ ایک یہ کہ جس کی طرف سے شکایت کا کوئی سبب پیدا نہ ہوا ہو اس کے ساتھ اخلاق اور انسانیت برتنا۔ یہ معمولی اخلاقیات ہیں۔ دوسرے یہ کہ شکایت اور تلخی پیدا ہونے کے بعد اخلاق اور انسانیت کا معاملہ کرنا۔ اس کو غیر معمولی اخلاقیات کہا جا سکتا ہے۔ ہمارے رہنما بلاشبہ معمولی اخلاقیات کے حامل ہیں۔ مگر ہمارے جغرافیہ کا جو مسئلہ ہے وہ غیر معمولی اخلاقیات کا تقاضا کرتا ہے۔ اور اس دوسرے معاملہ میں ہمارے رہنما صفر کی حد تک خالی ہیں " انسانیت " کے پرچار کا کام اگر وہ کسی ایسے جغرافیہ میں کر رہے ہوتے جہاں لوگوں کو ایک دوسرے سے شکایات پیدا نہ ہوئی ہوں تو ان پر کسی کو اعتراض کا حق نہ تھا۔ کیوں کہ یہ اخلاق کی

وہ سطح ہے جس پر وہ خود بھی قائم ہیں ۔ جو لوگ ان کے ساتھ اچھے بنے ہوئے ہوں وہ بھی ان کے ساتھ اچھے بنے رہتے ہیں ۔ مگر جب معاملہ ایسے لوگوں کا ہو جو ان کے ساتھ برا سلوک کریں جو ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچائیں ۔ جو ان کی انا کی راہ میں حائل ہوں تو ان کو ہمارے رہنما کبھی بخشنے کے لئے تیار نہیں ہوتے ۔ بالفاظ دیگر، اس معاملہ میں وہ خود بھی اخلاق کی اسی سطح پر ہیں جہاں ان کا مخاطب سماج ہے ۔ پھر جو لوگ خود معمولی اخلاقیات کی سطح پر ہوں وہ دوسروں کو غیر معمولی اخلاقیات کا وعظ کس طرح سنا سکتے ہیں ۔ جس طرح ایک جھوٹا آدمی سچائی کا مبلغ نہیں بن سکتا اسی طرح معمولی اخلاقیات کے لوگ غیر معمولی اخلاقیات کا درس نہیں دے سکتے اور اگر وہ اس قسم کی جرأت کریں تو یہ ایک بے فائدہ لفظی نمائش ہوگی نہ کہ کوئی حقیقی جدوجہد ۔

ہم کسی سادہ جزیرہ میں نہیں ہیں بلکہ ایک ایسے ملک میں ہیں جہاں بے شمار قسم کی تلخیاں پہلے سے لوگوں کے درمیان موجود ہیں ۔ ایک گروہ کو دوسرے گروہ سے تاریخی اور غیر تاریخی شکایات ہیں ۔ مفادات کے اختلاف نے لوگوں کو بانٹ رکھا ہے ۔ اعتقادی اور نظریاتی اختلافات لوگوں کے ذہنوں میں بسے ہوئے ہیں اور ہر ایک اپنے کو برسرحق اور دوسرے کو برسرباطل سمجھتا ہے ۔ کچھ لوگ دولت و اقتدار کے مقامات پر قابض ہیں اور کچھ لوگ اس سے محروم پڑے ہوئے ہیں ۔ اختلاف مزاج اور اختلاف مفاد کے نتیجہ میں بار بار ایک دوسرے سے شکایت کے مواقع پیدا ہوتے ہیں ۔ حتیٰ کہ اس صورت حال نے ایک کو دوسرے کا حریف بنا رکھا ہے ۔ ایسے ماحول میں انسانیت اور اخلاق کی بات کرنا گویا لوگوں سے یہ کہنا ہے کہ ــــــــ اختلاف کے باوجود مل کر رہو ۔ شکایات کے اسباب ہوتے ہوئے ایک دوسرے کا احترام کرو ۔ اختیار و اقتدار کے باوجود اپنے کمزور بھائی کے آگے جھک جاؤ ۔ کوئی تمہارے متعلق بری رائے رکھتا ہو تب بھی تم اس کے بارہ میں اچھی رائے رکھو ۔ دوسرے کی طرف سے قابل نفرت رویہ ظاہر ہونے کے باوجود اپنی طرف سے محبت کا مظاہرہ کرو ۔ دوسرے کو اپنا حریف جانتے ہوئے بھی اس کو اپنے گلے سے لگا لو ۔ اور یہ سب کچھ کسی نمائشی جلسہ میں وقتی طور پر نہیں ، بلکہ انھیں بلند اخلاقیات کو اپنا مستقل رویہ بنا لو ۔

سجے ہوئے پنڈالوں میں الفاظ کا دریا بہانا نہایت آسان ہے ۔ مگر عملی زندگی میں ان بلند اخلاقیات کو نبھانا اتنا ہی زیادہ دشوار ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ یہی وہ بلند اخلاقیات ہیں جن پر کوئی صالح اور صحت مند سماج قائم ہوتا ہے ۔ مگر ایسے سماج کی تعمیر کے داعی وہی لوگ بن سکتے ہیں جو خود بھی ان غیر معمولی اخلاقیات کے حامل ہوں ۔ معمولی اخلاقیات کا سرمایہ رکھنے والے لوگ اس تعمیری مہم کو نہیں چلا سکتے ۔ جہاں تک ہمارے رہنماؤں کا تعلق ہے وہ اس معاملہ میں صفر کی حد تک خالی ہیں ۔ رہنماؤں کی طویل فہرست میں غالباً کوئی ایک بھی ایسا رہنما نہیں ہے جو اخلاق وانسانیت کی اس بلند سطح پر ہو ۔ جو اپنے مخالف سے پیار کرتا ہو ۔ جو اقتدار کا مالک ہونے کے باوجود اپنے کمزور حریف کے ساتھ مسکینی کا رویہ اختیار کرے ۔ جو تلخی اور اشتعال کے اسباب ہوتے ہوئے بھی جذبات کا شکار نہ ہو ــــ جو اپنے ماتحت ادارہ میں بلند اخلاقیات کا وہی ماحول قائم کئے ہوئے ہو جس کی طرف وہ تمام اہل ملک کو بلا رہا ہے پھر آدمی خود عمل کی جس سطح پر نہ ہو ، وہ محض تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ دوسروں کو وہاں کس طرح لا سکتا ہے

لفظی کمالات کی کوئی بھی مقدار عمل کوتاہی کا بدل نہیں بن سکتی۔ اگر آپ خود معمولی اخلاقیات کی سطح پر ہوں تو محض الفاظ کے زور سے دوسروں کو غیر معمولی اخلاقیات کی سطح پر نہیں لا سکتے۔ اس قسم کی تقریری مہم صرف ایک مسخرہ پن ہے اور مسخرہ پن نے کبھی اس زمین پر کوئی تاریخ نہیں بنائی ہے۔

جو چیز لوگوں کے درمیان فساد یا بگاڑ پیدا کرتی ہے وہ معمولی حالات نہیں ہیں بلکہ غیر معمولی حالات ہیں۔ عام حالات میں لوگ ہمیشہ ٹھیک ہی رہتے ہیں۔ مگر اجتماعی زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایسے مواقع آتے ہیں جب کسی کو کسی سے تکلیف پہنچ جائے۔ بس یہیں سے فساد شروع ہو جاتا ہے۔ ٹھیس پہنچتے ہی آدمی کے اندر کا شیطان جاگ اٹھتا ہے۔ وہ غصہ اور نفرت میں اندھا ہو جاتا ہے اور چاہتا ہے کہ جو کچھ وہ اپنے حریف کے خلاف کر سکتا ہے کر گزرے۔

ہر آدمی کے اندر ایک سانپ ہے۔ عام حالات میں وہ سویا ہوا ہوتا ہے۔ مگر وہ اس وقت جاگ اٹھتا ہے جب اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی جائے۔ ایسے موقع پر جو چیز آدمی کو بچاتی ہے وہ صبر اور اللہ کا خوف ہے۔ مگر بدقسمتی سے اس معاملہ میں قوم افلاس کے جس مقام پر ہے ٹھیک وہی حال خود ہمارے واعظوں اور رہنماؤں کا بھی ہے۔ آپ کسی رہنما کے ساتھ نیازمندی دکھائیے، اس کی قبائے عظمت کا تکمہ بنے رہئے تو وہ آپ سے خوش رہے گا۔ لیکن اگر آپ اس پر تنقید کریں، اس کی برتری کو مجروح کرنے کی کوشش کریں تو اچانک آپ دیکھیں گے کہ اس کے اندر کا سانپ جاگ اٹھا ہے۔ اس کے بعد کم از کم آپ کے مقابلہ میں وہ اپنا انسانی لبادہ اتار پھینکے گا۔ اگر آپ اس کے ادارہ میں ہیں تو آپ کو ذلیل کر کے وہاں سے نکال دیا جائے گا۔ آپ کے دوستوں اور ملاقاتیوں تک کی بے عزتی کی جائے گی۔ رہنما کے زیر اثر پریس کے لئے آپ ایک بالکل بے قیمت انسان بن جائیں گے۔ آپ کو نقصان پہنچانا عین جائز قرار پائے گا۔ ایک ایسے بے دین شخص کا استقبال وہ پسند کرے گا جس سے اس کی امیج میں اضافہ ہوتا ہو۔ مگر آپ سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملاقات کرنا بھی اس کو گوارا نہ ہوگا۔ اس کی نظر میں آپ کے علم و تقویٰ کی کوئی قیمت نہ ہوگی۔ اس کے برعکس بے دین لوگ اس کے لئے قیمت والے ہوں گے کیوں کہ وہ اس کی شان میں اضافہ کا سبب بنتے ہیں۔

قوم کا اگر یہ حال ہے کہ وہ عام حالات میں ٹھیک رہتی ہے اور جب کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آجائے تو بھڑک کر فساد کرنے لگتی ہے تو ہمارے رہنما بھی اپنے دائرہ میں اسی کردار کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ پھر وہ قوم کے اوپر انسانیت اور اخلاق کے واعظ کس طرح بن سکتے ہیں۔ "ایک سونے والا دوسرے سونے والے کو کیوں کر جگا سکتا ہے" جو لوگ اپنے نیازمندوں کے لئے شریف ہوں اور اپنے مخالفین کے لئے سانپ بنے ہوئے ہوں وہ دوسروں سے کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ تم اپنے مخالفین کے لئے سانپ نہ بنو بلکہ ان کے ساتھ انسانیت اور اخلاق کا وہی برتاؤ کرو جو تم اپنے دوستوں کے ساتھ کرتے ہو۔ خود معمولی اخلاق کی سطح پر ہونا اور دوسروں کو غیر معمولی اخلاق کا وعظ سنانا، ایک ایسے کام کا کریڈٹ لینا ہے جس کو آدمی نے کیا نہیں (آل عمران ۱۸۸) اس قسم کی روش خدا کے غضب کو بھڑکانے والی ہے نہ کہ وہ اللہ کی رحمتوں اور نصرتوں کو نازل کرنے کا سبب بنے۔

زمین بنانے سے پہلے کھیتی نہیں ہوتی

"ہم اپنے ملک میں غیر سودی بنک کاری کا تجربہ کرنے جا رہے ہیں" مہمان نے فخریہ لہجہ میں کہا۔

"موجودہ حالات میں یہ تجربہ کامیاب نہیں ہو سکتا" میں نے کہا۔

"کیوں"

"سودی بنک کاری کی زمین خود غرضانہ سماج ہے اور غیر سودی بنک کاری کی زمین بے غرضانہ سماج۔ آپ کے ملک کا موجودہ سماج ایک خود غرضانہ سماج ہے۔ پھر ایسے سماج میں کوئی ایسی اقتصادی اسکیم کس طرح کامیاب ہو سکتی ہے جس کے لئے بے غرضانہ سماج کی زمین درکار ہوتی ہے"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ غیر سودی بنک کاری کے خلاف ہیں"

"نہیں۔ میرا کہنا صرف یہ ہے کہ اگر آپ غیر سودی بنک کاری کا نظام وجود میں لانا چاہتے ہیں تو اس کا آغاز بے غرضانہ سماج وجود میں لانے سے کیجئے۔ ابتدائی زمین تیار کرنے سے پہلے پیغمبر نے بھی غیر سودی معاشیات قائم کرنے کا حکم نہیں دیا۔ پھر آپ اس قسم کے منصوبہ میں کیوں کر کامیاب ہو سکتے ہیں (۹ر نومبر ۱۹۷۸)

مستشرق کی زبان سے

پروفیسر مارگولیتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت نقاد تھے، مگر وہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

"انھوں نے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے) اڑنے والے جانوروں پر نشانہ بازی کی مشق کو منع فرمایا۔ جو لوگ اونٹوں پر ظلم کرتے تھے ان کے خلاف سخت ناراضگی ظاہر کی، جب ان کے بعض متبعین نے چیونٹیوں کی ایک چھوٹی سی پہاڑی میں آگ لگا دی تو ان کو حکم دیا کہ وہ اس کو بجھا دیں۔ ان کے زمانے سے کوئی عرب بھی اونٹوں کو اپنے اعزہ کی قبروں پر نہیں باندھتا کہ ایسا نہ ہو وہ بھوک اور پیاس سے مرجائیں، کوئی شخص بھی اپنی بھیڑ بکریوں کی آنکھیں اس لئے نہیں پھوڑتا کہ وہ خود نظر بد کے اثر سے بچ جائے۔ کوئی جلتی ہوئی مشعل باندھ کر جانوروں کے گلوں میں نہیں چھوڑ دیتا، کوئی بھی گھوڑوں کے چہروں پر ضرب نہیں لگاتا، نہ ان کے ایال اور دم تراشتا ہے، اس لئے کہ دم سے وہ مکھیاں اڑاتے ہیں اور ایال ان کو گرمی اور سردی سے بچاتے ہیں۔ کوئی بھی گدھوں کے چہروں کو نہیں داغتا، نہ ان پر ضرب لگاتا ہے۔ اونٹوں اور مرغیوں کو گالیاں دینا بھی ممنوع قرار دیا گیا۔ ایک دفعہ ایک عورت نے یہ قسم کھائی کہ اگر اس کا اونٹ اس کو صحیح و سلامت اس کی منزل مقصود تک پہنچا دے گا تو وہ اس کو قربان کر دے گی۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنا تو فرمایا "یہ تو اس غریب جانور کی حسن خدمت کا عجیب و غریب انعام ہے اور اس عورت کو اپنی قسم کا تاوان ادا کرنے سے معاف کر دیا"

ایک اقتباس

ر سلطان احمد پاکستان کی سیاسی صورت حال پر
رہ کرتے ہوئے روزنامہ سن (کراچی) میں لکھتے ہیں:

The PNA has all the disadvantag
of being in office for a bri
while without real power. The
could not refuse to join Gen. Zi
in an effort to neutralise th
PPP. But the country has come t
that tragic point where it i
easy to come to office but diffi
cult to stay, easy to promise bu
impossible to deliver and easy t
talk in ideological terms an
hold forth grand visions but di
fficult to delineate them precis
ly and implement them in detail.

The Times of India, 11.11.1978

پاکستان قومی اتحاد حقیقی اقتدار کے بغیر مختصر مدت کے لئے وزارت قبول کرنے کے تمام ناموافق پہلوؤں سے دوچار ہے۔ وہ جنرل ضیاء الحق کی پیش کش کو اس لئے رد نہ کر سکے کہ وہ سمجھتے تھے کہ حکومت کے ذریعہ وہ بھٹو پارٹی کو ختم کر دیں گے۔ مگر ملک ایسے دردناک نقطہ پر پہنچ گیا ہے کہ اب پاکستان میں وزیر بننا آسان ہے مگر برقرار رہنا مشکل ہے۔ وعدہ کرنا آسان ہے مگر اس کو زیر عمل لانا ناممکن ہے۔ نظریاتی اصطلاحوں میں بولنا اور بڑے بڑے خواب دیکھنا آسان ہے مگر ان کا ٹھیک ٹھیک نقشہ بنانا اور پوری طرح ان کی تعمیل کرنا مشکل ہے۔ ■

زندہ لوگ

چینی کمیونسٹ پارٹی کے چیرمین اور وزیر اعظم سنٹر ہوا کوفنگ کا چھوٹا لڑکا ۱۹۷۷ میں کالج کے داخلہ کے ایک قومی امتحان میں فیل ہو گیا۔ داخلہ کے لئے جتنے نمبر مقرر کئے گئے تھے، وزیر اعظم کے لڑکے کا نمبر اس معیار سے کم تھا۔ اس لئے اس کا انتخاب نہ ہو سکا۔ بعد کو وزیر اعظم ہوا کے کچھ آدمیوں نے یہ مسئلہ ان کے سامنے رکھا اور چاہا کہ وزیر اعظم اس مسئلہ کو دوبارہ زیر غور لائیں اور خصوصی اختیارات سے کام لے کر لڑکے کو داخلہ دلوا دیں۔ مگر وزیر اعظم نے اس معاملہ میں دخل دینے سے صاف انکار کر دیا۔ انھوں نے اپنے لڑکے سے کہا کہ اگلے سال تم زیادہ سخت محنت کرو تاکہ تم کو زیادہ نمبر ملیں اور قاعدہ کے مطابق تمہارا داخلہ ہو سکے۔ (ہندستان ٹائمس ۷ اکتوبر ۱۹۷۸)

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

پیغمبر اسلام

از: مولانا وحید الدین خاں

یہ کتاب سیرت سے متعلق مصنف کے مطالعہ کا خلاصہ ہے۔ مضامین کی فہرست حسب ذیل ہے۔

۱۔ شجرۂ نبوت۔
۲۔ سیرت نبوی قرآن میں۔
۳۔ اثبات رسالت۔
۴۔ نبوت محمدی کا ظہور۔
۵۔ پیغمبر اسلام: مثالی انسانی کردار۔
۶۔ اسوۂ نبوت
۷۔ مکتوب نبوی بنام منذر بن ساوی
۸۔ اسلامی تحریک سیرت کی روشنی میں
۹۔ وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین
۱۰۔ ختم نبوت: انسانیت پر عظیم احسان
۱۱۔ کلام نبوت
۱۲۔ نقشۂ عالم اسلام

کتاب تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل ہوگی۔

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

بامقصد زندگی

(جماعت اسلامی ضلع اعظم گڑھ کے ایک اجتماع میں کی گئی تقریر۔ ۱۹۶۳ء)

دوستو! ہم مسلمان ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے بارے میں دعویٰ رکھتے ہیں کہ ہم بامقصد لوگ ہیں۔ کیوں کہ اسلام زندگی کا ایک مقصد ہے۔ مگر میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ بامقصد ہونے کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ ایک مقصدی تصور آپ کے ذہن میں پایا جارہا ہو۔ کچھ تقریروں کو سُن کر یا کچھ تحریروں کو دیکھ کر ایک مقصدی نظریہ کسی کے دماغ میں پہونچ جائے تو صرف اس بنا پر اسکو بامقصد انسان نہیں کہا جاسکتا۔ بامقصد انسان تو وہی ہے جو اپنے پورے وجود کے ساتھ بامقصد بن گیا ہو۔ جس کی زندگی اسکے مقصد میں اس طرح ڈھل جائے کہ دونوں کے درمیان کوئی دوئی باقی نہ رہے۔

آپ اس وقت ایک مسجد میں بیٹھے ہیں جس کے اوپر اونچے اونچے مینار کھڑے ہیں اگر ہوا کے ذریعے کچھ آم کے پتّے اڑ کر آئیں اور ان میناروں پر اٹک جائیں تو اس بنا پر ان میناروں کو آپ آم کا درخت نہیں کہنے لگیں گے۔ آم کا درخت تو وہی ہے جو اپنی جڑ میں بھی آم ہو، اپنے تنہ میں بھی آم ہو، اپنی شاخوں میں بھی آم ہو، اپنے پتّوں میں بھی آم ہو، اور وہ آم ہی کے پھل دے۔ آم کا درخت آپ اسی کو کہتے ہیں جو اس طرح اوپر سے نیچے تک آم ہو۔ محض کسی لمبی کھڑی ہوئی چیز پر آم سے مشابہت رکھنے والی کچھ چیزوں کا اتفاق سے جمع ہو جانا اس کو ہرگز آم نہیں بنا دیتا۔ اسی طرح آپ کو بھی بامقصد انسان کا لقب اسی وقت دیا جاسکتا ہے جب آپ سر سے پاؤں تک اپنے پورے وجود میں بامقصد بن گئے ہوں۔ محض کچھ نظریات کا کہیں سے آکر آپ کے ذہن میں اٹک جانا آپ کو بامقصد نہیں بنا دیتا۔ اسلام زندگی کا ایک مقصد ہے اور ہم اسی وقت مسلمان کہے جانے کے مستحق ہیں جب ہم نے واقعی ایک مقصد کی طرح اسلام کو اپنی زندگی میں شامل کیا ہو۔

بامقصد انسان کی پہچان کیا ہے۔ اس کو درجنوں پیرایہ سے بیان کیا جاسکتا ہے اس وقت میں اسکی چند خصوصیات کا مختصر طور پر ذکر کرونگا۔

۱۔ بامقصد آدمی کی پہلی پہچان وہ ہے جس کو میں "ارتکاز" کے لفظ سے تعبیر کروں گا۔ اس کا
ب یہ ہے کہ آپ کی تمام فکری اور ذہنی قوتیں آپ کے مقصد میں مرکوز ہوجائیں۔ آپ کا
پنا، آپ کا محبت کرنا، آپ کا نفرت کرنا، سب کچھ آپ کے مقصد کے ساتھ وابستہ ہوگئے
ں۔ آپ کی کوئی چیز دوسری سمت بکھری ہوئی نہ ہو۔ جوتا بنانے والوں کے یہاں آپ نے دیکھا
کا کام کرتے کرتے ان کے پاس بہت سی کیلیں پھیل جاتی ہیں۔ اس وقت وہ یہ کرتے ہیں کہ
ناطیس کا ایک ٹکڑا لے کر وہاں پھراتے ہیں جس سے تمام بکھری ہوئی کیلیں کھنچ کھنچ کر اس
سے چمٹ جاتی ہیں۔ اور پھر وہ اٹھاکر اسے خانے میں رکھ لیتے ہیں۔ اس مثال میں اگر مقناطیس
ی جگہ آپ اپنے مقصد کو رکھیں اور کیلوں کے بجائے اپنے افکار و خیالات اور جذبات و
حساسات کا تصور کریں تو زندگی اور مقصد کے درمیان تعلق کو آپ سمجھ سکتے ہیں۔ اس کا مطلب
ہے کہ مقناطیس کے گرد لوہے کے ٹکڑے جس طرح ایک ایک کرکے اکٹھا ہوجاتے ہیں اور
اس پاس کا کوئی ٹکڑا ایسا نہیں ہوتا جو اس سے آکر چمٹ نہ گیا ہو، اسی طرح آدمی کے مقصد
کے گرد اس کے سارے دل اور سارے دماغ کو مرکوز ہوجانا چاہیے۔

یہاں ایک واقعہ مجھے یاد آتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک صاحب میرے یہاں آئے
ان کو بازار کا کچھ کام تھا۔ بازار جاکر جب وہ لوٹے تو انھوں نے ایک واقعہ بتایا جس
سے مجھے بڑی عبرت ہوئی۔ واقعہ بہت چھوٹا سا ہے مگر اس میں ہمارے لئے بڑی نصیحت
ہے، انھوں نے کہا کہ میں ایک جگہ پہونچا جہاں سڑک کے کنارے بہت سے موچی اپنی
اپنی دوکان لئے بیٹھے تھے۔ جب میں انکے پاس سے گذرا تو میں نے دیکھا کہ ان میں سے ہر
شخص میرے جوتے کی طرف دیکھ رہا ہے۔ جس موچی کی نظر اٹھتی ہے وہ بس میرے جوتے
پر آکر رک جاتی ہے۔ میں نے سوچا کہ یہ موچی بھی اپنے مقصد میں کس قدر گم ہیں۔ ان کو انسان
صرف جوتے کی شکل میں نظر آتا ہے بھرے ہوئے بازار میں سینکڑوں انسان ان کے سامنے
سے آتے جاتے ہیں۔ مگر انھیں ان انسانوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ ان کو نظر اٹھاکر دیکھتے بھی
نہیں۔ وہ صرف یہ جانتے ہیں کہ یہ آنے جانے والے لوگ اپنے پاؤں میں ایک ایسی چیز پہنے ہوئے ہیں جس کی پالش
کرکے یا جس کی مرمت کرکے وہ کچھ پیسے حاصل کرسکتے ہیں۔ گویا انسان ان کی نظر میں صرف ایک "جوتا" ہے اور بس۔

اسی طرح بامقصد آدمی اپنے مقصد میں گم رہتا ہے۔ اس کو ہر چیز میں صرف اپنا مقصد
نظر آتا ہے۔ وہ ہر واقعہ کو، ہر مسئلہ کو، ہر بات کو اپنے مقصد کی روشنی میں دیکھتا ہے حتی کہ
وہ اپنے مقصد کے تصور میں اتنا محو ہوجاتا ہے کہ دوسری چیزیں اسے بھولنے لگتی ہیں۔ ایک صاحب
ہیں جو بہت فعال آدمی ہیں جو کام بھی کرتے ہیں اس کو پوری طرح لگ کر کرتے ہیں ایک مرتبہ

میں ایک ایسے زمانے میں ان سے ملنے گیا جب وہ اپنا نیا مکان بنوانے میں معروف تھے۔ میں نے دیکھا کہ ان کے پائجامہ میں ایک جگہ بہت سے لال لال دھبے پڑے ہوئے ہیں۔ پوچھا یہ کیا ہے۔ انھوں نے دیکھ کر کہا ۔ مجھے خود بھی نہیں معلوم۔ اس کے بعد انھوں نے پائجامہ اٹھایا تو معلوم ہوا کہ کسی سخت چیز سے ٹکرانے کی وجہ سے ٹانگ میں ایک جگہ چوٹ لگ گئی ہے۔ چوٹ لگ کر خون بہا، کپڑے میں لگا، پھر خود بخود سوکھ کر بند ہو گیا۔ اور انھیں مطلق خبر نہیں ہوئی۔ جب آدمی کے سامنے کوئی مقصد ہو تو وہ اسی طرح اس میں منہمک ہو جاتا ہے۔ اس وقت وہ ایک اور ہی دنیا میں پہونچ جاتا ہے جہاں دوسری چیزیں اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہیں۔ جہاں دوسری چیزیں اُسے محسوس نہیں ہوتیں۔ حتیٰ کہ خود اپنی ذات کے جسمانی تقاضے بھی بعض اوقات اسے یاد نہیں رہتے۔

یہی وہ بات ہے جس کو میں نے "ارتکاز" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ بامقصد آدمی وہی ہے جس کو اپنے مقصد میں اس درجہ شغف اور انہماک ہو جائے۔ اس کے بغیر اپنے آپ کو بامقصد آدمیوں کی فہرست میں لکھنا، مقصد کے لفظ سے ایک طرح کا مذاق کرنا ہے۔

۲۔ بامقصد آدمی کی دوسری پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے مقصد کے مطابق زندگی گذارتا ہو۔ "مقصد کے مطابق عمل" سے میں ایک خاص چیز مراد لے رہا ہوں جس کو آپ ایک مثال سے سمجھ سکتے ہیں۔ ایک حکیم صاحب ہیں جو ایک دیہات میں دوا علاج کا کام کرتے ہیں وہ کوئی سند یافتہ طبیب نہیں ہیں نہ پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ بس لوگوں کی صحبت اور تجربہ کی وجہ سے کچھ باتیں جان گئے ہیں اور اس کے مطابق کام کر رہے ہیں بلکہ اپنی محنت اور توجہ کی وجہ سے اپنے علاقہ میں اچھے خاصے متعارف بھی ہو گئے ہیں۔ انکے گھر پر کچھ کھیتی باڑی کا کام بھی ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ انھوں نے کہا کہ میں کھیتی کے موٹے کام مثلاً کھودنا، ہل چلانا وغیرہ اپنے ہاتھ سے نہیں کرتا۔ آپ سمجھیں گے، وہ شاید کوئی شیروانی پوش آدمی ہونگے اور اپنی شیروانی کی عزت رکھنے کے لئے ایسے کاموں سے بچتے ہوں گے۔ مگر ان کو "شیروانی" اور "پتلون" کی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ بالکل سیدھے سادے دیہاتی حکیم ہیں۔ کھیتی کے سخت کاموں سے الگ رہنے کی وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ اگر میں اس طرح کے کام کروں تو میرا ہاتھ سخت ہو جائے گا۔ انگلیوں کی کھال موٹی ہو جائے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مریض کی نبض میں ٹھیک طرح سے دیکھ نہ سکوں گا۔ نبض کی ضربیں ہلکی ہوتی ہیں اور ان میں بہت نازک اور لطیف فرق ہوتے ہیں۔ ان کو محسوس کرنے کے لئے انگلیوں کا نرم ہونا بہت ضروری ہے۔ اگر انگلیاں ہل اور کدال پکڑتے پکڑتے سخت ہو جائیں، جیسا کہ اس طرح کا کام کرنے والوں کی ہوتی ہیں، تو وہ نبض کی ضربیں محسوس کرنے کے قابل نہیں رہیں گی۔

ہر مقصد اپنے اختیار کرنے والے سے اسی کا تقاضہ کرتا ہے۔ جو شخص بھی کسی مقصد کو

بنائے، ضروری ہے کہ وہ اپنی عملی زندگی اور اپنی روزانہ کی سرگرمیوں کو اپنے مقصد کے ساتھ ہم آہنگ رکھے۔ وہ دونوں میں کوئی تضاد پیدا نہ ہونے دے۔ بامقصد آدمی ایک باشعور آدمی ہوتا ہے۔ اگر اس کے اندر حقیقۃً ایک مقصد اترا ہوا ہے، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو ایسے عملی حالات اور ایسے مشاغل کی طرف نہ لے جائے جہاں وہ اور اس کا مقصد الگ الگ ہو جائیں۔ جب وہ ویسا بن کر نہ رہ سکے جیسا اپنے مقصد کے اعتبار سے اسے بن کر رہنا چاہئے۔

میں ایک ایسے مسلم خاندان کو جانتا ہوں جس کی آمدنی اتنی تھی کہ وہ معقول طریقہ سے ایک سادہ زندگی گذار رہا تھا اور اسی کے ساتھ دین کے تقاضے بھی پورے کر رہا تھا۔ اس کے بعد اس کے یہاں ایک لڑکی اور ایک لڑکے کی شادی ہوئی۔ ان کے مقصد کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ شادی کو اس طرح کرے کہ اس کی وجہ سے اس کے گھر میں معمول کے مطابق جو زندگی چل رہی ہے اس میں کوئی خلل پیدا نہ ہو۔ مگر اس نے پہلی غلطی یہ کی کہ شادی کے لئے ایک ایسے خاندان کا انتخاب کیا جس کا معیار زندگی اسکے مقابلے میں بڑھا ہوا تھا۔ پھر شادی بھی اس طرح کی جیسے عام دنیا دار لوگ اپنی شادیاں کرتے ہیں۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف اس کے گھر کا سارا سرمایہ شادی میں لگ گیا بلکہ وہ کافی مقروض بھی ہو گیا۔ اس کے پیچھے اس کا سارا کاروبار اجڑ گیا۔ اگر صرف اتنا ہی نقصان ہوا ہوتا جب بھی غنیمت تھا، کیوں کہ جس طرح مختلف قسم کے وقتی حادثے آدمی کے اوپر پڑتے ہیں اور پھر وہ سنبھل جاتا ہے، اسی طرح وہ دوبارہ سنبھل جاتا۔ مگر شادی نے اس کو ایک نئی مصیبت میں ڈال دیا۔ جس کا پہلے اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اپنی لڑکی کو اس نے جو کپڑے اور سامان دیئے اور سسرال سے اس کے لئے جو کپڑے وغیرہ آئے، اس کی وجہ سے شادی شدہ لڑکی کی پوشش اور رہن سہن کا معیار یکایک بہت بڑھ گیا۔ اور جب گھر کی ایک لڑکی کا معیار بڑھا تو اسی کیساتھ دوسروں کا لحاظ کرنا ضروری تھا۔ پھر اسی کے ساتھ نئے نئے فرنیچر سے لدی ہوئی پوری ایک گاڑی بھی اس کے گھر اتری ان چیزوں کے نتیجہ میں اس کی گھریلو زندگی کا معیار بالکل مصنوعی طور پر یکایک بدل گیا۔ اب ہر چیز میں پہلے سے زیادہ خرچ ہونے لگا۔ اس طرح ایک طرف پچھلے قرضوں کی ادائگی اور دوسری طرف بڑھے ہوتے اخراجات کو پورا کرنا، ایسے دو پاٹ بن گئے جن کے نیچے اس کی زندگی پس کر رہ گئی۔ اس کا گھر دیکھتے دیکھتے ایک دیندار گھرانے سے ایک دنیا دار گھرانے میں تبدیل ہو گیا۔

یہ صرف ایک واقعہ نہیں ہے۔ بلکہ میں نے کتنے لوگوں کو دیکھا ہے کہ اسی طرح وہ اپنے دنیوی معاملات میں ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں کہ بالآخر وہ انھیں گھسیٹ کر تباہی کے غار میں پہونچا دیتا

ہے۔ جو شخص کسی مقصد کے لئے دنیا میں جینا چاہتا ہو، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ باشعور زندگی گذارے۔ وہ اپنی سرگرمیوں پر نظر رکھے۔ اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو اس مادی دنیا میں ہر وقت اس کا امکان ہے کہ آدمی ایسے بندھنوں میں اپنے آپ کو پھنسا لے جس کے بعد وہ بہ ظاہر زندہ نظر آتا ہو، مگر مقصد کے اعتبار سے اس نے خودکشی کرلی ہو۔ دنیا کی نمائشی چیزوں میں دل چسپی سامان کی کثرت، سطحی مشاغل میں پڑنا، غیر ضروری عادتوں میں اپنے کو ڈالنا، پست لٹریچر کا مطالعہ ــــ یہ وہ چیزیں ہیں جو آدمی کو مقصد سے دور کر دیتی ہیں، اس کے وقت کو غیر ضروری مشغولیتوں میں لگا دیتی ہیں، اس کے جذبات واحساسات کو مقصد کے بارے میں کمزور کر کے دوسری چیزوں کے بارے میں شدید کر دیتی ہیں۔ اس کو ایسے تعلقات اور ایسے تقاضوں میں الجھا دیتی ہیں کہ وہ نہ چاہنے کے باوجود دوسری طرف کھنچتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ اپنے مقصد سے دور ہو جاتا ہے۔

اگر آپ کو اسلام عزیز ہے اور آپ اس کو اپنا مقصد بنا کر اسی کے لئے جینا اور اسی کے لئے مرنا چاہتے ہیں تو آپ کے لئے لازم ہے کہ اپنی عملی زندگی، اپنے تعلقات اور اپنی روزانہ کی مصروفیتوں کو اس سے ہم آہنگ رکھیں، آپ دونوں میں کوئی تضاد پیدا نہ ہونے دیں۔ اس معاملے میں آپ کو اس ہوشیار طبیب کی طرح بن جانا چاہیے جو اپنی انگلیوں تک کی اس حیثیت سے حفاظت کرتا ہے کہ وہ ایسے حالات سے دوچار نہ ہوں کہ وہ نبض دیکھنے کی صلاحیت کو کھو دیں۔ پھر ایک مسلمان کا مقصد اس سے زیادہ نازک اور اس سے زیادہ مشکل ہے، اس لئے آپ کو اس سے زیادہ ہوشیاری کے ساتھ اپنی حرکات پر نظر رکھنی چاہیے۔

۳۔ تیسری چیز با مقصد آدمی کو پہچاننے کی یہ ہے کہ اس کے عمل میں مقصد کی روح موجود ہو۔ یہاں "عمل" سے میری مراد عام عمل نہیں ہے، بلکہ وہ عمل ہے جو مقصد کے تعلق سے ظاہر ہوتا ہے۔ آپ تعجب نہ کریں۔ مقصد سے متعلق عمل بھی کبھی بے مقصد ہوتا ہے۔ بہ ظاہر آدمی مقصد کا عمل کر رہا ہوتا ہے، مگر حقیقتاً اس کے عمل کا مقصد سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

ایک مثال لیجئے۔ ہمارے یہاں جو مذہبی فرقے ہیں ان کی ابتدا بھی اصلاً ایک مقصدی گروہ کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ وہ ایک مخصوص مشن لے کر اٹھے تھے مگر ہر شخص جانتا ہے کہ آج وہ اپنی مقصدی حیثیت کو کھو چکے ہیں۔ وہ تحریک کے بجائے ایک جامد قسم کی روایتی انجمن بن کر رہ گئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کا مقصدی تصور ان کے ذہن سے نکل گیا، اور نہ ایسا ہے کہ مقصد کے لئے کام کرنا انھوں نے چھوڑ دیا ہے۔ یہ سب چیزیں آج بھی کسی نہ کسی شکل میں ان کے اندر پائی جاتی ہیں۔ مگر ان میں اب وہ اسپرٹ باقی نہیں رہی جو ایک مشن کے علم بردار کے اندر ہوتی ہے

اب ان کا مقصد محض ایک بحث و گفتگو کا موضوع ہے جس پر وہ کبھی آپس میں کبھی دوسروں سے باتیں کر لیتے ہیں۔ ان کے رسالے اور اخبار نکلتے ہیں۔ مگر ان رسالوں اور اخباروں کی حیثیت مقصدی پرچوں سے زیادہ کاروباری اداروں کی ہے۔ ان کے اجتماعات بھی ہوتے ہیں۔ مگر ان اجتماعات کی حیثیت کسی مقصدی سرگرمی کی نہیں۔ بلکہ وہ ماضی کی پڑی ہوئی ایک لکیر ہے جس پر وہ رسمی طور پر چلے جا رہے ہیں۔ ان کے جماعتی فنڈ بھی ہیں جن میں وہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ دیتے ہیں۔ مگر یہ دینا زیادہ تر جماعتی تقاضے کے تحت ہوتا ہے نہ کہ حقیقۃً انفاق فی سبیل اللہ کے جذبے کے تحت۔ وہ اپنے خیالات کو پھیلانے کے لئے دورے اور تقریریں کرتے ہیں۔ مگر یہ سب کسی مقصدی بے تابی کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ بلکہ یا تو محض روایتی ذوق کا اظہار ہوتا ہے یا اسی قسم کے جذبے کے تحت ہوتا ہے جیسے کسی فرم کی پبلسٹی برانچ کا افسر اپنی ڈیوٹی انجام دینے کے لئے کیا کرتا ہے۔ وہ اپنے مخصوص موضوعات پر کتابیں اور پمفلٹ چھاپتے ہیں۔ مگر اس کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی کہ ایک بنے ہوئے حلقہ کی مانگ پوری کر دی جائے۔

وہ عمل جو حقیقۃً داعیانہ جذبے کے تحت نکلتا ہے اور وہ عمل جو روایتی طور پر یا محض ڈیوٹی انجام دینے کے لئے کیا جاتا ہے۔ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ ایک حقیقت ہے اور دوسرا حقیقت کی نقل۔ ایک جگہ بات صرف حلق سے نکلتی ہے اور دوسری صورت میں آدمی جب بولتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے کلام میں اپنی پوری شخصیت کو انڈیل دیا ہے۔ ایک صورت میں آدمی کا عمل صرف ایک لگی بندھی کارروائی نظر آتا ہے، اور دوسری صورت میں اس کا عمل اس کے بے تاب جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک صورت میں آدمی کی تمام زندگی سراپا اس کے مقصد میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے اور دوسری صورت میں بعض مقصد نما اجزاء اس کی غیر متعلق زندگی کے ساتھ اس طرح ادھر اُدھر اٹکے ہوئے ہوتے ہیں جیسے کسی مینار میں آم کے چند پتے۔

یہ خطرہ ہر اس گروہ کو ہے جو ایک مقصد کو لیکر اٹھے اور اس پر اس کو پچیس پچاس سال گذر جائیں۔ لیکن یاد رکھئے کوئی گروہ اسی وقت تک مقصدی گروہ ہے جب تک حقیقۃً وہ مشنری اسپرٹ کے تحت کام کر رہا ہو۔ اس کے بعد جب اس کی گاڑی اس سے اتر کر روایتی ڈگر پر چل پڑے، جب اس کی سرگرمیاں بے تابانہ جذبات کے اظہار کے بجائے مقررہ کارروائی بن کر رہ جائیں، تو وہ تحریک کے بجائے رسم اور جماعت کے بجائے انجمن بن جاتی ہے۔ اس کے بعد بھی اگرچہ شکلاً وہ ایک بامقصد گروہ کے مانند نظر آتا ہے۔ مگر مقصدی حیثیت سے اب اس پر موت وارد ہو چکی ہوتی ہے۔

وہ بامقصد انسان نہیں ہوتا۔ بلکہ سابقہ بامقصد انسان کی لاش ہوتی ہے جو دیکھنے میں سابقہ انسان کی طرح نظر آتی ہے، مگر حقیقتہً انسان نہیں ہوتی۔

اب میں ایک آخری بات کہہ کر اپنی گفتگو کو ختم کروں گا۔ اس طرح کی باتیں جب کہی جاتی ہیں تو بعض لوگ جواب دیتے ہیں —— "آپ کی باتیں تو سب ٹھیک ہیں، ہم خود بھی اپنے اندر یہی چیز پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ چیز کیسے پیدا ہو۔" یہ بظاہر ایک سوال ہے مگر حقیقتہً اس کے ذریعے سے اپنے الزام کو اپنے سے ہٹا کر اسے خارج کے اوپر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر سوچئے کہ وہ خارج جس کے اوپر آپ اپنا الزام ڈالنا چاہتے ہیں وہ کون ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس دنیا کا مالک خدا —— ہے۔ اسی نے ساری چیزوں کو بنایا ہے۔ اس لئے خارج کو الزام دینے کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے یہ دنیا اس ڈھنگ سے بنائی ہے کہ ہم وہاں اپنے ایمانی تقاضوں کو حاصل کرنا چاہیں تو حاصل نہ کرسکیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بالکل غلط بات ہے۔ خدا اس سے پاک ہے کہ اس پر یا اس کی تخلیق پر اس قسم کا الزام عائد ہو سکے۔ اس لئے خارج پر جب الزام ڈالا نہیں جا سکتا تو لامحالہ وہ آپ کی طرف لوٹے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری اپنی ذات کے سوا اور کوئی نہیں ہے جو ہماری ترقی کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے والا ہو۔ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ فطرت اور حقیقت میں تضاد نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ حقیقت ہے کہ ہم کو ایسا ہی بننا چاہئے تو لازماً ہماری فطرت اور کائنات کو ایسا ہونا چاہئے کہ ہم ایسے بن سکیں۔

تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی مہم آپ کو آواز دیتی ہے

وقتی جوش کے تحت بڑی قربانی دینا آسان ہے۔ مگر کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت تسلسل کے ساتھ دی جائیں۔ ہم اسی قسم کی ایک چھوٹی قربانی کے لئے آپ سے اپیل کر رہے ہیں۔

وہ لوگ جو الرسالہ کو ضروری اور مفید سمجھتے ہیں۔ ان سے ہماری درخواست ہے کہ وہ اس کی ایجنسی قبول کر کے اس فکری مہم میں ہماری مدد فرمائیں۔ پانچ پرچہ کی قیمت بعد وضع کمیشن ساڑھے سات روپے ہوتی ہے۔ ہمارا ہر ہمدرد یہ طے کرے کہ وہ پانچ پرچے ہر حال میں منگائے گا۔ اور جب تک خریدار مہیا نہ ہوں لوگوں میں مفت تقسیم کرے گا۔ اور اس وقت تک ساڑھے سات روپے ماہانہ اپنے پاس سے ادا کرتا رہے گا جب تک خریدار نہیں مل جاتے۔

موجودہ حالات میں ایک شخص کے لئے یہ بہت چھوٹی قربانی ہے۔ لیکن اگر ہمارا ہر ہمدرد اس قربانی کو اپنی زندگی میں شامل کرے تو چند سالوں میں انشاء اللہ بہت بڑے نتائج نکل سکتے ہیں۔

یہ غوغائی سیاست

مولانا حمید اللہ ندوی بھوپال

ماہ اکتوبر کے الرسالہ میں کشمیر میں میر سید علی ہمدانی کے کام کی نوعیت کو ایک مثال کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ آپ نے واقعاتی انداز میں دعوت کا کام کرنے والوں کی جو رہنمائی فرمائی ہے، اس طرز پر جب بھی کام ہوا ہے، اسے کامیابی ملی ہے۔

اس کے علاوہ ہمارے سامنے مسلمانوں کی تاریخ میں ایک دوسری عظیم الشان مثال موجود ہے، وہ ہے شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رح کا کام — اکبری گمراہی کو ختم کرنے کے لئے مجدد الف ثانی تاریخ اسلام کا سب سے بڑا میدان کربلا برپا کر سکتے تھے، لاکھوں افراد کو وہ اپنے جوش خطابت کے ذریعہ شہادت کے لئے آمادہ کر سکتے تھے، اور پھر بھی وہ اکبر کے سامنے ممکن ہے اسی طرح ناکام رہتے، جس طرح حضرت حسینؓ یزید کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے۔ مجدد الف ثانی رح نے ہندستان کے ہر طبقہ فکر کے علماء و خواص کو اکٹھا کر کے ایک مشترکہ آزمائش کو ختم کرنے کے لئے کوئی مجلس مشاورت بھی نہیں بنائی، نہ انھوں نے عوام کو ترک موالات پر ابھارا۔

وہ انتہائی دردمندی، خاموشی اور حکمت عملی کے ساتھ اس فتنہ کا انسداد کرنے کے لئے مثبت انداز میں کام کرنے کے وقت اور موقع کے منتظر رہے۔ خود اکبری عہد کو انھوں نے اپنے کام کا آغاز کرنے کے لئے موزوں نہیں پایا تو مرحوم نے قطعاً عجلت نہیں دکھائی، انھوں نے مکمل طور پر اس اصول پر بھی عمل کیا کہ بے وقت کا اقدام ناکامی کا سبب نہ بن جائے۔ انھوں نے جہانگیر کی جانشینی تک انتظار کیا۔ حالاں کہ ان کے لئے یہ انتظار سخت صبر آزما تھا۔ ظاہر ہے کہ جہانگیر اکبر کے نظریات کے سلسلہ میں اتنا حساس نہیں تھا۔ اس عرصہ میں مجدد صاحب رح نے یہ بھی سوچ لیا کہ بادشاہ پر کس طرح اثر انداز ہوا جا سکتا ہے۔ بادشاہ کے ذہن کو بدلنے کے لئے

ایک تجویز

میری ایک تجویز ہے جسے جناب پسند فرمائیں تو شائع بھی کر دیں، وہ یہ کہ الرسالہ کی اشاعت کا ہفتہ منایا جائے اور الرسالہ کے ہمدردوں سے اپیل کی جائے کہ اس ہفتہ اس کام کو ایک مہم کے طور پر کریں اور کم سے کم ہر خریدار، نئے تین خریدار بنائے، زیادہ جتنے بھی بن جائیں۔ یہ کام ایک تحریک کے طور سال میں ایک مرتبہ بھی ہو جائے تو ہر سال اشاعت میں کئی گنا اضافہ ہو سکتا ہے، اور یہ بات چل پڑے تو حیرت انگیز طور پر الرسالہ کی اشاعت پھیل سکتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ایک خاصی تعداد ایسے لوگوں کی ہوگی جو الرسالہ سے ایک تحریک کی طرح وابستہ ہوں گی، جتنے خریدار ہیں، ان کی اگر ایک ثلث تعداد نے بھی اس پر عمل کیا تو ایک مہم میں الرسالہ کی اشاعت دوگنی ہو جایا کرے گی، اور ہر آنے والا سال اشاعت کو سال گزشتہ کے مقابلہ میں دگنا کر دیا کرے گا۔ میں نے طے کیا ہے کہ میں الرسالہ کے لئے اور اس تحریک کے لئے ایسے لوگوں کے ذہن بناؤں جو سماج میں مؤثر حیثیت رکھتے ہوں اور قائم شدہ ایجنسی کے ساتھ تعاون کروں

(حمید اللہ ندوی۔ بھوپال)

یک بڑا لشکر وہ کام نہیں کر سکتا جو کام بادشاہ کے معتمدین کر سکتے ہیں، اس لئے مجدد صاحب کی دانش مندی نے لشکر کی فراہمی میں وقت ضائع نہیں کیا بلکہ وزرائے سلطنت پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی —— مجدد صاحب کے مکتوبات جو وزراء کے نام ہیں انھیں دیکھ کر ہر ایک اندازہ لگا سکتا ہے، کہ کس دل سوزی حکمت عملی اور اپنائیت کے ساتھ مجدد صاحب نے مختلف عمائدین سلطنت کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور انھیں جہانگیر کا ذہن بدلنے کے لئے آمادہ کیا —— ایک موقع مجدد صاحب کی تحریک کے لئے انتہائی آزمائش کا آگیا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ اگر مجدد صاحبؒ کی دانش مندی اور دور اندیشی اس موقع پر خطا کر جاتی تو مجدد صاحب اپنے مشن میں یقیناً فیل ہو چکے ہوتے — یہ نازک وقت وہ تھا جب اصول پر سمجھوتہ نہ کرتے ہوئے مجدد صاحب نے جہانگیر کو سجدۂ تعظیمی نہیں کیا تھا اور اس نے آپ کو جیل بھیج دیا۔ ایسے موقع پر ہمارا آج کا داعی آسانی سے اپنے مریدوں کو ہڑتالوں اور احتجاجات کی راہ پر ڈال دیتا اور نتیجۃً سخت ٹکراؤ کی نوبت آتی اور دعوتی کام کا وہی حشر ہوتا جو آج ہمیں پاکستان کے داعیوں کی جدلی دعوت کا نظر آ رہا ہے — ایسا نہ کرتے ہوئے مجدد صاحب نے صبر و سکون کے ساتھ جیل کی زندگی گزاری اور اپنے مریدین کے جذبات کو قابو میں رکھا، اور اسی کے ساتھ وزرائے سلطنت سے مسلسل رابطہ قائم رکھتے ہوئے اپنے دعوتی کام سے یک لمحہ غافل نہیں ہوئے —— مجدد صاحب کی اس خاموش حکیمانہ اور ہر قسم کی نعرہ بازی سے ہٹی ہوئی مثبت کوششوں کے جو اثرات مرتب ہوئے وہ ہم جانتے ہیں

—— آج بھی یہ سب کچھ ہو سکتا ہے، بشرطیکہ ہم غوغائی سیاست کی چاشنیوں کو ترک کرنے کا اپنے اندر حوصلہ پیدا کر لیں۔

الرسالہ کے شائقین سے گزارش ہے کہ وہ پرچہ بذریعہ وی، پی طلب نہ فرمائیں۔ بلکہ اپنا زرتعاون منی آرڈر کے ذریعہ بھیج دیں یہ طرفین کے لئے سہولت کا باعث ہے۔

جو لوگ سالانہ یا ششماہی زرتعاون بیک وقت ادا نہ کرسکیں، وہ ہر مہینہ دو روپے کا ٹکٹ لفافہ میں رکھ کر بھیج دیں۔ پرچہ انھیں روانہ کردیا جائے گا۔

خریدار حضرات براہ کرم اپنے خطوط میں خریداری نمبر کا حوالہ ضرور تحریر فرمائیں

ضروری اعلان

بینک میں ہمارا اکاؤنٹ "الرسالہ منتھلی" کے نام سے ہے۔ اس لئے بینک سے رقم بھیجتے ہوئے چک یا ڈرافٹ پر الرسالہ منتھلی

AL-RISALA MONTHLY

لکھیں۔ کوئی دوسرا لفظ (مثلاً صرف الرسالہ یا منیجر الرسالہ وغیرہ) نہ لکھیں

حفاظت قرآن

قرآن ۲۳ سال کے عرصہ میں اترا۔ سب سے پہلی آیت جو اتری وہ آیت علم (اقرأ باسم ربك الذی خلق) تھی اور آخری آیت آخرت (اتقوا یوما ترجعون فیه الی الله، بقرہ) ابتدائی ۲۳ سال تک خود رسول اللہ کی ذات قرآن کے اخذ کا ذریعہ تھی۔ اپنے بعد آپ نے کچھ لوگوں کو نامزد کر دیا کہ ان سے تم قرآن سیکھنا۔ یہ لوگ وہ تھے جنھوں نے نہایت صحت کے ساتھ پورے قرآن کو اپنے سینہ میں محفوظ کر لیا تھا اور عربی زبان سے گہری واقفیت اور جناب رسول کی مسلسل صحبت کی وجہ سے اس قابل ہو گئے تھے کہ مستند طور پر قرآن کی تعلیم دے سکیں۔ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق کے زمانے میں ایک شخص کوفہ سے مدینہ آیا۔ گفتگو کے دوران اس نے آپ سے کہا کہ کوفہ میں ایک شخص یاد سے قرآن پڑھاتا ہے۔ یہ سن کر حضرت عمر غضب ناک ہو گئے۔ مگر جب معلوم ہوا کہ وہ بزرگ حضرت عبداللہ بن مسعود ہیں، تو آپ خاموش ہو گئے (استیعاب، جلد ۱، صفحہ ۳۷۷) اس کی وجہ یہی تھی کہ عبداللہ بن مسعود آنحضرت کے اجازت یافتہ تھے۔ آپ کے مجاز قاریوں میں سے چند نمایاں افراد یہ تھے:— عثمان، علی، ابی ابن کعب، زید بن ثابت، ابن مسعود، ابوالدرداء، ابوموسیٰ اشعری، سالم مولی ابی حذیفہ۔

مگر یہ اجازت یافتہ افراد ہمیشہ نہیں رہ سکتے تھے۔ یہ اندیشہ بہر حال تھا کہ کسی وقت ایسے تمام لوگ ختم ہو جائیں اور قرآن دوسرے لوگوں کے ہاتھوں میں جا کر اختلاف کا شکار ہو جائے۔ جنگ یمامہ (۱۲ھ) کے بارہ میں خبر آئی کہ کثرت سے مسلمان قتل ہو گئے ہیں۔ حضرت عمر، خلیفہ اول ابوبکر صدیق کے پاس آئے اور کہا کہ اب قرآن کی حفاظت کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے کہ اس کو تحریری طور پر باضابطہ مدون کر دیا جائے۔ اس موقع پر روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں:

فلما قتل سالم، مولیٰ ابی حذیفة خشی عمر ان یذھب القرآن فجاء الی ابی بکر ـ ـ ـ	جب سالم، مولی ابوحذیفہ قتل ہوئے تو عمر کو خطرہ پیدا ہوا کہ قرآن ضائع نہ ہو جائے، وہ ابوبکر کے پاس آئے،

فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۹

یمامہ کی جنگ میں تقریباً ۷۰۰ صحابہ قتل ہوئے تھے۔ مگر حضرت عمر کو "ذہاب قرآن" کا خطرہ حضرت سالم کی موت کی وجہ سے ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان چند مخصوص صحابہ میں سے تھے جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم قرآن کی اجازت دی تھی۔

جیسا کہ ثابت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے اترتے ہی اس کو فوراً لکھوا دیا کرتے تھے۔ کتابت کا اہتمام اتنا زیادہ تھا کہ سورہ نساء آیت ۹۵ اتر چکی تھی بعد کو غیر اولی الضرر اس میں بطور اضافہ اترا۔ امام مالک کے الفاظ میں یہ "حرف واحد" (در منثور، جلد ۲، صفحہ ۲۰۳) بھی آپ نے اسی وقت کاتب کو بلا کر لکھوایا:

لما نزلت لا یستوی القاعدون من المومنین	جب آیت لا یستوی القاعدون اتری تو رسول اللہ

غیر اولی الضرر والمجاهدون فی سبیل الله، قال النبی صلی الله علیه وسلم ادع لی زیدا ولیجیئ باللوح والقلم والکتف والدواة ثم قال اکتب لا یستوی ... (بخاری)

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زید کو بلاؤ اور وہ تختی اور قلم اور کتف اور دوات لے کر آئیں۔ جب وہ آگئے تو کہا کہ لکھو لا یستوی ---- ۔

آپ کا معمول تھا کہ نازل شدہ آیات کو لکھانے کے بعد اس کو پڑھوا کر سنتے۔ زید بن ثابت کا بیان ہے: فان کان فیه سقط اقامه (مجمع الزوائد، جلد ۱، صفحہ ۶۰) اگر کوئی جزء لکھنے سے چھوٹ جاتا تو اس کو درست کراتے جب یہ سب کام پورا ہو جاتا تب اشاعت عام کا حکم دیا جاتا (ثم اخرج به الی الناس - - -) کاتبان وحی (وہ صحابہ جن سے آپ قرآن کو لکھواتے تھے) ان کی تعداد ۴۲ تک شمار کی گئی ہے۔ (ان ۴۲ کاتبوں کے نام کے لئے ملاحظہ ہو الکتانی کی کتاب التراتیب الاداریہ، جلد ۱، صفحہ ۱۱۶، مطبوعہ مراکش) ابن عبد البر نے عقد الفرید (جلد ۴، صفحہ ۱۱۴) میں لکھا ہے کہ حنظلہ ابن ربیع رض تمام کاتبوں کے "خلیفہ" تھے۔ یعنی ان کو حکم تھا کہ وہ ہر وقت آپ کی صحبت میں موجود رہیں۔ آپ کے اس اہتمام کا نتیجہ یہ تھا کہ جب آپ کی وفات ہوئی تو کثرت سے لوگوں کے پاس قرآن کے اجزاء لکھے ہوئے موجود تھے۔ ایک تعداد ان لوگوں کی تھی جن کے پاس مکمل قرآن اپنی اصل ترتیب کے ساتھ جمع شدہ موجود تھا۔
ان میں سے چار خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

مات النبی ولم یجمع القرآن غیر اربعة: ابو الدرداء ومعاذ بن جبل وزید بن ثابت و ابو زید

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو چار آدمیوں کے پاس مکمل قرآن تحریری طور پر موجود تھا: ابو الدرداء، معاذ بن جبل، زید بن ثابت اور ابو زید

قرآن مکمل طور پر لکھا ہوا عہد نبوت میں موجود تھا۔ البتہ کتابی شکل میں ایک جگہ مجلد نہیں ہوا تھا۔ قسطلانی شارح بخاری کے حوالہ سے الکتانی نے نقل کیا ہے:

قد کان القرآن کله مکتوبا فی عهده صلی الله علیه وسلم لکن غیر مجموع فی موضع واحد
الکتانی، جلد ۲، صفحہ ۳۸۴)

قرآن کل کا کل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی میں لکھا جا چکا تھا۔ البتہ ایک جگہ تمام سورتوں کو جمع نہیں کیا گیا تھا۔

حارث محاسبی نے، جو امام حنبل کے معاصر ہیں، اپنی کتاب فہم السنن میں لکھا ہے:

وکان القرآن فیها منتشرا فجمعها جامع و ربطها بخیط

قرآن کی سورتیں اس میں الگ الگ لکھی ہوئی تھیں۔ ابو بکر کے حکم سے جامع (زید بن ثابت) نے ایک جگہ سب سورتوں کو جمع کیا اور ایک دھاگہ سے سب کی شیرازہ بندی کی

قرآن کی کتابت تین مراحل سے گزری ہے: کتابت، تالیف، جمع۔

پہلے مرحلہ میں کوئی آیت یا سورۃ اترتے ہی اس کو کسی ٹکڑے پر لکھ لیا جاتا تھا، اس سلسلے میں حسب ذیل چیزوں کے نام آئے ہیں:

رقاع	چمڑا
لخاف	پتھر کی سفید پتلی تختیاں (سلیٹ)
کتف	اونٹ کے مونڈھے کی گول ہڈی
عسیب	کھجور کی شاخ کی جڑ کا کشادہ حصہ

دوسرے مرحلہ کے عمل کو حدیث میں تالیف سے تعبیر کیا گیا ہے (کنا عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم نولف القرآن فی الرقاع، مستدرک حاکم) گویا اولاً ہر آیت نازل ہوتے ہی لکھ لی جاتی تھی۔ پھر جب سورہ مکمل ہو جاتی تو پوری سورہ کو مرتب شکل میں رقاع (چمڑے) پر لکھتے تھے۔ اس قسم کے مولفہ قرآن (مکمل یا غیر مکمل) دور نبوت ہی میں کثرت سے لوگوں کے پاس ہو چکے تھے۔ حضرت عمر کے اسلام لانے کے مشہور واقعہ میں ہے کہ بہن کو زدوکوب کرنے کے بعد آپ نے کہا وہ کتاب مجھے دکھاؤ جو ابھی تم پڑھ رہے تھے (اعطنی الصحیفۃ التی سمعتکم تقرؤن آنفا، ابن ہشام)۔ بہن نے جواب دیا: ناپاکی کے ساتھ تم اس کو چھو نہیں سکتے۔ پھر آپ نے غسل کیا اور ان کی بہن نے کتاب انھیں دی (فاغتسل فاعطتہ الصحیفۃ)

تیسرے مرحلہ کے کام کو "جمع" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی پورے قرآن کو ایک جلد میں یکجائی طور پر لکھنا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قرآن مختلف رسالوں اور کتابوں کی شکل میں ہوتا تھا۔ تمام سورتوں کو ایک ہی تقطیع اور سائز کے اوراق پر لکھوا کر ایک ہی جلد میں مجلد کرنے کا طریقہ آپ کے عہد میں رائج نہ تھا۔ بخاری کی ایک روایت کے مطابق صرف چار صحابہ (ابی بن کعب، معاذ بن جبل، ابو زید، زید بن ثابت) تھے جنھوں نے پورے قرآن کو آپ کے عہد میں مجموعی شکل میں تیار کر لیا تھا۔ تاہم ان کی حیثیت نجی مجموعوں کی تھی۔ محمد بن کعب القرظی کے حوالہ سے کنز العمال میں جو روایت ہے، اس کے مطابق ایسے جامعین قرآن کی تعداد پانچ تھی، (جمع القرآن فی زمان النبی صلی اللہ علیہ وسلم خمسۃ من الانصار) حضرت ابوبکر صدیق نے جو کام کیا وہ یہی تھا کہ انھوں نے ریاستی انتظام کے تحت تمام سورتوں کو ایک ہی تقطیع اور سائز پر لکھوا کر مجلد کرا دیا۔ امام مالک شہاب زہری سے اور شہاب زہری عبد اللہ بن عمر کے صاحبزادہ سالم کے حوالے سے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ زید بن ثابت نے القراطیس پر ابوبکر کے حکم سے قرآن کی کل سورتوں کو لکھا تھا۔ بعض محققین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ایک ہی تقطیع کے اوراق جب بنائے جاتے تھے تو ان کو قراطیس کہتے تھے۔ ایک سائز کے اوراق پر لکھے ہونے کی وجہ سے ابوبکر صدیق کی حکومت کے مرتب کردہ اس نسخہ کو ربعہ کہتے تھے (اتقان، جلد ۱، صفحہ ۸۵-۶۰) ربعہ کا ترجمہ چوکھنٹہ کیا جا سکتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان اوراق کا طول و عرض تقریباً مساوی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت عمر فاروق کے زمانہ میں مصر، عراق، شام اور یمن وغیرہ میں قرآن کے ایک لاکھ سے زیادہ نسخے موجود تھے۔

بعد کے زمانے میں لکھا ہوا قرآن ہی لوگوں کے لیے قرآن کو سیکھنے کا ذریعہ بن سکتا تھا، تاہم ایک خطرہ اب بھی تھا۔ مقدس کتاب میں انتہائی معمولی فرق بھی زبردست اختلاف کا سبب بن جاتا ہے۔ اس لیے یہ اندیشہ تھا کہ مختلف لوگ اگر اپنے اپنے طور پر قرآن لکھیں تو کتابت اور قرأت کا فرق مسلمانوں کے اندر زبردست اختلاف کھڑا کر دے گا اور اس کو ختم کرنے کی کوئی سبیل باقی نہ رہے گی۔ مثلاً سورہ فاتحہ میں ایک ہی لفظ کو محض ادائگی کے فرق سے کوئی مالک یوم الدین لکھتا، کوئی ملک یوم الدین اور کوئی ملیک یوم الدین۔ پھر جیسے جیسے زمانہ گزرتا، طرز تحریر اور رسم الخط کا فرق نئے نئے اختلاف پیدا کرتا چلا جاتا۔ اس لئے حضرت عمر کے مشورہ سے خلیفہ اول حضرت ابو بکر نے طے کیا کہ سرکاری اہتمام میں قرآن کا ایک مستند نسخہ لکھوا دیا جائے اور اختلاف قرأت کے امکان کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے۔

اس کے لئے زید بن ثابت سب سے زیادہ موزوں شخص تھے، کیونکہ وہ رسول اللہ کے کاتب (سکریٹری) تھے۔ زید اور ابی بن کعب دونوں "عرضۂ اخیرہ" میں شامل تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست پورے قرآن کو نبوی ترتیب کے ساتھ سنا تھا۔ ان کو پورا قرآن مکمل طور پر یاد تھا اور اس کے ساتھ پورا قرآن مرتب طور پر لکھا ہوا بھی ان کے پاس موجود تھا۔ خلیفۂ اول نے ان کو حکم دیا کہ تم قرآن کا تتبع کرو اور اس کو جمع کر دو (فتتبع القرآن فاجمعه، بخاری) اس بات کے طے ہونے کے بعد حضرت عمر نے مسجد میں اعلان کر دیا کہ جس کے پاس قرآن کا کوئی ٹکڑا موجود ہو، وہ لے آئے اور زید کے سامنے پیش کرے۔

خلیفہ اول کے زمانہ میں قرآن "کاغذ"، یعنی چمڑے، پتھر اور کھجور کی چھال وغیرہ پر لکھا ہوا تو موجود تھا اور بہت سے لوگوں کے سینوں میں، رسول اللہ سے سن کر، مرتب طور پر بھی محفوظ تھا۔ مگر وہ ایک کتاب کی طرح بین الدفتین اب تک جمع نہیں ہوا تھا۔ خلیفہ اول نے حکم دیا کہ اس کو بین الدفتین جمع کر دو اور اس کو ایک مجلد کتاب کی صورت میں یکجا کر دو:

وقال الحارث المحاسبی فی کتاب فہم السنن: کتابة القرآن لیست بمحدثة، فانه صلی اللہ علیه وسلم کان یامر بکتابته ولکنه کان مفرقا فی الرقاع والاکتاف والعسب فانما امر الصدیق بنسخها من مکان الی مکان مجتمعا وکان ذلك بمنزلة اوراق وجدت فی بیت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فیها منتشر فجمعها جامع وربط بخیط حتی لا یضیع منها شئ

الاتقان، جلد ۱، صفحہ ۴۰

حارث محاسبی فہم السنن میں لکھتے ہیں کہ قرآن کی کتابت کوئی نئی بات نہ تھی، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کو لکھوایا کرتے تھے۔ مگر وہ رقاع اور اکتاف اور عسیب میں متفرق طور پر لکھا ہوا تھا۔ ابو بکر صدیق نے اس کو مرتب طور پر یکجا لکھنے کا حکم دیا۔ اور یہ بمنزلہ ان اوراق کے تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں پائے گئے تھے۔ ان میں قرآن منتشر طور پر لکھا ہوا تھا۔ اسی کو جمع کرنے والے نے جمع کر دیا اور ایک دھاگے میں اس طرح پرو دیا کہ اس کا کوئی حصہ ضائع نہ ہو۔

عہد صدیقی میں جمع قرآن کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس سے پہلے قرآن "منتشر" تھا اور آپ کے زمانہ خلافت میں اس کو جمع کیا گیا۔ قرآن اس سے پہلے بھی مکمل طور پر جمع تھا۔ "عرضۂ اخیرہ" میں متعدد صحابہ کو شامل کرکے آپ نے اس کی تصدیق و توثیق بھی فرما دی تھی۔ جمع قرآن کا یہ اہتمام صرف اس لئے ہوا کہ معمولی امکانی فرق کو بھی باقی نہ رہنے دیا جائے جو حافظہ یا کتابت میں فرق کی وجہ سے ہو سکتے تھے۔ مثال کے طور پر حضرت عمرؓ نے زید بن ثابت کو یہ آیت سنائی:

من المهاجرين والانصار الذين اتبعوهم باحسان (توبہ ۱۰۰)

زید نے کہا مجھے تو یہ آیت جس طرح یاد ہے، اس میں انصار اور الذین کے درمیان ایک "واو" بھی ہے۔ چنانچہ تحقیق شروع ہوئی بالآخر مختلف لوگوں کی گواہیوں سے ثابت ہوا کہ زید کی رائے صحیح تھی۔ چنانچہ مصحف میں آیت کو واؤ کے ساتھ لکھا گیا۔

مولانا بحر العلوم شرح سلم میں لکھتے ہیں "قرآن کی یہ ترتیب جس پر وہ آج ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ اس لئے کہ ان دس قاریوں نے جن کی قرأت اسلامی دنیا میں بالاتفاق مقبول ہے، ایسی سندوں سے جس پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے، قرآن کو اسی ترتیب سے نقل کیا۔

زید بن ثابت نے جب پورا قرآن مرتب کر لیا تو ان کے مصحف کے علاوہ جتنے مختلف اجزاء اکٹھا ہوئے تھے، ان سب کو جلا کر ختم کر دیا گیا۔ یہ مجلد مصحف خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق کے پاس رکھ دیا گیا۔ آپ کی وفات کے بعد وہ خلیفہ ثانی حضرت عمر کے پاس رہا۔ پھر آپ کی وفات کے بعد وہ حفصہ بنت عمرؓ کے پاس محفوظ رہا۔

حضرت عثمان کی خلافت کا زمانہ آیا تو اسلام بہت پھیل چکا تھا اور مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ اس وقت مختلف علاقوں کے مسلمانوں کے لئے قرآن سیکھنے کا ذریعہ وہ صحابہ تھے جو مدینہ سے نکل کر ممالک اسلامیہ میں ہر طرف پھیل گئے تھے۔ مثلاً اہل شام ابی بن کعب سے قرآن سیکھتے تھے۔ اہل کوفہ عبداللہ بن مسعود سے اور اہل عراق ابوموسیٰ اشعری سے۔ تاہم اختلاف لہجہ اور اختلاف کتابت کی وجہ سے دوبارہ لوگوں میں قرآن کے بارے میں اختلافات ہونے لگے حتیٰ کہ ایک دوسرے کو کافر کہنے لگے (کفر بعضهم بعضا، تبیان الجزائری)۔ ابن ابی داؤد نے کتاب المصاحف میں یزید بن معاویہ نخعی سے نقل کیا ہے کہ ولید بن عقبہ کے زمانہ میں ایک بار وہ کوفہ کی مسجد میں تھے۔ حذیفہ بن الیمان بھی اس وقت مسجد میں موجود تھے۔ مسجد میں ایک حلقہ قرآن کے ذکر میں مشغول تھا۔ ایک شخص نے کوئی آیت پڑھی اور کہا: قرأۃ عبداللہ بن مسعود۔ دوسرے نے اسی آیت کو کسی اور ڈھنگ سے پڑھا اور کہا قرأۃ ابی موسیٰ الاشعری۔ حضرت حذیفہ یہ سن کر غضب ناک ہو گئے۔ انھوں نے کھڑے ہو کر ایک مختصر تقریر کی اور فرمایا:

هكذا كان من قبلكم اختلفوا، والله لاركبن الى امير المؤمنين

تم سے پہلے جو لوگ تھے، انھوں نے اسی طرح اختلاف کیا۔ خدا کی قسم میں سوار ہو کر امیر المومنین (عثمان) کے پاس جاؤں گا۔

عمارہ بن غزیہ کی روایت کے مطابق حذیفہ بن الیمان واپس آئے۔ وہ ایک فوجی افسر تھے اور اس وقت آرمینیہ میں

اہل شام سے اور آذربائیجان میں اہل عراق سے جنگ کر کے لوٹے تھے۔ وہ مدینہ پہنچے تو اپنے مکان جانے کے بجائے سیدھے خلیفہ ثالث کے پاس آئے اور کہا:

یا امیر المومنین ادرك هذه الامة قبل ان یختلفوا فی الکتاب اختلاف الیهود والنصاریٰ

اے امیر المومنین لوگوں کو سنبھالئے، قبل اس کے کہ لوگ کتاب اللہ کے بارے میں اختلاف میں پڑ جائیں جس طرح یہود و نصاریٰ اختلاف میں پڑ گئے

حضرت عثمان کے زمانہ میں ایسی آبادیاں اسلام میں داخل ہوگئیں جن کی مادری زبان عربی نہ تھی۔ عربی الفاظ و حروف کے صحیح تلفظ کی قدرت ظاہر ہے ان میں نہیں ہو سکتی تھی۔ خود عرب کے مختلف قبائل کے لہجے الگ الگ تھے۔ اس سے قرأت قرآن میں اختلاف پیدا ہوا۔ نتیجۃً نقل و تحریر میں بھی اختلاف شروع ہو گیا۔ ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ قبیلہ بنی ہذیل حتیٰ کو عتیٰ پڑھتا تھا۔ ابن مسعود اسی قبیلہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے حتیٰ حین کو عتیٰ عین پڑھتے تھے۔ قبیلہ بنو اسد تعلمون کی ت کو زیر کے ساتھ (تِعلمون) پڑھتا تھا۔ مدینہ کے لوگ تابوت کا تلفظ تابوہ کرتے تھے۔ قبیلہ قیس ک تانیث کا تلفظ ش سے کرتے تھے اور قرآنی آیت کو قد جعل ربش تحتش سریا پڑھتے۔ اسی طرح قبیلہ تمیم ان کے لفظ کو عن کی شکل میں ادا کرتے تھے اور عسی اللہ عن یاتی بالفتح پڑھتے تھے۔ ایک قبیلہ س کو ت کی شکل میں ادا کرتا تھا اور اعوذ برب الناس ملك الناس الٰہ الناس پڑھتا تھا وغیرہ۔ ان حالات میں حذیفہ بن یمان صحابی کے مشورہ سے حضرت عثمان نے صدیقی نسخہ کی نقلیں تیار کرائیں اور تمام شہروں میں اس کا ایک ایک نسخہ بھیج دیا۔ یہ کام دوبارہ حضرت زید بن ثابت انصاری کی سرکردگی میں کرایا گیا اور ان کی مدد کے لئے گیارہ افراد مقرر کئے گئے۔ خلیفہ سوم کے حکم کے مطابق اس کمیٹی نے قرآن کو قریش کے لہجہ پر تحریر کیا جو کہ پیغمبر اسلام کا لہجہ تھا۔ اس کے بعد آپ نے حکم دیا کہ دوسرے نسخے جو لوگوں نے بطور خود لکھے ہیں وہ ان کو حکومت کے حوالے کر دیں۔ چنانچہ ان کو جمع کر کے نذر آتش کر دیا گیا۔

اس طرح قرآن کو لکھاوٹ یعنی نوشت و کتابت کی حد تک ایک بنا دیا گیا۔ تاہم فطری اختلاف کی وجہ سے سارے لوگ ایک طرح قرآن کو پڑھنے پر قادر نہ ہو سکتے تھے۔ اس لئے لوگوں کو آزادی دے دی گئی کہ "سات" طریقوں یعنی متعدد لب و لہجہ میں پڑھ سکتے ہیں۔ صدیق اکبر کا جمع قرآن آنحضرت ؐ کی وفات کے ایک سال بعد انجام پایا تھا، عثمانی مصحف کی ترتیب آپ ؐ کی وفات کے پندرہ سال بعد ہوئی۔

تیسری صدی کے مشہور صوفی اور عالم حارث محاسبی کا قول اتقان میں سیوطی نے نقل کیا ہے:

المشهور عند الناس ان جامع القرآن عثمان ولیس کذلك انما حمل عثمان الناس علی القراة بوجه واحد

لوگوں میں مشہور ہے کہ حضرت عثمان جامع قرآن ہیں، حالاں کہ یہ صحیح نہیں۔ انھوں نے صرف یہ کیا کہ لوگوں کو قرآن کی ایک قرأت پر جمع کر دیا۔

بعض لوگوں نے تفنن طبع یا عناد کے طور پر اس قسم کی باتیں مشہور کیں کہ حضرت عثمان نے قرآن میں تحریفات کر ڈالیں۔ مثلاً قرآنی آیت تقفوهم انهم مسئولون (صافات) کے آخر میں عن ولایة علی کے الفاظ تھے، جنھیں عہد

عثمانی میں بالقصد قرآن سے خارج کر دیا گیا۔ حتیٰ کہ کچھ لوگوں نے یہ مضحکہ خیز بات مشہور کی کہ "ولایت" کے نام سے ایک مستقل سورہ قرآن میں تھی جس میں اہل بیت کے اسماء اور ان کے حقوق وغیرہ کا تفصیلی ذکر تھا۔ اس کو قرآن سے نکال دیا گیا۔ اس قسم کی باتیں قطعاً بے بنیاد ہیں۔ ان علینا جمعہ (قیامۃ) شیعہ وسنی دونوں کے نزدیک بالاتفاق قرآن کی آیت ہے۔ پھر قرآن کو خدا کی کتاب مانتے ہوئے کیسے کوئی شخص اس قسم کی بے بنیاد باتوں کو مان سکتا ہے۔ مشہور شیعی عالم علامہ طبرسی نے لکھا ہے:

الزیادۃ فی القرآن مجمع علیہ بطلانہا، واما النقصان فقد روی عن قوم من اصحابنا وعن قوم من حشویۃ العامۃ، والصحیح خلاف ذلک

قرآن میں اضافہ (شیعہ وسنی دونوں کے) اجماع سے غلط ہے۔ باقی کمی تو بعض شیعوں سے اور عامہ کے حشویہ (یعنی اہل سنت کے محدثین) سے اس کا دعویٰ منقول ہے۔ مگر صحیح یہ ہے کہ یہ بھی غلط ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کبھی بھی محققین نے اس قسم کے دعوے نہیں کئے۔ یہ موقع پرستوں کے شوشے تھے جو انھوں نے سیاسی مقصد کے لئے وضع کئے۔ اہل بیت کی فضیلت کی ساری موضوعات اس لئے گھڑی گئیں تاکہ ان کے لئے خلافت کا استحقاق ثابت ہو جائے۔ مثلاً ایک غیر معروف شخص محمد بن جہم الہلالی تھے۔ انھوں نے امام جعفر صادق کی طرف منسوب کر کے یہ مشہور کیا کہ قرآنی آیت امۃ ھی اربی من امۃ (نحل) میں تحریف کی گئی ہے۔ اصل الفاظ تھے ائمتنا ھی ازکیٰ من ائمتکم (تفسیر روح المعانی مقدمہ) یعنی ہمارے بنی ہاشم کے ائمہ و حکمران بنی امیہ کے حکمرانوں سے بہتر ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا حضرت عثمان نے ۲۵ھ میں حفصہ بنت عمر کے پاس سے مصحف صدیقی منگوایا۔ اس وقت قرآن کے کاتب اول زید بن ثابت انصاری موجود تھے۔ ان کی رہنمائی میں آپ نے بارہ آدمیوں کی جماعت مقرر کی۔ انھوں نے صدیقی نسخہ کی بنیاد پر قرآن کی سات نقلیں تیار کیں۔ پھر یہ نسخے تمام اسلامی ملکوں میں بھیج دیئے گئے۔ حضرت عثمان نے حکم دیا کہ اس کے سوا جتنے مصاحف لوگوں نے بطور خود لکھ لئے ہیں وہ سب جلا دیئے جائیں۔ ایک نسخہ انھوں نے دارالسلطنت مدینہ میں رکھا اور اس کا نام "الامام" رکھا اور بقیہ ہر گوشہ مملکت میں بھیج دیا۔ مکہ، شام، یمن، بحرین، بصرہ، کوفہ میں سے ہر جگہ ایک ایک نسخہ بھیجا۔

یہ مصحف بعد کی صدیوں میں انتہائی صحت کے ساتھ نسل در نسل منتقل ہوتا رہا یہاں تک کہ وہ دور پریس میں پہنچ گیا جس کے بعد کسی ضیاع یا تغیر کا کوئی سوال نہیں۔ اس ابتدائی نسخہ کے ساتھ بعد کے نسخوں کی مطابقت کا کتنا زیادہ اہتمام کیا گیا ہے، اس کی دو چھوٹی سی مثال لیجئے۔ سورہ مومنوں کی آیت ۱۰۸ میں قال (الف کے ساتھ) لکھا ہوا ہے یہی لفظ اسی سورہ کی اگلی آیت ۱۱۲ میں قل (بغیر الف) لکھا گیا ہے۔ گویا ابتدائی مصحف میں جو لفظ جس شکل میں لکھا ہوا تھا ٹھیک اسی طرح اس کو لکھا جاتا رہا۔ خواہ ایک ہی لفظ، دو جگہ دو املا کے ساتھ کیوں نہ ہو۔ اسی طرح سورہ قیامہ کی آیت "وقیل من" کے بعد قاری تھوڑی دیر وقفہ کے لئے ٹھہرتا ہے۔ پھر "راق" پڑھتا ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ روایات کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر ہلکا وقف کیا تھا۔ قرآن میں اسی طرح کے دوسرے متعدد

مقامات ہیں، مگر کبھی قرآن پڑھنے والوں کو یہ خیال نہیں ہوا کہ بطور خود دوسرے مقامات پر بھی اسی طرح وقفہ دے کر پڑھنا شروع کر دیں۔

آج جو قرآن مسلمانوں کے درمیان رائج ہے، اس کی صحت میں کسی فرقہ کا کوئی اختلاف نہیں۔ حتیٰ کہ محقق شیعہ علماء بھی اس معاملہ میں متفق ہیں۔ کتاب تاریخ القرآن لابی عبد اللہ الزنجانی شیعی (صفحہ ۴۴) میں نقل کیا ہے کہ علی بن موسیٰ المعروف بابن طاؤس (۶۶۴ — ۵۸۹ھ) جو محقق شیعہ علماء میں سے ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب سعد السعود میں شہرستانی سے نقل کیا ہے جو انھوں نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں سوید بن علقمہ سے روایت کیا ہے:

قال سمعت علی بن ابی طالب یقول: ایها الناس، اللہ اللہ، ایاکم والغلو فی امر عثمان وقولکم حراق المصاحف۔ فواللہ ما حرقها الا عن ملأ من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعنا وقال: ما تقولون فی ھذہ القرأۃ التی اختلف الناس فیها، یلقی الرجل الرجل فیقول: قرأتی خیر من قرأتک، وھذا یجر الی الکفر، فقلنا ما الرای، قال ارید ان اجمع الناس علی مصحف واحد، فانکم ان اختلفتم الیوم کان من بعدکم اشد اختلافا، فقلنا نعم ما رأیت

وہ کہتے ہیں: میں نے حضرت علی بن ابی طالب کو یہ کہتے ہوئے سنا۔ اے لوگو، اللہ اللہ، عثمان کے معاملہ میں غلو سے بچو۔ یہ نہ کہو کہ انھوں نے مصاحف کو جلایا۔ خدا کی قسم انھوں نے نہیں جلایا مگر اس وقت کہ انھوں نے صحابہ کی جماعت کو اکٹھا کیا اور پوچھا کہ تم قرآن میں اختلاف قرأت کے بارہ میں کیا کہتے ہو۔ ایک شخص دوسرے سے ملتا ہے اور کہتا ہے۔ میری قرأت تمھاری قرأت سے بہتر ہے۔ اس قسم کی بات کفر تک جاتی ہے۔ صحابہ نے کہا آپ کی کیا رائے ہے۔ انھوں نے کہا میں چاہتا ہوں کہ میں لوگوں کو ایک مصحف پر جمع کر دوں۔ کیوں کہ تم اگر آج اختلاف میں پڑ گئے تو تمھارے بعد کے لوگ اور زیادہ اختلاف میں پڑیں گے۔ تمام صحابہ نے کہا ہاں آپ کی رائے سے ہم کو اتفاق ہے۔

قرآن کا یہ ایسا وصف ہے جس کا معاندین تک نے اعتراف کیا ہے۔ سر ولیم میور لکھتے ہیں:

"محمد کی وفات کے ربع صدی بعد ہی ایسے مناقشات اور فرقہ بندیاں ہوگئیں جس کے نتیجہ میں عثمان قتل کر دیے گئے، اور یہ اختلافات آج بھی باقی ہیں۔ مگر ان سب فرقوں کا قرآن ایک ہی ہے۔ ہر زمانہ میں یکساں طور پر سب فرقوں کا ایک ہی قرآن پڑھنا، اس بات کا ناقابل تردید ثبوت ہے کہ آج ہمارے سامنے وہی مصحف ہے جو اس بدقسمت خلیفہ (عثمان) کے حکم سے تیار کیا گیا تھا، شاید پوری دنیا میں کوئی دوسری ایسی کتاب نہیں ہے جس کی عبارت بارہ صدیوں تک اس طرح بغیر تبدیلی کے باقی ہو" لائف آف محمد (1912) دیباچہ

لین پول نے اس حقیقت کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے:

"قرآن کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی اصلیت میں کوئی شبہ نہیں۔ ہر حرف جو ہم آج پڑھتے ہیں، اس پر یہ اعتماد کر سکتے ہیں کہ تقریباً تیرہ صدیوں سے غیر مبدل رہا ہے (سلکشن فرام دی قرآن)

بن محقق وان ہیم غیر مسلم مستشرقین کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہم قرآن کو محمد کا کلام اسی طرح یقین کرتے ہیں جس طرح مسلمان اس کو خدا کا کلام یقین کرتے ہیں"

اعجاز التنزیل صفحہ ۵۰

عہد عثمانی تک قرآن کے جتنے نسخے لکھے گئے وہ سب خط حیری میں تھے۔ حضرت علی کے زمانہ میں خط کی اصلاح ہوئی رخط کوفی وجود میں آیا جو سابق خط کی ترقی یافتہ شکل تھا۔ حضرت علی کے ندیم خاص ابوالاسود الدولی (۶۹ھ) ، پہلی بار اس خط کو بنایا اور پھر بنی امیہ کے عہد میں اس کو مزید ترقی ہوئی۔ قرآن میں اعراب لگانے کا آغاز بھی ،الاسود دولی نے حضرت علی کے عہد میں کیا۔ اسی کی بنیاد پر حجاج بن یوسف نے بعد کو قرآن کے باقاعدہ معرب نسخے تیار کرائے۔ آج تک قرآن ٹھیک اسی نہج پر لکھا جارہا ہے۔

عرب کا ریگستان: پٹرول سے بھی زیادہ بڑی دولت

سورج کی گرمی کو قابو میں لاکر اس کو استعمال ہا جاسکتا ہے، یہ بات انسان کو بہت عرصہ سے معلوم ی۔ مگر اس صنعت کو ترقی دینے میں ایک خاص رکاوٹ نضاد تھا کہ وہ ممالک جو آفتابی حرارت کی زیادہ مقدار رکھتے ہیں وہ سب سے کم ترقی یافتہ تھے۔ وہ نے ذرائع نہیں رکھتے تھے کہ اس صنعت کو ترقی دینے ی قیمت ادا کر سکیں۔ دوسری طرف وہ قومیں جو ترقی فتہ ہیں اور وسائل کی مالک ہیں وہ اکثر سرد ممالک ں اور زمین کے منطقہ حارہ سے دور واقع ہیں۔ مگر ب صورت حال بدل گئی ہے۔ عرب ممالک جو گرم صحراؤں ے مالک ہیں، پٹرول نے ان کو دولت سے بھی مالا مال کر دیا ہے۔

سعودی عرب ایک بڑے سرمایہ کی لاگت سے انرجی (طاقت) کے متبادل ذریعہ کی تلاش کر رہا ہے۔ سعودی عرب اس حقیقت سے واقف ہے کہ تیل کا ذخیرہ لامحدود نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے اس سلسلے میں بڑے پیمانہ پر تحقیقات شروع کر دی ہیں

اس صحرائی ریاست کو ہر سال ۲۵۰۰ سے لے کر ۴۰۰۰ گھنٹے تک گرم سورج حاصل رہتا ہے۔ اس طرح جو گرمی اس کو ملتی ہے اس کا اوسط روزانہ تقریباً ۵۵۰ کیلوریز فی مربع سنٹی میٹر (550 cals/cm^2/day) ہے۔ سعودی عرب کا سورج، طور پر اس کے لئے تیل سے بھی زیادہ بڑی دولت ہے۔ سعودی عرب کا خیال ہے کہ ۲۰۰۰ تک وہ آفتابی انرجی کے معاملہ میں خود کفیل ہو جائے گا۔ یہ انرجی مختلف کاموں میں استعمال ہوگی۔ مثلاً سمندر کے پانی کو میٹھا بنانا ع پینے کے لئے اور زراعت کے لئے استعمال ہو اور بجلی کی ضرورت پوری کرنے کے لئے۔ اس وقت سعودی عرب میں چار بڑے انرجی پروجیکٹ تکمیل کے مرحلہ میں ہیں۔

سائنس ٹوڈے، اکتوبر ۱۹۷۸ء

الرسالہ اگر آپ کو پسند ہے

تو آپ پر اس کا پہلا حق ہے کہ

آپ فوراً اپنا زرِ تعاون بھیج کر

اس کے معاونین کی برادری میں باقاعدہ شامل ہو جائیں۔

مکتبہ الرسالہ کی کتابیں

آپ

دہلی کے کسی بھی مکتبہ سے

حاصل کر سکتے ہیں

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶

اسلام کے خلاف جدید شبہات کو ڈھادینے والی کتاب

مذہب اور جدید چیلنج

"علم جدید کا چیلنج" مولانا وحید الدین خاں کی مشہور کتاب ہے۔ "مذہب اور جدید چیلنج" اسی کا نظر ثانی کیا ہوا ایڈیشن ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۶۶ میں اردو میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد عربی اور ترکی زبانوں میں اس کے درجن سے اوپر ایڈیشن شائع ہوئے۔ تمام عالم اسلام میں اس کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ۱۷ فروری ۱۹۷۶ کو مولانا وحید الدین خاں طرابلس میں صدر قذافی سے ملے تو لیبی لیڈر نے فوراً کہا: لقد قرأت کتابك الاسلام یتحدیٰ (میں نے آپ کی کتاب الاسلام یتحدیٰ پڑھ لی ہے)۔

الامام الاکبر ڈاکٹر عبد الحلیم محمود (جامعہ ازہر قاہرہ) نومبر ۱۹۷۵ میں ہندستان آئے انھوں نے جامعہ ڈابھیل سورت میں تقریر کرتے ہوئے علماء سے کہا کہ آپ لوگ الاسلام یتحدیٰ کا مطالعہ کیجیے۔ جس میں اسلام کے خلاف جدید شبہات کا کافی وشافی رد موجود ہے۔

قاہرہ کے روزنامہ الاہرام نے اس کتاب کے عربی ایڈیشن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

"مصنف کتاب نے اسلام کے مطالعہ کا ایک ایسا علمی انداز اختیار کیا ہے جو بالکل نیا اور انوکھا ہے۔ جدید مادی فکر کے مقابلہ میں دین کو وہ اسی طرز استدلال سے ثابت کرتے ہیں جس سے منکرین مذہب اپنے نظریات کو ثابت کرتے ہیں۔۔۔ اسلام کے ظہور سے لے کر اب تک چودہ سو سالوں میں اسلام پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اگر تاریخ کو چھانا جائے اور اللہ کی طرف بلانے والی عمدہ کتابوں کو چھلنی سے چھان کر نکالا جائے تو کتاب الاسلام یتحدیٰ بلاشک وشبہ ان میں سے ایک ہوگی۔ ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ مصنف کتاب کے عمل کو قبول فرمائے۔ ان کے دل کو نور سے، ان کی عقل کو معرفت سے اور ان کی روح کو رضا سے بھر دے اور ان کے قلم کو ایسی روشنائی عطا کرے جو لکھنے سے کبھی ختم نہ ہو۔"

قیمت: تیرہ روپے پچاس پیسے

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

تعمیر ملت

از

مولانا وحید الدین خاں

اشاعتِ اول ۱۹۷۹
قیمت دو روپے

ناشر مکتبہ الرسالہ
جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی

طابع جے۔کے آفسٹ پرنٹرز دہلی ۶

دوسروں کو
اپنی بربادی کا
ذمہ دار قرار دینا
صرف اس بات کا
ثبوت ہے کہ
آدمی اپنے
امکانات سے
باخبر نہ ہوسکا

قدرت کا سبق

گیس نیچے نہیں سماتی تو اوپر اٹھ کر اپنے لئے جگہ حاصل کر لیتی ہے۔ پانی کو اونچائی آگے بڑھنے نہیں دیتی تو وہ نشیب کی طرف بہہ کر اپنا راستہ بنا لیتا ہے۔ درخت سطح کے اوپر قائم نہیں ہو سکتا تو وہ زمین پھاڑ کر اس سے اپنے لئے زندگی کا حق وصول کرتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

راقم الحروف کو ایک بار ایک مسلم ادارہ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے اپنا قائم کیا ہوا "صنعتی مدرسہ" دکھایا جو ان کے وسیع مکان کے ایک حصہ میں واقع تھا۔ اس مدرسہ میں مسلم لڑکیوں کو کپڑے کی کڑھائی کا کام سکھایا جاتا تھا۔ پھر وہ مجھے ایک کمرے میں لے گئے۔ یہاں بڑی تعداد میں میز پوش رکھے ہوئے تھے جو پچھلے کئی سالوں میں لڑکیوں نے بنائے تھے۔ "دیکھئے کتنے اچھے ہیں یہ میز پوش" انھوں نے پھول دار ٹکڑوں کو دکھاتے ہوئے کہا "یہ ہماری لڑکیوں نے تیار کئے ہیں۔ مگر یہاں مقامی طور پر ان کا کوئی مارکٹ نہیں۔ آپ ان کو دہلی میں فروخت کرا دیں تو ہم اس کے پیسہ کو مدرسہ میں لگائیں اور اس کو مزید ترقی دیں"

یہ سادہ سا واقعہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے مسئلہ کو بہت خوبی کے ساتھ ممثل کر رہا ہے۔ ہم "سن مائیکا" کے دور میں "میز پوش" کی تجارت کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں زمانہ کے جدید حالات کی خبر نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا وجود آج کے زمانہ میں ایک قسم کی قدیم اشیاء کی دکان (Old Curiosity Shop) بن کر رہ گیا ہے جس کو وقتی طور پر خواہ کچھ خاص مزاج کے خریدار مل جائیں۔ مگر جدید دنیا میں اس کو کوئی غالب حیثیت حاصل نہیں ہو سکتی —— ایک ایسے زمانہ میں جب کہ قومیں لیاقت اور امتیاز کے بل پر اپنی جگہ بنا رہی ہیں ہم مراعات اور ریزرویشن کا مطالبہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ جب کہ دوسرے لوگ سائنٹفک اسلوب میں اپنے "دین" کو پیش کر رہے ہیں، ہم شاعرانہ اور خطیبانہ اسلوب کا کمال دکھا رہے ہیں۔ جب کہ لوگ پر امن تدابیر کے ذریعہ اپنی جڑیں مستحکم کر رہے ہیں، ہم توڑ پھوڑ اور ایجی ٹیشن میں مصروف ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس سے معجزاتی نتائج برآمد ہوں گے۔

ملت کی تعمیر کے لئے پچھلے سو برس سے پر شور ہنگامے جاری ہیں۔ مگر ملت کا قافلہ ایک قدم بھی آگے بڑھا ہوا نظر نہیں آتا۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ملت کی تعمیر کا مطلب ہمارے یہاں یہ ہے کہ کسی نہ کسی خارجی گروہ کو اپنے مسائل کا ذمہ دار قرار دے کر اس کے خلاف تقریر و تحریر کا طوفان برپا کرتے رہنا۔ یہ واقعہ بار بار پیش آ رہا ہے کہ حالات ہمارے ایک "دشمن" کو ہٹا دیتے ہیں مگر اس کے بعد جو دوسرا آتا ہے وہ بھی ہمارے لئے اتنا ہی، بلکہ اکثر اوقات اس سے زیادہ برا ثابت ہوتا ہے جتنا کہ پہلا تھا۔ مگر ہمارے جوش میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں آتا کہ جو احتجاجی سیاست پہلے ہم ایک کے خلاف چلا رہے تھے، اب اس کو دوسرے کے خلاف چلانا شروع کر دیتے ہیں۔

اگر ہمیں زندہ رہنا ہے تو اس قسم کی منفی تدبیروں کو ہمیں چھوڑنا ہوگا۔ اپنی تعمیر آپ کرنی ہوگی۔ دوسروں کو ذمہ دار ٹھہرانے کے بجائے اپنے آپ کو اپنے پچھڑے پن کا ذمہ دار قرار دینا ہوگا۔ اپنے وقت اور پیسہ کو جلسوں اور کانفرنسوں میں برباد کرنے کے بجائے اس کو اپنی تعمیر و ترقی پر لگانا ہوگا۔ نعروں اور تقریروں کی سیاست کو چھوڑ کر خاموش عمل کی سیاست اختیار کرنا ہوگا۔ جو امکانات ضائع ہو چکے ان کا ماتم کرنے کے بجائے نئے مواقع کو استعمال کرکے اپنا سفر جاری کرنا ہوگا۔ خوش فہمیوں کی دنیا سے نکل کر حقائق کی دنیا میں اپنا مستقبل بنانا ہوگا۔ اس کے سوا اور کوئی چیز نہیں جو اسباب کی اس دنیا میں ہمیں زندگی عطا کرنے والی ہو۔ (۱۹ دسمبر ۱۹۸۰ء

یہ الفاظ ایک صدی قبل لکھے گئے تھے

۱۸۵۷ء کے حالات کے ذیل میں مولانا سید حسین احمد مدنی لکھتے ہیں: "قصبہ تھانہ بھون میں حضرت حاجی امداد اللہ
نور محمد جھنجھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے تیسرے خلیفہ مولانا شیخ محمد صاحب رہتے تھے۔ وہ علوم عربیہ کے باقاعدہ فاضل
علماء دہلی سے تمام نصاب علم ظاہر پڑھ چکے تھے۔ بدقسمتی سے مولانا شیخ محمد صاحب کی رائے یہ تھی کہ انگریزوں کے خلاف
جہاد کرنا ہم مسلمانوں پر فرض تو درکنار موجودہ احوال میں جائز ہی نہیں۔ (چنانچہ تھانہ بھون میں اکابر علماء کا ایک
بلایا گیا جس میں مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی وغیرہ شریک ہوئے) اجتماع میں حضرت نانوتوی رحمۃ
اللہ علیہ نے بہت ادب سے مولانا شیخ محمد صاحب سے پوچھا کہ حضرت کیا وجہ ہے کہ آپ ان دشمنان دین و وطن پر
کو فرض بلکہ جائز بھی نہیں فرماتے تو انھوں نے جواب دیا کہ ہمارے پاس اسلحہ اور آلات جہاد نہیں ہیں۔ ہم بالکل بے
سامان ہیں۔ مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا کہ کیا اتنا بھی سامان نہیں ہے جتنا کہ غزوۂ بدر میں تھا۔ اس پر
شیخ محمد صاحب مرحوم نے سکوت فرمایا (نقش حیات، جلد دوم، ۱۹۵۴ء، صفحہ ۴۰)

ڈاکٹر محمد اقبال کے پہلے مجموعۂ کلام بانگ درا میں ایک نظم "نالۂ طائر بام" کے عنوان سے درج ہے
یہ نظم اقبال نے ۱۹۰۵ اور ۱۹۰۸ کے درمیان کسی وقت "طلبہ علی گڑھ کالج کے نام" لکھی تھی۔ اس نظم کا
آخری شعر یہ تھا:

بادہ ہے نیم رس ابھی شوق ہے نارسا ابھی   رہنے دو خم کے سر پہ تم خشت کلیسیا ابھی

مطلب یہ کہ انگریزوں سے سیاسی چھیڑ چھاڑ ابھی نہ کرو۔ کیوں کہ اس سے پہلے اور اس کے بعد جو ضروری صلاحیت
درکار ہے وہ ابھی لوگوں میں پیدا نہیں ہوئی۔

انگریزوں کے ہندستان میں داخلہ کے بعد جب رہنماؤں کے ایک بڑے طبقہ میں ان کے خلاف سیاسی
کا جذبہ ابھرا تو اسی کے ساتھ اہل فکر کی ایک تعداد ایسی بھی موجود تھی جو اس کے خلاف تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ انگریزوں
سے سیاسی جہاد ابھی قبل از وقت اور مضر ہے۔ ہم کو پہلے اپنے آپ کو مستحکم بنانا چاہئے۔ کیوں کہ اپنی موجودہ حالت کے
ساتھ ہم زمانہ جدید کے سیلاب کے مقابلہ میں ٹھہرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اس سلسلہ میں یہاں دو رہنماؤں
اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں۔ ایک اقبال کا۔ دوسرے رشید رضا کا۔

ڈاکٹر اقبال نے رسالہ مخزن (اکتوبر ۱۹۰۴ء، مارچ ۱۹۰۵ء) میں دو قسطوں میں ایک مضمون شائع کرایا
اس مضمون کا خلاصہ خود اقبال کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:

"اگر ہمیں اقوام عالم کے دفتر میں اپنا نام قائم رکھنا ضروری ہے تو اپنی نسلوں کی بہبودی کو بھی ایک
واقعہ تصور کرنا ہوگا۔ ایک زمانہ تھا جب کہ اقوام دنیا کی باہمی معرکہ آرائیوں کا فیصلہ تلوار سے ہوا کرتا تھا۔ مگر آج
کا دارومدار اس کاٹھ کی تلوار پر ہے جو قلم کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔

مسلمانوں نے باعموم یہ سمجھا ہے کہ تعلیم کا مقصد زیادہ تر دماغی تربیت ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ تعلیم کا اصل مقصد نوجوانوں میں ایسی قابلیت پیدا کرنا ہے جس سے ان میں باحسن وجوہ اپنے تمدنی فرائض ادا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ جن قوموں نے تعلیم کے اس راز کو سمجھا وہ آج ترقی کے آسمان پر ہیں۔

پارسیوں کی تاریخ پر نظر ڈالو۔ ایک زمانہ میں وہ عظیم الشان قوم تھی۔ کیانی تہذیب وتمدن، شہنشاہ یزدجرد کے عہد میں عربی سواروں نے ختم کر دیا۔ مگر کیا یہ قوم صفحۂ ہستی سے مٹ گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قوم نے انقلاب کے اس مفہوم کو سمجھ لیا ہے جس کی سب سے بڑی خصوصیت صنعت وتجارت ہے۔ تجارت کا ایک کثیر حصہ ان کے ہاتھوں میں ہے اور یہی وجہ ان کے سنبھل جانے کی ہے۔

ان اعتبارات سے مسلمانوں کی حالت نہایت مخدوش نظر آتی ہے۔ یہ بدقسمت قوم حکومت کھو بیٹھی، صنعت کھو بیٹھی، تجارت کھو بیٹھی۔ اب وقت کے تقاضوں سے غافل اور افلاس کی تلوار سے مجروح ہو کر ایک بے معنی توکل کا عصا ٹیکے کھڑی ہے۔ حتیٰ کہ ابھی تک ان کے مذہبی نزاعوں کا ہی فیصلہ نہیں ہوا۔ آئے دن ایک نیا فرقہ پیدا ہوتا ہے جو اپنے آپ کو جنت کا وارث سمجھ کر باقی تمام لوگوں کو جہنم کا ایندھن قرار دے دیتا ہے"۔

علامہ رشید رضا مصری ۱۳۳۰ھ (۱۲ ۱۹ء) میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کی دعوت پر ہندستان آئے تھے اس کے سالانہ اجلاس سے فارغ ہو کر وہ دارالعلوم دیوبند گئے۔ وہاں انھوں نے ایک تقریر کی جس کے ایک حصہ کا ترجمہ یہ ہے:

"اشاعت اسلام کے دو طریقے ہیں۔ ایک، اسلام کے احکام وہدایات کا عام مسلمانوں تک پہنچانا، اسلام کی اشاعت کا دوسرا حصہ کافروں اور بت پرستوں سے متعلق ہونا چاہیے۔ ہندستان میں صدہا قسم کے بت پرست ہیں۔ یہاں بتوں کو پوجنے والے، درختوں اور پتھروں کو پوجنے والے، چاند، سورج، ستاروں اور نہایت لغویات اور خرافات کو پوجنے والے بھی موجود ہیں۔ پس اگر دعاۃ اور مبلغین کی ایک مضبوط جماعت موجود ہو تو ان لوگوں میں اسلام کی اشاعت اس قدر سرعت کے ساتھ ہو سکتی ہے جو اس وقت ہمارے خیال میں بھی نہیں آ سکتی۔ ہمیں عیسائیوں کے مقابلے میں بہت زیادہ کامیابی ہو سکتی ہے۔

اس کے علاوہ ایک خاص بات اور ہے جو ہر ایک دور اندیش مسلمان کی توجہ کے لائق ہے اور وہ یہ کہ ہندستان میں مسلمانوں کی تعداد غیر مسلموں کے مقابلہ میں اس قدر کم ہے کہ ان کی ہستی کو اس ملک میں ہمیشہ معرض خطر میں سمجھنا چاہیے۔ انگریزی حکومت نے جو کہ عقل اور عدل کی حکومت ہے، غیر مسلموں اور مسلمانوں کے درمیان موازنہ قائم کر رکھا ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ موازنہ کسی وقت ٹوٹ جائے تو آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ کیا نتیجہ ہوگا۔ غالباً مسلمانوں کا وہی حشر ہوگا جو اندلس میں ہوا تھا۔ اس لئے ایک جماعت ہم میں ایسی ہونی چاہیے جو ان شبہات کو رفع کرے جو اسلام پر عائد کئے جاتے ہیں۔ یہ شبہات جو موجودہ زمانہ کے علوم وفنون کی بنا پر پیدا ہو گئے ہیں، ان کا دور کرنا بہت ضروری ہے، مگر ان شبہات کو رفع کرنا بغیر فلسفۂ جدید کی واقفیت کے ناممکن ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ اس جماعت کے اشخاص فلسفۂ جدید

کے اہم مسائل سے واقفیت رکھتے ہوں۔" روداد دارالعلوم دیوبند ۳۰-۱۳۳۲ھ (۱۹۱۲ء)

اوپر کے دونوں اقتباسات موجودہ صدی کے آغاز سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں ایسے مفکرین موجود تھے جنھوں نے مسلمانوں کو وقت کی دو اہم ضرورتوں کی طرف توجہ دلائی۔ انھوں نے بتایا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو جو چیز طاقت ور بنائے گی وہ جنگ و جدال نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ مسلمان ایک طرف جدید اقتصادی قوتوں پر قبضہ کریں۔ دوسری طرف اسلام کی توسیع و اشاعت کے لئے خاموش جدوجہد کریں۔ یہ دونوں کام اسی حالت میں ہو سکتے تھے جب کہ مسلمان سیاسی اور غیر سیاسی جھگڑوں سے بچ کر خالص تعمیری انداز میں ان کے لئے مصروف ہوتے۔ مگر جھگڑے کی سیاست میں ہماری بڑھی ہوئی دل چسپی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم کو اس قسم کے خاموش تعمیری کام کی طرف رغبت ہی نہ ہو سکی۔ ہم نے کام کی پوری ایک بہترین صدی صرف بے معنی قسم کی سیاست میں گزار دی۔ اور اب جب کہ ہم اپنی اس غفلت کی وجہ سے دوسرے انسانی قافلوں سے پچھڑ گئے ہیں، ہم نے اپنے لئے ایک اور مشغلہ تلاش کر لیا ہے: اپنے پچھڑے پن کا الزام دوسروں کو دے کر ان کے خلاف فریاد و احتجاج کرنا۔ ہم کو آج بھی نہ اپنی غلطی کا احساس ہے اور نہ دوبارہ اپنی غلطی کی تلافی کرنے کا۔

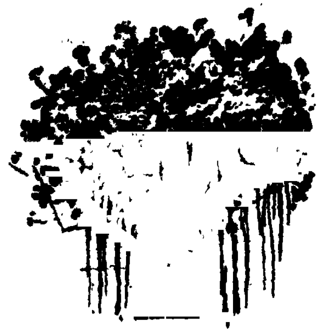
دوسروں سے پہلے اپنے کو جاننے کی ضرورت

اگست ۱۹۷۱ء میں راقم الحروف کو احمد آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک کارخانہ دار اپنا کارخانہ دکھانے کے لئے لے گئے۔ یہ ایک نوجوان تھے۔ انھوں نے انجینئرنگ کی ڈگری لی تھی اور اب اپنے والد کے قائم کئے ہوئے کارخانہ کو سنبھالنے اور اس کو ترقی دینے میں لگے ہوئے تھے۔

"اپنی تو (Limitations) آجاتی ہیں مینجمنٹ سائڈ پر"، انھوں نے کہا "میں ایک انجینیر ہوں۔ مگر بزنس مینجمنٹ موجودہ زمانہ میں ایک مستقل سبجکٹ ہو چکا ہے۔ انجینیرنگ میں اپنی واقفیت کے باوجود مینجمنٹ کے معاملہ میں میں اپنے کو معذور پاتا ہوں۔ مجھے ایک ٹرینڈ منیجر کی تلاش ہے جو انتظامی معاملات میں میرا مددگار بن سکے۔"

اپنے دنیوی کاروبار میں لوگ اپنی محدودیت کو خوب جانتے ہیں۔ کوئی یہ غلطی نہیں کرتا کہ کام کے جس شعبہ سے وہ واقف نہیں ہے، اس میں کود پڑے اور بالآخر نقصان اٹھائے۔ مگر عجیب بات ہے کہ ملت کی رہنمائی کے میدان میں کوئی اس اصول کو ملحوظ رکھنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ ہر آدمی جو کچھ تقریر کرنا جانتا ہو، فوراً قیادت کے اسٹیج پر ظاہر ہو کر خدمت قوم کا کریڈٹ لینا شروع کر دیتا ہے۔ خواہ اس کی قیادت عملاً قوم کو بربادی کے گڑھے میں گرانے کے ہم معنی کیوں نہ بن جائے۔ حتی کہ یہ نتائج اگر اس کی آنکھوں کے سامنے آجائیں تب بھی اس کے جوش قیادت میں کوئی کمی نہیں آتی۔ وہ نئے نئے الفاظ بول کر دوبارہ قوم کے کندھے پر سوار ہو جاتا ہے۔ موت کے سوا کوئی چیز نہیں جو انھیں اعتراف شکست پر مجبور کر سکے۔

دیکھئے کہ آپ کون سا درخت اگا رہے ہیں



دنیا کا نظام اللہ تعالیٰ نے محکم قوانین کے تحت بنایا ہے اور اس کا فیصلہ ہے کہ وہ ان قوانین میں کسی قسم کی تبدیلی قبول نہیں کرے گا۔ (فاطر ۴۳)

انھیں قوانین الٰہی میں سے ایک قانون یہ ہے کہ اس نے مقرر کر دیا ہے کہ جو لوگ سطحی نعروں اور جذباتی تقریروں پر اپنی قوم کو اٹھائیں گے، ان کی قومی زندگی برساتی جھاڑ جھنکاڑ کی طرح ہوگی۔ وقتی طور پر تو وہ بہت نمایاں دکھائی دیں گے۔ مگر ان کے اندر کوئی پائداری نہیں ہوگی۔ فاتحانہ نعروں پر اٹھنے والے لوگوں کے حصہ میں بالآخر صرف یہ فریاد آئے گی کہ "فلاں نے میرے درخت کو اکھاڑ دیا ہے"۔

اس کے برعکس جو لوگ گہری جڑوں اور دور رس منصوبوں پر اپنی قومی تعمیر کریں گے، ان کو مضبوط درختوں کی سی پائداری حاصل ہوگی، جس کو کوئی اکھاڑ نہیں سکتا اور جو صدیوں تک انسانیت کو اپنا سایہ اور پھل دیتے رہتے ہیں۔

(ابراہیم: ۲۴-۲۷)

اگر آپ دنیا میں کوئی حقیقی مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے حقیقی بنیادوں پر اپنی تعمیر کی منصوبہ بندی کیجئے۔ اس صحیح مقام کو دریافت کیجئے جہاں سے صحیح اور پائدار جدوجہد کا آغاز ہوتا ہے۔ اگر آپ نے اپنے آغاز کو پالیا تو آپ اپنے اختتام کو بھی پالیں گے، کیونکہ صحیح آغاز ہی کا دوسرا نام صحیح اختتام ہے۔

فضائی جاسوسی میں جو ہوائی جہاز استعمال ہوتے ہیں ان میں بہت نازک قسم کے کیمرے لگے رہتے ہیں۔ انتہائی بلندی پر اڑان کرنے کے باوجود ان کی تصویریں اتنی مکمل ہوتی ہیں کہ آدمی کے چہرے پر جذبات کا اتار چڑھاؤ تک دیکھا جا سکتا ہے۔ تاہم یہ آواز سے تیز رفتار ہوائی جہاز عموماً دشمن کا نشانہ بننے سے بچ جاتے ہیں۔ اپنی آواز سے آگے پرواز کرنے کی وجہ سے ان کا پتہ زمین پر کھڑے ہوئے لوگوں کو اس وقت ملتا ہے جبکہ ہوائی جہاز ان کے اوپر سے گزر کر بہت دور پہنچ گیا ہو —— گویا زندگی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ آپ اپنا سفر اس طرح طے کریں کہ آپ کا حریف آپ کی کارگزاریوں سے صرف اس وقت واقف ہو جب کہ آپ اپنا کام پورا کر چکے ہوں۔

کبھی شکست بھی فتح ثابت ہوتی ہے

زندگی کے حقائق اس سے کہیں زیادہ وسیع ہیں کہ وہ فتح و شکست کی اصطلاحوں میں سما سکیں۔

اسلام کی قدیم تاریخ میں اغیار کی طرف سے اس کو دو بڑے فوجی مقابلے پیش آئے ہیں۔ ایک تاتاریوں سے، دوسرا مسیحیوں سے۔ تاتاریوں سے مقابلہ بارھویں صدی کے آخر میں پیش آیا۔ مسلم قوموں کو اس مقابلہ میں مکمل شکست ہوئی۔ مگر اس شکست کے اندر سے حیرت انگیز طور پر ایک نیا امکان برآمد ہوگیا۔ فتح نے تاتاریوں کے انتقامی جذبہ کو ختم کردیا۔ اب وہ نفسیاتی طور پر اس پوزیشن میں تھے کہ مفتوح کے مذہب و عقائد پر بے آمیز رائے قائم کرسکیں۔ انہیں نظر آیا کہ اسلام ایک سچا دین ہے اور اس میں خود ان کی اپنی بھلائی چھپی ہوئی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی شکست پر ایک صدی بھی نہیں گزری تھی کہ تاتاری حکمران مسلمان ہوگئے اور سارا مسئلہ ایک نئی بہتر شکل میں ختم ہوگیا ـــــ فوجی میدان کے فاتح فطرت اور نفسیات کے میدان میں اپنے مفتوحوں سے شکست کھاگئے۔

مسیحی یورپ اور مسلمانوں کے درمیان مقابلہ اس کے برعکس مثال پیش کرتا ہے۔ مسیحی یورپ سے دو سو سالہ صلیبی لڑائی کے بعد مسلمانوں کو شاندار فتح حاصل ہوئی اور مسیحی اقوام کو بدترین شکست کے بعد واپس لوٹنا پڑا۔

مگر اس کے بعد کیا ہوا۔ سارے یورپ میں اپنے غالب حریف کے خلاف انتقام کی ایک نہ ختم ہونے والی آگ بھڑک اٹھی۔ اپنے تمام وسائل کو انھوں نے ایک نئے مقابلہ کی تیاری کے لئے استعمال کرنا شروع کیا۔ ان کی یہ مخالفانہ کوششیں پانچ صدیوں تک جاری رہیں۔ یہاں تک کہ ان کی کامیابی اس انتہا کو پہنچی کہ انھوں نے قوت و طاقت کے نئے میدان دریافت کرلئے۔ انھوں نے مسلمانوں کو زندگی کے ہر شعبے میں شکست دے کر ساری دنیا پر اپنی سیادت کا جھنڈا گاڑ دیا ـــــ انھوں نے قدیم طرز کی ملاحی جہاز رانی کو ترقی دے کر دخانی جہاز رانی کے مقام پر پہنچایا اور اس کے زور پر تمام سمندروں پر قابض ہوگئے۔ انھوں نے دور مار ہتھیار تیار کرکے مسلم تلواروں کو کند کردیا۔ انھوں نے مشینی صنعت ایجاد کرکے مسلم دستکاری کا خاتمہ کردیا۔ انھوں نے سائنسی علوم وضع کرکے مسلمانوں کے روایتی علوم کو بے قیمت کردیا۔ انھوں نے محکومی کی ایک نئی قسم (اقتصادی اور فنی محکومی) وجود میں لاکر تمام مسلم دنیا کو مجبور کیا کہ سیاسی طور پر آزاد ہونے کے بعد بھی وہ انھیں کی غلام اور محکوم بنی رہے۔

پچھلی آٹھ سو سالہ تاریخ کا یہ تجربہ بتاتا ہے کہ وہ لوگ سخت غلطی پر ہیں جو صرف فتح و شکست کی اصطلاحوں میں سوچتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے حقائق اس سے کہیں زیادہ وسیع ہیں کہ فتح و شکست کی اصطلاحوں میں سما سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ فتح کبھی شکست ثابت ہوتی ہے اور شکست بھی کسی وقت فتح بن جاتی ہے۔

اسلام کا طریقہ حقیقت پسندی کا طریقہ ہے

نہ کہ حالات کا اندازہ کئے بغیر چھلانگ لگانے کا

قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ (حج ـ ۳۹)

ان لوگوں کو لڑنے کی اجازت دے دی گئی جن سے لڑائی کی جاتی ہے، اس لئے کہ ان پر ظلم ہوا اور بلاشبہ اللہ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے۔

مکہ کے مشرک مسلمانوں کو بہت تکلیفیں دیتے تھے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تو کسی کا سر پھٹا ہوتا، کوئی زخمی ہوتا، کوئی چوٹ کھایا ہوا ہوتا۔ وہ آپ سے شکایتیں کرتے۔ مگر آپ کا جواب صرف یہ ہوتا: صبر کرو مجھے ابھی لڑنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے (اصبروا فانی لم اومر بالقتال، تفسیر النسفی)۔ اسی حال میں تیرہ برس گزر گئے۔ پھر ہجرت کے دوسرے سال مدینہ میں قتال کی ہدایات بھیجی گئیں۔ عبدالرزاق، عبد بن حمید، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، بزار، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابن حبان، حاکم، ابن مردویہ اور بیہقی نے دلائل میں عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ کچھ اوپر ستر آیات میں قتال کی ممانعت کے بعد اجازت کی یہ پہلی آیت قرآن میں نازل ہوئی (هی اول آیة اُذن فیها بالقتال بعد ما نهی عنه فی نیف وسبعین آیة)

یہاں یہ سوال ہے کہ مسلمانوں پر ظلم تو مکی دور میں اپنی بدترین شکل میں ہو رہا تھا، اور اللہ بلاشبہ اس وقت بھی مسلمانوں کی نصرت پر پوری طرح قادر تھا۔ پھر مکہ میں "قتال" کی اجازت کیوں نہ دی گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کے قانون کے مطابق مسلمان ابھی اتنے طاقتور نہ ہوئے تھے کہ ان کا کوئی اقدام فیصلہ کن نتیجہ تک پہنچ سکتا۔ ہجرت کے بعد جب مسلمانوں کی طاقت اس معیار کو پہنچ گئی کہ ان کا اقدام یوم الفرقان (انفال ـ ۴۱) کو وجود میں لانے کے ہم معنی بن سکے تو مڈبھیڑ کی اجازت دے دی گئی۔

پچھلے ڈیڑھ سو برس سے اسلام کے علم بردار جس طرح اپنے مفروضہ حریفوں سے ٹکرا رہے ہیں اور نقصان ہر بار اسلام کے علم برداروں کے حصہ میں آتا ہے، وہ اس قرآنی اصول کی صریح خلاف ورزی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام اقدامات محض نادانی کے اقدامات تھے، اگرچہ غلط طور پر ان کو "اسلامی جہاد" کا مقدس نام دے دیا گیا۔

مکمل تدبیر، اور اسی کے ساتھ اللہ پر مکمل اعتماد

انسان بیک وقت دو مختلف تقاضوں کے درمیان ہے۔ ایک عبدیت کا تقاضا، دوسرے امتحان کا۔ انسان کے حالت امتحان میں ہونے کا پہلو تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنے سارے اختیار اور اپنی تمام امکانیات کو بروئے کار لانے کی کوشش کرے۔ دوسری طرف عبدیت کا پہلو زور کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہر حال میں آدمی اللہ پر بھروسہ رکھے، اپنے کو یا اپنی تدبیروں کو کچھ نہ سمجھے۔ اسباب کا اہتمام ہمارے حالت امتحان میں ہونے کا اظہار ہے اور اللہ پر اعتماد ہماری حالت عبدیت کا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جب مکہ کے حالات اس حد تک سخت ہو گئے کہ لوگوں نے آپ کے ل کا ارادہ کر لیا تو آپ اپنے وطن کو چھوڑ کر یثرب (مدینہ) چلے گئے۔ سیرت کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فر کے لئے آپ نے ہر قسم کا ممکن اہتمام فرمایا —— سفر کے ہر جزء کو مکمل طور پر راز میں رکھا۔ عام شاہراہ کے بجائے یر معروف راستہ سے سفر فرمایا۔ مکہ سے رات کے وقت پیدل نکلے اور سواری کا انتظام آگے ایک صحرائی مقام ے کیا۔ آپ کو مدینہ جانا تھا جو مکہ سے شمال کی جانب واقع ہے۔ مگر آپ نے اس کے الٹی طرف جنوبی سمت ں سفر فرمایا۔ مکہ کے باہر چند میل جا کر ایک سنسان پہاڑی غار (ثور) میں تین دن ٹھہرے رہے جو اتنا تنگ ھا کہ آدمی صرف لیٹ کر اس کے اندر داخل ہو سکتا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

آپ جب ابوبکر صدیق کے ساتھ غار ثور میں مقیم تھے، قریش کے کچھ لوگ آپ کو ڈھونڈتے ہوئے غار کے ارے تک پہنچ گئے۔ آہٹ پا کر ابوبکر صدیق نے کہا، دشمن اتنے قریب آچکا ہے کہ اگر انھوں نے جھک کر اپنے قدموں ے نیچے کی طرف دیکھا تو وہ ہم کو پا لیں گے۔ آپ نے نہایت اطمینان کے ساتھ جواب دیا:

ماظنک باثنین یا ابابکر اللہ ثالثھما — ابوبکر! ان دو کی نسبت تمھارا کیا خیال ہے جن کا تیسرا اللہ ہو

اس واقعہ میں نبوت کا مقام نظر آرہا ہے۔ ایک طرف تدبیر کمال درجہ پر۔ دوسری طرف اللہ پر اعتماد مال درجہ پر۔ یہی نبوت کی شان ہے۔ پیغمبر اس شان عبدیت میں کمال درجہ پر ہوتا ہے۔ پیغمبر کے ساتھیوں اور فیض پانے والوں میں بھی یہ اوصاف درجہ بدرجہ پیدا ہوتے ہیں۔

کیسی عجیب خیرامت

"مسلمان جب تک معاشی اور تعلیمی میدانوں میں برادرانِ وطن کے برابر نہ ہو جائیں ان کو مظلوم اور محروم طبقہ قرار دے کر ان کو پس ماندہ فرقوں کی طرح مراعات اور سہولتیں دی جائیں" —— یہ وہ مطالبہ ہے جو پچھلے چند سالوں سے تمام مسلم جماعتوں کی طرف سے حکومت سے کیا جا رہا ہے۔ اس قسم کا مطالبہ کرنے والے لیڈر اگر فی الواقع اپنے مطالبہ میں سچے ہیں تو اس اصول کو سب سے پہلے انھیں خود اپنے درمیان جاری کرنا چاہئے۔ ہر لیڈر جو اس حال میں ہے کہ اس کے گرد و پیش (خاندان کے اندر یا باہر) کچھ لوگ اس کے مقابلہ میں معاشی حیثیت سے پچھڑے ہوئے ہیں، اس کو چاہئے کہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ اس وقت تک ان لوگوں کے لئے وقف رکھے جب تک یہ پس ماندہ لوگ معاشی حیثیت سے اس کے برابر نہ ہو جائیں۔ اس قسم کا مطالبہ کرنے والے قائدین اگر خود اپنے درمیان اس اصول کو جاری کرنے کے لئے تیار نہ ہوں تو وہ کیوں کر امید رکھتے ہیں کہ اپنی "حریف قوم" سے وہ اس کو منوانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

عجیب بات ہے کہ اس قسم کا مطالبہ کرنے والے قائدین اسی کے ساتھ مسلمانوں کے "خیرامت" ہونے کا ذکر بھی زور شور کے ساتھ کرتے ہیں اور فخر کے ساتھ یہ اعلان کرتے ہیں کہ مسلمان کا منصب یہ ہے کہ وہ سارے عالم کے نظام کو درست کرے اور اس کو خیر و صلاح سے بھر دے۔ کیسی عجیب ہوگی وہ خیرامت جس کا حال ایک طرف یہ ہو کہ اپنے کو "مظلوم اور محروم" طبقہ قرار دے کر دنیا والوں سے رعایتوں کی خیرات مانگ رہی ہو، اور اسی کے ساتھ وہی وہ آسمانی گروہ ہو جس سے دنیا اپنی اصلاح و ترقی کی امید رکھے۔

ہماری ملی مشکلات کا سبب دراصل ہماری اپنی کوتاہیاں ہیں۔ ہم جدید اقتصادیات میں اپنی جڑیں قائم نہ کر سکے۔ ہم وقت کی تعلیم میں پیچھے ہو گئے۔ بے معنی اندرونی نزاعات نے ہم کو اتحاد سے محروم کر رکھا ہے۔ ہمارے سامنے کوئی ایسا قابل عمل مشن نہیں جس میں ہمارے افراد اپنی ذہنی اور عملی قوتوں کا نکاس پا سکیں۔ ہمارے قومی کردار کا حال یہ ہے کہ جب بھی کسی معاملہ میں ہمارے صبر، تحمل، محنت، دیانت داری، خیر خواہی، انصاف، بلند حوصلگی اور وسعت قلبی کا امتحان ہو تو اصاغر سے لے کر اکابر تک سب ناکام ثابت ہوتے ہیں۔ یہ داخلی کمزوریاں ہی ہمارا اصل مسئلہ ہیں اور ان کی اصلاح کے لئے خاموش جدوجہد کرنے کا نام کام ہے۔ مگر ہمارے کسی رہنما کو اس قسم کی تعمیری جدوجہد میں لگنے سے دلچسپی نہیں، البتہ طرح طرح کی بولیاں بول کر وہ لوگوں کے ذہنوں کو الجھائے ہوئے ہیں۔ کوئی یہ کہتا ہوا سنائی دیتا ہے کہ ہم کو حفاظت خود اختیاری کے تحت اپنا مسئلہ اپنے ہاتھ میں لینا چاہئے۔ کسی نے اسلام کے کچھ سیاسی قصائد یاد کر لئے ہیں اور وہ بس انھیں کو دہراتا رہتا ہے۔ کوئی جا بجا تقریری نمائش گاہیں کھڑی کرنے میں جگمگاتا ہوا مستقبل دیکھ رہا ہے۔ کوئی شترمرغ کی طرح خیالی پناہ گاہیں بنانے میں مصروف ہے۔ کوئی احتجاج اور مطالبات کی رٹ لگائے رکھنے کو کام سمجھتا ہے۔ مگر اس قسم کی ہر بات صرف اپنی بربادیوں کو دائمی بنانے کے ہم معنی ہے۔ یہ محض کچھ الفاظ ہیں اور جو مسئلہ عمل کی کمی سے پیدا ہوا ہو اس کو الفاظ بول کر حل نہیں کیا جا سکتا۔

ہر غروب کے لئے ایک نیا طلوع مقدر ہے

سورج پچھم میں غروب ہوتا ہے تاکہ دوبارہ پورب سے نئی شان کے ساتھ طلوع ہو۔ یہ ایک روشن نشانی ہے جو آسمان پر ظاہر ہو کر ہر روز ہمیں بتاتی ہے کہ خدا نے اپنی مملکت کا نظام کس طرح بنایا ہے۔ یہ اس حقیقت کا ایک کائناتی اعلان ہے کہ خدا کی اِس دنیا میں کوئی "غروب" آخری نہیں۔ ہر غروب کے لئے ایک نیا طلوع مقدر ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ آدمی کے اندر حوصلہ ہو۔ غروب کا واقعہ پیش آنے کے بعد وہ از سرِ نو اپنی جدوجہد کا منصوبہ بنائے۔ زندگی کی شاہ راہ پر دوبارہ اپنا سفر شروع کر دے۔

ناکامی کے اسباب ہمیشہ آدمی کے اپنے اندر ہوتے ہیں
مگر اکثر وہ ان کو دوسروں کے اندر تلاش کرنے لگتا ہے

زندگی کا راز
ایڈجسٹمنٹ میں ہے
نہ کہ
مقابلہ آرائی میں

کہا جاتا ہے کہ جاپانی زبان میں بہت سے ایسے الفاظ ہیں جو "کام" کے مفہوم کو بتاتے ہیں۔ مگر ابھی حال تک جاپانی زبان میں ایسا کوئی لفظ نہ تھا جو "فرصت" کے مفہوم کو ادا کرتا ہو۔ غالباً یہ واحد عامل ہے جس نے جاپانی قوم کو دنیا میں سب سے زیادہ محنتی قوم بنا دیا ہے۔ دوسری عالمی جنگ میں جاپان کی اقتصادیات بالکل برباد ہو گئی تھیں۔ مگر جاپانی محنت نے معجزہ دکھایا۔ جنگ کے صرف ۲۵ سال بعد جاپان نے اقتصادی حیثیت سے دنیا کے چند انتہائی ترقی یافتہ ملکوں کی فہرست میں جگہ حاصل کر لی۔

مسلمانوں کا معاملہ ایک اور پہلو سے دلچسپ مثال پیش کرتا ہے۔ ہماری زبان میں اختلاف اور ٹکراؤ کے مفہوم کو بتانے کے لئے درجنوں الفاظ ہیں —— مگر ADJUSTMENT کے مفہوم کو صحیح طور پر ادا کرنے کے لئے کوئی لفظ نہیں۔

پچھلے دو سو برس سے ہندستانی مسلمانوں پر احتجاج اور ٹکراؤ کی سیاست اتنی زیادہ چھائی رہی ہے کہ اردو زبان میں اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے کوئی لفظ ہی نہ بن سکا جس کو انگریزی میں ADJUSTMENT کہا جاتا ہے۔ "بازمانہ ستیز" کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ہمارے یہاں درجنوں الفاظ ہیں۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ ADJUSTMENT کے مفہوم کو صحیح طور پر ادا کرنے کے لئے ہمارے یہاں کوئی ایک لفظ بھی نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان آج سب سے زیادہ لڑنے جھگڑنے والی قوم بن گئے ہیں۔ حالات سے ہم آہنگی کرتے ہوئے اپنا راستہ نکالنا جیسے ان کو آتا ہی نہیں۔ ان کی جنگ جویانہ تحریکوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا انھیں خبر ہی نہیں کہ زندگی کا راز ایڈجسٹمنٹ میں ہے نہ کہ مقابلہ آرائی میں۔

اس صورت حال کے نتیجہ میں ایک عجیب مشکل یہ پیدا ہوئی ہے کہ کوئی خدا کا بندہ اگر یہ کہتا ہے کہ ملی مقاصد کے حصول کے لئے جو منصوبہ بناؤ، حالات سے ہم آہنگ ہو کر بناؤ تو یہ بات ان کی سمجھ میں آتی ہی نہیں۔ اس قسم کی آواز حقیقۃً ایڈجسٹمنٹ کی آواز ہوتی ہے مگر سننے والے اس کو "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" کے ہم معنی سمجھ لیتے ہیں۔ کیوں کہ جن الفاظ سے وہ مانوس ہیں انھوں نے ان کو دو ہی مفہوم سے آشنا کیا ہے: زمانہ سے لڑنا یا ہوا کے رخ پر چلنا۔ ان دو کے علاوہ کسی تیسرے رویہ کو وہ جانتے ہی نہیں۔

Japanese did not have 'leisure'

There are plenty of words in the Japanese language meaning "work" but till recently it had no word for "leisure". This may be the one single factor to explain how Japan has emerged as a major economic power within the past two decades, says a report in The Times, London.

The Times of India, 9.11.1975

سب سے زیادہ معلوم بات جس کو لوگ سب سے زیادہ کم جانتے ہیں

ہر مسافر جانتا ہے کہ ایک ٹرین چھوٹ جائے تو جلد ہی بعد دوسری ٹرین مل جاتی ہے جس سے وہ اپنا سفر جاری رکھ سکے ــــــــــــــــ

یہ پلیٹ فارم کا سبق ہے ۔ مگر اکثر لوگ اس معلوم سبق کو اس وقت بھول جاتے ہیں جب کہ زندگی کی دوڑ میں ایک موقع ان کے ہاتھ سے نکل گیا ہو ۔

> اپنی غلطی کی قیمت آدمی کو خود ادا کرنی پڑتی ہے ۔ مگر آدمی غلطی کرنے کے بعد ہمیشہ کسی دوسرے کو تلاش کرنے لگتا ہے جو اس کی طرف سے اس کی غلطی کی قیمت ادا کر دے ۔

جو شخص ہار کو مان لے وہی تیاری کر کے دوبارہ اپنے حریف کے مقابلہ میں کامیاب ہوتا ہے

۱۵ فروری ۱۹۷۸ کو ساری دنیا نے حیرت کے ساتھ یہ خبر سنی کہ باکسنگ کے مشہور چیمپین محمد علی کو ایک غیر معروف کھلاڑی لیون اسپنکس نے ہرا دیا۔ اب محمد علی کے لئے ایک راستہ وہ تھا جو عام طور پر ہارے ہوئے سیاستداں اختیار کرتے ہیں۔ وہ ایک اخبار نکال کر ججوں کی "دھاندلی" کا شور مچاتے۔ اپنے پرجوش حامیوں کو لے کر اسپنکس کے خلاف ایجی ٹیشن چلاتے اور اس کو قتل کرنے یا اس پر مقدمہ چلانے کی کوششیں کرتے۔ خود ساختہ طور پر ایک لقب وضع کر کے اپنے نام کے ساتھ لگا لیتے اور سمجھتے کہ وہ اب بھی کھیل کی دنیا کے "امام" ہیں۔ محمد علی اگر اس قسم کا راستہ اختیار کرتے تو اس کے لئے ان کے پاس پیسہ بھی تھا اور اعوان و انصار بھی۔ مگر اس قسم کے تمام طریقوں کو چھوڑ کر انھوں نے محنت و مشقت اور خاموش تیاری کا طریقہ اختیار کیا۔

ہارنے کے بعد پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت، محمد علی نے فروری ۱۹۷۸ کے تیسرے ہفتہ میں بنگلہ دیش کا پانچ روزہ دورہ کیا۔ ان کو بنگلہ دیش کی اعزازی شہریت دی گئی اور ان کو امریکہ میں بنگلہ دیش کا اعزازی قونصل جنرل بنانے کا اعلان کیا گیا۔ اس موقع پر ۲۲ فروری کو ڈھاکہ کی ایک پریس کانفرنس میں ایک اخباری نمائندہ نے محمد علی سے پوچھا کہ لیون اسپنکس سے مقابلہ میں ججوں کے فیصلہ کو کیا وہ صحیح فیصلہ سمجھتے ہیں۔ محمد علی نے صاف لفظوں میں کہا:

It was a fair decision.

یہ ایک بے لاگ فیصلہ تھا۔ علی نے صاف لفظوں میں اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہوئے کہا:

> I misjudged the man (Spinks) and fought a wrong battle. my planning was not correct because I did not know much about Spinks
>
> The Times of India, 23.2.1978

میں نے اپنے حریف کو سمجھنے میں غلطی کی اور اس سے غلط جنگ لڑی۔ میری منصوبہ بندی صحیح نہیں تھی کیوں کہ میں اسپنکس کے بارے میں کچھ زیادہ جانتا نہ تھا۔

محمد علی نے اب اپنی زندگی کا نیا نظام بنایا اور باقاعدہ تیاری میں لگ گئے۔ وہ دن بھر دوڑتے، پہاڑیوں پر چڑھتے۔ بھری ہوئی بوری میں گھونسے مار کر اپنے ہاتھوں کی تربیت کرتے۔ اپنے ساتھیوں سے آزمائشی مقابلے کرتے، اور اسی کے ساتھ عبادت کر کے دعا بھی کرتے کہ خدا انھیں اگلے مقابلہ میں کامیاب کرے — محمد علی کی عمر ۳۶ سال ہے اور ان کے حریف لیون اسپنکس کی عمر ۲۵ سال، یعنی دونوں کی عمر میں گیارہ سال کا فرق ہے۔ مبصرین کا خیال تھا کہ محمد علی کی عمر ان کے لئے فیصلہ کن ہو چکی ہے اور اب وہ اپنے نوجوان حریف سے دوبارہ جیت نہیں سکتے۔ مگر محمد علی نے پورے جوش اور اہتمام کے ساتھ اپنی تیاریاں جاری رکھیں۔ وہ روزانہ صبح ۵ بجے اٹھ کر تین میل پہاڑی راستہ پر دوڑتے جب کہ ابھی اندھیرا چھایا ہوا ہوتا اور لوگ اپنے نرم بستروں پر سوئے ہوتے۔ اس کے بعد سارے دن سخت ترین

قسم کی ورزشوں میں لگے رہتے۔
اگست میں، مقابلہ کی تاریخ سے کچھ پہلے، انھوں نے ڈیریلیک (پنسلوانیا) میں اپنے کھیل کا مظاہرہ کیا تھا اور اعلان کیا تھا کہ ۱۵ ستمبر کے مقابلہ میں میں دوبارہ ٹائٹل جیت لوں گا۔ اخباری رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ ۳۶ سالہ علی آج کل اپنے باکسنگ سنٹر پر زبردست تیاری میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ بے حد سنجیدہ ہو گئے ہیں۔ اخباری رپورٹ کا ایک جملہ یہ تھا۔

Members of the Ali entourage insist that they have never seen Ali work so hard.
The Times of India 17.8.78

محمد علی کے ساتھیوں کا کہنا ہے کہ انھوں نے محمد علی کو اتنا سخت محنت کرتے ہوئے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔
اس طرح محنت اور تیاری کے چھ سخت مہینے گزارنے کے بعد محمد علی نے ۱۶ ستمبر ۱۹۷۸ کو دوبارہ لیون اسپنکس سے مقابلہ کیا اور اس کے اوپر شاندار فتح حاصل کی۔ اسپنکس فتح کے بعد عیاشیوں میں پڑ گیا حتیٰ کہ ٹریفک قواعد کی خلاف ورزی کرنے کے جرم میں پولس نے اس کا چالان کیا۔ جب کہ محمد علی برابر اپنی تیاری میں مشغول رہا۔

ہار کو مان لینا اعلیٰ ترین انسانی صفت ہے۔ یہ حقیقت واقعہ کا اعتراف ہے۔ یہ جھوٹ کو چھوڑ کر سچائی کا راستہ اختیار کرنا ہے۔ جو شخص اپنی ہار مان لیتا ہے، اس کے اندر حقیقت پسندانہ نفسیات ابھرتی ہیں۔ وہ سنجیدگی کے ساتھ حالات کا جائزہ لینے لگتا ہے۔ وہ اپنی کمزوریوں کو سمجھ کر دوبارہ اپنی منصوبہ بندی کرتا ہے۔ وہ حریف کے خلاف لفظی طوفان اٹھانے کے بجائے حقیقی میدان میں اس کا مقابلہ کرنے کی تیاریاں کرتا ہے۔ ایک طرف اس کا حریف فتح کی خوشی میں مگن ہوتا ہے۔ دوسری طرف یہ اپنی شکست کے احساس کو لئے ہوئے سنجیدہ تیاریوں میں مصروف ہوتا ہے —— ان باتوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو شخص مقابلہ کے میدان میں ہار گیا تھا وہ دوبارہ اپنے حریف کو شکست دے کر کامیاب ہو جاتا ہے۔

مکان نیچے سے اٹھایا جاتا ہے نہ کہ اوپر سے

زمین کو انسان کی قیام گاہ بنایا گیا ہے۔ مگر وہی قیام گاہ زمین کے اوپر کھڑی ہوتی ہے جس کی تعمیر کو بنیاد سے شروع کرکے چھت تک پہنچایا گیا ہو۔ کوئی شخص چھت کی طرف سے اپنا مکان بنانا شروع کردے تو خدا کی زمین ایسے مکان کو قبول کرنے سے انکار کردے گی۔
یہ اس دنیا کی ایک اٹل حقیقت ہے۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ جب ملت کی تعمیر کا سوال آتا ہے تو لوگ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں۔ وہ چھت کی طرف سے ملت کا محل اٹھانا شروع کردیتے ہیں۔ خواہ ان کا محل بالآخر زمین بوس ہو کر مایوسی اور بے یقینی کے ملبہ کے سوا ان کے لیے کچھ اور نہ چھوڑے۔

ناموافق حالات زندہ قوموں کیلئے

ترقی کا زینہ بن جاتے ہیں

آرنلڈ ٹائن بی (۱۹۷۵-۱۸۸۹) چند خوش قسمت مصنفین میں سے ہے جس نے اپنی زندگی ہی میں عالمی مقام حاصل کرلیا۔ اس انگریز مورخ کو سب سے زیادہ شہرت اپنی ۱۰ جلدوں پر مشتمل "اسٹڈی آف ہسٹری" کی وجہ سے ملی جس میں اس نے ۲۱ تہذیبوں کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کتاب کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ وہ قوتیں جو تاریخ بناتی ہیں، وہ بنیادی طور پر داخلی قوتیں ہیں نہ کہ خارجی اسباب۔ اس نے قدیم زمانہ سے لے کر اب تک تمام بڑی تہذیبوں کا مطالعہ کر کے دکھایا ہے کہ ان تہذیبوں کو جن قوموں نے پیدا کیا، وہ تخلیقی صلاحیت رکھنے والی اقلیتیں تھیں جنھوں نے وقت کے چیلنج کا کامیابی کے ساتھ جواب دیا۔

اقلیتوں کے ساتھ ہمیشہ یہ ہوا ہے کہ وہ اکثریت کی طرف سے مسلسل دباؤ میں رہتی ہیں۔ یہ دباؤ عملی زندگی میں بہت بڑی نعمت ہے۔ اس کی وجہ سے کسی قوم کی وہ اندرونی تخلیقی صلاحیت ابھرتی ہے جو اس کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ پیش آنے والے چیلنج کے مقابلہ میں قائدانہ رول ادا کرسکے۔ اس کے برعکس جن قوموں کی لغت میں "دباؤ" کے معنی صرف "مظلومیت" کے ہوتے ہیں، ان کے حصہ میں فریاد و احتجاج کے سوا کچھ نہیں آتا۔ وہ اپنی محرومیوں کا رجسٹر بنانے میں مشغول رہتی ہیں یا جلسوں اور تقریروں کا کمال دکھا کر سمجھتی ہیں کہ انھوں نے اپنی سربلندی کا راز پالیا ہے۔ یہاں تک کہ جب وقت کا قافلہ آگے بڑھ جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لئے اس دنیا میں قبرستان کے سوا اور کچھ نہیں۔

جھگڑے سے ہٹ کر اپنی تعمیر کیجئے

بے وقوف کسان نے مینڈ کے جھگڑے کو مینڈ پر طے کرنے کی کوشش کی۔ جس کا نتیجہ صرف یہ ہوا کہ بے شمار نئے نئے جھگڑے کھڑے ہو گئے۔ اور پہلا جھگڑا بھی طے نہ ہوا۔

عقلمند کسان کو اپنے پڑوسی سے مینڈ کا جھگڑا پیش آیا تو اس نے مینڈ کو چھوڑ دیا۔ وہ اس کوشش میں لگ گیا کہ اپنے بقیہ کھیتوں اور باغوں کو ترقی دے۔ اس طریق کار کا شاندار نتیجہ برآمد ہوا۔ بالآخر اس نے نہ صرف اپنی کھوئی ہوئی مینڈ حاصل کر لی بلکہ اس قابل ہو گیا کہ پہلے سے بھی زیادہ بڑی جائداد اپنے لئے خرید لے۔

□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□□

ناکافی تیاری کے ساتھ کیا ہوا اقدام ——— مسئلہ کو پہلے سے زیادہ سنگین بنا دیتا ہے

شیر اپنی فطرت کے اعتبار سے انسان خور نہیں ہوتا۔ کسی شیر کو انسان خور بنانے والے اکثر وہ غیر ماہر شکاری ہوتے ہیں جو شیر پر گولی چلاتے ہیں مگر ان کی گولی صحیح نشانہ پر پڑنے کے بجائے اچٹتی ہوئی نکل جاتی ہے۔ اس قسم کا شیر انسان دشمن ہو جاتا ہے۔ وہ جہاں کہیں انسانی شکل کو دیکھتا ہے، اس پر حملہ کر کے اسے کھا جاتا ہے ——— اسی طرح اگر آپ اپنے حریف پر ایسے اقدامات کریں جو ناکافی تیاری کی وجہ سے فیصلہ کن نہ بن سکیں تو اس قسم کا ہر اقدام آپ کے حریف کو پہلے سے زیادہ مشتعل کر کے آپ کے مسئلہ کو اور زیادہ سنگین بنا دے گا۔

لڑائی بھڑائی کا نام سیاست نہیں

ابوفراس حمدانی عباسی دور کا شاعر ہے۔ وہ اپنے ایک قصیدہ میں کہتا ہے:

إذا امّا أرسلَ الأمراءُ جَيشاً
إلى الأعداءِ أرسلنا الكتابا

یعنی ہماری دھاک کا یہ عالم ہے کہ جہاں دوسرے امراء کو مقابلہ کرنے کے لئے لشکر بھیجنا پڑتا ہے وہاں ہم صرف خط بھیج دیتے ہیں اور وہی فیصلہ کرنے کے لئے کافی ہو جاتا ہے

شاعر نے ایک شعر میں سیاست کا راز بتا دیا ہے۔ سیاست یہ نہیں ہے کہ حریف سے براہ راست لڑائی چھیڑ دی جائے۔ سیاست یہ ہے کہ اپنے آپ کو اتنا طاقت ور اور مستحکم بنایا جائے کہ جب ضرورت پڑے تو ایک تحریری وارننگ بھیج دینا معاملہ کو ختم کرنے کے لئے کافی ہو۔

آپ لکڑی کو توڑیں تو وہ دو ٹکڑے ہو جائے گی مگر زندہ چیزوں کے لئے شکست کا کوئی سوال نہیں۔ ایک زندہ ایبا (AMOEBA) جب ٹوٹتا ہے تو وہ دو زندہ ایبا بن جاتا ہے۔

کام صرف وہ ہے جو خود اپنے مثبت فکر کے زور پر وجود میں آئے۔ خارجی حالات کے خلاف ردعمل کے طور پر جو چیز ظاہر ہو، وہ کام نہیں، جذباتی ابال ہے۔ اس قسم کا جذباتی ابال وقتی شور و شر تو ضرور پیدا کر سکتا ہے۔ مگر اس سے کسی حقیقی نتیجہ کی امید کرنا ایسا ہی ہے جیسے کتے کی بھونک سے بلبل کے نغمہ کی توقع کی جائے۔

نادانی کی چھلانگ

حکایت ہے کہ کسی زمانہ میں بہت بڑا سیلاب آیا۔ ایک بندر اور ایک مچھلی اس میں پھنس گئے۔ بندر تیز تھا۔ چھلانگ لگا کر ایک درخت پر چڑھ گیا اور ایک شاخ پر جا بیٹھا جہاں وہ سیلاب کی طوفانی موجوں سے محفوظ تھا۔ اب اس نے نیچے نظر ڈالی تو دیکھا کہ مچھلی امنڈتی ہوئی لہروں کے خلاف جدوجہد میں مصروف ہے۔ اس نے سمجھا کہ مچھلی طوفان میں پھنس گئی ہے۔ وہ پوری ہمدردی اور نیک نیتی کے ساتھ نیچے آیا اور مچھلی کو پانی سے نکال کر خشکی پر ڈال دیا۔ اس کے بعد جو نتیجہ نکلا وہ ظاہر ہے۔

نادان دوستی کی یہ تمثیل ایڈیسن کی زندگی میں واقعہ بن چکی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایڈیسن ایک کتا پالے ہوئے تھا جو اس کو بہت محبوب تھا۔ ایک روز ایڈیسن کا کتا اس کے مطالعہ کے کمرہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ میز پر اس کے ضروری کاغذات پھیلے ہوئے تھے اور کرد سین کا لیمپ جل رہا تھا۔ ایک پتنگا کہیں سے کمرے میں داخل ہو گیا اور لیمپ کے گرد منڈلانے لگا۔ کتا دیر تک یہ منظر دیکھتا رہا۔ آخر اس کو گوارا نہ ہوا کہ اس کے آقا کی میز پر ایک پتنگا قابض ہو جائے۔ اس نے اس کو پکڑنے کے لئے ایک چھلانگ لگائی۔ پتنگا تو اڑ گیا، البتہ لیمپ الٹ گیا اور میز پر تیل پھیل جانے کی وجہ سے فوراً آگ لگ گئی اور کاغذات جل گئے۔ اڈیسن نے دیکھا تو کہا:

"میرے محبوب کتے! تجھے نہیں معلوم کہ تو نے کیا کیا۔"

موجودہ زمانے میں ہمارے رہنماؤں نے بھی حیرت انگیز طور پر اسی قسم کے کارنامے دکھائے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اصلاح ملت اور احیائے اسلام کا نعرہ لے کر اٹھا۔ مگر ہر ایک نے ایسی نادانی کی چھلانگیں لگائیں کہ اصل مقصد تو حاصل نہیں ہوا البتہ نئے نئے مسائل اور نئی نئی پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں جس کے نتیجہ میں مسئلہ پہلے سے بھی زیادہ گمبھیر ہو گیا۔ نادانی کے اقدام سے کہیں زیادہ بہتر یہ ہے کہ کوئی اقدام ہی نہ کیا جائے۔

حقیقت پسند بنئے

خدا نے اپنی دنیا کا نظام انتہائی محکم بنیادوں پر بنایا ہے۔ کوئی درخت کبھی طلسماتی طور پر نہیں اگتا۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ ایک آسمانی کرہ چھلانگ لگاکر اچانک اس سرے سے اس سرے پر پہنچ جائے۔

ایک ایسی دنیا میں ہم ایسے "بزرگ" کی پیدائش کا انتظار کر رہے ہیں جو کراماتی طور پر واقعات کو ظہور میں لائے۔ ہم ایسے "قائد" کی تلاش میں ہیں جو ایک بڑا سا مظاہرہ کرکے آناً فاناً قوم کے لئے نیا مستقبل پیدا کر دے۔

جو لوگ اس قسم کی امیدوں پر جی رہے ہیں انھیں جاننا چاہئے کہ خدا کی اس دنیا میں ایسے طلسماتی واقعات کا ظہور ممکن نہیں۔ اگر انھیں طلسمات ہی کے سہارے زندہ رہنا ہے تو ان کو اپنی پسند کے مطابق دوسری کائنات بنانی پڑے گی

"سادھارن گنوں سے اسادھارن منش بنتے ہیں" یہ ہندی کی ایک سوکتی ہے عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بڑا انسان بننے کے لئے کوئی بڑا واقعہ چاہئے جو اس کو اخبار کی شاہ سرخی میں جگہ دے سکے۔ مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اکثر معمولی باتوں میں غیر معمولی انسان بننے کا راز چھپا ہوتا ہے۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس راز کو جانتے ہوں

لفظی تسکین کی قیمت

بہت مہنگی دینی پڑی

جنگ عظیم ثانی میں آخری شکست سے کچھ ماہ پہلے جاپانی لیڈر یہ سمجھ چکے تھے کہ وہ بازی ہار چکے ہیں۔ اتحادی طاقتوں کی طرف سے ۲۶ جولائی ۱۹۴۵ کو پوٹسڈم ڈکلریشن جاری کیا گیا تو وہ ذہنی طور پر ہتھیار ڈالنے کے لئے تیار ہو چکے تھے۔ جاپانی پارلیمنٹ کی خواہش تھی کہ اس ڈکلریشن کی بنیاد پر اتحادی طاقتوں سے امن کی گفتگو شروع کی جائے۔

باضابطہ فیصلہ سے پہلے ۲۸ جولائی کو جاپانی وزیر اعظم سوزوکی (SUZUKI) نے ایک پریس کانفرنس کی۔ انھوں نے پریس کے نمائندوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ جاپانی کابینہ موکوستسو (MOKUSATSU) کی پالیسی پر عمل کر رہی ہے۔ موکوستسو ایک جاپانی لفظ ہے جس کا کوئی قطعی متبادل انگریزی زبان میں نہیں ہے۔ حتیٰ کہ خود جاپانی میں بھی وہ ایک غیر واضح لفظ ہے۔ اس کا ایک مفہوم "تبصرہ سے رکنا" ہے۔ اور اغلباً جاپانی وزیر اعظم کی مراد یہی تھی۔ مگر خود جاپانی زبان ہی میں اس لفظ کا ایک اور مفہوم بھی ہے، اور وہ ہے نظر انداز کرنا۔

جاپانی وزیر اعظم کو کابینہ کی طرف سے جس بیان کی ہدایت کی گئی تھی، وہ یہ تھا کہ جاپانی کابینہ پوٹسڈم ڈکلریشن کے معاملہ میں ابھی کسی فیصلہ پر نہیں پہنچی ہے۔ مگر انھوں نے پریس کانفرنس میں جو لفظ استعمال کیا وہ سننے والے اخبار نویسوں کے لئے مبہم ثابت ہوا۔ جاپان کی ڈومی نیوز ایجنسی نے وزیر اعظم کے بیان کا جو انگریزی ترجمہ نشر کیا اس میں موکوستسو کا ترجمہ IGNORE کے لفظ سے کیا گیا۔ ایک لفظ کے دو ممکن مفہوم میں سے سخت تر مفہوم کے انتخاب کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ ۴۵-۱۹۴۴ کے جاپان میں جنگی جنون کا جو ماحول تھا اس میں "نظر اندازی" کا تصور عوامی ذوق کے زیادہ مطابق تھا۔ جاپان کے قومی حوصلوں کے لئے اس میں زیادہ تسکین مل رہی تھی۔ مگر اس لفظی تسکین کی قیمت جاپان کو بہت مہنگی ادا کرنی پڑی۔

اتحادی طاقتوں کے دفاتر میں جب یہ نشریہ سنا گیا تو انھوں نے سمجھا کہ جاپانیوں نے پوٹسڈم ڈکلریشن کو نظر انداز کر دیا ہے —— چند دن بعد ہی جاپان پر دو ایٹم بم گرائے گئے اور ہیروشیما اور ناگاساکی تباہ ہو گیا۔ دو لاکھ انسان فوراً مر گئے اور بے شمار لوگ خطرناک طور پر زخمی ہوئے۔

یہ انکشاف کاسو کوائی (KASUO KAWAI) نے کیا ہے جو اس سے پہلے جاپان کے طاقتور اخبار نپن ٹائمس (NIPPON TIMES) کے ایڈیٹر تھے۔

پلین ٹروتھ، دسمبر ۱۹۷۰

یہ کوئی ایک واقعہ نہیں جو صرف جاپان کے ساتھ پیش آیا ہو۔ افراد یا قوموں کے ساتھ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ کسی معاملہ کو ساکھ کا معاملہ بنا لیتے ہیں وہ حقیقت پسندی کی زبان بولنے پر تیار نہیں ہوتے۔ وہ کمزور حالت میں ہونے کے باوجود ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جن میں ان کی بڑائی باقی رہے۔ اس سے وقتی طور پر لفظی تسکین ضرور ہوتی ہے۔ مگر بالآخر اس کی بہت مہنگی قیمت دینی پڑتی ہے۔ کیوں کہ حقائق کا طوفان ان کے الفاظ کو اسی طرح بہالے جاتا ہے جس طرح آندھی خس و خاشاک کو۔

چلنا وہی ہے جو صحیح سمت میں ہو

کوئی شکاری اگر جانور کے سایہ کو جانور سمجھ کر بندوق چلادے تو اس کی گولی اپنا نشانہ کھو دے گی، کارتوس خالی کرنے کے بعد بھی وہ اپنی مطلوبہ چیز سے محروم رہے گا۔ یہی حال ان لوگوں کا ہے جو زندگی کا نصب العین مقرر کرنے میں غلطی کر جائیں۔ اگر آپ نے نصب العین کا تعین صحیح نہیں کیا ہے تو آپ کی ساری کوششیں اور قربانیاں اسی طرح رائگاں چلی جائیں گی جس طرح کوئی شکاری غلط نشانہ پر بندوق چلادے اور بالآخر اس کے حصہ میں خالی کارتوس کے سوا اور کچھ نہ ہو۔

اس میں نصیحت ہے

انگلستان میں یہ قانون ہے کہ جانور کو ذبح نہ کیا جائے بلکہ کرنٹ کے ذریعہ ہلاک کیا جائے۔ اور اگر ذبح کیا جائے تو پہلے جانور کو بیہوش کر لیا جائے۔ مگر دونوں صورتوں میں ذبح کے اسلامی حکم پر عمل نہیں ہوتا۔ تاہم پچھلے دس سال سے برطانیہ میں مقیم مسلمانوں کو ذبیحہ کی اجازت مل گئی ہے، برمنگھم میں ۱۹۶۰ سے ایک حلال میٹ کمپنی قائم ہے۔ اس کا کام اب اتنا بڑھ چکا ہے کہ اس وقت روزانہ تین ہزار سے چار ہزار تک جانور اور ۱۸ ہزار مرغیاں ذبح کی جاتی ہیں۔ اس کا اسٹاف ۷۵ لوگوں پر مشتمل ہے۔

برطانیہ میں مسلمانوں کو یہ سہولت کیونکر حاصل ہوئی، برطانیہ کے ایک مسلمان اقبال مسعود ندوی لکھتے ہیں:

"یہاں ایک اور فرقہ ہے جو اپنے طریقہ کے مطابق جانور ذبح کرتا ہے۔ یہ یہود کا فرقہ ہے۔ حکومت ان سے تعرض نہیں کرتی۔ ایک وجہ ان کی اقتصادی سیاسی اہمیت ہے۔ ان کا معیار بھی خاصا اونچا ہے۔ بلکہ دراصل اس فرقہ کے ساتھ رعایت ہی کی وجہ سے یہاں پر ذبیحہ کی اجازت مل سکی ہے۔"

الحسنات رام پور فروری ۱۹۷۸ صفحہ ۷۷

یہ واقعہ اس بات کی مثال ہے کہ اغیار کے پیدا کردہ حالات کس طرح کبھی اسلام کے لئے مفید بن جاتے ہیں۔ اسی طرح کبھی اس کے برعکس صورت حال بھی پیش آتی ہے یعنی مسلمان اپنی نادانی سے ایسے حالات پیدا کرتے ہیں کہ اسلام کے لئے موافق حالات برباد ہو جائیں۔ ایک جدوجہد جو اسلام کے نام پر کی گئی ہو، بالآخر وہ غیر اسلامی نتیجہ پر ختم ہو۔

یہ لکڑی کی ہنڈیا میں سالن پکانا ہے

کوئی شخص یہ نادانی نہیں کرے گا کہ اپنے گھر کا کھانا کاٹھ کی ہنڈیا میں پکائے۔ کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ چولھے کی آگ کاٹھ کی ہنڈیا کو جلا دے گی۔ اور بالآخر آدمی کے حصے میں کچھ نہیں آئے گا۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ ملت کا کھانا ہر آدمی کاٹھ کی ہنڈیا میں پکا رہا ہے۔ نعرے اور پوسٹر، جلسے اور کانفرنسیں، شاعری اور خطابت، احتجاج اور مطالبات، یہ سب "کاٹھ کی ہنڈیا" ہیں۔ مگر ہمارے تمام قائدین انھیں کے ذریعہ ملت کا مستقبل تعمیر کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ پچھلی کئی نسلوں کے ناکام تجربات بھی ان کے جوش میں کمی کا باعث نہ ہو سکے۔

چیخنا کام نہ آیا

جہاز چٹان سے ٹکرا کر چور چور ہو چکا تھا۔
اس کے ٹوٹے ہوئے تختے سمندر کی موجوں میں ہچکولے کھا رہے تھے
سینکڑوں مسافر اپنی منزل کے بجائے سمندر کی تہ میں پہنچ چکے تھے۔
اور جہاز کا کپتان ایک تختہ کا سہارا لئے ہوئے چیخ رہا تھا ———

کتنی بے رحم ہے وہ قدرت جس نے سمندر میں چٹان ابھار دی
کیسی ظالم ہے وہ حکومت جس نے یہاں روشنی کا مینار تعمیر نہیں کیا
کتنے مجرم ہیں وہ جہاز ساز جنھوں نے جہاز کو حادثہ پروف نہیں بنایا

وہ چیخ رہا تھا، اور چیخ رہا تھا
مگر وہاں کوئی سننے والا نہ تھا جو اس کی چیخ کو سنے
اس کی آواز فضا میں تحلیل ہوتی رہی
یہاں تک کہ وہ بھی اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ سمندر میں غرق ہو گیا
اس کا چیخنا اس کے کام نہ آیا اور نہ دوسروں کے۔

عقل سے کام لیجئے نہ کہ جذبات سے

کسی شخص یا گروہ کی کامیابی کا راز کیا ہے۔ ایک لفظ میں یہ کہ: وہ انتہائی جذباتی مواقع پر انتہائی عقلی فیصلے کرسکے۔ اسی کو صبر کہتے ہیں۔ زندگی ایک مسلسل امتحان ہے جس میں بار بار ایسے مواقع آتے ہیں کہ آدمی جذبات سے مغلوب ہوجائے، وہ متاثر ذہن کے تحت کارروائی کرنے لگے۔ ایسے مواقع پر اپنے عقل و ہوش کو باقی رکھنا اور واقعات سے الگ ہوکر واقعات کے بارے میں فیصلہ کرنا قرآن کی اصطلاح میں صبر ہے اور یہی کسی کی کامیابی کی واحد یقینی ضمانت ہے۔ ولکم النصر ما صبرتم

وہ انھیں کھلاڑیوں کی بی ٹیم ہوگی

Second Eleven

Mr T. A. Pai, ex-Cabinet Minister, when asked to comment on the "no-change" in the style of functioning and the poor performance of the Government, is said to have remarked: "Why should anyone have expected anything better from them? They are only our B team."

The Illustrated Weekly of India
May 14, 1978

مسٹر ٹی۔ اے۔ پائی اندرا حکومت میں وزیر کابینہ تھے۔ ان سے موجودہ جنتا حکومت کے بارے میں پوچھا گیا کہ سرکاری مشین کی سست رفتاری اور اس کا طریقہ جو پہلے تھا وہی اب بھی کیوں ہے۔ حکمراں پارٹی کی تبدیلی کے باوجود اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ مسٹر پائی نے جواب دیا "لوگوں نے موجودہ حکومت سے کسی بہتر چیز کی توقع کیوں کرلی تھی۔ وہ آخر ہماری ہی "بی ٹیم" تو ہیں۔

اس میں ان مسلمانوں کے لئے کھلی سبق ہے جو ایک ملکی پارٹی کو ہٹا کر دوسری ملکی پارٹی کو برسر اقتدار لانے میں ملت کے مستقبل کا سیاسی خواب دیکھا کرتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ ایک کو ہٹا کر جس دوسرے کو وہ اوپر لائیں گے، وہ بھی پچھلے کھلاڑیوں ہی کی "بی ٹیم" ہوگی۔

کبھی سیاست کو ترک کرنے ہی کا نام سیاست ہوتا ہے

اکتوبر ۱۹۴۴ء میں دوسری عالمی جنگ اپنے شباب پر تھی۔ امریکہ، بحرالکاہل کے جزائر کو فتح کرتے ہوئے جاپان کے دروازہ تک پہنچ چکا تھا۔ اس وقت جاپان کے وائس ایڈمرل اونیشی (TAKIJIORO ONISHI) نے اپنی فوج کے اعلیٰ افسروں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا :

"میرے خیال سے اب ایک ہی راستہ رہ گیا ہے جس میں ہم یقین کر سکیں کہ ہماری معمولی طاقت زیادہ سے زیادہ موثر بن سکتی ہے۔ وہ یہ کہ ہم "زیرو فائٹرس" کا ایک دستہ بنائیں جو ۲۵۰ کیلوگرام کا بم لے کر دشمن کے سمندری جنگی جہازوں پر اپنے آپ کو گرا دیں"

اونیشی کی یہ تجویز ہوابازوں تک پہنچائی گئی۔ فی الفور منظوری کا فیصلہ ہو گیا۔ ہوابازوں کا ایک دستہ بنایا گیا جس کا نام تھا کامی کیز (KAMIKAZE) یہ ایک جاپانی لفظ ہے جس کے معنی ہیں "خدائی آندھی" یہ نام اس لئے اختیار کیا گیا کیونکہ تیرھویں صدی میں قبلائی خاں کے حملہ سے "ایک خدائی آندھی نے جاپان کو بچایا تھا" جس میں اس کی جنگی کشتیاں ایک سمندری طوفان نے تباہ کر ڈالی تھیں۔

اگست ۱۹۴۵ء میں جنگ ختم ہوئی تو پانچ ہزار کی تعداد میں جاپانی ہواباز اس طرح اپنی جانیں دے چکے تھے۔ انھوں نے اکتوبر ۱۹۴۴ اور جون ۱۹۴۵ کے درمیان ۳۴ امریکی جنگی جہازوں کو تباہ کر دیا تھا۔

جاپان کے بہادر ہوابازوں نے کن جذبات کے ساتھ یہ قربانیاں دی تھیں، اس کا اندازہ ایک خط سے ہوگا۔ سسومو (SUSUMU KIJITSU) اسی قسم کا ایک ۲۲ سالہ جاپانی ہواباز تھا جس نے ایک بم لے کر اپنے ہوائی جہاز کو دشمن کے ایک سمندری جنگی جہاز پر گرایا تھا، اس نے آخری دن اپنے دفتر سے اپنے خاندان کو حسب ذیل خط لکھا :

"میرے پیارے والدین، پیارے بھائیو اور میری پیاری بہن !

یقیناً آپ کو اس کا علم نہیں ہوگا، مگر چند دن پہلے میں نے آپ کو الوداع کہی ہے جب کہ میں اپنے گھر کے اوپر پرواز کر رہا تھا، میرے جہاز کے بازوؤں کے سایہ نے ہمارے مکان کی چھت کو چھوا۔ میرے خیالات ہمہ تن آپ کی طرف لگے ہوئے تھے۔ میں جانتا ہوں کہ بہت جلد میرا وقت آجائے گا۔ مگر مجھے موت کا ڈر نہیں۔ مجھے صرف یہ فکر ہے کہ میرا عمل کیا جاپان کو بچانے کے لئے مفید اور فیصلہ کن ثابت ہوگا۔ میں اور میرے ساتھی یہ یقین رکھتے ہیں کہ ہماری قربانیاں ہمارے بعد کی نسلوں کے لئے فتح لے آئیں گی۔ ہم نہایت پرسکون ہیں۔ ہم اکثر مذاق کرتے ہیں اور اپنا وقت پڑھنے اور تاش کھیلنے میں گزارتے ہیں۔ آپ ہمارے لئے غمگین نہ ہوں۔ اس کے برعکس آپ کو فخر کرنا چاہئے کہ میرا جسم اگرچہ جلد ہی ختم ہو جائے گا مگر میری روح ہمیشہ آپ کے پاس رہے گی۔ ۔ ۔ ۔ اب الوداع، کیونکہ آخر وقت کی گھنٹی ہو چکی ہے۔

(آپ کا بیٹا اور بھائی سسومو)

تاہم تاریخ کی یہ انوکھی قربانی جاپان کو بچانے والی ثابت نہ ہو سکی۔ کیوں کہ دشمن کے پاس ایک اور برتر طاقت تھی جس کے مقابلہ میں جاپانی ہوابازوں کی یہ لامثال قربانی

Kamikaze: Suicide Pilots

بھی بے اثر تھی۔ یہ تھا ایٹم بم۔ ۶ اگست ۱۹۴۵ کو امریکی ہوائیہ نے دو ایٹم بم جاپان کی زمین پر گرائے جس نے ہیروشیما اور ناگاساکی جیسے عظیم صنعتی شہروں کو چند منٹ میں خاک کا ڈھیر بنا دیا۔ اب جاپان کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ نہ تھا کہ وہ امریکہ کے سامنے ہتھیار ڈال دے۔ تاہم جاپان کے لئے اب بھی راستے بند نہیں ہوئے۔ اب اس نے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ اس نے "جنگ کو جاری رکھنے کے لئے جنگ کے خاتمہ" کا اعلان کر دیا۔ جاپان کے شہنشاہ ہیروہیٹو نے ریڈیو پر قوم کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

"— ہم ایک ناقابل برداشت صورت حال سے دوچار ہیں۔ مگر ہمیں اس ناقابل برداشت کو برداشت کرنا ہے تاکہ ہم جاپان کی اگلی نسلوں کی تعمیر نو کر سکیں۔"

جاپان نے امریکہ کے سیاسی اور فوجی اقتدار کو تسلیم کر لیا اور اس کے تحت غیر سیاسی میدانوں میں اپنی ترقی و استحکام کی تدبیریں شروع کر دیں۔ اب ان کا خصوصی نشانہ تھا سائنسی تعلیم اور جدید صنعت — "جنگ کو ختم کر کے جنگ جاری رکھنے" کی تدبیر کامیاب رہی۔ ۱۹۴۵ میں کئے گئے اس خاموش فیصلہ کا نتیجہ ۱۹۷۰ میں برآمد ہوا۔ ۲۵ سال تک "سیاست" چھوڑنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاپان ایک ناقابل تسخیر سیاسی طاقت بن گیا۔ سائنسی تعلیم، ٹکنالوجی، صنعت اور قومی کردار کی تعمیر میں جاپان نے جو غیر معمولی کامیابیاں حاصل کی تھیں، اس نے اپنے بالواسطہ اثرات پیدا کرنے شروع کئے۔ یہاں تک کہ امریکہ کے لئے اس کو نظر انداز کرنا ناممکن ہو گیا۔ امریکہ نے جزائر جاپان کا اقتدار جاپانی باشندوں کے حوالے کر دیا۔ اس کی فوجیں اوکی ناوا میں اپنے عظیم فوجی اڈہ کو خالی کر کے اپنے وطن واپس چلی گئیں۔

وہ ہار کو ماننا جانتا تھا

امریکہ کے ایک شخص نے ۱۸۳۱ میں تجارت کی۔ اس میں وہ ناکام ہو گیا۔ ۱۸۳۲ میں اس نے الکشن میں شکست کھائی۔ ۱۸۳۴ میں اس نے دوبارہ تجارت کی مگر اس بار بھی ناکام رہا۔ ۱۸۴۳ میں اس کو امید تھی کہ اس کی پارٹی اس کو کانگرس کی ممبری کے لئے نامزد کرے گی۔ مگر اس کی امید پوری نہ ہو سکی۔ ۱۸۵۵ میں وہ سینٹ کے لئے کھڑا ہوا مگر ہار گیا۔ ۱۸۵۸ میں دوبارہ اس کو سینٹ کے الکشن میں شکست ہوئی۔

یہ بار بار ناکام ہونے والا شخص ابراہام لنکن (۱۸۰۹ - ۱۸۶۵) تھا جو بالآخر ۱۸۶۰ میں امریکہ کا صدر چنا گیا اور آج وہ نئے امریکہ کا معمار سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر نارمن ونسنٹ پیل نے لنکن کی کامیابی کا راز یہ بتایا ہے: HE KNEW HOW TO ACCEPT DEFEAT وہ جانتا تھا کہ شکست کو کس طرح تسلیم کیا جائے۔

مقابلہ کی سیاست ترک کرکے

دوسری جنگ عظیم (۴۵-۱۹۳۹) میں جاپان اور برطانیہ ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اس جنگ میں جاپان نے بدترین شکست کھائی۔ مگر اس کے صرف ۲۰ سال بعد یورپ کے بازار جاپانی مصنوعات سے بھرے ہوئے تھے۔ جاپان نے ۱۹۷۲ میں برطانیہ اور دوسرے پانچ یورپی ملکوں میں ۲ بلین ڈالر کا سامان فروخت کیا۔ یورپ میں چھوٹے الکٹرانک سامان کی ۷۰ فی صد مارکٹ پر جاپان نے قبضہ کرلیا ہے۔ ۱۹۷۲ میں یورپ میں فروخت ہونے والی جاپانی کاروں کی تعداد ۳۶۸۰۲۵ تھی۔

جاپان کو کیسے یہ موقع ملا کہ وہ اپنے حریف کی اقتصادیات پر اس طرح چھا جائے، انگلستان میں مقیم ایک جاپانی تاجر سے جب یہ سوال کیا گیا تو اس نے جواب دیا:

I SURRENDERED MY SWORD TO A BRITISH
OFFICER AT THE END OF WORLD WAR II

Time (New York) August 6, 1973

دوسری جنگ عظیم کے بعد میں نے اپنی تلوار ایک برطانی افسر کے حوالے کردی تھی۔ مقابلہ کی سیاست میں جاپان کو شکست ہوگئی۔ جاپان نے مقابلہ کو ترک کرکے تعمیری شعبوں میں اپنے کو مستحکم کرنا شروع کردیا۔ جدوجہد کے میدان کی تبدیلی کارگر ثابت ہوگی۔ جاپان نے "ترک سیاست" سے وہ مقصد زیادہ بہتر طور پر حاصل کرلیا جس کو "سیاست" کے ذریعہ حاصل کرنے میں وہ ناکام ہوگیا تھا۔

عدم تشدد کا ہتھیار تشدد سے زیادہ سخت ثابت ہوا

ہندستان میں انگریزوں کے خلاف آزادی کی تحریک ۱۸۵۷ میں شروع ہوئی۔ ابتدائی ۵۰ سال تک یہ تحریک تشدد کے طریقہ پر چلتی رہی۔ ۱۹۱۹ میں مہاتما گاندھی ہندوستان کی سیاست میں داخل ہوئے تو انھوں نے اعلان کیا کہ وہ اہنسا کی بنیاد پر آزادی کی تحریک چلائیں گے۔

انگریز حکمراں کے لئے گاندھی جی کا عدم تشدد کا ہتھیار پچھلے "مجاہدین آزادی" کے تشدد کے ہتھیار سے زیادہ سخت ثابت ہوا۔ تشدد کو تشدد کے ذریعہ ختم کرنے کا ان کے پاس کافی وجہ جواز تھا۔ مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ عدم تشدد کے اصول پر اٹھنے والے طوفان کا مقابلہ کس طرح کریں۔ جب یہ صورت حال سامنے آئی تو ایک پرانے انگریز کلکٹر نے سکریٹریٹ کو تار دیا:

KINDLY WIRE INSTRUCTIONS HOW
TO KILL A TIGER NON-VIOLENTLY

براہ مہربانی بذریعہ تار ہدایات بھیجئے کہ ایک شیر کو تشدد کے بغیر کس طرح ہلاک کیا جائے ——

اکثر لوگ سیاست کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ حریف سے لامتناہی لڑائی جاری رکھی جائے۔ مگر اصل سیاست یہ ہے کہ خاموش تدبیر کے ذریعہ حریف کو اس طرح بے ہتھیار کردیا جائے کہ وہ لڑنے کے قابل نہ رہے

حقیقی واقعہ صرف حقیقی عمل کے ذریعہ وجود میں آتا ہے

آپ کے کمرہ کی دیوار پر جو کیلنڈر ہے، اس پر ۱۹۷۷ کا سنہ لکھا ہوا ہے۔ اگر آپ چاہیں کہ کیلنڈر کے اوپر ۲۰۷۷ کا سنہ لکھا ہوا نظر آئے تو اس کے لئے آپ کو پوری ایک صدی تک انتظار کرنا پڑے گا۔ ایک خود ساختہ کیلنڈر پر آپ جو ہندسہ چاہیں اپنے ہاتھ سے لکھ لیں۔ مگر وہ کیلنڈر جو دنیا کے نزدیک بھی کیلنڈر ہو، اس پر ۲۰۷۷ کا ہندسہ دیکھنے کے لئے سو سالہ انتظار کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

اس دنیا میں کیلنڈر کے لئے جو قانون ہے، وہی ملی تعمیر کا بھی قانون ہے، نعروں اور جوشیلی تقریروں میں ملت کا مستقبل دیکھنا ہو تو کسی بھی صبح و شام لفظوں کا سیلاب بہا کر اس قسم کا ایک خیالی محل کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ مگر حقیقی مستقبل کی تعمیر طویل جدوجہد کے بغیر ممکن نہیں۔

محرومی اُس وقت محرومی ہے جب کہ وہ آدمی کے اندر تلخی اور مایوسی پیدا کرے۔ مگر محرومی اس وقت ترقی کا زینہ بن جاتی ہے جب کہ وہ آدمی کی دبی ہوئی قوتوں کو جگانے والی ثابت ہو

بچوں کا گھروندا جتنی دیر میں بنتا ہے اس سے بھی کم مدت میں زمیں بوس ہوجاتا ہے

ایک طالب علم کے سرپرست کالج کے پرنسپل سے ملے ـــــ "آپ لوگوں نے جو تعلیمی نصاب بنایا ہے وہ بڑا طویل ہے۔ طالب علم کی عمر کا بڑا حصّہ صرف پڑھنے میں گزر جاتا ہے۔" انھوں نے کہا۔

"اس کا حل تو بہت آسان ہے" پرنسپل نے جواب دیا۔ "آپ مختصر نصاب بھی بنا سکتے ہیں۔ اصل میں مدت کا تعلق اس بات سے ہے کہ آپ طالب علم کے اندر کس درجہ کی لیاقت دیکھنا چاہتے ہیں۔ قدرت کو شاہ بلوط (OAK) کا درخت تیار کرنے میں سو برس لگ جاتے ہیں مگر جب وہ ککڑی اگانا چاہتی ہے تو اس کے لئے صرف چند مہینے درکار ہوتے ہیں۔ اگر آپ معمولی قسم کا علمی معیار چاہتے ہوں تو چند سال کی تعلیم بھی کافی ہو سکتی ہے مگر اعلیٰ تعلیم یافتہ بنانے کے لئے تو بہرحال زیادہ وقت دینا پڑے گا۔"

یہی حال قومی تعمیر کا بھی ہے۔ اگر آپ ٹھوس اور دیرپا تعمیر چاہتے ہیں تو اس کے لئے آپ کو صبر آزما انتظار کے مرحلہ سے گزرنا ہوگا اور لمبے عرصہ تک مسلسل محنت کرنی پڑے گی۔ لیکن اگر آپ بچوں کا گھروندا بنانا چاہتے ہوں تو پھر صبح شام میں ایسا گھروندا بن کر کھڑا ہو سکتا ہے۔ البتہ ایسی حالت میں آپ کو اس حادثہ کا سامنا کرنے کے لئے بھی تیار رہنا چاہئے کہ جتنی دیر میں آپ کا گھروندا بن کر کھڑا ہوا ہے اس سے بھی کم مدت میں وہ دوبارہ زمیں بوس ہو جائے۔

ہوائیں چلتی ہیں تو گرد و غبار اٹھ کر فضا میں اڑنے لگتے ہیں مگر گرد و غبار کی پرواز کیلئے آخری طور پر جو انجام مقدر ہے وہ یہ کہ دوبارہ وہ زمین پر گریں اور قدموں کے نیچے پامال ہونے کے لئے باقی رہ جائیں۔

مگر یہی ہوائیں پانی کے قطروں کو بھی پرواز پر آمادہ کرتی ہیں۔ مگر یہاں معاملہ بالکل مختلف ہوتا ہے۔ قطرے فضا میں جا کر بادل بنتے ہیں، پھر وہ بارش کی شکل میں زمین پر برستے ہیں۔ اس کے بعد نالوں اور ندیوں سے ہوتے ہوئے سمندر میں پہنچتے ہیں اور بالآخر اس عظیم آبی چادر کا حصّہ بن جاتے ہیں جو دوامی طور پر پورے کرۂ ارض کو لپیٹے ہوئے ہے۔

ایسا ہی کچھ معاملہ ہماری سرگرمیوں کا بھی ہے۔ سطحی اور غیر دانش مندانہ سرگرمیاں انسانوں کو صرف گڑھے میں گرانے کا باعث ہوتی ہیں اور جن سرگرمیوں کی بنیاد گہری بصیرت پر ہوتی ہے وہ آدمی کو ترقی کے آسمان پر پہنچا دیتی ہیں۔ پچھلے ڈیڑھ سو برس کے درمیان ہم نے اس ملک میں قومی تعمیر کے نام سے زبردست ہنگامہ آرائی کی ہے مگر یہ کوششیں اس انجام پر ختم ہوئی ہیں کہ آج ہم صرف گرد راہ بن کر انسانی قافلوں کے قدموں کے نیچے پامال ہونے کے لئے پڑے ہوئے ہیں۔ حالانکہ ہم کو جدّوجہد کا جو طویل موقع ملا اور اسمیں جو سنہری امکانات ہمارے لئے چھپے ہوئے تھے اگر ہم نے دانش مندی کے ساتھ انھیں استعمال کیا ہوتا تو آج ہم زمین پر چھائے ہوئے ہوتے۔ فریاد و ماتم کے بجائے ہم فیصلہ کرنے والے کی پوزیشن میں ہوتے۔ ہمارے لئے آسمانی پرواز بھی مقدر تھی۔ مگر ہماری بے بصیرتی کی وجہ سے صرف زمین کی پامالی کا انجام ہمارے حصّہ میں آیا ہے۔

کبھی سست رفتاری زیادہ عظیم ہوتی ہے

تارکول کی چکنی سڑک پر نئی کار تیزی سے پھسل رہی تھی۔ دوسری طرف سڑک کے کنارے ایک کسان ٹریکٹر کی پیٹھ پر ہچکولے کھا رہا تھا۔ وہ ٹیلوں اور کھائیوں کو ہموار کر رہا تھا تاکہ اس کو فصل اگانے کے قابل بنائے۔ کار کے لئے کوئی ٹھہراؤ نہیں تھا جب کہ ٹریکٹر کو جگہ جگہ ٹھوکر لگ رہی تھی۔ اس کو بار بار رکنا پڑتا تھا۔

کار کے مقابلہ میں ٹریکٹر کی یہ حالت کسی بھی درجہ میں اس کی اہمیت کو نہیں گھٹاتی۔ کار بنے بنائے راستہ پر دوڑ رہی ہے، جب کہ ٹریکٹر خود اپنا راستہ بنا رہا ہے۔ ایک ماضی میں سفر کر رہا ہے، دوسرا مستقبل کی طرف مارچ کر رہا ہے۔ ایک تاریخ کے اندر گم ہے، دوسرا اپنی جدوجہد سے خود ایک تاریخ بنا رہا ہے۔

ٹریکٹر کی سست رفتاری میں جو عظمتیں چھپی ہوئی ہیں، اس کے مقابلہ میں کار کی تیز رفتاری کی کوئی حقیقت نہیں۔

دوسروں کے ساتھ اچھا سلوک خود اپنے لئے مفید ہوتا ہے

شیخ سعدی شیرازی (۶۹۱ — ۵۸۹ ھ) کی کتاب بوستاں کے شروع میں ایک حکایت درج ہے۔ اس کا عنوان ہے: "پند دادن کسرے ہرمز را"۔ اس حکایت کے مطابق ایران کا بادشاہ نوشیرواں جب مرض الموت میں مبتلا ہوا تو اس نے اپنے جانشین ہرمز کو بہت سی نصیحتیں کیں۔ ان میں سے ایک نصیحت، سعدی کے الفاظ میں، یہ تھی:

مراعات دہقاں کن از بہر خویش   کہ مزدور خوش دل کند کار بیش

یعنی چودھریوں اور سرداروں کے ساتھ رعایت کرو، اس سے خود تم کو فائدہ ہوگا۔ کیوں کہ مزدور جب خوش ہو تو وہ کام زیادہ کرتا ہے۔

یہ کام ہے یا لیڈری

ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی (۱۹۱۳–۱۹۷۴) ابتدا میں آل انڈیا امن کونسل کے ممبر تھے۔ اس کے بعد اس سے علیٰحدہ ہوگئے اور اولاً آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت اور اس کے بعد مسلم مجلس کے ذریعہ کام کرتے رہے۔ امن کونسل سے اپنی علیٰحدگی کے بارے میں ایک شخص کو انٹرویو دیتے ہوئے انھوں نے کہا تھا:

"جب جبل پور میں بدامنی (۱۹۶۳) ہوئی تو میں نے کونسل سے کہا کہ چلو جبل پور چل کر کچھ کام کریں۔ مگر ان لوگوں نے میری بات نہ مانی۔ وہ بین الاقوامی امن کی بات تو کرتے تھے۔ مگر انھیں گھر کی بدامنی رفع کرنے کے کام سے دل چسپی نہ تھی۔ مجھے یہ بات عجیب سی لگی اور محسوس ہوا کہ ایسی تنظیم سے میرا تعلق رکھنا بے کار سی بات ہے۔ اس لئے میں نے استعفا دے دیا" (الحسنات اگست ۱۹۷۷)

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے جو بات امن کونسل کے بارے میں کہی، وہ صد فی صد صحیح ہے، صرف اس اضافہ کے ساتھ کہ خود ہمارے رہنماؤں کا حال بھی یہی ہے۔ ہمارا تقریباً ہر رہنما، خواہ وہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی، عالمی کاموں سے خصوصی دل چسپی رکھتا ہے۔ اپنے گھر، اپنے محلہ، اپنے ادارہ اور اپنے قریبی دائرہ میں اس کے لئے جو کام ہیں، اس میں مصروف ہونا وہ اپنے لئے چھوٹی بات سمجھتا ہے۔ اس کے برعکس آل انڈیا اجتماعات کی صدارت اور بین اقوامی نمائش گاہوں میں تقریری کمال دکھانا اس کو زیادہ پسند ہے۔ موجودہ زمانہ میں ملت کی بربادی کی، اگر کُل نہیں تو کم از کم ایک بڑی وجہ، یقیناً یہی ہے۔

اللہ کے سامنے سرخروئی حاصل کرنے کا جذبہ آدمی کو اپنی ذاتی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ مگر انسانوں کے سامنے سرخروئی حاصل کرنے کا شوق ہو تو آدمی کو "باہر" کی فکر زیادہ ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ عام انسانوں کو وہی "کام" زیادہ نظر آتے ہیں جو دور دور کئے گئے ہوں۔

سفر ابتدا سے شروع ہوتا ہے نہ کہ درمیان سے

"We must
start again
from scratch . . ."

ہم کو ابتدائی نقطہ سے اپنا سفر شروع کرنا ہے۔
کوئی شخص اگلی منزل سے اپنے سفر کا آغاز نہیں کر سکتا۔

سفر کا آغاز جب بھی ہوگا وہیں سے ہوگا جہاں آدمی فی الواقع کھڑا ہوا ہے — ایک شخص دہلی میں ہے اور بمبئی پہنچنا چاہتا ہے، ایسے شخص کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ دادر سے اپنا سفر شروع کرے۔ اس کو بہرحال دہلی سے چلنا ہوگا۔ دادر سے سفر شروع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ سفر کبھی شروع ہی نہ ہو۔

الٹی سمت میں

ایک لطیفہ ہے کہ دہلی میں ایک مسافر کناٹ پلیس کی سڑک پر چل رہا تھا۔ اس کو پارلیمنٹ ہاؤس جانا تھا۔ مگر اس کا رخ الٹی طرف تھا۔ اس نے راستہ میں ایک شخص سے پوچھا: "پارلیمنٹ ہاؤس یہاں سے کتنی دور ہوگا" جواب دینے والے نے کہا "تقریباً ۲۵ ہزار میل"۔ مسافر یہ سن کر گھبرا گیا۔ "جناب میں آپ سے راستہ پوچھ رہا ہوں اور آپ مجھ سے مذاق کر رہے ہیں" اس نے کہا: معاف کیجئے گا۔ میں نے مذاق نہیں کیا۔ اصل میں آپ پارلیمنٹ ہاؤس کے الٹی طرف چل رہے ہیں۔ اس لئے اگر آپ یوں ہی چلتے رہے تو زمین کا پورا چکر کرنے کے بعد ہی آپ اپنی منزل پر پہنچ سکیں گے جس کی گولائی ۲۵ ہزار میل ہے۔" یہ بات بھی اس وقت ہے جب کہ آپ عرض البلد کے ٹھیک اس خط پر چل رہے ہوں جس پر پارلیمنٹ ہاؤس واقع ہے۔ اگر آپ کچھ دائیں بائیں ہوگئے تو زمین کا بار بار چکر کرنے کے بعد بھی آپ اپنی منزل کو پانے سے محروم رہیں گے۔"

پارلیمنٹ ہاؤس کا کوئی مسافر اس قسم کی غلطی نہیں کرے گا۔ کیونکہ لوگ اپنے دنیوی معاملات میں اتنے نادان نہیں ہوتے کہ اپنی غلطی واضح ہونے کے بعد بھی بدستور الٹی راہ پر چلتے رہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ دین کے شدید تر معاملہ میں بیشتر لوگ اسی غلطی میں مبتلا ہیں۔ واضح کرنے والے ان کی غلطیاں واضح کرتے ہیں۔ ان کا دل بھی گواہی دیتا ہے کہ میں غلطی پر ہوں۔ مگر شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ اس کو عزت کا سوال بنا لیتے ہیں۔ "اگر میں نے اس کے کہنے سے اپنی غلطی مان لی تو میں چھوٹا ہو جاؤں گا" یہ احساس ان کے لئے رکاوٹ بن جاتا ہے۔ وہ بدستور غلط راستہ پر چلتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ تباہی کے گڑھے میں جا گرتے ہیں۔ احیاء ملت کا سفر بھی موجودہ زمانہ میں کچھ اسی نوعیت کا ہو گیا ہے۔ لوگ الٹی سمت میں بھاگے جا رہے ہیں وہ بھول گئے ہیں کہ الٹی سمت میں سفر آدمی کو منزل سے اور دور کر دیتا ہے نہ کہ اس سے قریب۔

مسائل کا حل خاموش منصوبہ میں نہ کہ پُر رونق ہنگاموں میں

اسرائیل کے وزیر اعظم مسٹر بیگن سے پوچھا گیا "کیا اسرائیل اس کے لئے تیار ہے کہ مقبوضہ مغربی اردن اور فلسطینیوں کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے گفتگو کرے" انھوں نے جواب دیا:

WE WILL FIND A SOLUTION TO THE PALESTINIAN PROBLEM, BUT NOT IN FRONT OF THE TELEVISION CAMERAS

ہم فلسطینی مسئلہ کا حل پالیں گے۔ مگر ٹیلی وژن کیمروں کے سامنے نہیں۔ (ٹائمس آف انڈیا ۱۲ دسمبر ۱۹۷۷)

قوموں کے مسائل کا حل خاموش منصوبہ بندی میں ہوتا ہے۔ مگر اکثر قائدین اس کو پُر رونق ہنگاموں میں تلاش کرتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ اس طرح دو فائدوں میں سے کم از کم ایک فائدہ یقینی طور پر حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کے ذریعہ قائد کی اپنی شخصیت بہر حال نمایاں ہو جاتی ہے۔ خواہ قوم کا مسئلہ حل ہو یا نہ ہو۔

کامیابی کا راز یہ ہے کہ ــــ

آدمی اپنی ناکامی کے راز کو جان لے

●●●

پختگی اس صلاحیت کا نام ہے کہ آدمی ان چیزوں کے ساتھ پرامن طور پر رہ سکے جن کو وہ بدل نہیں سکتا۔

پختگی انکساری کا نام ہے۔ ایک پختہ انسان یہ کہنے کا حوصلہ رکھتا ہے کہ "میں غلطی پر تھا"

●●●

سورج ایک بے حد روشن حقیقت ہے۔ مگر جو شخص اپنی آنکھیں بند کرلے، اس کے لئے سورج کا کوئی وجود نہیں۔

●●●

ذاتی نقصان کا اندیشہ ہو تو آدمی فوراً حقیقت پسندانہ انداز میں سوچنے لگتا ہے۔ مگر ملی معاملات میں دلائل کا انبار بھی کسی کو حقیقت پسند بنانے کے لئے کافی نہیں۔

●●●

کبھی جاننا اس کا نام ہوتا ہے کہ آدمی یہ کہہ دے کہ "میں نہیں جانتا"

اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ کیجئے آپ کو دوسروں سے کوئی شکایت نہ ہوگی

پتھر ہر ایک کے لئے سخت ہے۔ البتہ وہ اس کے لئے نرم ہو جاتا ہے جس نے اس کو توڑنے کا اوزار فراہم کرلیا ہو ــــ یہی صورت ہر معاملہ میں پیش آتی ہے۔ اگر آپ لیاقت اور اہلیت کے ساتھ زندگی کے میدان میں داخل ہوں تو ہر جگہ آپ اپنا حق وصول کر کے رہیں گے۔ اور اگر لیاقت اور اہلیت کے بغیر آپ نے زندگی کے میدان میں قدم رکھا ہے تو آپ کے لئے اس دنیا میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اپنی مفروضہ حق تلفی کے خلاف فریاد وفغاں کرتے رہیں۔

ماحول سے کوئی امید نہ رکھئے، بلکہ اپنی محنت اور لیاقت پر بھروسہ کیجئے۔ آپ کو ماحول سے کبھی شکایت نہ ہوگی۔ ماحول کی شکایت دراصل ماحول سے زیادہ خود اپنی نالائقی کا اظہار ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے وہ ناگزیر تیاری نہیں کی تھی جو ماحول سے اپنا حق وصول کرنے کے لئے ضروری ہے۔

ناکامی کی وجہ

شریف کامل ایک اخوانی رہنما ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اخوان المسلمین کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ وہ سیاست میں قبل از وقت داخل ہوگئی: تدخلنا في السياسة قبل وقتها

برتر سطح سے کام کرنے کا ذہن پیدا کیجئے

کسی شہر میں کپڑے کی دوکان نہ ہو تو ہر شخص جانتا ہے کہ یہ ایک سنہری موقع ہے جس کو استعمال کر کے کوئی شخص شہر میں ایک کامیاب دوکان کا مالک بن سکتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہاں ایک اس سے بھی زیادہ بڑا خلا ہے جس کو ابھی تک کسی نے استعمال نہیں کیا۔ ہمارے ملک کے بھرے ہوئے دفاتر اور ہمارے پررونق بازار جہاں ہر وقت خرید و فروخت کے ہنگامے جاری رہتے ہیں اپنی ساری ہماہمی کے باوجود ابھی تک خالی ہیں۔

آپ بازار سے کوئی ملک کی بنی ہوئی چیز خریدیں چند ہی روز کے تجربے کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ کو اپنی پسند کی چیز نہیں ملی۔ آپ اپنے کام کے لیے ملازم رکھئے، بہت جلد آپ محسوس کریں گے کہ آپ جیسا کارکن چاہتے ہیں، آپ کا ملازم ان اوصاف میں پورا نہیں اترتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بازار اگرچہ سامانوں سے پٹے ہوئے ہیں مگر وہ ان چیزوں سے خالی ہیں جو حقیقتاً گاہک کو مطمئن کرنے والی ہوں۔ اسی طرح وہ جگہیں جہاں آدمی کو کام ملتا ہے اگرچہ بظاہر بھری ہوئی ہیں۔ مگر انھیں اب بھی ایسے کارکنوں کا انتظار ہے جو ان کی مرضی کے مطابق ان کا کام پورا کر سکیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آج سارا ملک ایک عظیم خلا سے دوچار ہے۔ اور یہ خلا اعلیٰ مصنوعات اور بہتر کارکردگی کا خلا ہے۔ اگر کوئی گروہ ہو جو محنت اور عملی دیانتداری میں اعلیٰ معیار دکھا سکے، جو مثال کے طور پر جرمنی اور

کارکردگی کا خلاء پر کرکے آپ اپنے لئے جگہ حاصل کرسکتے ہیں۔

جاپان میں نظر آتا ہے تو وہ آناً فاناً ملک کی اقتصادیات پر چھا جائے گا اور جو گروہ اقتصادیات پر قابض ہو جائے وہ لازمی نتیجہ کے طور پر دوسرے شعبوں پر بھی قابض ہو کر رہتا ہے۔

دنیا میں اپنی جگہ بنانے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ______ جس آسامی کے لیے بی اے کی قابلیت کی شرط ہو اور بی اے والوں نے درخواستیں دے رکھی ہوں۔ وہاں آپ بھی اپنی بی اے کی ڈگری لے کر پہنچ جائیں اور جب آپ کو نہ لیا جائے تو بحث کریں کہ کیوں آپ کے مقابلے میں دوسرے امیدوار کو ترجیح دی گئی جبکہ دونوں یکساں طور پر گریجویٹ تھے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ جہاں لوگ بی اے کی سندیں پیش کر رہے ہوں وہاں آپ ماسٹر ڈگری لے کر پہنچیں جہاں لوگ مطابق شرائط قابلیت کی بنیاد پر اپنا حق مانگ رہے ہوں وہاں آپ برتر از شرائط قابلیت دکھا کر اپنا حق تسلیم کرائیں۔

یہی دوسرا طریقہ زندگی کا اصل طریقہ ہے۔ تمام بڑی بڑی ترقیاں اور کامیابیاں انھیں کے لیے مقدر ہیں جو اس دوسرے طریقے کے مطابق کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔

مسلم قیادت موجودہ زمانے میں سب سے زیادہ ناکام قیادت ثابت ہوئی ہے۔ اس کی وجہ اس کی یہ غلطی ہے کہ اس نے مسلمانوں کے مستقبل کو تعمیر کے بجائے سیاست میں تلاش کیا۔ سیاست بازی کا مطلب ہے، اپنے مسائل کے حل کے لئے دوسروں کے خلاف مہم چلانا۔ جب کہ تعمیر یہ ہے کہ اپنے مسائل کے لئے خود اپنے اوپر عمل کیا جائے۔

کرنے کا اصل کام یہ تھا کہ قوم کو اس حیثیت سے تیار کیا جائے کہ لوگوں کے عقائد مضبوط ہوں۔ ان کے اندر اخلاق کی طاقت ہو، وہ تعلیم میں اونچے ہوں، ان میں باہم اتحاد ہو اقتصادی شعبوں میں انھوں نے اپنی جگہ بنائی ہو۔ سماجی بہبود کے ادارے ان کے درمیان چل رہے ہوں۔ وہ زمانے کو پہچانیں اور اس کے مطابق کام کرنا جانتے ہوں۔ اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے اندر وہ شعور ابھارا جائے کہ وہ صاحب نظریہ افراد کی حیثیت سے لوگوں کے درمیان رہ سکیں۔ انھیں چیزوں کے اوپر کسی قوم کی زندگی کا دارو مدار ہے لیکن مسلمانوں نے دوسروں کے خلاف سیاسی ہنگامہ آرائی تو خوب کی، خود اپنی تعمیر کے لئے کوئی کام نہ کیا۔

مزید نادانی یہ ہے کہ سیاست بازی سے جب وہ کامیاب نہ ہو سکے تو اب انھوں نے دوسرا مشغلہ یہ اختیار کیا ہے کہ اپنی ناکامی کے لئے دوسروں کو ذمہ دار ٹھہرا رہے ہیں۔ حالانکہ اس قسم کی باتوں سے وہ صرف یہ بات ثابت کر رہے ہیں کہ قرآن کے الفاظ میں انھوں نے کلمۂ طیبہ کا درخت نہیں اگایا تھا، بلکہ کلمۂ خبیثہ کا درخت اگایا تھا۔ کیونکہ کلمہ طیبہ کے درخت کے لئے خدا کا اعلان ہے کہ کوئی اس کو اکھاڑ نہیں سکتا۔ یہ انجام صرف کلمہ خبیثہ کے درخت کے لئے مقدر ہے کہ جو چاہے ہاتھ بڑھا کر اس کو اکھاڑ لے۔ (ابراہیم)

ایمان یہ ہے کہ جب کوئی غیر معمولی بات پیش آئے تو آدمی کے اندر نفسانیت نہ جاگے بلکہ خدا پرستی جاگے

آدمی کی زندگی میں مختلف قسم کے واقعات پیش آتے ہیں۔ کبھی آرام کبھی تکلیف، کبھی تعریف کبھی تنقید۔ کبھی خوشی کبھی غم ——— یہ اتار چڑھاؤ سب امتحان کے پرچے ہیں۔ کامیابی یہ ہے کہ ان واقعات سے آدمی کے اندر نفسانیت نہ جاگے بلکہ خدا پرستی جاگے۔ خوشی اور آرام ہو تو اس کے اندر شکر کا جذبہ ابھرے۔ کسی سے کوئی تکلیف پہنچے تو اس کے اندر عجز اور عبدیت کی روح پیدا ہو۔

۱۹۷۵ میں شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کے کابینی رفقاء مسٹر تاج الدین احمد، مسٹر قمر الزماں، مسٹر نذر الاسلام اور دوسرے بہت سے لوگ قتل کر دیئے گئے تھے۔ اس واقعہ سے کسی قدر پہلے اپریل ۱۹۷۵ میں بنگالی صحافی مسٹر سکھ رنجن داس گپتا ڈھاکہ گئے تھے اور بنگلہ دیش کے لیڈروں سے ملے تھے۔ انھوں نے بنگلہ دیش کے خونیں واقعات پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے :

The Midnight Massacre in Dacca

مسٹر گپتا کے بیان کے مطابق اپریل ۱۹۷۵ میں جب وہ دوسرے ہندوستانی صحافیوں کے ساتھ ڈھاکہ پہنچے تو وہاں مجیب حکومت کو ختم کرنے کی افواہیں گرم تھیں۔ مسٹر قمر الزماں سے جب وہ ان کی رہائش گاہ پر ملے تو موصوف کے الفاظ میں :

The first thing he asked for was the tin of Zarda

پہلی چیز جو انھوں نے مجھ سے مانگی وہ زردہ تھا۔ میں نے بتایا کہ میں ان کے لئے زردہ کا ایک ڈبہ لایا ہوں۔

مسٹر تاج الدین سے جب وہ ان کے مکان پر ملے تو انھوں نے مسٹر گپتا سے فرمائش کی کہ وہ ایشور چندر ودیا ساگر کی کتابیں پڑھنا چاہتے ہیں۔ یہ کتابیں ان کو فراہم کر دی گئیں۔ مسٹر خوندکر مشتاق جو اس وقت ٹریڈ اور کامرس کے منسٹر تھے، انھوں نے شکایت کی کہ کلکتہ کے اخبارات نے اپنے صفحات میں ان کو اتنی جگہ نہیں دی جتنی انھوں نے مسٹر تاج الدین اور مسٹر نذر الاسلام کو دی۔ مسٹر داس گپتا لکھتے ہیں میں سمجھ نہ سکا کہ وہ شیخ مجیب کے خلاف اپنی شکایت کو میرے جیسے ایک غیر ملکی صحافی سے کیوں بیان کر رہے ہیں

" ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ کو پاکستانی فوج نے بنگلہ دیش میں مار دھاڑ کیوں شروع کی"۔ مسٹر تاج الدین نے بتایا کہ الیکشن کے بعد ہم نے خفیہ منصوبہ بنایا کہ بنگلہ دیش کی مکمل آزادی کا اعلان کر دیں۔ یہ منصوبہ خوندکر مشتاق کے ذریعہ پاکستان کے لیڈروں تک قبل از وقت پہنچ گیا اور انھوں نے فوجی کارروائی شروع کر دی "۔

کام کا آغاز خود اپنی ذات سے

"ہماری قوم جاہل ہے، آپ اس کی جہالت دور کرنے کے لئے کیوں نہیں اُٹھتے"

"آپ نے خود کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے"

"میں تو بدقسمتی سے کوئی تعلیم حاصل نہ کرسکا"

"پھر آپ یہ کیجیے کہ فوراً کسی تعلیمی ادارہ میں داخلہ لے لیجئے۔ اگر آپ نے پڑھ لیا تو قوم کا کم سے کم ایک جاہل کم ہو جائے گا"

دو شخصوں کی یہ گفتگو بتاتی ہے کہ موجودہ حالات میں ہمارے کرنے کا کام کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ دوسروں کو تلقین کرنے کے بجائے ہر شخص اپنے کام میں لگ جائے۔ زندہ قوم کی علامت یہ ہے کہ اس کا ہر شخص "میں کیا کروں" کے سوال پر سوچتا ہے۔ اس کے برعکس جب قوم کے افراد "دوسرے کیا کریں" کے سوال پر بحث کرنے لگیں تو سمجھنا چاہئے کہ قوم مرچکی ہے۔ اس قسم کی حرکت موت کی حرکت ہے نہ کہ زندگی کی حرکت۔

اقدام سے پہلے تیاری ضروری ہے

عربی کا ایک مثل ہے: قبل الرمی یراش السہم (تیر مارنے سے پہلے تیر کو کمان میں ٹھیک طریقے جمایا جاتا ہے)۔ تیر کو کمان میں اچھی طرح بٹھائے بغیر یونہی چلا دیا جائے تو وہ کبھی نشانہ پر نہیں لگے گا۔ اسی طرح کوئی اقدام ضروری تیاری کے بغیر کیا جائے تو اس کا ناکام ہونا یقینی ہے۔

یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے

مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۱۴ میں "دارالارشاد" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا۔ ادارہ کے مقاصد بیان کرتے ہوئے انھوں نے لکھا:

"ہمارے کاموں کی بڑی قسمیں صرف دو ہی ہیں — مسلمانوں کی داخلی اصلاح و احیائے علم و عمل، اور غیر قوموں میں اسلام کی تبلیغ۔ یہ دونوں کام بغیر کسی ایسی جماعت کی موجودگی کے انجام نہیں پا سکتے۔ جس قدر تحریکیں، انجمنیں، کانفرنسیں اور متفرق کوششیں بغیر اس کے ہوں گی، وہ اسی طرح ضائع ہو جائیں گی جس طرح اب تک ضائع ہو چکی ہیں"۔ البلاغ ۱۲ نومبر 1915

چالیس سال پہلے مولانا آزاد کا یہ تجزیہ کس قدر صحیح تھا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ دنوں بعد وہ ان دونوں کاموں کو چھوڑ کر "متفرق کوششوں" بالفاظ دیگر سیاست کی لائن پر چل پڑے۔ اگرچہ وہ آخر وقت تک یہی اعلان کرتے رہے کہ "میں نے ۱۶ سال کی عمر میں اپنے لئے جو راستہ مقرر کیا تھا، اسی پر میں آج بھی قائم ہوں"

یہی موجودہ زمانہ میں تقریباً تمام شخصیتوں کا حال ہوا ہے۔ وہ آغاز میں ایک خالص دینی مقصد لے کر اٹھیں۔ مگر دھیرے دھیرے ان کی گاڑی سیاست کی پٹری پر اتر گئی۔ مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ ہر ایک آخر وقت تک یہی اعلان کرتا رہا کہ وہ اب بھی اسی مقصد پر قائم ہے جو اس نے شروع میں اپنے سامنے رکھا تھا۔

وقت گزرنے کے بعد

۳۰ جنوری ۱۹۴۸ کو مہاتما گاندھی کو گولی سے ہلاک کر دیا گیا تھا۔ اس وقت سے ہر سال یہ دن "یوم شہیداں" کے طور پر منایا جاتا ہے۔ ۳۰ جنوری ۱۹۷۸ کو اس موقع پر جو تقریبات ہوئیں، ان میں سے ایک یہ تھا کہ برطانی نوبل انعام یافتہ لارڈ فلپ نویل بیکر کو لکچر کے لئے مدعو کیا گیا۔ اس اجتماع کی صدارت مسٹر اٹل بہاری باجپئی نے انجام دی۔

مسٹر باجپئی، جو اس وقت ہندستان کے وزیر خارجہ ہیں، ۱۹۴۸ میں ڈاکٹر شیام پرشاد مکرجی (ہندو مہاسبھا) کے پرسنل سکریٹری تھے۔ مسٹر باجپئی کی صدارتی تقریر کی جو رپورٹ اخبارات میں آئی ہے، اس کا ایک حصہ یہ ہے۔

MR ATAL BEHARI VAJPAYEE, EXTERNAL AFFAIRS MINISTER, CONFESSED HERE TODAY THAT HE HAD FOUND MAHATMA GANDHI WANTING AT THE TIME OF INDIA'S PARTITION IN HIS APPROACH TO THE COMMUNAL QUESTION.

The Times of India, 31.1.1978

وزیر خارجہ مسٹر اٹل بہاری باجپئی نے اپنی تقریر میں اعتراف کیا کہ اس وقت ان کا خیال تھا کہ مہاتما گاندھی نے ملک کی تقسیم کے وقت فرقہ وارانہ سوال پر جو موقف اختیار کیا، وہ قومی معیار سے گرا ہوا تھا۔ (گر اب وہ سمجھتے ہیں کہ مہاتما گاندھی کا موقف ہی درست تھا)

حقیقت پسند رہنماؤں کے ساتھ اکثر یہ المیہ پیش آتا ہے کہ ان کے وقت کے پرجوش لوگ ان کے موقف کو پست ہمتی کا موقف سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ بعد کے حالات ثابت کرتے ہیں کہ وہی زیادہ صحیح اور قابل عمل تھا۔

صحیح کوشش کرنے والے کے لئے

ناکامی کا سوال نہیں

جو حرکت کرنا چاہے اس کا راستہ کبھی بند نہیں ہوتا ــــ گیس نیچے نہیں سماتی تو اوپر اٹھ کر اپنے لیے جگہ حاصل کرتی ہے۔ پانی کو اونچائی آگے بڑھنے نہیں دیتی تو وہ نشیب کی طرف بہہ کر اپنا راستہ بنا لیتا ہے۔ درخت سطح پر قائم نہیں ہو سکتا تو وہ زمین کو پھاڑ کر اس سے اپنے لئے زندگی کا حق وصول کرتا ہے۔

یہی طریقہ آپ کو بھی اختیار کرنا ہے، آپ کا پہلا کام یہ ہے کہ اپنے آپ کو سمجھیں، اپنی قوتوں کو صحیح ڈھنگ سے ترتیب دیں اور پھر ماحول کو سمجھ کر ماحول کے اندر اس طرح گھسیں کہ اسکے مقابلہ میں اپنی اہلیت ثابت کرنے کے لیے آپ پوری طرح مسلح ہوں۔ حالات سے اپنی اہمیت منوانے کے لیے آپ نے ضروری سامان کر لیا ہو۔

لیاقت پیدا کیجئے اور دانش مندی کے ساتھ اپنے لئے راہ نکالیے، اس کے بعد آپ کو کبھی ماحول سے شکایت نہ ہوگی۔ زندگی کی کسی منزل پر آپ اپنے کو ناکام محسوس نہیں کریں گے۔ ناکامی اور مایوسی صرف وہیں آتی ہے جہاں زندگی کی ضروری شرطیں پوری کرنے میں کوئی کوتاہی رہ گئی ہو۔

ناکافی تیاری کے ساتھ کیا ہوا اقدام مسئلہ کو پہلے سے زیادہ سنگین بنا دیتا ہے

ڈیگال ازم: اپنی مقبولیت کی قیمت پر قوم کے مستقبل کی تعمیر

ہندوستان کے وزیر خارجہ مسٹر اٹل بہاری باجپئی نے فروری ۱۹۷۸ کے پہلے ہفتہ میں پاکستان کا دورہ کیا۔ اس موقع پر پاکستان کے فوجی حکمراں جنرل ضیاء الحق نے اخبار نویسوں سے بات کرتے ہوئے کہا:

THE BEST DESCRIPTION I CAN GIVE OF MR VAJPAYEE IS THAT AS A POLITICIAN IN OFFICE HE IS DIFFERENT FROM WHAT HE WAS IN THE OPPOSITION.

مسٹر باجپئی کے بارے میں بہترین الفاظ جو میں کہہ سکتا ہوں، وہ یہ کہ بحیثیت وزیر حکومت وہ اس سے مختلف ہیں جیسے کہ وہ اس وقت تھے جب کہ وہ اپوزیشن میں تھے۔

دونوں ملکوں کے لیڈروں کے درمیان اسلام آباد میں جو گفتگو ہوئی، اس میں کشمیر کا مسئلہ نمایاں رہا۔ اس واقعہ کے باوجود کہ دونوں ممالک اپنے تعلقات کو مستحکم بنانے کے لئے پوری طرح سنجیدہ تھے، طرفین نے محسوس کیا کہ کشمیر کا مسئلہ دونوں کے تعلقات کو معمول پر لانے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، کیونکہ:

THE PUBLIC OPINION IN INDIA WAS VERY SENSITIVE ON THIS SUBJECT.

ہندوستان کی رائے عامہ اس مسئلہ کے بارے میں بے حد حساس ہے۔ دوسری طرف جنرل ضیاء الحق نے صفائی کے ساتھ کہا کہ بنیادی مشکل یہ ہے کہ:

WE ARE ALLERGIC ON KASHMIR

کشمیر کے معاملہ میں ہم پاکستانی الرجک واقع ہوئے ہیں۔

ٹائمس آف انڈیا، ۷ فروری ۱۹۷۸

یہ اخباری رپورٹ بتاتی ہے کہ موجودہ زمانہ کی "جمہوری سیاست"، کس تضاد سے دوچار ہے۔ ایک لیڈر جب تک ایوانِ حکومت کے باہر ہوتا ہے، وہ آتشیں تقریریں کرتا ہے، کیونکہ ہند و پاک جیسے علاقہ میں عوامی لیڈر بننے کا یہ سب سے آسان طریقہ ہے۔ مگر اس کی سیاسی مقبولیت جب اس کو حکومت کی کرسی پر پہنچا دیتی ہے تو معاملہ بدل جاتا ہے۔ اب اس کو محسوس ہوتا ہے کہ حکومت کا انتظام چلانے کے لئے حقیقت پسندی کی ضرورت ہے۔ مگر یہاں عوام کی وہی جذباتیت، حقیقت پسندانہ سیاست کے لئے سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے جو اس سے پہلے حزبِ اختلاف کی سیاست چلانے کے لئے سب سے زیادہ کارآمد ثابت ہوئی تھی۔ اس تضاد کا واحد حل "ڈیگال ازم" ہے یعنی اپنی مقبولیت کی قیمت پر ملک کے مستقبل کی تعمیر۔ جنرل ڈیگال (۱۸۹۰-۱۹۷۰) نے الجیریا کو آزاد کرکے اچانک فرانس کو یورپ کا سب سے طاقتور ملک بنا دیا۔ اگرچہ اس کے بعد ڈیگال کی اپنی سیاسی زندگی ختم ہوگئی ——— ڈیگال ازم عملاً سیاسی خودکشی کے ہم معنی ہے۔ اور خودکشی کی معروف قسم جتنی عام ہے، یہ دوسری قسم اتنی ہی کمیاب ہے۔

حقیقی لیڈر وہی ہے جو قوم کو حقیقی عملی چیز دے سکے۔ اور ایسا اسی وقت ہوتا ہے جب کہ لیڈر ہر حال میں حقیقت پسندانہ سیاست چلائے خواہ اس کی وجہ سے اپنی کامیابی کے لئے اس کو کتنی ہی لمبی مدت تک انتظار کرنا پڑے۔ اور اگر بالفرض اس کو وراثت میں ایک جذباتی سیاست کا ماحول ملے تو وہ اپنی مقبولیت کو خطرہ میں ڈال کر فیصلہ کر سکے۔

قومی رہنمائی کے کام کے لیے صرف انھیں لوگوں کو اٹھنا چاہیے جو حال کے اندر مستقبل کو دیکھ سکتے ہوں۔ جن کے اندر یہ صلاحیت نہ ہو، ان کا قومی رہنما بن کر اٹھنا، قومی جرم ہے نہ کہ قومی خدمت

چودھری خلیق الزماں (۱۹۷۳ - ۱۸۸۸)

پاکستان تحریک کے بانیوں میں سے تھے۔ انھیں اپنے اوپر اتنا اعتماد تھا کہ انھوں نے کہا: "نہرو سے زیادہ سیاست میر کو جوان جانتا ہے۔" انھوں نے ایک کتاب بھی لکھی ہے جس میں دکھایا ہے کہ پاکستان کے اصل بانی وہی تھے۔ یہ انھیں کا تخیل تھا اور اس وقت تھا جب کہ مسٹر جناح بھی اس کے خلاف تھے۔

مگر آخر عمر میں چودھری صاحب کو یہ احساس ہو گیا کہ انھوں نے تقسیم ملک کی جو تحریک چلائی وہ غلط تھی۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور (۲۱ اپریل ۱۹۷۲ء) میں ان کا ایک انٹرویو چھپا تھا۔ اس سے پھر روزنامہ جنگ میں نقل ہوا۔ اس انٹرویو کا ایک حصہ یہ تھا:

"ممتاز مسلم لیگی لیڈر چودھری خلیق الزماں نے روزنامہ "جنگ" کے نمائندہ کو ایک ملاقات میں انٹرویو دیا اور برصغیر کی تقسیم کے بارے میں تفصیل سے اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ موجودہ حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے یہ تقسیم کرا کر ہندوستان کے مسلمانوں کو کمزور کیا اور جن عظیم مقاصد کے لیے پاکستان قائم کیا تھا وہ بھی حاصل نہ ہو سکے۔ اب ہم ایک کوزہ میں بند ہو گئے ہیں۔ ہندوستان میں اب بھی ۶ کروڑ مسلمان ہیں، جن کی ہم کوئی خدمت نہیں کر سکتے۔ اس صورت میں کون کہہ سکتا ہے کہ تقسیم ہند کرا کر ہم نے کوئی فائدہ حاصل کیا۔"

روزنامہ جنگ۔ راولپنڈی۔ ۳۰ اپریل ۱۹۷۲ء صفحہ ۴

اس میں ہم صرف اتنا اضافہ کریں گے کہ موجودہ زمانے میں ہمارے تمام قائدین، خواہ وہ مذہبی ہوں یا غیر مذہبی، چودھری خلیق الزماں ہی کی مثال ثابت ہوئے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ بعض لوگ مرتے ہوئے چودھری صاحب کی طرح اپنا اقرار نامہ لکھ کر قوم کو دے گئے۔ اور بیشتر کا حال یہ رہا کہ آخر وقت تک وہ یہی کہتے رہے یا کہہ رہے ہیں کہ انھوں نے جو راہ اختیار کی وہی صحیح ترین راہ تھی۔ حالات کے بگاڑ میں ان کا اپنا کوئی حصہ نہیں۔

زندگی کا راز

جو کم پر راضی ہو جائے
وہی زیادہ پاتا ہے۔

جو زیادہ کے لئے دوڑے
وہ کم سے بھی محروم رہتا ہے
اور زیادہ سے بھی۔

طاقت کا سرچشمہ اپنے اندر ہے

نیپولین کا نام فوجی تاریخ میں عظمت کا نشان ہے۔ مگر وہ ایک پستہ قد آدمی تھا اگرچہ فربہ اندام تھا۔ ایک دن وہ پریڈ گراؤنڈ میں معمولی لباس میں کھڑا تھا۔ اتنے میں اس کا ایک فوجی پیچھے سے آیا اور یہ خیال کرتے ہوئے کہ کوئی معمولی سپاہی ہے، نیپولین کے اوپر سے پھلانگ کر گیا۔ اس کے بعد وہ فخریہ انداز میں پلٹا اور کھڑے والے شخص کے سامنے سے اس کے چہرہ پر نظر ڈالی تو وہ نیپولین تھا جو سنجیدگی کے ساتھ اپنے فوجی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ فوجی نے جب اس طرح اچانک اپنے عظیم کمانڈر نیپولین کو دیکھا تو وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا اور فوراً مر گیا۔

معلوم ہوا کہ طاقت کا اصل سرچشمہ خود آدمی کا اپنا احساس ہے۔ وہی نیپولین ہے اور وہی فوجی۔ مگر ایک بار وہ نیپولین کے سر سے فخریہ انداز میں پھاند جاتا ہے اور دوسری بار اس کو دیکھتے ہی اتنا بدحواس ہوتا ہے کہ فوراً مر جاتا ہے۔

یہ دونوں احساس کے کرشمے ہیں اگر آپ کا دل بے خوف ہے تو آپ شیر سے لڑ سکتے ہیں اور دریاؤں کو پھلانگ سکتے ہیں۔ لیکن اگر دل میں شبہ اور دہشت پڑا ہو تو گیدڑوں کا غول بھی آپ کو بوکھلا دے گا اور معمولی نہریں بھی آپ کو ڈبانے کے لیے کافی ہوں گی۔

اوپر ہم نے نیپولین کے فوجی کی جو مثال پیش کی ہے، وہ اس صورت حال سے متعلق تھی کہ ایک طاقتور شخص کس طرح دل کی گھبراہٹ کی وجہ سے اپنی موجودہ طاقت بھی کھو بیٹھتا ہے۔ اب ایک ایسی مثال لیجیے جبکہ ایک کمزور اور شکست خوردہ آدمی محض دل کی کیفیت بدل جانے کی وجہ سے دوبارہ فتح و کامیابی کا مالک بن جاتا ہے۔

اسکاٹ لینڈ کے رابرٹ بروس (ROBERT BRUCE) نے انگلینڈ کے بادشاہ کنگ ایڈورڈ اوّل کے خلاف بغاوت کر دی تھی جو کہ اسکاٹ لینڈ کے اوپر اقتدار اعلیٰ کا دعویدار تھا اس کو ۱۳۰۶ء میں "کنگ آف اسکاٹ لینڈ" کا تاج پہنایا گیا۔

اس مقابلہ میں رابرٹ بروس کو بری طرح شکست ہوئی اور اس کو جنگلوں اور بیابانوں میں پناہ لینا پڑی۔ مگر ۱۳۱۴ء میں اس نے دوبارہ انگلینڈ کے بادشاہ ایڈورڈ دوم سے بناک برن میں جنگ کی اور اس کو شکست دی۔ اور اسکاٹ لینڈ کو انگریزوں سے آزاد کرا لیا۔ اس کے بعد "رابرٹ اول" کے نام سے اس نے ۱۳۲۹ء تک اسکاٹ لینڈ پر حکومت کی۔

رابرٹ بروس کو شکست کے بعد فتح کس طرح حاصل ہوئی اس کے سلسلے میں ایک دلچسپ قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ وہ ایک جنگل کے اندر کسی غار میں پڑا ہوا تھا۔ "مجھے اب انگلینڈ کے بادشاہ سے مقابلہ کا خیال چھوڑ دینا چاہیئے" اس نے سوچا۔ اس کو اپنی کامیابی کی کوئی امید نظر نہیں آتی تھی۔ کئی بار کے مقابلہ کے بعد بالآخر وہ مایوس ہو چکا تھا۔

اتنے میں غار کے اندر ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا۔ ایک مکڑی اپنے جالے کے باریک تار سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑی۔ رابرٹ بروس کی نظریں اس کے اوپر جم گئیں۔ اس نے دیکھا کہ مکڑی نے اپنا ایک منٹ ضائع نہیں کیا اور لٹکتے ہوئے تار کے ذریعے دوبارہ اوپر چڑھنے کی جدوجہد شروع کر دی۔ مگر چھت کے قریب پہنچتے ہی وہ دوبارہ پھسل کر گر پڑی۔ اب وہ پھر پہلے کی طرح زمین پر پڑی ہوئی تھی اس طرح وہ بار بار چڑھتی اور بار بار گرتی رہی۔ مگر وہ

ہمت نہیں ہاری اور پھر بار دوبارہ اسی کام میں مشغول ہو جاتی جس میں وہ اس سے پہلے ناکام ہو چکی تھی۔

رابرٹ بروس اس کے ناکام تجربات کو گنتا رہا۔ یہاں تک کہ جب وہ نویں بار زمین پر گری تو اس کو ہنسی آگئی۔ "اب یہ کیڑا مزید کوشش کی حماقت نہیں کرے گا" اس نے کہا۔ مگر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ مکڑی نے ایک لمحہ ٹھہرے بغیر دسویں بار پھر اپنی جدوجہد شروع کر دی۔

اس بار رابرٹ بروس کے سامنے دوسرا منظر تھا اس نے دیکھا کہ مکڑی منزل سے بہت قریب پہنچ گئی ہے وہ دھیرے دھیرے چڑھتی رہی یہاں تک کہ جب فاصلہ بہت قریب آگیا تو اس نے آخری چھلانگ لگائی اب وہ اپنے جالدار مکان کے اندر تھی۔

"خوب" رابرٹ بروس چلایا "وہ لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو ہمت نہ ہاریں اور مسلسل اپنی جدوجہد جاری رکھیں" وہ ایک لمحہ کے لئے رکا اور پھر بولا "ایک معمولی کیڑے نے مسلسل کوشش سے اپنی بازی جیت لی۔ پھر میں کیوں ایسا نہیں کر سکتا۔"

رابرٹ بروس غار سے نکل کر باہر آیا۔ اس نے آخری فیصلہ کن مقابلہ کے لئے تیاری شروع کر دی۔ وہ نئے عزم کے ساتھ شاہ انگلینڈ سے لڑا اور اس بار اس نے فتح حاصل کر لی۔

حقیقت یہ ہے کہ "میں ایسا نہیں کر سکتا" محض ایک بزدلانہ فقرہ ہے ہر شخص ہر کام کر سکتا ہے اور شکست دوبارہ نئی فتح میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ مسلسل جدوجہد کرنے کا حوصلہ پیدا ہو جائے۔

سیب کا سبق

ایک ٹن سیب سے کتنا عرق نکالا جا سکتا ہے۔ کوئی بھی پھلوں کا ماہر آپ کو بتائے گا کہ ۶۵۰ سے ۷۰۰ کلوگرام تک۔ مگر سیب میں حقیقتاً اس سے بہت زیادہ عرق ہوتا ہے۔ محققین نے دریافت کیا ہے کہ موجودہ ذرائع کے تحت جب ہم سیب کو مکمل طور پر نچوڑ چکے ہوتے ہیں، اس کے بعد بھی اس کے اندر ایک ٹن میں ۱۰۰ سے ۱۲۰ کلوگرام تک عرق باقی رہتا ہے۔

کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے کولھو اچھے نہیں ہیں۔ نہیں۔ اگر ہم سب سے طاقتور برقی کولھو استعمال کریں جب بھی عرق کی مقدار میں بس برائے نام ہی فرق آئے گا۔ سیب کے اندر بچا ہوا عرق پھر بھی نہیں حاصل نہ ہو سکے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیب کے خلیوں کا چھلکا بے انتہا دباؤ کے تحت بھی ویسے کا ویسا ہی رہتا ہے۔ اور کولھو میں پس جانے کے باوجود اس کا عرق خلیوں کے اندر محفوظ رہتا ہے موجودہ حالت میں دباؤ اور طاقت کا اضافہ اس مسئلہ کو حل نہیں کرتا۔

یہ سیب کا قصہ ہے مگر اسی کے اندر آپ قوموں کی تصویر بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ایک قوم وہ ہوتی ہے کہ اگر وہ کسی دباؤ کی زد میں آجائے تو آخری حد تک نچڑ کر رہ جاتی ہے۔ مگر زندہ قوموں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اگر وہ ظلم وستم کے کولھو میں پیل دی جائیں جب بھی سیب کی طرح، ان کے اندر زندگی کی رمق باقی رہتی ہے اور موقع پاتے ہی وہ دوبارہ اٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔

اس کا اخبار وہاں بھی پہونچ رہا تھا جہاں وہ خود نہیں پہنچ سکتا تھا

روسی کمیونسٹ پارٹی کی تاریخ کا ایک چھوٹا سا واقعہ ہے مگر اس کے اندر بہت بڑی نصیحت چھپی ہوئی ہے۔

یہ اس وقت کا ذکر ہے جب روس میں اکتوبر ۱۹۱۷ء کا انقلاب نہیں آیا تھا روس میں بالشویکوں (کمیونسٹوں کا قدیم نام) کے بڑھتے ہوئے اثرات کو روکنے کے لیے شہنشاہ روس (زار) نے بالشویک پارٹی کو خلاف قانون قرار دے دیا تھا۔ اور تمام بڑے بڑے لیڈروں کے نام گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیئے تھے۔

کچھ لیڈر گرفتار ہوئے، کچھ بچ کر جنگلوں اور غاروں میں روپوش ہو گئے۔ انھیں روپوش ہونیوالوں میں بالشویک پارٹی کا عظیم لیڈر لینن بھی تھا۔ لینن نے جنگلوں اور غاروں کے ایک دور افتادہ علاقہ کو اپنا مسکن بنایا اور وہاں روپوش ہو کر اخبار نکالنا شروع کر دیا۔ یہ اخبار دستی پریس میں چھاپ کر دستی طور پر روس کے شہروں میں خفیہ طور پر پہنچا دیا جاتا تھا۔

ایک روز کا واقعہ ہے۔ ایک شخص ایک روسی شہر میں پنساری کے یہاں کچھ سامان خریدنے گیا جب وہ سامان خرید کر گھر لایا اور پڑیا کھولی تو اچانک اس کی نظر پڑیا والے کاغذ کے چھپے ہوئے الفاظ پر پڑی۔ یہ ایک اخبار کا پھٹا ہوا صفحہ تھا جس میں آتشیں الفاظ اور گرما گرم عنوان کے ساتھ ایک عبارت چھپی ہوئی تھی۔

ردی کے اس ٹکڑے پر چھپی ہوئی عبارت پڑھ کر اس آدمی کے اندر عجیب کیفیت پیدا ہوئی، وہ بار بار اس کو پڑھتا رہا اور اس سے اپنے دل کو گرماتا رہا یہاں تک کہ اسے خیال ہوا کہ معلوم کرے کہ اس عبارت کا مصنف کون ہے اور یہ کس اخبار کا ٹکڑا ہے جو پنساری کی معرفت اسے ملا ہے۔

وہ تلاش میں لگ گیا۔ جوئندہ یابندہ۔ بالآخر اسے معلوم ہوا کہ یہ ردی کا ٹکڑا لینن کے اس اخبار کا پھٹا ہوا صفحہ ہے جو وہ روپوش ہو کر نکال رہا ہے۔

اب اس کا اشتیاق اور بڑھا اور وہ تلاش کرتا ہوا اس غار میں پہنچ گیا جہاں چھپ کر لینن اخبار نکالا کرتا تھا۔ اس کے بعد سے آخر تک وہ لینن کا ساتھی بنا رہا۔ اس طرح کے کتنے لوگ ہیں جن کو لینن نے صرف اپنے اخبار سے فتح کیا۔

لینن زار کی پولیس سے بچنے کے لیے غار کے اندر روپوش تھا مگر اپنے اخبار کی بدولت وہ ہر شہر میں پہنچا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ بازار میں پنساری کی دوکان بھی اس کے حق میں پروپیگنڈے کا مرکز بنی ہوئی تھی، اس کا اخبار وہاں بھی پہنچ رہا تھا، جہاں وہ خود نہیں پہنچ سکتا تھا۔

یہ ہے موجودہ زمانے میں پریس کی قوت۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ پچاس برس پہلے باشعور لوگوں نے اس سے جو کام لیا تھا ابھی تک ہم وہاں بھی نہیں پہنچے ہیں اور آج کی زندہ قومیں پریس سے جو کام لے رہی ہیں اس کی تو عام مسلمانوں کو خبر بھی نہیں حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں دوسری قومیں ہم سے اتنا آگے ہیں کہ ہم ان کے پیچھے بھی نہیں۔ پیچھے ہونے کا مطلب تو یہ ہے کہ ہم بھی کہیں ہیں۔ حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ ہم ان کی نسبت سے کہیں نہیں ہیں۔

جو بات ایک شخص اپنی ذات کے بارے میں جانتا ہے وہی بات قوم کے بارے میں بھول جاتا ہے

طرابلس کے متحف (میوزیم) میں ایک بکری رکھی ہوئی ہے جس کی گردن کے اوپر دو سر ہیں۔ اس کا حوالہ دیتے ہوئے میں نے کہا، اگر ایک شخص اس کو دیکھ کر آئے اور آپ اس سے پوچھیں کہ سب سے عجیب چیز متحف میں تم نے کیا دیکھی۔ تو شاید وہ جواب دے گا کہ "دو سروں والی بکری"۔ مگر میں آپ سے کہتا ہوں کہ میں نے سب سے عجیب چیز جو دنیا میں دیکھی وہ دو سروں والے انسان ہیں۔ طرابلس کے متحف میں تو صرف ایک ایسی بکری ہے جس کے دو سر ہیں۔ مگر میں نے اپنی ساری عمر میں جتنے انسان دیکھے سب دو سر رکھنے والے انسان تھے۔

میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، اس کو مثال سے سمجھئے۔ آپ کا ایک لڑکا ہے۔ آپ اس کو کامیاب ڈاکٹر دیکھنا چاہتے ہیں آپ کیا کریں گے۔ آپ اس کو اسکول میں داخل کریں گے۔ بیالوجی کے ساتھ ہائی اسکول کرائیں گے۔ پھر بی، ایس، سی کرائیں گے۔ پھر اس کو ایم بی بی ایس کے کورس میں داخل کریں گے۔ پھر آپ کی کوشش یہ ہوگی کہ اس کو ایف آر سی ایس کرنے کے لئے لندن بھیجیں۔ ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد ہی آپ یہ امید کر سکتے ہیں کہ وہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے دنیا میں اپنی جگہ بنائے۔ آپ میں سے کوئی شخص ایسا نہیں کرے گا کہ وہ اپنے لڑکے کو یوں ہی چھوڑ دے کہ وہ کھیلتا کودتا رہے۔ اس کے بعد جب وہ ۲۵ برس کا ہو جائے تو اس کا باپ اس کو ڈاکٹر بنانے کے حق میں پر جوش تقریریں شروع کر دے، وہ حکومت سے مطالبہ کرے کہ میرے لڑکے کو اسپتال میں سرجن مقرر کرو۔ یا یہ کہ اس کو "پس ماندہ" قرار دے کر ڈگری کے بغیر ڈاکٹر تسلیم کرو۔ ہر شخص خوب جانتا ہے کہ ڈاکٹر بننے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اس کالج کا تعلیمی اور تربیتی کورس پورا کرے۔ محض مطالبہ کرنے سے کوئی شخص کبھی ڈاکٹر نہیں بن سکتا۔ یہ دنیا استحقاق کی دنیا ہے مطالبات کی دنیا نہیں۔

مگر یہی بات جو ہر آدمی اپنے ذاتی معاملہ میں جانتا ہے، قومی معاملہ میں وہ اس سے بے خبر ہے، جہاں کسی شخص کو قوم کا درد اٹھا اور وہ اصلاح کے میدان میں کھڑا ہوا، فوراً ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر ایک اور سر پیدا ہو گیا ہے جو بالکل دوسرے ڈھنگ سے سوچتا ہے۔ اب وہ "تیاری" کے بجائے "مطالبہ" کو کامیابی کا راز سمجھنے لگتا ہے۔ مفروضہ حریف کے خلاف پُر جوش تقریریں کرنا، تار اور میمورنڈم بھیجنا، مطالبات کے ریزولیوشن پاس کرنا، بین اقوامی اداروں میں اپنا کیس لے جانے کی اسکیمیں بنانا، یہی اس کی تمام سرگرمیوں کا خلاصہ ہوتا ہے۔ وہی شخص جو اپنی اولاد کے بارے میں جانتا تھا کہ کامیابی صرف اس طرح ملتی ہے کہ پہلے اس کے لئے صلاحیت اور استعداد پیدا کی جائے، وہی شخص قوم کی اولاد کے بارے میں اپنی ساری سرگرمیوں کا نقشہ اس طرح بناتا ہے گویا تقریر اور مطالبات ساری کامیابیوں کا راز ہیں۔ یہ لاحاصل جد و جہد بالآخر جب ناکام ہو جاتی ہے تو وہ ہمت نہیں ہارتا۔ اب وہ اپنی مطالباتی مہم کو جاری رکھنے کے لئے نیا لفظ ڈھونڈ لیتا ہے:

"ہم کو پس ماندہ قرار دے کر استحقاق کے بغیر ہی تمام مناصب پر بٹھا دو"۔ ایسے لوگوں کو اس کے سوا کیا کہا جائے کہ وہ دو سر رکھنے والے لوگ ہیں۔

اس مزاج کے معاملہ میں کسی مسلم قوم کی کوئی خصوصیت نہیں۔ ہر علاقہ کے مسلمان اسی دُہری ذہنیت کا شکار ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ کسی کا "دوسرا سر" ایک کے خلاف کام کر رہا ہے، کسی کا دوسرے کے خلاف۔ ایسے لوگ ممکن ہے وقتی لیڈری حاصل کر لیں مگر ان کے اس عمل کی کوئی قیمت نہ تاریخ کے نزدیک ہے اور نہ خدا کے نزدیک۔

سوچ کر زندگی گزاریے

حافظ حامد حسن علوی (۱۸۴۲-۱۹۵۹) اعظم گڑھ کے ایک بزرگ تھے۔ نہایت ذہین اور معاملہ فہم۔ انکے عزیزوں میں ایک شخص اکثر گھر کے اندر عورتوں اور بچوں میں بیٹھا کرتے تھے۔ حافظ صاحب مرحوم نے جب کئی بار ان کو اس طرح دیکھا تو ایک روز بگڑ کر فرمایا: "عورتوں میں مت بیٹھو، اس سے عقل کم ہو جاتی ہے۔"

یہ مقولہ حال میں مجھے اس وقت یاد آیا جب میں نے ایک نوجوان کو دیکھا۔ وہ اس سے پہلے ایک معمولی ملازمت میں تھے۔ پچھلے دو برس سے انھوں نے ملازمت چھوڑ کر ایک کاروبار کر لیا ہے۔ جب میں ان سے ملا تو مجھے محسوس ہوا کہ ان کے کل اور آج میں بہت بڑا فرق ہو چکا ہے۔ ملازمت کے زمانے میں وہ دبے اور کھنچے ہوئے شخص دکھائی دیتے تھے۔ بہت کم کوئی سمجھ داری کا جملہ ان سے سننے میں آتا تھا۔ مگر اب جو میں نے دیکھا تو ان کے اندر ایک اعتماد ابل رہا تھا۔ اور بات بات میں سمجھ داری کی باتیں ان کی زبان سے نکل رہی تھیں۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ آدمی جیسی زندگی گزارتا ہے، اسی کے لحاظ سے اس کی عقل کی تربیت بھی ہوتی ہے۔ جو شخص عورتوں اور بچوں میں اپنا وقت گزارے ظاہر ہے کہ اس کی گفتگو کے موضوعات بالکل معمولی ہونگے۔ گھریلو قصے، فیشن، ہنسی مذاق، کھانا کپڑا وغیرہ۔ اس قسم کی باتوں میں مشغول رہنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کا ذہن اونچے اور گہرے مسائل میں غور و فکر کی تربیت نہیں پا سکے گا۔

اسی طرح ملازم کی زندگی ایک لگی بندھی زندگی ہوتی ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح مہینہ پورا کرلے تو اس کو مقررہ تنخواہ بہرحال مل جائے گی۔ اس زندگی کی وجہ سے اس کے اندر ایک قسم کا ذہنی ٹھہراؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس تجارت ایک ایسا کام ہے جس میں ہر وقت آدمی کی محنت اور صلاحیت کا امتحان ہوتا رہتا ہے۔ ہر دن اس کو نئے نئے حالات سے نمٹنا پڑتا ہے یہ چیز حالات سے لڑنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ اس کی عقل کو جلا دیتی ہے اس کو بار بار زندگی کی خوراک دیتی رہتی ہے۔

آدمی کو چاہیئے کہ اپنی زندگی کا مشغلہ طے کرتے وقت یہ ضرور سوچے کہ وہ اسکی زندگی کی تربیت کس طرح کرے گا۔ وہی مشغلہ ایک انسان کے لیے صحیح مشغلہ ہے جس میں اس کی چھپی ہوئی صلاحیتیں ابھریں، اس کے ذہن کا افق وسیع ہو، اس کے اندر خود اعتمادی کی پرورش ہو سکے، وہ دنیا میں وہ تمام "رزق" پا سکے جو خدا نے یہاں اس کے لیے مہیا کر رکھا ہے۔

انسانی ذہن حیران کن حد تک بے پناہ صلاحیتیں رکھتا ہے۔ اگر ہم درست مشغلہ اختیار کریں تو ہمارے ذہن کی ترقی ہماری زندگی کی آخری سانس تک جاری رہیگی، اس کے امکانات کبھی ختم نہ ہوں گے۔ اس کے برعکس اگر ہم اس کو کسی محدود یا ناقص مشغلہ میں بند کردیں تو وہ ٹھٹھر کر رہ جائے گا۔ پانی ایک گڑھے میں ہو تو وہ گھٹ کر رہ جاتا ہے، مگر وہی پانی جب دریا میں رواں ہوتا ہے تو سیلاب بن جاتا ہے۔

یہ اتفاقی غلطی کا نتیجہ نہ تھا

بھگوتی ایس۔ گڈوانی ہندستان کے شہری پرواز کے محکمہ کے ڈائرکٹر جنرل ہیں۔ انھوں نے اپنی ایک تازہ کتاب میں میسور کے سلطان ٹیپو (۹۹-۱۷۵۱) کے حالات ناول کے پیرایہ میں بیان کئے ہیں۔ اس تاریخی ناول کا نام ہے "ٹیپو سلطان کی شمشیر" یہ کتاب انھوں نے ہند، برطانیہ، فرانس، ہالینڈ، ترکی اور ایران کے کتب خانوں اور عجائب گھروں میں اٹھارہ سال تک تحقیق کرنے کے بعد تیار کی ہے۔

مسٹر گڈوانی نے ٹیپو سلطان کو "درجہ اول کا قوم پرست" قرار دیا ہے۔ ان کا فیصلہ ہے کہ "ٹیپو اٹھارویں صدی کا واحد ہندستانی حکمراں ہے جس نے کسی بھی وقت اپنے ہم وطنوں کے خلاف جنگ میں انگریزوں کا ساتھ نہیں دیا"

مسٹر گڈوانی نے لکھا ہے کہ "۱۷۹۲ کے سرنگا پٹم کے محاصرہ میں ٹیپو نے انگریزوں کے ساتھ صلح کی جو بات چیت شروع کی وہ محض اپنے جنرل میر صادق کی پیدا کردہ غلط فہمی کی بنیاد پر تھی۔ حالانکہ اس وقت برطانوی جنرل کارنوالس اپنی فوجوں کے زبردست جانی نقصان کی وجہ سے پسپائی کی تیاریوں میں مشغول تھا"

سلطان ٹیپو کا یہ اقدام وقتی طور پر اس کے جاسوسی نظام کی کمی کا سبب ہو سکتا ہے۔ تاہم ٹیپو کی شکست یا اٹھارویں صدی کے آخر میں مشرقی اقوام کی مغربی اقوام کے مقابلہ میں پسپائی اس قسم کی کسی جزوی یا اتفاقی غلطی کا نتیجہ نہ تھی۔ یہ دراصل جدید قوتوں میں مغرب کی سبقت اور مشرق کی پس ماندگی تھی جس نے ایک کو غالب اور دوسرے کو مغلوب کر دیا

تاریخ میں کوئی فیصلہ دینا ایک بے حد نازک کام ہے۔ کیوں کہ بہت سے بظاہر یکساں اسباب میں سے کسی ایک سبب کو وہ فیصلہ کن عامل قرار دینا پڑتا ہے جس کے ذریعہ دوسرے اسباب کو سمجھا جا سکے۔ اگر فیصلہ کن سبب کو متعین کرنے میں غلطی ہو جائے تو تاریخ کا مطالعہ محض قصہ کہانی کا مطالعہ بن جاتا ہے بجائے اس کے کہ وہ ہم کو کسی حقیقی سبب تک پہنچانے کا ذریعہ بنے۔ اپنی کمزوری کو دوسرے کے اوپر ڈالنے کی کوشش آدمی کو تاریخ کے حقیقی سبق سے محروم کر دیتی ہے۔

عام تصور یہ ہے کہ کسی "قدیم" تہذیب کو دوبارہ "جدید" نہیں کیا جا سکتا۔ جس طرح آدمی کو جوانی صرف ایک بار ملتی ہے، اسی طرح تہذیب کو بھی صرف ایک بار عروج نصیب ہوتا ہے۔ اس کے بعد تہذیب پر بڑھاپا آجاتا ہے۔ اور جو بوڑھا ہو گیا اس کو دوبارہ جوان نہیں کیا جا سکتا۔

مگر چین کی مثال نے اس مفروضہ کی تردید کر دی ہے۔ نیویارک ٹائمز کے نامہ نگار جیمز رسٹن (JAMES RESTON) نے پیکنگ میں اپنے طویل قیام کے بعد اپنے ذاتی مشاہدہ پر مبنی ایک رپورٹ تیار کی ہے جس کا عنوان ہے

NEW LOOK OF AN ANCIENT LAND

اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ "چین کی قدیم ترین تہذیب کے بارے میں جو بات سب سے زیادہ نمایاں ہے، وہ یہ کہ آج وہ دوبارہ جوان نظر آتی ہے۔ ایک امریکی مشاہد کے نزدیک چین کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت اس کا "شباب" ہے۔

اسلامی مرکز کی اشاعتی مہم : عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

دین کیا ہے	از	مولانا وحید الدین خاں	Rs. 1.50
الاسلام	"	"	12.00
تجدید دین	"	"	2.00
ظہور اسلام	"	"	12.00
اسلامی زندگی	"	"	
زلزلۂ قیامت	"	"	3.00
تاریخ کا سبق	"	"	2.00
تعمیر ملت	"	"	2.00
مذہب اور جدید چیلنج	"	"	13.50
اسلامیات	"	"	2.00
عقلیات اسلام	"	"	2.00
اسلام دین فطرت	"	"	2.00
تعلیمات قرآن	"	"	2.00
قرآن کا مطلوب انسان	"	"	

ماہنامہ **الرسالہ** تعمیری اور اصلاحی مضامین کے مستقل مطالعہ کے لئے زر تعاون سالانہ 24.00

MAKTABA AL-RISALA, JAMIAT BUILDING, QASIMJAN STREET, DELHI 110006

Regd. No. D. (D) 532
Regd. R.N. No 28822/76
Issue No. XXVII

February 1979

Al-Risala Monthly

Jamiat Building, Qasimjan Sreet, DELHI-110006 (INDIA)

ظہور اسلام

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحیدالدین خاں

الرسالہ

شمارہ ۲۸ مارچ ۱۹۷۹

جمعیۃ بلڈنگ • قاسم جان اسٹریٹ • دہلی ۶

آپ کی چھت اگر کم زور ہے تو آپ اس کو سیلاب کی زد میں آنے سے روک نہیں سکتے۔ خواہ آپ اس کے خلاف کتنا ہی چیخ پکار کر رہے ہوں

فہرست

اداریہ

۱۔ الرسالہ کا عربی ایڈیشن، جزئی صورت میں اس سے پہلے قاہرہ اور بیروت سے شائع ہوتا رہا ہے۔ اس کی صورت یہ تھی کہ الرسالہ کے خصوصی مضامین کا عربی ترجمہ ماہانہ کتابچہ کی صورت میں دونوں مقامات سے بیک وقت شائع کیا جاتا تھا۔ قاہرہ کا ایڈیشن مصر کے لئے اور بیروت کا بقیہ عرب دنیا کے لئے۔ الرسالہ کے ناظرین کے لئے یہ بات دلچسپی کی ہوگی کہ اب قاہرہ کے ایک بڑے ناشر کی معرفت الرسالہ کے باقاعدہ عربی ایڈیشن کی اشاعت کا انتظام ہو گیا ہے — اولاً "الرسالہ" کے نام سے ڈکلریشن حاصل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ مگر مصر میں پہلے سے ایک پرچہ الرسالہ کے نام سے نکل رہا ہے، اس لئے اس نام سے اجازت نہ مل سکی۔ اب مصر کے محکمہ اطلاعات نے المختار الاسلامی کے نام سے اس کی اشاعت کی اجازت دے دی ہے۔ جیسے ہی اداراتی اور تنفیذی امور اجازت دیں گے، ماہانہ رسالہ کی حیثیت سے یہ عربی ایڈیشن انشاء اللہ قاہرہ سے شائع ہونا شروع ہو جائے گا۔

۲۔ ہم کو ایک ایسے معاون کی ضرورت ہے جو اردو، عربی اور انگریزی زبانیں جانتے ہوں اور دفتری کام کے ساتھ ساتھ اسلامی تحقیقی کام میں مدد دے سکیں۔ عمر ۲۵۔۳۰ سال کے درمیان ہونی چاہیے۔ عربی اور انگریزی ٹائپ جاننا ضروری ہے۔ عربی زبان پر قدرت رکھنے والے کو ترجیح دی جائے گی۔ تعلیم، تجربہ اور مطلوبہ مشاہرہ کی تفصیلات کے ساتھ درخواست روانہ فرمائیں۔ مناسب امیدوار کے لئے انشاء اللہ ترقی کے امکانات ہیں (ظفر الاسلام خاں)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن خدا کی کتاب ہے۔ اس کا برتر ادب، اس کے بلند مضامین، اس کی ابدی تعلیمات، اس کا اختلاف و تضاد سے خالی ہونا ثابت کرتا ہے کہ یہ خدائی ذہن سے نکلا ہوا کلام ہے۔ قرآن میں ہدایت کا سامان ہے۔ وہ انسان کی اس تلاش کا جواب ہے کہ وہ زندگی کی معنویت کو سمجھ سکے۔ اس کی فطرت جس رہنمائی کو مانگ رہی ہے، قرآن میں وہ اس کو واضح اور مکمل صورت میں پالیتا ہے۔ قرآن اس کے تمام اندرونی سوالات کا جواب ہے۔ مگر یہ ہدایت کسی کو اپنے آپ نہیں مل جاتی۔ اس کو وہی شخص پاتا ہے جس کے اندر حقیقی طلب کا مادہ ہو۔ جو یہ غیر علمی اصرار نہ کرے کہ وہ آنکھ سے دیکھ کر ہی کسی بات کو مانے گا۔ بلکہ وہ بصیرت سے سمجھ میں آنے والی باتوں پر یقین کرنے کے لئے تیار ہو۔ جو حقیقتِ اعلیٰ (خدا) کے آگے جھک کر اس بات کا ثبوت دے کہ وہ مصنوعی خود پرستی سے پاک ہے۔ جو اپنی کمائی میں دوسرے کا حصہ لگا کر یہ ظاہر کرے کہ اپنی ذات سے باہر پائے جانے والے تقاضوں کو ماننے کے لئے اس کا سینہ کھلا ہوا ہے۔ جو انسانی محدودیت کا اقرار کرتے ہوئے خارجی ہدایت کی ضرورت کو تسلیم کرتا ہو۔ جو اس سوال کو اہمیت دے کہ موجودہ دنیا کا نامکمل ہونا ایک زیادہ مکمل نظامِ عالم کی تشکیل کا تقاضا کرتا ہے ——— یہ طلب صادق کی علامتیں ہیں۔ ایسے ہی طالبین کے حصہ میں ہدایت آتی ہے اور وہی اس کائنات میں فلاح کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں (بقرہ ۱-۵)

اسلامی زندگی کا آغاز ایمان سے ہوتا ہے۔ ایک شخص کو جب اس بات کی پہچان ہو جائے کہ اس کائنات کا خالق، مالک اور رب اللہ ہے۔ وہ اس کو اس طرح اپنے شعور کا حصہ بنائے کہ اللہ ہی اس کا سب کچھ بن جائے وہ اسی پر بھروسہ کرے۔ اسی سے امید رکھے۔ اسی سے خوف کھائے۔ اپنی زندگی کو ہمہ تن اسی کے رخ پر ڈال دینے کا فیصلہ کرے تو اسی کا نام ایمان ہے۔

ایمان کے بعد چار عبادتوں کو اسلام میں ارکان کا درجہ حاصل ہے۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج۔ یہ چاروں عبادتیں اسلام کے ارکان بھی ہیں اور اسلام کے مطلوب اوصاف کی علامات بھی۔ نماز اللہ کی قربت تلاش کرنے کی کوشش ہے۔ روزہ صبر کی تربیت ہے۔ زکوٰۃ یہ پیغام دیتی ہے کہ بندوں کے عملی خیر خواہ بن کر رہو۔ حج اسلامی اتحاد کا عالمی سبق ہے۔ یہی چار چیزیں اسلام کا خلاصہ ہیں۔ بندۂ مومن سے اولاً یہ مطلوب ہے کہ وہ اپنے رب کی یاد میں ڈوبا رہے۔ وہ زندگی کے کسی موڑ پر اس کے تصور سے خالی نہ ہو۔ پھر جس دنیا میں آدمی کو دیندار بن کر رہنا ہے، وہاں بہت سے دوسرے لوگ ہیں۔ ان کی طرف سے بار بار تکلیف کی باتیں سامنے آتی رہتی ہیں۔ اگر آدمی اپنے سوا دوسروں کے اعتراف کا مزاج نہ رکھتا ہو۔ اگر وہ دوسروں کو برداشت کرتے ہوئے دوسروں کے ساتھ مل کر چلنے کے لئے تیار نہ ہو تو موجودہ دنیا میں وہ حق کے سفر کو کامیابی کے ساتھ طے نہیں کر سکتا۔

یہ ایمان اور عبادت اگر حقیقی طور پر آدمی کے اندر پیدا ہو جائے تو اس کے اندر وہ خدا پرستانہ زندگی ابھرتی ہے جو مالک کائنات کو اپنے بندوں سے مطلوب ہے۔ دنیا میں اس کی ہستی کا ظہور حق اور عدل کا ظہور بن جاتا ہے۔

ا کی سوچ، اس کا اخلاق، اس کے معاملات، سب اللہ کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔ وہ اپنے اندرونی وجود
ا قلب سلیم (شعراء ۸۹) اور خارجی سلوک میں قائم بالقسط (نساء ۱۳۵) کا مصداق بن جاتا ہے۔ یہی دین
سلام ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کو سکھانے کے لئے قرآن اتارا گیا۔

قرآن کو قلم کے ذریعہ کتاب کی صورت میں لکھوا کر انسان کے حوالے کیا گیا ہے۔ یہ اس بات کا اہتمام تھا کہ وہ سی ادنیٰ تبدیلی کے بغیر اگلی نسلوں تک پہنچ سکے۔ قرآن آج مکمل طور پر محفوظ حالت میں موجود ہے۔ اس کے ماننے والے بھی بے شمار تعداد میں دنیا بھر میں پائے جاتے ہیں۔ مگر قرآن والی زندگی عملاً کہیں نظر نہیں آتی۔ قرآنی امکانیات اسی طرح بند حالت میں پڑے ہوئے ہیں جس طرح چند سو سال پہلے بھاپ اور بجلی کی طاقتیں بند پڑی ہوئی تھیں۔

ایسا کیوں ہے۔ اس سوال کے جواب کو اس وقت تک سمجھا نہیں جا سکتا، جب تک خدا کی سنت امتحان کو سامنے نہ رکھا جائے۔ موجودہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ یہاں قرآن کو ماننے والے اور قرآن کو نہ ماننے والے دونوں اپنا اپنا امتحان دے رہے ہیں۔ دونوں قسم کے لوگوں کو یکساں طور پر آزادی حاصل ہے۔ کوئی شخص قرآن کا انکار کر کے گمراہ ہونا چاہے تو اس کو بھی پوری آزادی ہے۔ اور کوئی قرآن کو مان کر عملاً قرآن کے خلاف چلنا چاہے تو اس کے لئے بھی راستہ کھلا ہوا ہے۔ قرآن کو نہ ماننا کسی کے بچاؤ کے لئے عذر نہیں بن سکتا۔ اسی طرح قرآن کو مان لینا کسی کو حالت امتحان سے مستثنیٰ نہیں کرتا۔ موجودہ دنیا میں جس طرح قرآن کو ماننے یا نہ ماننے کی آزادی ہے۔ اسی طرح اس کو مان کر اس کی تعلیمات پر چلنے یا نہ چلنے کی آزادی بھی ہر ایک کو ملی ہوئی ہے۔ ایک گروہ قرآن کا انکار کر کے جس طرح اپنی گمراہیوں کے لئے آزاد ہے۔ دوسرے گروہ کو اسی طرح قرآن کا نام لیتے ہوئے قرآن کے خلاف عمل کرنے کی چھوٹ ملی ہوئی ہے۔ مسلم قوم بھی خدا کی عدالت میں جانچ کی ٹھیک اسی سطح پر کھڑی کی گئی ہے جہاں دوسری غیر مسلم قومیں کھڑی ہوئی ہیں:

ان الذین آمنوا والذین هادوا والنصاریٰ والصابئین من آمن بالله والیوم الآخر وعمل صالحاً فلهم اجرهم ولا خوف علیهم ولا هم یحزنون (بقرہ ۶۲)

یوں ہے کہ جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابئین، جو کوئی یقین لایا اللہ پر اور پچھلے دن پر اور کام کیا نیک تو ان کو ہے ان کی مزدوری اپنے رب کے پاس۔ اور نہ ان کو ڈر ہے اور نہ وہ غم کھاویں (ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلوی)

جب تک اللہ کی یہ سنت باقی ہے، یہ امکان بھی باقی رہے گا کہ کوئی گروہ قرآن و اسلام کا نام لے اور عملاً اس طرح رہے گویا قرآن اور اسلام سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ حتیٰ کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آزادی یہاں تک ہے کہ ایک شخص قرآن کے عالم اور مفسر کی حیثیت سے نمایاں ہو۔ دنیا کی زندگی میں وہ دین خداوندی کا چیمپین بنے۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے اس کی کوئی دینی قیمت نہ ہو۔ وہ آخرت میں ان لوگوں کے ساتھ دھکیل دیا جائے جنھوں نے قرآن کو سرے سے مانا ہی نہ تھا، جن کا دین اسلام سے کوئی تعلق نہ تھا۔ (۱۹ جنوری ۱۹۷۹) ■

وہ لوگ جو سو شہیدوں کا اجر پائیں گے

من تمسك بسنتي عند فساد امتي فله اجر مائة شهيد (الحديث)

میری امت میں بگاڑ کے وقت جس نے میری سنت کو پکڑا اس کے لئے سو شہیدوں کا ثواب ہے۔

اسلام کی راہ میں لڑکر اپنی جان دے دینا ایک ایسا عمل ہے جس کا اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑا انعام ہے۔ مگر بگاڑ کے زمانہ میں اپنے آپ کو سچے دین پر قائم کرنے کا اجر اس سے سو گنا زیادہ بتایا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اول الذکر اپنے آپ کو ایک دن قربان کرتا ہے۔ جب کہ ثانی الذکر کو ہر روز اپنے آپ کو قربان کرنا پڑتا ہے۔

امت کے اندر جب بگاڑ آتا ہے تو اس وقت یہ حال ہو جاتا ہے کہ ایک بگڑے ہوئے مذہب کا نام دین بن جاتا ہے۔ سارے دینی ادارے، تمام دینی اعزازات اسی بگڑے ہوئے مذہب سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ دین کے تمام شعبوں میں ایسے لوگ قبضہ پا لیتے ہیں جو دین کو تجارت بنا چکے ہوتے ہیں۔ خواص اپنے مصالح کی بنا پر اور عوام اپنی جہالت کی بنا پر اسی بگڑے ہوئے دین کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں جب کوئی بندہ خدا کے سچے اور بے آمیز دین کو لے کر اٹھتا ہے تو سارے لوگ محسوس کرتے ہیں کہ اس شخص کا دین ان کے اپنے دین کو بے اعتبار بنا رہا ہے۔ وہ فوراً اس کے مخالف بن جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رسول خدا والے طریقے کو پکڑنے والا آدمی خود اپنے دینی معاشرہ میں بے جگہ ہو جاتا ہے۔ وہ سب کے درمیان ایک غیر مطلوب شخص بن جاتا ہے۔

بگاڑ کے زمانہ میں یہ ہوتا ہے کہ وقتی اور رسمی عملیات کو لوگ جنت کا ٹکٹ سمجھ لیتے ہیں، اس کے مقابلہ میں سنت رسول کو پکڑنے والا آدمی حقیقی اعمال پر جنت کا مدار رکھتا ہے۔ لوگ مذہبی مناظرے اور سیاسی مجادلے کے مشغلوں کو دینی کارنامہ سمجھنے لگتے ہیں، وہ بتاتا ہے کہ صبر اور قربانی کے طریقوں کو اختیار کرنے کا نام دین ہے۔ لوگ اپنے دنیوی ہنگاموں کو دین کا عنوان دیئے ہوتے ہیں، وہ کہتا ہے کہ آخرت کے لئے جینے اور مرنے کا نام دین ہے۔ لوگ احبار و رہبان کے دین کو پکڑے ہوئے ہوتے ہیں، وہ خدا اور رسول کے دین کو دین کا مقام دیتا ہے۔ لوگ اپنے بزرگوں کے ارشادات و ملفوظات سے لپٹے ہوئے ہوتے ہیں، وہ کہتا ہے کہ قرآن و سنت والے دین کو اپنا دین بناؤ۔ لوگ قصے کہانیوں کے ذریعہ اپنا ایک دینی ایڈیشن تیار کر کے اس کی تلاوت میں مشغول ہوتے ہیں، وہ کہتا ہے کہ اس کے بجائے محکم آیات اور ثابت شدہ سنت رسول پر اپنے دین کی بنیاد رکھو۔ لوگ اپنے طور پر مختلف قسم کی مذہبی موشگافیاں ایجاد کرتے ہیں اور اس کو دین کا قائم مقام بنا لیتے ہیں، وہ کہتا ہے کہ اس صاف اور سیدھے دین کو اختیار کرو جو خدا اور رسول نے بتایا ہے اور جو اصحاب رسول کے ذریعہ ہم کو پہنچا ہے۔

جو شخص اس قسم کا دین بگڑے ہوئے زمانہ میں لے کر اٹھے وہ لوگوں کی نظر میں کافر و مشرک سے بھی زیادہ مبغوض ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ ان کی دینی حیثیت کو بے بنیاد ثابت کرتا ہے۔ اس سے ان کو اپنی قیادت پر ضرب پڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس سے ان کے معاشی مفادات درہم برہم ہوتے ہیں۔ اس سے ان کی گدیاں چھنتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

اس کو ماننا اپنے آپ کو جمے ہوئے مفادات سے محروم کرنے کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ ایسا شخص ایک طرف عوام کی عافیت کوش زندگی کے لئے تازیانہ بن جاتا ہے اور دوسری طرف خواص کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ ان کے شہ سوار اسلام ہونے کو مشتبہ بنا رہا ہے۔ یہ چیزیں اس شخص کو اتنی بے شمار قسم کی مخالفتوں اور مشکلات میں مبتلا کر دیتی ہیں کہ اس کے مقابلہ میں ایک دن میدان جنگ میں لڑ کر مر جانا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

ان مخالفتوں میں سب سے زیادہ شدید مخالفت ان قائدین کی طرف سے سامنے آتی ہے جو دین کے نام پر دنیوی فائدے حاصل کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کی قیادت کا راز صحیح دین کا علم بردار بننا نہیں ہوتا۔ وہ یہ کرتے ہیں کہ بگاڑ کے زمانے میں پائی جانے والی دینی شکلوں میں اپنی جگہ بنا لیتے ہیں۔ کوئی کسی ادارہ کی گدی پر بیٹھ جاتا ہے، کوئی دینی جشنوں اور تقریبوں میں خطابت کا جوہر دکھا کر مرجع خلائق بن جاتا ہے۔ کوئی دین کو رائج الوقت پیمانوں میں ڈھال کر لوگوں کے درمیان مقبولیت حاصل کر لیتا ہے۔ کوئی گزری ہوئی مقدس شخصیتوں کا سہارا لے کر ان کے نام پر اپنا کاروبار چلا رہا ہوتا ہے۔ کوئی دین کے ایسے سستے نسخوں کی کامیاب تجارت کر رہا ہوتا ہے جس میں لوگوں کو اپنی زندگی کا ڈھانچہ بدلے بغیر جنت کی بشارتیں مل رہی ہوں۔

صحیح دینی دعوت کا اٹھنا اس قسم کے تمام لوگوں کے لئے چیلنج بن جاتا ہے۔ اس کے فروغ میں ان کو اپنا عزت و اقتدار مٹتا ہوا نظر آتا ہے۔ مزید یہ کہ ایک عرصہ تک عزت و استقبال کے جلو میں رہنے کے نتیجہ میں ان کے اندر ایک قسم کا دینی کبر پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی ذات کو اور دین کو ہم معنی سمجھ لیتے ہیں۔ فطری طور پر وہ ایک ایسے شخص کا اعتراف کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے جو ان کی امتیازی حیثیت کو بے اعتبار ثابت کرے۔ اعاظم و اکابر کی یہ مخالفت سچے دین کے علم بردار کے لئے انتہائی شدید مسائل پیدا کر دیتی ہے۔ وقت کے دینی حلقوں کی طرف سے اس کا بائیکاٹ کیا جاتا ہے۔ اس کی بے دینی کے فتوے دیئے جاتے ہیں۔ اس کی معاشیات کو برباد کیا جاتا ہے۔ اس کو ماحول میں بے جگہ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کے خلاف ہر قسم کی معاندانہ کارروائی کو جائز سمجھ لیا جاتا ہے۔ اکابر قوم کی مخالفت سے اصاغر قوم کو مزید جرأت ہوتی ہے۔ بالآخر یہاں تک نوبت پہنچتی ہے کہ اپنی قوم کے اندر رہنا اس کے لئے انگاروں کے درمیان رہنے کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ ان حالات میں فسادِ امت کے وقت سنتِ رسول کو زندہ کرنے کے لئے اٹھنا اتنی بے پناہ مشکلات کا سبب بن جاتا ہے جو سو بار قتل ہونے کے برابر ہے۔ اسی بنا پر آپ نے فرمایا کہ ایسے شخص کے لئے اللہ کے یہاں سو شہیدوں کا اجر ہے۔ جس طرح خدا کی کوئی حد نہیں، اسی طرح خدا کے دین کی راہ میں آگے بڑھنے کی بھی کوئی حد نہیں۔ خدا کا دین گویا دنیا میں رزق الٰہی کا ایک عظیم دستر خوان ہے۔ اس رزق کا سب سے بڑا حصہ اسی کو ملتا ہے جو اس راہ میں اپنے کو ملیامیٹ کرنے کے لئے تیار ہو۔ یہ عزت و شہرت کا اسٹیج نہیں، بربادی کے مقامات ہیں۔ ان مقامات کو طے کرنا بلاشبہ سولی پر چڑھنے سے زیادہ سخت ہے۔ مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ آدمی دین کو اس کی اعلیٰ سطح پر اس وقت تک پا نہیں سکتا جب تک وہ قربانیوں کی قیمت پر دین کو حاصل کرنے کے لئے تیار نہ ہو۔ وما یلقّٰھا الا الذین صبروا وما یلقّٰھا الا ذو حظ عظیم (حم سجدہ ۳۵) ■

ایک واقعہ دو انجام

تیرھویں صدی عیسوی میں جب کہ مسلمان سیاسی طاقت، تمدنی ترقی اور علوم و فنون میں دنیا کی تمام قوموں سے بڑھے ہوئے تھے۔ یورپ نے طے کیا کہ اس کو عربی پڑھنی ہے اور مسلمانوں کے علوم سیکھنے ہیں۔ یہی فیصلہ تھا، جو پندرھویں صدی کے اس عظیم واقعہ کا سبب بنا جس کو دنیا یورپ کی نشاۃ ثانیہ (Rennaissance) کے نام سے جانتی ہے۔ مسلمانوں کے علوم سیکھ کر اور ان میں اضافہ کر کے یورپ اتنا طاقت ور ہو گیا کہ نہ صرف مسلمانوں پر بلکہ ساری دنیا پر چھا گیا۔

اس واقعہ کے پانچ سو برس بعد یہی صورت حال برعکس شکل میں مسلمانوں کے سامنے تھی۔ انھوں نے دیکھا کہ یورپ سیاست و تمدن اور علوم و فنون میں سب سے آگے بڑھ گیا ہے۔ ان کے اندر یہ رجحان ابھرا کہ وہ یورپی زبانیں سیکھیں اور یورپ کے علوم کو حاصل کریں۔ مگر یہاں نتیجہ برعکس نکلا۔ یورپی طرز کی تعلیم نے ہم کو یورپ کا ذہنی غلام بنا دیا۔ ہم اپنے علیحدہ قومی وجود کو بھول کر یورپ کے رنگ میں رنگ گئے۔

ایک ہی نوعیت کے دو واقعات میں انجام کا یہ فرق کیوں ہے۔ اس کا جواب ذہنیت کے اس فرق میں ہے جو دونوں جگہ پایا جاتا ہے۔ یورپ نے ہمارے علوم کو اس جذبہ کے تحت سیکھا تھا کہ وہ ہمارے ہتھیاروں سے ہم کو شکست دے سکے۔ اس کے برعکس ہم یورپی علوم کی طرف اس لئے بڑھے کہ ہم اس کے نقال بن کر اس کی نظروں میں باعزت ہو جائیں۔ اور جہاں ذہنیت میں اس قسم کا فرق پایا جائے وہاں انجام میں فرق پایا جانا لازمی ہے۔

مسلمانوں کو ایک ہزار سال تک دنیا میں وہی حیثیت حاصل رہی ہے جو آج روس یا امریکہ کو حاصل ہے۔ اس وقت جب کہ یورپ پر ابھی قرونِ مظلمہ (Dark Ages) کا اندھیرا چھایا ہوا تھا، عرب مسلمان ایک شاندار تہذیب کو وجود میں لا چکے تھے۔ اور اپنی تحقیقات اور یونانی اور دوسرے علوم کے ترجموں کی مدد سے سائنس اور فلسفہ میں دنیا کی امامت کر رہے تھے، اس وقت مسلمان ساری دنیا میں علم اور تہذیب کے تنہا مالک تھے۔ عربی زبان دنیا کی واحد علمی زبان تھی اور ساری دنیا کے لوگ علوم و فنون کے اکتساب کے لئے مسلم مرکزوں (دمشق، بغداد، قرطبہ، غرناطہ) کا اسی طرح سفر کرتے تھے جیسے آج لوگ اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ اور امریکہ کے شہروں میں جاتے ہیں۔

بارھویں اور تیرھویں صدی میں جب کہ مسلمانوں کی طاقت عروج پر تھی اور وہ عرب سے بڑھتے بڑھتے فرانس تک پہنچ گئے تھے اس وقت یورپ نے مسلمانوں کے خلاف اپنی شدید ترین جنگ چھیڑ دی اور گیارھویں صدی کے آخر (۱۰۹۶) سے لے کر تیرھویں صدی کے آخر تک دو سو برس پورا یورپ مسلمانوں کے خلاف خوفناک جنگ لڑتا رہا۔ یہ جنگ جو صلیبی لڑائیوں (Crusades) کے نام سے مشہور ہے، بالآخر یورپ کی مکمل ناکامی پر ختم ہوئی۔

مگر یورپ نے ہمت نہیں ہاری۔ اب اس کے اندر ایک نیا رجحان ابھرا۔ صلیبی جنگوں کے درمیان اہل یورپ کو تجربہ ہو گیا تھا کہ مسلمان علم اور سائنس میں ان سے بہت آگے ہیں۔ اس وقت کا تصور کیجئے، جب مصری فوج نے منجنیقوں

کے ذریعہ فرانسیسی لشکر پر آگ کے بان پھینکنا شروع کئے۔ یہ بان جب منجنیقوں سے نکل کر دشمن کی طرف بڑھتے تو ایسا نظر آتا جیسے بڑے بڑے آتشیں اژدہے ہوا میں اڑ رہے ہوں۔ فرانسیسی، جن کے پاس اس وقت پرانے وقتی ہتھیاروں کے سوا اور کچھ نہ تھا، ان کے لئے یہ بان ایسے ہی بھیانک تھے جیسے آج کسی پس ماندہ اور بے سروسامان ملک پر جدید ترین راکٹوں کے ذریعہ حملہ کر دیا جائے۔ اسی طرح مسلمان تہذیب و تمدن کے تمام پہلوؤں میں نمایاں طور پر اہل یورپ سے بڑھے ہوئے تھے۔ چنانچہ صلیبی جنگوں کے ناکام تجربہ کے بعد یورپ نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کو شکست دینے کے لئے اب اس کو دوسرے قسم کی جنگ چھیڑنی ہے، اور وہ یہ کہ مسلمانوں کے ہنر اور اُن کے علوم کو سیکھ کر انھیں کے ہتھیاروں سے انھیں شکست دی جائے۔

اب ایک طرف یورپ کے مذہبی طبقہ نے روحانی صلیبی جنگ (Spiritual Crusadws) کا نعرہ دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں کے مذہبی علوم کو سیکھا جائے۔ اور مسلمانوں کی تاریخ اور ان کے عقائد کو اس طرح بگاڑ کر پیش کیا جائے کہ مسلمان اپنے دین سے متنفر ہو جائیں اور عیسائیت قبول کر لیں تاکہ وہ قوم جس کو فوجی میدان میں شکست نہیں دی جا سکی ہے، اس کو عددی حیثیت سے کمزور کر کے مغلوب کیا جا سکے۔ عیسائی مشنری تحریک پہلی بار صلیبی جنگوں کے زمانے میں شروع ہوئی۔ پہلا شخص جس نے ۱۱۵۴ء میں ماؤنٹ کارمل پر مشنری نظام قائم کیا وہ ایک صلیبی ہی تھا۔ بعد کو فرانسس کن (۱۲۱۹) نے اس کی پیروی کی۔ یہ مشنری تحریک آج ساری دنیا میں سب سے زیادہ طاقت ور تبلیغی ادارہ کی حیثیت سے کام کر رہی ہے۔ اس کی کوششیں اس حد تک کامیاب ہوئی ہیں کہ ساری دنیا کا لٹریچر اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں غلط قسم کی باتوں سے بھر گیا ہے۔

دوسری طرف مسلمانوں کا فلسفہ و سائنس اور ان کے علوم و فنون سیکھنے کی تحریک زور شور سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ یورپ کی درس گاہوں میں عربی زبان پڑھانے کا انتظام کیا گیا۔ مسلمانوں کی تصنیفات کے ترجمے یورپ کی زبانوں میں کئے جانے لگے۔ یورپ کے طلبہ مسلم شہروں میں تحصیل علم کے لئے جانا شروع ہوئے۔

جنگ کی یہ نئی تکنیک اختیار کرنے کی وجہ سے یورپ کو اندرونی طور پر مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس وقت یورپ کے قدامت پسند حلقوں میں عربی زبان کی توسیع کی حوصلہ افزائی کے سلسلہ میں ناراضگی پائی جاتی تھی جس کی وجہ خاص طور پر یہ اندیشہ تھا کہ عربی سیکھنے سے عیسائیوں کے درمیان اسلامی خیالات پھیلنا شروع ہو جائیں گے۔ مثال کے طور پر فرانسس کن راہب راجر بیکن (۹۴ - ۱۲۱۴) جو اپنے وقت کا مشہور انگلستانی عالم تھا، اس نے جب عربی زبان کی اہمیت پر زور دیا تو آکسفورڈ کے علما رچلا اٹھے "بیکن مسلمان (Saracen) ہو گیا"۔

مگر اس طرح کی مخالفتوں کے باوجود مسلمانوں کی زبان اور ان کے علوم سیکھنے کا رجحان بڑھتا رہا۔ مسلم محققین کے حاصل کو لے کر یورپ نے اپنی کوشش سے اس میں اضافے کئے اور اتنی ترقی کی کہ تاریخ میں پہلی بار قوت کا معیار بدل دیا اور بالآخر مسلمانوں کو ہر میدان میں شکست دے کر علم و عمل کی پوری دنیا کا مالک بن گیا۔ جدید مورخین نے تقریباً متفقہ طور پر تسلیم کیا ہے کہ یورپ کی نشأۃ ثانیہ کا اہم ترین محرک وہ علوم تھے جو مسلمانوں کی معرفت یورپ تک پہنچے

(ویسٹرن سویلزیشن، اڈورڈ میکنال برن)

اس کے پانچ سو برس بعد تاریخ دوسرا منظر دیکھتی ہے یورپ کی ترقی اور عروج سے متاثر ہو کر مسلمانوں کے اندر یہ رجحان ابھرا کہ وہ یورپ کے علوم و فنون کو سیکھیں۔ مگر یہاں اس رجحان کا محرک اس سے بالکل مختلف تھا جو یورپ کی تاریخ میں ہمیں نظر آتا ہے۔ سرسید احمد خاں (۹۸ - ۱۸۱۷) جو پروفیسر گب کے الفاظ میں اسلام میں پہلی جدت پسند تنظیم (Modernist Organization) کے بانی تھے۔ انھوں نے ۱۸۷۵ میں علی گڑھ کالج قائم کیا اور اس پر اپنی ساری زندگی وقف کر دی۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۰ میں وہ یونیورسٹی ہو گیا، وہ یورپی طرز کی تعلیم کے زبردست حامی تھے۔ ان کا مقصد اس تعلیم سے کیا تھا اس کی ترجمانی ان کے رفیق خاص مولانا حالی نے ان الفاظ میں کی ہے:

حالی اب آؤ پیروئ مغربی کریں

سرسید نے جب انگلستان سے واپس آکر دسمبر ۱۸۷۰ میں تہذیب الاخلاق نکالنا شروع کیا تو انھوں نے پہلے پرچہ کے شروع میں لکھا:

> "اس پرچہ کے اجراء سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سویلزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے تاکہ جس حقارت سے سویلائزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب قوم کہلادیں"

سرسید جب ترقی کا تصور کرتے تو ان کے ذہن میں "زرق برق وردیاں پہنے کرنل اور میجر بنے ہوئے مسلمان نوجوان" ہوتے تھے۔ ان کا منتہائے مقصود ایسی تعلیم تھی جو مسلمانوں کو اعلیٰ عہدوں تک پہنچا سکے۔ سرسید کی تہذیب کو مہدی افادی نے بجا طور پر "اینگلو محمڈن کلچر" کا نام دیا ہے۔

کمال اتاترک (۱۹۳۸-۱۸۸۱) جو اس گروہ کا دوسرا نمایاں ترین نام ہے، وہ اس معاملہ میں سرسید سے بھی آگے تھے۔ ترکی میں مغربی تعلیم و تہذیب کی اشاعت سے کمال اتاترک کا مقصد کیا تھا، اس کا اندازہ اس عنوان سے ہوتا ہے جو اس مہم کو وہاں دیا گیا۔ کمال اتاترک اور ان کے ساتھیوں کے نزدیک یہ "غرب دوغرو" تھا، جس کے معنی ترکی زبان میں ——— "سمت مغرب میں سفر" کے ہیں۔ سمت مغرب میں سفر کا یہ کام اس درجہ اہم تھا کہ صرف رومن رسم الخط جاری کرنے اور ترکی باشندوں کو ہیٹ پہنانے کے لئے ہزاروں آدمی اس طرح ہلاک کر دیئے گئے گویا وہ ریاست سے بغاوت کے مجرم ہوں۔

اسی تقلیدی ذہنیت کا نتیجہ تھا کہ ہمارے ان مصلحین کی ساری توجہ بس یورپ کی تہذیب اور یورپ کے زبان و ادب کے حصول پر لگی رہی۔ سائنس اور ٹکنالوجی جو مغربی قوموں کی ترقی کا اصل راز ہے، اس کو مسلمانوں کے اندر رائج کرنے کی انھوں نے زیادہ کوشش نہیں کی۔ سرسید نے تو صراحۃً مسلمانوں کے لئے ٹکنیکل ایجوکیشن کی مخالفت کی اور "اعلیٰ درجہ کی دماغی تعلیم" کو سب سے مقدم قرار دیا۔ یہی اس زمانہ میں تعلیم جدید کے حامیوں کا عام نقطۂ نظر تھا۔ ان

ضرات نے ساری توجہ صرف اس پر دی کہ ایک ایسا گروہ پیدا ہو جائے جو مغربی تمدن اور یورپی ادب میں کمال حاصل کئے ہوئے ہو۔ کمال اتاترک کا نام نہاد انقلاب اور روس کے اشتراکی انقلاب میں صرف چند سال کا فرق ہے، مگر حیرت انگیز بات ہے کہ روس آج خلا میں راکٹ پھینک رہا ہے اور ترکی ابھی تک مغربی مصنوعات کا گودام بنا ہوا ہے۔

یورپ جس ذہن کے تحت ہمارے علوم کی طرف بڑھا وہ یہ تھا کہ مسلمانوں سے ان کے علوم اور ان کے ہنر کو لے کر اس کے ذریعہ سے انھیں شکست دی جائے۔ ان چیزوں کو اس نے وقت کی طاقت سمجھا اور اس کو اپنے دشمن کے مقابلہ میں استعمال کیا۔ چنانچہ اپنی اس مہم کو یورپ نے "تقلیدِ مشرق" یا "تقلیدِ مسلم" کا نام نہیں دیا بلکہ اس کو روحانی صلیبی جنگ (Spiritual Crusades) کہا، جس کا مطلب یہ تھا کہ صلیبی لڑائیوں کی ہاری ہوئی بازی کو نئی تکنیک سے کامیاب بنایا جائے۔ اور جب اس کوشش سے وہ اپنے کو ایک نئے انقلاب تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے تو اس کو انھوں نے یہ حیثیت دی گویا انھوں نے خود اپنی کھوئی ہوئی حیثیت دوبارہ حاصل کی ہے۔ چنانچہ یورپ میں اس نئے انقلاب کا تاریخی نام نشاۃ ثانیہ (Renaissance) رکھا گیا ہے۔ یہ فرانسیسی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے ـــــ نیا جنم (Rebirth) گویا یہ کوئی غیر سے حاصل کی ہوئی چیز نہیں ہے، بلکہ یہ یورپ کی اپنی ہی متاع ہے جو اس نے دوبارہ پائی ہے۔ یورپ نے لیتے وقت اگرچہ ان علوم کو مسلمانوں سے لیا تھا، مگر اس نے حال کی کڑی کو حذف کرکے اس کا رشتہ ماضی سے ملایا اور اس کو مغرب کے ایک ملک ــ یونان ــ کی چیز قرار دے کر اس کو نشاۃ ثانیہ کہا۔ اس کے برعکس ہم نے ایسا نہیں کیا، حالاں کہ یورپ جو چیز ہمیں دے رہا تھا وہ اضافہ شدہ حالت میں وہی سرمایہ تھا جو یورپ کو ہم نے عطا کیا تھا۔ مسلمان مغربی علوم کی طرف خالص تقلیدی ذہن کے ساتھ بڑھے ان کا یہ عمل سرسید کے یہاں "پیروئ مغرب" اور اتاترک کے یہاں "غرب دو غرو" کے ہم معنی تھا۔ ذہنیت کے اس فرق کا لازمی نتیجہ یہ ہونا تھا کہ یورپ ہمارے علوم کو سیکھ کر ہمیں شکست دے اور اس کے برعکس ہم مغرب کے علوم کو سیکھ کر صرف مغرب کے بھونڈے نقال بن کر رہ جائیں۔

مصطفیٰ کمال کی تحریک کا آخری نشانہ یہ تھا کہ ترک قوم ہیٹ اور پتلون پہننے لگے۔ اور سرسید کا منتہائے نظر یہ تھا کہ مسلم نوجوان مغربی ادبیات میں کمال حاصل کرلیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے ذہن کے تحت مغرب کی طرف بڑھنے کا وہی نتیجہ برآمد ہو سکتا تھا جو عملاً برآمد ہوا۔

یہ تاریخ جہاں ایک طرف ہماری غلطی کو بتاتی ہے وہیں اس کے اندر اس کا بھی نشان ہے کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ ہمیں وہی کرنا چاہئے جو مغربی قوموں نے ہمارے ساتھ کیا۔ مغربی علوم کو اس لئے سیکھنا تاکہ اس کے ذریعہ مغربی تہذیب کو شکست دے کر اسلام کو غالب کیا جائے۔ اگر ہمارے اندر یہ ذہن پیدا ہو جائے تو وہی نتیجہ برعکس شکل میں ظاہر ہوگا جو مغربی قوموں کے لئے ہمارے مقابلہ میں ظاہر ہوا تھا۔

جب زندگی اللہ کے رنگ میں رنگ جائے

یہود و نصاریٰ کے یہاں رواج تھا کہ جب ان کے یہاں بچہ پیدا ہوتا یا کسی نئے آدمی کو اپنے دین میں داخل کرتے تو اس کو خاص قسم کے زرد رنگ میں غوطہ دیتے۔ اس رنگ میں رنگنا ان کے نزدیک آدمی کے خدا پرست اور نجات یافتہ ہونے کا نشان تھا۔ قرآن میں کہا گیا کہ اس قسم کا ظاہری رنگ چڑھا لینے سے کچھ نہیں ہوتا، اپنے باطن کو "رنگین" بنانے کی کوشش کرو:

صبغة الله ومن احسن من الله صبغة (بقرہ ۱۳۸)   اللہ کا رنگ، اور اللہ سے بہتر کون رنگ ہے۔

گویا دین کسی ظاہری رنگ کا نام نہیں بلکہ معنوی رنگ کا نام ہے —— وہ دین جو اعضاء و جوارح کی سطح پر اٹکا ہوا ہو، جو کچھ عملیات کو دہرانے کے ہم معنی ہو۔ جو آدمی کے لئے خارجی امور میں بحث و مباحثہ کا موضوع ہو، جو دوسروں کے خلاف شور و غل کا پروگرام دیتا ہو۔ جو جلسوں اور جلوسوں اور اخباروں کی سطح پر نمایاں ہونے کا عنوان ہو، وہ گویا ظاہری اصطباغ کا دین ہے۔ وہ ایسا ہی ہے جیسے جسم کو اوپر سے "زرد رنگ" میں رنگ لیا اور اندر کا حقیقی وجود بدستور بے رنگ پڑا رہا۔

اصل دین وہ ہے جو آدمی کے اندر ہل چل پیدا کر دے، جو آدمی کے دل و دماغ میں آگ لگانے والا ہو۔ جو آدمی کے اندرونی وجود کو خدا کے رنگ میں رنگ دے۔ پہلی قسم کا دین آدمی کے اوپر اوپر رہتا ہے۔ جب کہ اصل دین آدمی کی حقیقی ہستی میں شامل ہو جاتا ہے۔ پہلی قسم کے دین میں ایک شخص کچھ چمتکار دکھا کر یا بعض عملیات کر کے سمجھتا ہے کہ وہ دیندار بن گیا۔ جب کہ اصل دین اس کے اندرونی احساسات سے لے کر اس کی آنکھ اور زبان اور ہاتھ اور پاؤں تک جگہ طاری ہو جاتا ہے۔ وہ اس کو بالکل دوسرے قسم کا انسان بنا دیتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ پہلی قسم کے دین میں آدمی کی اصل ہستی اور اس کا دین دونوں الگ الگ رہتے ہیں۔ جب کہ اصل دین میں دونوں ایک دوسرے میں شامل ہو جاتے ہیں۔ نہ دین اس سے جدا رہتا ہے اور نہ وہ دین سے۔

صحیح مذہب وہ ہے جو آدمی کی زندگی میں اسی طرح شامل ہو جائے جیسے پانی میں رنگ شامل ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس وہ مذہب بناوٹی مذہب ہے جو آدمی کی اپنی زندگی سے باہر باہر نجات کے عملیاتی راستے بتائے۔ خواہ وہ سیاسی عملیات ہوں یا نام نہاد روحانی عملیات۔

علمائے نفسیات ذہنی اختلال کے وقت آدمی کے لاشعور کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اسی طرح اوپری رنگ اور حقیقی رنگ کو جاننے کا وقت وہ ہوتا ہے جب کہ کوئی ایسا ناخوش گوار واقعہ پیش آئے جس سے آدمی کے نفس کو چوٹ لگے۔ اگر وہ سچا ہے تو ایسے وقت اس کے اندر سے تواضع ابھرے گی کیونکہ خدا پرستی کی حقیقت تواضع ہے۔ اس کے برعکس اگر جھٹکا لگنے کے وقت اس کے اندر نفرت، کبر اور انانیت ابھرے تو سمجھ لیجئے کہ اس کا دین محض اوپری رنگ کا دین تھا جو معمولی آنچ لگتے ہی اڑ گیا۔ ■

ISLAM IN BRITAIN

Mr. Ahmed Thomson, a member of the British *Sufis*, who are setting up a Muslim Village outside Norwish in the United Kingdom has expressed the following views—

(1) The resurgence of Islam in the UK particularly and in the West generally, is the fulfilment of the promise given by the Holy Prophet of Islam, peace be on him, **that Islam will have a revival every hundred years.**

(2) We are in 1398 Hijra and within two years we will be entering the 15th century Hijra, when *Insha Allah*, **Islam will have its biggest revival in the West ever.**

(3) Unless there are more Muslim Barristers in the UK we can't change the law here. Law here is subservient to Parliament while for a **Muslim, law is subservient to Allah** and is to be guided by Allah's words as revealed in the Holy Quran and explained and expanded in the *Hadith* and *Sunnah*.

(4) As their own faith and religion has failed to solve their problem, non-Muslims listen carefully to what Islam has to offer and very often they come to the fold.

(5) The Prophet's forecast is coming true. The day Franco died two Spaniards came to Shaikh Abdul Qadir and said they wanted to return to the religion of their forefathers—Islam. They embraced Islam and stayed at the centre for a whole year to learn all about Islam in detail and have since returned to Cordova where they have set up an Islamic Centre and now there are 25 Spanish Muslims in Cordova and they have even set up a mosque there. That's the beginning; **Islam is spreading in Spain once again.**

Mr. Ahmed Thomson once belonged to the Church of England. He embraced Islam a couple of years ago and since then has been to Haj as well. He is hardly 25 and is reading law at Grey's Inn. He belongs to the group of British Muslims who were converted to Islam by Sufi Abdul Qadir—an English man—who had set up a centre for British Muslims (converts) at Maida Vale in London, a sort of Islamic commune or kibbutz.

British Muslims are pure, unadulterated, no nonsense, Muslims. They lead a self-sufficient life and strictly adhere to Islamic dictates; they dress in flowing robes and wear '*Ammaama*. Their women and girls also cover their heads all the time and wear long robes. They also publish a magazine called ISLAM.

There are now in the Village over 40 English Muslims, men, women and children, and they have set up a Madresa where English children (five or six) are being taught the Holy Quran.

The Caliph of the commune is Abdus-Samad, who speaks very good Urdu as he was in Lahore some years ago. He too is an Englishman.

They have set up a mosque in an old hall; it is called Ihsaan Mosque.

* * *

Islam on British T.V. (By Yahya M. Syed, Reproduced from Dawn, Karachi of September 10, 1978.)

I couldn't believe my ears and eyes when I heard the question master asking two groups of students, one of non-Asians or immigrants, and another of English non-Muslims, who was the first caliph of Islam and who was the last. And an English girl, correctly answered both the questions. The Quiz Master, Keith Macklin, then went on to ask about the different Islamic schools—Sha-fi-', Hambli, Maliki and (Hanafi), and a English boy gave the answers correctly.

The boys and girls, all in their teens, in the quiz programme were shown photographs of the Blue Mosque in Turkey and were asked who built it. No one knew—Sulaiman the magnificent, said Keith Macklin. Other photographs included Masjid-e-Aqsa and other well known mosques in Baghdad and elsewhere.

Then he asked who was killed at Karbala, the question was asked in stages, giving more details at every stage, but in the end a girl got the correct answer, Hasan, she said, which the Quiz Master corrected: Hussain and awarded her one point for the effort! Questions of the same standard and tenor followed thick and fast till the final gong. The score was 26 to 22.

I looked at the programme for all the 25 minutes it lasted. It was "Junior Sunday Quiz", a Yorkshire TV Production and shown on the Independent Television during the weekend.

It was the second-round contest of religious competition on Islam. Full marks to the producer of the Quiz programme, Tony Scott, and its researcher Jane Aldrick. I only wish the press officer of either Yorkshire TV or ITV had realized the importance of the programme and given advance publicity in the Press. It could have had a top viewing rating.

Only a year ago I could not imagine that a question and answer programme on Islam and Islamic history would be screened on British TV in which English boys and girls would be participating with a zeal, and keenness that would put many modern Muslims to shame!

یحییٰ سید کا ایک مضمون اخبار ڈان کراچی (۱۰ ستمبر ۱۹۸۷ء) میں چھپا ہے۔ وہ اپنے لندن کے سفر کے تاثرات بتاتے ہوئے لکھتے ہیں۔ مجھے اپنے آنکھ اور کان پر یقین نہیں آرہا تھا۔ میں برٹش ٹیلی وژن پر بچوں کے سوال و جواب کا پروگرام دیکھ رہا تھا۔ "اسلام کا پہلا خلیفہ کون تھا" سوال کرنے والے مسٹر کینیتھ میکلی نے پوچھا۔ ایک غیر مسلم انگریز لڑکی نے بالکل صحیح جواب دیا۔ اس نے پھر مختلف فقہی مکاتب کے بارے میں سوالات کئے اور دوبارہ ایک انگریز لڑکا نہایت صحیح جواب دیتا رہا۔ یہ سب لڑکے لڑکیاں ۱۰ سال اور ۲۰ سال کے درمیان کی عمر والے تھے۔ سوال کرنے والے نے پوچھا: کربلا میں کون شہید ہوا۔ جوابات صحیح تھے صرف اس فرق کے ساتھ کہ لڑکی نے حسین کے بجائے حسن کا نام لیا۔ آخر میں اعلان ہوا تو معلوم ہوا کہ ٹونی اسکاٹ نے پورے نمبر پائے۔ ٹیلی وژن پر اس قسم کے اسلامی پروگرام کو دیکھنے والوں کی تعداد یہاں تیزی سے بڑھ رہی ہے — ایک سال پہلے تک اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔

مسٹر احمد ٹامسن ایک انگریز نومسلم ہیں — یہ "برٹش صوفی" حلقہ سے تعلق رکھتے ہیں جس کو ایک انگریز نومسلم "صوفی عبدالقادر" نے قائم کیا ہے۔ ان لوگوں نے انگلستان میں ایک مسلم بستی بنائی ہے جس میں چالیس سے اوپر نومسلم انگریز رہتے ہیں۔ مسٹر احمد ٹامسن نے کہا کہ اسلام دوبارہ دنیا کی طاقت بننے والا ہے۔ انھوں نے یورپ میں اسلام کے پھیلنے کی تفصیلات بتاتے ہوئے کہا کہ اسپین میں جب جنرل فرینکو کا انتقال ہوا تو دو اسپینی باشندے صوفی عبدالقادر کے پاس آئے۔

انھوں نے اسلام قبول کیا۔ ایک سال تک انگلستان میں رہ کر انھوں نے اسلام کی تعلیمات کو سیکھا۔ اس کے بعد وہ اسپین گئے اور وہاں قرطبہ میں اسلامک سنٹر قائم کیا۔ ان کی کوششوں سے اب تک پچیس اسپینی اسلام قبول کر چکے ہیں۔ انھوں نے قرطبہ میں ایک مسجد بھی بنائی ہے۔ اسلام دوبارہ اسپین میں اپنی تاریخ شروع کر رہا ہے۔

برطانیہ کے یہ نومسلم خود کفیل زندگی گزارتے ہیں وہ پوری طرح اسلام پر عمل کرتے ہیں۔ وہ عمامہ پہنتے ہیں ان کی عورتیں اور لڑکیاں اپنے پورے سر کو ڈھکے رہتی ہیں ان کا ایک میگزین بھی نکلتا ہے جس کا نام "اسلام" ہے انھوں نے اپنی بستی میں ایک اسلامی مدرسہ بھی بنایا ہے جس میں بچوں کو قرآن پڑھایا جاتا ہے۔ ■

امریکی فلسفی رالف والڈو ایمرسن (۱۸۰۳-۱۸۸۲) نے اپنے زمانہ کی امریکی جماعتوں کے بارہ میں کہا تھا:

Our parties are parties of circumstances and not of principle

ہماری جماعتیں محض حالات کی پیداوار ہیں۔ وہ اصولی جماعتیں نہیں ہیں۔ یہی بات آج کی ہندستانی جماعتوں پر صادق آتی ہے۔ حتیٰ کہ خود ملی اور اسلامی جماعتیں بھی بڑی حد تک اسی کا مصداق ہیں۔ ہماری تحریکیں وقتی حالات کے تحت اٹھ کھڑی ہوئیں۔ مثبت فکر اور مستقل ذمہ داری کے احساس نے ان کو پیدا نہیں کیا۔ یہ تحریکیں اگر مستقل ذمہ داری کے احساس کے تحت وجود میں آتیں تو وہ دعوتی تحریکیں ہوتیں نہ کہ ہماری موجودہ تحریکوں کی طرح سیاسی اور احتجاجی تحریکیں۔ ■

اللہ کے یہاں دونوں برابر نہیں ہو سکتے

اجعلتم سقاية الحاج وعمارة المسجد الحرام
كمن آمن بالله واليوم الآخر وجاهد في سبيل
الله لا يستوٗن عند الله والله لا يهدي القوم
الظالمين۔ الذين آمنوا وهاجروا وجاهدوا في
سبيل الله باموالهم وانفسهم اعظم درجة
عند الله واولٰئك هم الفائزون يبشرهم
ربهم برحمة منه ورضوان وجنّٰت لهم فيها
نعيم مقيم (توبہ ۲۱-۱۹)

کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کی خدمت
کرنے کو اس شخص کے برابر ٹھیرا لیا ہے جو ایمان لایا اللہ
پر اور آخرت کے دن پر اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ اللہ
کے نزدیک دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ اور اللہ ظالموں
کو راہ نہیں دکھاتا۔ جو لوگ کہ ایمان لائے اور جنھوں نے
گھر چھوڑا اور اپنے مال اور جان سے اللہ کی راہ میں جہاد
کیا ان کا درجہ اللہ کے یہاں بہت بڑا ہے اور وہی لوگ
کامیاب ہیں۔ ان کا رب ان کو خوش خبری دیتا ہے اپنی
طرف سے رحمت اور رضامندی کی اور ایسے باغوں کی
کہ ان میں ان کے لئے دائمی نعمت ہوگی۔

کعبہ، اسلام کے ظہور کے بہت پہلے سے تمام عربوں کے نزدیک مقدس چلا آرہا تھا۔ صدیوں کی تاریخ نے اس کی عظمتیں لوگوں کے دلوں میں قائم کردی تھیں۔ اس سے معمولی انتساب بھی ایک قابل تذکرہ چیز سمجھا جاتا تھا۔ کعبہ کی زیارت اتنا مقدس عمل تھا جس کو آدمی فخر کے ساتھ بیان کرسکتا تھا۔ کعبہ کا خادم اور منتظم ہونا ایک ایسا مسلّمہ اعزاز تھا کہ جس کو حاصل ہو جائے اس کو وہ قوم کا سردار بنانے کے لئے کافی ہو۔ مکہ کے مشرکین کعبہ کی انھیں پرفخر روایات کے اوپر کھڑے ہوئے تھے۔ کعبہ سے انتساب اور اس کی زیارت و خدمت نے ان کو لوگوں کی نظر میں محترم بنا دیا تھا۔ وہ سوچ نہیں سکتے تھے کہ اس کے باہر بھی فضل و شرف کا کوئی درجہ ہے جو کسی کو خدا کی طرف سے عطا کیا جائے۔

دوسری طرف اسلام تھا جس کی ابھی کوئی تاریخ نہیں بنی تھی۔ جس کے گرد ابھی تک عظمتوں کی روایات جمع نہیں ہوئی تھیں۔ اس کی تصویر لوگوں کی نظر میں یہ تھی کہ ـــــ ایک یتیم جو ابھی تک بکریاں چراتا تھا، اپنے ذاتی حوصلوں کے تحت داعی حق بن کر کھڑا ہو گیا ہے۔ اور کچھ لٹے پٹے لوگ اس کا ساتھ دے رہے ہیں۔ ایک، دیکھنے والوں کو قوم کے اصاغر کا وقتی مجمع نظر آتا تھا۔ دوسرا، قوم کے اکابر کا شاندار قافلہ جو عزت و شرف کی ابدی مسندوں پر جلوہ افروز ہو۔

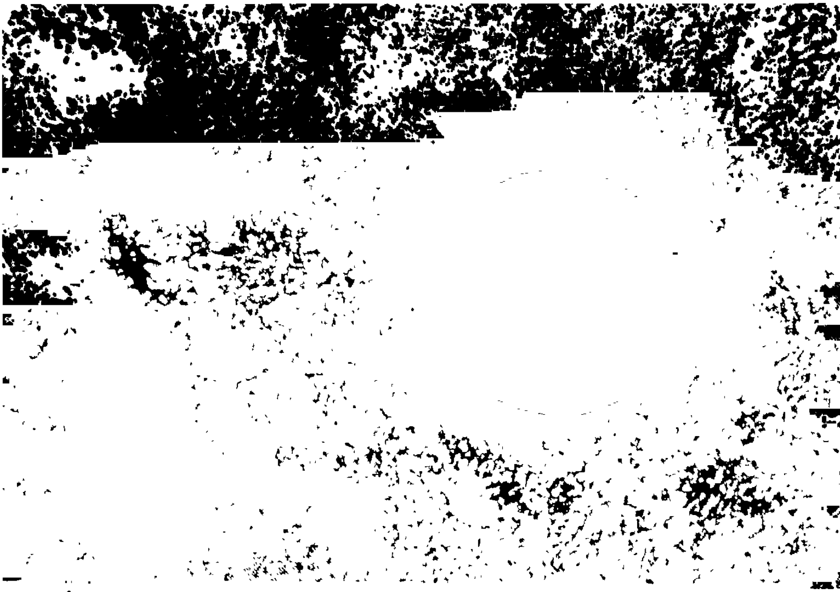
مکہ کے لوگ اپنے آپ کو کعبہ کی عظمتوں کے جلو میں پاکر مطمئن تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کی دینی حیثیت مسلّم ہے۔ ان کی خدا پرستی میں کسی قسم کے شبہ کی گنجائش نہیں۔ مگر خدا کے یہاں ایسی دینداری کا کوئی اعتبار نہیں جس کے ساتھ دنیوی عزتیں اور مادی ترقیاں وابستہ ہو گئی ہوں۔ جو دین تجارت بن گیا ہو، وہ کسی کی خدا پرستی کو جانچنے کا

معیار کیسے بن سکتا ہے۔ خدا پرستی تو ایسے دین کے ساتھ جانچی جاتی ہے جو دنیا کی چمک دمک سے خالی ہو۔ خدا ایک غیبی حقیقت ہے اور وہ ہمیشہ غیبی روپ میں انسان کے سامنے آتا ہے۔ خدا پرست وہ ہے جو خدا کو اس کی غیبی صورت میں پالے۔ وہ یتیم پروردہ ہمہ کے اندر چھپے ہوئے داعیٔ حق کو دیکھ لے۔ وہ ایک انسان کی زبان سے ادا ہونے وا- کلمات میں خدا کی آواز کو پہچان لے۔ وہ معمولی آدمیوں کے ساتھ چلنے والے فرشتوں کی آہٹ کو سن سکے۔ مکہ کے لوگ انتظام حرم اور خدمت حجاج جیسے نمائشی کام کرکے خدا پرستی کے چیمپین بنے ہوئے تھے۔ ان کو خبر نہ تھی کہ عالم الغیب جہاں خدا پرستی کا کریڈٹ دینے کے لئے ان کا انتظار کر رہا ہے وہ دوسرا مقام ہے اور وہ دین ہے جس کو غیر ا سمجھ کر انھوں نے نظر انداز کر دیا ہے۔

حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کی خدمت کرنا بجائے خود ثواب کے کام ہیں۔ مگر اس وقت کے تاریخی میں وہ مکہ والوں کے لئے کام سے زیادہ اعزاز بن چکے تھے۔ وہ اس کے ذریعہ بیک وقت دینداری کا شرف حاصل کر رہے تھے اور اسی کے ساتھ عزت و اقبال کی گدیاں بھی۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ د والوں کا معاملہ بالکل مختلف تھا۔ ان کے لئے دین داری عملاً اپنے آپ کو بربادی کے راستہ پر ڈالنے کے ہم معنی اول الذکر کو دین کے نام پر عزت و جاہ کا تمغہ ملتا تھا۔ ہر قسم کی دنیوی سہولتیں فراہم ہوتی تھیں۔ یہ تسکین حاصل ہوتی کہ ہماری دین اور دنیا دونوں محفوظ ہیں۔ جب کہ ثانی الذکر کے لئے دین ایک سراپا جان جوکھم کا معاملہ تھا۔ اس میں رو کا ساتھ دینے کے بجائے اپنی قوت فیصلہ کو استعمال کرنا تھا۔ سامنے کے فائدے کو چھوڑ کر غیب کے فائدے کی جان دوڑنا تھا۔ عافیت کی زندگی کو خیر باد کہہ کر کھکھیڑ کی زندگی اختیار کرنا تھا۔ ایک کے لئے دین ایک شاندار تجارت دوسرے کے لئے دین سراپا قربانی۔ ایک گروہ حالات کے رتھ پر سوار تھا۔ دوسرے گروہ کا معاملہ یہ تھا کہ رواجی کے دائرہ سے نکال کر اس نے اپنے آپ کو خدائے وحدہٗ لاشریک کا مومن بنایا تھا۔ دنیا کے بنے ہوئے نقشہ سے ہٹا کرکے اپنے آپ کو آخرت کے ان دیکھے راستہ پر ڈالا تھا۔ چلتی ہوئی زندگی سے موافقت کرنے کے بجائے ایک ا نئی تحریک کا ساتھ دیا تھا جس میں بظاہر کش مکش اور محرومی کے سوا اور کچھ نہیں۔ مزید یہ کہ اس قسم کی جان جوکھم د اختیار کرنے کے بعد بھی وہ وقت کے مذہبی ٹھیکیداروں کی نظر میں بے دین ہی بنے ہوئے تھے۔

اللہ کے یہاں اس ایمان کا درجہ بہت بڑا ہے جب کہ آدمی کا ایمان اس کے لئے عزتیں اور شوکتیں ۔ کرنے کے ہم معنی نہ بن رہا ہو۔ جب ایمان کی راہ اختیار کرنا اس قیمت پر ہو کہ آدمی سے اس کا گھر بار اور عزیز و ا تک چھوٹ جائیں۔ جب اسلام کے لئے اٹھنے میں کچھ ملنا تو درکنار اپنے جان و مال کو اس کی راہ میں قربان کر دینا ایسے ہی لوگ خدا کے سچے مومن ہیں۔ ان کے لئے خدا کی رحمتیں اور اس کی رضامندیاں ہیں ــــ ان کے لئے ابدی نعمتوں اور راحتوں کی وہ دنیا ہے جس کا دوسرا نام جنت ہے۔ موجودہ دنیا امتحان کا مقام ہے۔ یہاں حق کو ہمیشہ مشـ حالات (انعام ۹) میں سامنے لایا جاتا ہے۔ آدمی کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ پردہ پوش حق کو بے پردہ حالت دیکھ لے۔ جو خدا کو اس کے غیبی لباس میں نہ پاسکے اس نے خدا کو پایا ہی نہیں۔

یہ صفحہ آپ کے لئے خالی ہے۔ ہمارا ہر ہمدرد جو ہماری اپیل پر لبیک کہے وہ اس خالی صفحہ کو اپنے عہد کی سیاہی سے پُر کرے۔ یہاں وہ اپنے اس عزم کو تحریر کرے جو ملت کے اندر فکری بیداری پیدا کرنے کے لئے وہ اپنے رب کو گواہ بنا کر کرے گا — کیا عجب کہ یہی ورق کسی وقت ملت کے مستقبل کا ورق بن جائے۔



تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی مہم آپ کو آواز دیتی ہے

وقتی جوش کے تحت بڑی قربانی دینا آسان ہے۔ مگر کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت تسلسل کے ساتھ دی جائیں۔ ہم اسی قسم کی ایک چھوٹی قربانی کے لئے آپ سے اپیل کر رہے ہیں۔

وہ لوگ جو الرسالہ کو ضروری اور مفید سمجھتے ہیں۔ ان سے ہماری درخواست ہے کہ وہ اس کی ایجنسی قبول کر کے اس فکری مہم میں ہماری مدد فرمائیں۔ پانچ پرچہ کی قیمت بعد وضع کمیشن ساڑھے سات روپے ہوتی ہے۔ ہمارا ہر ہمدرد یہ طے کرے کہ وہ پانچ پرچے ہر حال میں منگائے گا۔ اور جب تک خریدار مہیا نہ ہوں لوگوں میں مفت تقسیم کرے گا۔ اور اس وقت تک ساڑھے سات روپے ماہانہ اپنے پاس سے ادا کرتا رہے گا جب تک خریدار نہیں مل جاتے۔

موجودہ حالات میں ایک شخص کے لئے یہ بہت چھوٹی قربانی ہے۔ لیکن اگر ہمارا ہر ہمدرد اس قربانی کو اپنی زندگی میں شامل کرے تو چند سالوں میں انشاء اللہ بہت بڑے نتائج نکل سکتے ہیں۔ ■

یونیورسٹی کے ایک استاد نے اپنے ساتھی سے ماہنامہ الرسالہ کا تعارف کرتے ہوئے کہا:

IT PRESENTS ISLAM AS A LIVING FAITH

یہ اسلام کو ایک زندہ مذہب کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔

اس معاشرہ میں کوئی خوبی نہیں جس میں تنقید اور نصیحت کا ماحول نہ ہو

طبرانی نے عبدالعزیز بن ابی بکرہ رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ کچھ لوگوں کو آپ سے شکایت ہوئی۔ انھوں نے ایک موقع پر آپ کو دھکا دے کر گرا دیا۔ آپ کے لڑکے دوڑے تو آپ نے فرمایا: ٹھیرو۔ خدا کی قسم کوئی جان جو نکالی جانے والی ہو، اس کا نکالا جانا مجھ کو ابوبکرہ کی جان نکالے جانے سے زیادہ محبوب نہیں۔ لڑکوں نے پوچھا کیوں۔ آپ نے فرمایا کہ میں ڈرتا ہوں کہ میں وہ زمانہ پاؤں جس میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ کر سکوں، کیوں کہ اس وقت کوئی خیر نہ ہوگا (انی اخشی ان ادرك زمانا لا استطیع ان آمر بالمعروف ولا انہی عن منکر۔ ولا خیر یومئذ)

تنقید سن کر برہم نہ ہونا

عمر فاروق رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو آپ نے خالد بن الولید کو فوج کی سپہ سالاری سے معزول کر دیا۔ امام احمد نے ناشرہ بن سمی الیزنی سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے یوم جابیہ میں عمر رضی اللہ عنہ کو خطبہ دیتے ہوئے سنا۔ آپ نے فرمایا: اے لوگو! میں تم کو بتاتا ہوں کہ میں نے خالد بن الولید کو کیوں معزول کیا۔ میں نے ان کو حکم دیا کہ اس مال کو کمزور مہاجرین کے لئے روکیں۔ مگر انھوں نے اس کو صاحب شرف اور صاحب لسان کو دے دیا۔ اس بنا پر میں نے ان کو معزول کر دیا۔ اور ان کی جگہ ابوعبیدۃ بن جراح کو مقرر کر دیا۔" ابوعمرو بن حفص (حضرت خالد کے رشتہ دار) مجمع میں موجود تھے۔ وہ اس کو سن کر اٹھے اور کہا: خدا کی قسم اے عمر بن خطاب! یہ کیا عذر ہے جو تم نے بیان کیا۔ تم نے اس شخص کو ہٹا دیا جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کیا تھا، تم نے وہ تلوار میان میں ڈال دی جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بے نیام کیا تھا، تم نے وہ جھنڈا گرا دیا جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑا کیا تھا (ووضعت لواء نصبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)

تم نے اپنے چچا کے لڑکے سے حسد کا معاملہ کیا۔" عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو سنا اور اس کے بعد نرمی کے ساتھ فرمایا: تم خالد کے قریبی ہو، نوعمر ہو، اپنے چچازاد بھائی کے معاملہ میں غصہ میں آگئے ہو (انك قریب القرابۃ، حدیث السن، مغضب فی ابن عمك)

ان کا اختلاف حق کے لئے ہوتا تھا

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وظائف کی تقسیم میں مساوات برتتے تھے۔ آپ سے کہا گیا کہ مہاجرین وانصار کو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ دیجئے۔ آپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا: ان کی فضیلت اللہ کے یہاں ہے۔ یہ گزربسر کی چیز ہے، اس میں برابری بہتر ہے (فضائلهم عند اللہ واما هذا المعاش فالسویۃ فیه خیر، احمد)

عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اس سے اختلاف تھا۔ آپ خلیفہ ہوئے تو آپ نے تقسیم وظائف میں درجات کے اعتبار سے فرق کیا۔ آپ نے مہاجرین وانصار کے لئے پانچ پانچ ہزار درہم مقرر کئے اور دوسرے مسلمانوں کے لئے چار چار ہزار درہم۔ اس اصول کے مطابق اسامہ بن زید کو چار ہزار درہم ملے۔ تاہم اپنے لڑکے عبداللہ رض کو صرف

تین ہزار درہم دیئے۔ انھوں نے کہا: "اسامہ بن زید کو آپ نے چار ہزار درہم دیئے اور میرے لئے تین ہزار درہم مقرر کئے۔ ان کو یا ان کے باپ کو کون سی فضیلت حاصل ہے جو مجھ کو نہیں۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ان کے باپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمھارے باپ سے زیادہ محبوب تھے اور وہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تم سے زیادہ محبوب تھے۔ ان اباہ کان احب الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من ابیک وھو کان احب الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منک، بزار) ایک روایت کے مطابق عمر رضی اللہ عنہ نے آخر عمر میں فرمایا کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کی رائے عملاً زیادہ درست تھی (فرایہ خیر رائی، بزار)

وہ یاد دلاتے ہی واپس دوڑ پڑے

حنین کی جنگ میں ابتداءً مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ وہ میدان مقابلہ سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ عباس رضی اللہ عنہ بلند آواز تھے۔ ان سے آپ نے کہا: اے چچا لوگوں کو پکاریئے۔ انھوں نے بلند آواز سے پکارنا شروع کیا: یا اصحاب السمرۃ (اے کیکر کے درخت کے نیچے موت کی بیعت کرنے والو، کہاں جا رہے ہو) حضرت عباس کہتے ہیں: خدا کی قسم جب انھوں نے میری آواز سنی تو انھوں نے کہا یا لبیکاہ، یا لبیکاہ۔ ہم آئے، ہم آئے۔ اور رسول اللہ کی طرف اس طرح دوڑ پڑے جیسے گائے اپنے بچھڑوں کی طرف دوڑتی ہے۔ (رواہ مسلم عن ابن وہب)

قرآن سامنے آتے ہی رک جاتا

عبداللہ بن عباس رض کہتے ہیں عُیینہ بن حصن مدینہ آئے اور اپنے بھتیجے حر بن قیس کے یہاں ٹھہرے۔ حر بن قیس ان لوگوں میں تھے جن کو عمر رضی اللہ عنہ کی قربت حاصل تھی۔ عمر رضی اللہ عنہ کی مجلس اور ان کے مشوروں میں شریک ہونے والے قرآن کے علماء ہوتے تھے خواہ وہ بوڑھے ہوں یا جوان۔ عیینہ نے حر بن قیس سے کہا: اے میرے بھتیجے تم کو امیر المومنین کے یہاں رتبہ حاصل ہے، میرے لئے امیر المومنین سے ملنے کی اجازت حاصل کرو۔ انھوں نے اجازت مانگی اور عمر رضی اللہ عنہ نے اجازت دے دی۔ عیینہ آئے اور کہا: اے خطاب کے لڑکے! تم ہم کو نہ مال دیتے ہو اور نہ ہمارے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کرتے ہو (ھی یا ابن الخطاب! فواللہ ما تعطینا الجزل و تحکم فینا بالعدل)۔ عمر رضی اللہ عنہ یہ سن کر غصہ میں آگئے۔ قریب تھا کہ ان پر ٹوٹ پڑیں۔ اتنے میں حر بن قیس نے کہا: اے امیر المومنین! اللہ نے اپنے رسول سے کہا ہے "معافی کا طریقہ اختیار کرو، نیکی کا حکم کرو اور جاہلوں سے اعراض کرو" (اعراف ۱۹۹) اور یہ شخص یقیناً جاہل ہے۔ راوی کہتے ہیں: واللہ ما جاوزھا عمر حین تلاھا وکان وقافاً عند کتاب اللہ (بخاری) خدا کی قسم۔ قرآن کی آیت سننے کے بعد عمر رض نے ذرا بھی تجاوز نہیں کیا۔ وہ قرآن کے سامنے بہت زیادہ رک جانے والے تھے۔

ضد اور عناد ان کے لئے سچائی کو پہچاننے میں رکاوٹ نہ بن سکا

ہجرت سے چند سال پہلے مدینہ میں اسلامی دعوت کا آغاز ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مصعب بن عمیر رض کو مدینہ بھیجا۔ وہ وہاں پہنچ کر خاموشی سے لوگوں کے درمیان اسلام کی تبلیغ کرتے اور قرآن پڑھ کر سناتے۔ سعد بن

کے قبیلہ بنو عبدالاشہل کے سردار تھے۔ ان کو معلوم ہوا تو بہت خفا ہوئے۔ ایک روز نیزہ لے کر مصعب بن عمیر ش میں نکلے۔ بستی کے باہر ایک کنوئیں پر ان کو پایا جو کچھ لوگوں کو جمع کر کے ان کو دینی باتیں بتا رہے تھے۔ سعد بن معاذ آئے اور غصہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا: کون اس اجنبی شخص کو یہاں لایا ہے جو ہمارے کمزور لوگوں کو بہکاتا ہے ہمارے گھروں میں وہ چیز داخل کرنا چاہتے ہو جس کو ہم برا سمجھتے ہیں۔ بس آج کے بعد میں تم کو یہاں نہ دیکھوں" اسعد ارہ جو ان کے ہم قبیلہ تھے اور اسلام لا چکے تھے بولے: "میرے خالہ زاد بھائی! ان کی بات بھی سن لو۔ اگر نامعقول رد کر دینا اور معقول دکھائی دے تو مان لینا" سعد بن معاذ کچھ نرم پڑے۔ انھوں نے کہا ان کی بات کیا ہے۔ ب بن عمیر نے اس کے جواب میں قرآن کی سورہ زخرف کا ابتدائی حصہ پڑھ کر سنایا۔ قرآن کو سنتے ہی ان کا جوش ا پڑ گیا۔ وہ نئی سوچ میں پڑ گئے۔ یہاں تک کہ چند روز بعد انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اب انھوں نے خود ہی بدالاشہل میں تبلیغ شروع کر دی۔ انھوں نے اپنے قبیلہ کے لوگوں سے کہا:

شک من صغیر او کبیر او ذکر او انثی فلیاتنا دی منہ نلخذ بہ فواللہ لقد جاء امر رق فیہ الرقاب (ابونعیم فی دلائل النبوۃ)

کسی چھوٹے یا بڑے، مرد یا عورت کو اس کے بارے میں شک ہو تو وہ ہمارے پاس اس سے زیادہ ہدایت والی چیز لے آئے ہم اس کو لے لیں گے۔ خدا کی قسم یہ ایک ایسی بات آگئی ہے کہ اس کے آگے گردنیں جھک جائیں۔

اپنے خلاف تنقید کو پسند کرنا

رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ اس شخص کا بھلا کرے جو میرے عیوب کا تحفہ مجھے بھیجے۔

انصاف میں بڑے چھوٹے کا لحاظ نہیں

شعبی نے روایت کیا ہے کہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی ایک زرہ جنگ جمل میں کھو گئی تھی۔ حضرت علی ایک روز ازار میں چل رہے تھے۔ دیکھا کہ ایک نصرانی زرہیں بیچ رہا ہے۔ انھوں نے اپنی گم شدہ زرہ اس کے پاس پہچان لی اور کہ یہ میری زرہ ہے۔ مسلمان قاضی میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا۔ حضرت علی امیر المومنین تھے اور ضی شریح اس وقت قضا کے عہدہ پر تھے۔ مقدمہ قاضی شریح کی عدالت میں پیش ہوا۔ حضرت علی نے کہا: "اے شریح! رے اور اس کے درمیان فیصلہ کرو" قاضی شریح نے کہا "اے امیر المومنین۔ آپ کا دعویٰ کیا ہے" حضرت علی نے کہا یہ زرہ میری ہے" قاضی شریح نے نصرانی سے کہا: "تم کیا کہتے ہو" نصرانی نے کہا: "امیر المومنین غلط بیانی کر رہے ہیں زرہ میری ہے" قاضی شریح نے حضرت علی سے کہا: آپ کے گواہ کون ہیں۔ حضرت علی نے اپنے لڑکے حسن اور اپنے غلام بر کو پیش کیا۔ قاضی شریح نے کہا: حسن کی جگہ کوئی اور گواہ لائیے۔ حضرت علی نے کہا: اترد شہادۃ الحسن (کیا تم حسن شہادت کو رد کر رہے ہو) قاضی شریح نے جواب دیا: یہ بات نہیں۔ مگر میں نے آپ ہی سے سن کر یاد کیا ہے کہ لڑکے کی ای باپ کی موافقت میں جائز نہیں۔ (ولکن حفظت عنک انہ لا تجوز شہادۃ الولد علی والدہ، کنز العمال، جلد ۴، صفحہ ۶)

مجلس میں گفتگو کے آداب

علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس کے بارے میں فرماتے ہیں۔ آپ جب گفتگو کرتے تو مجلس میں بیٹھنے والے اس طرح سر جھکا لیتے گویا ان کے سروں کے اوپر چڑیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ جب آپ اپنی بات کہہ کر چپ ہو جاتے تب دوسرے لوگ بولتے۔ آپ کے پاس لوگ کسی بات پر نزاع نہ کرتے۔ ایک شخص بولتا تو دوسرے لوگ چپ ہو کر سنتے یہاں تک کہ بولنے والا اپنی بات کو پورا کرلے۔ آپ کی مجلس میں ہر شخص کی بات یکساں توجہ سے سنی جاتی (لا یتنازعون عندہ الحدیث۔ ومن تکلم عندہ انصتوا لہ حتی یفرغ۔ حدیثہم عندہ حدیث اولہم، الشمائل للترمذی)

جواب میں الزام تراشی نہیں

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب ابتدائی زمانہ میں آپ کے سرپرست تھے۔ بعثت کے دسویں سال ابو طالب کا انتقال ہو گیا تو مکہ والوں کو موقع مل گیا۔ انھوں نے آپ کو برادری سے خارج کر دیا۔ اب ضروری تھا کہ آپ اپنے لئے کوئی نیا حمایتی تلاش کریں۔ آپ اپنے چچا عباس بن عبد المطلب کو لے کر عکاظ کے میلہ میں گئے۔ وہاں مختلف قبائل کے خیموں میں جاکر ان سے کہا کہ مجھے اپنی حمایت میں لے لو تاکہ میں اپنے تبلیغی کام کو جاری رکھ سکوں۔ مگر قریش مکہ کے ڈر سے کوئی تیار نہ ہوا۔ اگلے سال دوبارہ آپ عرب کے میلوں میں حمایتی کی تلاش میں نکلے۔ بالآخر یثرب (مدینہ) کے قبائل اوس و خزرج کے چھ آدمیوں سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ آپ نے ان کو اسلام کا پیغام دیا۔ انھوں نے پوچھا کہ آپ پر جو وحی آتی ہے وہ کیا ہے۔ آپ نے ان کو سورہ ابراہیم کی آیتیں سنائیں۔ اس کو سن کر ان کا دل نرم ہو گیا۔ انھوں نے فوراً اسلام قبول کر لیا۔ یہ رات کا وقت تھا۔ آپ ان لوگوں سے باتیں کر رہے تھے کہ عباس بن عبد المطلب ادھر سے گزرے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پہچان کر وہ وہاں آگئے۔ انھوں نے پوچھا: "اے میرے بھتیجے یہ کون لوگ تمھارے پاس ہیں" آپ نے جواب دیا: اے میرے چچا یہ یثرب کے رہنے والے ہیں۔ میں نے ان کو وہ دعوت پیش کی جو اس سے پہلے دوسرے قبائل کے سامنے پیش کی تھی۔ انھوں نے مان لیا اور میری تصدیق کی۔ وہ اس کے لئے تیار ہیں کہ مجھ کو اپنے یہاں لے جائیں۔ عباس بن عبد المطلب سواری سے اتر پڑے۔ انھوں نے اپنے اونٹ کو باندھ دیا اور کہا: اے اوس اور خزرج کی جماعت! یہ میرا بھتیجا ہے اور وہ مجھ کو تمام لوگوں سے زیادہ محبوب ہے۔ اگر تم نے اس کی تصدیق کی ہے اور اس پر ایمان لائے ہو اور اس کو اپنے یہاں لے جانا چاہتے ہو تو میں تم لوگوں سے ایک عہد لینا چاہتا ہوں تاکہ میرا دل مطمئن رہے۔ وہ یہ کہ تم اس کو رسوا نہیں کرو گے اور اس کو دھوکا نہیں دو گے۔ کیوں کہ تمھارے پڑوس میں یہود ہیں اور یہود اس کے دشمن ہیں۔ اور میں اپنے بھتیجے کو ان کے مکر سے محفوظ نہیں سمجھتا۔ اسعد بن زرارہ، جو یثرب والوں کے سردار تھے، ان کو عباس بن عبد المطلب کا یہ قول برا معلوم ہوا۔ کیوں کہ انھوں نے ان کے کردار پر شک وشبہ کا اظہار کیا تھا۔ انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! مجھے عباس بن عبد المطلب کا جواب دینے کی اجازت دیجئے۔ آپ نے فرمایا: تم جواب دو، مگر جواب میں الزام کا طریقہ نہ اختیار کرنا (اجیبوہ غیر متہمین، ابو نعیم، دلائل النبوۃ ص ۱۰۱)

بے فائدہ باتوں کا جواب نہ دینا

ابوسفیانؓ کی بیوی ہند بنت عتبہ فتح مکہ کے بعد اسلام پر بیعت ہونے کے لیے آئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت کے الفاظ ادا کرتے ہوئے فرمایا ولا تقتلن اولادکن (تم اپنی اولاد کو قتل نہیں کرو گی)۔ ہند نے کہا: انت قتلتھم یوم بدر (ان کو تو آپ ہی نے جنگ بدر میں قتل کردیا)۔ دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں: وھل ترکت لنا اولادا نقتلھم (کیا آپ نے ہماری اولاد کو باقی رکھا ہے جو ہم انھیں قتل کریں، تفسیر ابن کثیر جلد ۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا اور ہند بنت عتبہ کی بیعت قبول کرلی۔

طعن و طنز کی زبان میں کلام کرنا درست نہیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبوک پہنچ کر جب دیکھا کہ لشکر میں کعب بن مالک رضی نہیں ہیں تو آپ نے فرمایا: ما فعل کعب (کعب نے کیا کیا) بنی سلمہ کے ایک شخص نے کہا: اے خدا کے رسول، ان کو ان کی چادروں نے اور اپنے کاندھوں کو دیکھنے نے روک دیا (حبسہ بُرداہ ونظرہ فی عطفیہ) معاذ بن جبل نے جواب دیا: تم نے نہایت بری بات کہی۔ اے خدا کے رسول! ہم نے کعب میں خیر کے سوا کوئی اور بات نہیں دیکھی (بئس ما قلت، واللہ یا رسول اللہ ما علمنا علیہ الا خیرا، البدایہ والنہایہ)

زبان کو روکنا تمام بھلائیوں کا دروازہ

معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ انھوں نے آپ سے پوچھا: اے خدا کے رسول مجھے ایسا عمل بتائیے جو مجھ کو جنت میں لے جائے اور جہنم سے دور کردے۔ آپ نے فرمایا تم نے بہت بڑی بات پوچھی۔ اور یہ آسان ہے جس پر اللہ اس کو آسان کردے۔ پھر آپ نے فرمایا: تم اللہ کی عبادت کرو۔ کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ، نماز ادا کرو، زکوٰۃ دو، رمضان کے روزے رکھو اور بیت اللہ کا حج کرو۔ پھر فرمایا: کیا میں تم کو بتاؤں کہ بھلائی کے دروازے کیا ہیں۔ سنو، روزہ ڈھال ہے، صدقہ گناہ کو اس طرح بجھاتا ہے جس طرح پانی آگ کو۔ اور رات کی خاموشی میں اٹھ کر نماز پڑھنا۔ پھر فرمایا: کیا میں تم کو بتاؤں کہ دین کا سرا کیا ہے اور اس کا ستون کیا ہے اور اس کی چوٹی کیا ہے۔ میں نے کہا ضرور اے خدا کے رسول۔ فرمایا: اس کا سرا اسلام ہے، اس کا ستون نماز ہے، اور اس کی چوٹی جہاد ہے۔ پھر فرمایا: کیا میں تم کو بتاؤں کہ ان تمام چیزوں کی جڑ کیا ہے۔ میں نے کہا ضرور اے خدا کے رسول۔ آپ نے اپنی زبان پکڑی اور فرمایا کفّ علیک ھذا (اس کو روکے رکھو) میں نے کہا اے خدا کے رسول ہم جو کچھ بولتے ہیں، کیا اس کا بھی ہم سے مواخذہ ہوگا۔ آپ نے فرمایا: تمھاری ماں تمھیں گم کرے۔ لوگ اپنی زبان کی بدولت ہی تو آگ میں منھ کے بل گرائے جائیں گے (ثکلتک امک وھل یکبّ الناس فی النار علی وجوھھم الا حصائد السنتھم، ترمذی)

کھانے کو برا نہ کہنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب کوئی کھانا پیش کیا جاتا تو کبھی اس کو برا نہ کہتے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ

بتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی کھانے کو عیب نہیں لگایا۔ اگر رغبت ہوتی تو کھا لیتے، ناپسند ہوتا تو چھوڑ دیتے (ما عاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طعاما قط۔ ان اشتھاہ اکلہ وان کرھہ ترکہ۔ بخاری و مسلم)

مشتعل ہوئے بغیر معترض کو جواب دینا

علقمہ کہتے ہیں۔ بنو اسد کی ایک عورت جس کا نام ام یعقوب تھا، عبد اللہ بن مسعود رض کے پاس آئی اور کہا: مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ آپ گودنا گودنے والے اور گودنا گدانے والے پر لعنت کرتے ہیں۔ حالاں کہ میں نے قرآن کو شروع سے آخر تک پڑھا ہے اور اس میں میں نے وہ بات نہیں پائی جو آپ کہتے ہیں" پھر اس نے کہا: اور میرا تو یہ خیال ہے کہ آپ کے گھر والے بھی ضرور ایسا کرتے ہوں گے (انی لاظن اھلک یفعلون بعض ذلک) عبد اللہ بن مسعود رض نے کہا تم میرے گھر میں جا کر دیکھ لو۔ وہ گھر کے اندر گئی اور دیکھا۔ مگر کسی پر گودنے کا نشان نہ پایا۔ وہ واپس آئی تو عبد اللہ بن مسعود رض نے اس سے کہا، کیا تم نے قرآن میں نہیں پڑھا کہ "رسول جو دے اس کو لے لو اور جس سے وہ روکے اس سے رک جاؤ"۔ عورت نے کہا ہاں۔ انھوں نے کہا: فانہ قد نھی عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا ہے) جامع بیان العلم وفضلہ دوم ۱۸۸

کسی کو حقیر الفاظ میں یاد نہ کیا جائے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اہلیہ عائشہ رض کے حجرہ میں تھے۔ گفتگو کے دوران عائشہ رض کی زبان سے اپنی سوکن صفیہ رض کے بارے میں نکل گیا: "حسبک من صفیۃ کذا وکذا" وہ حضرت صفیہ رض کے ناٹے قد کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔ یہ سنتے ہی اچانک آپ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ آپ نے فرمایا: تم نے ایسی بات کہی کہ اگر اس کو سمندر میں ملایا جائے تو سمندر کا پانی بھی بدل جائے (لقد قلتِ کلمۃ لو مُزِجت بماء البحر لمَزَجتہ، ابو داؤد، ترمذی)

خاموش رہنا اور اہل تر کو بولنے کا موقع دینا

عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی تو مدینہ میں نفاق نے زور پکڑا اور عرب وعجم مرتد ہونے لگے۔ نہاوند (ایران) سے ان کی ساز باز ہوگئی۔ انھوں نے کہا وہ آدمی (رسول) وفات پا گیا جس کی وجہ سے مسلمانوں کو خدا کی مدد حاصل ہوتی تھی۔ اس وقت خلیفہ اول ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مہاجرین اور انصار کو جمع کیا اور کہا: ان عربوں نے بکری اور اونٹ (زکاۃ) دینا بند کر دیا ہے۔ وہ اسلام سے پھر گئے ہیں۔ عجمیوں نے نہاوند والوں سے ساز باز کر لی ہے تاکہ وہ مل کر تم سے لڑیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ شخص چلا گیا جس کی وجہ سے تمھاری مدد ہوتی تھی۔ اب تم لوگ مجھ کو مشورہ دو۔ میں بھی تمھاری طرح ایک آدمی ہوں۔ بلکہ خلافت کا بوجھ اٹھانے کے لئے تم سب سے زیادہ کمزور ہوں"۔ عبد اللہ بن عمر رض کہتے ہیں: صحابہ کرام نے سنا اس کے بعد وہ چپ ہو کر بہت دیر تک گردن جھکائے رہے پھر عمر بن الخطاب رض بولے ۔۔۔ (فاطرقوا طویلا۔ ثم تکلم عمر بن الخطاب رض فقال ۔۔ کنز

بولنے میں احتیاط

اشعث بن شعبہ کہتے ہیں کہ انھوں نے فزاری کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ عمر بن عبد العزیزؒ سے پوچھا گیا کہ جنگ صفین میں جو لوگ لڑے اور مارے گئے۔ ان کی بابت آپ کی کیا رائے ہے۔ انھوں نے کہا: یہ وہ خون ہے جس سے اللہ نے میرے ہاتھ کو محفوظ رکھا۔ میں نہیں چاہتا کہ میں اپنی زبان کو اس سے آلودہ کروں (تلك دماء كف الله عنها يدي لا اريد ان الطخ بها لساني، ابن عبد البر، جامع بيان العلم وفضله، جزء ثاني، صفحہ ۹۳)

تنقید مگر بحث و جدال نہیں

بیان کیا گیا ہے کہ طاؤس اور وہب ابن منبہ دونوں ملے۔ طاؤس نے وہب سے کہا۔ اے ابو عبد اللہ میں نے آپ کے بارے میں ایک سنگین بات سنی ہے۔ انھوں نے پوچھا کیا بات۔ طاؤس نے کہا۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ اللہ ہی تو تھا جس نے قوم لوط کو ایک دوسرے پر سوار کیا۔ وہب نے یہ سن کر کہا۔ اللہ کی پناہ۔ پھر وہ چپ ہو گئے۔ میں نے پوچھا۔ کیا دونوں میں کوئی بحث ہوئی۔ راوی نے کہا نہیں۔ (ردينا ان طاؤسا ووهب ابن منبه التقيا فقال طاؤس لوهب يا ابا عبد الله بلغني عنك امر عظيم. فقال ماهو. قال تقول ان الله حمل قوم لوط بعضهم على بعض. قال اعوذ بالله. ثم سكتا. قال فقلت هل اختصما، قال لا. ابن عبد البر جامع بيان العلم وفضله، جزء ثاني، صفحہ ۹۵)

تنقید غلطی کی نشان دہی کا نام ہے نہ کہ عیب لگانے کا

علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مسلمانوں میں جو باہمی لڑائیاں ہوئیں، ان سے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ بالکل الگ رہے تھے۔ اپنی علیحدگی کے بارے میں انھوں نے بار بار کہا کہ "میں مسلمان کے ہاتھ سے مسلمان کا خون کرنا جائز نہیں سمجھتا، اس لئے اس سے الگ ہوں"۔ تمام امت آپ کے اخلاص اور تقویٰ اور اصابت رائے پر متفق ہے۔ مگر آپ کے معاصرین نے آپ کو متہم کرنے کے لئے ایک پہلو نکال لیا۔ کچھ لوگ آپ سے ملے اور کہا کہ آپ کیوں "جہاد" کے لئے نہیں نکلتے۔ عبد اللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ میں تم لوگوں کی اس لڑائی کو جہاد نہیں سمجھتا۔ یہ مسلمانوں کا باہمی قتل و خون ہے نہ کہ جہاد۔ مگر لوگ ان کے جواب سے مطمئن نہ ہوئے۔ انھوں نے کہا:

والله ما رأيك ذلك ولكنك اردت ان يفنى اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم بعضهم بعضا حتى اذا لم يبق غيرك قيل: بايعوا لعبد الله بن عمر بامارة المومنين. (ابو نعيم، حلية الاولياء، جلد ۱ صفحہ ۲۹۴)

خدا کی قسم تمھاری یہ رائے کچھ نہیں۔ بلکہ تم چاہتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب آپس میں لڑ کر ایک دوسرے کو فنا کر دیں۔ یہاں تک کہ جب تمھارے سوا کوئی باقی نہ رہے تو کہا جائے: مسلمانوں کی امارت کے لئے عبد اللہ بن عمرؓ سے بیعت کر لو۔

اختلاف رائے کو برداشت کرنا علم کی نشانی ہے

قال سعيد بن ابي عروبة من لم يسمع الاختلاف فلا تعده عالما جو شخص اختلاف کو نہ سنے اس کو عالم نہ شمار کرو (جامع ۴۶)

امریکہ نئے انقلاب کے دروازہ پر

"بیسویں صدی کا انقلاب امریکہ میں آئے گا۔ دوسرے ملکوں میں انقلاب آتا ہے یا نہیں، اس کا انحصار اس پر ہے کہ وہ اولاً امریکہ میں کامیاب ہوتا ہے یا نہیں" (جین فرانکوئس ریویل)

اس بات کو میں ایک ترمیم کے ساتھ صحیح سمجھتا ہوں۔ امریکہ موجودہ زمانہ میں کسی صحیح انقلاب کے لئے سب سے بہتر زمین ہے، کیونکہ اپنے سائنسی مزاج کی بنا پر وہ اپنے اندر سب سے زیادہ مادۂ قبولیت رکھتا ہے۔ وہ نہ صرف وسائل و ذرائع کے اعتبار سے تمام ملکوں میں سب سے آگے ہے، بلکہ وہی سب سے زیادہ ترقی یافتہ سائنسی معاشرہ بھی ہے۔ اس لئے یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ موجودہ زمانہ میں بڑے پیمانہ پر اسلامی دعوت پھیلانے کے لئے سب سے موزوں جگہ غالباً ریاست ہائے متحدہ امریکہ ہے۔

ایک سو کمروں کا مذہبی مرکز انگلستان میں

Mahesh Yogi buys mansion in England

LONDON, November 22 (UNI): Maharishi Mahesh Yogi has bought a 100-room mansion in England to serve as an international centre for his "transcendental meditation" movement, DPA reports.

The mansion, Mentmore Towers, was built between 1851 and 1854 for a leading member of the Rothschild banking family.

The contents of the house were sold last year for a then record art auction total in England of some £6 million. The British government had refused to pay £2 million for the house and its contents by the owner, the Earl of Rosebery. The earl had also wanted exemption from death duties.

Critics blamed the government for failure to preserve British architectural heritage in not accepting the Rosebery offer.

T.O.I. 23-11-1978

مہارشی مہیش یوگی، دوسرے بہت سے ہندو یوگیوں کی طرح، مغربی دنیا میں اپنے دھرم کا پرچار کر رہے ہیں۔ انگریزی زبان پیمان کو مکمل قدرت ہے اور بہت مؤثر انداز میں اپنی بات کو سمجھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ امریکہ میں ان کے لاکھوں معتقد ہیں۔ ان کے نام پر "مہارشی مہیش یونیورسٹی" قائم ہے۔ اور دوسرے بہت سے کام ہو رہے ہیں۔ اب انھوں نے انگلستان میں اپنے مشن کا ایک مرکز قائم کرنے کے لئے ایک عمارت خریدی ہے جس میں ایک سو کمرے ہیں ——— موجودہ زمانہ میں ساری دنیا میں مذہب کو نئی زندگی مل رہی ہے۔ ہر مذہب کے لوگ دنیا بھر میں اپنے لئے کام کے زبردست مواقع پا رہے ہیں۔ مذہب کے اس جدید احیاء نے مذہب کو موجودہ زمانہ کا سب سے بڑا کاروبار بنا دیا ہے۔

صنعتی تہذیب کا ردعمل ——— بے راہ روی

امریکہ کے نوجوان طالب علموں میں ایک طبقہ پیدا ہو گیا ہے جو اپنے کو مخالف رواج (Anti-Establishment) کہتا ہے۔ گندے کپڑے اور الجھے ہوئے بال ان کا نشان ہیں۔ وہ گندے قسم کے گانے گاتے ہیں۔ ان کے حالات کو قریب سے جاننے کے لئے امریکہ کے ایک شخص نے اسی قسم کا روپ اختیار کر لیا۔ اس کا نام ایلوس پرسلی (Elvis Presley) تھا۔ ان کے درمیان کچھ عرصہ رہنے کے بعد اس کو اندازہ ہوا کہ ان کے عادات و اطوار امریکی معاشرہ کے لئے بہت بڑا خطرہ ہیں۔ اس نے حکومت کے محکمہ سراغ رسانی (FBI) کے ڈائرکٹر ایڈگر ہوور (J.Edger Hoover) سے ملنا چاہا۔ مگر اس کے ظاہری حلیہ کی وجہ سے ڈائرکٹر نے اس سے ملنا پسند نہ کیا۔ یہاں تک کہ اگست ۱۹۷۷ میں مسٹر پرسلی کا انتقال ہو گیا۔

قولِ اسلام کا معیار اتحادِ اسلام ہے

یا ایہا الذین آمنوا لم تقولون ما لا تفعلون۔ — اے ایمان والو کیوں کہتے ہو منھ سے جو نہیں کرتے۔
کبر مقتاً عند اللہ ان تقولوا ما لا تفعلون۔ — بڑی بیزاری ہے اللہ کے یہاں کہ کہو وہ چیز جو نہ کرو۔
ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ صفاً — اللہ چاہتا ہے ان کو جو لڑتے ہیں اس کی راہ میں قطار
کانہم بنیان مرصوص (الصف) — باندھ کر جیسے وہ دیوار ہیں سیسہ پلائی ہوئی۔

اس آیت کے مطابق قولِ اسلام کی صداقت کی جانچ اتحادِ اسلام ہے۔ اسلام کے قائلین اگر اسلامی مہم کے لئے متحد نہ ہو سکیں تو ان کا قول اللہ کی نظر میں مقت کبیر کی حیثیت رکھتا ہے جس کی کوئی قیمت نہ دنیا میں ہے اور نہ آخرت میں۔

یہ اصول نہایت اہم نکتہ پر مبنی ہے۔ کوئی بڑا کام اتحاد کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ مگر اتحاد ایک بہت بڑی قربانی مانگتا ہے۔ یہ آدمی کے "انا" کی قربانی ہے۔ جب زیادہ انسان ایک محاذ پر جمع ہوں گے تو لازمی ہے کہ ان میں رایوں کا اختلاف ہو۔ ایک کو دوسرے سے تکلیف پہنچے۔ بار بار نفس کو ٹھیس لگے۔ ہر آدمی بڑا بننا چاہتا ہے۔ ہر آدمی اپنے اندر یہ سویا ہوا جذبہ رکھتا ہے کہ "میری چلے، دوسرے کی نہ چلے"۔ ایسی حالت میں جب بھی کچھ لوگ جمع ہوں گے تو لازماً آپس میں ٹکراؤ ہوگا۔ کہیں خلافِ مزاج بات کو برداشت کرنا ہوگا۔ کہیں تنقید سننی پڑے گی۔ کہیں اپنی شکست پر صبر کرنا ہوگا۔ کہیں اپنی بے عزتی کو سہنا ہوگا۔ کہیں اپنے مقابلہ میں دوسرے کو ترجیح دینی ہوگی۔ کہیں اجتماعی مصلحت کی خاطر اپنی ذاتی رائے کو قربان کرنا ہوگا۔ کہیں ایک جائز کریڈٹ سے محرومی پر اپنے کو راضی کرنا پڑے گا۔ غرض بے شمار قسم کی ناخوش گواریاں سامنے آئیں گی۔ ایسی حالت میں اتحادِ عمل پر وہی قائم رہ سکتا ہے جو اپنی "انا" کو ختم کرکے مسلمان بنا ہو۔ جو اپنی ذات کو دفن کرکے اجتماعیت میں شامل ہوا ہو۔ اس کے برعکس جو شخص اللہ کی کبریائی پر ایمان لانے کے باوجود اپنی انا کو اپنے ساتھ لئے ہوئے ہو وہ کبھی متحدہ جدوجہد پر ٹھیر نہیں سکتا۔

اللہ پر ایمان، اپنی حقیقت کے اعتبار سے، اپنی ذات کی نفی کا نام ہے۔ اور اتحاد میں سب سے زیادہ اسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ متحدہ جدوجہد سب سے بڑی اور یقینی کسوٹی ہے جس پر جانچ کر یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ آدمی اپنی ذات کی نفی کرکے اسلام میں داخل ہوا ہے یا اپنی انا کے بت کو اپنے ساتھ لئے ہوئے ہے۔ جو لوگ اپنی انا کے بت کو توڑ چکے ہوں ان کے لئے کوئی چیز اتحادِ عمل میں مانع نہیں ہوتی۔ اسی لئے اسلام کے محاذ پر جب ایسے لوگ قابلِ لحاظ تعداد میں جمع ہو جائیں تو لازماً وہ کامیاب ہو کر رہتے ہیں۔ آخرت کی جنت بھی ان کے لئے لکھ دی جاتی ہے اور دنیا کا غلبہ بھی (صف ۱۳) مگر جو لوگ اپنی انا کے بت کو لئے ہوئے ہوں، وہ کبھی متحدہ طاقت نہیں بنتے۔ اور اس طرح وہ ثابت کرتے ہیں کہ ان کا "قول" حقیقۃً قول بلا فعل تھا۔ ایسے لوگ اللہ کی نظر میں بالکل بے قیمت ہیں۔ خواہ اپنی خوش فہمیوں کی دنیا میں وہ کتنا ہی زیادہ بڑے نظر آتے ہوں۔ ایمان باعمل کی کسوٹی جو خدا نے مقرر کی ہے وہ اسلام کے لئے متحدہ عمل ہے۔ کوئی دوسری کسوٹی خواہ بظاہر کتنی ہی بڑی دکھائی دے خدا کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

خدا کی طرف

مارکونی پہلا شخص تھا جس نے ۱۹۰۱ء میں بحر اٹلانٹک کے ایک طرف سے دوسری طرف ریڈیو لہریں بھیجنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس وقت یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ وہ کون سا ذریعہ ہے جس نے لہروں کے اس سفر میں مدد دی ہے۔ ۱۹۲۴ میں ایڈورڈ ایپلٹن وغیرہ نے دریافت کیا کہ یہ زمین کی اوپری فضا میں آئنو اسفیر کی موجودگی ہے جو لاسلکی پیغام رسانی کو ممکن بناتی ہے۔

تاہم یہ سوال اب بھی باقی ہے کہ فضا میں آئنو اسفیر کا یہ حیرت انگیز نظام کس نے قائم کر رکھا ہے ـــــ اس قسم کے سوالات کا سائنس کے پاس کوئی جواب نہیں۔ ساری ترقیات کے باوجود علم کی یہ بے بسی انسان کو خدا کے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس سلسلے کا تازہ واقعہ یہ ہے کہ چاند پر جانے والے امریکی خلاباز آرم اسٹرانگ نے اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا ہے۔ علم کی ترقی نے انسان کے اس احساس میں صرف اضافہ کیا ہے کہ خدا کے آگے جھکنے کے سوا اس کے لئے کوئی دوسرا راستہ نہیں۔

کام کا صحیح طریقہ

شری نانک جی موٹوانی (۱۹۰۲ ـ ۱۹۷۰) ایک آزادی پسند ہندوستانی تھے۔ ۱۹۴۲ میں ان کو نظر بندی کی سزا ہوئی۔ وہ آٹھ مہینے جیل میں رہے۔ مہاتما گاندھی، سردار پٹیل، پنڈت نہرو، راجندر پرشاد وغیرہ سے ان کے قریبی تعلقات تھے۔

یہی نانک جی موٹوانی ہیں جنھوں نے ہندستان میں سب سے پہلے لاؤڈ اسپیکر کی صنعت قائم کی۔ انھوں نے دیکھا کہ ہندستانی لیڈروں کے جلسہ میں بہت بڑا بڑا مجمع اکٹھا ہوتا ہے۔ مگر لاؤڈ اسپیکر نہ ہونے کی وجہ سے مقرر کی آواز پوری طرح لوگوں تک نہیں پہنچتی۔ انھوں نے اس کمی کو پورا کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسی فیصلہ کا نتیجہ مشہور لاؤڈ اسپیکر شکاگو ریڈیو (Chicago Radio) تھا۔ جس سے آج سارا ہندستان واقف ہے۔

صرف اخبار نکالنا اور جلسہ کرنا کام نہیں۔ کام یہ ہے کہ مختلف لوگ مختلف ضرورتوں کو پورا کرنے میں لگیں۔ اس کے بغیر حقیقی ترقی نہیں ہو سکتی۔

کون کس کی جیب میں

پہلی جنگ عظیم کے بعد جس زمانہ میں خلافت تحریک کا زور تھا، علی برادران نے ملک کا دورہ کیا۔ ان کے ساتھ مہاتما گاندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی تھے۔ جو ان دنوں ترک موالات کی تحریک چلا رہے تھے۔ مولانا شوکت علی ان دنوں اکثر فخریہ انداز میں کہتے تھے "گاندھی جی میری جیب میں ہیں"۔ کچھ دنوں بعد سیاسی اختلافات ہوئے اور علی برادران نے مہاتما گاندھی کا ساتھ چھوڑ دیا اور اپنا راستہ الگ اختیار کیا۔ مولانا محمد علی لندن میں انتقال کر گئے۔ اور مولانا شوکت علی محمد علی جناح کے ساتھ مل گئے۔

ایک بار مسلم لیگ کے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے مولانا شوکت علی نے کہا: "مہاتما گاندھی کہاں ہیں جنھوں نے گول میز کانفرنس میں اعلان کیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو سادہ چک دینے کے لئے تیار ہیں"۔ مہاتما گاندھی کو معلوم ہوا تو انھوں نے اپنی پرارتھنا کی تقریر میں اس کا جواب دیتے ہوئے کہا: "بڑے بھائی کو اپنی جیب دیکھنا چاہئے۔ وہ مجھ کو وہاں پائیں گے" (ریڈینس ۲۶ نومبر ۱۹۷۸)

زیادہ بڑی ذلت

کرشن چند آئی سی ایس (۱۹۷۸ - ۱۹۱۷) ایمرجنسی کے زمانہ میں دہلی کے لفٹننٹ گورنر تھے۔ جنتا حکومت آنے کے بعد شاہ کمیشن قائم ہوا تو اس نے کرشن چند کو ایمرجنسی کے زمانہ میں دہلی میں ہونے والے واقعات کا براہ راست ذمہ دار قرار دیا۔ وہ اس سے اتنا پریشان ہوئے کہ ۱۰ جولائی ۱۹۷۸ کو جنوبی دہلی کے ایک کوئیں میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی۔ اپنے پیچھے انھوں نے ایک تحریر چھوڑی جس میں ہندی میں لکھا ہوا تھا:

جینا ذلت سے ہو تو مرنا اچھا

آدمی "مرنے" کو "مٹنے" کے ہم معنی سمجھتا ہے۔ اس لئے وہ دنیا کی ذلت سے گھبرا کر خودکشی کر لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ مرکر میں ذلت سے نجات پا جاؤں گا۔ اگر اس کو معلوم ہو کہ مرنے کے بعد شدید تر ذلت پیش آسکتی ہے تو وہ زندگی کو "ختم" کرنے کے بجائے زندگی کو صحیح بنانے کی کوشش کرے تاکہ اگلی دنیا میں مستقل ذلت اور تکلیف سے بچ سکے۔

تفتیش کے دوران معلوم ہوا کہ قریب کے گاؤں کے کچھ لوگوں نے آخر وقت میں کنوئیں کے اندر سے "بچاؤ بچاؤ" کے الفاظ سنے تھے۔ موت کو دیکھنے سے پہلے کرشن چند موت کو دنیا کی زندگی سے اچھا سمجھتے تھے۔ مگر جب وہ موت سے دوچار ہوئے تو معلوم ہوا کہ موت دنیا کی زندگی سے بھی زیادہ بھیانک ہے ——— یہ صرف "موت" کا معاملہ ہے۔ آدمی اگر موت کے اس پار کا عالم دیکھ لے جہاں ہر غافل اور سرکش انسان کے لئے آگ کا الاؤ بھڑک رہا ہے تو اس کی زندگی میں انقلاب آجائے۔ وہ موجودہ زندگی کو ہمہ تن اگلی زندگی کی بہتری میں لگا دے۔

یہ بے اعتمادی کی فضا

یہ اعظم گڑھ ریلوے اسٹیشن کا واقعہ ہے۔ میں بکنگ کی کھڑکی پر اپنا ٹکٹ لے رہا تھا۔ اتنے میں ایک دیہاتی آیا اس کو کسی مقام کا ٹکٹ لینا تھا جس کی قیمت پانچ چھ روپے ہوتی تھی۔ اس نے ریزگاری بکنگ کلرک کے سامنے پیش کرتے ہوئے اپنا ٹکٹ مانگا۔ مٹھی بھر ریزگاری دیکھ کر کلرک بگڑ گیا۔ "روپیے لے آؤ۔ ہم کب تک اس کو گنتے رہیں گے؟" اس نے کہا اور دوسرے مسافر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

دیہاتی آدمی کھڑکی سے نکل کر باہر آگیا۔ مجھے اس کی حالت پر ترس آیا۔ میں اس کے قریب گیا اور اس سے کہا کہ یہ ریزگاری مجھ کو دے دو اور اس کے بدلے مجھ سے نوٹ لے لو۔ دیہاتی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک لمحہ کے لئے اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر خاموشی سے ایک طرف روانہ ہو گیا۔

دیہاتی نے میری پیش کش کیوں قبول نہ کی۔ اس کی وجہ بے اعتمادی ہے۔ ہم ایک ایسے سماج میں ہیں جہاں کسی کو دوسرے پر بھروسہ نہیں۔ آج اگر کوئی شخص کسی پر مہربان ہوتا ہے تو صرف اپنے فائدہ کے لئے نہ کہ حقیقۃً دوسرے کی مدد کے لئے۔ دیہاتی نے غالباً یہ سوچا کہ میرے پاس کچھ خراب نوٹ ہوں گے اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں ان کو دیہاتی کی ریزگاری سے بدل لینا چاہتا ہوں۔

یہ ایک کی بے غرضی کا امتحان ہے اور دوسرے کی فیاضی کا

للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ لا یستطیعون ضربا فی الارض یحسبھم الجاھل اغنیاء من التعفف تعرفھم بسیماھم لا یسئلون الناس الحافا وما تنفقوا من خیر فان اللہ بہ علیم۔ الذین ینفقون اموالھم باللیل والنھار سرا وعلانیۃ فلھم اجرھم عند ربھم ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون (بقرہ ۲۷۳-۲۷۴)

دینا ہے ان حاجت مندوں کو جو گھر گئے ہیں اللہ کی راہ میں۔ چل پھر نہیں سکتے زمین میں۔ ناواقف ان کو غنی خیال کرتا ہے۔ تم ان کے چہرہ سے ان کو پہچان لوگے۔ وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے۔ اور جو مال تم خرچ کروگے وہ اللہ کو خوب معلوم ہے۔ جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنا مال رات دن کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں، ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے۔ ان کے لئے نہ ڈر ہے نہ غم۔

انفاق کے حکم کے ذیل میں اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ نے وسعت دی ہے ان کے لئے خرچ کی سب سے بڑی مد وہ لوگ ہیں جو دین کی خدمت میں لگنے کی وجہ سے ایسا گھر گئے ہیں کہ معاشی جدوجہد کے لئے وقت نہیں نکال سکتے۔ ایسے لوگوں کو خدا کا دین ایک طرف اس قابل نہیں رکھتا کہ وہ دوسرے لوگوں کی طرح معاش کی فراہمی کے لئے دوڑ دھوپ کر سکیں۔ دوسری طرف یہی دین ان کے اندر توکل علی اللہ کا جو مزاج پیدا کرتا ہے، وہ اس کے لئے مانع بن جاتا ہے کہ وہ اپنی ذاتی یا دینی ضرورتوں کے لئے ہر ایک سے کہتے پھریں۔ ان کی متوکلانہ باتیں اکثر لوگوں کو غلط فہمی میں ڈال دیتی ہیں۔ وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ مستغنی ہیں، ان کو پیسہ کی ضرورت نہیں۔

تاہم وہ لوگ جن کو اللہ نے ایمان کی روشنی عطا کی ہے، وہ ظاہری پردوں کو پھاڑ کر خدا کے ان بندوں کو دیکھ لیتے ہیں۔ وہ جان لیتے ہیں کہ یہ دنیا امتحان کا مقام ہے۔ یہاں "لینے والوں" کی بے غرضی کا امتحان ہو رہا ہے اور "دینے والوں" کی فیاضی کا امتحان۔ ایک سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اپنے آپ کو دین کی خدمت میں اس طرح جھونک دے کہ اس کے پاس پیسہ کمانے کا وقت نہ رہے اور دوسرے سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اپنے خرچ کی سب سے بڑی مد اپنی ذات کو نہیں بلکہ خدا کے دین کو سمجھے اور اپنی کمائی کو اس قسم کے خادمانِ دین پر قربان کر دے۔ ایک کا کمال یہ ہے کہ اپنی ضرورت مندی کو چھپائے اور دوسرے کا کمال یہ ہے کہ بظاہر چھپے ہونے کے باوجود اس کی ضرورتوں کو جان لے۔ ایک اگر اپنی تمام توانائیوں سمیت خدا کی طرف دوڑ رہا ہو تو دوسرا خدا کی طرف دوڑنے والوں کے پیچھے اپنا سرمایہ لئے پھرتا ہو —— جن لوگوں کے رات اور دن، جن کی خلوتیں اور جلوتیں اس طرح اللہ کے لئے وقف ہو جائیں، وہ گویا اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ وہ اپنی ذات کے خول سے باہر آکر خدا کو دیکھ رہے ہیں۔ وہ اپنی ضرورتوں سے اوپر اٹھ کر دین کی ضرورتوں کو جانتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ان کی مالی قربانیوں کا بے حساب گنا بدلہ دے گا اور ان کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جہاں وہ ہر قسم کے اندیشوں سے بے خوف ہو کر خوشیوں کی لازوال دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور کبھی اس سے نکلنا نہ چاہیں گے۔

"روزہ نماز" زندگی سے علیحدہ کوئی چیز نہیں ہے جو چھنگلیا کی طرح آدمی کے ہاتھ میں شامل رہے۔ بلکہ وہی اصل زندگی ہے۔ روزہ نماز کو آدمی کی پوری ہستی میں شامل ہونا چاہئے نہ کہ اس طرح جیسے کوئی وقتی رسم ادا کی جاتی ہے۔ آدمی حقیقۃً کیا ہے، اس کو دیکھنے کی جگہ عبادتی مراسم نہیں ہیں۔ بلکہ آدمی کی اصل زندگی ہے —— اگر اس کی مجلسی باتیں وہی ہوں جو عام دنیاداروں کی ہوتی ہیں۔ اگر اس کے اخبار میں وہی باتیں چھڑی رہتی ہوں جو عام قومیں اپنے اخباروں میں چھیڑے رہتی ہیں۔ اگر اس کے پاس بھی وہی نعرے اور مطالبے ہوں جو دوسروں کے پاس ہوتے ہیں۔ اس کی بحثوں اور گفتگوؤں اور دوسروں کی بحثوں اور گفتگوؤں میں اس کے سوا کوئی فرق نہ ہو کہ دوسرے لوگ جو بات اپنی روایتی اصطلاحوں میں کہتے ہیں، وہ ان کو اپنی روایتی اصطلاحوں میں بیان کر رہا ہے، اگر ایسا ہو تو اس کی نماز قرآن کے الفاظ میں غفلت کی نماز (ماعون) کہی جائے گی۔ یعنی نماز روزہ کے ذریعہ وہ جس قسم کی زندگی گزارنے کا اقرار کرتا ہے، حقیقی عملی زندگی میں وہ ان کو نہیں اپناتا۔

ذکر کوئی رٹے ہوئے منتروں کا جاپ نہیں ہے۔ ذکر اللہ کی یاد کا نام ہے جو قلب و روح کی گہرائیوں سے ابلتا ہے۔ اللہ سے خوف، اللہ سے محبت، اللہ پر اعتماد، اللہ کو اپنا سب کچھ سمجھنا، جب کسی کے اندر پیدا ہو جائے تو اس کا سینہ اللہ کی یاد سے بھر جاتا ہے۔ اللہ کے کلمات اس کی زبان و قلب سے امنڈتے رہتے ہیں۔ وہ ہر وقت اللہ سے دعاؤں اور سرگوشیوں میں مشغول رہتا ہے —— اللہ کے ساتھ اس قسم کے مستقل ربط میں رہنے کا نام ذکر ہے۔

وعظ کون کرے

ایک بزرگ نے فرمایا کہ "وعظ وہ شخص کرے جس کو وعظ کا کم سے کم اتنا تقاضا ہو جتنا ایک شخص کو رفع حاجت کا ہوتا ہے"۔ یہ بات تحریر اور تقریر دونوں کام پر صادق آتی ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ اتنا زیادہ مطالعہ کرے کہ معلومات اس کے ذہن سے اُبلنے لگیں۔ متعلقہ موضوع پر جو ذخیرہ کتب خانوں میں موجود ہے، ان کو چھاننے کے بعد وہ بے تابانہ محسوس کرے کہ اب بھی کچھ لکھنے سے رہ گیا ہے۔ اس کا حال یہ ہو جائے کہ اس کی معلومات تھامے نہ تھمیں اور اس کی بے تابی روکے نہ رکے۔ اس وقت اس کو بولنے یا لکھنے کے لئے اٹھنا چاہئے۔ اس کے بغیر جو لوگ "لاؤڈ اسپیکر" استعمال کریں گے وہ صرف فضائی شور و غل (Noise Pollution) میں اضافہ کریں گے۔ اور اس کے بغیر جو لوگ قلم سنبھالیں گے وہ صرف سفید کاغذ کو سیاہ کرنے کا کارنامہ انجام دیں گے۔ اس قسم کے مشاغل سے ممکن ہے کسی کے سطحی ذوق کو تسکین ملتی ہو مگر اس کا کوئی حقیقی فائدہ نہ سننے والے کو ملتا ہے اور نہ سنانے والے کو۔

یہ ... جدید ... کا ... یا ... ہے

اس کتاب کا عربی ایڈیشن "الاسلام یتحدی" کے نام سے شائع ہو چکا ہے جو قاہرہ کی جامعۃ الازہر کے نصاب میں ایک "مددگار کتاب" کی حیثیت سے داخل ہے۔

اسی طرح طرابلس یونیورسٹی نے اس کو اپنی تمام فیکلٹیوں میں "ثقافت اسلامیہ" کے موضوع کے تحت بی اے اور بی ایس سی کے پہلے اور دوسرے سال کے طلبہ کی تعلیم کے لئے مقرر کر دیا ہے۔

یہ بے حسی کیوں

مجھ کو جب یہ حکم ملا کہ اس وقت کی مجلس میں مجھے کچھ کہنا ہے، تو میں نے سوچنا شروع کیا کہ وہ کیا بات ہے جو مجھے آپ سے کہنی چاہئے۔ یہ چونکہ نصیحت، یا قرآن کے الفاظ میں تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کی مجلس ہے، اس لئے اس مناسبت سے بہت سی باتیں ذہن میں آئیں۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک سوال نے میرے سلسلۂ خیال کو توڑ دیا —— "تم جو باتیں سوچ رہے ہو کیا وہ سننے والوں کے لئے نئی ہیں، کیا ان کے کان بار بار انھیں نہیں سن چکے ہیں۔ پھر جن الفاظ نے اس سے پہلے کوئی اثر نہیں دکھایا، وہی الفاظ ایک مرتبہ اور دہرا دینے سے کیا انقلاب آجائے گا"۔ اس سوال کا آنا تھا کہ میرے سارے خیالات اس طرح منتشر ہو گئے جیسے یکایک ہوا کا تیز جھونکا آئے اور تنکوں اور پتوں کے ڈھیر کو اڑا لے جائے۔

اب میں دم بخود تھا۔ "آخر اس بے حسی کی وجہ کیا ہے" یہ سوال میرے سامنے گھومنے لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے ساری باتیں کہہ ڈالی ہیں اور اب میرے پاس آپ سے کہنے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ میری مثال اس مقرر کی سی ہو گئی جو اپنی پوری تقریر ختم کر چکا ہو۔ مگر ساری قوت صرف کرنے کے بعد آخر میں جب وہ حاضرین سے کہے کہ لگائیے نعرہ "انقلاب زندہ باد"، تو سامنے بیٹھے ہوئے ہزاروں انسانوں میں سے کسی ایک کی زبان بھی حرکت میں نہ آئے۔ وہ بار بار کہے کہ "لگائیے نعرہ" مگر ہر شخص اس طرح خاموش بیٹھا رہے گویا کسی کے منھ میں زبان ہی نہیں ہے۔ لیکن اس وقت مجھے دور سے ایک آواز سنائی دی۔ مجھے نظر آیا کہ امام ترمذی سے لے کر کعب بن عیاض تک انسانوں کی ایک جماعت ایک دوسرے کو پکار رہی ہے کہ آخری رسول کا یہ پیغام اس بندۂ خدا تک پہنچا دو، کیوں کہ اسی پیغام میں اس کے سوال کا جواب ہے:

حدثنا احمد بن منیع نا الحسن بن سوار نا لیث بن سعد عن معاویۃ بن صالح عن عبد الرحمٰن بن جبیر بن نفیر حدثہ عن ابیہ عن کعب بن عیاض قال سمعت النبیؐ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول: ان لکل امۃ فتنۃ وفتنۃ امتی المال (ترمذی، ابواب الزہد)

امام ترمذی سے کہا احمد بن منیع نے، ان سے کہا حسن بن سوار نے، ان سے کہا لیث بن سعد نے، ان سے کہا معاویہ بن صالح نے، ان سے کہا عبد الرحمٰن بن جبیر نے، ان سے کہا ان کے باپ نے، ان سے بیان کیا کعب بن عیاض نے، انھوں نے کہا کہ میں نے سنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے، آپ نے فرمایا۔ ہر امت کا ایک فتنہ تھا اور میری امت کے لئے جو چیز فتنہ بنے گی وہ مال ہے۔

اس فقرے میں "مال" دراصل "دنیا" کا قائم مقام ہے۔ کیوں کہ دنیا کی وہ تمام چیزیں جن کو عاجلہ پسند انسان للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے وہ مال ہی کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں۔ مال دنیا کے ساز و سامان کی قیمت ہے۔ جیسا کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے، یہی دنیا ہر زمانے میں انسانوں کی گمراہی کا سبب رہی ہے۔ مگر بعد کے دور

میں یہ فتنہ پوری شدت سے ظاہر ہونے والا تھا۔ اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو خاص طور پر امت اسلامیہ کا فتنہ قرار دیا۔ پہلے آدمی جن لذائذ ونعم کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا وہ آج سائنسی تحقیقات کے نتیجہ میں واقعہ بن کر انسان کو حاصل ہو چکی ہیں۔ یہی نہیں، پہلے دنیا کی جو رنگینیاں اور اس کے دل کش ساز و سامان صرف کسی بادشاہ کے محل میں ہوتے تھے، وہ آج خوب صورت الماریوں میں سجے ہوئے بازار کے اندر نظر آتے ہیں، وہ آج در و دیوار پر رنگین اشتہارات کی صورت میں لگے ہوئے ہیں، وہ پوری رعنائی کے ساتھ سڑکوں پر ظاہر ہو کر ہر راہ گیر کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا اس سے پہلے کبھی اتنی حسین نہیں تھی، اس لئے وہ اس سے پہلے انسان کے لئے اتنا بڑا فتنہ بھی نہیں بن سکتی تھی۔

یہاں میں ایک واقعہ کا ذکر کروں گا جو ابھی حال میں اخبارات میں آیا تھا۔ نئی دہلی میں ہندوستان کے بین اقوامی صنعتی میلہ میں امریکہ کی طرف سے ایک ہوائی موٹر کار کی نمائش کی گئی ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ زمین پر بھی چلتی ہے اور ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ہوا میں بھی اڑ سکتی ہے۔ اس عجیب وغریب کار کو جب ایک نوجوان سادھو نے دیکھا تو اس کے سامنے ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا "کیا میں تیاگ اور قربانی کی زندگی کو چھوڑ کر مادی ترقیات کی دنیا میں اپنے حوصلوں کی تسکین ڈھونڈوں" سادھو نے کہا۔ گیروے کپڑے میں ملبوس اور لمبے بکھرے ہوئے بالوں والا یہ ہندوستانی نوجوان بیس منٹ تک اس امریکی کار کو دیکھتا رہا جس کو نمائش کے ذمہ داروں نے مستقبل کی کار (Car of the Future) کا نام دیا ہے۔ جب اس کے بارے میں سادھو کا تبصرہ پوچھا گیا تو اس نے گہرے تاثر کے ساتھ جواب دیا "اس نے مجھے اس سوچ میں ڈال دیا ہے کہ دونوں دنیاؤں میں سے وہ کون سی دنیا ہے جس کو میں اپنے لئے زیادہ بہتر سمجھوں" (ہندوستان ٹائمس ۲۰ نومبر ۱۹۷۱) یہ واقعہ بتاتا ہے کہ مادی ساز و سامان نے آج کس طرح ہر شخص کو اس خطرے میں مبتلا کر دیا ہے کہ وہ ان کی ظاہری چمک دمک سے متاثر ہو کر زندگی کی اصل حقیقت کو بھول جائے۔

اس حدیث سے میرا ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ امت محمدیہ کے افراد میں جب کوئی کمزوری نظر آئے تو اس کے اسباب سب سے پہلے دنیا کے فتنوں میں تلاش کرنے چاہئیں۔ جب اس امت کا فتنہ دنیا ہے تو امت کی خرابیاں بھی دنیا ہی کی پیدا کی ہوئی ہوں گی۔ جب میں نے اس حیثیت سے غور کیا تو بالآخر میرا ذہن اس پر مطمئن ہو گیا کہ دنیا ہی وہ سب سے بڑا روک ہے جو حق کی آواز کو آدمی کے لئے قابل فہم اور قابل قبول بننے نہیں دیتا۔ اسلام کی بلند تر حقیقتوں کو وہی شخص پا سکتا ہے جو دنیا اور دنیا کی چیزوں سے اپنے آپ کو اوپر اٹھا چکا ہو۔ جو اس سے اوپر نہ اٹھ سکے اس کے عین سر کے اوپر حقیقت کی آواز گونج رہی ہو گی مگر اس کو گرفت کرنے کی طاقت سے وہ محروم ہو گا۔ اس کے پاس وہ کان نہیں ہوں گے جن سے وہ سنے اور وہ دل نہیں ہو گا جن سے وہ اسے سمجھے

آپ کی سعادت و ترقی کے تمام امکانات اس وقت تک آپ سے دور ہیں جب تک آپ کی توجہات دنیا کے اندر بکھری ہوئی ہوں۔ آپ کا مومن بننا، آپ کا داعی بننا، آپ کا مجاہد فی سبیل اللہ بننا، سب کچھ منحصر ہے اس بات پر کہ اس

سے پہلے آپ "زھد فی الدنیا" کی کیفیت اپنے اندر پیدا کر چکے ہوں جو رسول کے الفاظ میں ــــ اول صلاح هذه الامة ہے۔ دنیا پسندی دوسرے لفظوں میں ظاہر پسندی کا نام ہے۔ اور زھد یہ ہے کہ ظاہری چیز دنیا کے پیچھے جو اصل حقیقت ہے وہ آدمی کے سامنے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا پسندی سطحیت پیدا کرتی ہے اور زھد سے وہ گہری نظر حاصل ہوتی ہے جو چھپے ہوئے واقعات کو بالکل بے نقاب دیکھ لے۔ اور حقیقت سے انتہائی حد تک آشنا ہو کر بول سکے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ما زھد عبدٌ فی الدنیا الا انبت اللہ الحکمۃ فی قلبہ وانطق بھا لسانہ وبصرہٗ عیب الدنیا وداءھا ودواءھا واخرجہ سالما الیٰ دار السلام (بیہقی فی شعب الایمان)

جو شخص دنیا سے بے رغبت ہو جائے اللہ تعالیٰ اس کے دل میں حکمت پیدا کر دیتا ہے اور اس کی زبان پر کلمات حکمت جاری کر دیتا ہے۔ دنیا کے عیب اور اس کا مرض اور علاج اسے دکھا دیتا ہے۔ اور اس کو سلامتی کے گھر (جنت) تک محفوظ لے جاتا ہے۔

یہ حکمت جو زُہد کے صلے میں ملتی ہے، یہ خدا کی سب سے بڑی دین ہے جس کو قرآن میں "خیر کثیر" کہا گیا ہے یعنی سب سے بڑا خزانہ۔ قرآن کے بیان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکمت کا خزانہ اسی کو ملتا ہے جو دوسرے خزانوں سے اپنی نظریں ہٹا لے، جو دنیا کی محبت سے اپنے دل کو خالی کر چکا ہو۔ چنانچہ سورہ بقرہ میں خدا کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد ہوا ہے:

یؤتی الحکمۃ من یشاء ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا

اللہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے، اور جس کو حکمت دی گئی اس کو سب سے بڑا خزانہ دے دیا گیا۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ "خیر کثیر" اسی کو ملتا ہے جو "خیر قلیل" سے اپنے آپ کو خالی کر لے، جو خیر قلیل میں لپٹا ہوا ہو، وہ خیر کثیر سے اپنا دامن نہیں بھر سکتا۔

میں چاہتا ہوں کہ آج کی صحبت میں اسی زُہد فی الدنیا کے بارے میں کچھ عرض کروں۔ کیوں کہ اپنے مطالعہ اور تجربہ سے میں اس حقیقت پر مطمئن ہو چکا ہوں کہ جب تک کسی کے اندر زُہد کی کیفیت پیدا نہ ہو وہ دین کی اعلیٰ حقیقتوں کا ادراک نہیں کر سکتا اور نہ اس کے اندر کبھی گہرا عمل پیدا ہو سکتا۔ جس شخص کی آخرت طلبی نے اس کو دنیا کا زاہد نہیں بنایا، اس کے درمیان اور قرآن کے درمیان ایک "حجاب مستور" حائل رہتا ہے۔ وہ سنتا ہے مگر نہیں سنتا، وہ سنتا ہے مگر نہیں سمجھتا۔ (بنی اسرائیل ۴۶-۴۵)

زُہد فی الدنیا کے معنی ہیں دنیا سے بے رغبتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا سے دلچسپی کا تعلق ختم کر کے اس سے صرف ضرورت کا تعلق باقی رکھا جائے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو حدیث میں التجافی من دار الغرور کہا گیا ہے۔ (دھوکا دینے والی جگہ سے دور رہنا) اس دوری کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ دنیا کے کاروبار سے

الگ تھلگ ہو جائیں۔ زہد در اصل دنیا سے حیاتی بے تعلقی کا نام ہے نہ کہ عملی بے تعلقی کا۔ جیسا کہ حضرت سفیان ثوری نے فرمایا، زہد خراب کپڑے اور معمولی کھانے کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک کیفیت ہے جو دل کے اندر پیدا ہوتی ہے ظاہری شکلیں اس اندرونی کیفیت کا فطری اظہار ہیں، نہ کہ بجائے خود کسی ظاہری شکل کا نام زہد ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک شخص جھونپڑی میں رہتا ہو مگر اپنے خیالات و احساسات کے اعتبار سے وہ مکمل طور پر ایک دنیا پسند آدمی ہو۔ اور دوسرا شخص اپنے آپ کو عالی شان عمارتوں کے درمیان پائے مگر دنیا پسندی سے اس کا ذہن خالی ہو۔

زہد کسی مصنوعی تدبیر کا نام نہیں ہے۔ بلکہ وہ آدمی کی ایمانی حالت کا ایک فطری اظہار ہے۔ جب کوئی شخص اعلیٰ حقیقتوں کو پا لیتا ہے تو اسفل حقیقتیں خود بخود اس کی نگاہ میں حقیر بن جاتی ہیں۔ اُخروی قدروں کی اہمیت کا احساس دنیوی قدروں کو غیر اہم بنا دیتا ہے۔ وہ اپنی ایمانی کیفیت کے بالکل لازمی نتیجے کے طور پر دنیا سے بے رغبت ہو جاتا ہے۔ جب آپ کا ذہن خدا کی باتیں سوچنے میں اتنا مصروف ہو کہ آپ دنیا کی باتیں بھولنے لگیں، جب آخرت کی فکر آپ کے اوپر اس طرح چھا جائے کہ دنیا کے غم آپ کو یاد نہ آئیں، جب آنے والے مستقل آرام و تکلیف کا مسئلہ آپ کو اتنا فکرمند بنا دے کہ عارضی آرام و تکلیف کے مسئلے آپ کے لئے بے حقیقت ہو جائیں۔ جب کل کی زندگی آپ کو اس طرح اپنی طرف کھینچ لے کہ آج کی زندگی کے بارے میں آپ لوگوں کو غافل نظر آنے لگیں، جب بلند تر حقائق کی طرف متوجہ ہونے کی وجہ سے آپ دنیا میں اس طرح رہنے لگیں گویا آپ دنیا میں نہیں ہیں۔ جب دنیا میں آپ کوئی آرام دیکھیں تو یہ سوچ کر رو پڑیں کہ معلوم نہیں کہ آخرت میں کیا ہونے والا ہے اور جب کوئی تکلیف ستائے تو آپ کی زبان سے نکلے کہ "خدایا دنیا کی معمولی تکلیف کا یہ حال ہے تو آخرت میں کیا ہوگا"۔ جب دنیا کی لذتیں آپ کو تسکین نہ دے سکیں اور دنیا کی زحمتیں آپ کی نگاہ میں حقیر بن جائیں ——— جب آپ کا حال یہ ہو جائے تو اسی کا نام زھد فی الدنیا ہے۔ آنحضورؐ نے ایک بار اپنے صحابی حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کو پکڑ کر جو نصیحت فرمائی تھی، اس کا ایک فقرہ یہ تھا:

عُدَّ نفسكَ مِنْ اهل القبور (بخاری) اپنے آپ کو قبر والوں میں شمار کرو

گویا اللہ تعالیٰ نے ہم کو جو دنیا میں بھیجا ہے اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم یہاں کی نعمتوں میں غرق ہوں اور یہاں رہ کر اپنے دل کی تمنائیں پوری کریں۔ بلکہ وہ تو یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ ہم میں سے کون ہے جو دنیا کو اپنے حوصلوں اور تمناؤں کا قبرستان بناتا ہے۔

اس تشریح سے خود بخود یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زہد صرف محرمات دنیا سے بچنے کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسی حالت ہے جس میں آدمی کو بہت سی جائز چیزوں سے بھی اپنے آپ کو محروم کر لینا پڑتا ہے۔ بے شک جو کچھ اللہ تعالیٰ نے حرام ٹھہرایا ہے وہی حرام ہے اور جو کچھ اس نے حلال کیا ہے وہ سب حلال ہے۔ کسی انسان کو حق نہیں کہ اس میں بال برابر کوئی رد و بدل کر سکے۔ مگر شریعت کی قانونی حدود ہمارے ارتقا کی آخری حدود نہیں ہے۔ دائرہ ایمان میں داخل ہونے کے لئے یقیناً صرف اتنا ہی کافی ہے کہ آدمی احکام کے قانونی تقاضے پورے کر دے۔ مگر ایمان کے اعلیٰ

مراتب کو حاصل کرنے کا ذریعہ قانون نہیں، قربانی ہے، اگر آپ خدا کی راہ میں مسابقت کا جذبہ رکھتے ہیں تو آپ کو اپنی نیند، اپنا آرام، اپنی لذتیں، سب کچھ چھوڑنی پڑیں گی، ذوق اور عادت کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دینا ہوگا۔ حالاں کہ یہ سب کچھ آپ کے لئے جائز ہے اور ان میں سے کوئی بھی چیز شریعت نے حرام نہیں قرار دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسری تمام راہوں کی طرح اسلام کی راہ میں بھی ترقی صرف اسی کے لئے ہے جو قانونی تقاضوں سے بلند ہو کر کام کرنے کا جذبہ رکھتا ہو۔ جو یہ نہ دیکھتا ہو کہ دنیا کی چراگاہ میں اس کے لئے کیا کیا جائز ہے بلکہ جس کی نگاہ اس پر لگی ہوئی ہو کہ کتنے عظیم امتحان میں اسے پیش ہونا ہے اور اس کے لئے کتنی بے پناہ تیاریوں کی ضرورت ہے۔ ایسا شخص یقیناً بہت سی ایسی چیزوں سے فائدہ اٹھانے سے محروم رہ جائے گا جو اس کے لئے شرعاً حلال تھیں۔ جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

لا يبلغ العبد ان يكون من المتقين
حتى يدع مالا باس به حذرا لما
به باس (ترمذی، ابن ماجہ)

کوئی شخص متقیوں میں شمار کیے جانے کے قابل نہیں ہو سکتا جب تک اس کا یہ حال نہ ہو جائے کہ وہ ان چیزوں کو چھوڑ دے جن میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ایسی چیزوں سے بچنے کی خاطر جن میں واقعتاً حرج ہے۔

اس "چھوڑنے" کی دو صورتیں ہیں۔ ایک، ایسی چیزوں کو چھوڑنا جو بذات خود مشتبہ ہوں۔ دوسرے، ایسی چیزوں کو چھوڑنا جو بذات خود مشتبہ نہ ہوں مگر ان کے متعلق یہ شبہ ہو کہ وہ آدمی کو غلط انجام تک پہنچا سکتی ہیں۔

پہلی صورت میں متعلقہ چیز کی حرمت کا یقین تو نہیں ہوتا مگر اس کی حلت کے بارے میں بھی ذہن پوری طرح مطمئن نہیں ہوتا۔ اس لئے آدمی احتیاط کی بنا پر اسے ترک کر دیتا ہے۔ دوسری صورت میں متعلقہ چیز اصلاً بالکل جائز ہوتی ہے مگر یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ ایسے نتائج پیدا کرے گی جو صحیح نہ ہوں۔ مثلاً دنیا کا عیش و آرام فی نفسہ بالکل جائز ہے۔ مگر ایک حساس مومن ان سے صرف اس لئے بچتا ہے کہ وہ ڈرتا ہے کہ اس میں پڑ کر اس کا نفس موٹا ہو جائے گا۔ اس کے درمیان اپنے آپ کو پا کر وہ اور اس کے اہل خاندان غلط قسم کے احساس برتری میں مبتلا ہو جائیں گے، دنیا کی آسودہ زندگی "کامیابی" کا غلط احساس پیدا کرے گی اور اس طرح آخرت میں کامیابی حاصل کرنے کی فکر نفسیاتی طور پر مضمحل ہو جائے گی۔

زہد فی الدنیا سے وہ انسان کیسے بنتا ہے جو ترقی کے اعلیٰ مراتب طے کر سکے، اس کے بہت سے پہلو ہیں، میں یہاں چند خاص پہلوؤں کا ذکر کروں گا۔

۱۔ زہد فی الدنیا سے جو چیزیں حاصل ہوتی ہیں ان میں پہلی چیز وہ ہے جس کو میں استغراق یا ذہنی یکسوئی کے لفظ سے تعبیر کروں گا۔ دنیا سے جتنا زیادہ آپ کا تعلق ہوگا اتنا ہی زیادہ آپ کے خیالات منتشر ہوں گے، اور یہ تعلق جتنا کم ہوگا اتنا ہی آپ اپنے خیالات کو یکجا کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ حقیقت ایک نہایت لطیف چیز ہے اس لئے اس کو گرفت کرنے کے لئے غیر معمولی ذہنی ارتکاز بہت ضروری ہے جس نے اپنی فکر کو مختلف سمتوں میں پھیلا

رکھا ہو وہ ہرگز اعلیٰ حقائق کا ادراک نہیں کر سکتا۔ تاریخ سائنس کا عظیم ترین نام "نیوٹن" اپنے پیچھے جو عظمت رکھتا ہے اس کا سب سے بڑا راز نیوٹن کا ذہنی استغراق تھا۔ وہ اپنے بچپن میں Wool Gatherer کہا جاتا تھا۔ یعنی کھویا ہوا شخص۔ لوگ اسے نیوٹن کا طبعی نقص سمجھتے تھے۔ مگر بعد کو معلوم ہوا کہ اس کی یہ کیفیت اس کی استغراقی صلاحیت کی وجہ سے تھی۔ وہ کسی مسئلہ خاص پر ذہن کو بالکل مرتکز کر کے سوچنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا تھا۔ اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے وہ بہت جلد مسائل کی تہ تک پہنچ جاتا تھا۔ اور انتہائی پیچیدہ سوالات جن کے حل کرنے میں دوسرے لوگ مہینوں لگا دیتے تھے وہ انھیں گھنٹوں میں حل کر کے رکھ دیتا تھا۔

اگر آپ اس کے کمرے میں داخل ہوں تو آپ کے سامنے کتابوں اور کاغذات کی ایک بے ترتیب دنیا ہوگی جس میں کسی اہتمام کے بغیر ایک شخص اس طرح کھڑا یا بیٹھا ہوا نظر آئے گا جیسے وہ کوئی مجسمہ ہے جو کسی اسکیم کے بغیر اس ڈھیر میں لا کر ڈال دیا گیا ہے۔ مشہور سائنس داں اڈمنڈ ہیلی (Edmund Halley) جس کے نام پر ایک دمدار ستارہ کا ہیلی کامٹ (Halley Comet) کہا جاتا ہے۔ اس نے یہ دمدار ستارہ معلوم تو کر لیا تھا مگر اس کے مدار کا حساب لگانے میں وہ کوشش کے باوجود ناکام رہا۔ اس سلسلے میں مدد لینے کے لئے وہ نیوٹن کے پاس گیا۔ وہاں یہ سن کر اسے سخت حیرت ہوئی کہ الجھے ہوئے بالوں والا یہ آدمی اس کو پہلے ہی حل کر چکا ہے۔ اس نے اس کا حساب دیکھنا چاہا۔ مگر یہ نیوٹن کا کمرہ تھا۔ کوشش کے باوجود بکھرے ہوئے بے ترتیب انبار میں متعلقہ کاغذ برآمد نہ ہو سکا۔ نیوٹن نے فوراً ہی ایک سادہ کاغذ لیا اور اس انتہائی پیچیدہ ریاضیاتی سوال کو دوبارہ حل کر کے اسی وقت ہیلی کے سامنے رکھ دیا۔ ہیلی اس واقعہ سے بہت متاثر ہوا جب اسے معلوم ہوا کہ نیوٹن کی تصنیف Principia ابھی تک اس کے ڈسک کے ایک خانہ میں ردی کاغذات کی طرح بھری ہوئی رکھی ہے، تو اس نے کہا کہ ایسے قیمتی دماغ کے افکار اس طرح پڑے رہنے کے لئے نہیں ہیں۔ چنانچہ اس نے اپنے خرچ سے اس کو چھپوانے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح نیوٹن کی یہ کتاب پہلی بار دنیا کے سامنے آئی۔

نیوٹن صرف مادی دنیا کے کچھ حقائق جاننا چاہتا تھا، اس کے لئے اُسے اس طرح مستغرق ہونا پڑا کہ وہ اپنا کھانا، اپنا سونا، اپنا آرام، اپنا ذوق، اپنی عادتیں، سب بھول گیا۔ تو آپ بھی غیر مادی حقائق کا تصور اپنے ذہن میں جمانا چاہتے ہیں، ان کو شدید ذہنی استغراق کے بغیر کس طرح پا سکتے ہیں۔ آسمان پر جو ستارے جگمگاتے ہوئے نظر آتے ہیں ان کی حرکت کے قوانین منضبط کرنے کے لئے نیوٹن کو افکار میں اتنا ڈوبنا پڑا گویا اس نے اپنے آپ کو دنیا سے اٹھا کر اسی خلا میں پہنچا دیا ہے جہاں یہ روشن اجسام حرکت کر رہے ہیں۔ پھر وہ حقیقتیں جو ستاروں سے بھی دور ہیں، جو ٹمٹماتی ہوئی شکل میں بھی آنکھوں کو نظر نہیں آتیں، ان کو بے پناہ ذہنی یکسوئی کے بغیر کیسے گرفت کیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ اس طرح خدا کی عبادت کریں گویا کہ آپ اسے دیکھ رہے ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ قیامت اور جنت دوزخ کا تصور ہر وقت آپ کی نگاہوں کے سامنے رہے، اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ ایسے ہو جائیں کہ آپ جہاں ہوں اور جو کام بھی کر رہے ہوں، ہر حال میں آپ کا سینہ "ذکر کثیر" سے لبریز رہے۔ اگر آپ اپنے اندر

وہ شدید یقین اور وہ زبردست استحضار دیکھنا چاہتے ہیں جو دل کو پگھلا دے اور آنکھوں کو اشکبار کر دے تو یہ سب کچھ اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ آپ حدیث کے الفاظ میں "تشعّب ہموم" کو ختم کر کے اپنی ساری نظریں صرف ایک نقطہ پر لگا دیں۔ ارجن کے مشہور واقعہ کی طرح آپ کو درخت اور چڑیا اور پتے اور پھل نظر نہ آئیں بلکہ صرف ایک چیز نظر آئے ——— "شکار کی بائیں آنکھ"

جب آپ یہ ذہنی گم شدگی اور یہ استغراق اپنے اندر پیدا کریں گے تو عادت اور ذوق کے تقاضے آپ کا ساتھ چھوڑتے پر مجبور ہوں گے، لذتوں اور آسائشوں کا خیال مدھم پڑ جائے گا۔ فکر کی زیادتی جسمانی تقاضوں پر غالب آنے لگے گی۔ آپ کا ہنسنا اور بولنا کم ہو جائے گا، تصوراتی دنیا کو پانے کی کوشش میں آپ مادی دنیا سے دور ہوتے ہوئے نظر آئیں گے۔ اس وقت ممکن ہے لوگ کہیں تم پاگل ہو گئے ہو۔ مگر اس سے گھبرائیے نہیں، کیونکہ یہی وہ صحیح ترین خطاب ہے جو کسی با مقصد آدمی کو اہل دنیا کی طرف سے دیا جا سکتا ہے۔

۲۔ زہد فی الدنیا کے ذریعہ دوسری چیز جو حاصل ہوتی ہے وہ لطافت روح ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مادی دنیا میں آدمی جتنا زیادہ مشغول ہوگا۔ اس کی روح میں اسی قدر کثافت پیدا ہوگی۔ اور جتنا وہ اس سے اپنے آپ کو دور لے جائے گا اسی کے بقدر اس کی روح پاک اور خالص ہوتی چلی جائے گی۔ یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں رہبانیت کی تبلیغ کر رہا ہوں، رہبانیت دنیا سے اپنے آپ کو الگ کر لینے کا نام ہے حتیٰ کہ اس مقصد سے اگر کوئی شخص اپنے آپ کو مار ڈالے تو یہ بھی رہبانی فلسفہ کے مطابق جائز ہوگا۔ اس کے برعکس زہد یہ ہے کہ آدمی مکمل طور پر اسی دنیا میں ہو۔ مگر اس سے بے رغبت ہو چکا ہو وہ دنیا میں رہتے ہوئے ذہنی حیثیت سے اس سے باہر نکل جائے۔ مومن بھی یقیناً راہب ہوتا ہے۔ مگر اس کی رہبانیت حسی رہبانیت ہے جب کہ دوسرے مذاہب جسمانی رہبانیت میں عقیدہ رکھتے ہیں۔

"اللہ تعالیٰ نے کسی کے سینے میں دو دل نہیں بنائے" اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے احساسات کسی ایک ہی چیز کے بارے میں شدید ہو سکتے ہیں۔ وہ دو سمتوں میں حرکت نہیں کر سکتے۔ اگر آپ دنیا اور اس کے ساز و سامان کو اہمیت دینے لگیں تو آخرت کا خیال آپ کے اندر کمزور پڑ جائے گا اور اگر آپ آخرت کی فکر میں مشغول ہوں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا کے بارے میں آپ پر غفلت طاری ہونے لگے گی۔ جو شخص دنیوی قدروں کو اہمیت دیتا ہے، اس کا لازمی مطلب یہ ہے کہ وہ اُخروی قدروں کو پامال کر رہا ہے۔ آپ کو ایسے "خوش مذاق" ملیں گے جن کے کھانے کی پلیٹ میں مکھی پڑ جائے تو وہ اس کو کھانا پسند نہیں کریں گے۔ دوسری طرف ان کے اسلام میں کتنی ہی مکھیاں پڑی سڑ رہی ہوں گی۔ مگر اس کی عفونت کا انھیں اندازہ نہ ہوگا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ دنیا کی طرف رغبت نے آدمی کی حسیات کو دنیا کے بارے میں تو بہت تیز کر دیا، مگر اس کا دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ آخرت کے بارے میں اس کی حسیات کند ہو کر رہ گئیں۔

یہ دنیا جو آپ کے جسم کو موٹا کرتی ہے۔ یہ آپ کی روح کی قاتل ہے۔ اگر آپ اس کے اندر لذت ڈھونڈنے

لیں، اگر اس کے سطحی اور ظاہری ساز و سامان آپ کو اپنی طرف کھینچ لیں، تو وہ آپ سے آپ کا سب سے بڑا جوہر چھین لیں گے۔ اس کے بعد آپ کے نازک جذبات مردہ ہو جائیں گے، آپ کے اندر وہ لطیف احساسات ابھر نہیں سکتے جو اعلیٰ ترین حقائق کا ادراک کرتے ہیں۔ جن پر تجلیات الٰہی کا نزول ہوتا ہے۔ جس کے بعد آدمی تمام حجابات سے بلند ہو کر حقیقت کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے جس کے اندر دنیا سے بے رغبتی پیدا نہیں ہوئی، اس کے اندر گویا وہ صلاحیت ہی پیدا نہیں ہوئی جو کسی حقیقت کو سمجھے اور اسے قبول کر سکے۔ ظاہر ہے کہ ایسے دل میں حکمت کا "انبات" نہیں ہو سکتا۔ جس زمین میں اخذ کی صلاحیت نہ ہو وہ کیسے کسی بیج کو قبول کرے گی اور اس کے اندر ڈالا ہوا دانہ نشو و نما پا کر پورا درخت کیسے بن سکتا ہے۔ یاد رکھئے، حقیقت ایک غیر مادی چیز ہے۔ اس لئے وہ روح جو مادی آلائشوں میں پھنسی ہوئی ہو، وہ حقیقت کو بے نقاب حالت میں نہیں دیکھ سکتی۔ اس کا مشاہدہ ہمیشہ دھندلا مشاہدہ ہوگا جس میں حقیقت کے بعض رُخ دکھائی دیں گے اور بعض رخ نظروں سے اوجھل ہو جائیں گے۔

روح کی لطافت اور کثافت کوئی تصوف کا پُراسرار مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ بالکل ایک سادہ سی حقیقت ہے جس کو ہر شخص معمولی غور و فکر سے سمجھ سکتا ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ آپ کا جو حسیاتی اور تصوراتی وجود ہے وہ کسی اور کی محبت میں اٹکا ہوا ہے یا اس نے اپنے آپ کو دوسری تمام چیزوں کی گرفت سے بالکل خالی کر دیا ہے تاکہ مالکِ حقیقی کی یاد آپ کی روح کو اپنا مسکن بنا سکے۔ گرمیوں میں اگر مسجد میں بجلی کا پنکھا چلایا جائے اور اس کی ہوا میں نماز ادا کی جائے تو ظاہر ہے کہ کوئی اسے ناجائز نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اگر دل اللہ کے ذکر سے خالی ہو تو یہ حال ہوتا ہے کہ مسجدوں میں نماز کے لئے آنے والے پنکھے کے نیچے جگہ حاصل کرنے کے لئے مسابقت کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ نماز کے دوران میں اگر کرنٹ رکنے کی وجہ سے پنکھا بند ہو جائے تو سلام پھیرتے ہی ہر شخص کی نظریں اوپر اٹھ جاتی ہیں اور نماز کے بعد پاور سپلائی کے انتظام کی خرابی وہ اہم ترین موضوع ہوتا ہے جس پر لوگ اپنے جذبات اور اپنی معلومات کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کی آرام طلبی نے آپ کی روح کو گندا کر دیا۔ اس میں گرمی اور سردی کے مسائل نے اپنے آشیانے بنا لئے۔ ظاہر ہے کہ ایسا آدمی وہ نماز نہیں پڑھ سکتا جو ساری لذتوں سے بڑھ کر لذیذ ہے۔ جس میں مشغول ہو کر آدمی گرد و پیش سے بے خبر ہو جاتا ہے، جب ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ اپنی دنیا سے نکل کر خدا کی دنیا میں پہنچ گیا ہے۔

مجھ کو بار بار اس کا تجربہ ہوا کہ ایک شخص اپنے ذوق اور اپنی عادتوں کے معاملے میں تو نہایت حساس ہے۔ اپنے طبعی تقاضوں میں کمی کو وہ کسی حال میں برداشت نہیں کرتا۔ مگر ایسے معاملات جو خدا اور آخرت سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو اس کی دوامی زندگی کو بہتر یا بدتر بنانے والے ہیں ان میں وہ اکثر نہایت سنگین حقیقتوں کو اس طرح نظر انداز کر دیتا ہے گویا ان کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ اس کے سامنے آپ قرآن و حدیث کے صریح ارشادات پیش کیجئے، مگر وہ ایسے سرسری جوابات دے کر بات کو ٹال دے گا کہ آپ حیرت میں یہ سوچتے رہ جائیں گے کہ "دوبارہ ان کا کوئی جواب بھی دوں یا نہیں" اس کی وجہ یہی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو دنیا سے اوپر اٹھا نہیں سکا۔ اس کے ایمان بالآخرۃ نے

اس کی روح کو ابھی تک دنیا کی کثافتوں سے پاک نہیں کیا ۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کی حسیات انھیں معاملات میں زیادہ کام کریں گی جہاں وہ عملاً پڑا ہوا ہے ۔ مگر جس دنیا سے وہ دور ہے جہاں اس نے ابھی تک اپنے آپ کو پہنچایا نہیں اس کی حقیقتوں کو وہ کیسے گرفت کر سکتا ہے اور ان کے ذکر سے کس طرح اس کے اندر ہل چل برپا ہو سکتی ہے —— شخصیت پرستی کسی کے ذہن کی تمام کھڑکیاں بند کر دے تو حق کی روشنی اس کے اندر کس راہ سے داخل ہوگی ۔

اگر آپ چند آدمیوں کے ساتھ بیٹھے ہوں اور یکایک تار آئے کہ آپ کے اکلوتے لڑکے کا انتقال ہو گیا، تو دوسرے لوگ جیسے پہلے تھے ویسے اب بھی رہیں گے مگر آپ تڑپ اٹھیں گے ۔ آپ کی حالت بالکل بدل جائے گی ۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ جس شخص کے متعلق خبر آئی ہے اس کی خبر سننے کے لئے پہلے سے آپ کے دل کے تمام گوشے خالی تھے اس لئے وہ سیدھی آپ کے دل میں گھس گئی ۔ اس کے برعکس بقیہ لوگوں کے دل میں اس نے جانے کا راستہ نہیں پایا کیوں کہ ان کے دل کچھ دوسرے لوگوں کی محبت سے بھرے ہوئے تھے ۔ ٹھیک اسی طرح جب قرآن کی "تلاوت" ہو رہی ہو ۔ جب کلمات حکمت سنائے جا رہے ہوں، جب کوئی منادی کرنے والا ایمان کی منادی کر رہا ہو، تو اس کی آواز انھیں لوگوں کے دل سے ٹکرائے گی جنھوں نے اپنا سینہ اس کے لئے کھلا رکھا ہو ۔ اور جس نے اپنے اندرون کو دوسری پرستشوں کا گودام بنا رکھا ہے اس پر کوئی آواز اثر نہیں کر سکتی، وہ تو اسی وقت سنے گا جب صاعقۂ عظیم اس کے کان کے پردے پھاڑ دے ۔

۳۔ زہد کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ وہ آپ کے لوازم زندگی میں کمی کر دیتا ہے ۔ ہر با مقصد آدمی فطرتاً ایک تضاد میں مبتلا کیا گیا ہے ۔ ایک طرف اس کے جسم کے تقاضے ہیں جن کی فہرست کا کوئی شمار نہیں ۔ اور دوسری طرف اس کا مقصد ہے جو تقاضا کرتا ہے کہ ساری توجہ اسی کی طرف لگا دی جائے ۔ اس تضاد کو ہم بالکلیہ ختم نہیں کر سکتے ہماری بہترین عقل مندی یہ ہے کہ ہم اس میں کمی کی کوشش کریں ۔ دنیا کے تمام وہ لوگ جنھوں نے کوئی بڑا کام انجام دیا ہے، وہ اپنے مشن کی تکمیل کے لئے مجبور تھے کہ اپنے لوازم حیات میں ہر ممکن حد تک کمی کریں ۔ آپ کے سامنے بھی ایک عظیم مشن —— دنیا کے سامنے حق کی گواہی دینے کا مشن، ہے ۔ اس لئے اگر آپ اسے تکمیل تک پہنچانا چاہتے ہیں تو آپ کو بھی اسی اصول پر عمل کرنا ہوگا ۔ البتہ اس میں اسلام کے اپنے نظریۂ زندگی کا لحاظ ضروری ہے ۔ میں ہرگز یہ نہیں کہوں گا کہ آپ نیوٹن کی طرح شادی نہ کریں ۔ مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ آپ نیوٹن کی طرح سگرٹ نہ پئیں ۔ کیوں کہ شادی ایک حقیقی ضرورت ہے جب کہ تمباکو، انسان کی فطری ضرورتوں پر ایک مصنوعی ضرورت کا اضافہ ہے ۔

لوازم حیات میں کمی کا یہ پہلو تو بالکل واضح ہے کہ وہ آپ کو اپنے مقصد میں زیادہ حصہ لینے کے قابل بناتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ آپ کی دیگر ضروریات کی فہرست جتنی مختصر ہو گی، اسی کے بقدر آپ اپنے مقصد کے کاموں کے لئے زیادہ فارغ ہوں گے ۔ خلا کا ایک مسافر راکٹ میں بیٹھ کر تین سو میل فی منٹ کی رفتار سے اڑتا ہے ۔ مگر اس سفر میں جو بھاری ملبوسات اور مختلف قسم کے آلات سے وہ لیس ہوتا ہے، ان کو اپنے جسم پر لادے ہوئے زمین پر پیدل چلنا ہو تو وہ چند میل بھی مشکل سے اپنے آپ کو گھسیٹ کر لے جا سکے گا ۔ اسی طرح اگر آپ نے اپنی زندگی کو حقیقی ضروریات

کے ماسوا اور بہت سی مزید قوتوں کا عادی بنا لیا ہے تو ان کو لئے ہوئے آپ زمین پر نہیں چل سکتے۔ جب تک یہ لوازم آپ کے گرد مہیا ہوں آپ متحرک نظر آئیں گے۔ مگر جہاں یہ لوازم رخصت ہوئے، آپ اسی طرح اپنے آپ کو بے بس پائیں گے جیسے مغلیہ سلطنت کے آخری شہزادے پالکی کی سواری کا عادی ہونے کی وجہ سے غدر کے وقت بھاگ نہیں سکے اور ان کے دشمنوں نے محل میں گھس کر ان کے بستروں پر انہیں قتل کیا۔

مگر لوازم حیات کو مختصر کرنے کا ایک اور فائدہ ہے جو اسلامی اعتبار سے اس سے زیادہ قیمتی ہے۔ وہ یہ کہ اس طرح کے لوازم میں جتنی کمی ہوگی اسی کے بقدر آپ کے اندر زیادہ سوز اور اخلاص پیدا ہوگا۔ اگر آپ کو ایک ہزار میل دور سے آکر یہاں تقریر کرنی ہے تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ میرے لئے اسپیشل سیلون میں سفر کرنا ضروری ہے تاکہ جب میں اسٹیشن پر اتروں تو بالکل تازہ دم رہوں اور جلسہ گاہ پہنچ کر اپنے موضوع پر اچھی طرح بول سکوں، بیشک آپ کے لئے ایسا کرنا جائز ہے۔ کسی کو جرأت نہیں کہ اس کے خلاف فتویٰ دے سکے۔ بلکہ بہت سے ظاہر بینوں کو آپ کا زور خطابت اس دلیل کی معقولیت ماننے پر یہاں تک مجبور کر سکتا ہے کہ وہ آپ کے لئے مخصوص سیلون میں سفر کرنا ہی افضل سمجھنے لگیں کیونکہ اس کے بغیر اتنی شاندار تقریر وجود میں نہیں آسکتی تھی۔ مگر میں کہوں گا کہ خدا کو شاندار تقریر مطلوب نہیں ہے۔ اس کو تو آپ کے دل کے ٹکڑے درکار ہیں۔ اور وہ تقریر جس میں آپ کے دل کے ٹکڑے الفاظ بن کر نکلیں، جو دوسروں کو متاثر کرنے سے پہلے خود آپ کو رلا دے، جو تقریر نہ ہو بلکہ درد اور تڑپ کا ایک مجسم اظہار ہو۔ وہ تو اسی وقت ہوتا ہے جب کہ آپ بے آرامی سے سفر کر کے یہاں پہنچے ہوں جس میں یہاں تک اپنے آپ کو لانے میں آپ نے مشقت اٹھائی ہے جو آپ کے لئے محض سفر نہ ہو بلکہ خدا کی طرف بڑھنے کا ایک مجاہدہ ہو۔ ایسی ہی ایک زبان سے کلمات درد نکل سکتے ہیں۔ دردمند کلام، خدا کا ایک الہام ہے جو براہ راست عالم الغیب والشہادۃ کی طرف سے آپ کے اوپر القا کیا جاتا ہے۔ اور قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کا الہام ایک "قول ثقیل" ہے جو کسی ایسے قلب ہی پر اتر سکتا ہے جو "وطأ شدیدً" کے مرحلے سے گزر چکا ہو (سورۂ مزمل)

امام احمد اور امام ترمذی کی روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بار اپنے رسول کو سونے کی عظیم ترین کان دینے کی پیش کش کی، رسول نے جواب دیا، خدایا نہیں، بلکہ مجھے اس طرح رکھئے کہ کسی روز کھاؤں اور کسی روز بھوکا رہوں۔ تاکہ جب میں کھاؤں تو آپ کا شکر ادا کروں اور جب بھوک ستائے تو آپ کے سامنے گریہ و زاری کروں۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی حالات کے بغیر اپنے اندر کیفیات پیدا نہیں کر سکتا۔ جو حالات سے خالی ہو جائے وہ کیفیات سے بھی خالی ہو جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ سختی اور مشقت کے لمحات اپنے اندر دو طرفہ فائدہ رکھتے ہیں۔ ایک طرف ان سے وہ "درد" حاصل ہوتا ہے جو دل کی زندگی ہے، جو آپ کو احساس حیات سے آشنا کرتا ہے۔ جو انسان کی اندرونی صلاحیتوں کو بیدار کرنے والا ہے۔ دوسری طرف مشقت کے لمحات ہی آپ کی راحت کے لمحات کو اسلامی رنگ دیتے ہیں۔ وہ آدمی کو اس قابل بناتے ہیں کہ جب وہ ایسی کوئی چیز دیکھے تو اس کا دل شکر کے جذبے سے لبریز ہو جائے۔ جو درد سے خالی ہے وہ زندگی سے خالی ہے، اور جو زندگی سے محروم ہو وہ کیسے کوئی بات سنے گا اور کیسے کوئی بات قبول کرے گا۔

۴۔ زہد فی الدنیا کا ایک اور پہلو ہے۔ وہ یہ کہ ایسا آدمی حرام اور مشتبہ چیزوں میں پڑنے سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ناجائز چیزوں کے ارتکاب سے وہی شخص بچ سکتا ہے جو جائز حدود میں بھی بچ کر چلتا ہے۔ جو تمام "جائز" چیزوں کو اپنا ضروری حق سمجھ لے، ایسے آدمی کے لئے ہر وقت خطرہ ہے کہ وہ کسی حرام کام میں پڑ جائے۔ حدیث کے الفاظ میں، ہر بادشاہ کی ایک ممنوعہ چراگاہ ہوتی ہے اور خدا کی چراگاہ وہ چیزیں ہیں جن کو اس نے حرام قرار دیا ہے۔ جو شخص سرحد تک اپنے مویشی چراتا ہوا پہنچ جائے اس کے لئے ہر آن یہ خطرہ ہے کہ مویشی کہیں چراگاہ کے اندر نہ گھس جائیں۔ (متفق علیہ)

عورتوں کے لئے زیب و زینت بالکل جائز ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ ہر وہ گھر جس نے اس جواز کو اپنے لئے کھلا دروازہ سمجھ لیا ہے، آج اس کے یہاں غیر ساتر ملبوسات اس طرح استعمال ہونے لگے ہیں کہ اب لوگوں کو شاید ان کے ممنوع ہونے کا بھی احساس نہیں رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کل کے بے دین گھرانے اور اسلام پسند گھرانے میں بس اتنا ہی فرق رہ گیا ہے کہ ہمارے گھروں کی عورتیں اور لڑکیاں خاندان اور رشتہ کے لوگوں اور دوسرے ملنے والوں کے سامنے اپنی غیر شرعی پوشاک کا مظاہرہ کرتی ہیں اور دوسرے گھرانوں کی عورتیں اپنے اس فتنہ کو لئے ہوئے بازاروں اور سڑکوں پر نکل آئی ہیں۔

اسی طرح سرکاری ملازمتوں میں جو لوگ ترقی کرتے ہیں یا بڑے عہدے حاصل کرتے ہیں وہ ضمیر کی قربانی دے کر ہی ان مناصب تک پہنچتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں کسی اونچی کرسی کو اپنی نشست گاہ بنانے کے لئے جو لیاقت درکار ہے اس میں سے ایک ضروری چیز یہ بھی ہے کہ دین کو آپ اپنے اندر سے کھرچ کر نکال دیں۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بادشاہوں سے تعلق رکھنے والوں کے بارے میں کہا تھا "اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، تم ان کی دنیا میں سے جتنا پاؤ گے اس سے زیادہ وہ تمہارے دین میں سے لے لیں گے" یہ بات جدید بادشاہت کے بارے میں بھی اسی طرح صحیح ہے جیسے وہ قدیم بادشاہت کے بارے میں صحیح تھی۔ اس فرق کے ساتھ کہ پہلے وہ دین کا زیادہ حصہ لیتے تھے اور اب وہ آپ کا کل دین لے لیتے ہیں۔

ایک بڑے تاجر نے ایک مرتبہ کہا کہ موجودہ زمانے میں بالکل جائز طریقہ پر کوئی بڑا کاروبار نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں آپ کی آمدنی ایک خاص حد سے آگے بڑھی، بے شمار قوانین آپ کو چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں۔ آپ مجبور ہوتے ہیں کہ غلط طریقے سے کام کریں۔ ورنہ آپ کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔ "اتنے بڑے کاروبار کا آپ کو مکلف کس نے کیا ہے" جواب دینے والے نے جواب دیا۔ مگر موجودہ انسان کو اس قسم کے جوابات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس نے تو یہ طے کر رکھا ہے کہ وہ اپنے امکان بھر ان تمام نعمتوں کو حاصل کرے گا جو خدا نے زمین پر پیدا کی ہیں۔ اس لئے یہ بھی ضروری ہو گیا ہے کہ وہ ان تمام چیزوں کو اپنے لئے حلال کرے جس کو خدا نے حرام ٹھیرایا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ترقی کا ہر واقعہ جو آپ کو اپنے گرد و پیش نظر آتا ہے، وہ صرف حکمت زہد سے محرومی کا ثبوت نہیں ہے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی بڑھتے بڑھتے خدا کی حرام کی ہوئی چراگاہ میں گھس گیا ہے۔ اس کے بغیر وہ اتنی غیر معمولی فربہی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

ممکن ہے یہ باتیں سن کر آپ کہیں کہ اسلام کا مطلب اگر یہی ہے تو اس کا پانا بہت مشکل ہے۔ بیشک اسلام کا

پانا بہت مشکل ہے مگر وہ خدا کی مدد سے آسان ہو سکتا ہے۔ حضرت مسیحؑ نے جب روح دین کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "میں تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہی میں داخل ہو" تو ان کے شاگرد یہ سن کر بہت اچنبھے میں پڑ گئے اور کہنے لگے کہ پھر کون نجات پا سکتا ہے۔ آپ نے ان کی طرف دیکھ کر فرمایا ــــــ "یہ آدمیوں سے تو نہیں ہو سکتا لیکن خدا سے سب کچھ ہو سکتا ہے" اگر آپ اسلام کو اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتے ہیں، اگر آپ وہ حیات طیبہ حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے تو اس کو پانے کی صورت یہی ہے کہ آپ اسے خدا سے مانگیں۔ دوسری تمام چیزوں کی طرح یہ سب سے قیمتی چیز بھی آپ کو خدا ہی سے ملے گی۔ کہیں اور سے آپ اسے حاصل نہیں کر سکتے۔ مگر یاد رکھئے خدا سے مانگنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ دعا کے کچھ مقرر الفاظ یاد کر لیں اور اسے اپنی زبان سے دہرا دیا کریں ایک عیسائی عالم کے الفاظ میں:۔

God is not a Cosmic bell-boy for whom
we can press a button to get things.

خدا سے مانگنے کی اصل زبان وہ نہیں جو لفظوں کی صورت میں اپنے مطالبات کا اظہار کرتی ہے۔ اس سے مانگنے کی زبان آپ کا قلب ہے۔ آپ اپنی حقیقی زندگی سے جو کچھ چاہ رہے ہیں وہی دراصل آپ اپنے رب سے مانگتے ہیں۔ خدا آپ کے لفظوں کو نہیں دیکھتا۔ وہ خود آپ کو دیکھتا ہے۔ آپ اپنے اصلی وجود میں جس چیز کے لئے بے قرار ہوں اپنے رب سے آپ اسی چیز کے طلب گار ہیں۔

ایک بچہ اپنی ماں سے روٹی مانگے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ ماں اس کے ہاتھ میں انگارہ رکھ دے۔ خدا اپنے بندوں پر اس سے زیادہ مہربان ہے۔ یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ آپ خدا سے خشیت مانگیں اور وہ آپ کو قساوت دیدے۔ آپ خدا کی یاد مانگیں اور وہ آپ کو نسیان میں مبتلا کر دے۔ آپ آخرت کی تڑپ مانگیں اور وہ آپ کو دنیا کی محبت میں ڈال دے، آپ کیفیت سے بھری ہوئی دینداری مانگیں اور وہ آپ کو بے روح دینداری میں پڑا رہنے دے۔ آپ حق پرستی مانگیں اور وہ آپ کو شخصیت پرستی کی تاریک کوٹھری میں بند کر دے ــ آپ کی زندگی میں آپ کی مطلوب چیز کا نہ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ نے ابھی تک اس کو مانگا ہی نہیں۔ اگر آپ کو دودھ خریدنا ہو اور آپ چھلنی لے کر بازار جائیں تو ظاہر ہے کہ پیسے خرچ کرنے کے باوجود آپ خالی ہاتھ واپس لوٹیں گے۔ اسی طرح اگر زبان سے آپ دعا کے کلمات دہرا رہے ہوں مگر آپ کی اصل ہستی کسی اور طرف متوجہ ہو تو میں کہوں گا کہ نہ آپ نے مانگا تھا اور نہ آپ کو ملا۔ جو مانگے وہ کبھی محروم نہیں رہ سکتا۔ یاد رکھئے، یہ مالک کائنات کی غیرت کے خلاف ہے کہ وہ کسی بندے کو اس حال میں رہنے دے کہ قیامت میں جب خدا سے اس کا سامنا ہو تو وہ اپنے رب کو حسرت کی نظر سے دیکھے۔ وہ کہے کہ خدایا میں نے تجھ سے ایک چیز مانگی تھی مگر تو نے مجھے نہ دی۔ بخدا یہ ناممکن ہے، یہ ناممکن ہے، یہ ناممکن ہے۔ کائنات کا مالک تو ہر صبح و شام اپنے سارے خزانے کے ساتھ آپ کے قریب ترین آ کر آواز دیتا ہے، "کون ہے جو مجھ سے مانگے تا کہ میں اسے دوں"، مگر جنھیں لینا ہے وہ سوئے ہوں تو اس میں دینے والے کا کیا قصور۔

ــــــ تقریر حلقہ وار اجتماع جماعت اسلامی ہند بمقام جون پور۔ ۱۲ نومبر ۱۹۶۱

زلزلہ قیامت

از
مولانا وحید الدین خاں

جس کو پڑھ کر دل دہل اٹھیں
اور آنکھیں آنسو بہائیں

صفحات ۶۴ قیمت تین روپے

عقلیات اسلام

از
مولانا وحید الدین خاں

اسلام کے خلاف جدید اعتراضات کا
علمی و عقلی جواب

صفحات ۴۸ قیمت دو روپے

مکتبہ الرسالہ • جمعیۃ بلڈنگ • قاسم جان اسٹریٹ • دہلی ۱۱۰۰۰۶

تعمیر ملت

از

مولانا وحید الدین خاں

صفحات ۴۸

قیمت دو روپے

ظہور اسلام

از

مولانا وحید الدین خاں

قیمت بارہ روپے

مکتبہ الرسالہ

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

الاسلام

دوسرا ایڈیشن

از

مولانا وحید الدین خاں

قیمت ۱۲ روپے

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ

قاسم جان اسٹریٹ دہلی

دین کیا ہے

از

مولانا وحید الدین خاں

قیمت

ایک روپیہ پچاس پیسے

مکتبہ الرسالہ

دہلی ۶

فارم IV

دیکھو رول نمبر ۸

ماہنامہ الرسالہ۔ جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی

۱۔ مقام اشاعت جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

۲۔ وقفۂ اشاعت ماہانہ

۳۔ نام پرنٹر (طابع) ثانی اثنین خاں
قومیت ہندوستانی
پتہ جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

۴۔ نام پبلشر (ناشر) ثانی اثنین خاں
قومیت ہندوستانی
پتہ جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

۵۔ نام ایڈیٹر (مدیر مسئول) ثانی اثنین خاں
قومیت ہندوستانی
پتہ جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی ۶

۶۔ نام اور پتہ مالک رسالہ ثانی اثنین خاں
جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

میں ثانی اثنین خاں تصدیق کرتا ہوں کہ جو تفصیلات اوپر دی گئی ہیں، میرے علم و یقین کے مطابق صحیح ہیں۔

ثانی اثنین خاں
یکم مارچ ۱۹۷۹ء

ملی تعمیر کا کام

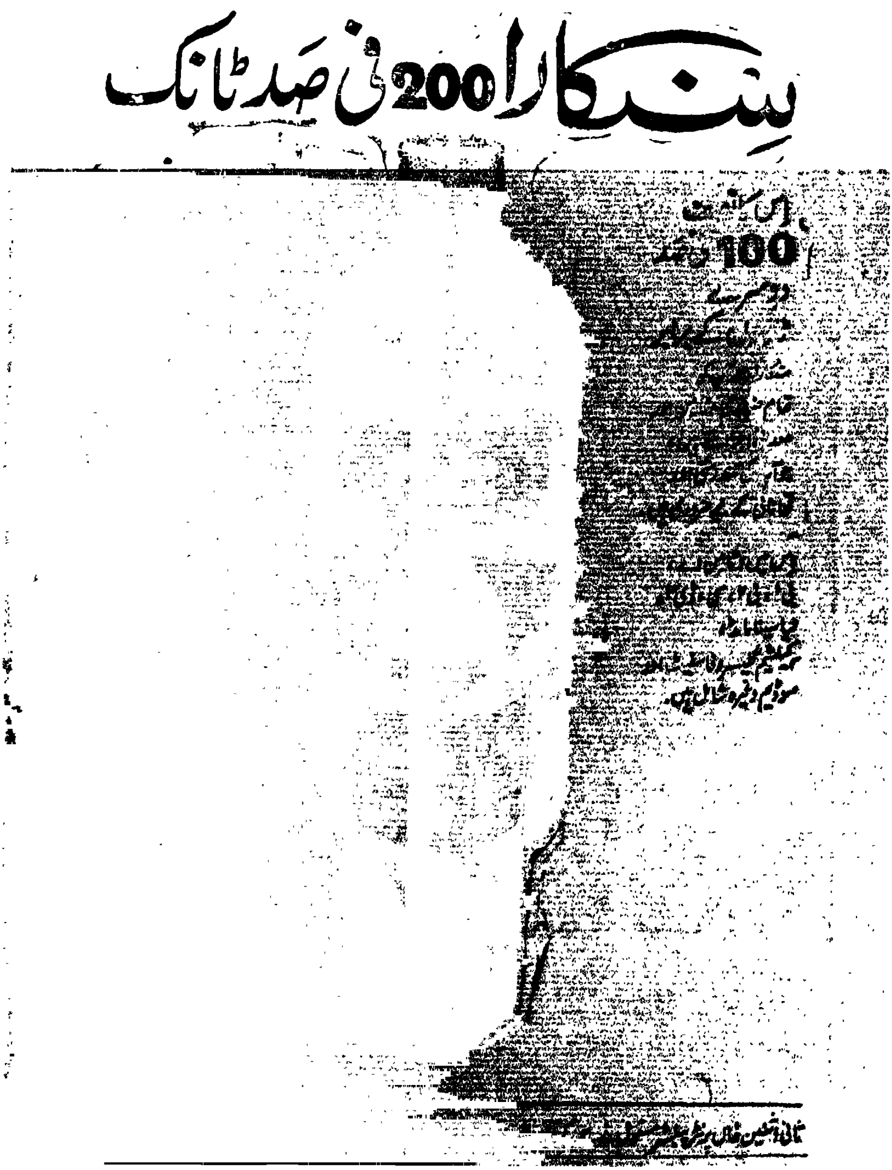
سب سے پہلے
ملت کے افراد میں
شعور پیدا کرنے کا کام ہے
اس کی
بہترین صورت یہ ہے کہ
الرسالہ کو
ایک ایک بستی اور
ایک ایک گھر میں
پہنچایا جائے۔

Regd. No. D. (D) 532
Regd. R.N. No. 28822/76
Issue No XXVIII

March 1979

Al-Risala Monthly

Jamiat Building, Qasimjan Sreet, DELHI-110006 (INDIA)



الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

حسین پھول اپنی خاموش زبان میں یہ کہہ رہے ہیں کہ
—— انسانوں کے درمیان پھول بن کر رہو

شمارہ ۲۹	زر تعاون سالانہ	۲۴ روپے	قیمت فی پرچہ	
	خصوصی تعاون سالانہ	ایک سو روپے		
اپریل ۱۹۷۹	بیرونی ممالک سے	۱۵ ڈالر امریکی	دو روپے	

اسلام دین فطرت

از

مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی 6

سال اشاعت ۱۹۷۹ قیمت دو روپے

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کوئی آدمی دولت کے لئے جیتا ہے، کوئی عزت کے لئے، کوئی اقتدار کے لئے۔ ہر آدمی، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، کسی نہ کسی چیز میں جی رہا ہے۔ ہر آدمی کی زندگی میں کوئی ایسی چیز ہوتی ہے جس کے سہارے وہ زندہ ہو۔ جس کو وہ سب سے زیادہ قابل لحاظ سمجھے۔ جس کو حاصل کرنے کا خواب دیکھے۔ جس کے لئے دوڑ دھوپ کرے۔ اس کی امیدیں اور اس کے اندیشے، اس کی تمنائیں اور اس کی حسرتیں سب سے زیادہ اس سے وابستہ ہوں۔ اس کو پاکر وہ سب سے زیادہ خوش ہو اور اس کے چھننے کا ڈر ہو تو وہ سب سے زیادہ غمگین ہو جائے۔

یہی دین ہے۔ اس معنی میں ہر شخص کا ایک دین ہوتا ہے۔ کوئی بھی شخص اس قسم کے ایک دین سے خالی نہیں۔ آدمی جس چیز کو اپنا "دین" بنائے اسی کے مطابق اس کی پوری زندگی بنتی ہے۔ اس کی سوچ اور جذبات، اس کا لین دین، اس کے انسانی تعلقات، اس کی سرگرمیاں اور کارروائیاں سب اسی کے گرد گھومتی ہیں۔ وہ اس کام کو کرتا ہے جس سے اس کا مقصود ملنے والا ہو، اس کام سے دور بھاگتا ہے جس سے اپنے مقصود کو نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ ہو۔ یہی دین اس کا حاکم ہوتا ہے۔ سوتے جاگتے ہر حال میں وہ اسی دین کو پکڑے رہتا ہے۔ اس کی زندگی کا کوئی گوشہ اس کے اثر سے خالی نہیں ہوتا۔

یہ دین خدا کا بھی ہو سکتا ہے اور غیر خدا کا بھی۔ موجودہ دنیا میں یہی امتحان ہے کہ آدمی کون سا دین اختیار کرتا ہے۔ خدا کا یا غیر خدا کا۔ یہاں ہر شخص کو آزادی ہے۔ یہاں غیر خدا کے دین کو پکڑ کر بھی آدمی عزت اور کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ مگر یہ کامیابی بالکل وقتی ہوگی۔ وہ زیادہ سے زیادہ موت تک آدمی کا ساتھ دے گی اس کے بعد اگلی مستقل دنیا میں وہ اس حال میں اٹھے گا کہ وہ بالکل خالی ہاتھ ہوگا۔ اگلی دنیا میں خدا اپنے قدرت اور جلال کے ساتھ ظاہر ہو چکا ہوگا۔ اس لئے وہاں عزت و کامیابی صرف اس شخص کے لئے ہوگی جس نے موجودہ دنیا میں خدا کے دین کو اپنا دین بنایا ہوگا۔ جو کسی دوسرے دین کو اختیار کرے گا، اس کے لئے موت کے بعد آنے والی دنیا میں ناکامی و بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

خدا کا دین ہی انسان کے لئے فطری اور حقیقی دین ہے۔ یہ حقیقت ڈر کے لمحات میں کھل جاتی ہے۔ آدمی خواہ کوئی بھی دین اختیار کرے۔ خواہ وہ کوئی بھی سہارا پکڑے۔ مگر جب انسان کی زندگی کا جہاز کسی بھنور میں پھنستا ہے جب اس پر کوئی نازک لمحہ آجاتا ہے، اس وقت اس کو تمام چیزیں بھول جاتی ہیں۔ اس وقت وہ بے اختیار ہو کر ایک خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ یہ تجربہ جو کبھی نہ کبھی ہر شخص کی زندگی میں گزرتا ہے یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ حقیقی دین صرف خدا کا دین ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ اسی کو اپنی زندگی کا دین بنائے۔ اس کے سوا وہ جس دین کو بھی پکڑے گا وہ وقت آنے پر اسی طرح بے حقیقت ثابت ہوگا جیسے آج نازک لمحات میں تمام چیزیں بے حقیقت ثابت ہو جاتی ہیں۔ آج کے حالات میں فطرت کی پکار آئندہ آنے والی مستقل دنیا کا ایک اشارہ ہے۔ وہی شخص کامیاب ہے جو اس اشارہ پر کان لگائے اور اپنی زندگی کو اس کے مطابق بنالے۔

آدمی کا امتحان

پہلا انسان جو خدا نے پیدا کیا وہ آدم تھے۔ اس وقت خدا کی پیدا کی ہوئی دو مخلوقات اور تھیں۔ ایک فرشتے دوسرے جن۔ خدا نے فرشتوں اور جنوں کو حکم دیا کہ تم سب آدم کے آگے سجدہ کرو۔ فرشتے خدا کا حکم سنتے ہی سجدہ میں گر پڑے۔ مگر ابلیس، جو جنوں کا سردار تھا، اس نے سجدہ نہیں کیا۔ خدا نے کہا: تم نے سجدہ کیوں نہیں کیا جب کہ میں نے اس کا حکم دیا تھا۔ ابلیس بولا: میں آدم سے بہتر ہوں۔ تو نے آدم کو مٹی سے بنایا ہے اور مجھ کو آگ سے (اعراف ۱۲) ابلیس خدا کو سجدہ کرنے کے لئے تیار تھا۔ مگر وہ آدم کو سجدہ کرنے پر راضی نہ ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ملعون اور جہنمی قرار دے دیا گیا۔

یہی معرکہ آدم کی اولاد میں آج بھی جاری ہے۔ ایک طرف فرشتے ہیں جو آدمی کو تسلیم اور اعتراف کا سبق دے رہے ہیں۔ دوسری طرف ابلیس ہے جو انسان کی رگوں میں تیرتا ہے اور آدمی کو اکساتا ہے کہ وہ خود پسندی (انا خیر منہ) کا طریقہ اختیار کرے اور اس کا ہم مسلک بن جائے۔ اس طرح ہماری زندگی میں دوبارہ بہت بڑے پیمانہ پر وہی کہانی دہرائی جارہی ہے جو پہلے انسان کی پیدائش کے وقت ابتداءً پیش آئی تھی۔ دنیا میں زندگی گزارتے ہوئے ہم کبھی نہ کبھی ایک "آدم" سے دوچار ہوتے ہیں۔ ہمارا سابقہ کسی نہ کسی انسان سے پڑتا ہے اور اس کا کوئی نہ کوئی حق ہمارے اوپر عائد ہوتا ہے، خواہ وہ ایک اچھے بول کی صورت میں کیوں نہ ہو۔ ایسے ہر موقع پر خدا اپنی خاموش زبان میں کہہ رہا ہوتا ہے کہ میرے حکم کی تعمیل میں اس آدم کے سامنے جھک جاؤ۔ اب جو لوگ فرشتوں کی روش کو اختیار کریں اور اپنے بارے میں خدا کے حکم کو پہچان کر اپنے آپ کو اس کے آگے ڈال دیں، وہ خدا کے وفادار بندے ہیں۔ وہ ابدی جنتوں میں جگہ پائیں گے۔ اور جو لوگ ابلیس کے طریقے کو اختیار کریں اور اپنی بڑائی کی خاطر دوسرے کے آگے جھکنے کے لئے تیار نہ ہوں، وہ خدا کے باغی لوگ ہیں۔ وہ ابلیس کے ساتھ جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے تاکہ وہاں ابدی طور پر جلتے رہیں:

> شیطان بولا: جیسا تو نے مجھے بدراہ کیا ہے، میں تیری سیدھی راہ پر انسانوں کی تاک میں بیٹھوں گا۔ میں ان پر آؤں گا آگے سے اور پیچھے سے، دائیں سے اور بائیں سے۔ اور تو ان میں سے اکثر کو شکرگزار نہ پائے گا۔ اللہ نے کہا: نکل یہاں سے ذلیل و خوار ہو کر۔ ان میں سے جو کوئی تیری راہ چلا تو میں تم سب سے دوزخ کو بھر دوں گا (اعراف ۱۶-۱۸)

انسان خدا کا بندہ ہے۔ اس کو اصل سجدہ خدا ہی کو کرنا ہے۔ مگر دنیا کی زندگی میں وہ جن لوگوں کے درمیان رہتا ہے، ان کے مقابلہ میں بار بار اس پر کسی نہ کسی کا حق آتا ہے اور بار بار خدا کا حکم ہوتا ہے کہ یہاں تم اس "آدم" کے سامنے جھک جاؤ۔ یہی آدمی کا اصل امتحان ہے۔ خدا کو سجدہ کرنے کے لئے آدمی آسانی سے تیار ہو جاتا ہے۔ مگر جہاں اس کو کسی انسان کا اعتراف کرنا ہو، جہاں کسی انسان کے سامنے جھکنے کا سوال ہو وہاں فوراً

اس کے اندر ابلیس والی نفسیات جاگ اٹھتی ہیں ۔" میں اس سے بہتر ہوں، میں کیوں اس کے سامنے جھکوں" یہ احساس، شعوری یا غیر شعوری طور پر، اس کے لئے رکاوٹ بن جاتا ہے ۔ وہ جس خدا کو سجدہ کر رہا ہوتا ہے، اس خدا کے حکم کے باوجود "آدم" کے آگے جھکنے سے انکار کر دیتا ہے ۔

دو آدمیوں کے درمیان ایک معاملہ پڑتا ہے ۔ اس معاملہ میں ایک حق پر ہوتا ہے اور دوسرا ناحق پر۔ جو شخص حق پر ہے وہ گویا دوسرے شخص کے لئے وقت کا "آدم" ہے ۔ دو آدمیوں کے درمیان اس صورت حال کا پیدا ہونا ہی خدا کا یہ حکم آجاتا ہے کہ میرے بنائے ہوئے اس آدم کے سامنے میری خاطر جھک جاؤ ۔ اب جو شخص اپنے حریف کے حق کو مانتے ہوئے اس کے سامنے اپنے آپ کو جھکا دے، اس نے فرشتوں کی پیروی کی ۔ اور جس شخص کے لئے اس کی "میں" حق کے اعتراف میں مانع ہو جائے، جو اس ذہن کے تحت حق دار کے سامنے جھکنے سے انکار کر دے کہ میری پوزیشن مضبوط ہے، یہ شخص میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتا، اس نے ابلیس کی پیروی کی ۔ خدا کے سامنے سجدہ کرنا اس کی نجات کا سبب نہیں بن سکتا ۔ خدا کے آگے سجدہ صرف اس شخص کا معتبر ہے جو خدا کے حکم کی تعمیل میں اس کے بنائے ہوئے "آدم" کے سامنے بھی جھکنے پر راضی ہو جائے ۔ جو یہ کہے کہ میں خدا کے لئے سجدہ کروں گا مگر آدم کے سامنے نہیں جھکوں گا، وہ ابلیس کا بھائی ہے ۔ اس کے سجدہ کی خدا کے یہاں کوئی قیمت نہیں ۔ اس نے "آدم" کے سامنے جھکنے سے انکار کر کے کبر کا مظاہرہ کیا ہے ۔ اور جو اپنے اندر کبر کی نفسیات کی پرورش کرے اس کا کوئی عمل خدا کبھی قبول نہیں کرتا ۔

پہلے انسان (آدم) کا قصہ خدا کے سامنے براہ راست پیش آیا تھا ۔ اب دنیا کی زندگی میں ہر آن یہی قصہ خدا کے غیب میں پیش آرہا ہے ۔ آج خدا ہمارے سامنے عیاناً موجود نہیں ہے ۔ آج جو چیز خدا کی جگہ پر ہے وہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کا طریقہ ہے اور اسی کے ساتھ آدمی کا اپنا ضمیر ہے جو اندر سے اس کو آواز دیتا ہے ہر روز جب کسی انسان سے ہمارا سابقہ پیش آتا ہے اور یہ تقاضہ ہوتا ہے کہ ہم اس کے حق کا اعتراف کریں، خواہ یہ تقاضہ لفظی اعتراف کا ہو یا کسی عمل کا، اس وقت گویا خاموش زبان میں خدا کا حکم ہمارے پاس آجاتا ہے ۔ خدا کہتا ہے کہ اس "آدم" کا جو حق تمہارے اوپر آتا ہے اس کو ادا کرو ۔ بالفاظ دیگر، اس کے سامنے جھک جاؤ ۔ اگر لفظی اعتراف کا معاملہ ہے تو لفظوں میں اس کی صداقت کا اعتراف کرو ۔ اگر عملی حق کا معاملہ ہے تو عملی طور پر اس کا حق ادا کرو ۔ ایسے موقع پر جو لوگ خدا کی خاموش آواز پر کان لگائیں اور فوراً اپنے آپ کو اس کی تعمیل کے لئے پیش کر دیں، وہ امتحان میں سچے اترے ۔ اور جو لوگ "میرا درجہ بڑا ہے" "میں اس سے بہتر ہوں" "میں زیادہ طاقتور ہوں" جیسی نفسیات میں مبتلا ہو جائیں اور اپنے "آدم" کے آگے جھکنے سے انکار کر دیں، وہ امتحان میں پورے نہیں اترے ۔ پہلی قسم کے لوگوں کے لئے فرشتوں والا انجام ہے اور دوسری قسم کے لوگوں کے لئے ابلیس والا انجام۔ انسان سے اصلاً جو چیز مطلوب ہے وہ یہی ہے کہ وہ خدا کے سامنے سجدہ کرے ۔ مگر کوئی شخص حقیقتہً خدا کا ساجد بنا یا نہیں، اس کا امتحان اس کو "آدم" کے سامنے جھک کر دیتا ہے ۔ خدا کا ساجد اور عابد وہی ہے جو خدا کے

حکم کو مان کر اپنے حق دار انسان کے سامنے جھک جائے۔ جو شخص خدا کے سامنے سجدہ کرے اور جب انسان سے معاملہ پڑے تو اس کا حق نہ پہچانے اور گھمنڈ اور بے انصافی کا طریقہ اختیار کرے، وہ خدا کا ساجد بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ جہاں اس کا خدا اس کے ساجد ہونے کا امتحان لے رہا تھا وہاں وہ اپنے آپ کو ساجد ثابت نہ کر سکا۔

خدا کو سجدہ کرنے کے لئے آدمی آسانی سے تیار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ خدا کے مقابلہ میں کسی کے اندر "میں اس سے بڑا ہوں" کی نفسیات نہیں ہوتی۔ جب کہ انسان کے مقابلہ میں طرح طرح کی نفسیاتی گرہیں پڑی ہوئی ہوتی ہیں جو ایک انسان کے لئے دوسرے انسان کے اعتراف میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ خدا کسی انسان کا حریف نہیں۔ جب کہ ایک انسان بہت جلد دوسرے انسان کو اپنا حریف سمجھ لیتا ہے اور اس کے مقابلہ میں جھکنے کو اپنے لئے عزت کا سوال بنا لیتا ہے۔ خدا کے مقابلہ میں آدمی کی نفسیات احتیاج کی نفسیات ہوتی ہے۔ خدا صرف دینے والا ہے۔ اس کو کسی سے لینے کی ضرورت نہیں۔ مگر انسان کا معاملہ مختلف ہے۔ یہاں جب ایک شخص دوسرے شخص کے سامنے جھکتا ہے تو وہ اس کو کچھ نہ کچھ دیتا ہے۔ کبھی اچھے الفاظ، کبھی دوسرے کی حقانیت کا اعتراف، کبھی اس کا مالی یا مادی حق ادا کرنا، کبھی کسی کو افضل پاکر خود پیچھے ہٹ جانا اور اس کو آگے بڑھانا، کبھی کسی کی کمزوری پر قابو پا لینے کے باوجود اس کی عزت کی خاطر اس سے درگزر کرنا۔ کبھی ایک شخص کی اتفاقی غلطی سے فائدہ اٹھانے کا موقع ہوتے ہوئے انصاف کی خاطر چپ رہ جانا۔ کبھی سامنے کے ملتے ہوئے نفع کو چھوڑ کر صرف اصول کی خاطر بے نفع والے آدمی کا ساتھ دینا، غرض ہر بار جب کسی کے لئے دوسرے آدمی کے سامنے جھکنے کا سوال ہو تو یہ اس کو کچھ دینے کا سوال ہوتا ہے۔ ایک آدمی کو دوسرے آدمی کے مقابلہ میں حق وانصاف کا رویہ اختیار کرنے کے لئے اس کو اپنی نفسیاتی گرہوں کو توڑنا پڑتا ہے۔ جب وہ کسی حریف کی عزت کرتا ہے تو یہ اپنی عزت کو خطرہ میں ڈالنے کی قیمت پر ہوتا ہے۔ یہ چیزیں خدا کے سجدہ کے مقابلہ میں "آدم" کے آگے جھکنے کو کسی انسان کے لئے بے حد مشکل بنا دیتی ہیں۔ مگر انسان کا اصلی امتحان جہاں ہو رہا ہے، وہ یہی مقام ہے۔ یہی وہ اصل قربانی ہے جو ہر ایک کو اپنے خدا کی رضا کے لئے دینی ہے۔ جو اس قربانی کے لئے تیار نہ ہو وہ کبھی خدا کا محبوب بندہ نہیں بن سکتا۔ خواہ وہ بظاہر خدا کو سجدہ کرنے والا ہو یا سجدہ نہ کرنے والا۔

سب سے بڑی حقیقت اللہ رب العالمین ہے۔ اس ذات کو پالینا ہی آدمی کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ موجودہ دنیا میں آدمی جہاں اپنے رب کو پاتا ہے وہ "سجدہ" ہے، مگر سجدہ اسی وقت حقیقی سجدہ بنتا ہے جب کہ سجدہ سے باہر کی دنیا میں آدمی تواضع اور جھکاؤ کی زندگی اختیار کر چکا ہو۔ ایسا شخص اپنی نفسی حالت کے اعتبار سے اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ خدا کی تجلیات کا آخذ (Recipient) بن سکے۔ اس کے لئے سجدہ حقیقی معنوں میں رب العالمین سے ملاقات کا مقام بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص سجدہ سے باہر کی زندگی میں خود پسند اور متکبر بنا رہے، اس کی روح کے اندر شیطان اپنے گھونسلے بنا لیتا ہے۔ اس کا سجدہ غفلت اور بے کیفی کا سجدہ ہوتا ہے۔ اس کا سجدہ اس کو خدا سے نہیں ملاتا، اس کا سجدہ اس کو خدا سے قریب نہیں کرتا۔

توحید کا تصور اسلام میں

کائنات کا ایک خالق ہے۔ اس نے اپنے منصوبہ کے مطابق اس کو بنایا ہے اور وہی اس کو چلا رہا ہے۔ جس طرح ساری کائنات خدا کی اطاعت کر رہی ہے اسی طرح انسان کے لئے بھی صحیح رویہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنے خالق کا فرماں بردار بن کر زندگی گزارے۔ تمام انبیاء یہی بتانے کے لئے آئے اور کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ ہر آن آدمی کو یہی سبق دے رہی ہے ——— یہ ہے اسلامی توحید اور اس مقالہ میں مجھ کو اسی نظریۂ توحید کی وضاحت کرنی ہے۔

"کیا تمھیں شک ہے اللہ کے بارے میں جس نے زمین و آسمان کو پھاڑا" (ابراہیم ۱۰) قرآن کا یہ ارشاد بظاہر ایک سوال ہے مگر حقیقۃً وہ سوال کا جواب ہے۔ اس آیت میں فاطر (پھاڑنے والا) کا لفظ وجود خداوندی کے حق میں ایک قطعی دلیل ہے جس کو دوسرے مقام پر ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے "کیا انکار کرنے والوں نے نہیں دیکھا کہ زمین و آسمان باہم ملے ہوئے تھے۔ پھر ہم نے ان کو جدا کر دیا (انبیاء ۳۰) اندازہ کیا گیا ہے کہ کائنات کا موجودہ دائرہ (Radius) کم از کم دس ہزار ملین سال نور ہے۔ فلکیاتی مطالعہ نے بتایا ہے کہ کائنات ایک حالت پر ٹھہری ہوئی نہیں ہے بلکہ یکساں رفتار سے اپنے چاروں طرف پھیل رہی ہے۔ یہ عمل مسلسل جاری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ماضی میں کسی وقت کائنات سمٹی ہوئی حالت میں تھی۔ فلکیات دانوں کے خیال کے مطابق ابتداءً پوری کائنات ایک بڑے ایٹم (Super Atom) کی صورت میں تھی۔ اس کے تمام اجزاء بے حد قوت کے ساتھ اندر کی طرف کھنچے ہوئے تھے۔ تقریباً پندرہ بلین سال پہلے اس ابتدائی مادہ میں ایک دھماکہ یا اخراج طاقت (Energy Release) کا واقعہ ہوا جس کے نتیجہ میں سپر ایٹم کے اجزا اپنے مرکز سے ٹوٹ کر اپنے چاروں طرف پھیلنے لگے تاکہ موجودہ کائنات کو وجود دے سکیں۔ سپر ایٹم کے اندر اس وقت جو اسباب کام کر رہے تھے وہ تمام تر صرف اندر کی طرف کھینچنے اور سمٹنے کے تھے۔ اپنے ذاتی قانون کے برخلاف اس کے اجزاء کا باہر کی طرف سفر شروع کرنا لازماً کسی خارجی طاقت کی مداخلت ہی سے ہو سکتا تھا۔ یہ واقعہ ہم کو مجبور کرتا ہے کہ ہم کائنات کے ماسوا ایک آزاد ہستی کا وجود تسلیم کریں جو تمام طاقتوں کی مالک ہے اور جس نے اپنے شعوری عمل سے ابتدائی مادہ کے اندر یہ غیر معمولی حرکت پیدا کی۔

"زمین و آسمان میں اگر ایک خدا کے سوا کوئی اور خدا ہوتا تو ضرور ان میں بگاڑ پیدا ہو جاتا (انبیاء ۲۲) قرآن کے یہ الفاظ جس کائناتی واقعہ کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جو اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ یہ مافوق طاقت صرف ایک ہے، کئی نہیں۔ تمام طبیعی علوم حیرت انگیز طور پر اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ پوری کائنات ایک ہی قانون کے تحت چل رہی ہے۔ جو قوانین زمین پر کام کر رہے ہیں، وہی نہایت صحت کے ساتھ اجرام سماوی میں بھی کارفرما ہیں۔ یہی یقین تھا جس نے انسان کو آمادہ کیا کہ وہ کھربوں ڈالر خرچ کر کے خلائی مشینیں بنائے اور ان کو چاند اور مریخ پر عین اپنے اندازہ کے مطابق اتار سکے۔ اگر ساری کائنات ایک قانون کے تحت مکمل صحت کے ساتھ عمل نہ کر رہی ہو تو زمین پر

لگی ہوئی ہماری دوربینیں وسیع کائنات میں آٹھ ہزار ملین سال نور تک نہ "دیکھ" سکیں۔ ہمارے طبیعی علوم اچانک اپنی تمام اہمیت کھودیں۔ کائنات کا اس قدر درست طور پر وحدانی حالت میں ہونا بتاتا ہے کہ وہ صرف ایک خدا کے کنٹرول میں ہے۔ اگر وہ کئی خداؤں کے کنٹرول میں ہوتی تو یقیناً اس میں انتشار برپا ہو جاتا۔ مختلف خداؤں کی کش مکش میں وہ درہم برہم ہو کر رہ جاتی۔ زمین پر ایک قانون کی حکمرانی ہوتی اور سیاروں پر دوسرے قانون کی۔

"اللہ نے پیدا کی ہر چیز اور پھر ہر ایک کا ایک اندازہ مقرر کر دیا (فرقان ۲) طبیعیاتی مشاہدہ بتاتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز کا ایک قانون ہے اور وہ انتہائی لزوم کے ساتھ اس پر قائم ہے۔ آئن رکسبرگ (پروفیسر تطبیقی ریاضیات کوئن میری کالج لندن) کے الفاظ میں "کائنات تعجب خیز حد تک یکساں (Uniform) ہے۔ ہم خواہ کسی طور پر بھی اس کو دیکھیں، کائنات کے اجزاء میں وہی ترکیب اسی تناسب سے پائی جاتی ہے۔ زمین پر جو طبیعیاتی قوانین دریافت کئے گئے ہیں، وہ تحکمی اعداد (Arbitrary Numbers) پر مشتمل ہیں۔ جیسے الکٹران کی مقدار مادہ کا تناسب ایک پروٹان کے مقدار مادہ (Mass) سے، جو کہ تقریباً 1840 کے مقابلہ میں ایک ہوتا ہے۔ یہی تناسب ہر جگہ اور ہر وقت پایا جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ کیا ایک خالق نے تحکمی طور پر (Arbitrarily) انھیں اعداد کا انتخاب کر رکھا ہے" (سنڈے ٹائمس لندن ۴ دسمبر ۱۹۷۷) یہ واقعہ صاف طور پر بتاتا ہے کہ کائنات ہر آن ایک زبردست ہستی کے کنٹرول میں ہے۔ جو خدا کائنات کا خالق ہے، وہی اس کا حکمراں بھی ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ — "خدا اگر ہے تو ہم کو نظر کیوں نہیں آتا"۔ ہم ایک ایسی دنیا میں ہیں جہاں ہمارے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ چیزوں کو دیکھے بغیر مانیں۔ یہ صرف خدا کے عقیدہ کا سوال نہیں ہے۔ ہم جس کائنات میں ہیں اور جس کو ہم بہر حال مانتے ہیں، اس میں بے شمار چیزیں ہیں جن کو ہم نہیں دیکھتے اور نہیں دیکھ سکتے۔ مگر اس کے باوجود ہم ان کو ماننے پر مجبور ہیں۔ خدا کے سوا موجودہ کائنات کو بھی ہم ایمان بالغیب کا طریقہ اختیار کئے بغیر نہیں سمجھ سکتے۔ مثال کے طور پر ایٹم میں کئی قسم کے ذرات (Particles) تسلیم کئے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک نیوٹرینو (Neutrino) ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس ذرہ میں کوئی برقی چارج نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ اس میں کوئی مادہ (Mass) بھی نہیں ہوتا۔ گویا وہ ایک لاشئے وجود ہے۔ ایک سائنس داں کے الفاظ میں:

Neutrino is a tiny bundle of nothing (3.1.1979)

نیوٹرینو لاشئے کا ایک چھوٹا سا پلندہ ہے۔ اس لاشئے کا وجود کیوں تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایٹم میں بعض ایسے خواص ظاہر ہوتے ہیں جن کی توجیہہ اس کے بغیر نہیں بنتی کہ ایٹم کے ڈھانچہ میں ایک غیر ذرہ (Non-Particle) کا وجود تسلیم کیا جائے۔ اس مفروضہ نیوٹرینو کے عجیب و غریب اوصاف میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ کسی بھی مادی جسم سے بغیر روک ٹوک گزر سکتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنے سفر میں پورے کرہ ارض کو اس کے اندر سے پار کر سکتا ہے۔ نیوٹرینو کی اس خصوصیت کو انسانی استعمال میں لانے کے لئے امریکہ میں تجربات ہو رہے ہیں۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اگر نیوٹرینو کی اس خصوصیت کو قابل استعمال بنایا جا سکا تو پیغام رسانی کی دنیا میں انقلاب آجائے گا——

کائنات میں کسی چیز کو "دیکھنا" خالص علمی طور پر اس قدر ناممکن ہے کہ سائنسی فلاسفہ کے درمیان خود اس امر میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے کہ وہ کائنات کو ایک خارجی (Objective) واقعہ قرار دیں یا محض ایک ذہنی یا داخلی (Subjective) طور پر محسوس کی جانے والی چیز۔

خدا کو ماننا کبھی انسان کے لئے اتنا مشکل نہیں رہا ہے جتنا خدا کا صحیح تصور قائم کرنا۔ تمام معلوم زمانوں سے انسان خدا کو مانتا رہا ہے اور آج بھی کرۂ ارض کی آبادی کی بہت بڑی اکثریت خدا کے وجود کا اقرار کرتی ہے۔ مگر اصل کمی ہمیشہ یہ رہی ہے کہ خدا کو ماننے کے باوجود لوگ اس کے ساتھ ایسے عقیدے جمع کر لیتے ہیں جس سے ماننا اور نہ ماننا دونوں یکساں ہو جاتا ہے۔ کسی نے خدا کو مانتے ہوئے اس کی ایسی تعبیر کی کہ خدا کا کوئی علیحدہ اور مستقل وجود ہی مشتبہ ہو گیا۔ کسی نے خدا کو مانا مگر اسی کے ساتھ اس کے ایسے شرکاء یا مقربین بارگاہ فرض کر لئے جس کے بعد خدا کی خدائی بے معنی ہو کر رہ گئی۔

خدا کے معاملہ میں انسان کے بے راہ ہونے کی وجہ ہمیشہ صرف ایک رہی ہے۔ کائنات کے معلوم واقعات پر خدا کو قیاس کرنا ———— انسان کے یہاں بیٹے بیٹیاں ہوتی ہیں، اس لئے فرض کر لیا گیا کہ خدا کے بھی کچھ بیٹے بیٹیاں ہوں گی۔ اور اس طرح ایک مقدس خدائی خاندان تیار ہو گیا۔ دنیا کے بادشاہوں کے یہاں کچھ سرکاری لوگ ہوتے ہیں، اس لئے فرض کر لیا گیا کہ خدا کے یہاں بھی کچھ مقرب لوگ ہیں جن کو اس نے اختیار دے رکھا ہے اور جن کی باتوں کو وہ سنتا ہے۔ اس طرح خاصان کائنات کا ایک قبیلہ تیار ہو گیا۔ دنیا میں بہت سی طاقتیں کام کرتی ہوئی نظر آئیں۔ مثلاً سورج، ستارے، دریا وغیرہ۔ فرض کر لیا گیا کہ یہ سب خدائی میں شریک ہستیاں ہیں اور بڑے خدا کے ساتھ مل کر خدائی کو چلا رہی ہیں۔ اس طرح خدا کا معاملہ ایک قسم کا "مشترک کاروبار" کا معاملہ بن گیا، وغیرہ

مظاہر پرستی کی یہی قسم تھی جس نے فلسفیانہ ذہنوں میں پہنچ کر وحدت وجود کی صورت اختیار کی۔ لوگوں نے دیکھا کہ ایک کائنات ہے جو انسان سے لے کر ستاروں تک بے شمار چیزوں سے بھری ہوئی ہے۔ وہ اس تنوع میں وحدت تلاش کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ایک مطلق خدا ہے جو اپنے آپ کو مختلف شکلوں میں ظاہر کر رہا ہے۔ اس طرح خدا کا تصور ایک ایسے مجرد خیال کی صورت میں ڈھل گیا جس کی اپنی علیحدہ کوئی ہستی نہ ہو۔ ہر چیز اسی سے نکلتی ہو اور ختم ہو کر دوبارہ اس میں مل جاتی ہو۔ اسی تصور نے "انسانی خداؤں" کا عقیدہ پیدا کیا۔ یہ فرض کر لیا گیا کہ کچھ لوگ اپنی ریاضتوں سے اپنی دنیوی حیثیت کی اس طرح نفی کر لیتے ہیں کہ وہ جیتے جی خدا سے مل جاتے ہیں اور اس طرح اپنی زندگی ہی میں اس خدا کا جزء بن جاتے ہیں جس کا جزء دوسرے لوگ مرنے کے بعد، ان کے عقیدہ کے مطابق، بننے والے ہیں

اسلام نے خدا کے تصور سے ان تمام الحاقات کو جدا کیا۔ اس نے بتایا کہ اس طرح کا ہر اضافہ در اصل خدا کے عقیدہ کی نفی ہے۔ خدا وہی خدا ہے جو ہر لحاظ سے یکتائی کی صفت رکھتا ہو۔ جو اپنی ذات و صفات میں اشتراک

کی تمام قسموں سے پوری طرح پاک ہو۔ "کہہ دو کہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے احتیاج ہے۔ اس کے اولاد نہیں۔ نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔ اور نہیں ہے اس کے برابر کوئی (اخلاص)

توحید کی عملی اہمیت

اسلام میں توحید کا عقیدہ ہیگل کے فلسفہ کی طرح محض ایک مجرد تصور (Abstract Idea) کی حیثیت نہیں رکھتا۔ انسان کی زندگی سے اس کا نہایت گہرا عملی تعلق ہے۔ اسلام کے نزدیک وہی شخص موحد ہے جو وحدت فکر کے ساتھ وحدت کردار کا بھی حامل بن جائے۔ اسلامی توحید کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کائنات کا خالق ایک ہے اسی طرح اس کا مالک بھی ایک ہے۔ اور ٹھیک اسی طرح وہ ہستی بھی وہی ایک ہے جس کے آگے انسان جواب دہ ہے اور اپنے عمل کے مطابق جس کے یہاں سزا یا جزا پانے والا ہے۔ اس طرح آخرت کا عقیدہ بھی، بالواسطہ طور پر، عقیدۂ توحید ہی کا ایک جزء بن جاتا ہے۔ خدا کے تخلیقی ظہور کو مانے بغیر جس طرح خدا کا عقیدہ بے معنی ہے، اسی طرح خدا کے محاسب اور مجازی ہونے کی حیثیت کو جب تک تسلیم نہ کیا جائے، خدا کی یکتائی کا عقیدہ مکمل نہیں ہوتا۔ موجودہ کائنات اپنی اتھاہ حکمتوں کے ساتھ خدائے وحدہٗ لاشریک کی قدرت کاملہ کا ایک ظہور ہے۔ آخرت کا عالم اسی ظہور خداوندی کی تکمیل ہے۔ موجودہ دنیا وحدتِ الٰہی کا غیبی ظہور ہے، آخرت کی دنیا وحدتِ الٰہی کا مشاہداتی ظہور۔ موجودہ عالم میں توحید ایک غور و فکر کا موضوع نظر آتی ہے، آخرت کی دنیا وہ دنیا ہوگی جہاں توحید ایک ایسا قائم شدہ واقعہ بن جائے گا جس کو ماننا اسی طرح ہر ایک کے لئے ضروری ہوگا جس طرح آج سورج کو ماننا۔ اگر کوئی شخص خدا کو ایک مانے مگر خدا کی یکتائی کے اس ظہور کو تسلیم نہ کرے جو آخرت کی صورت میں سامنے آنے والا ہے تو اس کا عقیدۂ توحید ناقص ہے۔ وہ ایک فلسفی موحد ہو سکتا ہے مگر اس کو اسلامی موحد کہنا کسی طرح درست نہ ہوگا۔

"خدا ایک ہے" یہ صرف ایک گنتی کا معاملہ نہیں ہے بلکہ تمام معلوم اور نامعلوم حقائق کی تشریح کا معاملہ ہے۔ مادی دنیا ہو یا روحانی دنیا، حال کا معاملہ ہو یا مستقبل کا معاملہ، دنیا کے مسائل ہوں یا آخرت کے مسائل، تمام چیزیں اس وقت تک ناقابل فہم ہیں جب تک ان کو ایک فکری وحدت کی حیثیت نہ دے دی جائے، جب تک وحدتِ خداوندی کے ساتھ ان کی نسبت کو معلوم نہ کر لیا جائے۔ خدا کی یکتائی کی دریافت تمام حقائق کی مرکزی وحدت کی دریافت ہے۔ وہی توحید توحید ہے جو ہمارے اوپر حقائق کی ابدی معنویت کو واضح کر دے۔ جو نظریہ حقائق کی معنویت کو بحیثیت ایک کل کے واضح نہ کرے وہ خواہ اور جو کچھ ہو مگر اسلامی نقطۂ نظر سے اس کو توحید نہیں کہا جا سکتا۔ خدا کی وحدت کو پانا اسی وقت مکمل ہوتا ہے جب کہ وہ اسی کے ساتھ انسان اور کائنات کی وحدت کو پانے کے ہم معنی بن جائے، وہ ایک ایسے فکر کا درجہ حاصل کرے جہاں تمام تضادات ختم ہو جائیں اور صرف وحدت ہی آخری حقیقت کے طور پر باقی رہ جائے۔ ڈارون نے خالق (Creator) کا وجود تسلیم کیا ہے۔ مگر وہ یہ دریافت نہ کر سکا کہ خالق ہے تو اس کے اور انسان کے درمیان نسبت کیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈارون کے نظریہ کے بطن سے تاریخ کا سب سے زیادہ شدید

الحاد برآمد ہوا۔ توحید کے عقیدہ کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ ضروری ہے کہ توحید کا مطالعہ اس طرح کیا جائے کہ وہ ہم کو توحید اور انسان کے درمیان نسبت کی دریافت تک پہنچا سکے۔ اس کے بغیر نہ صرف یہ کہ یہ مطالعہ ادھورا رہیگا بلکہ یہ بھی اندیشہ ہے کہ وہ سچائی کے مسافر کو الٹی سمت میں کسی مقام پر پہنچانے والا بن جائے۔

توحید کا عقیدہ اور انسان

کائنات جس طرح مکمل طور پر اپنے خالق اور مالک کے تابع ہے، وہی انسان سے بھی مطلوب ہے جو کائنات کا صرف ایک حقیر حصہ ہے۔ انسان کے لئے درست طرز عمل صرف یہ ہے کہ وہ اس حقیقت واقعہ کو تسلیم کرے اور خدا کی اطاعت کو قبول کر کے بقیہ کائنات کا ہم سفر بن جائے۔ خدا جس طرح ساری کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے اسی طرح انسان کے معاملات بھی اسی وقت سدھر سکتے ہیں جب کہ وہ اپنے آپ کو خدائی کنٹرول میں دے چکا ہو۔ کائنات کی صحت کارکردگی کا سبب یہ ہے کہ اس نے اپنے آپ کو خدائی اخلاقیات کے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ انسانی زندگی کی درستگی کا راز بھی یہی ہے کہ وہ خدائی اخلاقیات میں اپنے آپ کو رنگنے کی کوشش کرے۔

توحید تمام بھلائیوں کا سرچشمہ ہے۔ اور ہر قسم کی خرابیوں کی جڑ یہ ہے کہ توحید دنیا میں قائم نہ ہو۔ توحید کیا ہے۔ اس حقیقتِ واقعہ کا تحقق کہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا، اس کو سنبھالنے والا اور ہر قسم کی قوتوں کا واحد مالک صرف ایک اللہ ہے۔ اس کے سوا کسی کو اس کائنات میں کسی قسم کا کوئی اختیار حاصل نہیں۔ ذرہ سے لے کر کہکشانی نظاموں تک سارا عالم اس حقیقتِ توحید کی براہ راست گرفت میں ہے۔ وہ مکمل طور پر ایک مالک الملک کے زیر انتظام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پورا عالم اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ ٹھیک ویسا ہی ہے جیسا کہ فی الواقع اس کو ہونا چاہئے۔ اس کی کارگزاری میں آج تک کسی ادنیٰ نقص کا مشاہدہ نہ کیا جا سکا۔ وہ اتنی کامل صحت کے ساتھ چل رہا ہے کہ کھرب ہا کھرب سال کے اندر بھی اس کی رفتار میں ایک سکنڈ کا فرق نہیں پڑتا۔

موجودہ زمانہ میں خدا کے وجود کے خلاف جو دلیلیں پیش کی گئی ہیں، ان میں سب سے اہم وہ ہے جس کو نقص کا مسئلہ (Problem of Evil) کہا جاتا ہے۔ یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ کائنات میں ایسے نقائص ہیں جن کی موجودگی میں یقین نہیں کیا جا سکتا کہ اس کو کسی حکمت والے خدا نے بنایا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک شخص نے یہ مثال دی ہے کہ زمین کی قوت کشش (Force of Gravity) اس سے بہت زیادہ ہے جتنا کہ اس کو ہونا چاہئے۔ چنانچہ چند میٹر کی بلندی سے گرنے میں آدمی کا پاؤں ٹوٹ جاتا ہے۔ اگر قوت کشش کم ہوتی تو ایسا نہ ہوتا۔ مگر اس قسم کی بات صرف کمتر غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ کہنے والا یہ بھول گیا کہ گرنا تو ایک حادثہ ہے جو معمول کے خلاف کبھی پیش آتا ہے۔ لیکن اگر زمین کی قوت کشش کم ہوتی تو اس پر معمول کی زندگی ہی درہم برہم ہو جاتی ـــــــ انسان مضبوطی کے ساتھ زمین پر قائم نہ رہ سکتا، ہماری ریلیں پٹریوں پر نہ دوڑ سکتیں، ہمارے مکانات اور کارخانے اکھڑ جاتے، پانی زمین پر نہ ٹھہر سکتا، وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ چیز جس کو بعض لوگوں نے نظام فطرت کا نقص سمجھا ہے وہ نظام فطرت میں اعتدال و توازن کا ثبوت ہے۔ قرآن کے یہ الفاظ ناقابل چیلنج حد تک صحیح ہیں "اللہ نے بنائے سات آسمان

اوپر تلے۔ تم اللہ کے اس بنانے میں کوئی فرق نہ دیکھو گے۔ تم پھر نگاہ ڈال کر دیکھ لو۔ کیا تم کو کوئی خلل دکھائی دیتا ہے۔ بار بار نگاہ ڈال کر دیکھو۔ تمھاری نگاہ عاجز ہو کر اور تھکی ہوئی تمھاری طرف لوٹ آئے گی (ملک)

کائنات کا اس طرح بے عیب اور خالی از نقص ہونا اس لئے ہے کہ وہ براہ راست خدا کے کنٹرول میں ہے۔ وہ خدا کی صفات کا مادی ظہور ہے۔ مگر انسانی دنیا کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اینٹن چیخوف نے صحیح کہا ہے کہ "یہ دنیا بے حد حسین ہے۔ اس میں صرف ایک ہی چیز ہے جو حسین نہیں، اور وہ انسان ہے" انسان ساری معلوم کائنات میں واحد مخلوق ہے جو اپنے ہم جنسوں کے ساتھ عداوت کرتا ہے (بقرہ ۳۶) وہ زمین پر اصلاح کے بجائے فساد برپا کرتا ہے (اعراف ۵۶) وہ ایسی کارروائیاں کرتا ہے جس کے نتیجہ میں کھیتیاں اور نسلیں برباد ہوں (بقرہ ۲۰۵)۔ دو دنیاؤں میں یہ فرق کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بقیہ کائنات براہ راست اللہ کے حکم کے تحت چل رہی ہے۔ وہ ویسی ہی رہنے کے لئے مجبور ہے جیسی کہ خدا چاہتا ہے کہ وہ رہے۔ مگر انسان کو اللہ طرف سے آزادی ملی ہوئی ہے۔ وہ اپنے ارادہ کے تحت صحیح یا غلط راستہ پر چلنے کا اختیار رکھتا ہے۔ انسانی دنیا میں بگاڑ کی وجہ تمام تر یہی ہے۔ بقیہ دنیا خدا کی مرضی کی پابند ہے، اس لئے وہ مکمل طور پر درست ہے۔ اس کے برعکس انسان اپنی خواہشوں کی پیروی کرتا ہے، اس لئے اس کے سارے معاملات میں فساد اور بگاڑ برپا رہتا ہے۔ ہر برائی جو زمین پر پائی جاتی ہے وہ انسانی آزادی کا غلط استعمال ہے۔ انسان نے فرشتوں کے اس اندیشہ کو ساری تاریخ میں درست ثابت کیا ہے جو انھوں نے اس کی پیدائش کے وقت خدا کے سامنے ظاہر کیا تھا: "کیا تو ایسے لوگوں کو زمین میں اختیار دے رہا ہے جو وہاں فساد کرے اور خون بہائے (بقرہ ۳۰)

یہ آزادی جو انسان کو حاصل ہے، یہ مطلق آزادی نہیں ہے۔ یہ صرف وقتی آزادی ہے اور خاص منصوبہ کے تحت دی گئی ہے۔ یہ دراصل امتحان کی آزادی ہے (ملک ۲) کائنات کا مالک یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ ان میں سے کون ہے جو آزادی پاکر بھی آزادی کا غلط استعمال نہیں کرتا۔ تاکہ وہ ایسے لوگوں کو اپنے انعامات سے نوازے۔ اور ان لوگوں کو تباہی کے گڑھے میں ڈال دے جو آزادی پاکر بگڑ گئے (انفال ۳۷) دنیا کا موجودہ نظام صرف اس وقت تک ہے جب تک جانچ کا یہ عمل پورا نہیں ہو جاتا۔ اس مدت کے پورا ہونے کے بعد زمین کا مالک زمین کا انتظام بھی براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لے گا جس طرح وہ بقیہ کائنات کا انتظام اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے ہے۔ (مریم ۴۰) اس وقت اچھے اور برے ایک دوسرے سے الگ کر دیئے جائیں گے (آل عمران ۱۷۹) اچھے لوگوں کو ابدی طور پر جنتی زندگی حاصل ہوگی اور برے لوگ ابدی طور پر جہنمی حالات میں دھکیل دیئے جائیں گے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ موجودہ دنیا وہ مقام ہے جہاں آنے والی خدائی دنیا کے شہری چنے جا رہے ہیں۔ جو لوگ آزاد ہونے کے بعد بھی اپنے آپ کو اللہ کا حکم بردار بنائیں گے، جو مجبور نہ ہوتے ہوئے بھی اللہ کی مرضی کو اپنے اوپر طاری کریں گے، وہی اللہ کے نزدیک اس قابل ٹھیریں گے کہ وہ اللہ کی دنیا کے شہری بن سکیں۔ آج امتحان کے وقفہ میں ہر طرح کے لوگ زمین پر بسے ہوئے ہیں۔ مگر امتحان کی مدت ختم ہونے کے بعد صرف صالح لوگ خدا کی اس ہری بھری دنیا کے وارث

قرار پائیں گے (انبیاء ۱۰۵) اور بقیہ لوگوں کو اس سے بے دخل کرکے دور پھینک دیا جائے گا۔

قرآن اور کائنات

آنے والی جنتی دنیا کا شہری بننے کے لئے کس قسم کی صلاحیتیں درکار ہیں، اس کے جواب کو خدا نے مبہم نہیں رکھا بلکہ اس کو انتہائی واضح طور پر بتا دیا ہے۔ بولنے والی زبان میں یہ جواب قرآن میں موجود ہے اور خاموش زبان میں وہ کائنات میں ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔ توحید کو انسانی زندگی میں قائم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان بھی اسی آفاقی دین کو اپنا لے جس کو ہمارے گرد و پیش کی ساری کائنات اپنائے ہوئے ہے۔ "کیا وہ خدا کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں۔ حالاں کہ اسی کے حکم میں ہے جو کوئی آسمان اور زمین میں ہے، خوشی سے یا ناخوشی سے۔ اور سب اللہ ہی کی طرف پھیرے جائیں گے" (آل عمران ۸۳) قرآن کے اس بیان کے مطابق کائنات بالفعل اس دین توحید کو اپنائے ہوئے ہے جس کو اپنانے کا مطالبہ انسان سے کیا جا رہا ہے۔ کائنات دین توحید کا عملی نمونہ ہے۔ کائنات میں ہم اس دین کو "دیکھ" سکتے ہیں جس کو ہم خدا کی کتاب میں "پڑھ" رہے ہیں۔ توحید کے دین کو اختیار کرنے کے نتیجہ میں کائنات کا جو نقشہ بنا ہے اس کے بعض پہلوؤں کو ہم یہاں مختصراً بیان کریں گے۔

کامل سپردگی ——— کائنات کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے رب کی مکمل اطاعت کر رہی ہے (فصلت ۱۲) زمین، سورج اور تمام ستارے نہایت تیز رفتاری کے ساتھ وسیع خلا میں گھوم رہے ہیں۔ مگر کھرب ہا کھرب سال کے اندر بھی ان کی گردش میں ایک سکنڈ کا فرق نہیں آتا۔ ہر چیز کا جو وظیفہ مقرر ہے، انتہائی صحت کے ساتھ وہ اس کی ادائگی میں مصروف ہے۔ انسان کو بھی اپنی زندگی میں اسی کامل سپردگی کا مظاہرہ کرنا ہے۔ اس سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اپنے ذاتی ارادہ کو مکمل طور پر خدا کے تابع کر دے۔ وہ وہی کرے جو اس کا مالک اس سے چاہتا ہے ــ اس کے ہاتھ اور پاؤں، اس کی آنکھ اور زبان، اس کا دل اور دماغ سب اللہ کے آگے اس طرح جھکے ہوئے ہوں کہ خدا کی مرضی کے خلاف کوئی فعل ان سے سرزد نہ ہو۔

عبادت الٰہی ——— قرآن بتاتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز خدا کی عبادت اور تسبیح کر رہی ہے (نور ۴۱) چڑیاں جب درخت کی ہری بھری شاخوں پر بیٹھ کر چہچہاتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے خالق اور رب کی تعریف کے نغمے گا رہی ہیں۔ کھڑا ہوا درخت جب اپنا سایہ زمین پر ڈالتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے کے سامنے سجدہ میں گر گیا ہے۔ رات کی تاریکی کے بعد صبح کو جب سورج اپنی حسین کرنیں زمین پر پھیلاتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ زبان حال سے کہہ رہا ہو: "پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں تمام روشنیوں کا مین سوئچ ہے۔ اگر وہ اس مین سوئچ کو بند کر دے تو ساری کائنات میں اندھیرے کے سوا کچھ بھی باقی نہ رہے"۔ اسی عبادت کا مطالبہ انسان سے بھی ہے۔ اس کو بھی یہی کرنا ہے کہ اپنے رب کی حمد و تسبیح کرے، اس کی خوبیوں اور کمالات کے احساس سے اس کا دل سرشار رہے، اس کی یاد اس کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ بن جائے، اس کی عبادت گزاری کو وہ اپنی زندگی کا مستقل مشغلہ بنا لے۔

قابلِ پیشین گوئی کردار ـــــــ کائنات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اتنی صحت کے ساتھ حرکت کرتی ہے کہ مستقبل کے واقعات کا پیشگی اندازہ کیا جا سکتا ہے (یونس ۵) وہ مکمل طور پر قابلِ پیشین گوئی (Predictable) ہے۔ یہی چیز انسان سے بھی اس کی زندگی میں مطلوب ہے۔ انسان کو اتنا پابند اور اتنا ذمہ دار ہونا چاہئے کہ پیشگی طور پر یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ کس موقع پر اس کی طرف سے کس قسم کا ردِ عمل ظاہر ہوگا۔ کوئی معاملہ کرتے وقت پہلے سے یقین کیا جا سکے کہ کون سا رویہ اس کی طرف سے سامنے آئے گا۔ اس کے قول پر اسی طرح بھروسہ کیا جا سکے جس طرح اپنی گھڑیوں کو درست کرنے کے لئے ہم سورج کی رفتار پر بھروسہ کرتے ہیں۔

توافق ـــــــ کائنات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے تمام اجزاء حد درجہ توافق (Harmony) کے ساتھ عمل کرتے ہیں (یٰس ۴۰) سورج اور چاند کبھی ایک دوسرے کے حریف نہیں بنتے۔ ستاروں اور ستاروں میں کبھی ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ ہوا اور پانی اور دھوپ اور مٹی سب آپس میں کامل ہم آہنگ ہو کر کام کرتے ہیں۔ تقریباً ایک سو عناصر اور ان سے بنے ہوئے بے شمار مادی مجموعے اس قدر متوافق طور پر اپنے اپنے فرائض انجام دیتے ہیں کہ ان میں کبھی باہمی آویزش کا مشاہدہ نہیں کیا گیا۔ اب انسان کو بھی یہی کرنا ہے کہ وہ باہمی کشمکش سے مکمل طور پر بچتے ہوئے اپنے اپنے حصہ کا کام انجام دے۔ ہر انسان دوسرے انسان سے ٹکرائے بغیر اپنا فریضۂ حیات پورا کرے۔

نتیجہ پسندی ـــــــ کائنات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کی سرگرمیاں ہمیشہ ایک مفید انجام کی طرف جاتی ہیں (رعد ۱۷) زمین کی گردش، رات دن کا آنا جانا، بارش کا برسنا اور موسموں کا بدلنا، اور دوسری تمام سرگرمیاں نتیجہ پسند (Result Oriented) ہیں۔ سب کی سب نتیجہ خیز رخ پر سفر کرتی ہیں۔ فطرت کو آزادانہ طور پر کام کرنے کا موقع دیا جائے تو وہ کبھی کسی غیر مفید انجام پر ختم نہیں ہوتی۔ یہی اصول انسان کو بھی اپنی زندگی میں اختیار کرنا ہے۔ اس کی سرگرمیوں کو ہمیشہ نتیجہ رخی، بالفاظ دیگر مفید انجام کا حامل ہونا چاہئے۔ ہر ایسی سرگرمی سے اس کو مکمل طور پر دور رہنا چاہئے جو عملاً بے نتیجہ ہو کر رہ جائے یا کوئی ناپسندیدہ نتیجہ برآمد کرنے والی ہو۔

ارتقائی طریقہ ـــــــ کائنات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ چھلانگوں میں سفر نہیں کرتی بلکہ ارتقائی انداز میں واقعات کو ظہور میں لاتی ہے (ابراہیم ۲۷) درخت اچانک طلسماتی طور پر زمین کے اوپر کھڑا نہیں ہو جاتا بلکہ طویل مدت کے اندر تدریجی طور پر وجود میں آتا ہے۔ یہی تمام چیزوں کا حال ہے۔ انسان کو بھی اسی طریقہ کی پیروی کرنی ہے۔ اس کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ تدریجی اور ارتقائی طور پر نتائج حاصل کرنے کا منصوبہ بنائے نہ کہ چھلانگ لگا کر منزل تک پہنچنے کی کوشش کرے۔

یکسانیت ـــــــ کائناتی چیزوں میں ظاہر و باطن کا کوئی فرق نہیں۔ وہ اندر اور باہر یکساں ہیں۔ سورج اپنی ذات میں جیسا ہے، ٹھیک اسی شکل میں وہ دوسروں کے سامنے بھی طلوع ہوتا ہے۔ یہی بات انسان سے قول و عمل کی یکسانی کی صورت میں مطلوب ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ جو اس کے دل میں ہے وہی وہ زبان پر لائے۔ جیسا کچھ وہ عمل میں ہے ویسا ہی لفظوں میں بھی اپنے کو ظاہر کرے۔ اس سے کسی کو منافقت یا دو عملی کا تجربہ ہرگز نہ ہو۔

خدائی اخلاقیات کا ظہور کائنات میں

حقیقت یہ ہے کہ حکمت و معنویت کا جو واقعہ وسیع تر کائنات میں خدا اپنے براہ راست کنٹرول کے تحت ظہور میں لا رہا ہے وہی واقعہ انسان کو اپنی زندگی میں ذاتی کنٹرول کے تحت وجود میں لانا ہے۔ جو واقعہ خدا نے اپنی کائنات میں مادی سطح پر قائم کر رکھا ہے وہی انسان کو اپنی زندگی میں اخلاقی اعتبار سے بروئے کار لانا ہے ـــــ کائناتی سطح پر جو چیز حدید (لوہا) کی شکل میں پائی جاتی ہے، وہ انسانی سطح پر پختہ کرداری کی صورت میں مطلوب ہے۔ کائناتی سطح پر جو چیز پتھریلی زمین سے چشمہ کی صورت میں بہہ نکلتی ہے، وہ انسان سے نرم مزاجی کی صورت میں مطلوب ہے۔ کائناتی سطح پر جو چیز اٹل قوانین کی صورت میں پائی جاتی ہے، وہ انسانی سطح پر ایفائے عہد کی صورت میں مطلوب ہے۔ کائناتی سطح پر جو چیز مہک اور لذت اور رنگ کی صورت میں پائی جاتی ہے وہ انسانی سطح پر خوش معاملگی کی صورت میں مطلوب ہے۔ کائناتی سطح پر کھربوں ستاروں کی ایک کہکشاں مسلسل حرکت کرتی ہے۔ مگر اس کے ستاروں میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ حتی کہ ایک کہکشانی جھرمٹ حرکت کرتا دوسرے کہکشانی جھرمٹ میں داخل ہوتا ہے اور نہایت تیز سفر کرتا ہوا باہر نکل جاتا ہے۔ مگر دونوں جھرمٹوں میں کوئی تصادم نہیں ہوتا۔ یہی واقعہ انسانی زندگی میں اس طرح مطلوب ہے کہ انسانی مجموعے اپنی اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہوں۔ مگر ان میں کبھی ایک دوسرے سے نزاع اور ٹکراؤ کی نوبت نہ آئے۔ درخت خراب ہوا (کاربن) کو لے لیتا ہے اور اس کے بدلے اچھی ہوا (آکسیجن) ہماری طرف لوٹا دیتا ہے۔ یہی بات انسانی سطح پر اس اصول کی صورت میں مطلوب ہے کہ "جو تمہارے ساتھ برا سلوک کرے تم اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو"۔ کائنات میں کوئی چیز کسی کی کاٹ میں لگی ہوئی نہیں ہے۔ ہر ایک پوری یکسوئی کے ساتھ صرف اپنا اپنا حصہ ادا کرنے میں مصروف ہے۔ یہی چیز انسانی سطح پر اس شکل میں مطلوب ہے کہ وہ ہمیشہ مثبت جد وجہد کرے، منفی کارروائیاں کرنے سے مکمل طور پر پرہیز کرے۔ کائنات میں دوبارہ گردش (Recycle) کا اصول کارفرما ہے۔ پتی درخت سے گر کر ضائع نہیں ہوتی بلکہ کھاد بن جاتی ہے۔ فضلات دوبارہ استعمال ہونے کے لئے گیس میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ پانی بھاپ بن کر اڑتا ہے اور اس کے بعد پھر سمندر میں واپس آجاتا ہے۔ یہی چیز انسانی زندگی میں اس طرح مطلوب ہے کہ انسان کا خرچ کیا ہوا پیسہ دوبارہ انسان کے لئے مفید بنے۔ ایک انسان کی چھیڑی ہوئی جد وجہد دوسرے انسانوں کو اچھے ثمرات کا تحفہ دے۔ میدانی علاقوں میں پانی زمین کے نیچے ملتا ہے اس لئے میدانی درخت نیچے گہرائی میں اپنی جڑیں لے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس پہاڑی ڈھلوانوں پر پانی صرف اوپری سطح پر ملتا ہے، اس لئے پہاڑی درخت اپنی جڑیں اوپر اوپر پھیلاتے ہیں۔ یہی چیز انسانی زندگی میں اس طرح مطلوب ہے کہ وہ اپنی جد وجہد میں حالات سے مطابقت (Adjustment) کا طریقہ اختیار کرے نہ کہ حالات سے لڑنے کا ـــ کائنات ذرہ سے لے کر ستاروں تک بے حد تیز سفر میں مصروف ہے۔ وہ ہر آن ایک بہت بڑے کارخانہ کی طرح کام کر رہی ہے۔ مگر اس میں کہیں بھی شور سنائی نہیں دیتا۔ یہی چیز انسانی زندگی میں اس طرح مطلوب ہے کہ وہ خاموش جد وجہد کا طریقہ اپنائے، شور وغل کی سیاست چلانے سے مکمل پرہیز کرے۔ کائنات میں عظیم الشان سطح پر بے شمار

کام ہو رہے ہیں۔ ہر چیز انتہائی صحت اور پابندی کے ساتھ اپنی ڈیوٹی کی انجام دہی میں لگا ہوا ہے۔ مگر کسی کو یہاں کوئی ظاہری بدلہ نہیں ملتا۔ یہی چیز انسان سے بھی مطلوب ہے کہ وہ مکمل طور پر اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں لگا رہے، بغیر اس کے کہ اس دنیا میں اس کو اس کے عمل کا کوئی معاوضہ ملنے والا ہو۔ اونچا پہاڑ اور تمام کھڑی ہوئی چیزیں اپنا سایہ زمین پر ڈال دیتی ہیں۔ یہی چیز انسانی زندگی میں اس طرح مطلوب ہے کہ ہر آدمی تواضع اختیار کرے۔ کوئی کسی کے اوپر فخر نہ کرے، کوئی دوسرے کے مقابلہ میں اپنے کو بڑا نہ سمجھے ـــــــ نماز اسی قسم کی زندگی کی ایک علامتی تصویر ہے جو روزانہ پانچ وقت خدا کے وفادار بندوں پر فرض کی گئی ہے۔

کائنات میں ہر آن جو سرگرمیاں جاری ہیں وہ خاموش زبان میں پکار رہی ہیں کہ خدا کی دنیا میں کون قیمت والا ہے اور کون بے قیمت ہے ـــ وہ لوگ جن کو صرف ظاہری مفاد متحرک کر سکتا ہو (خواہ وہ روپیہ پیسہ کا مفاد ہو یا عزت و شہرت کا مفاد) وہ اس غیر معاوضہ طلب دنیا میں بالکل بے قیمت ہیں۔ ـ کائنات میں ظاہر کی ہوئی خدائی اخلاقیات کے معیار پر وہ پورے نہیں اترتے۔ خدا کی دنیا میں وہی لوگ قیمت رکھتے ہیں جو خالص صداقت کی خاطر متحرک ہوئے ہوں۔ جو تسکین ذات سے اوپر اٹھ کر عمل کا ثبوت دینے والے ہوں۔ جو ہر قسم کی نفسیاتی پیچیدگیوں سے آزاد ہو کر کام کریں۔ آئندہ آنے والے جنتی دور میں وہ تمام لوگ خدا کی دنیا سے باہر دھکیل دیئے جائیں گے جنھوں نے قریبی مفاد (عاجلہ) کے لئے سرگرمیاں دکھائی تھیں۔ اور خدا کی یہ حسین اور خوشیوں سے بھری ہوئی دنیا ہمیشہ کے لئے صرف ان لوگوں کی وراثت میں دے دی جائے گی جو دیر میں آنے والے فائدہ (آخرت) کے لئے سرگرم عمل رہے تھے۔ جو سامنے کی چیزوں سے اوپر اٹھ کر "غیب" کی طرف اپنی توجہ لگائے ہوئے تھے:

"اور انھوں نے قدر نہ پہچانی اللہ کی جیسی کہ قدر ہے اس کی۔ حالاں کہ قیامت کے دن ساری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی اور تمام آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہوں گے۔ وہ پاک ہے اور بہت اوپر ہے ان کے شرک سے۔ اور اس روز پھونک ماری جائے گی صور میں۔ پھر تمام آسمان اور زمین والے بے ہوش ہو کر گر پڑیں گے۔ صرف وہی بچے گا جس کو خدا چاہے۔ پھر دوبارہ پھونکا جائے گا تو اچانک وہ کھڑے ہو جائیں گے اور دیکھنے لگیں گے۔ اور زمین اپنے رب کے نور سے چمک اٹھے گی اور سب کے اعمال نامے سامنے رکھ دیئے جائیں گے اور پیغمبر اور گواہ حاضر کئے جائیں گے اور ٹھیک ٹھیک سب کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔ کسی کے اوپر کوئی ظلم نہ ہوگا۔ ہر شخص کو پورا بدلہ دیا جائے گا جو اس نے کیا تھا۔ اور اللہ کو خوب خبر ہے جو وہ کرتے ہیں۔ اور انکار کرنے والے گروہ در گروہ جہنم کی طرف ہانکے جائیں گے۔ جب وہ اس کے پاس پہنچیں گے تو جہنم کے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور اس کے چوکیدار ان سے کہیں گے: کیا تمھارے پاس تم ہی لوگوں میں سے پیغام پہنچانے والے نہ آئے تھے جو تم کو خدا کی باتیں سناتے تھے اور تم کو اس دن کے پیش آنے سے ڈراتے تھے۔ وہ جواب دیں گے ہاں۔ مگر عذاب کا وعدہ منکروں کے اوپر پورا ہو کر رہا۔ پھر ان سے کہا جائے گا کہ جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ اور ہمیشہ اس میں پڑے رہو۔ کیسا برا ٹھکانا ہے تکبر کرنے والوں کا۔ اور جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے تھے وہ گروہ در گروہ جنت کی طرف روانہ

کئے جائیں گے۔ جب وہ وہاں پہنچیں گے اور جنت کے دروازے کھولے جائیں گے تو جنت کے فرشتے کہیں گے، سلامتی ہو تم پر۔ خوش رہو۔ جنت میں ہمیشہ رہنے کے لئے داخل ہو جاؤ۔ اہل جنت کہیں گے۔ شکر ہے اللہ کا جس نے ہم سے اپنے وعدہ کو سچا کر دیا۔ اور ہم کو اس زمین کا وارث بنا دیا کہ ہم جنت میں جہاں چاہیں مقام کریں۔ کیا خوب بدلہ ہے عمل کرنے والوں کا۔ اور تو دیکھے گا فرشتوں کو کہ گھیر رہے ہوں گے عرش کے گرد پاکی بولتے ہوئے اپنے رب کی خوبیوں کی۔ اور تمام بندوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دیا جائے گا۔ اور یہی بات ہوئی کہ سب خوبی اللہ کے لئے ہے جو مالک ہے سارے جہان کا" (زمر۔ آخر)

کائنات میں انتہائی وسیع پیمانہ پر ہر آن یہ دکھایا جا رہا ہے کہ آئندہ بننے والی معیاری دنیا (جنت) میں بسانے کے لئے خدا کو کس قسم کے شہری درکار ہیں۔ اس کو وہ انسان درکار ہیں جو کائناتی اخلاقیات کے معیار پر پورے اتریں۔ وہ اس دین کو اختیار کریں جو اس نے لفظی طور پر اپنی کتاب میں اور عملی طور پر اپنی کائنات میں ظاہر کیا ہے۔ اس کے باوجود جو لوگ اس سے سبق نہ لیں اور خود اپنے گھڑے ہوئے راستوں پر چلتے رہیں، وہ خدا کی نظر میں بدترین مجرم ہیں۔ خدا کے بتائے ہوئے "دین" کے سوا جو دین بھی وہ اختیار کریں گے وہ آخرت میں بالکل بے قیمت ہوگا۔ کیوں کہ انھوں نے خدا کی نشانیوں کا انکار کیا (کہف ۱۰۵) جو لوگ آنکھ رکھتے ہوئے خدا کی نشانیوں کو نہ دیکھیں اور کان رکھتے ہوئے خدا کی آوازوں کو نہ سنیں، وہ خدا کے نزدیک جانوروں سے بھی زیادہ بدتر ہیں (انفال ۲۲)

آئندہ بننے والی دنیا میں ان کا جو انجام ہوگا اس کا اعلان خدا کی کتاب میں ان لفظوں میں کر دیا گیا ہے:

ومن اعرض عن ذکری فان لہ معیشۃ ضنکا ونحشرہ یوم القیامۃ اعمی۔ قال رب لم حشرتنی اعمیٰ وقد کنت بصیرا۔ قال کذلک اتتک آیٰتنا فنسیتھا وکذلک الیوم تنسیٰ۔ وکذلک نجزی من اسرف ولم یومن بآیات ربہ ولعذاب الاخرۃ اشد وابقیٰ (طہٰ ۱۲۴ - ۱۲۷)

اور جس نے منہ پھیرا میری نصیحت سے تو اس کے لئے (آخرت میں) تنگی کا جینا ہوگا۔ اور قیامت کے روز ہم اس کو اندھا کرکے اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا میرے رب! تو نے مجھ کو اندھا کیوں اٹھایا۔ میں تو دنیا میں آنکھوں والا تھا۔ ارشاد ہوگا کہ اسی طرح آئی تھیں تیرے پاس ہماری نشانیاں۔ پس تو نے ان کو بھلا دیا تو اسی طرح آج تم کو بھلا دیا جائے گا۔ اس طرح ہم بدلہ دیں گے ہر اس شخص کو جو حد سے نکل گیا اور یقین نہ لایا اپنے رب کی نشانیوں پر۔ اور یقیناً آخرت کا عذاب بڑا سخت ہے۔

نوٹ: یہ مقالہ سیمینار منعقدہ تغلق آباد نئی دہلی (۸ جنوری ۱۹۷۹) میں پڑھا گیا۔ سیمینار کا عنوان تھا: خدا کی وحدانیت کے تصورات (Concepts of the Unity of God)

اسلام دین فطرت

عن ابی عبد الرحمٰن عبد اللہ بن عمر بن الخطاب قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: بنی الاسلام علی خمس شھادۃ ان لا الٰہ الا اللہ وان محمدا عبدہ ورسولہ واقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ وحج البیت وصوم رمضان (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کہتے ہیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا۔ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے۔ گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اور نماز قائم کرنا۔ اور زکوٰۃ ادا کرنا اور بیت اللہ کا حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔

بعض روایتوں میں یہ الفاظ ہیں کہ اسلام کی تعمیر پانچ ستونوں (خمس دعائم) پر کی گئی ہے (کتاب الصلوٰۃ محمد بن نصر المروزی) ایک عمارت اپنی تفصیلی صورت میں بہت سے اجزاء کا مجموعہ ہوتی ہے۔ مگر ساری عمارت جس چیز کے اوپر کھڑی ہوتی ہے وہ چند کھمبے (PILLARS) ہوتے ہیں۔ اسی طرح اسلام کے لئے بھی یہ پانچ چیزیں کھمبے کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کے مضبوط ہونے سے اسلام مضبوط ہوتا ہے اور ان کے کمزور ہونے سے اسلام کمزور ہو جاتا ہے۔ ہر آدمی کی ہستی ایک زمین کی مانند ہے۔ اگر وہ اپنی اس "زمین" پر خدا کی پسند والی عمارت کھڑی کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے وہ ان پانچ کھمبوں کو پوری مضبوطی کے ساتھ قائم کرے۔ ان کھمبوں کو گاڑے بغیر نہ فرد کی سطح پر اسلام کا ظہور ہو سکتا ہے اور نہ سماج کی سطح پر۔

اسلام آدمی کے اندر جو زندگی پیدا کرنا چاہتا ہے وہ ایک لفظ میں عبادت یا خدا پرستی کی زندگی ہے۔ تاہم اپنی تفصیلی صورت میں وہ پانچ چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے: ایمان، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔ یہ پانچ چیزیں پانچ رسمیات نہیں ہیں بلکہ پانچ اوصاف ہیں۔ یہ ان مطلوب چیزوں کا خلاصہ ہے جو ہمارا مالک ہماری زندگیوں میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر یہ پانچ اوصاف آدمی کے اندر حقیقی طور پر پیدا ہو جائیں تو گویا اس کے اندر وہ بنیادی صلاحیت پیدا ہو گئی جس کے بعد یہ امید کی جا سکتی ہے کہ اس کی زندگی میں اس ربانی کردار کا ظہور ہو جس کو اسلام ایک ایک شخص کی زندگی میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ایمان کا مطلب خدائی حقیقتوں پر یقین ہے۔ نماز کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی اللہ کی بڑائی کے آگے اس طرح جھکے کہ اپنی بڑائی کا احساس اس کے اندر سے ختم ہو جائے ۔ روزہ اللہ کے بھروسے پر صبر کرنے کا نام ہے۔ زکوٰۃ یہ ہے کہ آدمی دوسرے کا حق پہچانے تاکہ خدا اس کو اس کے حصہ سے محروم نہ کرے۔ حج سے یہ مراد ہے کہ خدا کے بندے خدا کے گرد متحد ہو جائیں ۔ یہ سب اپنی اپنی حقیقت کے اعتبار سے اوصاف ہیں نہ کہ محض خارجی مراسم۔ گویا کہ یقین، بے نفسی، صبر، حق شناسی اور اتحاد وہ پانچ صفاتی کھمبے ہیں جن کے اوپر اسلامی زندگی کا گھر بنتا ہے۔

۱۔ اللہ کو اپنا الٰہ بنانے کا اقرار اس کو اپنا سب کچھ بنانے کا معاہدہ ہے۔ یہ اللہ کو اپنے احساسات اور

جذبات کا مرکز بناتا ہے۔ یہ اپنے آپ کو مکمل طور پر اللہ کے حوالے کرنا ہے۔ یہ اس بات کا فیصلہ کرنا ہے کہ آدمی اپنی امیدوں اور تمناؤں، اپنے اندیشوں اور التجاؤں کا مرکز اللہ کو بنائے گا۔ وہ کہیں اور جینے کے بجائے اپنے رب میں جئے گا۔ آدمی کی امیدیں اور اس کے احساسات جہاں اٹکے ہوئے ہوں، وہیں وہ آدمی جی رہا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو ہر آدمی، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، کہیں نہ کہیں جی رہا ہوتا ہے۔ کوئی اپنے گھر بار اور اپنے بال بچوں میں جیتا ہے۔ کوئی اپنے معاش اور کاروبار میں جیتا ہے۔ کوئی اپنے سیاسی مشاغل اور قیادتی مصروفیات میں جیتا ہے، کوئی اپنی عزت اور اقتدار کے خوابوں میں جیتا ہے۔ غرض ہر آدمی کہیں نہ کہیں جی رہا ہے۔ مگر یہ تمام جینا جاہلیت کا جینا ہے۔ یہ اپنا آشیانہ ایسی شاخوں پر بنانا ہے جن کا حقیقۃً کوئی وجود نہیں۔ حقیقی جینا یہ ہے کہ آدمی اپنے رب میں جینے لگے۔ وہ اس سہارے کو پکڑے جس کے سوا اس کائنات میں کسی کے لئے کوئی سہارا نہیں۔ وہ اللہ کی یاد کو لے کر سوئے اور اللہ کی یاد کے ساتھ صبح کرے۔ وہ اسی کے بھروسہ پر رکے اور اسی کے بھروسہ پر چلے۔ وہ اسی کے لئے بولے اور اسی کے لئے خاموشی اختیار کرے۔

ایمان کی مثال بجلی کی کرنٹ کی سی ہے۔ پاور ہاؤس سے بجلی کی کرنٹ جب کارخانہ میں پہنچتی ہے تو سارا کارخانہ جگمگا اٹھتا ہے۔ اس کی تمام کلیں حرکت میں آجاتی ہیں۔ اسی طرح جب کسی بندے کا اپنے رب سے ایمانی تعلق قائم ہوتا ہے تو اس کے اندر اچانک ایک نئی روشنی آجاتی ہے، اس کی فطرت جاگ اٹھتی ہے۔ ایمان اس کے قلب کو گرمانے والا اور اس کی روح کو تڑپانے والا بن جاتا ہے۔ وہ اس کے اندر ایک نئی آگ لگا دیتا ہے۔ وہ انسان جو پہلی بار اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا، وہ دوبارہ ایمان کے کوکھ سے ایک نیا جنم لیتا ہے۔ وہ اب خدا سے الگ نہیں رہتا بلکہ خدا میں شامل ہو جاتا ہے۔ ایک شخص کو کسی سے محبت ہو تو جسمانی طور پر وہ اس سے جدا رہتے ہوئے بھی حسیاتی طور پر وہ اس سے مل جاتا ہے۔ وہ ہر چیز میں اسی کا جلوہ دیکھنے لگتا ہے۔ یہی حال اللہ پر ایمان لانے والے کا ہوتا ہے۔ وہ آسمان کی وسعتوں میں خدا کی عظمت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ طوفانوں کی قہرمانی میں اس کو خدا کا جلال دکھائی دیتا ہے۔ چڑیوں کے چہچہے میں اس کو خدا کے نغمے سنائی دیتے ہیں۔ سورج نکلتا ہے تو اس کو محسوس ہوتا ہے کہ خدا نے اپنا نورانی ہاتھ اس کی طرف بڑھایا ہے۔ وہ درختوں کو دیکھتا ہے تو اس کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا خدا کی تخلیقی کہانی سرسبز صفحات کی صورت میں زمین کے اوپر پھیلا دی گئی ہے۔ ہوا کا جھونکا جب اس کو چھوتا ہے تو وہ اس کے لئے خدا سے اتصال کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ غرض جو شخص خدا کا مومن بن جائے وہ ہر آن خدا کے اتھاہ سمندر میں غوطہ لگاتا رہتا ہے۔ ہر تجربہ جو اس کے ساتھ گزرتا ہے وہ اس کو خدا سے ملانے والا بن جاتا ہے۔ وہ خدا کا ہو جاتا ہے اور خدا اس کا۔

اللہ پر ایمان ایک ایسے خدا پر ایمان ہے جو ساری کائنات کا خالق، مالک اور پروردگار ہے۔ اسی نے سب کچھ بنایا ہے، اسی کے سہارے ہر چیز قائم ہے، اس کے بغیر کسی چیز کا کوئی وجود نہیں۔ ایمان آدمی کے اندر اس شعور کو زندہ کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس حیثیت سے دیکھنے لگتا ہے کہ وہ ایک خدا کا بندہ ہے، ہر چیز میں

س کو خدا کا کرشمہ نظر آتا ہے اور ہر عطیہ اس کو خدا کے ہاتھ سے ملی ہوئی چیز دکھائی دیتا ہے۔ خدا کا ذکر اور اس کی حمد ہر آن اس کے اندر سے ابلتی رہتی ہے۔ ایسے آدمی کے لمحات غفلت کے لمحات نہیں ہوتے بلکہ ہوش مندی کے لمحات ہوتے ہیں۔ ہر موقع اس کے لئے خدا کی یاد دلانے والا بن جاتا ہے۔ دن بھر کا تھکا ہوا شام کو وہ اپنے بستر پر لیٹتا ہے اس کو گہری نیند آجاتی ہے۔ صبح کو وہ تازہ دم ہو کر اٹھتا ہے تو بے حساب احسان مندی کے جذبہ کے تحت اس کی زبان سے نکلتا ہے: خدایا تیرا یہ احسان بھی کیسا عجیب ہے۔ اگر آدمی پر نیند نہ آئے تو وہ پاگل ہو جائے اور چند دن کی زندگی بھی اس کے لئے محال ہو جائے۔ رات کی تاریکی کے بعد جب سورج نکلتا ہے اور دنیا کو روشن کر دیتا ہے تو اس کا دل بے اختیار پکار اٹھتا ہے: کیسی بابرکت ہے وہ ذات جس نے روشنی پیدا کی۔ اگر روشنی نہ ہو تو سارا عالم تاریکی کا مہیب سمندر بن جائے۔ جب اس کو بھوک لگتی ہے، وہ پانی پیتا ہے اور کھانا کھاتا ہے تو اس کی پوری ہستی شکر کی کیفیت سے بھر جاتی ہے۔ وہ حیران ہو کر سوچنے لگتا ہے کہ خدا اگر آدمی کے لئے کھانا اور پانی نہ اتارتا تو آدمی کا کیا حال ہوتا۔ اس کو چوٹ لگتی ہے تو وہ خدا کو مدد کے لئے پکارتا ہے۔ اس کو حاجتیں پیش آتی ہیں تو وہ خدا ہی سے امید کرتا ہے کہ وہ اس کی حاجتوں کو پورا فرمائے گا۔ اس کو نفع ملتا ہے تو اس کو انسان کے اوپر خدا کی نوازشیں یاد آتی ہیں۔ اور اس کا دل شکر کے جذبات سے بھر جاتا ہے۔ اس کو نقصان پہنچتا ہے تو اس کو وہ خدا کی قدرت کا ایک کرشمہ سمجھتا ہے۔ نعمتوں کا ملنا اس کو متمرد نہیں بناتا اور نقصان اس کے اندر بے صبری پیدا نہیں کرتا۔ کوئی عقیدت اس کے لئے خدا کی حریف نہیں بنتی۔ کوئی مصلحت اس کو خدا سے بے پروا نہیں کرتی۔

ایک شخص زمین اور دوسرے اجرام کی قوت کشش کو دریافت کرے یا کائناتی شعاعوں کو اپنے آلات کی مدد سے پالے تو یہ اس کے لئے محض ایک علمی یافت ہوگی۔ یہ پانے والے سے کسی ذمہ داری کا تقاضا نہیں کرے گی۔ مگر خدا کو پانے کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ خدا کو پانا ایک ایسی ہستی کو پانا ہے جو سننے والا اور جاننے والا ہے۔ جو حکمت اور طاقت کا خزانہ ہے۔ ایسے خدا کو جب ایک شخص پاتا ہے تو ٹھیک اسی وقت وہ اس حقیقت کو بھی پالیتا ہے کہ خدا نے اس کو اور اس کائنات کو عبث نہیں بنایا ہے۔ ایک عظیم الشان کائنات یوں ہی خاموش کھڑی رہے اور اس کی معنویت کبھی ظاہر نہ ہو، یہ ایک ایسی کائنات میں بالکل ناممکن ہے جس کا بنانے اور چلانے والا ایک علیم اور عزیز خدا ہو۔ اس طرح اس کی ایمانی یافت اس کو اس یقین تک پہنچاتی ہے کہ ضرور ہے کہ ایک دن ایسا آئے جب کہ وہ خدا لوگوں کے سامنے ظاہر ہو جائے جو کائنات کے تمام واقعات کے پیچھے کام کر رہا ہے۔ جب آدمی ان حقائق کو دیکھ کر جان لے جن کی بابت آج وہ نظر نہ آنے کی وجہ سے جھگڑ رہا ہے۔ پھر یہی یقین اس کو یہ بھی بتاتا ہے کہ کائنات کے خالق و مالک کا ظہور اس قسم کا غیر متعلق ظہور نہیں ہوگا جیسے تاریک رات کے بعد روشن سورج نکلتا ہے۔ یہ ایک باشعور اور محاسب و مجازی طاقت کا ظہور ہوگا۔ خداوند کائنات کا ظہور کائنات کے لئے قیامت کے ہم معنی بن جائے گا۔ خدا کے ظاہر ہوتے ہی اس کے تمام سرکش اور خود پرست بندے خدا کی اس دنیا میں بے قیمت ہو جائیں گے۔ وہ اس دن مکھی مچھر سے بھی زیادہ حقیر نظر آئیں گے۔ دوسری طرف اس کے خدا پرست اور وفادار بندے اچانک سرفرازی کا مقام

حاصل کریں گے۔ خدا کا غیب میں ہونا خدا کے غیر وفادار بندوں کو اچھل کود کے مواقع دئے ہوئے ہے۔ خدا کا ظاہر ہونا خدا کے وفادار بندوں کے لئے سرفرازی کا دن بن جائے گا۔ اس کے بعد، ایک نئی، زیادہ بہتر اور مکمل دنیا شروع ہوگی جہاں سرکش لوگ ابدی طور پر جہنم میں ڈال دیے جائیں گے اور وفادار لوگ ابدی طور پر جنت میں خوشیوں اور لذتوں کی زندگی گزاریں گے۔

جب آدمی اس یقین تک پہنچتا ہے تو وہ خدا کی ہیبت سے کانپ اٹھتا ہے۔ وہ پکار اٹھتا ہے: "خدایا مجھے اس دن رسوا ہونے سے بچا جب تو اپنی طاقتوں کے ساتھ ظاہر ہوگا۔ جب انصاف کا ترازو قائم کیا جائے گا۔ جب آدمی بالکل بے بس حالت میں تیرے سامنے کھڑا ہوگا۔ جب تیرے سوا کسی کے پاس کوئی اختیار نہ ہوگا"

خدا کو الٰہ بنانے ہی کا ایک پہلو رسول کی رسالت کو ماننا ہے۔ جب آدمی خدا کو ایک زندہ اور باشعور ہستی کی حیثیت سے پاتا ہے تو فوراً یہ سوال اس کے سامنے آجاتا ہے کہ میرا خدا مجھ سے کیا چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں اس کو اندرونی فطرت سے اشارے ملتے ہیں۔ کائنات اپنی خاموش زبان میں کچھ پیغامات نشر کرتی ہوئی نظر آتی ہے مگر وہ چاہتا ہے کہ اپنے رب کے پیغام کو یقینی زبان میں پالے، وہ آنے والے دن سے پہلے اس دن کے معاملات سے باخبر ہوجائے۔ عین اس وقت اس کو پیغمبر کی آواز سنائی دیتی ہے: "میں اللہ کا بندہ اور رسول ہوں، اللہ نے مجھ کو انسانوں کی ہدایت کے لئے بھیجا ہے۔ میری طرف آؤ اور مجھ سے اپنے رب کے پیغامات معلوم کرو"۔ جو انسان حقیقۃً طالب ہو، جو فی الواقع سچائی کی تلاش میں ہو، اس کے لئے اس آواز کو پہچاننا مشکل نہیں ہوتا۔ وہ تعصب اور غفلت کے ان تمام پردوں کو پہلے ہی پھاڑ چکا ہوتا ہے جو آدمی کو گھیرے رہتے ہیں اور سچائی کی آواز کو اس کے اندر داخل نہیں ہونے دیتے۔ ایک بچہ جس طرح اپنی ماں کی آواز کو پہچان لیتا ہے، اسی طرح وہ اس پیغام کو پہچان لیتا ہے جو پیغمبر کی معرفت اس کے رب کی طرف سے اس کو پہنچ رہی ہے۔ پیغمبر کی آواز اس کے لئے ایسی ہی ثابت ہوتی ہے جیسے پٹرول کی آگ یا سوکھی زمین میں بارش۔ اس کا پورا اندرونی وجود ربانی روشنی سے بھڑک اٹھتا ہے۔ اس کی تلاش کی سوکھی زمین حق کی بارش کے ایک ایک قطرہ کو جذب کرتی چلی جاتی ہے۔ وہ خدا کو پانے کے ساتھ اس کے پیغمبر کو پالیتا ہے اور پیغمبر کو پانے کے ساتھ اپنے خدا کو۔

رسول کوئی فرشتہ یا کوئی غیر انسانی وجود نہیں۔ وہ بھی ایک انسان ہے اور سارے انسانوں کی طرح ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کی خصوصیت صرف یہ ہے کہ خدا نے اس کو اپنی پیغام رسانی کے لئے چن لیا۔ خدا نے دیکھا کہ وہ ایک ایسا انسان ہے جس کی فطرت پوری طرح زندہ ہے۔ جس کے قول و عمل میں تضاد نہیں۔ جس نے نبوت سے پہلے چالیس سال کی عمر تک کبھی ایک بار بھی امانت کی ادائگی میں کوتاہی نہیں کی۔ وہ سچا ہے، وعدہ پورا کرنے والا ہے، وہ اپنے سینہ میں انسانیت کا درد رکھتا ہے، وہ حق کے لئے اس سے زیادہ بے چین ہوتا ہے جتنا کوئی شخص اپنے ذاتی منافع کے لئے بے چین ہوتا ہے۔ خدا نے محمد بن عبد اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں وہ خالص روح پائی جو حق کی امانت کا امین ہو سکے۔ اس نے اس کے اندر وہ غیر مصلحت پرستانہ کردار پایا جو کسی ادنیٰ لچک کے بغیر ربانی ذمہ داری

کو ادا کر سکے۔ اس نے اس عربی انسان میں وہ طلب دیکھی جو اس بات کی ضمانت تھی کہ وہ خدا کی الہامی امانت کی پوری قدر دانی کرے گا اور اس کو اسی طرح لے گا جس طرح اس کو لینا چاہئے۔ ان پہلوؤں میں یہ عربی انسان چالیس برس کی زندگی تک انتہائی مکمل ثابت ہوا۔ اس لئے خدا نے اس کو اپنے آخری اور عالمی پیغمبر کی حیثیت سے چن لیا اور اس انسان کامل نے اپنی نبوت کی ۲۳ سال کی زندگی سے ثابت کر دیا کہ خدا کا یہ انتخاب انتہائی درست تھا۔ اس انسان کامل نے پیغمبری کی ذمہ داری کو اتنی معیاری صورت میں انجام دیا کہ اس سے زیادہ معیاری صورت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

پیغمبر کے ذریعہ ہم کو خدا کی وہ محفوظ کتاب ملی ہے جو اس کے اوپر فرشتہ کے ذریعہ اتاری گئی۔ اس کتاب میں وہ تمام چیزیں لکھی ہوئی صورت میں موجود ہیں جو اللہ کو ہم سے مطلوب ہیں۔ قرآن میں اللہ ہم سے انسانی زبان میں ہم کلام ہوتا ہے۔ پیغمبر نے اور آپ کے ساتھیوں نے ہر قسم کا بہترین اہتمام کر کے اس کو اس کی اصلی شکل میں محفوظ رکھا اور ہم کو پوری طرح پہنچا دیا۔ پیغمبر نہ صرف خدائی الہام کو وصول کرنے والا تھا بلکہ اس نے کامل اور مکمل صورت میں اس کو اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ اس طرح پیغمبر کی زندگی اس ربانی ہدایت کا عملی نمونہ بن گئی جو قرآن میں لفظوں کی صورت میں ظاہر کی گئی تھی۔ پیغمبر نے گھریلو زندگی بنائی۔ وہ بستی اور بازار میں لوگوں کے درمیان رہا۔ اس نے دوستوں اور دشمنوں سے معاملہ کیا۔ اس کو فتح و شکست کے مواقع پیش آئے۔ اس نے دعوت دی اور دعوتی مراحل سے گزرا۔ اس کو بھوک لگی اور اس نے چوٹ کھائی۔ اس نے مفلسی اور دولت مندی کے دن دیکھے۔ غرض ایک عام آدمی سے لے کر ایک جج اور بادشاہ تک انسانی زندگی کے جتنے مختلف تجربات ہیں، سب اس پر گزرے۔ ہر جگہ اس نے ایک ربانی انسان کا رویہ اختیار کیا۔ اس طرح اس کی زندگی قیامت تک تمام انسانوں کے لئے مکمل نمونہ بن گئی۔ ہر وہ آدمی جو اپنے رب کے یہاں اس حال میں پہنچنا چاہتا ہے کہ اس کا رب اس سے راضی ہو اور اس کو ابدی باغوں والے گھر میں داخل کرے، اس کے لئے ایک ہی راہ ہے۔ وہ قرآن سے اللہ کا حکم معلوم کرے اور پیغمبر کی زندگی میں اس حکم کا عملی نمونہ دیکھے اور ان دونوں چیزوں کی روشنی میں اپنی زندگی گزارنے لگے۔ اس کے سوا جتنی صورتیں ہیں سب بھٹکنے کی صورتیں ہیں، نجات کی صورت اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ پیغمبر کی زندگی ایک ایسی مکمل زندگی ہے جس میں چھوٹے لوگوں کے لئے بھی نمونہ ہے اور بڑے لوگوں کے لئے بھی۔

۲۔ اسلام کا دوسرا رکن نماز ہے۔ نماز اپنی متعین شکل کے اعتبار سے یہ ہے کہ روزانہ دن رات کے درمیان پانچ وقت مقررہ انداز میں اللہ کی عبادت کی جائے۔ یہ انداز جو رسول کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں سکھایا ہے، اتنا جامع ہے کہ اس سے زیادہ بہتر عبادتی انداز کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ جب وقت آتا ہے تو اذان کے ذریعہ اللہ کی بڑائی کا اعلان کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ نماز کا وقت آگیا۔ اپنی فلاح کے لئے جمع ہو جاؤ۔ لوگ وضو کر کے اپنے پاکی کے احساس کو تازہ کرتے ہیں۔ پھر اللہ کو یاد کرتے ہوئے مسجد پہنچتے ہیں۔ وہاں سب مل کر نماز ادا کرتے ہیں۔ نماز کا ایک امام ہوتا ہے جس کی رہنمائی میں اجتماعی نماز ادا کی جاتی ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے

کہ اسی طرح سارے مسلمان خدا کے رسول کو اپنا مرکز اجتماع قرار دے کر اس کے گرد متحدہ زندگی گزاریں گے۔
رکوع و سجود اور قیام و قعود کی مختلف حالتوں کے ذریعہ خدا کے سامنے اپنی بندگی کا اقرار کیا جاتا ہے۔ کبھی دست کھڑے ہو کر، کبھی جھک کر، کبھی نیازمندانہ بیٹھ کر کبھی اپنے سر کو زمین پر رکھ کر خدا کے ساتھ اپنے عہد بندگی کو تازہ کر ہیں۔ نماز میں قرآن کے حصے پڑھے جاتے ہیں۔ قرآن کی ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ اس کو جہاں کہیں سے اور جتنا بھی پڑھیے، قرآن کی دعوت کا تعارف مل جاتا ہے۔ قرآن کا ہر صفحہ گویا قرآن کا خلاصہ ہے۔ اس طرح نماز میں اگر بیک وقت قرآن کا مختصر حصہ پڑھا جاتا ہے مگر وہ اللہ کی پسند و ناپسند کو جاننے کے لئے ہمیشہ کافی ہوتا ہے اسی کے ساتھ نماز میں خدا کی حمد اور ذکر کے کلمات بولے جاتے ہیں، اس سے دعا کی جاتی ہے، رسول کے لئے ا تمام اہل ایمان کے لئے نیک جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کا خاتمہ تمام انسانوں کو سلامتی بھیج کر کیا ج ہے۔ اس طرح اپنے مختلف اجزاء کے ذریعہ نماز ایک ایسا عمل بن جاتی ہے جو بیک وقت اللہ کی عبادت بھی ہے ا اللہ کے حکموں کی یاددہانی بھی۔ وہ اہل ایمان کے لئے دینی غذا بھی ہے اور ان کے درمیان اتحاد و اجتماعیت ذریعہ بھی۔ وہ اسلامی زندگی کا نشان بھی ہے اور نظم و ضبط کی تربیت بھی۔ وہ اللہ سے روحانی اتصال کا مقا بھی ہے اور روزمرہ کی زندگی میں حرکت و عمل کا سبق بھی۔

نماز اپنی شکل کے اعتبار سے مخصوص عبادت کا نام ہے اور اپنی حقیقت کے اعتبار سے تواضع اور توجہ الی اللہ ک اپنے مقابلہ میں کسی کی عظمت تسلیم کرنے کے لئے آدمی زبان سے جو آخری کلمہ بول سکتا ہے وہ یہ کہ وہ کہے "وہ سب بڑا ہے"۔ نماز میں بار بار یہ کلمہ (اللہ اکبر) خدا کے لئے بولا جاتا ہے اور اس طرح اپنے مقابلہ میں خدا کی مطلق کبریائی لسانی اقرار کیا جاتا ہے۔ جسمانی طور پر کسی کی بڑائی کے اعتراف کی آخری صورت سجدہ ہے۔ سجدہ سے بڑھ کر کوئی صورت نہیں ہو سکتی جس سے آدمی دوسرے کی عظمت کا جسمانی اعتراف کرے۔ نماز میں بار بار خدا کے آگے سجدہ کر کے خدا بے مثال عظمتوں کا عملی اعتراف کیا جاتا ہے۔ کسی کو اپنی زندگی کا مرکز و محور بنانے کی سب سے زیادہ کامیاب ہیئت جو تصور کی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی اپنے چہرے کا رخ پوری طرح اس کی طرف کر دے۔ نماز میں بیت اللہ کی ط رخ کا اہتمام کر کے ظاہر کیا جاتا ہے کہ بندے نے اپنی زندگی کو خدا کی طرف موڑ دیا، اس نے اپنی زندگی کو اندر سے لے کر باہر تک خدا رخی (God-oriented) بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

اللہ کے آگے بندے کے اس جھکاؤ سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ صرف خدا کے سامنے جھکاؤ تک نہ رہتی، وہ اس کی مستقل کیفیت بن جاتی ہے۔ جو آدمی اللہ سے ڈرنے لگے۔ جو اللہ کے آگے جھک جائے۔ جو اللہ کے مقابلہ میں اپنے کو بے حقیقت بنائے وہ بندوں کے سامنے آئے گا تو ناممکن ہے کہ یہاں اس کے رویہ میں اس عبادتی اثرات ظاہر نہ ہوں۔ وہ انسان کے آگے سجدہ میں نہیں گرے گا مگر وہ انسان کے مقابلہ میں گھمنڈ بھی نہیں دکھائے گا۔ وہ انسان کو "تو بڑا ہے" نہیں کہے گا مگر اپنی بڑائی کا سکہ اس پر قائم کرنے کی کوشش بھی نہیں کرے گا۔ نما میں اس کا ساجد بننا بندوں کے مقابلہ میں تواضع کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ زمانہ میں اس کا خدا کی تابعداری کا اقرار ک

بندوں کے معاملات میں حقوق کی ادائگی کی صورت میں ظاہر ہوگا نماز میں اس کی رخ بندی بندوں کے معاملات میں اصولی پابندی کی صورت میں ظاہر ہوگی۔ وہ انسان جو خدا کے سامنے کامل بندگی کا اقرار کرکے مسجد سے نکلا تھا، وہ بندوں کے درمیان کامل اخلاق کا نمونہ بنا ہوا دکھائی دے گا۔ نماز کسی بندہ کے معاملات کو خدا کے ساتھ عجز کی بنیاد پر قائم کرتی ہے اور بندوں کے ساتھ اس کے معاملات کو تواضع کی بنیاد پر۔

روزانہ پانچ وقت کی نمازوں کے علاوہ نماز کی اور بھی کئی صورتیں ہیں۔ رات کو تہجد کی نماز، کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آنے کے وقت کی نماز، حاجت اور استخارہ کی نماز، اسی طرح جمعہ اور عیدین کی جماعت، جنازہ کی نماز جماعت، وغیرہ۔ یہ نمازیں اسی کیفیت کو مزید اضافہ کے ساتھ حاصل کرنے کی کوششیں ہیں جو پنج وقتہ نمازوں سے ہر روز مطلوب ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نماز اگر پوری طرح کسی کو مل جائے تو وہ اس کی پوری زندگی میں شامل ہو جاتی ہے۔ وہ ایک نیا کام شروع کرے تو دو رکعت نماز پڑھ کر خدا سے مدد کی درخواست کرتا ہے، وہ کسی مقام پر پہلی بار جائے تو وہاں وہ نماز پڑھ کر اپنے رب کی یاد کرتا ہے۔ کوئی مسئلہ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو تو نماز پڑھ کر اپنے دل کی گرہ کو کھولنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی حال بندوں سے تعلقات کے معاملہ میں بھی ہوتا ہے۔ بندوں سے معاملہ کرتے ہوئے اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا نماز اس کے ساتھ ایک خدائی نگراں کی طرح لگی ہوئی ہے۔ دنیا کی پھیلی ہوئی زندگی میں اپنا حصہ ادا کرتے ہوئے اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ساری زمین خدا کی مسجد ہے اور ہر جگہ اس کو اپنی عبادت گزاری کے تقاضے پورے کرنے ہیں

۳۔ اسلام کا تیسرا رکن روزہ ہے۔ روزہ میں آدمی صبح کو فجر سے لے کر شام کو سورج ڈوبنے تک نہ کوئی کھانے کی چیز کھاتا اور نہ پینے کی چیز پیتا۔ اس طرح اپنی زندگی کی سب سے بڑی ضرورت کو چھوڑ کر وہ صبر اور رکنے اور برداشت کرنے کی تربیت حاصل کرتا ہے۔ کھانا پینا چھوڑنے کی وجہ سے اس کو دن میں بھوک لگتی ہے۔ پیاس ستاتی ہے، اس کا جسم کمزور ہو جاتا ہے۔ اس کے معمولات درہم برہم ہو جاتے ہیں۔ اس کی پوری زندگی کا نظام تلپٹ ہو جاتا ہے۔ مگر وہ ان تمام چیزوں کو برداشت کرتا ہے۔ وہ ناخوش گواریوں کو جھیلتا ہے۔ وہ اپنی جسمانی تکلیفوں پر قابو رکھتے ہوئے اپنے ہوش و حواس کو برقرار رکھتا ہے۔ وہ مشکلات کے باوجود اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں لگا رہتا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے پانی ہوتا ہے مگر پیاس کے باوجود وہ اس کو نہیں پیتا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے کھانا ہوتا ہے مگر بھوک کے باوجود وہ اس کو نہیں کھاتا، اس طرح وہ اپنے آپ کو اس کے لئے تیار کرتا ہے کہ وہ ایک پابند اور ذمہ دار زندگی گزارے۔ وہ وہی کرے جو اس کو کرنا چاہئے۔ اور وہ نہ کرے جو اس کو نہیں کرنا چاہئے۔ خواہ کسی بھی قسم کی مشکل پیش آئے، ہر حال میں اصل مقصد حیات کی طرف اپنے سفر کو جاری رکھے۔

خدا نے دنیا کی زندگی میں بے حساب نعمتیں انسان کو دے رکھی ہیں۔ مگر یہ نعمتیں خود بخود ملتی رہتی ہیں اس لئے آدمی کو ان کا احساس نہیں ہوتا۔ آدمی کو ایک بے حساب قسم کا پیچیدہ جسمانی نظام دیا گیا ہے۔ ایک رگ میں

فرق آجائے تو سارے جسم کا توازن بگڑ جائے۔ دنیا میں دھوپ، ہوا، پانی اور لاتعداد دوسری چیزیں حیرت انگیز طور پر اس کے لئے کارآمد بنا دی گئی ہیں۔ اگر ایک چیز بھی ان میں سے نہ رہے تو زندگی عذاب بن جائے۔ یہ تمام چیزیں بغیر کسی اکتسابی کوشش کے آدمی کو ملتی رہتی ہیں اس لئے آدمی ان کی اہمیت کو سمجھ نہیں پاتا۔ روزہ میں انسان کو اس کی انتہائی بنیادی ضرورت سے عارضی طور پر کچھ دیر کے لئے روکا جاتا ہے۔ اور اس طرح اس کے اندر خدائی نعمتوں کا شعور جگایا جاتا ہے۔ دن بھر کی بھوک، پیاس، تھکن اور بے آرامی کے بعد شام کو جب آدمی کھانا کھاتا ہے اور پانی پیتا ہے تو اس کو اپنی محتاجی اور خدا کی بے پناہ بخششوں کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے شکر کے جذبہ سے بھر جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ جس خدا نے ایسی نعمتیں دی ہیں، اس کے لئے اگر میں اپنی پوری زندگی بھی قربان کر دوں تو حق ادا نہیں ہو سکتا۔

دنیا میں مومن کو جو زندگی گزارنی ہے وہ سرتاپا صبر کی زندگی ہے۔ اس کو اللہ کی جائز کی ہوئی چیزوں تک اپنے کو محدود رکھنا ہے، اس کی ناجائز کی ہوئی چیزوں کو ہاتھ نہیں لگانا ہے۔ حق پرستانہ زندگی کی راہ میں آنے والی مشکلات کو برداشت کرنا ہے۔ دوسروں کی طرف سے پیش آنے والی تکلیفوں کا جواب دینے میں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا ہے بلکہ ان کو سہتے ہوئے اپنے فریضہ حیات کو پورا کرنے میں لگے رہنا ہے۔ اس کو دنیا کے نقصانات کی پرواہ کئے ہوئے آخرت کی طرف اپنے سفر کو جاری رکھنا ہے۔ ایسے تمام مواقع پر جب کہ اس کے نفس کو چوٹ لگے، جب اس کے اندر کوئی ناپسندیدہ بات پیش آنے کی وجہ سے اشتعال پیدا ہو، تو اس کو منفی ردعمل سے اپنے آپ کو بچانا ہے اور ہر حال میں اپنے آپ کو مثبت مقاصد کے لئے وقف رکھنا ہے۔ یہ تمام چیزیں بے پناہ صبر و برداشت چاہتی ہیں۔ صبر کے بغیر کوئی شخص اسلام کے راستہ کا مسافر نہیں بن سکتا۔ روزہ ہر سال اسی صبر کا سبق دیتا ہے۔ وہ ایک مہینہ تک صابرانہ زندگی کی مشق کرا کر آدمی کو تیار کرتا ہے کہ وہ سال کے بقیہ مہینوں کو صبر کے ساتھ گزار سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ مومن کی پوری زندگی ایک قسم کی روزہ دار زندگی ہے۔ اس کو تمام عمر برائی سے، منفی تدبیروں سے، بے صبری کے اقدامات سے، دوسروں کو ستانے سے، اللہ کے حرام کو حلال کرنے سے روزہ رکھ لینا ہے۔ سال کے ایک مہینہ میں ضروریات زندگی پر پابندی لگا کر اسی قسم کی "روزہ دار" زندگی کی مشق کرائی جاتی ہے۔ روزہ اپنی شکل کے اعتبار سے مقررہ اوقات کے لئے کھانا پانی چھوڑنا ہے اور اپنی حقیقت کے اعتبار سے صابرانہ زندگی کی تربیت۔

۴۔ اسلام کا چوتھا رکن زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ کا مطلب یہ ہے کہ اپنی کمائی اور اپنی دولت سے ہر سال ایک مقررہ رقم (عام طور پر ڈھائی فی صد) اللہ کے نام پر نکالی جائے۔ اور اس کو دین کی ضرورتوں اور حاجت مندوں کے اوپر خرچ کیا جائے۔ یہ زکوٰۃ ایک قسم کی سالانہ یاد دہانی ہے کہ انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ خدا کا ہے، اس کو چاہئے کہ اپنی کسی چیز کو خدا سے بچا کر نہ رکھے۔ دنیا میں آدمی جو کچھ حاصل کرتا ہے، اس کا اپنا حصہ اس میں بہت تھوڑا ہوتا ہے زمین و آسمان کے اندر جو بے شمار اعلیٰ ترین انتظامات ہیں اگر وہ ساتھ نہ دیں تو آدمی نہ کوئی دانہ اگا سکے، نہ مویشیوں کی پرورش کر سکے۔ نہ صنعتیں قائم ہو سکیں، نہ اور کوئی کام کرنا ممکن ہو۔ انسان کے اپنے وجود سے

لے کر باہر کے عالم تک جو خدائی انتظامات ہیں، ان میں سے کوئی ایک چیز بھی اگر خدا واپس لے لے تو آدمی کی ساری کوششیں اور منصوبے اکارت چلے جائیں اور کوئی نتیجہ پیدا نہ کریں۔

زکوٰۃ اسی حقیقت واقعہ کا مالی اعتراف ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ آدمی اپنے مال کو خدا کا مال سمجھے۔ اپنی کمائی میں خدا کا حق تسلیم کرے۔ اس معاملہ میں زیادہ کی کوئی حد نہیں ہے۔ تاہم کم سے کم کی حد مقرر کر دی گئی ہے۔ قانونی زکوٰۃ کی صورت میں آدمی ہر سال کم سے کم خدا کا حق نکالتا ہے اور اس کو جمع کرکے خدا کی مقرر کی ہوئی مدوں میں خرچ کیا جاتا ہے۔ اس نکالنے میں آدمی کو نہ تو یہ اجازت ہے کہ وہ اس کو دوسروں کے اوپر احسان سمجھے اور نہ اس کو ایسا کرنا چاہئے کہ پانے والوں کو ذلیل کرے۔ اس کو اس جذبہ کے تحت دینا چاہئے کہ یہ خدا کی طرف سے آیا ہوا دوسروں کا حصہ ہے اور وہ اس کو حق داروں کی طرف لوٹا رہا ہے۔ وہ اس لئے دوسروں کو کھلائے تاکہ خدا آخرت کے دن اس کو کھلائے، وہ اس لئے دے تاکہ خدا آخرت کے دن اس کو محروم نہ کرے۔

زکوٰۃ ان ذمہ داریوں کی ایک علامت ہے جو ایک آدمی کو دوسرے انسانوں کے درمیان ادا کرنا ہے۔ وہ ذمہ داری یہ ہے کہ ہر آدمی دوسرے آدمی کا حق پہچانے، ہر آدمی دوسرے آدمی کے لئے دردمند ہو۔ یہ جذبات یہاں تک ترقی کریں کہ آدمی خود اپنی چیزوں تک میں دوسرے کا حصہ سمجھنے لگے۔ دوسرے سے کوئی معاوضہ نہ ملتے ہوئے بھی وہ اس کے کام آئے۔ دوسرے سے نفع کی امید نہ ہوتے ہوئے بھی وہ اس کی عزت کا نگہبان ہو۔ دوسرے سے رشتہ اور دوستی کا تعلق نہ ہوتے ہوئے بھی وہ اس کا خیر خواہ ہو۔ زکوٰۃ ایک طرف آدمی کو یہ سبق دیتی ہے کہ اس کی ہر چیز خدا کا عطیہ ہے۔ دوسری طرف اس کو یہ احساس دلاتی ہے کہ تم اگر خدا کے بندے ہو تو تم کو معاشرہ کے اندر بے درد اور خود غرض بن کر نہیں رہنا چاہئے۔ بلکہ تمہاری زندگی میں دوسروں کا بھی حصہ ہونا چاہئے۔

سماجی تنظیم کی ایک صورت یہ ہے کہ آدمی دوسرے کے کام صرف اس وقت آئے جب کہ اس کو دوسرے سے نفع کی امید ہو۔ وہ کسی کو قرض دے تو اس اعتماد پر دے کہ وہ سود کے ساتھ اس کی طرف اضافہ شدہ حالت میں لوٹے گا۔ ایسے معاشرہ میں استحصال کا مزاج فروغ پاتا ہے۔ ہر آدمی دوسرے آدمی کو دباتا اور لوٹنا چاہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پورا سماج بدنظمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایسے سماج میں کسی کو بھی سکون حاصل نہیں رہتا۔ خواہ وہ امیر ہو یا غریب۔ سماجی تنظیم کی دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی خدا سے بدلہ پانے کی امید پر دوسرے انسان کے کام آئے۔ وہ اس خدائی یقین دہانی کی بنیاد پر دوسرے کو دے کہ خدا اس کو آخرت میں بہت زیادہ بڑھا کر لوٹائے گا۔ ایسے معاشرہ میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت اور بے تعلقی کے جذبات فروغ نہیں پاتے۔ لوگ ایک دوسرے کو استحصال کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ سماج میں باہمی ناراضی اور انتشار کی فضا پیدا نہیں ہوتی۔ ہر ایک دوسرے کی طرف سے امن میں رہتا ہے اور پورا سماج سکون اور خوش حالی کا سماج بن جاتا ہے۔ زکوٰۃ قانونی اعتبار سے ایک قسم کا سالانہ ٹیکس ہے اور حقیقت کے اعتبار سے اپنی ملکیت میں خدا اور بندے کے حق کا اعتراف۔

۵۔ اسلام کا پانچواں رکن حج ہے۔ سال میں ایک بار ساری دنیا کے مسلمان مرکز اسلام میں جمع ہوتے ہیں

اور وہاں مخصوص اجتماعی عبادات انجام دیتے ہیں۔ حج کی عبادات کیا ہیں ــــ یہ دراصل ان اسلامی تعلیمات کو علامتی طور پر دہراتا ہے جو اسلام میں معنوی طور پر مطلوب ہیں۔ یہ اسلام کے احکام کو مخصوص صورتوں میں متشکل کرکے اللہ سے یہ عملی عہد کرنا ہے کہ آدمی انھیں بنیادوں پر اپنی زندگی کو قائم کرے گا۔ اسلام کی دوسری عبادات میں بھی اگرچہ یہ پہلو موجود ہے۔ تاہم حج میں زیادہ بڑے پیمانہ پر اور مجموعی شکل میں یہ تمام چیزیں اکٹھا کردی گئی ہیں۔

اسلام چاہتا ہے کہ انسانوں کے درمیان ہر قسم کے مصنوعی امتیازات ختم ہو جائیں اور تمام انسان ایک خدا کے بندے بن کر دنیا میں زندگی گزاریں، احرام باندھنا اسی کی ایک عملی صورت ہے جس میں مختلف قوموں اور مختلف ملکوں کے لوگ یکساں طور پر ایک ہی سادہ لباس پہنے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اسلام چاہتاہے کہ آدمی کی زندگی خدا کے گرد گھومنے لگے، کعبہ کے گرد طواف کرنا اسی کا ایک علامتی مظاہرہ ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ خدا کے بندے خدا کی راہ میں دوڑ دھوپ کرنے والے بنیں، صفا و مروہ کے درمیان دوڑ (سعی) اسی کی ایک مشق ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ جب خدا کی پکار بلند ہو تو اس کے بندے اس کی پکار پر دوڑ پڑیں، حج کے دوران بار بار لبیک اللھم لبیک (حاضر ہوں خدایا میں حاضر ہوں) کہنا اسی کا ایک عملی اقرار ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ آدمی اس دن کو یاد کرے جب کہ سارے انسان خدا کے یہاں جمع کئے جائیں گے، عرفات کے وسیع کھلے ہوئے میدان میں تمام حاجیوں کا قیام اسی کی ایک ظاہری یاددہانی ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ آدمی شیطان سے بیزار ہو اور ہمیشہ اس کو اپنے سے دور بھگاتا رہے، رمی جمار کے موقع پر شیطان کی پتھر کی علامتوں پر کنکریاں مارنا اسی کا ایک عملی سبق ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ انسان ہر حال میں خدا کے عہد پر قائم رہے خواہ ایسا کرنا اس کے لئے جان و مال کی قربانی کی قیمت پر کیوں نہ ہو، منیٰ میں جانور کو قربان کرنا اسی کی کی ایک خارجی علامت ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں لوگ ایک دوسرے کی طرف سے پیش آنے والی ناگواریوں کو برداشت کریں، حج کے زمانہ میں اس کی خصوصی تربیت ہوتی ہے۔ مختلف قسم کے لاکھوں لوگ بیک وقت ایک مقام پر جمع ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بار بار ایسے مواقع آتے ہیں جب کہ ایک کو دوسرے سے تکلیف پہنچے۔ حج کے دنوں میں خصوصی طور پر لازم کر دیا گیا کہ غصہ، بدکلامی، مارپیٹ، کسی جان کو تکلیف پہنچانا، بےحیائی اور بددیانتی کے کام سے مکمل پرہیز کیا جائے۔ اللہ سے بہتر سلوک پانے کے شوق میں بندوں کے ساتھ بہتر سلوک کیا جائے۔

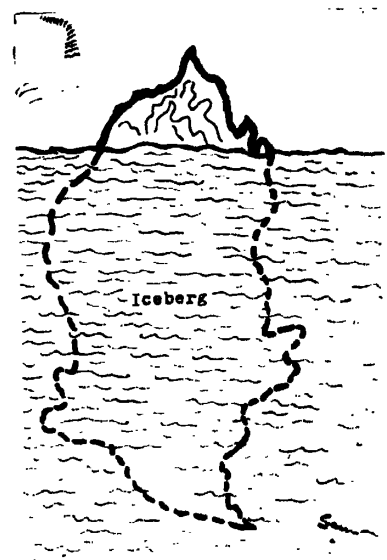
حج خدارخی زندگی گزارنے کا سبق ہے۔ وہ آخرت کے ہولناک دن کو یاد دلاتا ہے۔ وہ خدا کے لئے سرگرم ہونے کا ریہرسل ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ آدمی کو خدا کے راستہ میں جدوجہد کرنے والا بننا چاہئے۔ وہ انسان کو بتاتا ہے کہ تمھارا سب سے بڑا دشمن شیطان ہے اس کو کبھی اپنے قریب آنے کا موقع نہ دو۔ اس کا پیغام ہے کہ اللہ کے انعامات حاصل کرنا چاہتے ہو تو اللہ کے لئے اپنے جان و مال کو قربان کر دو۔ وہ عملی حالات پیدا کرکے بتاتا ہے کہ مختلف انسانوں کو ایک دوسرے کی ناخوش گواریاں کو برداشت کرتے ہوئے انصاف اور خیرخواہی کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہئے۔ وہ انسانی مساوات کا عظیم الشان مظاہرہ ہے

غرض حج ایک ایسی مکمل عبادت ہے کہ آدمی اگر اس کو صحیح طور پر انجام دے تو اس کے تمام معاملات درست ہو جائیں۔ خواہ یہ معاملات خدا سے متعلق ہوں یا انسانوں سے متعلق۔

آخرت کی دنیا

قطب جنوبی کے سمندروں میں برف کے بہت بڑے بڑے تودے ہوتے ہیں جن کو آئس برگ (Iceberg) کہا جاتا ہے۔ یہ برفانی پہاڑ سطح سمندر پر تیرتے رہتے ہیں۔ ان کے حجم کا دس میں تقریباً نو حصہ پانی کے اندر ڈوبا رہتا ہے اور صرف ایک حصہ پانی کے اوپر دکھائی دیتا ہے۔ ایسی ہی کچھ مثال ہماری زندگی کی ہے۔ خدا نے انسان کو ابدی مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا۔ پھر اس کی عمر کا الگ بھگ سو سال موجودہ دنیا میں رکھ کر بقیہ تمام عمر کو موت کے بعد آنے والی دوسری دنیا میں ڈال دیا۔ ہم ماں کے پیٹ میں پرورش پا کر اس دنیا میں آنکھ کھولتے ہیں۔ اور پھر بچپن، جوانی اور بڑھاپا کے مرحلوں سے گزر کر مر جاتے ہیں۔ تاہم موت ہماری زندگی کا خاتمہ نہیں۔ موت ہم کو دوبارہ ایک نئے پیٹ، کائنات کے پیٹ میں ڈال دیتی ہے۔ اس کے بعد انسان ایک اور عالم میں آنکھ کھولتا ہے۔ یہ آخرت کا عالم ہے۔ موجودہ دنیا عارضی ہے، آخرت کی دنیا ابدی ہے۔ موجودہ دنیا کی تکلیفیں بھی معمولی ہیں اور لذتیں بھی معمولی — مگر اگلی دنیا میں دونوں چیزیں اپنی آخری انتہا پر ہوں گی۔ وہاں جس کے حصہ میں تکلیف آئے گی، وہ بدترین عذاب میں ہمیشہ کے لئے تڑپتا رہے گا۔ جس کے حصے میں راحتیں آئیں گی، وہ کمال درجہ کی راحتوں میں ابدی طور پر خوشیوں اور لذتوں کا لطف اٹھاتا رہے گا۔

امتحان کی مصلحت کی بنا پر آخرت کی دنیا کو ہماری نظروں سے اوجھل کر دیا گیا ہے۔ مگر ہمارے گرد و پیش



آدمی اگر یہ جان لے کہ موت کے دوسری طرف بھی ایک دنیا ہے جو زیادہ مکمل ہے تو موجودہ زندگی اس کے لئے بے حد بامعنی ہو جائے گی۔ وہ اپنی جدوجہد کی منزل کو پالے گا۔ اس کی زندگی —— آخرت رخی زندگی (Akhirat Oriented Life) ہو جائے گی جو بالآخر ایک شاندار کامیابی پر ختم ہوگی۔ اس کے برعکس جو شخص موت کے بعد آنے والی دنیا کو نہ دیکھ رہا ہو اس کی زندگی دنیا رخی زندگی ہوگی۔ اس کی کوششیں اسی دنیا میں بھٹکتی رہیں گی۔ مرنے کے بعد جب وہ اگلی وسیع تر دنیا میں داخل ہوگا تو اچانک اس کو معلوم ہوگا کہ یہاں کے لئے اس کے پاس کچھ نہیں وَمَالَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (البقرہ ۲۰۰)

ایسی نشانیاں ہیں جن کے ذریعہ سے ہم آخرت کی دنیا کو سمجھ سکتے ہیں۔

ایک کمرہ ہے۔ اس میں کچھ آدمی بیٹھے ہوئے ہیں۔ دیوار، فرنیچر، آدمی وغیرہ کی صورت میں جو چیزیں کمرہ کے اندر نظر آرہی ہیں، بظاہر وہی کمرہ کی کل دنیا ہے۔ اس کے سوا کوئی اور دنیا وہاں موجود نہیں۔ لیکن جب کمرہ میں رکھا ہوا ٹیلی وژن سٹ کھولا جاتا ہے تو اچانک معلوم ہوتا ہے کہ ہماری اس دنیا کے اندر ایک اور دنیا اپنے تمام اجزاء کے ساتھ موجود تھی۔ اس میں حرکت تھی، آوازیں تھیں۔ اس میں انسان جیسی ہستیاں تھیں۔ اس میں واقعات ہو رہے تھے۔ یہ سب مکمل طور پر موجود تھا مگر وہ دیکھنے والوں کے لئے غیر موجود بنا ہوا تھا۔ جب ٹیلی وژن کھولا گیا تو معلوم ہوا کہ ہماری محسوس دنیا کے اندر ایک اور مکمل دنیا موجود تھی۔ اگرچہ اس سے پہلے وہ ہم کو دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

یہ ایک معلوم مثال ہے جس سے آخرت کے معاملہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ہماری دنیا ایک دہرا وجود کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں ہماری محسوس دنیا کے اندر ایک اور دنیا چھپی ہوئی ہے۔ یہ آخرت کی دنیا ہے۔ ہم اپنی زندگی کا ابتدائی حصہ نظر آنے والی دنیا میں گزارتے ہیں۔ اس کے بعد موجودہ دنیا میں ہماری آنکھ بند ہو جاتی ہے اور ہم کو ایک اور دنیا میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ انسانی زندگی کا اصل مسئلہ یہی ہے کہ وہ آئندہ آنے والی دنیا میں کامیابی حاصل کرے۔ کیوں کہ وہ دنیا ابدی بھی ہے اور حقیقی بھی۔ اس دنیا کی تکلیفوں اور راحتوں کے مقابلہ میں موجودہ دنیا کی تکلیفوں اور راحتوں کی کوئی حقیقت نہیں۔

موجودہ دنیا میں بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان آزاد ہے کہ جو چاہے کرے۔ مگر یہ آزادی صرف اس لئے ہے کہ انسان حالت امتحان میں ہے۔ یہاں آدمی کو جانچ کر دیکھا جا رہا ہے کہ کون اچھا ہے، کون برا۔ اس جانچ کے لئے آزادانہ فضا ضروری تھی۔ ضروری تھا کہ آدمی کو اس بات کا کھلا موقع دیا جائے کہ وہ جس طرح چاہے رہے اور جس قسم کی چاہے زندگی گزارے۔ موجودہ ابتدائی دنیا اسی خاص ضرورت کے تحت خاص ڈھنگ سے بنائی گئی ہے۔ وہ تمام حالات یہاں جمع کئے گئے ہیں جو کسی آدمی کو عمل کا موقع دینے اور اس کے بعد اس پر حجت قائم کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ اس طرح لوگوں کو کسوٹی پر رکھ کر دیکھا جا رہا ہے کہ کون اگلی دنیا میں عزت کی جگہ دئے جانے کے قابل ہے اور کون اپنے ظلم اور نالائقی کی بنا پر اس کا مستحق ہے کہ اس کو ذلت کے گڑھے میں ڈال دیا جائے۔ موجودہ دنیا میں دونوں قسم کے آدمی ملے جلے ہیں۔ آخرت کی دنیا میں دونوں کو ان کے آج کے ریکارڈ کے مطابق چھانٹ دیا جائے گا۔ ایک طرف تکلیفوں اور مصیبتوں کا جہنم ہوگا اور برے لوگوں کو اس میں پُر عذاب زندگی گزارنے کے لئے ڈال دیا جائے گا۔ دوسری طرف ہر قسم کی راحتوں اور خوشیوں کی جنت ہوگی اور نیک لوگوں کو اس کا دائمی وارث بنا دیا جائے گا کہ وہ اس میں اپنا ٹھکانا بنائیں اور خوشیوں بھری زندگی گزاریں۔

اب آخرت کے مسئلہ کو ایک اور پہلو سے دیکھئے۔

ایک مرتبہ میں ایک بڑے سرکاری افسر سے ملا۔ شام کا وقت تھا۔ ہم لوگ ان کے شان دار بنگلہ کے لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ "مولانا صاحب" اچانک انھوں نے کہا "ہم لوگوں کی زندگی بھی کیسی بری زندگی ہے۔ اب دیکھئے۔ کل صبح کو سورج نکلنے سے پہلے مجھے ہوائی اڈہ پر جانا ہے۔ فلاں ملک کی اعلیٰ سیاسی شخصیت کا ہوائی جہاز ہماری زمین پر اترے گا۔ مجھ کو نہ صرف اپنی نیند کو چھوڑ کر ہوائی اڈہ پر پہنچنا ہے بلکہ دل میں نفرت کے باوجود مسکرا کر ان کا استقبال بھی کرنا ہے"

یہ ایک سادہ سی مثال ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بڑے لوگوں کی زندگیاں کس طرح دورخی ہوتی ہیں۔ ان کی زندگی کا ایک پہلو کار اور کوٹھی اور عزت اور اقتدار ہے۔ مگر اس کا ایک اور پہلو ہے جو اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ چیزیں انھیں ان باتوں کے نتیجہ میں ملتی ہیں۔ اگر آپ کسی بڑے آدمی کے اندر جھانک کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اس چمک دمک کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو سطحیت پر راضی کیا ہے، خوشامد، موقع پرستی، مصلحت پسندی، زمانہ سازی، بے ضمیری ظاہرداری، دوغلی، یہی وہ چیزیں ہیں جن کی قیمت ان کو ایک شان دار زندگی کی صورت میں ملتی ہے۔ ہر بڑے آدمی کی زندگی کے دورخ ہیں۔ ایک شان دار، دوسرا تاریک اور بے روح۔ وہ اپنے "انسانی وجود" کو قتل کرنے پر راضی ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوتا ہے کہ "حیوانی وجود" کی سطح پر اس کو جاہ وحشم کی ایک زندگی حاصل ہوسکے۔

عام انسان کی زندگی کے بھی اسی طرح دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک مزدور مئی جون کی گرمی میں کھلی دھوپ میں کام کر رہا ہے۔ وہ سر سے پاؤں تک پسینہ میں شرابور ہے۔ مگر اپنا کام کئے جا رہا ہے۔ وہ کیوں اپنے آپ کو مشقت کی آگ میں جلاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ اس "دھوپ" کا ایک "سایہ" بھی ہے۔ اس کی مزدوری کا ایک پہلو گرمی اور لو میں جھلسنا ہے اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ شام کو چند روپے حاصل کرے گا جس سے اس کے بیوی بچوں کی ضرورتیں پوری ہوں گی اور وہ رات کو اطمینان کی نیند سوئے گا۔

کسی عمل کے دورخ ہونے کا یہ وہ پہلو ہے جو صرف دنیوی اعتبار سے پایا جاتا ہے۔ اسی طرح دنیا اور آخرت کے اعتبار سے بھی عمل کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ہر عمل جو آدمی اس دنیا میں کرتا ہے، اس کا ایک رخ وہ ہے جو دنیا میں نظر آتا ہے۔ دوسرا وہ ہے جو آخرت میں مترتب ہو رہا ہے۔ آج ہم اپنے عمل کے دنیوی پہلو کو بھگتتے ہیں۔ کل ہم اپنے عمل کے اخروی پہلو کو پائیں گے آج ہم زندگی کے ایک سمت میں کھڑے ہیں۔ اس لئے ہم کو اعمال کا ایک ہی رخ دکھائی دیتا ہے۔ قیامت ہم کو ایک ایسے مقام پر کھڑا کر دے گی جہاں دونوں رخ ہمارے سامنے آجائیں گے۔ جس طرح دیوار کے اوپر کھڑا ہوا آدمی دیوار کے دونوں طرف دیکھتا ہے اسی طرح قیامت کے عالم میں پہنچ کر آدمی حقیقت کے دونوں رخ کو دیکھنے لگے گا۔ ایک طرف پچھلی زندگی کی پوری تاریخ بچپن سے موت تک لمبی فلم کی طرح اس کے سامنے کھلی ہوئی ہوگی۔ دوسری طرف اس کی اس بنائی ہوئی تاریخ کے اخروی نتائج بالکل برہنہ ہوکر آنکھوں کے سامنے کھڑے ہوں گے:

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَأَخَّرَتْ (انفطار) اس دن آدمی جان لے گا جو اس نے آگے بھیجا اور جو اس نے پیچھے چھوڑا۔

دنیا کا کام دنیا میں رہ جائے گا اور آخرت کی زندگی کے لئے وہی چیز کارآمد بنے گی جو آخرت کے لئے کی گئی تھی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں ایک مقدمہ پیش ہوا۔ ایک شخص نے ناجائز طور پر دوسرے کی زمین پر قبضہ کر لیا تھا۔ مگر اس کی قانونی خانہ پری " اتنی مکمل تھی کہ ظاہری طور پر اس کے خلاف فیصلہ دینا بھی مشکل تھا۔ آپ نے فرمایا " تمہاری ہوشیاری کی بنا پر اگر عدالت نے تمہاری موافقت میں فیصلہ دے دیا تو سمجھو کہ اس نے تم کو آگ کا ایک ٹکڑا دیا" گویا اس آدمی کے عمل کا نتیجہ دنیوی اعتبار سے تو زمین کا ایک محبوب ٹکڑا تھا۔ مگر آخرت کے اعتبار سے وہ بھڑکتی ہوئی آگ کا ایک شعلہ تھا۔ وہ اپنے عمل سے پیچھے کی دنیا میں زمین چھوڑ رہا تھا اور آگے آخرت کی دنیا میں آگ بھیج رہا تھا۔

اسی طرح نیک اعمال کا معاملہ بھی ہے۔ امام احمد نے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ قول غصہ کے بارے میں نقل کیا ہے:

ماتجرع عبد جرعة من لبن او عسل خیر من جرعة غیظ	کسی بندہ نے غصہ کے گھونٹ سے بہتر دودھ یا شہد کا گھونٹ نہیں پیا۔

غصہ کو پی جانا دنیا کے اعتبار سے انتہائی کڑوا گھونٹ ہے۔ مگر اس عمل کا جو اخروی شئی ہے، وہ دودھ اور شہد سے بھی زیادہ میٹھا اور لذیذ ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ گرمی کی شدت جہنم کی سانس کی وجہ سے ہوتی ہے (ان شدة الحر من فیح جهنم) اسی طرح حدیث معراج میں ہے کہ آپ سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچے تو وہاں آپ نے چار نہریں دیکھیں۔ دو نہریں اندر بہتی تھیں اور دو باہر۔ جبریل نے بتایا کہ اندر اندر بہنے والی نہریں تو بہشت کے دریا ہیں اور اوپر اوپر بہنے والے نیل اور فرات۔ گویا موجودہ دنیا اور آخرت کی دنیا ایک ہی واقعہ کے دو پہلو ہیں۔ دنیوی پہلو حقیر اور عارضی ہے۔ اخروی پہلو بہتر اور مستقل۔ آج ہم دنیوی پہلو سے دوچار ہیں۔ موت کے بعد ہم اخروی پہلو سے دوچار ہوں گے۔

انسانی عمل کے اس دو گونہ پہلو کو حدیث معراج میں مختلف تمثیلات کے ذریعہ بتایا گیا ہے۔

بستی میں ایک شخص ہے۔ اس نے اپنی محنت اور جدوجہد سے اپنے لئے ہر قسم کی عزت اور خوش حالی جمع کر لی ہے۔ وہ جب کسی مجلس میں داخل ہوتا ہے تو اچانک ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مجلس کا سردار آگیا ہے۔ اسی بستی میں دوسرا شخص ہے۔ وہ بالکل ناکام ہے، اپنی عمر کا بڑا حصہ گزار لینے کے باوجود وہ اپنی مفلوک الحالی کو ختم نہ کر سکا۔ اگر وہ مجلس میں آجائے تو کوئی اس کو اہمیت نہیں دیتا۔ حتیٰ کہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی آدمی مجلس میں آیا ہی نہیں۔

دونوں بظاہر ایک ہی قسم کے انسان ہیں۔ دونوں یکساں قسم کے ہاتھ پاؤں کے ساتھ آتے ہیں۔ دونوں میں سے کوئی بھی اپنی عزت یا اپنی مفلسی کا پشتارہ لے کر نہیں آتا۔ اس کے باوجود دونوں میں اتنا زیادہ فرق کیوں ہے۔ اس کی وجہ آدمی کا وہ دہرا وجود ہے جس کو "حیثیت" کہا جاتا ہے۔ ہر آدمی اپنے دکھائی دینے والے وجود کے ساتھ اپنی نہ دکھائی دینے والی حیثیت کو بھی لئے ہوئے ہوتا ہے۔ ظاہری جسم آدمی کو پیدائشی طور پر ملتا ہے اور غیر محسوس حیثیت کو آدمی اپنی کوششوں سے بناتا ہے۔ اسی طرح آدمی کا ایک دنیوی وجود ہے اور ایک اخروی وجود۔ دنیوی وجود پیسے اور اقتدار سے بنتا ہے اور اخروی وجود خدا ترسی اور نیک عمل سے۔ آج کی دنیا میں آدمی اپنے دنیوی وجود کے ساتھ جی رہا ہے اور آخرت میں وہ اپنے اخروی وجود کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔

کسی درخت پر کوئی پتھر لٹکا ہوا ہے، آپ اس کے نیچے سے گزرے، یکایک پتھر آپ کے اوپر گرا اور آپ کا سر ٹوٹ گیا، کیا آپ اس درخت پر خفا ہوں گے اور اس سے لڑائی کریں گے۔ نہیں، بلکہ خاموشی سے اپنا سر پکڑے ہوئے گھر چلے جائیں گے یا اسپتال جا کر اپنا علاج کرائیں گے۔ اس کے برعکس اگر کوئی آدمی جان بوجھ کر آپ کے اوپر ایک پتھر کھینچ مارے اور آپ کا چہرہ زخمی ہو جائے تو آپ اس کے اوپر برس پڑتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کا بھی سر توڑ ڈالیں جس طرح اس نے آپ کا سر توڑا ہے اور اگر خود اس کا سر توڑ نہیں سکتے تو معاملہ کو عدالت میں لے جاتے ہیں اور وہاں اس کو قانون کے مطابق سزا دی جاتی ہے۔

اسی طرح ایک اور مثال لیجئے۔ آم کا ایک بڑا درخت ہے جس پر فصل کے موقع پر ہزاروں کی تعداد میں پھل آتے ہیں۔ یہ پھل پکتے ہیں اور ایک ایک کر کے گر جاتے ہیں یا توڑ لئے جاتے ہیں، خود آم اپنے ایک پھل کو بھی نہیں کھاتا۔ مگر کوئی شخص کبھی یہ کہتا ہوا نہیں سنا گیا کہ "افسوس کہ آم نے اتنے پھل پیدا کئے مگر وہ خود اپنے پھل کو نہ کھا سکا۔" اس کے برعکس ایک آدمی زندگی بھر کی کمائی سے اپنے لئے ایک شاندار مکان بنائے اور مکان کی تعمیر مکمل ہوتے ہی مر جائے تو ہر دیکھنے والا شخص کہے گا کہ کیسا افسوسناک ہے یہ واقعہ کہ آدمی نے محنت کر کے ایک گھر بنایا اور اس کے اندر رہنا اس کو نصیب نہ ہوا۔

معلوم ہوا کہ درخت اور انسان میں بہت بڑا فرق ہے، درخت کوئی "برائی" کرتا ہے تو اس کو اس برائی کی سزا نہیں دی جاتی۔ اسی طرح درخت کوئی "نیکی" کرتا ہے تو یہ ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ اس کو اس کی نیکی کا انعام دیا جائے، جب کہ انسان کے لئے ہم دونوں چیزیں چاہتے ہیں۔ ہمارا ذہن پکارتا ہے کہ انسان کوئی برا عمل کرے تو اس کو ضرور اس کی سزا دی جائے اور انسان کوئی اچھا عمل کرے تو ضرور اس کو اس کا انعام ملے۔

سارے انسانوں کی فطرت یہی مانگ رہی ہے اور تمام علوم متفقہ طور پر اس کی اہمیت کی تصدیق کرتے ہیں، مگر کیسی عجیب بات ہے کہ یہی چیز اس دنیا میں حاصل کرنا ممکن نہیں۔ ہٹلر نے ایک ایسی جنگ چھیڑی جس میں پانچ کروڑ آدمی ہلاک ہو گئے۔ کیا کوئی بھی حکومت ہٹلر کو اس کے اس جرم کی سزا دے سکتی ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ ہٹلر کو گولی مار کر ختم کر دیں حالانکہ یہ جرم اتنا بڑا ہے کہ ہٹلر اگر ۵ کروڑ بار زندہ ہو اور ۵ کروڑ بار گولی مار کر ہلاک کیا جائے تب بھی اس کی سزا مکمل نہیں ہوگی۔ پھر یہ معاملہ ہٹلر اور اسٹالن جیسے ظالموں کا ہی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک معمولی آدمی بھی جب کوئی جرم کرتا ہے تو اس کے جرم کے اثرات اتنے وسیع ہوتے ہیں کہ نہ کوئی دنیوی عدالت اس کے سارے پہلوؤں کی تحقیق کر سکتی اور نہ کوئی جیل خانہ اس کو اس کے جرم کی پوری پوری سزا دے سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص جو اس دنیا میں کوئی جرم کرتا ہے، وہ اپنے جرم کی حقیقی سزا پائے بغیر مر جاتا ہے۔ حالانکہ ساری انسانیت پکار رہی ہے کہ اس کو اس کے جرم کی پوری پوری سزا دی جائے۔

یہی معاملہ انعام کا بھی ہے۔ ایک شخص کو اقتدار ملے مگر اقتدار پا کر وہ فرعون نہ بنے بلکہ عام

انسانوں کی طرح اپنے کو ایک انسان سمجھے اور اقتدار کو لوگوں کی حقیقی خدمت میں لگائے، کیا اس دنیا میں اس کو اس عمل کا بدلہ دیا جاسکتا ہے۔ ایک شخص اپنی محنت سے دولت کمائے اور اس دولت کو غریبوں اور محتاجوں کی ضرورتیں پوری کرنے میں صرف کردے کیا اس کو اس عمل کا انعام دینا ممکن ہے۔ ایک شخص علم میں کمال پیدا کرتا ہے اور اس علم کو انسانیت کی تعمیر میں لگا دیتا ہے، کیا اس کو اس خدمت کا معاوضہ دیا جاسکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ایک شخص کے ایک چھوٹے سے نیک عمل کا انعام دینا بھی اس دنیا کے محدود حالات میں ممکن نہیں۔ جس طرح ایک برا عمل بے شمار طریقوں سے انسان کے لئے مصیبت بنتا ہے۔ اسی طرح ایک نیک عمل بے شمار طریقوں سے انسانیت کے لئے خیر و فلاح کا باعث ہوتا ہے۔ کون ہے جو اس کے اعداد و شمار جمع کرسکے اور اس کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ دے۔

اسی کے ساتھ ایک بات اور بھی ہے۔ اس دنیا میں آدمی بیماری، بڑھاپا، موت اور اس طرح کے دوسرے ناموافق قوانین سے بندھا ہوا ہے۔ بالفرض کسی کے حسن عمل کا اندازہ کرکے اس کے لئے اس کے کارناموں کے مطابق ایک "جنت" بنا دی جائے، جب بھی وہ اس سے حقیقی طور پر لطف اندوز نہیں ہوسکتا۔ بے شمار انسانوں کا تجربہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں بالفرض کسی کو مسرت مل جائے، جب بھی وہ چند لمحات سے زیادہ اس کا لطف نہیں اٹھا سکتا۔ ہر انسان اپنے لئے ایک "جنت" چاہتا ہے۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں جنت نہیں بن سکتی۔ جنت بنانے کے لئے کوئی اور دنیا درکار ہے جو محدودیتوں اور نقائص سے پاک ہو۔

یہ صورت حال پکار رہی ہے کہ موجودہ دنیا نامکمل ہے اور اس دنیا کی تکمیل کے لئے ایک اور دنیا وجود میں آنی چاہئے۔

جب ہم کائنات کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ بے پناہ حد تک وسیع معلوم ہوتی ہے۔ اس کے امکانات لامحدود ہیں۔ یہ زمین، جس پر انسان اپنی زندگی بناتا ہے، وہ عظیم کائنات کے اتھاہ امکانات کا ایک بے حد حقیر حصہ ہے۔ ہماری زمین، کائنات کا اس سے بھی زیادہ چھوٹا حصہ ہے جتنا سارے سمندروں کے کنارے پائی جانے والی ریت کے مقابلہ میں ایک ذرہ۔

کائنات نے اپنے اتھاہ امکانات میں سے صرف ایک حقیر جزو ہی کو زمین پر کیوں ظاہر کیا۔ آخرت کا عقیدہ اسی سوال کا جواب ہے۔ انسان کے لئے یہاں جو امکانات ہیں، ان کو دو حصوں میں تقسیم کردیا گیا ہے۔ اس کا ابتدائی حصہ موجودہ دنیا میں ہم کو مل رہا ہے اور اس کا آخری اور کامل حصہ آخرت کی دنیا میں دیا جائیگا۔ آخرت کا نظریہ ان تمام بہترین آرزوؤں اور تمناؤں کو با معنی بناتا ہے جن کو ایک آدمی اپنے سینہ میں لئے ہوئے ہوتا ہے۔ مگر ساری کوشش کے باوجود ان کو واقعہ بنانے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ اگر وہ ہر قسم کے ناموافق حالات کا مقابلہ کرتا ہوا بالفرض اپنے لئے ایک پسندیدہ زندگی بنائے تب بھی بڑھاپا اور موت اس کی ہر کامیابی کو بہت جلد بے معنی بنا دیتے ہیں۔ آخرت کا عقیدہ بتاتا ہے کہ اس کے خوابوں کی دنیا کہاں ہے اور اس کی مطلوبہ "جنت" کس سمت میں ہے جدھر اس کو دوڑ دھوپ کرنی چاہئے۔ آخرت آدمی کی منزل کو بھی بتاتی ہے اور اس کی جدوجہد کے صحیح رخ کو بھی۔

ہدایت کا انتظام

خدا نے انسان کی ہدایت کے لئے غیر معمولی انتظامات کئے ہیں پیغمبر کے ذریعہ اپنی کتاب اتاری ہے۔ کائنات میں بے حساب پیمانہ پر اپنی نشانیاں پھیلا دی ہیں۔ اسی کے ساتھ خدا کے فرشتے ہر قدم پر کھڑے ہوئے خاموش زبان میں اس کو بتاتے رہتے ہیں کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا۔

ایک بزرگ کو ان کے پڑوسی نے تکلیف پہنچائی۔ وہ اس سے سخت ناراض ہو گئے "اب میں نہ اس سے بات کروں گا اور نہ اس سے تعلقات رکھوں گا"۔ انھوں نے اپنے دل میں سوچا اس کے اگلے دن اتفاق سے ان کے لڑکے سے بھی ان کو ایک تکلیف پہنچی۔ وہ اس سے سخت ناراض ہوئے اور غصہ میں گھر سے باہر نکل آئے۔ رات تک ان کا غصہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ وہ سو گئے۔ اگلی صبح کو سو کر اٹھے تو انھیں محسوس ہوا کہ ان کے دل میں اپنے بچے کے لئے دوبارہ وہی محبت ہے جو پہلے تھی۔ انھوں نے اپنے لڑکے کو بلایا اور لطف و محبت کے ساتھ اس سے بات کر کے کل کے غصہ کی تلافی کی۔

"اگر میں اپنے لڑکے کا قصور معاف کر سکتا ہوں تو کیا اسی طرح میں اپنے پڑوسی کا قصور معاف نہیں کر سکتا" ان کے دل میں خیال آیا، اور اچانک انھیں محسوس ہوا کہ لڑکے کی غلطی کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے انھیں سبق دیا ہے۔ "اولاد جن مصلحتوں کے تحت دی جاتی ہے ان میں سے ایک مصلحت شاید یہ بھی ہے کہ انسان کو بتایا جائے کہ وہ کس طرح ایسا کر سکتا ہے کہ ایک قصوروار کا قصور معاف کر دے۔ اگر آدمی کو اولاد نہ دی جاتی تو اس اخلاق محبت کا عملی سبق کسی اور طرح اس کو نہیں دیا جا سکتا تھا"۔ اس کے بعد انھوں نے اللہ سے معافی مانگی اور اپنے پڑوسی سے مل کر اس کو خوش کیا۔

اگر آدمی کے سینہ میں ضمیر زندہ ہو اور وہ خدا کے سامنے پیش ہونے سے ڈرتا ہو تو اسی طرح ہر دن وہ اپنے گرد و پیش خدا کی آواز سنتا ہے۔ وہ ہر موڑ پر دیکھ سکتا ہے کہ خدا کے فرشتے کھڑے ہوئے بتا رہے ہیں کہ اس کو کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔ یہ آواز صرف ان لوگوں کو سنائی نہیں دیتی جن کے کان خدا کی آواز سننے کے لئے بہرے ہو چکے ہیں۔ وہ خدا کی آواز صرف اس وقت سنیں گے جب اسرافیل کی چنگھاڑ ان کے کان کے پردے پھاڑ دے۔

ایک بزرگ ایک شخص کے یہاں مہمان ہوئے۔ اس آدمی کے گھر سے ملی ہوئی مسجد تھی جس میں نمازی بہت کم آتے تھے۔ بزرگ نے اپنے سکون کی خاطر مسجد میں قیام کو پسند کیا۔ مسجد میں داخل ہونے کے بعد انھیں محسوس ہوا کہ عرصہ سے اس کی صفائی نہیں ہوئی ہے۔ یہ برسات کا زمانہ تھا۔ اس لئے ٹپکنے سے اور بوچھار سے مسجد کی صفیں جگہ جگہ سے بھیگ گئی تھیں اور ان میں بو بھی پیدا ہو گئی تھی۔ اگلے دن سورج نکلا تو بزرگ نے ساری صفیں نکال کر باہر دھوپ میں پھیلا دیں۔ مسجد میں خوب صفائی کی۔ اس کے بعد صفوں کو سکھا کر اور جھاڑ کر اپنی جگہ دوبارہ بچھا دیا۔

بزرگ جب پہلی بار مسجد میں داخل ہوئے تھے تو اس کی حالت دیکھ کر انھیں سخت انقباض ہوا تھا۔ اب جو وہ

اس کی صاف ستھری فضا میں بیٹھے تو ان کے دل کو ایک خاص طرح کی خوشی محسوس ہوئی۔ انھوں نے دو رکعت نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس نے انھیں اس خدمت کی توفیق عطا فرمائی۔

عین اس وقت ان کے میزبان آگئے۔ "اس شخص سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ مسجد کی صفائی کرے" اس کو دیکھتے ہی ان کے اندر یہ احساس ابھرا "یہ دین کے اوپر لمبی لمبی تقریریں کرتا ہے۔ مگر عمل کا یہ حال ہے کہ اپنے پڑوس کے خانہ خدا کو درست نہیں کر سکتا"۔ اس احساس نے بہت جلد ان کے لاشعور میں یہ جذبہ ڈال دیا کہ میں دین میں اس سے زیادہ ہوں۔ میری دین داری کے مقابلہ میں اس کی کوئی حیثیت نہیں"۔

دن گزر گیا۔ شام کو وہ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک اجنبی شخص اندر داخل ہوا۔ اس کا دبلا پتلا چہرہ اور اس کے پھٹے کپڑے بتا رہے تھے کہ وہ کوئی غریب مسافر ہے۔ بزرگ نے اس کے سلام کے جواب میں وعلیکم السلام تو کہا مگر دل میں سوچا "یہ شخص بھی کتنے بے وقت آیا ہے، اب اس کے لئے رات کے کھانے کا انتظام کرنا ہوگا۔ رات بھی شاید وہ اسی مسجد میں گزارے اور میری تنہائی میں خلل ڈالے"۔ ابھی وہ اسی انقباض میں تھے کہ ان کے میزبان مسجد میں داخل ہوئے۔ مسافر کو دیکھ کر انھوں نے فوراً آگے بڑھ کر اس کو سلام کیا، اور مسکراتے ہوئے پوچھا "کہاں سے آنا ہوا"۔ پھر اس کے حالات معلوم ہونے کے بعد خود ہی بولے "آج آپ یہیں قیام کریں اور ہمارے ساتھ کھانا کھائیں"۔ میزبان نے یہ ساری باتیں اس طرح کہیں گویا یہ نو وارد ایک غریب مسافر نہیں، ایک نعمت ہے جو خدا نے اس وقت خصوصی طور پر ان کے لئے بھیج دی ہے۔

اس واقعہ کے بعد بزرگ نے محسوس کیا کہ ان کے دل میں نئی ہلچل پیدا ہو رہی ہے "مسجد کی صفائی کے معاملہ میں میں نے اپنے میزبان پر سبقت کی تھی۔ مگر مسافر کی خدمت کے معاملہ میں وہ مجھ سے کہیں زیادہ بڑھا ہوا ہے"۔ انھوں نے اپنے دل میں کہا "اگر میرے اندر ایک خصوصیت ہے تو میزبان کے اندر دوسری خصوصیت ہے، اور کیا معلوم مسجد کی صفائی کے مقابلے میں غریب مسافر کی خدمت اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسند ہو"۔ اس خیال کا آنا تھا کہ انھوں نے توبہ کی اور سجدہ میں گر کر اللہ سے دعا کی کہ وہ ان کو اور ان کے میزبان کو ہدایت دے اور اپنی رحمتوں میں حصہ دار بنائے۔

ہماری دنیا فتنوں سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں ہر وقت اندیشہ ہے کہ آدمی کسی گڑھے میں جا گرے۔ مگر اوپر کے واقعات بتاتے ہیں کہ اللہ نے یہاں بچاؤ اور اصلاح کے بھی بے شمار مواقع رکھ دیئے ہیں۔ اگر آدمی کے اندر ایمانی جذبہ زندہ ہو تو ہر فتنہ کے وقت اس کو اپنے قریب ہی ایک روشنی مل جائے گی جس سے فائدہ اٹھا کر وہ دوبارہ اپنے نجات کے راستہ کو پا سکتا ہے۔ مگر جب ایمان کی چنگاری بجھ جائے تو وہ بچاؤ کے الٰہی انتظام سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا پاتا۔ وہ ہر پھسلن پر گرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس آخری گڑھے میں پہنچ جاتا ہے جس سے پھر آدمی کو نکلنا نہیں ہے:

جو خدا سے ڈرنے والے ہیں جب ان پر شیطان کا گزر ہوتا ہے، وہ چونک جاتے ہیں۔ پھر انھیں سوجھ آجاتی ہے اور جو شیطان کے بھائی ہیں، وہ ان کو کھینچے چلے جاتے ہیں پھر وہ کسی طرح نہیں تھمتے۔ (اعراف ۲۰۲)

انسان کی تلاش

انسان ایک ایسی دنیا چاہتا ہے جہاں وہ اپنے خوابوں کی تعبیر پا سکے، جو عیب اور محدودیت سے خالی ہو۔ مگر موجودہ دنیا میں اس کو یہ چیز حاصل نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر سی وی۔ رمن ہندستان کے مشہور ترین سائنس داں ہیں۔ انھوں نے اٹھارہ سال کی عمر میں ایم اے پاس کیا۔ ان کو سائنس کا نوبل انعام ملا۔ ان کی ایک سائنسی تحقیق (۱۹۲۸) نے رمن ایفیکٹ کے نام سے عالمی شہرت حاصل کی۔ بنگلور میں ان کے نام پر رمن انسٹی ٹیوٹ قائم ہے۔ ان کو اپنے سائنسی مطالعہ میں اتنا انہماک رہتا تھا کہ وہ ملاقاتیوں کی آمد کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک بار انھوں نے ایک آنے والے کے پرچۂ ملاقات کو دیکھ کر کہا: "یہ ملنے کے لئے آنے والے اس ابتدائی آداب کو بھی نہیں جانتے کہ مجھے تنہا رہنے دیں" ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی تو اکثر وہ "ایس" یا "نو" کہہ کر ریسیور رکھ دیتے۔ ان کے یہاں کثرت سے خطوط آتے تھے جن کو بس ایک نظر دیکھنے کے بعد وہ پھاڑ کر پھینک دیتے تھے۔ سیاست دانوں کی بابت ایک بار انھوں نے کہا: "انڈیا میں کامیاب ہونے کے لئے آج کل جو چیز درکار ہے وہ صرف یہ کہ آپ کے سر پر ایک گاندھی ٹوپی ہو اور اس کے نیچے کچھ نہ ہو"۔ ڈاکٹر رمن کی خود اعتمادی اتنی بڑھی کہ انھوں نے مذہب کا بھی انکار کر دیا۔ انھوں نے ایک بار ایک اخباری نمائندہ سے گفتگو کرتے ہوئے کہا: "نہ کوئی جنت ہے اور نہ کوئی دوزخ۔ اور نہ موت کے بعد آدمی کا کوئی وجود ہے"

مگر آخر عمر میں ڈاکٹر رمن سخت مایوسی کا شکار ہو گئے۔ نومبر ۱۹۷۰ میں اپنے انتقال سے کچھ پہلے انھوں نے کہا تھا "میری زندگی مکمل طور پر ایک ناکام زندگی رہی" :

My life has been an utter failure (T.O.I. 21-1-1979)

ڈاکٹر رمن کو اتنا بڑا انعام حاصل ہونے کے باوجود یہ احساس کیوں ہوا کہ وہ مکمل طور پر ناکام ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے خوابوں کی دنیا کو نہ پا سکے۔ ان کی سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ ملک میں سچی سائنس (True Science) قائم کریں۔ مگر جن ملکی سائنس دانوں سے انھوں نے کام لینا چاہا، ان کے متعلق ان کا تجربہ یہ رہا کہ وہ مغرب کی تقلید اور اس کی خیمہ برداری کے سوا اور کوئی مزاج نہیں رکھتے۔ وہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس (بنگلور) کے ڈائرکٹر تھے۔ انھوں نے چاہا کہ نازی حکومت کے نکالے ہوئے جرمن سائنس دانوں کو بلائیں۔ مگر حکومت نے اپنے سیاسی مصالح کے تحت اس کی اجازت نہ دی۔ پھر انھوں نے طے کیا کہ خود اپنا جمع کیا ہوا تمام سرمایہ لگا کر ذاتی طور پر ایک سائنسی ادارہ قائم کریں۔ مگر یہاں بھی ایک رکاوٹ حائل ہو گئی۔ ان کی رقم ایک پرائیویٹ بنک میں تھی جو دیوالیہ ہو گیا اور ان کی ساری رقم ڈوب گئی۔ وہ شخص جو اعلیٰ حوصلوں اور اونچی تمناؤں کے ساتھ زندگی کے میدان میں داخل ہوا تھا وہ ایک انتہائی مایوس انسان کی حیثیت سے اس دنیا سے رخصت ہوا۔

یہ ایک "کامیاب مرد" کا قصہ تھا۔ اب ایک "کامیاب عورت" کا حال دیکھئے۔

"ہماری دنیا مکمل کیوں نہیں"

آدمی اس سوال کا جواب نہیں پا سکتا

جب تک وہ آخرت کی دنیا کو نہ جان لے

۱۶ سالہ نندنی اپنے وجے نگر کے مکان میں آئینہ کے سامنے کھڑی تھی۔ اسے نظر آیا کہ اس کی نازک گردن پر ایک گومڑا ابھر رہا ہے۔ "زندگی زیادہ مکمل اور بےعیب کیوں نہیں"

Why life could not have been more perfect.

اس نے اپنے دل میں کہا۔ وہ ایک کامیاب رقاصہ تھی اور اپنی دو ہم پیشہ بہنوں (پدما اور جے شری) کے ساتھ ابھی ابھی کشمیر کے ایک رنگارنگ سفر سے یہ حوصلہ لے کر واپس آئی تھی کہ وہ اپنے پیشہ میں اور زیادہ توجہ دے کر اعلیٰ ترین رقاصہ بنے گی۔ اپنی بہنوں کے ساتھ اس نے ملک کے مختلف شہروں میں رقص کے ۵۰ مظاہرے کئے تھے۔ تینوں بہنیں "وجے نگر سسٹرس" کے نام سے مشہور ہو گئی تھیں۔ تاہم کل کی تقریب میں شرکت سے اس نے معذوری ظاہر کر دی۔ بدنما گردن کے ساتھ وہ آرٹ کی محفل میں کیسے شریک ہو سکتی تھی۔

مگر خلاف امید اس کا گومڑ بڑھتا گیا۔ گھر والوں کو پریشانی ہوئی۔ ڈاکٹروں اور اسپتالوں کی دوڑ شروع ہو گئی۔ بالآخر صرف یہ جاننے کے لئے کہ ان کی نندنی کینسر کے ناقابل علاج مرض میں مبتلا ہو چکی ہے۔ اسپتال میں داخلہ کے نویں دن اس کی موت کا پیغام آ گیا۔ بستر پر ایک بے حس و حرکت جسم پڑا ہوا تھا اور دوست اور رشتہ دار چاروں طرف اس کو گھیرے ہوئے یہ سوچ رہے تھے "وہ ہنستی ہوئی روح آخر کہاں چلی گئی"۔

یہ جولائی ۱۹۶۹ کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد نندنی کی بقیہ دو بہنوں نے "نرتیہ نندنی" کے نام سے ایک ڈانس اسکول کھولا۔ زندہ رہنے کے لئے کوئی مشغولیت ضروری تھی۔ دونوں باصلاحیت بہنوں کی شہرت میں مزید اضافہ ہوا۔ ان کو موقع ملا کہ وہ یورپ کے شہروں لندن، جینوا، فرینکفرٹ، برلن، ایمسٹرڈم، پیرس وغیرہ میں اپنے کمال فن کی داد لے سکیں۔ ان کو اپنے پیشہ میں اتنی کامیابی ہوئی کہ ایک اخبار نے لکھا:

The gods of India can smile when the bells on the Vijayanagar sisters tinkle

ہندوستان کے دیوتا مسکرا اٹھتے ہیں جب وجے نگر بہنوں کے گھونگرو بجتے ہیں۔

فروری ۱۹۷۳ میں دونوں "رقص رانیوں" کی شادی روایتی جشن کے ساتھ ہو گئی۔

شادی کے صرف دو دن بعد جے شری کے آئینہ نے بتایا کہ اس کی ٹھوڑی کے پاس ایک گومڑا ابھر رہا ہے۔ دواؤں اور آپریشن کے بعد گھر والوں نے سمجھا کہ ان کی جے شری اچھی ہو چکی ہے۔ مگر مقررہ جگہ پر درد کا باقی رہنا جے شری کو پریشان کئے ہوئے تھا۔ "بے وقوف نہ بنو جے شری"، ڈاکٹر نے کہا "تمہارے جیسی جوان اور تندرست عورت کو کینسر کس طرح ہو سکتا ہے"۔ اس کے بعد گومڑ کا ایک ٹکڑا ٹاٹا میموریل اسپتال (بمبئی) کو جانچ کے لئے بھیجا گیا۔ رپورٹ نے بتایا کہ نندنی کے بعد اب اس کی بہن کو بھی کینسر ہو چکا ہے۔ مرض ٹھوڑی اور سینہ سے گزر کر پیروں تک پہنچ گیا۔ ہر قسم کے بہترین علاج کے باوجود تکلیف بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ ۱۸ مارچ ۱۹۷۴ کو جے شری کی روح بھی ایک بھیانک جسم کو بستر پر چھوڑ

گمر اس سے جدا ہو گئی۔

"وجے نگر سسٹرس" کا جگمگاتا ہوا امکان اب تاریک ہو چکا ہے۔ دو جوان لڑکیوں کے کھونے کے بعد ماں باپ کو زندگی بے معنی نظر آتی ہے۔ ہر طرف مایوسی پھیلی ہوئی ہے۔ "نرتیہ نندنی" اسکول اگرچہ نومبر ۱۹۷۵ سے مسبجے شری آرٹس انٹرنیشنل" میں تبدیل ہو چکا ہے۔ مگر تیسری بہن پدما اپنی ظاہری کامیابیوں کے باوجود ہر آن اپنے کو اسی راستہ پر پاتی ہے جدھر اس سے پہلے اس کی دو محبوب بہنیں جا چکی ہیں۔ وہی سوال اس کو بھی بے چین کئے ہوئے ہے جس کو لے کر اس کی دونوں بہنیں اس دنیا سے چلی گئیں — "زندگی زیادہ مکمل اور بے عیب کیوں نہیں" اس کی نفسیاتی حالت کو رپورٹر (مسٹر ایس۔ گنگولی) نے ایک جملہ میں اس طرح ادا کیا ہے:

A PSYCHOLOGICAL AMPUTATION IS NO LESS REAL THAN A PHYSICAL ONE.

Eve's Weekl, (Bomba,) 2.6.1978

نفسیاتی قتل کسی بھی حال میں جسمانی قتل سے کم نہیں ہوتا۔

یہ کوئی اتفاقی مثال نہیں۔ ہمارا پورا سماج اسی قسم کی مثالوں سے بھرا ہوا ہے۔ وہ لوگ جن کو آپ ہنستے ہوئے دیکھتے ہیں۔ جو بظاہر کامیابیوں کی جگمگاہٹ میں زندگی گزارتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کو بھی اندر سے جھانک کر دیکھئے تو خوش نما جسموں کے اندر ایک غمناک اور اداس روح بسی ہوئی نظر آئے گی۔ موجودہ دنیا میں زندگی کے مسائل اتنے پیچیدہ ہیں، آدمی کو اتنے مختلف قسم کے ناموافق حالات میں رہنا ہوتا ہے اور دوسرے انسانوں کے چھیڑے ہوئے فتنے اس طرح سکون کو درہم برہم کرتے رہتے ہیں کہ کسی شخص کے لئے، ظاہری رونقیں اور ساز و سامان جمع کر لینے کے باوجود، حقیقی خوشیوں کی زندگی حاصل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

ایک شخص ضروریات زندگی کا محتاج ہو تو وہ سمجھتا ہے کہ سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ آدمی کی ضرورتیں اس کو حاصل ہو جائیں۔ جب وہ کوشش کر کے ضرورت کی چیزیں پا لیتا ہے تو اب اس کو عیش و آرام کی طلب ہوتی ہے۔ اب ضرورت کی چیزوں میں اس کے لئے کوئی لذت نہیں ہوتی۔ اب وہ رات دن یہ خواب دیکھتا رہتا ہے کہ عیش کے سامان اس کے گرد جمع ہو جائیں۔ اگر حالات اس کا ساتھ دیں اور وہ عیش کی چیزیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے تب بھی اس کی طلب ختم نہیں ہوتی۔ جن چیزوں کو پہلے وہ حرص کی نظروں سے دیکھا کرتا تھا، اب ان میں اس کے لئے کوئی لذت باقی نہیں رہتی۔ اس کے بعد اس کے اندر ایک اور چیز کی طلب جاگ اٹھتی ہے۔ یہ ہے عزت اور مرتبہ۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کا مقام سب سے اونچا ہو جائے۔ مگر یہ چیز اس کو کبھی حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے حصہ میں اس کے سوا اور کچھ نہیں آتا کہ جو لوگ اس کو اپنے سے کمتر دکھائی دیں ان پر اپنی بڑائی کا مظاہرہ کر کے اپنی ہوس کی تسکین حاصل کرے۔ اور جو لوگ اس کو اپنے سے اوپر دکھائی دیں ان کے خلاف حسد اور بغض کی آگ میں جلتا رہے۔ وہ انھیں تاریکیوں میں بھٹکتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اچانک اس کی موت آ جاتی ہے اور وہ آخرت کی ابدی دنیا میں پہنچا دیا جاتا ہے تاکہ دوبارہ اپنے لئے ایک زیادہ تلخ اور زیادہ تاریک زندگی کا آغاز کرے۔ دنیا کی کامیابیاں بھی اتنی ہی بے قیمت ہیں جتنی دنیا کی ناکامیاں۔ مگر انسان اپنی خوش خیالیوں میں گم رہتا ہے۔ موت کے سوا کوئی چیز نہیں جو اس کو اس کی خوش خیالیوں کی دنیا سے باہر نکالنے والی ثابت ہو۔

دنیا میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو زندگی بھر ناکامی و نامرادی کے احساس سے دوچار رہتے ہیں۔ تاہم وہ لوگ جن کو دنیا میں بہترین مواقع ملے۔ جنھوں نے سمجھا کہ وہ اپنی خوشیوں کی بہاریں اسی دنیا میں دیکھ سکتے ہیں۔ ان کا خاتمہ بھی اکثر بدترین مایوسی کے ساتھ ہوتا ہے۔ حادثہ، بیماری، منصوبوں کا ناکام ہوجانا۔ اور اگر بالفرض کوئی ان ناخوش گواریوں سے بچ جائے تو آخر میں موت۔ کتنے لوگ ہیں جو "کامیابی کے ساتھ" اپنا سفر طے کر رہے ہوتے ہیں۔ مگر موت عین اس وقت ان کی تمناؤں کے محل کو ڈھا دیتی ہے جب کہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس کے دروازے کے قریب پہنچ چکے ہیں۔

کیا انسان کے لئے یہی مقدر ہے کہ وہ انتہائی قیمتی صلاحیتیں لے کر آئے اور بالآخر ایک بدترین ناکامی کے ساتھ اس کا خاتمہ ہوجائے۔ اگر آخرت کو حذف کرکے زندگی کو دیکھا جائے تو زندگی ایک المناک ڈرامے کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتی۔ ہم خواہ کچھ بھی کریں، موجودہ دنیا میں ہم اپنی آرزوؤں کی جنت تعمیر نہیں کرسکتے۔ ہماری محدودیتیں فیصلہ کن طور پر ہماری راہ میں حائل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف آخرت کا عقیدہ ہے جو انسانی زندگی کو بامعنی بناتا ہے۔ آخرت کے عقیدہ میں ہم اپنی اس منزل کو پالیتے ہیں جس کی طرف ہم یقین کے ساتھ سفر کرسکیں، جہاں ہم اپنی کوششوں کا انجام پانے کی قطعی امید کرسکیں۔ آخرت کو نہ ماننے والے کو اپنے سامنے مایوسی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ جب کہ آخرت کو ماننے والا اپنے سامنے امیدوں کا اتھاہ مستقبل دیکھتا ہے۔ زندگی آخرت کے بغیر انتہائی بے معنی ہے مگر زندگی آخرت کے ساتھ اتنی بامعنی ہوجاتی ہے کہ انسانی زبان میں وہ الفاظ ہی نہیں جو اس کو بیان کرسکیں

ہالی وڈ (امریکہ) عیش پسندوں کے لئے دنیا کی سب سے بڑی جنت ہے۔ ساری دنیا کے "محروم" لوگ ان "پائے ہوئے" لوگوں پر رشک کرتے ہیں جن کو اس جنت ارضی میں کوئی حصہ ملا ہو۔ مگر ہالی وڈ کے ایک جائزہ میں بتایا گیا ہے کہ یہ بظاہر قابل رشک لوگ بے حد قابل رحم حالت میں زندگی گزار رہے ہیں۔ اس جنت ارضی کے انتہائی خوش قسمت لوگ، سب کچھ پالینے کے بعد بالآخر اکتاہٹ (Boredom) کا شکار ہوجاتے ہیں۔ ان کے پاس اتنی کاریں ہوتی ہیں کہ بسا اوقات ان کو یہ سوچنا پڑتا ہے کہ آج اپنی مختلف کاروں میں سے کس کار میں بیٹھ کر جائیں۔ تاہم ان کی بے اطمینانی یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ وہ آپس میں اپنے مکان حتیٰ کہ بیویوں کا تبادلہ کرتے ہیں تاکہ تنوع کے ذریعہ اپنی اکتاہٹ کو کم کرسکیں۔ اصل یہ ہے کہ انسان لامحدود اطمینان چاہتا ہے۔ دنیا کی چیزیں اس کو صرف محدود اطمینان دیتی ہیں اس لئے وہ اس کی تسکین نہیں بنتیں۔ یہ صرف خدا ہے جو انسان کی طلب کا حقیقی اور ابدی جواب ہے۔

الا بذکر اللہ تطمئن القلوب — سن لو، اللہ کی یاد ہی سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے۔

اللہ کی یاد کا مطلب یہ ہے کہ اس ہستی میں اپنا دل لگایا جائے جو حقیقی اور ابدی ہے۔ اپنی امیدوں اور حوصلوں کو اس عالم سے وابستہ کیا جائے جو ان تمام کمیوں سے پاک ہوگی جن کی وجہ سے موجودہ دنیا ہمارے خوابوں کی تعبیر نہیں بننے پاتی۔ جو آدمی اللہ کو پالیتا ہے وہ گویا اپنا سب کچھ پالیتا ہے۔ دنیا میں اگر اس کو تکلیف پہنچے تب بھی وہ مطمئن رہتا ہے کیونکہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ وہ جس راستہ پر چل رہا ہے وہ بالآخر اس کو منزل تک پہنچانے والا ہے۔

خدا ــــــ انسانی فطرت کی آواز ہے

مسٹر الطاف گوہر پاکستان کے چوٹی کے صحافی ہیں۔ وہ پاکستان کے اخبار ڈان کے ایڈیٹر تھے بھٹو حکومت (۷۷ ــ ۱۹۷۱) نے اپنے اقتدار کے ابتدائی زمانہ میں الطاف گوہر کو جیل خانہ میں ڈال دیا۔ جیل کا مطلب، سیاسی قیدیوں کے لئے، اپنے میدان عمل سے محرومی کے ہم معنی ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں عام طور پر سب سے بہتر مشغلہ یہ رہ جاتا ہے کہ آدمی اپنے آپ کو مذہبی کتابوں کے مطالعہ میں مصروف کرلے۔ الطاف گوہر نے قرآن کو ترجمہ کی مدد سے پڑھنا شروع کر دیا۔

یہ مطالعہ، حیرت انگیز طور پر، ان کے لئے ایک نیا تجربہ ثابت ہوا۔ وہ زندگی کی نئی وسعتوں سے آشنا ہوئے جس سے اب تک وہ، اپنے صحافتی مشاغل کی ہماہمی میں بے خبر رہے تھے۔ وہ شخص جس کا قلم چند دن پہلے تک عالمی سیاست کا جائزہ لیا کرتا تھا، جو اپنی خداداد ذہانت کے ساتھ قلم کا شہ سوار بنا ہوا تھا، جیل خانہ میں اس نے اپنے آپ کو اچانک بالکل بے بس پایا۔ اس کی دنیا ایک محدود کوٹھری تھی جہاں اس کی اپنی ذات کے سوا کوئی اور نہ تھا۔

تنہائی کی زندگی، ہر معاملہ میں دوسروں پر انحصار، تمام ظاہری سہاروں کا رخصت ہو جانا، ان واقعات نے جیل کے ماحول کو الطاف گوہر کے لئے ایک عظیم حقیقت کے ادراک کی تربیت گاہ بنا دیا۔ ان کی فطرت، غیر ارادی طور پر، ایک ایسی ہستی کو تلاش کرنے لگی جو ہر طاقت سے بڑھ کر طاقت ور ہو۔ جس کو آدمی ہر آن پا سکتا ہو۔ جو ہر حال میں آدمی کی چٹان بن سکے۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی جب کہ حالات اس کو دھکیل کر ایسے مقام پر پہنچا دیں جہاں اس کے اپنے کمزور وجود کے سوا کوئی اس کے پاس نہ ہو، جہاں اس کے تمام سہارے اس کا ساتھ چھوڑ چکے ہوں۔

اس نازک لمحہ میں جب مسٹر الطاف گوہر نے قرآن کی سورہ فاتحہ کھولی اور اس کو پڑھتے ہوئے اس فقرہ تک پہنچے: إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ، تو اچانک ان پر کھلا کہ وہ ہستی فی الواقع کائنات میں موجود ہے جس کی تلاش ان کی فطرت کا سب سے بڑا سوال بنی ہوئی تھی۔ سورہ کی آیت نمبر ۴ میں ان کو انسان کی حقیقی عظمت اور آزادی کا راز مل گیا۔ یہاں بندہ اپنے خدا کے ساتھ ایک ایسے ابدی عہد میں وابستہ نظر آیا جو مکمل طور پر اس کے عجز کا بدل بن جاتا ہے، جو اس کو ایک اتھاہ طاقت کی دائمی سرپرستی میں دے دیتا ہے۔ الطاف گوہر اپنے تجربات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

I REMEMBER VIVIDLY THE MOMENT WHEN I FIRST REALIZED THE SIGNIFICANCE OF THIS VERSE. 'WE WORSHIP YOU ALONE, AND TO YOU ALONE WE TURN FOR HELP. IT WAS A DRAMATIC MOMENT OF FREEDOM, A MOMENT IN WHICH FEAR DISAPPEARED, AND WITHIN ME I FELT A RESURGENCE OF CONFIDENCE AND FAITH.

مجھے وہ لمحہ خوب یاد ہے جب کہ میں نے پہلی بار اس قرآنی فقرہ کی معنویت کو سمجھا "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور ہم صرف تجھی سے مدد چاہتے ہیں"۔ یہ آزادی کا ایک ڈرامائی لمحہ تھا، ایک ایسا لمحہ جس کے بعد خوف مٹ گیا، اور میں نے محسوس کیا کہ میرے اندر ایک نیا اعتماد و یقین ابھر آیا ہے۔

خدا انسانی فطرت کی آواز ہے۔ عام حالات میں یہ آواز چھپی رہتی ہے۔ مگر جب زندگی میں کوئی نازک لمحہ آتا ہے تو یہ آواز جاگ اٹھتی ہے۔ تاریخ میں بے شمار مثالیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی بھی انسان اس فطرت سے خالی نہیں۔

فرانس کی ایک فلم ایکٹرس گائنا لولوبراگیڈا (GINA LOLLOBRIGIDA) جنوری ۱۹۷۵ میں ہندستان آئی تھی۔ ایک پریس کانفرنس میں ایک اخباری رپورٹر سے اس کا سوال و جواب یہ تھا:

TO A QUESTION WHETHER SHE BELIEVED IN GOD, GINA SAID: I BELIEVE IN GOD. I BELIEVE IN GOD, MORE WHEN I AM ON AN AEROPLANE.

Times of India, 3.1.1975

ایک سوال کے جواب میں کہ کیا وہ خدا کو مانتی ہے، گائنا نے کہا: میں خدا کو مانتی ہوں، میں خدا کو مانتی ہوں، اس وقت اور بھی زیادہ جب میں ہوائی جہاز میں ہوتی ہوں۔

آدمی جب ہوائی جہاز میں اڑ رہا ہو تو اس وقت وہ مکمل طور پر ایسے خارجی اسباب کے رحم و کرم پر ہوتا ہے جن کے توازن میں معمولی فرق بھی اس کو ہلاک کرنے کے لئے کافی ہے۔ انسان کی یہی بے چارگی سمندری سفروں میں بھی ہوتی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: "کیا تم دیکھتے نہیں کہ کشتی سمندر میں اللہ کے فضل سے چلتی ہے، تاکہ وہ تمھیں اپنی قدرتیں دکھائے۔ درحقیقت اس میں نشانیاں ہیں ہر اس شخص کے لئے جو صبر اور شکر کرنے والا ہو۔ اور جب سمندر میں ان لوگوں کو موجیں بدلیوں کی طرح گھیر لیتی ہیں تو یہ اللہ کو پکارتے ہیں، اپنے دین کو اسی کے لئے خالص کرکے۔ پھر جب وہ بچا کر انھیں خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو ان میں سے کوئی اعتدال پر رہتا ہے۔ اور ہماری نشانیوں کا انکار وہی کرتا ہے جو بدعہد اور ناشکرا ہے۔ (لقمان ۳۱-۳۲)

کوئی شخص خواہ کتنا ہی سرکش اور منکر کیوں نہ ہو، جب مشکل حالات پڑتے ہیں تو وہ بے اختیار خدا کو پکار اٹھتا ہے۔ یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا انسانی فطرت کی آواز ہے۔

۲۔ روسی ڈکٹیٹر مارشل اسٹالن (۱۹۵۳-۱۸۷۹) خدا کا منکر تھا۔ مگر اس کی زندگی میں ایسے واقعات ہیں جو ثابت کرتے ہیں کہ مشکل اوقات میں وہ بے اختیار خدا کو یاد کرنے لگتا تھا۔ ونسٹن چرچل (۱۹۶۵ - ۱۸۷۴) نے دوسری جنگ عظیم کے موقع پر اگست ۱۹۴۲ء میں ماسکو کا سفر کیا تاکہ ہٹلر کے خلاف دوسرا محاذ (سکنڈ فرنٹ) قائم کرنے کے لیے روسی لیڈروں سے گفتگو کرے۔ چرچل نے اس سلسلہ میں اتحادیوں کا فوجی منصوبہ اسٹالن کے سامنے رکھا جس کا خفیہ نام ٹارچ (TORCH) رکھا گیا تھا۔ اسٹالن چونکہ خود بھی ہٹلر کی بڑھتی ہوئی یلغار سے خائف تھا، اس نے اس فوجی منصوبہ میں گہری دلچسپی لی۔ چرچل کا بیان ہے کہ منصوبہ کی تشریح کے ایک خاص مرحلہ پر جب کہ اسٹالن کی دلچسپیاں اس سے بہت بڑھ چکی تھیں اس کی زبان سے نکلا:

MAY GOD PROSPER THIS UNDERTAKING

خدا اس منصوبہ کو کامیاب کرے۔

Winston S. Churchill,
The Second World War (Abridgement)
Cassell & Company
London, 1965, P. 603

۳۔ سابق صدر امریکہ مسٹر رچرڈ نکسن کے افراد خاندان جب آخری فوٹوگراف کے لئے وائٹ ہاؤس میں جمع ہوئے تو سرکاری فوٹوگرافر کو ان کا فوٹو لینے میں کافی دیر لگی۔ کیونکہ صدر نکسن سمیت سب لوگ رو رہے

تھے اور فوٹو گرافر اس انتظار میں تھا کہ بغیر آنسوؤں کا کوئی لمحہ ملے تو شاٹ لے سکے۔

واٹر گیٹ سکینڈل کے متعلق ٹیپ ریکارڈنگ جس نے نکسن کی صدارت کو ختم کیا، اگر نکسن چاہتے تو اس کو ضائع کر سکتے تھے۔ ایسی صورت میں ان کی صدارت خطرہ میں نہ پڑتی۔ مگر صدر نکسن کو یہ لالچ تھا کہ صدارت کے بعد اس ٹیپ کو فروخت کر کے وہ معقول رقم حاصل کر سکتے ہیں، مگر ان کی یہ امید پوری نہیں ہوئی۔ ٹیپ ریکارڈنگ لوگوں کے علم میں آگئی اور نکسن کی صدارت ایسے بحران کا شکار ہوئی کہ علیحدگی کے سوا ان کے لئے کوئی چارہ نہ رہا۔

واٹر گیٹ اسکینڈل کے انکشاف سے پہلے رچرڈ نکسن اتنا زیادہ پریشان تھے کہ نیم پاگل ہو گئے تھے۔ وہ وائٹ ہاؤس میں روتے رہتے۔ انھوں نے خودکشی کا ارادہ کر لیا تھا۔ اگرچہ سخت نگرانی کی وجہ سے وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔

آخری ایام THE FINAL DAYS نامی کتاب میں انکشاف کیا گیا ہے کہ:

AS THE END NEARED, NIXON ASKED SECRETARY OF STATE HENRY KISSINGER TO KNEEL AND PRAY WITH HIM, SAYING:
"YOU ARE NOT A VERY ORTHODOX JEW AND I AM NOT AN ORTHODOX QUACKER, BUT WE NEED TO PRAY."

Daily American (Rome) 27.3.1976

جب صدارت کا خاتمہ قریب آگیا، نکسن نے سابق سکریٹری آف اسٹیٹ ہنری کسنجر سے کہا کہ وہ ان کے ساتھ خدا کے آگے جھکیں اور دونوں مل کر دعا کریں۔ "نہ تم زیادہ پکے یہودی ہو نہ میں زیادہ پکا عیسائی۔ مگر اس وقت ہم کو ضرورت ہے کہ ہم دعا کریں"، نکسن نے کہا اور عیسائی طریق عبادت کے مطابق جھک کر دعا کرنے لگے۔

۴۔ روس میں اشتراکی انقلاب اکتوبر ۱۹۱۷ میں آیا۔ اس طرح اس انقلاب پر اب پورے ساٹھ سال گزر چکے ہیں۔ تازہ اعداد و شمار کے مطابق ۲۵ کروڑ سوویت شہریوں میں ۲۲ کروڑ ایسے لوگ ہیں جو اکتوبر انقلاب کے بعد پیدا ہوئے ہیں، دوسرے لفظوں میں ایسے سماج میں جس میں، حکومت روس کے دعوے کے مطابق، قدیم مذہبی نظام مکمل طور پر ختم کر دیا گیا ہے

اشتراکی نظریہ کے مطابق مذہب، سرمایہ داری نظام کا ضمیمہ تھا۔ سرمایہ داری نظام کے خاتمہ کے بعد قدرتی طور پر اس کے ضمیمہ کو بھی ختم ہو جانا چاہئے۔ روسی حکومت کا دعویٰ ہے کہ اس نے سرمایہ داری نظام کو روس سے ختم کر دیا ہے۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ مذہب اب بھی وہاں زندہ ہے۔ حتیٰ کہ روس کی جدید نسل میں دوبارہ مذہب پروان چڑھ رہا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ وہ ہے جو ۱۹۷۳ میں ہندستان میں پیش آیا۔ ایک روسی جہاز (ILYUSHIN JET) ہندستان میں مغربی بنگال کی فضا پر اڑ رہا تھا کہ اس کا انجن خراب ہو گیا ہوا باز کی ساری کوششیں ناکام ہو گئیں اور جہاز زمین پر گر پڑا۔ ہوا باز سمیت سارے مسافر جل کر ختم ہو گئے۔

چونکہ یہ حادثہ ہندستان کی سرزمین پر ہوا تھا اس لئے بین اقوامی قانون کے مطابق ہندستان کو اس کی تفتیش کرنی تھی۔ ہوائی جہازوں کا قاعدہ ہے کہ اس میں آواز ریکارڈ کرنے والی ایک خودکار مشین رکھی جاتی ہے جس کو عام طور پر (BLACK BOX) کہتے ہیں۔ یہ

بلیک باکس ہواباز اور کنٹرول ٹاور کے درمیان گفتگو کو ریکارڈ کرتا رہتا ہے۔ اس کو ہوائی جہاز کی دُم میں رکھا جاتا ہے تاکہ ہوائی جہاز کے جلنے کے بعد بھی وہ بچ سکے۔

ہندستانی افسروں نے ہوائی جہاز کے ملبہ سے اس بلیک باکس کو حاصل کیا۔ جب اس بکس کا ٹیپ بجایا گیا تاکہ اس سے تفتیش میں مدد لی جاسکے تو معلوم ہوا کہ بالکل آخری لمحات میں روسی ہواباز کی زبان سے جو لفظ نکلا وہ یہ تھا:

PETER SAVE US

(سینٹ پیٹر ہم کو بچا) واضح ہو کہ پیٹر یا پطرس حضرت عیسیٰؑ کے بارہ حواریوں میں سے ایک تھے اور عیسائیوں کے یہاں بڑے بزرگ مانے جاتے ہیں۔

۵۔ کون جانتا تھا کہ سٹالن کی اپنی لڑکی سویتلانہ SVETLANA ALLILUYEVA اس کے بعد عیسائی مذہب قبول کرے گی۔ سویتلانہ اشتراکی دنیا سے مایوس ہو کر ہندستان آئی تھی۔ ہوسکتا تھا کہ وہ کسی ہندستانی مذہب میں پناہ لے۔ مگر ہمارے حکمرانوں کے لئے اس کا یہاں رہنا ہند۔ روس دوستی کے خلاف معلوم ہوا۔ چنانچہ مجبور ہو کر وہ یورپ چلی گئی، اور وہاں عیسائیت کو اختیار کرلیا۔

سویتلانہ اپنی کتاب ONLY ONE YEAR (صرف ایک سال) میں لکھتی ہے کہ میں ماسکو ہی میں غیر مطمئن تھی اور اپنے قلب کی تسکین کے لئے کوئی چیز ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ چیز مجھے بائبل کے ان جملوں میں مل گئی:

خداوند میری روشنی اور میری نجات ہے مجھے کس کی دہشت۔

خداوند میری زندگی کا پشتہ ہے، مجھے کس کی ہیبت۔

خواہ میرے خلاف لشکر خیمہ زن ہو۔
میرا دل نہیں ڈرے گا۔
خواہ میرے مقابلہ پر جنگ برپا ہو۔
تو بھی میں خاطر جمع رہوں گا۔

زبور: ۲۷

۶۔ آج کے روس میں اس کیفیت کے ابھرنے کے شواہد کثرت سے مل رہے ہیں۔ سولژنتسین اور سخاروف اسی روحانی کش مکش کی ایک علامت ہیں۔ سولژنتسین کو اگر نوبل انعام حاصل کرنے کی اجازت ملی ہوتی تو وہ اس رقم کو روسی عوام کے لئے ایک گرجا تعمیر کرنے میں صرف کرتا۔ سولژنتسین کے ایک قریبی دوست دیمتری پیلنی سے پوچھا گیا کہ روسی سلطنت کا سب سے کمزور پہلو کیا ہے۔ اس نے بلاتردد جواب دیا:

THE HUNGER OF ORDINARY PEOPLE FOR MORAL AND SPIRITUAL TRUTH

"عام انسان کی یہ بھوک کہ وہ اخلاقی اور روحانی سچائی کو پاسکے۔"

جو شخص گھمنڈ اور عصبیت جیسی نفسیاتی پیچیدگیوں میں مبتلا ہو وہ کبھی سچائی کو دیکھ نہیں سکتا، خواہ وہ کتنی ہی کھلی شکل میں اس کے سامنے رکھ دی گئی ہو۔ سچائی کو پانے کے لئے سچائی کا طالب ہونا ضروری ہے۔

نماز سے آغاز

مولانا محمد علی ایم اے (کینٹب) اپنی تفسیری کتاب میں لکھتے ہیں: "ایک دفعہ راقم الحروف کے یہاں بہت سے احباب جمع تھے۔ ان میں لالہ لاجپت رائے بھی تھے۔ وہ باتوں باتوں میں کہنے لگے۔ مولوی صاحب! میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی کہ جس قوم کے پاس نماز اور زکوٰۃ جیسے دو بے مثال ادارے (Institutions) ہوں وہ قوم کیوں ذلیل و خوار ہو" قرآنی دعوت انقلاب، ۱۹۵۱، مکتبہ شعروادب لاہور، صفحہ ۳۱۶

نماز اللہ کے آگے اپنے کو جھکا دینے کا نام ہے اور زکوٰۃ کا مطلب ہے اللہ کی راہ میں اپنے مال کو قربان کرنا۔ جو ان دونوں عبادتوں کو حقیقی طور پر اپنی زندگی میں شامل کرلے، اللہ اس سے راضی ہوجاتا ہے اور اس کو ابدی جنت میں جگہ دیتا ہے۔

یہ نماز اور زکوٰۃ کا اخروی پہلو ہے اور یہی ان کا اصل مقصود ہے۔ تاہم ان عبادتوں کے زبردست دنیوی فائدے بھی ہیں۔ نماز اگر صحیح شعور کے ساتھ قائم کی جائے تو وہ سارے مسلمانوں کو ایک مرکز پر متحد کردیتی ہے اور اتحاد بلاشبہ کسی قوم کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ زکوٰۃ وسیع ترین قسم کا سوشل انشورنس ہے۔ کسی مسلم گروہ میں زکوٰۃ کا نظام اگر پوری طرح قائم ہوجائے تو اس کے اندر سے یہ مسئلہ سرے سے ختم ہوجاتا ہے کہ اس کے کچھ افراد مالیاتی کمی کے سبب سے اپنے لئے قابل اعتماد معاشی بنیاد نہ پاسکیں۔ زکوٰۃ کا نظام اس بات کی ضمانت ہے کہ قوم کا صرف ایک حصہ خوش حال نہ ہو بلکہ پوری قوم مجموعی حیثیت سے ترقی کرے۔

نماز اور زکوٰۃ، دنیوی اعتبار سے، اتحاد اور فارغ البالی کی علامتیں ہیں۔ اور یہ دونوں چیزیں جس قوم میں پیدا ہو جائیں، وہ بلاشبہ عزت و سربلندی حاصل کرے گی۔ کوئی اس کی کامیابی کو روک نہیں سکتا۔

نماز آدمی کے اوپر خدا کے حقوق کو بتاتی ہے اور زکوٰۃ آدمی کے اوپر آدمی کے حقوق کو۔ خدا کا حق آدمی کے اوپر یہ ہے کہ وہ اس کے آگے جھک جائے۔ آدمی کا حق آدمی کے اوپر یہ ہے کہ وہ اس کا خیر خواہ ہو۔ یہ دونوں چیزیں اتنی بنیادی ہیں کہ اگر وہ کسی قوم کے افراد میں پیدا ہوجائیں تو اس کے سارے معاملات کو درست کردیتی ہیں۔ خدا کے آگے جھکنا نہ صرف اس کو خدا کی نظر میں محبوب بناتا ہے اور خدا اس پر اپنے انعامات کے دروازے کھول دیتا ہے۔ بلکہ اسی کے ساتھ اس کے اندر وہ اوصاف پیدا ہوتے ہیں جو ہر قسم کی دنیوی ترقی کے ضامن ہیں۔ خدا کے آگے جھکنا اپنے رب کے سامنے اپنی عبدیت کا اقرار ہے اور عبدیت کا شعور جن لوگوں میں زندہ ہوجائے ان کا معاملہ جب دوسرے انسانوں سے پڑتا ہے تو یہ شعور وہاں تواضع، بے غرضی، انصاف پسندی اور حق کے لئے سپراندازی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ نہ صرف بندے کے اوپر بندے کے حق کو یاد دلاتی ہے بلکہ یہ سبق دیتی ہے کہ تمہاری انسانیت اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی جب تک تمہارا یہ حال نہ ہوجائے کہ اپنی ذاتی چیزوں میں بھی دوسرے کا حق سمجھنے لگو۔

نماز کے اندر ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسانی فطرت کا عملی ظہور ہے۔ اس کی اس خصوصیت نے حیرت انگیز طور پر نماز کے اندر ایک دعوتی قدر پیدا کر دی ہے۔

چار برس پہلے کی بات ہے، میں اپنی کتاب "الاسلام" کی ترتیب کے دوران ایک سوال سے دوچار تھا "موجودہ زمانہ تجربوں اور مشاہدوں کا زمانہ ہے۔ آج کا انسان اگر مجھ سے پوچھے کہ کیا اسلام کی صداقت کو ہم تجرباتی طور پر جان سکتے ہیں، تو میرا جواب کیا ہوگا"۔ اسی اثنا میں ۱۳ اور ۱۴ جولائی ۱۹۷۴ کی درمیانی شب کو میں نے دہلی میں خواب دیکھا کہ میں کچھ غیر مسلموں کے ساتھ ہوں اور ان کو اسلام کی باتیں بتا رہا ہوں۔ یہ غالباً یورپ کے کچھ لوگ تھے اور مجھ سے ٹھیک یہی سوال کر رہے تھے۔ عجیب بات ہے کہ وہ سوال جس کو میں حالت بیداری میں حل نہ کر سکا تھا، اللہ تعالیٰ نے حالت خواب میں اس کو کھول دیا۔ میں نے دیکھا کہ میں اس سوال کے جواب میں ان سے پورے اعتماد کے ساتھ کہہ رہا ہوں: "ہاں اسلام کی تجرباتی آزمائش ممکن ہے اور اس کی ایک صورت یہ ہے کہ آپ نماز کا تجربہ کریں"۔ مخاطب کی رعایت سے خواب کی یہ گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی۔ میری آنکھ کھلی تو اپنا ایک جملہ مجھے لفظ بہ لفظ یاد تھا۔ میں نے ان سے کہا تھا:

Without being a Muslim, you can experience Namaz

(مسلمان نہ ہوتے ہوئے آپ نماز کا تجربہ کر سکتے ہیں) جہاں تک یاد آتا ہے، اس کے بعد ان لوگوں نے وضو کیا اور میرے ساتھ نماز پڑھی۔ نماز کا یہ "تجربہ" ان کے لئے اتنا مؤثر ہوا کہ اس کے بعد انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔

تاریخ میں کثرت سے اس کی مثالیں موجود ہیں کہ لوگ صرف نماز کو دیکھ کر مسلمان ہو گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہند جگر خوار کے اسلام سے متاثر ہونے کا ابتدائی سبب نماز ہی تھی۔ مسلمان جب مکہ میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہوئے تو انھوں نے وہاں ظلم اور گھمنڈ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ بلکہ مسجد میں جا کر اللہ کے سامنے اپنے عجز اور بندگی کا اقرار کیا۔ ابن مندہ نے روایت کیا ہے کہ ہند نے اپنے شوہر ابو سفیان سے کہا کہ میں اسلام قبول کرنا چاہتی ہوں۔ ابو سفیان نے کہا، تم تو ابھی کل تک اسلام کی سخت مخالف تھیں۔ انھوں نے جواب دیا ہاں، مگر رات جو منظر میں نے دیکھا اس نے میرے ذہن کو بالکل بدل دیا ہے:

واللہ ما رأیت اللہ تعالیٰ عبد حق عبادتہ فی هذا المسجد قبل اللیلۃ، واللہ ان باتوا الا مصلین قیاما و رکوعا و سجودا	خدا کی قسم آج کی رات سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ اس مسجد میں خدا کی عبادت اس طرح کی گئی ہو جیسا کہ اس کی عبادت کرنے کا حق ہے۔ خدا کی قسم یہ لوگ ساری رات نماز پڑھتے رہے۔ انھوں نے قیام اور رکوع اور سجود میں رات گزار دی۔

افریقہ کی تاریخ کا ایک مبصر لکھتا ہے:

"وسط افریقہ میں اسلام کی اشاعت بہت بڑی حد تک سیاحوں اور عرب تاجروں کے ذریعہ ہوئی۔ ان کا سب سے بڑا معجزہ جس سے افریقہ میں اسلام کی اشاعت ہوئی، نماز تھا۔ جہاں یہ لوگ ایک امام کے پیچھے ایک صف میں کھڑے ہوئے اور ان کے چہروں سے خدا کا خوف ظاہر ہوا دیکھنے والے گھل کر رہ گئے۔ لوگ ایک طرف اپنی ذلیل بت پرستی پر نادم ہوئے، دوسری طرف اسلامی عبادت نے ان کو اپنی طرف کھینچا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صرف نماز نے وسط افریقہ کی اکثر آبادی کو اسلام میں داخل کر دیا"

Winwood Reade, Martyrdom of Man, P.32

شاہجہاں کے زمانے میں منگولوں سے مغل سلطنت کا مقابلہ پیش آیا۔ اورنگ زیب اس وقت شہزادہ تھا۔ اس کو مقابلے کے لئے بھیجا گیا۔ اس نے منگولوں کو سنکیانگ تک دھکیل دیا۔ کہا جاتا ہے کہ جس وقت اورنگ زیب اور جے سنگھ کی فوجیں سنکیانگ کے صحرا میں منگولوں کا مقابلہ کر رہی تھیں۔ ظہر کی نماز کا وقت آگیا۔ اورنگ زیب گھوڑے سے اتر گیا اور میدان جنگ میں رومال بچھا کر نماز ادا کرنے لگا۔ منگولوں نے دیکھا کہ بادشاہ "ڈنڈ بیٹھک" کی طرح کوئی عمل کر رہا ہے۔ انھیں اس عمل پر سخت حیرت ہوئی۔ نماز کے آداب کو قریب سے دیکھنے کے لئے انھوں نے جنگ روک دی اور اورنگ زیب کا محاصرہ کر لیا۔ وہ سکون کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا۔ اور منگول چاروں طرف اس کو گھیرے ہوئے حیرت کے ساتھ اس کی ایک ایک حرکت کو دیکھ رہے تھے جب بادشاہ نے سلام پھیرا تو منگولوں نے پوچھا کہ یہ آپ کیا کر رہے تھے۔ اورنگ زیب نے جواب دیا: "میں اس خدا کی عبادت کر رہا تھا جو سب سے بڑا اور سب سے زیادہ مہربان ہے۔"

بادشاہ کا یہ جواب سن کر منگول کانپ اٹھے۔ ان کا حوصلہ پست ہو گیا۔ انھوں نے یہ سوچ کر ہتھیار ڈال دیئے کہ ایسے بہادر انسان کو زیر کرنا ممکن نہیں۔ یہ ۱۶۴۷ء کا واقعہ ہے۔

محمد حسنین ہیکل (سابق ایڈیٹر الاہرام) نے لکھا ہے کہ جمال عبدالناصر جب پہلی بار روس گئے تو اس وقت کے روسی وزیراعظم نکیتا خروشچوف نے گفتگو کے دوران نماز سے بڑی دل چسپی کا اظہار کیا۔ یہ ۲۹ اپریل ۱۹۵۸ کا واقعہ ہے:

"خروشچوف کو مسلمانوں کے نماز پڑھنے کا منظر دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ جب خروشچوف کے گھر دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد صدر ناصر ظہر کی نماز کے لئے ماسکو کی مسجد جانے لگے تو خروشچوف نے سوالوں کی بھرمار کر دی۔ ناصر جتنی دیر وضو کرتے رہے، خروشچوف بذات خود تولیہ لئے کھڑا رہا، اس نے بڑی عقیدت و احترام کا مظاہرہ کیا۔"

علم الانسان پر جدید تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ معبود کی پرستش کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے جو ہر انسان کے اندر پیدائشی طور پر موجود رہتا ہے۔ کوئی بھی چیز اسے ختم نہیں کر سکتی۔ نماز اسی فطری جذبہ کے اظہار کا فطری طریقہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نماز کے آداب اور طریقوں میں یہ فطری تقاضا اس طرح سمیٹ دیا گیا ہے کہ نماز میں اور انسان میں خاص مناسبت پیدا ہو گئی ہے۔ نماز انسانی فطرت کی عکاس بن گئی ہے۔ جون ۱۹۷۶ء میں ایک بار مجھے ایک غیر مسلم کے مکان پر نماز ادا کرنے کا موقع ملا ہم دو آدمی تھے۔ جب تک ہم لوگ نماز پڑھتے رہے، چھ افراد کا پورا خاندان دم بخود ہو کر ہم کو دیکھتا رہا۔ نماز سے فراغت کے بعد صاحب خانہ نے کہا: "آپ کی نماز کو دیکھ کر میرے ماتھے پر پسینہ آگیا۔ جی چاہتا تھا کہ میں بھی اس میں شریک ہو جاؤں۔" اس قسم کا تجربہ مجھے اپنی زندگی میں کئی بار پیش آیا ہے۔

ہماری یہ لازمی ذمہ داری ہے کہ ہم اللہ کے دین کو اس کے تمام بندوں تک پہنچائیں۔ اس سلسلے میں ایک سوال یہ ہے کہ اس کے آغاز کی عملی شکل کیا ہو۔ دین کو ان کے لئے بحث کا موضوع کس طرح بنایا جائے۔ موجودہ حالات میں اس کی ایک قابل عمل شکل نماز نظر آتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ نماز کی "اٹھ بیٹھ" بعض لوگوں کو عجیب سی چیز معلوم ہوگی۔ جیسا کہ مکہ میں ابوطالب کے ساتھ پیش آیا تھا۔ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ ان کے صاحب زادے علی بن ابی طالب ابتداءً نماز ہی کو دیکھ کر اسلام سے متاثر ہوئے تھے، اور وہ اسلام کے سب سے بڑے جاں باز ثابت ہوئے۔

حقیقت یہ ہے کہ دوسری اقوام تک دین کو پہنچانے کے لئے نماز نہایت کامیاب ذریعہ بن سکتی ہے۔ فطری کشش تو ا[illegible] کے اندر ہمیشہ سے تھی۔ مگر موجودہ زمانہ کے تجرباتی اور مشاہداتی مزاج نے اس کے اندر ایک "سائنسی" اہمیت پیدا کر دی ہے۔ آ[illegible] انسان چاہتا ہے کہ کسی بات کو ماننے سے پہلے اس کو عملی شکل میں جانے، وہ اس کا ذاتی تجربہ کر سکے۔ نماز اس ضرورت کو کمال د[illegible]

میں پورا کرتی ہے۔ جب ایک شخص نماز میں مشغول ہو تو وہ حیرت انگیز طور پر محسوس کرتا ہے کہ یہ خود اس کی اندرونی مانگ کا جواب ہے۔ نماز کے مختلف اعمال میں خود اس کے اپنے روحانی تقاضے پورے ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کی پوری ہستی نماز میں اس طرح شامل ہو جاتی ہے کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اور حقیقت اعلیٰ دونوں ایک دوسرے میں جذب ہو گئے ہیں۔ حتیٰ کہ جو شخص دور سے صرف نماز کا مشاہدہ کر رہا ہو، وہ بھی اس کی سادگی، اس کی عظمت اور انسانی وجود کے ساتھ اس کی مطابقت پر حیران رہ جاتا ہے۔ وہ کھلا محسوس کرنے لگتا ہے کہ معبود کی پرستش کا اس سے بہتر کوئی طریقہ ممکن نہیں۔

جہاں تک نجات آخرت کا سوال ہے آدمی کے لئے یا ایمان نمازی ہونا ضروری ہے۔ مگر اس کی کیفیات کو پانے کے لئے رسمی ایمان کی ضرورت نہیں۔ ایک شخص اگر وہ سنجیدہ ہو، ایمان لائے بغیر بھی نماز کے مقررہ طریقے میں اپنے آپ کو مشغول کر کے نماز کی کیفیتوں اور لذتوں کا ایک حصہ پا سکتا ہے۔ نماز کا یہ پہلو اس کے اندر ایک دعوتی قدر پیدا کر دیتا ہے۔ مکہ کی تاریخ اس کی عملی تصدیق بھی کر رہی ہے۔ کیونکہ مکہ میں، اسلام کے ابتدائی دور میں، قرآن کے بعد نماز ہی سب سے زیادہ لوگوں کو دین سے قریب کرنے کا ذریعہ بنی تھی۔

دوسری قوموں میں دین کی اشاعت کے لئے موجودہ زمانے میں ہمیں جو کام کرنے ہیں ان میں سے ایک کام یہ ہے کہ عالمی سطح پر مسلم نوجوانوں کا ایک حلقہ قائم کیا جائے۔ اس حلقہ کا خاص مقصد خاموش اسلامی دعوت ہو۔ اس کے افراد تمام شہروں میں ہوں اور وہ ہر دن کسی نہ کسی ایسے پارک میں جائیں جہاں غیر مسلم مرد اور عورتیں تفریح کے لئے آتے ہوں۔ وہاں وہ ایک دو گھنٹہ اس طرح گزاریں کہ ان کی گفتگو اور اٹھنے بیٹھنے میں مکمل طور پر سنجیدگی کا اظہار ہو۔ ان کے پاس قرآن کا ترجمہ ہو یا ایسی کوئی کتاب ہو جس میں پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب کے اخلاقی اور ایمانی واقعات درج ہوں۔ وہ آپس میں بیٹھ کر اس کو پڑھیں۔ بالقصد اپنی طرف سے کسی کے اوپر تبلیغ کی کوشش نہ کریں۔ البتہ اگر کوئی شخص خود سے ان کے حلقۂ درس میں بیٹھنا چاہے تو اس کو عزت کے ساتھ بٹھائیں۔ کوئی سوال کرے تو انتہائی نرمی اور سنجیدگی کے ساتھ اس کا جواب دیں۔ جواب معلوم نہ ہو تو صفائی کے ساتھ کہیں کہ ہمیں اس کا جواب معلوم نہیں۔ ہم تحقیق کر کے اگلے دن آپ کو بتائیں گے۔ ان کے پاس نماز اور دوسری اسلامی تعلیمات کے بارے میں چھوٹے چھوٹے کتابچے مختلف زبانوں میں ہوں جو وہ شائقین کو مفت دے سکیں۔ پارک کے اس پروگرام کا سب سے اہم جزء نماز ہو۔ اس مقصد کے لئے غالباً عصر کی نماز زیادہ موزوں ہوگی۔ سب نوجوان مل کر نماز ادا کریں۔ نماز خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں۔ ایسا ہرگز نہ کریں کہ جلدی جلدی پڑھ کر سلام پھیر دیں۔ چار رکعت نماز میں لگ بھگ ۲۰ منٹ صرف کئے جائیں۔ نماز اس طرح پڑھی جائے گویا ہم فی الواقع اللہ کے سامنے کھڑے ہیں اور اس کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار کر رہے ہیں۔

یہ کام اگر کچھ برسوں تک مسلسل نہایت خاموشی اور سنجیدگی کے ساتھ کیا جائے تو اس کے غیر معمولی نتائج برآمد ہوں گے۔ مسجدوں میں نماز کی تحریک مسلمانوں کی اصلاح کے لئے کامیابی کے ساتھ چل رہی ہے۔ اسی طرح پارکوں میں نماز کی تحریک غیر مسلموں تک دین کا پیغام پہنچانے کے لئے چل پڑے تو ہماری ذمے داری کے دونوں تقاضے پورے ہو جائیں گے۔ اور دنیا میں اگر خدانخواستہ اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو آخرت میں انشاء اللہ ہمارا شمار ان لوگوں میں ہوگا جنھوں نے خلق اللہ کے سامنے حق کی گواہی دی تھی اور ایک مومن کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔

یہ بھی انتہائی ضروری ہے کہ یہ کام نظم کے ساتھ ہو۔ جو لوگ اس پروگرام میں شریک ہوں وہ باہم مشورہ سے ایک شخص کو "منتظم" مقرر کرلیں۔ وہی شخص کتاب پڑھے اور وہی شخص بوقت ضرورت بولے۔ بقیہ لوگ بالکل خاموش رہیں اور منتظم کے حق میں دل ہی دل میں دعا کرتے رہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرمائے اور اس کی زبان سے وہی کلمات نکالے جس میں حق اور خیر ہو۔

Regd. R.N. No. 28822/76
Issue No XXIX

April 1979

Al-Risala Monthly

Jamiat Building, Qasimjan Sreet, DELHI-110006 (INDIA)

ظہور اسلام

تالیف :

مولانا وحید الدین خان

صفحات ۲۰۰ —— قیمت بارہ روپے

آفسیٹ کی اعلیٰ طباعت کے ساتھ

جدید اسلامی لٹریچر میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب

مکتبہ الرسالہ

جمعیتہ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ۔ دلّی ۱۱۰۰۰۶

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیتہ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی سے شائع کیا

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

سب سے زیادہ بولنا وہ شخص جانتا ہے
جو سب سے زیادہ چپ رہنا جانتا ہو

شمارہ ۳۰ زر تعاون سالانہ ۲۴ روپے قیمت فی پرچہ
خصوصی تعاون سالانہ ایک سو روپے
مئی ۱۹۷۹ بیرونی ممالک سے ۱۵ ڈالر امریکی دو روپے

الرسالہ

شمارہ ۳۰   مئی ۱۹۷۹

جمعیۃ بلڈنگ • قاسم جان اسٹریٹ • دہلی ۶

نئی دہلی کا راشٹرپتی بھون، پارلیمنٹ ہاؤس اور اور دوسری عالی شان عمارتیں انگریزوں کی تعمیر کی ہوئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب یہ عمارتیں بن کر تیار ہوئیں تو کناڈا کے ایک بڑے سرکاری عہدیدار نے نئی دہلی کا دورہ کیا۔ اس نے شان دار دارالسلطنت کو دیکھ کر کہا:

What a magnificient world
they built to leave.

انھوں نے کیسی شان دار دنیا بنائی ہے صرف اس لئے کہ وہ اس کو چھوڑ دیں۔

مذکورہ مغربی لیڈر کے سامنے صرف سیاسی اندیشے تھے۔ مگر موت کا اندیشہ اس سے بھی زیادہ سنگین ہے جو ہر ایک کے پیچھے دوڑا چلا آرہا ہے۔ ہر آدمی زمین پر یا کم از کم اپنے ذہن میں ایک عالی شان دنیا تعمیر کرنے میں لگا ہوا ہے۔ اس کو خبر نہیں کہ بہت جلد موت کا طوفان اس کو اس طرح ڈھا دے گا، جیسے کہ اس کا سارا محل صرف ریت پر کھڑا ہوا تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"الرسالہ ایک قسم کی فیکٹری ہے" ایک تعلیم یافتہ شخص نے کہا "اس میں نظریاتی ہتھیار ڈھالے جاتے ہیں تاکہ لوگ ان سے مسلح ہوں اور اپنی گفتگوؤں، تقریروں اور تحریروں میں ان کو استعمال کریں۔" الرسالہ کے بارہ میں یہ تبصرہ بہت بامعنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ الرسالہ کا مقصد لوگوں کو دینی ہتھیار فراہم کرنا ہے۔ ہمارے گرد وپیش بے شمار معلومات بکھری ہوئی ہیں۔ تاہم ان معلومات کی مثال، ابتدائی حالت میں، سونے کی کان جیسی ہے۔ مٹی اور پتھر کے انبار میں جس طرح سونے کے ذرات چھپے ہوتے ہیں جن کو دیدہ ریزی کے ساتھ چن کر الگ کیا جاتا ہے۔ اسی طرح معلومات کے اس ڈھیر میں وہ چیزیں بکھری ہوئی ہیں جو دینی پہلو رکھتی ہیں، جن سے دینی محاذ کو تقویت پہنچ سکتی ہے۔

الرسالہ میں یہ کیا جاتا ہے کہ معلومات کے انبار سے دینی اہمیت کی چیزوں کو چھانٹ کر الگ کیا جاتا ہے اور ان کو جدید اسلوب میں مرتب کرکے قارئین کے سامنے لایا جاتا ہے تاکہ وہ ایک طرف اس سے خود اپنے لئے دینی غذا حاصل کریں اور دوسری طرف ان کے ذریعہ دوسروں کے اوپر دعوت کا کام کریں۔

الرسالہ کے ادارہ سے شائع ہونے والی کتابوں کی نوعیت بھی یہی ہے۔ الرسالہ میں جو چیز "صحافتی" سطح پر انجام دی جارہی ہے وہی ان کتابوں میں "تصنیفی" سطح پر انجام دینا مقصود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ الرسالہ اور اس کی کتابیں ہر طبقہ اور ہر حلقہ کے مسلمانوں کے لئے وقت کا اسلامی تحفہ ہیں۔ ان میں ہر ایک کے لئے غذا اور ہر ایک کے لئے مواد ہے۔ ان سے ہر ایک یکساں طور پر فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

فہرست

دو آدمی ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے۔ ہر ایک دوسرے کو بدنام کرنے اور اس کو نقصان پہنچانے میں لگا رہا۔ مگر آخری چیز جس نے دونوں کے درمیان فیصلہ کیا وہ موت تھی۔ موت نے ان میں سے ہر ایک کو اسی قبر میں پہنچا دیا جس میں وہ اپنے بھائی کو پہنچانا چاہتا تھا —
موت کا یہ واقعہ ہر روز ہمارے سامنے پیش آتا ہے مگر ہر ایک یہ سمجھتا ہے کہ یہ واقعہ اسی آدمی کے لئے ہے جس کے ساتھ وہ بظاہر پیش آرہا ہے۔ خود اپنے لئے کوئی شخص اس میں سبق نہیں پاتا۔

How England was Lost to Islam?

Had powerful Moorish ruler Emir Mohammed Al-Nassir overlooked the fact that Islam forbids taking undue advantage of helpless people, England would have become a Muslim country in the 13th century —some 800 years ago.

Gabriel Ronay in his book "The Tarter Khan's Englishman" published by Cassel, disclosed that in 1213 King John of England sent a secret emissary of three persons to Moorish ruler Emir Mohammed Al-Nassir with offer of homage and promise that if England were to be received into the Arab fold King John would become the Emir's tribute-paying vassal and he along with his subjects convert to Islam.

Ronay came across verbatim account of secret emissary while researching for book on Robert Dad, London Catholic priest who was also one of the emissary sent to Al-Nassir and who was later excommunicated and banished from England by King John for his role in the Magna Carta rebellion of 1215.

This forgotten episode of English history when King John offered to become Muslim along with his subjects was dutifully recorded by Saint Alban's chronicler of 13th century, Mathew Paris. There is little to question veracity of his account writes Ronay, because he heard it straight from those emissaries.

Nasser's Rebuff: Baron Thoma Hardington, head of King John's emissary, according to Paris accounts, was instructed by John to tell Emir Al-Nassir "great King of Africa, Morocco and Spain that he would voluntarily give up to him, himself and his kingdom, and if he pleased, would hold it as tributary for him and that he would also abandon Christian faith which he considered false and would faithfully adhere to law of Mohammed".

Baron Hardington, who was accompanied by Baron Relph Fitznicholas and Catholic priest Master Robert de London handed King John's letter to the Emir and with the aid of an interpreter proceeded to convey with oratorial skill the richness of England's soil, fertility of its fields and skill of its people "who are handsome and ingenious, are skilled in three languages, Latin, French and English as well as in every liberal and mechanical pursuit".

Ronay describes Emir's reply as "exceptionally level headed" when he said, "I have never read or heard that any king possessing such prosperous kingdom, subject and obedient to him, would thus voluntarily ruin his sovereignty by making tributary to a country that is free by giving to a stranger that which is his own by turning happiness to misery and thus giving himself up to will of another conquerred as it were without wound".

Upon his emissary's return to England, King John "wept bitterly in being baulked in his purpose".

Catholic priest, Master Robert de London later was excommunicated and banished from England as result of his role in Magna Carta rebellion. He went to Mongolia to become Tartar Khan's chief diplomat and later to return to Europe eventually as head of the Tartars that converted nearly half of Europe to Islam.

Sunday TIMES (London)
October 22, 1978

سلطنت موحدین کا حوصلہ مند فرماں روا عبد المومن اندلس پر اپنے قبضہ کو مکمل کرنے کے بعد سارے یورپ کو فتح کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس کی عمر نے وفا نہ کی۔ وہ پانچ لاکھ کے ناقابل تسخیر لشکر کو لے کر آگے بڑھنے والا تھا کہ جمادی الثانی ۵۵۸ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ تاہم اس کی اگلی پشت میں امیر ابو عبد اللہ محمد ناصر لدین اللہ کے زمانہ حکومت (۵۹۵ — ۶۱۰ھ) میں خود یورپ کی سیاست نے اس خواب کی تکمیل کے اسباب پیدا کر دیئے۔ اگرچہ ناصر لدین اللہ کی کم ہمتی کی وجہ سے یہ خواب تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

اس زمانہ میں جان لاک لینڈ (۱۱۶۷ — ۱۲۱۶ء) انگلستان کا بادشاہ تھا۔ یہی وہ بادشاہ ہے جس نے مشہور میگنا کارٹا (منشور آزادی) پر ۱۲۱۵ میں دستخط کئے تھے۔ اس کے زمانہ میں ملک کے کچھ امرا نے اپنے حقوق کی آزادی کا مطالبہ کیا۔ امرا اور بادشاہ کے درمیان کش مکش بڑھی۔ پوپ انوسنٹ سوم (۱۱۶۰ — ۱۲۱۶) نے اس معاملہ میں امرا کا ساتھ دیا۔ لندن کا پادری رابرٹ، جو اس مقابلہ میں بادشاہ کے ساتھ تھا، پوپ نے اس کو کلیسا سے خارج کر دیا۔ ان حالات میں شاہ جان نے یہ منصوبہ بنایا کہ وہ اندلس کے مسلم حکمران کا تعاون حاصل کر کے اپنے حریفوں کو شکست دے۔ اس نے ۱۲۱۳ء میں ناصر لدین اللہ کے پاس ایک خفیہ سفارت بھیجی۔ اس سفارتی وفد کے ارکان یہ تھے: ٹامس ہارڈنگٹن، رالف فز نکولس، ماسٹر رابرٹ۔ یہ وفد سمندری سفر کر کے مراقش پہنچا جہاں ناصر لدین اللہ مقیم تھا۔ وفد کے ارکان وسیع محل کے ایوان اور ڈیوڑھیوں سے گزرتے ہوئے، جن کے دونوں طرف شاہی خدام کی صفیں کھڑی ہوئی تھیں، امیر ناصر لدین اللہ کے سامنے پہنچے۔ انھوں نے امیر کو شاہ جان کا خط پیش کیا اور ترجمان کے ذریعہ امیر سے گفتگو کی۔ اپنے بادشاہ کی ہدایت کے مطابق انگلستانی وفد نے ناصر لدین اللہ سے کہا کہ اگر آپ شاہ جان کی مدد کریں تو وہ آپ کے باج گزار بن جائیں گے۔ نیز یہ کہ عیسائیت پر ان کا اعتقاد ختم ہو گیا ہے اور وہ "افریقہ اور مراقش اور اسپین کے عظیم بادشاہ" کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنے کے لئے تیار ہیں اور اسی کے ساتھ ان کی رعایا بھی۔ وفد نے انگلستان کی تعریف میں مزید کہا کہ وہ ایک زرخیز ملک ہے۔ اس کے باشندے تین زبانوں کو جاننے والے ہیں: لاطینی، فرانسیسی اور انگریزی۔ وہ مختلف قسم کی فنی صلاحیتیں بھی رکھتے ہیں۔

مگر امیر ناصر لدین اللہ نے اس پیش کش کو قبول نہیں کیا۔ اس نے اس کو سیاسی چال سمجھا۔ اس نے کہا "میں نے کبھی نہیں سنا کہ کوئی بادشاہ جس کے پاس اتنا قیمتی ملک ہو، خود سے اپنے آپ کو دوسرے بادشاہ کے حوالے کر دے۔" اس نے وفد کے لوگوں کو اپنے دربار سے نکال دیا اور کہا کہ اب کبھی میرے پاس نہ آنا۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے گیبریل رونے نے لکھا ہے:

"تیرھویں صدی عیسوی میں انگلستان مکمل طور پر ایک مسلم ملک بن جاتا اگر ناصر لدین اللہ شاہ جان کی پیش کش کو قبول کر لیتا"

شاہ انگلستان کے اسلام کو قبول نہ کرنا ناصر لدین اللہ کے لئے مہنگا پڑا۔ ۶۰۹ھ میں یورپی فوجیں بہت بڑی تعداد میں شاہ الفانسو کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو کر مسلم اندلس پر حملہ آور ہوئیں۔ ناصر لدین اللہ کے ساتھ چھ لاکھ کا لشکر تھا۔ مگر امیر کی نااہلی کی وجہ سے اس کو بری طرح شکست ہوئی۔ بیشتر مسلم فوجی العقاب کے میدان میں عیسائیوں کے ہاتھوں مار ڈالے گئے۔ ایک عظیم امکان ایک بدترین انجام میں تبدیل ہو گیا۔

بامعنی کائنات بے معنی انجام پر ختم نہیں ہو سکتی

وما خلقنا السموٰت والارض وما بينهما لٰعبين ما خلقنٰهما الا بالحق ولٰكن اكثرهم لا يعلمون ۔ ان يوم الفصل ميقاتهم اجمعين يوم لا يغني مولًى عن مولًى شيئا ولا هم ينصرون الا من رحم الله انه هو العزيز الرحيم (دخان ۴۲ ـ ۳۸)

اور ہم نے زمین و آسمان کو اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے کھیل کے لئے نہیں بنایا۔ ان کو ہم نے حق کے ساتھ بنایا ہے۔ مگر اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔ بلاشبہ فیصلہ کا دن سب کا مقرر ہے جس دن کوئی دوست کام نہ آئے گا اور نہ ان کو کچھ مدد پہنچے گی۔ ہاں جس پر اللہ رحم کرے۔ اللہ زبردست ہے اور مہربان

یہی بات قرآن میں دوسرے مقام پر ان لفظوں میں کہی گئی ہے کہ زمین و آسمان کو ہم نے باطل اور عبث نہیں بنایا (مومنون، ص) ایک عام آدمی جب دنیا کے منظر کو دیکھتا ہے تو اس کو عجیب نقشہ دکھائی دیتا ہے۔ یہاں سچے اپنی سچائی کا انعام نہیں پاتے اور بروں کو ان کی برائی کی سزا نہیں ملتی۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس دنیا میں کہیں پتھر عظمت پائے ہوئے ہیں اور انسان ذلیل ہو رہا ہے۔ کہیں شریر لوگوں کو اونچا درجہ مل رہا ہے اور نیک لوگ روندے جا رہے ہیں۔ کوئی مفاد اور مصلحت پر چل کر کامیابیاں سمیٹ رہا ہے اور کوئی اصولوں کی خاطر اپنی زندگی کو تباہ کئے ہوئے ہے۔ کسی کو نعروں اور تقریروں پر لیڈریاں مل رہی ہیں اور کسی کو اپنے آپ کو مٹا دینے کے بعد بھی کوئی کریڈٹ نہیں ملتا۔ کہیں انسانوں کو آپس میں لڑانے والے مصلح کا خطاب پا رہے ہیں اور کہیں لڑائی سے بچنے کی کوشش کرنے والوں کو سزا مل رہی ہے۔ کہیں ایک شخص کھلی غلطی کر کے بھی الفاظ کا نہ ختم ہونے والا ذخیرہ پا لیتا ہے جس سے وہ اپنے کو حق بجانب ثابت کر سکے اور کہیں غلطی کر کے آدمی پر ایسی چپ لگتی ہے گویا اس کے پاس بولنے کے لئے الفاظ ہی نہیں۔ کہیں خدا کے نام پر کسی کو شاندار کاروبار مل رہا ہے اور کہیں خدا کا نام لینا آدمی کے لئے اپنے کو مٹانے کے ہم معنی بن رہا ہے۔ کوئی شخص ہے جو ایک انسان کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس کے اوپر درندوں کی طرح ٹوٹ پڑتا ہے اور کوئی ہے جو دوسرے پر قابو یافتہ ہونے کے باوجود اس کو چھوڑ دیتا ہے۔ کہیں ایک شخص حق پسندی کی خاطر اپنے آپ کو دوسرے کے مسئلہ میں الجھا دیتا ہے اور کہیں آدمی حق کی پامالی دیکھتا ہے اور یہ سوچ کر چپ رہ جاتا ہے کہ جب میرا کچھ بگڑنے والا نہیں ہے تو میں دوسرے کے مسئلہ میں اپنے کو کیوں پھنساؤں۔ کہیں سچائی ظاہر ہونے کے بعد بھی آدمی اپنی عزت کو بچانے کے لئے اس کا اعتراف نہیں کرتا اور کہیں ایک آدمی اپنی عزت کے سوال کو بھول کر اس کی طرف دوڑ پڑتا ہے۔ کہیں ایک آدمی اپنے ذاتی مفاد کی خاطر پورے ملک اور قوم کی قسمت کو داؤ پر لگا دیتا ہے اور کہیں آدمی اپنی قوم کو بچانے کی کوشش میں اپنے آپ کو ہلاک کر لیتا ہے۔ کوئی اپنے دل میں دوسروں کی خیرخواہی کا جذبہ لئے ہوئے ہے اور کوئی حسد اور عداوت کا۔ کوئی دوسرے کی اصلاح کے لئے دعائیں کر رہا ہے اور کوئی دوسرے کی بربادی کی سازشیں کر رہا ہے۔ خلاصہ یہ کہ کوئی جہنم کے شعلے بکھیر رہا ہے اور پھر بھی وہ پھولوں کے باغ میں ہے اور

کوئی جنت کے دروازے کھولنا چاہتا ہے مگر وہ کانٹوں اور آگ کے شعلوں میں پڑا ہوا ہے

کیا یہ دونوں قسم کے لوگ اپنی اپنی کارگزاری دکھا کر ختم ہو جائیں گے اور اس کے بعد دونوں کا کوئی فیصلہ نہیں ہوتا ہے۔ کیا کوئی ایسی دنیا نہیں جہاں دونوں کا فرق ظاہر ہو۔ کیا یہ دنیا عیاروں اور باطل پرستوں کی تماشا گاہ ہے۔ کیا خدا نے یہ عظیم اہتمام اس لئے کیا ہے کہ یہاں حق پرستوں کے اوپر کتے بھونکیں اور جو کمزور رہیں، بھیڑیئے ان کا خون پئیں۔ کیا دنیا کا اسٹیج اس لئے ہے کہ کچھ لوگ یہاں اپنی شیطانی ہوس کی تسکین حاصل کریں اور کچھ لوگ ان کی ہوس کا شکار ہوتے رہیں۔ اور اس کے بعد یہ سارا ڈرامہ یوں ہی ختم ہو جائے۔ ایسا ناممکن ہے۔ کائنات کی بے پناہ معنویت اپنے پورے وجود کے ساتھ پکار رہی ہے کہ اس کا خاتمہ ایسے بے معنی انجام پر نہیں ہو سکتا۔ بامعنی کائنات صرف بامعنی انجام پر ہی ختم ہو سکتی ہے۔ موجودہ دنیا اپنے پورے وجود کے ساتھ پکار رہی ہے کہ یہ نامکمل ہے اور اس کا نامکمل ہونا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کے بعد ایک آخرت ہو جہاں ہر ایک کو جانچا جائے اور اس کے عمل کے مطابق اس کو اچھا یا برا مقام عطا کیا جائے۔

درخت میں غلط کھاد ڈالئے تو وہ سوکھ کر ختم ہو جائے گا اور جب آپ اس کو صحیح کھاد اور پانی پہنچاتے ہیں تو وہ ایک ہری بھری کائنات کی صورت میں زمین کے اوپر ابھرتا ہے۔ وہ رنگ اور خوشبو اور ذائقہ دیتا ہے۔ وہ تازہ ہوا بکھیرتا ہے اور زمین کی خوش نمائی میں اضافہ کرتا ہے۔ اور بے شمار دوسرے فائدے پہنچاتا ہے۔ یہی حال اس درخت کا ہے جس کو انسان کہتے ہیں، جو شخص خدا کے قانون کے مطابق اپنے وجود کی صحیح نگہداشت کرے گا، جو اپنی ہستی کو صالح خوراک پہنچائے گا وہ خدا کی زمین میں پھلے پھولے گا اور آخرت میں ایک عالی شان باغ کی صورت میں نمایاں ہوگا۔ وہ خوشیوں اور لذتوں کی ایک ایسی کائنات کی شکل اختیار کرے گا جس کی بہاریں کبھی ختم نہ ہوں، جس کے امکانات کی کوئی حد نہ ہو۔

دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو اپنی ہستی کے درخت کو غلط پانی دیں اور اس کی جڑوں میں وہ کھاد ڈالیں جو خدا نے اس کے لئے مقرر نہیں کی ہے۔ ایسے لوگ اپنے درخت کو ٹھنٹھ بنا رہے ہیں۔ وہ اس کے اپجاؤ کی صلاحیت کو فنا کر رہے ہیں۔ ایسے لوگ آخرت کی دنیا میں اس حال میں پہنچیں گے کہ ان کے پاس درختِ حیات کے نام سے سوکھی لکڑیوں کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ جو جہنم میں جلنے کے لئے ڈال دی جائیں۔ اس قسم کے لوگ موجودہ دنیا میں اگر بظاہر تر و تازہ دکھائی دیتے ہوں تو یہ بھی ان کے اوپر خدا کے غضب کی ایک صورت ہے۔ خدا ان کو مہلت دے کر چاہتا ہے کہ وہ اپنی ظاہری سرسبزی سے دھوکے میں پڑ جائیں اور مزید سرکشی کر کے اپنے جرم کو اور زیادہ ثابت کر دیں۔

دنیا میں آدمی اپنے گرد و پیش اعوان و انصار کو دیکھ کر غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ جس طرح دنیا کی زندگی میں اپنے مددگاروں کے ذریعہ میں اپنے کام بنا رہا ہوں اسی طرح آخرت میں بھی بنا لوں گا۔ مگر یہ زبردست بھول ہے۔ آخرت میں آدمی اس حال میں پہنچے گا کہ ہر قسم کا سہارا اس سے دور ہو چکا ہوگا، وہاں وہی شخص سہارے والا ہوگا جس کا خدا سہارا بنے۔ آخرت میں وہ تمام الفاظ بے معنی ہو جائیں گے جو دنیا میں لوگوں کو بامعنی نظر آتے ہیں اور وہ تمام طاقتیں بالکل بے زور ثابت ہوں گی جن کے بل پر آدمی آج اپنے کو طاقت ور سمجھے ہوئے ہیں۔

جب آدمی خدا کی حمایت سے محروم ہو جاتا ہے

عن خباب ابن الارت قال صلی بنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰۃً فاطالہا۔ قالوا یا رسول اللہ صلیت صلوٰۃً لم تکن تصلیہا۔ قال اجل۔ انہا صلوٰۃُ رغبۃٍ ورھبۃٍ وانی سألتُ اللہَ فیہا ثلثا فاعطانی ثنتین ومنعنی واحدۃً۔ سألتہ ان لا یہلک امتی بسنۃٍ فاعطانیہا وسألتہ ان لا یسلط علیہم عدواً من غیرھم فاعطانیہا وسألتہ ان لا یذیق بعضہم بأس بعض فمنعنیہا (مسلم، ترمذی، نسائی)

خباب بن ارت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے ساتھ ایک نماز پڑھی اور اس کو لمبا کیا۔ لوگوں نے کہا: اے خدا کے رسول آپ نے ایسی نماز پڑھی جو آپ نے اس سے پہلے نہیں پڑھی تھی۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ یہ امید اور خوف کی نماز تھی۔ میں نے اس میں اللہ سے تین چیزیں مانگیں۔ اللہ نے دو چیزیں دے دیں اور ایک سے انکار فرمایا۔ میں نے درخواست کی کہ میری امت کو قحط سے ہلاک نہ کیا جائے۔ یہ قبول ہو گئی۔ میں نے درخواست کی کہ ان کے اوپر ان کے باہر کے دشمنوں کو مسلط نہ فرما۔ یہ قبول ہو گئی۔ میں نے درخواست کی کہ میری امت کے بعض کی طاقت کا مزا بعض کو نہ چکھائے۔ مگر یہ منظور نہیں ہوئی۔

مسلمان اِس سے محفوظ کر دیئے گئے ہیں کہ وہ ارضی و سماوی آفتوں سے ہلاک کئے جائیں۔ وہ اس سے بھی محفوظ ہیں کہ ان کا کوئی خارجی دشمن ان کے اوپر مستقل قبضہ پا لے۔ مگر ایک چیز ایسی ہے جہاں وہ خدا کی حفاظت میں نہیں ہیں۔ وہ یہ کہ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کی طاقت کا مزا چکھنا پڑے۔ یہی وہ اصل مقام ہے جہاں مسلمانوں کا امتحان لیا جا رہا ہے۔ اگر یہاں بھی ان پر حفاظت قائم کر دی جاتی تو ان کا امتحان ختم ہو جاتا، اور یہ قیامت سے پہلے کسی کے لئے ممکن نہیں۔

جب بھی ایسا ہو کہ ایک مسلمان اپنی طاقت کو دوسرے مسلمان کے خلاف استعمال کرنے لگے تو سمجھنا چاہئے کہ وہ اس حد میں داخل ہو گیا جہاں خدا نے اپنے رسول کی دعا کے باوجود اس کی حفاظت کا وعدہ نہیں فرمایا ہے۔ جب ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو دکھ پہنچائے، وہ موقع پا کر اس کے اوپر چڑھ دوڑے، وہ اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس کو زک دینے کے درپے ہو جائے، وہ اپنی حیثیت کو دوسرے مسلمان کو نقصان پہنچانے کے لئے استعمال کرے تو گویا یہ اس بات کی علامت ہے کہ آدمی اللہ کی پہریداری سے باہر نکل گیا۔ اب وہ شیطان کی حمایت میں ہے۔ اس نے اپنے آپ کو شیطان کے قابو میں دے دیا ہے اور شیطان اس کو اندھا بنا کر اس سے وہ کام کروا رہا ہے جو اللہ نے اس کے لئے دائمی طور پر حرام قرار دیا تھا۔ کسی مسلمان کا دوسرے مسلمان کو اپنی طاقت کا مزہ چکھانا، اس کے لئے خوشی کا نہیں بلکہ ماتم کا وقت ہے ایسا ہر واقعہ اس بات کا اعلان ہے کہ آدمی رسول کی شفاعت کے حق سے محروم ہو گیا ہے، اس نے اپنے آپ کو ایک ایسے مقام پر کھڑا کر دیا ہے جہاں نہ اللہ اس کا ساتھی ہے اور نہ اللہ کا رسول۔

درخت کی زبان سے

درخت کیا ہے۔ ایک بیج کی اس صلاحیت کا ظہور کہ وہ مٹی اور پانی سے اپنا رزق لے کر اپنے آپ کو تنہ اور شاخ اور پتی اور پھول کے اس مجموعہ کی صورت دے سکے جس سے زیادہ خوش منظر مجموعہ اس دنیا میں اور کوئی نہیں۔

انسان کی مثال بھی کچھ اسی قسم کی ہے۔ وہ اس دنیا میں ایک بیج کی مانند ڈالا گیا ہے۔ اس کو اپنی کوششوں سے "درخت" بننا ہے۔ خدا کی اس دنیا میں اس کے لئے رزق کے بے پناہ ربانی مواقع رکھ دیئے گئے ہیں۔ وہ اس دنیا سے اپنا رزق لے کر اپنے لئے ایک ایسے ابدی مستقبل کی تعمیر کر سکتا ہے جو اگلی زندگی میں جنت کے ہرے بھرے باغوں کی شکل میں اس کی طرف لوٹے اور اس کے لئے لازوال خوشی کا باعث ہو۔

اس کے برعکس جو لوگ ان مواقع سے اپنا ربانی حصہ پانے میں ناکام رہیں، ان کی مثال اس بیج کی سی ہے جو کسی پتھر پر پڑ گیا ہو یا جس نے کسی ناموافق زمین میں جگہ پائی ہو۔ ایسا بیج کبھی لہلہاتے ہوئے درخت کی صورت اختیار نہیں کرتا۔ اسی طرح موجودہ دنیا میں جس نے اپنی تعمیر کے امکانات سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ وہ گویا ایک ایسا بیج ہے جس کی کوتاہیوں نے اس کو درخت نہیں بنایا۔ ایسا شخص اگلی طویل تر زندگی میں ابدی ناکامی سے دوچار ہوگا۔ وہ آخرت کی دنیا میں ایک ایسی زندگی کا وارث ہوگا جو ہر قسم کی شادابی سے مکمل طور پر محروم ہو۔

موجودہ زمانہ میں بعض مسلم حکمرانوں نے اپنی حکومت کے استحکام کی یہ آسان تدبیر دریافت کی ہے کہ اسلام کے نام پر کوڑے مارو اور خوفناک سزائیں جاری کرو، تاکہ عوام اور انقلاب پسند عناصر سہم جائیں اور ان کی آمریت کے خلاف اٹھنے کی ہمت نہ کریں۔ قدیم زمانہ میں بادشاہوں کو ایسے علماء مل جاتے تھے جو ان کی ہوس ناکی کے منصوبوں کے لئے شرعی سند عطا کرتے رہیں۔ اسی طرح موجودہ زمانہ کے ان حکمرانوں کی خوش قسمتی سے ان کو ایسے افراد اور ادارے مل گئے ہیں جو ان کے تاریک منصوبوں کے حق میں یہ فتوی دے سکیں کہ یہی اسلام کا اصل مطلوب ہے، صرف اس قیمت میں کہ ان کو کچھ نذرانے اور اعزازی عہدے حاصل ہو جائیں۔

مگر اسلام کوڑے مارنے اور ہولناک سزائیں جاری کرنے کا نام نہیں۔ اس قسم کی حدود اور تعزیرات اسلام کے پورے بامعنی وجود سے بس اتنی ہی نسبت رکھتے ہیں جیسے ایک زندہ انسان کا اپنے بڑھے ہوئے ناخن کو کاٹنا۔ اسلام خدا کی رحمتوں کا دین ہے۔ وہ جنتی فضاؤں کا دنیوی ظہور ہے۔ وہ موت کے بعد آنے والی دنیا کا موت سے پہلے والی دنیا میں مظاہرہ ہے۔ یہ جنت کے شہریوں کا دنیا میں اتر آنا ہے۔ وہ ملکوتی اوصاف جو کسی بندۂ خدا کو جنت کی ناقابل بیان خوشیوں کا مستحق بناتے ہیں، جب ایسے اوصاف کے لوگ اقتدار کے مناصب پر قبضہ پالیں تو اسی کا دوسرا نام اسلامی نظام ہے۔ اسلامی نظام وہ لوگ قائم کرتے ہیں جو آسمانوں والے خدا کو زمین پر کھڑا ہوا دیکھتے ہوں۔ جو اپنے آپ کو خدائی منصوبہ میں اس حد تک گم کر چکے ہوں کہ اپنی ذات کے منصوبے ان کے لئے باقی نہ رہیں۔ اسلامی نظام برپا کرنے والے وہ ہیں جو دوسرے کے درد پر تڑپتے ہوں۔ جو دوسرے کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتے ہوں۔ جن کا حال یہ ہو کہ ذمہ داریوں کا احساس ان سے زندگی کی خوشیاں چھین لے۔ اللہ کے سامنے جواب دہی کا فکر ان کے لئے اقتدار کی کرسی کو کانٹوں کی کرسی بنا دے۔ جو حکومتی مواقع کے ملنے پر آنسو بہانے والے ہوں نہ کہ قہقہہ بلند کرنے والے۔

زمین کے اوپر جب ایک درخت کھڑا ہوتا ہے اور اپنی سرسبز ٹہنیوں میں پھول اور پھل لگاتا ہے تو یہ ایک پیچیدہ ترین کائناتی منصوبہ کی تکمیل ہوتی ہے۔ اسی طرح اسلامی نظام گویا انسانی سماج میں خدا کا شرعی پھول اور پھل اگانا ہے۔ یہ ایک انتہائی لطیف اور انتہائی مشکل منصوبہ ہے۔ جس طرح ایک درخت طویل مدت تک خاموش عمل میں مصروف رہنے کے بعد اس قابل بنتا ہے کہ وہ اپنے ہریالے تنہ کے اوپر رنگ اور مزہ اور خوشبو کا وہ فرحت بخش مجموعہ ظہور میں لائے جس کو پھول اور پھل کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اسلامی نظام کا قیام بھی ایک بے حد سنجیدہ اور بے حد طویل منصوبہ ہے۔ یہ نہایت گہری جدوجہد کا طالب ہے۔ کچھ زندگیاں درخت کے بیج کی مانند اپنے آپ کو عظیم مقصد کی خاطر قربان کر دیتی ہیں۔ کچھ روحیں عالم حقائق میں گم ہو کر خدا کے چھپے ہوئے خزانوں کو اجتماعی سطح پر بکھیرتی ہیں تو اس کے بعد وہ واقعہ رونما ہوتا ہے جس کو اسلامی نظام کہا جاتا ہے کچھ لوگ جو جیتے جی اپنے آپ کو آخرت میں پہنچا چکے ہوں، جب وہ آخرت کی ابدی تجلیوں کو دنیا میں اتارتے ہیں تو اسی انعکاس نور کا نام اسلامی نظام ہوتا ہے۔ اسلامی نظام خدا کی اخروی نعمتوں کا زمینی ظہور ہے۔ جو لوگ اپنی جاہ طلبی کے تماشوں کو اسلامی نظام کا نام دیتے ہیں، ایسے لوگ اسلامی نظام قائم کرنے کا کریڈٹ تو کیا پائیں گے، البتہ یہ اندیشہ ہے کہ خدا کے یہاں وہ دھوکہ بازی کے مجرم قرار دئے جائیں، کیونکہ انھوں نے اپنے ٹھنٹھ کو خدا کا سرسبز و شاداب درخت کہنے کی جسارت کی تھی۔ (۴ اپریل ۱۹۷۹)

اسلام کے نام پر اسلام کا قتل

پدانگ (انڈونیشیا) کے مسلم اسکول میں طالب علموں نے ایک تصویری پوسٹ کارڈ چھپوایا۔ اس میں ایران کے مذہبی قائد آیات اللہ خومینی کی تصویر تھی۔ پوسٹ کارڈ کی تقسیم سے پہلے حکومت کو اس کی خبر ہوگئی اور انڈونیشی پولس نے تمام پوسٹ کارڈ ضبط کرلئے (ٹائمس آف انڈیا ۲۱ فروری ۱۹۷۹) اس قسم کی خبریں دوسرے مسلم ملکوں سے بھی مل رہی ہیں۔ مسلم حکمراں خومینی کے زیر اثر قائم شدہ ایرانی اسلامی حکومت کو اگرچہ سرکاری طور پر مبارک باد کے تار بھیج رہے ہیں مگر خود اپنے ملک میں "خومینی افکار" کی درآمد کو وہ سخت ناپسند کرتے ہیں۔ اس طرح یہ بظاہر کامیاب اسلامی تحریک عملاً الٹا اثر پیدا کررہی ہے۔ وہ اسلام کی کامیابی کے نعروں کے جلو میں اسلام کے لئے کام کرنے کے مواقع کو برباد کررہی ہے۔

پاکستان، ایران اور بعض دوسرے ملکوں میں مسلم رہنماؤں نے اپنے سیاسی عزائم کے لئے "اسلامی حکومت" کے لفظ کو ایک کامیاب عوامی نعرہ بنایا ہے۔ مگر اسلام کو سیاسی نعرہ بنانا اسلام کو اسلام کے نام پر قتل کرنا ہے۔ موجودہ حالات میں کوئی بھی مسلم ملک اپنے معاشرتی حالات کے اعتبار سے اس قابل نہیں کہ وہ اسلامی حکومت کے قیام کی زمین بن سکے۔ مزید یہ کہ جو لیڈر اس قسم کی تحریک چلا رہے ہیں وہ خود بھی اسلامی قیادت کے اوصاف سے بالکل خالی ہیں۔ ایسی حالت میں اسلامی حکومت کا نعرہ صرف تخریبی کارروائیوں کے لئے ایک کامیاب ہتھیار بن سکتا ہے، وہ کسی بھی درجہ میں کوئی تعمیری نتیجہ پیدا نہیں کرسکتا۔ اس قسم کی تحریکوں کا دوسرا نقصان یہ ہے کہ اسلام کا لفظ مسلم حکمرانوں کے لئے اسی طرح سیاسی خطرہ کے ہم معنی بنتا جارہا ہے جس طرح، مثال کے طور پر، کمیونزم کا لفظ امریکی حکمرانوں کے لئے بنا ہوا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مسلم ملکوں میں اسلام کے نام پر کوئی دیرپا کام کرنا دن بدن مشکل سے مشکل تر ہوتا جارہا ہے۔

موجودہ زمانہ کے مسلم قائدین اگرچہ اسلام کے نعرہ پر اٹھے ہیں مگر وہ جس زمین پر کھڑے ہوئے ہیں وہ سیاسی اور معاشی بے چینی کی زمین ہے نہ کہ حقیقتہً اسلام کی طلب کی زمین۔ آزادی اور جمہوریت اور سوشلزم کے علم بردار جس عوامی بے چینی کو استعمال کرکے اپنی سیاسی تحریکیں چلا رہے ہیں، اسی بے چینی کو مسلم قائدین اسلام کے نام پر استعمال کررہے ہیں۔ اس سے زیادہ اس قسم کی تحریکوں کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مفروضہ غیر اسلامی حکومت کو اکھاڑنے کے بعد جب مطلوبہ اسلامی حکومت بنانے کا سوال ہوتا ہے تو قائدین اسلام کا ساتھ دینے والی بھیڑ دونوں مکمل طور پر ناکام ثابت ہوتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں جو مادی سیاسی تحریکیں اٹھیں انھوں نے ہر ملک میں "عوام دشمن" حکومتوں کو اکھاڑ پھینکا مگر وہ حقیقی عوامی حکومت قائم نہ کرسکیں۔ یہی انجام اسلامی تحریکوں کے لئے بھی مقدر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہی تحریک صالح دینی نظام قائم کرسکتی ہے جو دینی محرکات کے تحت اٹھی ہو۔ سیاسی اور معاشی بے چینی کی زمین سے ابھرنے والی تحریکیں صرف نیا فساد برپا کریں گی، وہ ہرگز کوئی صالح نتیجہ پیدا نہیں کرسکتیں۔ منفی بنیادوں پر جو اتحاد پیدا ہو وہ ہمیشہ انتشار پر ختم ہوتا ہے اور مخالفانہ قسم کا سیاسی شور وشر بالآخر بدترین بے عملی پر۔ ایران کے واقعات میں جن لوگوں کو اسلام کا سورج ابھرتا ہوا نظر آرہا ہے، بہت جلد وہ دیکھ لیں گے کہ ان کی یہ رائے سطحی خوش فہمی کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ (۲۲ فروری ۱۹۷۹)

خود نمائی کے شوق میں

ایک صابن ہے۔ اس کا اشتہار اخبارات میں ایک خاص منظر کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ اس منظر میں ایک لڑکی آبشار کے نیچے نہاتی ہوئی دکھائی گئی ہے۔ یہ منظر کسی آرٹسٹ کے برش نے نہیں بنایا ہے۔ وہ ایک حقیقی منظر ہے۔ یہ مہم ۱۹۶۹ میں شروع کی گئی اور برسوں کے بعد تکمیل کو پہنچی۔ اس مقصد کے لئے ایک خاص لڑکی کا انتخاب کیا گیا، جنگل، سمندر اور دوسرے مقامات کا تجربہ کرنے کے بعد بالآخر آبشار کے غسل کو سب سے زیادہ موزوں سمجھا گیا۔ کیوں کہ آبشار کے گرتے ہوئے پانی میں نہانے کا منظر سب سے زیادہ عوامی کشش رکھتا تھا۔ مختلف آبشاروں کا جائزہ لینے کے بعد کوڈائی کنال کو مقام غسل کے لئے چنا گیا۔

سب سے مشکل یہ تھا کہ یہ کام صرف جاڑوں میں ہو سکتا تھا۔ کیوں کہ اسی موسم میں پہاڑی آبشاروں میں تیز دھارا ہوتا ہے۔ دوسری طرف اس مقصد کے لئے ایک نازک لڑکی کا انتخاب ضروری تھا جو نہاتے وقت "پانی کی پری" معلوم ہو۔ یہ ایک جان جوکھم منصوبہ تھا۔ مگر ماڈلنگ کے پیشہ نے اس کو آسان بنا دیا۔ ایڈورٹائزنگ کمپنی کا عملہ جس کو انتظام کرنا اور فوٹو لینا تھا، مکمل طور پر گرم کپڑوں سے لدا ہوتا تھا۔ دوسری طرف ان کی پارٹی کی سب سے زیادہ نازک اور کمزور ممبر صبح ۷ بجے ٹھٹھرتے ہوئے پانی کے ریلے میں چھلانگ لگاتی تھی۔ پھسلتی ہوئی چٹانوں پر پانی کے مسلسل گرتے ہوئے دریا کے نیچے اس کو اس طرح نہانا پڑتا تھا کہ اس کے چہرے پر صرف فرحت اور خوش گواری کی ہنسی ہو۔ خوف اور گھبراہٹ کی کوئی علامت اس پر ظاہر نہ ہونے پائے۔ کیڑے مکوڑے اور پانی کے سانپ ان سب کے علاوہ تھے۔ کمپنی کے لوگوں کو کبھی لڑکی کو جگانا نہیں پڑا۔ وہ ہر روز صبح کو ۵ بجے اپنے گھر پر تیار ملتی تھی۔

یہ واقعہ درجن سے زیادہ بار دہرایا گیا اور ہزاروں کی تعداد میں فوٹو لے گئے۔ پھر اس ایک فوٹو کا انتخاب ہوا جو آج لوگوں کو اخبار کے اشتہارات میں نظر آتا ہے۔ لڑکی کے لئے اس ایک فوٹو کی قیمت تھی پندرہ ہزار روپیہ ——— ماڈلنگ کا یہ پیشہ آج ساری دنیا میں بہت بڑے پیمانہ پر رائج ہے۔

"کیا چیز ہے جو لڑکوں اور لڑکیوں کو ماڈلنگ کے اس سخت کام کی طرف راغب کرتی ہے" ایڈورٹائزنگ کمپنی کے ایک افسر نے اس سوال کے جواب میں کہا:

It is, primarily, a case of vanity (Famina, 22.7.1978)

بنیادی طور پر اس کی وجہ نمود و نمائش کا جذبہ ہے۔ کیوں کہ اس کے بعد ہر طرف اس کو اخبارات و رسائل میں اپنا چہرہ چھپا ہوا دکھائی دینے لگتا ہے ——— خود نمائی کا یہ جذبہ جو ایک "پروفیشنل ماڈل" کو جان جوکھم کام کی طرف لے جاتا ہے وہی ایک "لیڈر" کے کام کا محرک بھی ہے۔ اگرچہ اول الذکر کے مظاہروں کو پیشہ ورانہ نمائش کہا جاتا ہے اور ثانی الذکر کے اسی قسم کے مظاہروں کو قربانی کے پُر فخر نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انسان کا حقیقی کمال یہ ہے کہ وہ خود نمائی کے شوق سے اوپر اٹھ جائے۔ اگرچہ تمام کاموں میں انسان کے لئے سب سے زیادہ مشکل کام یہی ہے۔

دین کیا ہے۔ دین یہ ہے کہ آدمی کے اندر آخرت کی فکر پیدا ہو جائے۔ اللہ سے تعلق، موت کی یاد، جہنم کا اندیشہ، یہ چیزیں اس پر اتنا چھا جائیں کہ وہ ہر وقت اسی کے لئے سوچے، اس کے ہر قول و عمل سے اسی کا اظہار ہونے لگے۔ مگر موجودہ زمانہ میں یہی چیز اجنبی ہو گئی ہے۔ ہر طرف دین کا غلغلہ برپا ہے مگر دین کی جو اصل روح ہے وہی کہیں نظر نہیں آتی۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک دنیا میں جینا۔ دوسرے، آخرت میں جینا۔ غیر اسلامی زندگی یہ ہے کہ آدمی اسی دنیا میں جی رہا ہو۔ اس کے برعکس اسلامی زندگی یہ ہے کہ آدمی آخرت میں جینے لگے۔ خدا کی اس کائنات میں وہ ابھی سے پہنچ جائے جہاں بالآخر ہر ایک کو پہنچنا ہے۔

دین دار بننا دراصل آخرت کی فضاؤں میں جینا ہے۔ مگر عام طور پر لوگ دین کی اہمیت کو آخرت کی سطح پر سمجھ نہیں پاتے۔ اس لئے وہ خدا کے دین کو دنیا کی سطح پر اتار لاتے ہیں ——— دین سے مال اور اولاد میں برکت حاصل کرنا، دین کو معاشی اور سیاسی نظام کی صورت میں دیکھنا، دین کو سماج سدھار کی ایک اسکیم کی حیثیت سے پیش کرنا، دین کو سیکولرازم اور سوشلزم کی اصطلاحوں میں بیان کرنا، وغیرہ یہ ساری چیزیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ آدمی دین کی اہمیت کو آخرت کی سطح پر نہ پا سکا۔ وہ اس کو اس دنیا کی سطح پر اتار لایا ہے جہاں وہ خود جی رہا ہے۔

ایک شخص دنیا میں محنت کرے اور عزت، دولت، عہدہ اور اعوان و انصار حاصل کرلے تو لوگ اس سے دبتے ہیں اور اس کا لحاظ کرنے لگتے ہیں۔ کیوں کہ لوگ جس معبودِ دنیا کے قائل ہیں، اس نے اس معبود کو اپنی پشت پر جمع کر لیا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص آخرت کی فکر کرے اور اس فکر کی وجہ سے دنیا کے ساز و سامان اپنے گرد جمع نہ کر سکے وہ لوگوں کی نظروں میں حقیر ہو جاتا ہے، کیوں کہ لوگ جس معبود سے واقف ہیں، وہ معبود انھیں اس کے آس پاس دکھائی نہیں دیتا۔ مگر قیامت کا دھماکا جب جھوٹے معبودوں کا خاتمہ کر دے گا تو اچانک لوگ جان لیں گے کہ وہ آخرت پسند شخص جس کو انھوں نے بے قیمت سمجھ لیا تھا وہی سب سے زیادہ قیمت والا انسان تھا۔ کیوں کہ اس کی پشت پر وہ خدا کھڑا ہوا تھا جو زمین و آسمان کے تمام خزانوں کا مالک ہے جھوٹے معبودوں پر بھروسہ کرنے والے اس دن اس حال میں ہوں گے کہ کسی دیوار کا سایہ بھی ان کے لئے نہ ہوگا جہاں وہ پناہ لے سکیں۔

حقیقت کی آواز آدمی کے کان کے پردہ سے ٹکراتی ہے۔ اس کا دل اس کی صداقت کا اقرار کرتا ہے۔ مگر اپنے جاننے والوں کے درمیان اپنے مقام کو باقی رکھنے کی خاطر وہ حقیقت کا انکار کر دیتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ عوام کے نزدیک اپنے درجہ کو باقی رکھنے کی کوشش میں وہ خدا کے نزدیک اپنے درجہ کو ختم کر رہا ہے

دنیا بے معنی ہنگامہ آرائیوں کا وقتی اسٹیج نہیں

وما خلقنا السماء والارض وما بينهما باطلا ذلك ظن الذين كفروا فويل للذين كفروا من النار۔ ام نجعل الذين آمنوا وعملوا الصالحات كالمفسدين في الارض ام نجعل المتقين كالفجار (ص ۲۷-۲۸)

اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو ان کے درمیان ہے بے فائدہ نہیں بنایا۔ یہ ان کا گمان ہے جو منکر ہیں۔ پس منکروں کے لئے خرابی ہے آگ سے۔ کیا ہم ایمان والوں اور اچھے کام کرنے والوں کو ان کے برابر کر دیں گے جو زمین میں فساد کرتے ہیں یا ہم ڈر رکھنے والوں کو ڈھیٹ لوگوں کے برابر کر دیں گے۔

دنیا میں جو لوگ اپنی خواہشات پر چلتے ہیں اور کسی پابندی کو اپنے لئے ضروری نہیں سمجھتے، وہ گویا یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ کارخانہ خدا نے بے فائدہ کھڑا کر دیا ہے۔ ایسے لوگ خواہ بظاہر اپنے کو دیندار ظاہر کرتے ہوں یا دین سے بالکل بے تعلق ہوں، وہ مفسدین کے گروہ میں شامل ہیں۔ کیوں کہ ان کی ڈھٹائی بتا رہی ہے کہ وہ دنیا کو خدا کی دنیا نہیں سمجھتے بلکہ اس کو اپنی ہنگامہ آرائیوں کا ایک وقتی اسٹیج سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ جو چاہے کرتے رہیں، کوئی ایسا دن آنے والا نہیں جب کہ انصاف کا ترازو کھڑا ہو اور ان کے عمل کا ان سے حساب لیا جائے۔ اللہ نے اپنے قانون امتحان کی بنا پر ان کو مہلت دے رکھی ہے۔ اس مہلت نے ان کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔ مگر بہت جلد وہ جان لیں گے کہ وہ شدید ترین غلط فہمی میں تھے۔ اگرچہ یہ جاننا ان کے کام نہ آئے گا۔ کیوں کہ وہ وقت اپنے عمل کا بدلہ پانے کا ہوگا نہ کہ عمل کرنے کا۔

ایک شخص وہ ہے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے۔ وہ خدا کے بندوں کے درمیان انصاف اور خیر خواہی کے ساتھ زندگی گزارتا ہے۔ وہ اپنے وسائل کو نمائش اور تخریب میں ضائع نہیں کرتا بلکہ اس کو اصلاح اور تعمیر کے کاموں میں لگاتا ہے۔ وہ خدا کے حکم کے آگے جھک جاتا ہے نہ کہ اپنی خواہشوں اور امنگوں کو حق کا معیار سمجھنے لگے۔ دوسری طرف وہ انسان ہے جو خدا کی زمین میں متکبر بن کر رہتا ہے۔ وہ خدا کے دیئے ہوئے مال کو اپنے ذاتی شوق میں برباد کرتا ہے۔ وہ خدا کی دی ہوئی طاقت کو دوسرے انسانوں کی جڑ اکھاڑنے میں لگاتا ہے۔ وہ خدا کی طرف سے ملے ہوئے مواقع کو اپنی بڑائی قائم کرنے میں استعمال کرتا ہے۔ جب کوئی معاملہ پڑتا ہے تو وہ حق کے آگے جھکنے کے بجائے خود حق کو اپنے آگے جھکانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ دونوں انسان مکمل طور پر ایک دوسرے سے مختلف انسان ہیں۔ ان کا انجام ایک ایسی کائنات میں یکساں نہیں ہو سکتا جو حق اور عدل پر بنائی گئی ہے۔ کائنات اپنی اتھاہ معنویت کے ساتھ ایسے انجام کو ماننے سے انکار کرتی ہے جس میں ڈرنے والے اور ڈھٹائی کرنے والے دونوں یکساں ہو جائیں۔ اس قسم کا گمان کائنات پر اور کائنات کے بنانے والے پر اتہام ہے۔ جو لوگ ایسا گمان کریں وہ صرف اپنے جرم میں اضافہ کرتے ہیں، وہ آنے والے انجام کو بدل نہیں سکتے۔ تخلیق کا پورا کارخانہ اپنے خالق کا تعارف ایک عادل اور حکیم ہستی کی حیثیت سے کر رہا ہے پھر کیسے ممکن ہے کہ اس کا خاتمہ ایک ایسے انجام پر ہو جو عدل و حکمت کے سراسر خلاف ہے۔

حاسِبوا قبلَ ان تحاسَبوا (حدیث)

دنیا میں اپنا حساب کرلو ، اس سے پہلے کہ آخرت میں تمہارا حساب کیا جائے

آپ کے ساتھ کوئی شخص غلط سلوک کرے، کسی سے آپ کو کوئی تکلیف پہنچ جائے تو فوراً آپ کے دل کو چوٹ لگتی ہے۔ آپ اس کو ذلیل اور حقیر سمجھنے لگتے ہیں۔ آپ کی نظر میں اس سے زیادہ برا اور کوئی شخص نہیں ہوتا۔

مومن وہ ہے جس کے اندر یہی شدت احساس خود اپنی غلطیوں کے بارہ میں پیدا ہو جائے۔ اس سے کوئی غلطی ہو تو فوراً وہ جان لے کہ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ اپنی غلطیوں کو جاننے کے لئے وہ اتنا ہی حساس ہو جائے جتنا کوئی شخص دوسرے کی غلطیوں کو جاننے کے لئے ہوتا ہے۔ غلطی سرزد ہوتے ہی وہ تڑپ اٹھے کہ مجھ سے ایسا فعل ہوگیا جو مجھ کو خدا سے دور کر دینے والا ہے۔ جو مجھ کو آخرت میں بے قیمت بنا دینے والا ہے۔ اس کا یہ احساس اتنا شدید ہو کہ اپنا وجود اس کو اپنی نظر میں حقیر معلوم ہونے لگے۔ اپنے احتساب کے لئے وہ اس سے زیادہ بے رحم ہو جائے جتنا کوئی شخص اپنے دشمن کے احتساب کے لئے ہوتا ہے۔

ایسے ہی لوگ اللہ والے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو اللہ کے ہاتھ بیچ دیا تاکہ ان کے لئے اللہ کے یہاں جنت ہو۔ جو لوگ دنیا میں اس قسم کی متقیانہ زندگی کا ثبوت دیں وہی وہ لوگ ہیں جو آخرت کی دنیا میں جہنم سے دور رکھے جائیں گے۔ ان کا رب ان سے ملاقات کے عظیم دن کہے گا کہ آج تمہارے اوپر کوئی الزام نہیں۔ ان کے لئے جنت کے تمام دروازے کھول دیئے جائیں گے اور خدا کی طرف سے پکارنے والا پکارے گا: ابدی باغوں میں بنے ہوئے یہ جنتی مکانات آج تمھاری وراثت میں دے دیئے گئے۔ جس دروازہ سے چاہو اس میں داخل ہو جاؤ۔ آج کے بعد نہ تمہارے لئے کوئی غم ہے اور نہ تکلیف۔

There is an ancient Chinese ceremony in which the parents of a child choose the baby's name.

As soon as the baby is born, all the cutlery in the house of its parents is thrown in the air. The parents then listen to the falling knives, forks, and spoons and choose a name—Ping, Chang, Tung, Fung, Cheung...

چینیوں کے نام ایسے ہوتے ہیں جن میں اکثر ٹن ٹن جیسی آوازیں ہوتی ہیں۔ اس پر کسی نے لطیفہ بنایا کہ چین میں جب کسی کے گھر میں بچہ پیدا ہوتا ہے تو گھر والے نام رکھنے کی تقریب مناتے ہیں۔ اس تقریب میں گھر کی تمام کٹلری (چھری، چمچہ وغیرہ) فضا میں اچھالی جاتی ہے۔ ماں باپ گرتے ہوئے چھری، کانٹے اور چمچے کی آوازیں سنتے ہیں۔ پھر ان آوازوں میں سے کسی آواز کو اپنے بچہ کے نام کے لئے منتخب کر لیتے ہیں۔ مثلاً پنگ، چنگ، ٹنگ، فنگ، چیانگ وغیرہ

لطیفوں سے استدلال کا یہ طریقہ آپ کسی بھی چیز کے خلاف استعمال کر سکتے ہیں۔ قرآن و حدیث سے لے کر عام کتابوں تک کوئی بھی چیز اس کی زد سے محفوظ نہیں۔ ایک شخص سب کو یکساں طور پر اپنی لطیفہ گوئی کا نشانہ بنا سکتا ہے۔ تاہم اس قسم کے "دلائل" کا ایک ہی آزمودہ جواب ہے —— مسکرا کر چپ ہو جانا۔

خدا پاک کو ناپاک سے جدا کرتا ہے

ما كان الله ليذر المؤمنين على ما انتم عليه حتى يميز الخبيث من الطيب وما كان الله ليطلعكم على الغيب ولكن الله يجتبي من رسله من يشاء فآمنوا بالله ورسله وان تؤمنوا وتتقوا فلكم اجر عظيم (آل عمران ۱۷۹)

اللہ وہ نہیں کہ چھوڑ دے مسلمانوں کو جس طرح پر تم ہو، جب تک جدا نہ کرے ناپاک کو پاک سے۔ اور اللہ یوں نہیں کہ تم کو خبردار کردے غیب کے اوپر۔ بلکہ اللہ چھانٹ لیتا ہے اپنے رسولوں میں جس کو چاہے۔ پس تم یقین لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر۔ اور اگر تم یقین پر رہو اور پرہیزگاری کرو تو تم کو بڑا ثواب ہے۔

اللہ کی نظر میں کون اچھا ہے اور کون برا، اس کا حال اسی دنیا میں کھل جاتا ہے۔ مگر اس کا اندازہ معمول کے حالات میں نہیں ہوتا، بلکہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ غیر معمولی حالات پیش آئیں۔ جب کہ انسان کو اپنے سانچہ کو توڑ کر اور اپنی زندگی کی روش کو بدل کر اس بات کا ثبوت دینا ہو کہ وہ فی الواقع اللہ پر یقین رکھتا ہے اور اس کی پکڑ سے ڈرنے والا ہے۔ ایک آدمی کے ساتھ جب کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آتا ہے تو یہ اللہ کی طرف سے اس کے امتحان کا وقت ہوتا ہے۔ اللہ اس کو ایک معاملاتی جانچ میں ڈال کر دیکھتا ہے کہ وہ خدا سے ڈرنے والا ہے یا اس کے سینہ میں ایسا دل ہے جو اللہ کے خوف سے خالی ہے۔ معاملہ کے وقت وہ بے انصافی کرتا ہے یا انصاف سے کام لیتا ہے۔ وہ ڈھٹائی کے راستہ پر چلتا ہے یا اعتراف کے راستہ پر۔ وہ گھمنڈ کا طریقہ اختیار کرتا ہے یا تواضع کا۔ وہ خدا کے حکم کو نظر انداز کرتا ہے یا اس کے آگے جھک جاتا ہے۔ جب بھی آدمی اپنے آپ کو اس قسم کے دو امکانات کے درمیان پائے تو اس کو سمجھنا چاہئے کہ اس کے رب نے اس کو پل صراط پر کھڑا کر دیا ہے جو بال سے زیادہ باریک ہے۔ ایک طرف اگر وہ جھکتا ہے تو وہ جہنم میں جا گرے گا اور دوسری طرف جھکتا ہے تو جنت میں اپنے آپ کو پائے گا۔

کون خدا کی نظر میں کیا ہے، اس کا اعلان فرشتوں کے ذریعہ نہیں کرایا جاتا۔ اس معاملہ میں اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان انسانوں میں سے ایک انسان کو کھڑا کرتا ہے اور اس کے ذریعہ سے حق کی آواز کو بلند کرتا ہے۔ اس آواز کو ماننے یا نہ ماننے میں آدمی کا سب سے بڑا امتحان ہوتا ہے۔ اپنے جیسے ایک انسان کی بولی میں خدا کی آہٹ کو پالینا اپنے جیسے ایک انسان کی آواز میں حق کی تجلیات کو پہچان لینا یہی اللہ کی نظر میں آدمی کا اصل کمال ہے، جو اس کمال کا ثبوت دے وہ اللہ کی نظر میں پاک انسان ہے، اس کے لئے جنت کی سرسبز بستیاں ہیں۔ اور جو لوگ اس جانچ میں ناکام رہیں وہ اللہ کی نظر میں ناپاک لوگ ہیں۔ دنیا میں خواہ وہ کتنے ہی کامیاب نظر آئیں۔ مگر آخرت میں دوزخ کی آگ کے سوا کوئی چیز نہ ہوگی جہاں ان کو ٹھکانا مل سکے۔ آدمی صالح ہے یا غیر صالح، اس کا فیصلہ معمول کے حالات میں نہیں ہوتا بلکہ غیر معمولی حالات میں ہوتا ہے۔ اس کی انصاف پسندی اس وقت کھلتی ہے جب کہ وہ اپنے مخالف سے معاملہ کر رہا ہو۔ اس کی تواضع اس وقت معلوم ہوتی ہے جب کہ حق کی آواز اس کو ایک ایسے گوشہ سے سنائی دے جس طرف اس کا گمان نہیں گیا تھا۔



تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی مہم
آپ کو آواز دیتی ہے

وقتی جوش کے تحت بڑی قربانی دینا آسان ہے۔ مگر کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت تسلسل کے ساتھ دی جائیں۔ ہم اسی قسم کی ایک چھوٹی قربانی کے لئے آپ سے اپیل کر رہے ہیں۔

وہ لوگ جو الرسالہ کو ضروری اور مفید سمجھتے ہیں۔ ان سے ہماری درخواست ہے کہ وہ اس کی ایجنسی قبول کر کے اس فکری مہم میں ہماری مدد فرمائیں پانچ پرچہ کی قیمت بعد وضع کمیشن ساڑھے سات روپے ہوتی ہے۔ ہمارا ہر ہمدرد یہ طے کرے کہ وہ پانچ پرچے ہر حال میں منگائے گا۔ اور جب تک خریدار مہیا نہ ہوں لوگوں میں مفت تقسیم کرے گا۔ اور اس وقت تک ساڑھے سات روپے ماہانہ اپنے پاس سے ادا کرتا رہے گا جب تک خریدار نہیں مل جاتے۔

موجودہ حالات میں ایک شخص کے لئے یہ بہت چھوٹی قربانی ہے۔ لیکن اگر ہمارا ہر ہمدرد اس قربانی کو اپنی زندگی میں شامل کرے تو چند سالوں میں انشاء اللہ بہت بڑے نتائج نکل سکتے ہیں۔

یونیورسٹی کے ایک استاد نے اپنے ساتھی سے ماہنامہ الرسالہ کا تعارف کرتے ہوئے کہا:

IT PRESENTS ISLAM AS A LIVING FAITH

یہ اسلام کو ایک زندہ مذہب کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔

یہ اپنی کمزوری کا اعلان ہے

"کارواں" ایک پندرہ روزہ انگریزی میگزین ہے۔ اس میں ایک انعامی کالم رہتا ہے جس کا عنوان ہے :

میری زندگی میں نقطۂ انقلاب

اس عنوان کے تحت اس کی جون اول ۱۹۷۰ کی اشاعت میں جو واقعہ درج ہے اس کے نیچے محمد اکمل کا نام ہے (پتہ درج نہیں ہے)

موصوف لکھتے ہیں کہ میں ایک مسلم خاندان میں پیدا ہوا۔ میری دادی بہت مذہبی تھیں۔ وہ ہم کو بتاتی رہتی تھیں کہ آدمی کی نجات صرف کلمۂ توحید سے ہوگی۔ ۱۰ سال کی عمر میں جب کہ میں چھٹی کلاس میں پڑھتا تھا، میرے اکثر دوست ہندو یا عیسائی تھے۔ یہ احساس مجھے بری طرح ستاتا تھا کہ مرنے کے بعد یہ میرے دوست مجھ سے چھوٹ جائیں گے۔ "ایسی جنت میں جانے سے کیا فائدہ جہاں سبرامنیم اور زیویر میرے ساتھ کھیلنے کے لئے موجود نہ ہوں، ایسی جنت سے تو جہنم اچھی"۔ میں عرصہ تک پریشان رہا یہاں تک کہ ایک "تدبیر میرے ذہن میں آئی"۔ میں کلمہ پڑھوں گا اور دوستوں سے کہوں گا کہ تم بھی اس کو زبان سے دہراؤ "۔ اور پھر خدا ان کو بھی جنت میں پہنچا دے گا۔

ایک دن جب کہ میں اپنے دوستوں کے ساتھ باغ میں تھا، میں نے اچانک کہا: لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ سبرامنیم نے یہ سن کر کہا یہ کیا۔ میں نے کہا یہ تمھارے لئے چیلنج ہے۔ کیا تم ان الفاظ کو اپنی زبان سے دہرا سکتے ہو۔ "دہرادوں تو کیا انعام دوگے"۔ میں نے کہا ایک نٹمن پنسل۔ سبرامنیم نے کلمہ کے الفاظ دہرا دیئے۔ اس کے بعد میں نے یہی بات زیویر سے کہی۔

زیویر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے کہا۔ میری ماں مجھ کو بتاتی ہے کہ یسوع مسیح خدا کے بیٹے ہیں۔ جو ان کا انکار کرے گا وہ سیدھا جہنم میں جائے گا۔ زیویر کلمہ کے الفاظ کو نہ دہرا سکا۔

اب میں سخت مشکل میں پڑ گیا۔ اس وقت سبرامنیم بولا۔ "میرے باپ کا کہنا ہے کہ ہندو، مسلم، عیسائی اور سکھ میں کوئی فرق نہیں۔ اصل یہ ہے کہ آدمی آدمی بنے۔ میرا باپ کبھی پوجا نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے اصل عبادت خانہ آدمی کا دل ہے"۔ خدا یہ نہیں دیکھے گا کہ تم ہندو ہو یا مسلمان یا عیسائی۔ وہ تو صرف یہ دیکھے گا کہ تم اچھے ہو یا برے۔

اسی دن میرے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔ میں نے سبرامنیم اور زیویر دونوں کو ایک ایک لال پنسل دی۔ ہم سب بہت خوش ہوئے۔ اس سنہری سہ پہر کو بالآخر ہم نے زندگی کی معنویت کو پا لیا۔ اب میں بڑا ہو چکا ہوں مگر سبرامنیم کے باپ کے الفاظ مجھے بھولتے نہیں۔ ان الفاظ پر میں جتنا زیادہ سوچتا ہوں، ان کی ابدی سچائی کا مجھ کو یقین ہوتا چلا جاتا ہے"۔

اوپر ہم نے کہانی کا خلاصہ درج کر دیا ہے۔ اس کے اندر جو مصنوعی پن ہے، اس سے یہ ظاہر ہے کہ یہ ایک گھڑا ہوا قصہ ہے نہ کہ کوئی سچا واقعہ۔ بظاہر اس کا مقصد یہ ہے کہ سامی مذاہب کے اوپر آریائی مذاہب کی فوقیت ثابت کی جائے۔ مختلف مذاہب کے درمیان تقابل کسی بھی شخص کا ایک علمی حق ہے۔ مگر اس قصہ میں اسلام کی تعلیم کو واضح طور پر بگاڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ جب کہ تقابل متعلقہ مذاہب کی حقیقی تعلیمات کے درمیان ہونا چاہئے نہ کہ خود ساختہ تعلیمات کے درمیان۔ تقابل کے لئے فرضی قصوں کا سہارا لینا اپنی کمزوری کا اعلان ہے نہ کہ دوسرے کی کمزوری کا۔

عمل وہی ہے جس میں دنیوی فائدہ اور شہرت کی طلب نہ ہو

ابو داؤد اور نسائی نے ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ان الفاظ میں نقل کی ہے:

قال جاء رجل الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال ارأیت رجلا غزا یلتمس الاجر والذکر ماله فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا شیئ له فاعادها ثلاث مرات- یقول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا شئی له- ثم قال ان اللہ لا یقبل من العمل الا ما کان خالصا وابتغی به وجهه

ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا ایک شخص جہاد کرتا ہے اور اس کے ذریعہ سے وہ دنیوی فائدہ اور شہرت چاہتا ہے، اس کے لئے کیا ہے۔ آپ نے فرمایا اس کے لئے کچھ نہیں ہے۔ یہی سوال اس نے تین بار کیا اور ہر بار آپ نے یہی فرمایا کہ اس کے لئے کچھ نہیں ہے۔ پھر آپ نے فرمایا: اللہ صرف اس عمل کو قبول کرتا ہے جو خالص اسی کے لئے اور اس کی رضا کے لئے ہو

امید اور خوف کے درمیان

ابونعیم نے نقل کیا ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

لو نادیٰ مناد من السماء یا ایها الناس انکم داخلون الجنة کلکم الا رجلا واحدا لخفت ان اکون انا هو- ولو نادیٰ مناد ایها الناس انکم داخلون النار الا رجلا واحدا لرجوت ان اکون انا هو

(حلیۃ الاولیاء جلد اول)

اگر آسمان سے کوئی پکارنے والا پکارے کہ اے لوگو تم سب کے سب جنت میں جاؤ گے سوا ایک آدمی کے، تو مجھے ڈر ہوگا کہ میں ہی وہ آدمی ہوں۔ اور اگر پکارنے والا پکارے کہ اے لوگو تم سب کے سب جہنم میں جاؤ گے سوا ایک آدمی کے، تو مجھے امید ہوگی کہ میں ہی وہ آدمی ہوں۔

لوگوں کو معاف کر دینا بھی صدقہ ہے

ابوعبس بن جبر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز لوگوں کو ابھارا کہ وہ جہاد فی سبیل اللہ کے لئے صدقہ دیں۔ لوگ اپنی وسعت کے مطابق لے آئے۔ آپ کے اصحاب میں ایک علبہ بن زید بن حارثہ انصاری رضی اللہ عنہ تھے۔ ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ وہ رات کو اٹھے۔ نماز پڑھی اور رو کر اللہ تعالیٰ سے کہا:

اللّٰھم انه لیس عندی ما اتصدق به- اللّٰھم انی اتصدق بعرضی علی من ناله من خلقك

خدایا! میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں جس کو صدقہ کروں۔ خدایا! آپ کے بندوں میں سے جس کسی نے میری عزت لی ہو تو میں اس عزت کو صدقہ کرتا ہوں (معاف کرتا ہوں)

صبح کو لوگ جمع ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: این المتصدق هذه اللیلة (آج کی رات صدقہ کرنے والا کہاں ہے) مگر کوئی نہ اٹھا۔ آپ نے دوبارہ یہی سوال کیا، مگر کوئی نہ اٹھا۔ تیسری بار سوال کرنے کے بعد علبہ بن زید رضی اللہ عنہ اٹھے۔ آپ نے فرمایا:

ابشر، فوالذی نفسی بیده لقد کتبت فی الزکاة

تم کو خوش خبری ہو۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری

المتقبلة (البدایہ والنہایہ جلد ۵) جان ہے، تمھارا عمل قبول کئے ہوئے صدقہ میں لکھ لیا گیا۔

اللہ کو وہ بندہ پسند ہے جو اپنے آپ کو فتنوں سے دور رکھے

عمر بن سعد رضؓ اپنے باپ سے نقل کرتے ہیں، مسلمانوں کی باہمی جنگ کے زمانے میں ان کے لڑکے عامر نے ان سے کہا: اے میرے باپ! لوگ لڑ رہے ہیں اور آپ گھر پر بیٹھے ہیں۔ انھوں نے کہا: اے میرے بیٹے! کیا تم مجھ سے یہ کہتے ہو کہ میں فتنہ کا سردار بن جاؤں۔ خدا کی قسم میں ایسا نہیں کروں گا۔ جب تک مجھے ایسی تلوار نہ مل جائے کہ اگر میں اس سے مومن کو ماروں تو وہ اچٹ جائے اور اس سے کافر کو ماروں تو میں اس کو قتل کر دوں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: اللہ ایسے شخص کو پسند کرتا ہے جو بے نیاز ہو، چھپا ہوا ہو اور اللہ سے ڈرنے والا ہو (ان اللہ یحب الغنی الخفی التقی، البدایہ والنہایہ جلد ۷ صفحہ ۲۸۲)

آدمی اپنے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے

بزار نے انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقداد بن اسودؓ کو ایک مقام پر عامل بنا کر بھیجا۔ کچھ دن کے بعد وہ آئے تو آپ نے پوچھا: تم نے اس کام کو کیسا پایا۔ مقداد رضی اللہ عنہ نے کہا: کنت احمل وا وضع حتی رأیت بان لی علی القوم فضلاً (لوگ مجھ کو اٹھاتے اور بڑھاتے رہے۔ یہاں تک کہ میں خیال کرنے لگا کہ مجھے لوگوں کے اوپر فضیلت حاصل ہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: امارت تو اسی طرح کی چیز ہے۔ اب تم چاہے اس کو اختیار کرو یا اسے چھوڑ دو۔ مقداد رضی اللہ عنہ نے کہا: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، اب میں دو آدمیوں کے اوپر بھی امیر نہیں بنوں گا۔

جس دل میں خدا کا خوف نہ ہو وہ خدائی کیفیات کو سمجھ نہیں سکتا

غزوہ تبوک نہایت مشکل حالات میں ہوا۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ اللہ کے راستہ میں نفقہ دیں۔ لوگوں نے اپنی اپنی وسعت کے مطابق دینا شروع کیا۔ سب سے زیادہ صدقہ کرنے والوں میں سے ایک عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ تھے۔ انھوں نے دو سو اوقیہ دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا: ھل ترکت لاھلک شیئاً (کیا اپنے بچوں کے لئے کچھ چھوڑا) انھوں نے کہا ہاں۔ آپ نے پوچھا کیا چھوڑا۔ انھوں نے کہا: جو میں نے صدقہ میں دیا ہے اس سے اچھا اور بہتر۔ آپ نے پوچھا کتنا۔ عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے جواب دیا: ماوعد اللہ ورسولہ من الرزق والخیر (وہ رزق اور خیر جس کا اللہ اور رسول نے وعدہ کیا ہے) ابو عقیل انصاری رضی اللہ عنہ ایک صاع کھجور لے کر آئے۔ انھوں نے کہا۔ آج ساری رات میں نے ایک یہودی کے یہاں پانی کھینچ کر دو صاع کھجور حاصل کی۔ ایک صاع (ساڑھے تین سیر) میں نے اپنے گھر والوں کو دی اور ایک صاع یہاں لایا ہوں: واللہ ما کان عندی شیئٌ غیرہ وھو یعتذر وھو یستحیی وہ عذر کر رہے تھے اور شرمندہ تھے۔ انھوں نے کہا خدا کی قسم اس کے سوا میرے پاس اور کچھ نہیں۔ دوسری طرف مدینہ کے منافقین کا حال یہ تھا کہ جب کوئی مسلمان زیادہ صدقہ دیتا تو کہتے کہ یہ ریاکار (مرائی) ہے اور دوسری قسم کے لوگوں کی بابت کہتے: ھذا افقر الی صاعہ من غیرہ (یہ شخص اپنے اس ایک صاع کا خود زیادہ محتاج تھا) کنز العمال

ایک گم نام آدمی کا اجر کبھی بڑے آدمیوں سے زیادہ ہوتا ہے

ابن عساکر نے ارطاۃ بن منذر سے نقل کیا ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے ایک روز اپنے پاس بیٹھنے والوں سے کہا ای الناس اعظم اجرا (لوگوں میں کس آدمی کا اجر زیادہ ہے) کسی نے روزہ دار اور نمازی کا ذکر کیا۔ کسی نے کہا امیر المومنین کا اجر زیادہ ہے۔ کسی نے اور کسی کا نام لیا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا میں تم کو بتاؤں کہ جن لوگوں کا تم نے ذکر کیا ان سے زیادہ اور امیر المومنین سے بھی زیادہ اجر کس کا ہے۔ لوگوں نے کہا: ہاں۔ آپ نے فرمایا:

رویجل بالشام آخذ بلجام فرسہ یکلأ من وراء بیضۃ المسلمین، لا یدری اسبع یفترسہ ام ھامۃ تلدغہ او عدو یغشاہ، فذٰلک اعظم اجرا ممن ذکرتم ومن امیر المومنین

(کنز العمال جلد ۲)

وہ معمولی آدمی جو شام (مقام جہاد) میں اپنے گھوڑے کی لگام پکڑے ہوئے مسلمانوں کے لشکر کی حفاظت کر رہا ہے اسے کچھ خبر نہیں کہ کوئی درندہ اس کو پھاڑ ڈالے گا یا کوئی کیڑا اسے ڈس لے گا یا دشمن اس پر چھاپہ مار دے گا۔ اس شخص کا اجر ان لوگوں سے زیادہ ہے جن کا تم نے ذکر کیا اور امیر المومنین سے بھی۔

ریا سے بچنے والا جواب

طبری نے حضرت عروہ کے واسطے سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عمر رضی اللہ عنہ ایلیہ (فلسطین) آئے اور ان کے ساتھ مہاجرین اور انصار کی ایک جماعت تھی۔ آپ نے اسقف کو اپنا کرتہ دیا جو کھدر کے پیوندوں کا تھا۔ لمبے راستہ پر سواری پر بیٹھنے کی وجہ سے کرتا پیچھے کی طرف پھٹ گیا تھا۔ آپ نے اس کو اسقف کو دیا تاکہ وہ اس کو دھو دے اور اس پر پیوند لگا دے۔ اسقف قمیص کو لے گیا۔ اس کو درست کیا اور اس کے ساتھ ایک اور کرتا باریک کپڑے کا سی کر لے آیا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو دیکھ کر پوچھا یہ کیا ہے۔ اسقف نے کہا: یہ تو آپ کی قمیص ہے۔ اس کو میں نے دھویا ہے اور اس میں پیوند لگایا ہے۔ یہ دوسرا میری طرف سے آپ کے لئے ہدیہ ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو دیکھا۔ ہاتھ سے چھوا۔ پھر اپنا کرتا پہن لیا اور دوسرا کرتا اسقف کو واپس کر دیا اور فرمایا:

ھذا انشفھما للعرق (تاریخ طبری جلد ۳)

دونوں میں سے یہ کرتا پسینہ جذب کرنے کے لئے زیادہ اچھا ہے

سب کچھ کر کے بھی دنیا میں قیمت نہ چاہنا

عبدالرحمن بن زید بن اسلم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ مکہ کے مسلمان ہجرت کر کے مدینہ آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار سے کہا: یہ مہاجرین تمہارے بھائی ہیں۔ وہ اپنے مال اور اولاد کو چھوڑ کر تمہارے پاس آئے ہیں۔ انصار نے کہا: ہمارے پاس کھجور کے باغ ہیں۔ ان میں آدھا مہاجرین کا، آدھا ہمارا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کے علاوہ بھی تو ہو سکتا ہے۔ انصار نے کہا اے خدا کے رسول! وہ کیا۔ آپ نے فرمایا: یہ مکہ کے لوگ کھیتی اور باغبانی نہیں جانتے۔ تم ان کی طرف سے کام کرو (اور پیداوار میں تقسیم کر لو۔ انصار نے کہا سمعنا واطعنا (ہم نے سنا اور ہم نے مان لیا) جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ انصار جب فصل کے موقع پر کھجوریں توڑتے تو ہر انصاری یہ کرتا کہ کھجوروں کے دو حصے بناتا۔ ایک حصہ کم ہوتا

اور ایک حصہ زیادہ ۔ کم والے حصہ کے ساتھ کھجور کی شاخیں رکھ دیتے ۔ پھر بڑا ڈھیر مہاجرین کو دے دیتے اور چھوٹا ڈھیر خود لے لیتے ۔ یہ سلسلہ فتح خیبر تک جاری رہا (کنز العمال جلد ۲) امام بخاری نے انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو بلایا کہ ان کو بحرین کی زمین دے دیں ۔ انھوں نے کہا نہیں جب تک مہاجر بھائیوں کو بھی اتنی ہی زمین نہ ملے ۔ آپ نے فرمایا :

اما لا فاصبروا حتی تلقونی فانہ سیصیبکم اثرۃ

ایسا ممکن نہیں پھر تم صبر کرو یہاں تک کہ آخرت میں مجھ سے ملو ۔ کیونکہ میرے بعد (حکومتی عہدوں میں) تمھارے اوپر دوسروں کو ترجیح دی جائے گی ۔

خدا کو شور کے ساتھ پکارنے کی ضرورت نہیں

ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ خیبر کے لئے روانہ ہوئے ۔ لوگ ایک وادی کے قریب پہنچے تو انھوں نے بلند آواز سے تکبیر کہی : اللہ اکبر و لا الٰہ الا اللہ ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : اربعوا علیٰ انفسکم انکم لا تدعون اصم ولا غائبا انکم تدعون سمیعا قریبا وھو معکم (بخاری) لوگو اپنے اوپر نرمی کرو تم کسی بہرے یا غائب کو نہیں پکار رہے ہو ۔ تم ایک ایسی ذات کو پکار رہے ہو جو سننے والی اور قریب ہے اور وہ تمھارے ساتھ ہے ۔

آخرت کے حساب سے کانپنا

ابن ابی شیبہ اور بیہقی نے ضحاک کے واسطے سے نقل کیا ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک چڑیا کو درخت پر بیٹھے ہوئے دیکھا ۔ آپ نے فرمایا : اے چڑیا ! تو کیسی خوش نصیب ہے ۔ کاش میں بھی تیری طرح ہوتا ۔ تو درخت پر بیٹھتی ہے اس کا پھل کھاتی ہے ، پھر اڑ جاتی ہے ۔ تیرے اوپر نہ کوئی حساب ہے اور نہ عذاب ۔ خدا کی قسم مجھے یہ زیادہ پسند ہے کہ میں راستہ کے کنارے کا ایک درخت ہوتا ۔ میرے پاس سے ایک اونٹ گزرتا ، مجھے پکڑتا اور مجھ کو اپنے منہ میں داخل کر لیتا ۔ مجھے چباتا ، مجھے نگل لیتا اور پھر مینگنی کرکے باہر نکال دیتا ۔

اپنے عمل کو بے قیمت سمجھنا

ابن عساکر نے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ عمر رضی اللہ عنہ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے ملے ۔ آپ نے فرمایا : اے ابوموسیٰ ! کیا تم کو یہ پسند ہے کہ تم نے جو عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہ کر کئے ، وہی تمھارے لئے ہوں ، اور تم اپنے عمل سے برابر سرابر چھوٹ جاؤ ۔ خیر شر سے اور شر خیر سے برابر ہو جائے ، نہ تمھارے لئے کوئی ثواب ہو نہ عذاب ، ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے کہا : نہیں اے امیر المومنین ! خدا کی قسم میں بصرہ آیا اور ظلم کرنا ان کے اندر عام تھا ۔ پھر میں نے ان کو قرآن اور سنت کی تعلیم دی ۔ ان کے ساتھ اللہ کی راہ میں غزوہ کیا : وانی لارجوا بذلک فضلہ (میں ان اعمال کے ذریعہ اللہ کے فضل کی امید رکھتا ہوں) عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا :

لکن وددت ان خرجت من عملی خیرہ بشرہ و شرہ بخیرہ کفافا لا علی ولا لی وخلص لی عملی مع

لیکن مجھے یہ پسند ہے کہ میں اپنے عمل سے اس طرح نکل جاؤں کہ خیر شر سے اور شر خیر سے برابر ہو جائے ، میرے اوپر نہ کوئی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المخلص | اگناہ ہوا اور نہ کوئی ثواب۔ میرے لئے وہی عمل رہ جائے جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کئے۔

محنت کی کمائی سے خرچ کرنا

بیہقی نے حضرت حسن سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا: اے مال والو! تم لوگ بھلائی میں آگے بڑھ گئے۔ تم لوگ صدقہ کرتے ہو، حج کرتے ہو، انفاق کرتے ہو۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا تم لوگ ہمارے اوپر رشک کرتے ہو۔ آدمی نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا: فو اللہ لدرہم ینفقه احد من جهد خیر من عشرۃ آلاف غیض من فیض (شعب الایمان) خدا کی قسم وہ ایک درہم جو ایک شخص اپنی محنت کی کمائی سے خرچ کرتا ہے، ان دس ہزار درہموں سے بہتر ہے جو بہت بڑے ڈھیر سے خرچ کئے گئے ہوں

اپنے ماتحتوں پر اپنی ذات کو ترجیح نہ دینا

ابن عساکر نے ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ ایک لشکر کے ساتھ شام میں تھے۔ وہاں طاعون پھیل گیا۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو آپ نے ابو عبیدہ رضؓ کو خط لکھا کہ مجھے تمہاری ایسی ضرورت پیش آگئی ہے کہ میرے لئے تمہارے بغیر چارہ نہیں۔ میرا یہ خط تم کو رات میں ملے تو میں تم کو قسم دیتا ہوں کہ تم صبح سے پہلے سوار ہو کر میری طرف روانہ ہو جاؤ۔ اور اگر میرا خط دن کو ملے تو میں تم کو قسم دیتا ہوں کہ تم رات سے پہلے سوار ہو کر میری طرف روانہ ہو جاؤ۔ ابو عبیدہ رضؓ نے خط پڑھا تو کہا کہ میں امیر المومنین کی اس ضرورت کو جان گیا جو ان کو پیش آئی ہے:

انه یرید ان یستبقی من لیس بباق | امیر المومنین چاہتے ہیں کہ اس کو باقی رکھیں جو باقی رہنے والا نہیں

انھوں نے جواب میں عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ میں مسلمانوں کے ایک لشکر میں ہوں۔ میں خود کو ان کے اوپر ترجیح نہیں دے سکتا۔ میں نے آپ کی ضرورت کو سمجھ لیا ہے جو آپ کو پیش آئی ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ اس آدمی کو باقی رکھیں جو باقی رہنے والا نہیں۔ جب آپ کو میرا یہ خط پہنچے تو آپ مجھ کو اپنے ارادہ سے معافی دیجئے اور مجھ کو ٹھہرنے کی اجازت دیجئے۔ حضرت عمر رضؓ نے ان کے خط کو پڑھا تو وہ رو پڑے اور ان کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ جو لوگ آپ کے پاس تھے انھوں نے پوچھا: امیر المومنین! کیا ابو عبیدہ رضؓ کا انتقال ہو گیا۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ لیکن گویا کہ ہو گیا۔

کاش میں ایک تنکا ہوتا

ابن ابی شیبہ، ابن عساکر وغیرہ نے عامر بن ربیعہ سے روایت کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ عمر رضی اللہ عنہ نے ایک تنکا زمین سے اٹھا کر اپنے ہاتھ میں لیا اور فرمایا:

یالیتنی کنت ھٰذہ التبنة، لیتنی لم اخلق، لیتنی لم اکن شیئا، لیت امی لم تلدنی، لیتنی کنت نسیا منسیا | کاش میں یہ تنکا ہوتا، کاش میں پیدا نہ کیا جاتا۔ کاش میں کچھ بھی نہ ہوتا۔ کاش میری ماں مجھ کو نہ جنتی۔ کاش میں بھولا بسرا ہوا ہوتا

حق کے معاملہ میں کوئی رعایت نہیں

بنی مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی جس کا نام فاطمہ تھا۔ لوگ ڈرے کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ لوگوں نے اسامہ بن زید رضؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سفارشی بنا کر بھیجا۔ آپ نے سنا تو آپ کے چہرے پر غصہ کے آثار ظاہر ہو گئے۔ آپ نے کہا: کیا تم مجھ سے اللہ کی حد کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہو۔ اسامہ رضؓ نے فوراً کہا: رسول اللہؐ! مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میرے لئے مغفرت کی دعا کیجئے۔ پھر آپؐ نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: پچھلی امتیں اس لئے ہلاک ہو گئیں کہ ان کا کوئی شریف چوری کرتا تو اس کو چھوڑ دیتے۔ اور اگر کوئی کمزور چوری کرتا تو اس پر حد جاری کرتے۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتی تو یقیناً میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔ والذی نفس محمد بیدہ، لو ان فاطمۃ بنت محمد سرقت لقطعت یدھا (بخاری ومسلم)

حسد اور کبر سچائی کے اعتراف میں رکاوٹ بن جاتا ہے

غزوۂ احزاب سے پہلے مدینہ کے کچھ یہودی مکہ گئے۔ انھوں نے مکہ والوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف لڑائی پر ابھارا اور کہا کہ تم لوگ مدینہ پر حملہ کرو۔ ہم بھی تمہارا ساتھ دیں گے۔ ان یہودیوں میں حی بن اخطب اور کعب بن اشرف وغیرہ شامل تھے۔ اس وقت مکہ کے سرداروں نے یہودی علماء سے کہا کہ ہم بیت اللہ کے متولی ہیں ہم حاجیوں کی خدمت کرتے ہیں اور کعبہ کو آباد رکھتے ہیں۔ بتاؤ کہ ہمارا دین بہتر ہے یا محمد کا دین (افدیننا خیر ام دین محمد) یہودی علماء نے جواب دیا: تمہارا دین ان کے دین سے بہتر ہے اور تم ان سے زیادہ حق پر ہو۔ وانتم اولی بالحق منہ (تہذیب سیرۃ ابن ہشام جزء اول صفحہ ۱۹۶)

انصاف میں چھوٹے اور بڑے برابر ہیں

ابن عبدالحکم نے انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مصر کا ایک باشندہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس آیا۔ اس نے کہا: اے امیر المومنین! میں ظلم سے پناہ لینے کے لئے آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ نے فرمایا میں نے تجھ کو پناہ دی۔ مصری نے کہا: مصر کے عامل کے لڑکے محمد بن عمرو بن العاص سے میرا دوڑ میں مقابلہ ہوا اور میں اس سے آگے نکل گیا۔ وہ خفا ہو گیا اور اس نے مجھے کوڑے سے مارنا شروع کیا اور کہتا جاتا تھا: خذھا وانا ابن الاکرمین (یہ لے اور میں بڑے آدمیوں کا بیٹا ہوں) یہ سن کر عمر رضی اللہ عنہ نے عمرو بن عاص رضؓ کو لکھا کہ وہ اپنے لڑکے کو لے کر فوراً مدینہ پہنچیں۔ وہ آئے تو آپ نے مصری کو بلایا اور اس کو کوڑا دے کر کہا کہ اس کو مارو۔ اس نے مارنا شروع کیا۔ عمر رضی اللہ عنہ فرماتے جاتے تھے: اضرب ابن الاکرمین (بڑے آدمیوں کے بیٹے کو مارو) جب وہ لڑکے کو خوب مار چکا تو آپ نے فرمایا کہ اب عمرو بن العاص کو مارو۔ کیوں کہ ان کے لڑکے نے اپنے باپ ہی کے بل پر تم کو مارا ہے (فواللہ ما ضربک ابنہ الا بفضل سلطانہ) مصری نے کہا: مجھ کو جس نے مارا تھا، اس کو میں نے مار لیا۔ اب کسی اور کو مارنے کی مجھے حاجت نہیں۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر تو ان کو مارتا تو ہم تیری راہ میں حائل نہ ہوتے الا یہ کہ تو خود ہی ان کو چھوڑ دے۔ پھر عمرو بن العاص رضؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنالیا حالاں کہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد جنا تھا یا عمرو متی تعبدتم الناس وقد ولدتهم امهاتهم احرارا

امیر کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں کے کام کو دیکھے

اخرج البیهقی وابن عساکر عن طاؤس ان عمر رضی الله قال : ارأیتم ان استعملت علیکم خیرا ممن اعلم ثم امرته بالعدل، اقضیت ماعلی ۔ قالوا نعم ۔ قال لا ۔ حتی انظر فی عمله اعمل بما امرته ام لا

عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے کہا: بتاؤ اگر میں تمہارے اوپر کسی بھلے آدمی کو عامل بناؤں جس کو میں بھلا جانتا ہوں اور پھر اس کو حکم دوں کہ وہ انصاف کرے تو کیا میں نے اس ذمہ داری کو ادا کر دیا جو میرے اوپر ہے ۔ لوگوں نے کہا ہاں ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نہیں، جب تک میں اس کے کاموں کا جائزہ لے کر یہ بھی نہ دیکھ لوں کہ جس چیز کا میں نے اس کو حکم دیا تھا اس پر اس نے عمل کیا یا نہیں ۔

حضرت ابراہیم سے روایت ہے کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ جب کسی کو عامل بناتے اور اس طرف سے کوئی وفد آپ کے پاس آتا تو اس سے پوچھتے: تمہارا امیر کیسا ہے ۔ وہ غلاموں کی عیادت کرتا ہے یا نہیں ۔ جنازہ کے پیچھے چلتا ہے یا نہیں ۔ اس کے دروازہ پر جو لوگ آتے ہیں ان کے ساتھ اس کا رویہ کیسا ہے ۔ وہ نرم ہے یا نہیں ۔ اگر لوگ کہتے کہ اس کا دروازہ نرم ہے اور وہ غلاموں کی دیکھ بھال کرتا ہے تو کچھ نہ کہتے ۔ ورنہ اس سے امارت چھیننے کے لئے فوراً آدمی روانہ کرتے ۔ (کنز العمال)

فیصلہ میں جانب داری نہیں

ابن عساکر نے علی بن ربیعہ سے روایت کیا ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ جعدہ بن ہبیرہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا: اے امیر المومنین! دو آدمی آپ کے پاس آتے ہیں ۔ ان میں سے ایک کا حال یہ ہے کہ آپ اس کے نزدیک اس کی اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں ۔ دوسرے کا حال یہ ہے کہ اگر وہ آپ کو ذبح کر سکے تو ذبح کر ڈالے اور آپ ایسا فیصلہ دیتے ہیں جو پہلے کے خلاف اور دوسرے کی موافقت میں ہوتا ہے ۔ علی رضی اللہ عنہ نے جعدہ کے سینہ پر ہاتھ مارا اور فرمایا: یہ فیصلہ اگر کوئی میری چیز ہوتی تو میں ایسا کرتا ۔ مگر وہ صرف اللہ کی چیز ہے ۔ ان هذا شیئ لو کان لی فعلت ۔ ولکن انما ذا شیئ لله (کنز العمال جلد ۳)

قرآن میں سب سے زیادہ مشغول ہونا

بیہقی نے عاصم بن ابو بجود سے روایت کیا ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جب اپنے عاملوں کو روانہ کرتے تو ان سے یہ اقرار کراتے کہ تم ترکی گھوڑے پر سوار نہ ہونا ، میدے کی روٹی نہ کھانا ، باریک کپڑا نہ پہننا ، اپنے دروازوں کو

ضرورت مندوں سے بند نہ رکھنا، اگر تم نے ان میں سے کوئی بات کی تو تم سزا کے مستحق ہو گے۔ یہ اقرار لے کر انھیں رخصت کرتے۔ اور جب وہ کسی عامل کو معزول کرتے تو کہتے: میں نے تم کو مسلمانوں کے خون پر مسلط نہیں کیا تھا۔ نہ ان کی کھال اڑانے اور نہ ان کی عزت لینے کے لئے مقرر کیا تھا اور نہ ان کا مال لینے کے لئے۔ میں نے تم کو اس لئے بھیجا تھا کہ تم ان میں نماز قائم کرو، ان کے درمیان ان کا مال غنیمت تقسیم کرو، ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔ طبری (جلد ۵ صفحہ ۱۹) میں ابو حصین سے نقل کیا ہے جس میں اتنا اور اضافہ ہے: قرآن میں زیادہ سے زیادہ مشغول ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت میں کمی کرو اور میں تمہارا شریک ہوں۔ جردوا القرآن واقلوا الروایۃ عن محمد صلی اللہ علیہ وسلم وانا شریککم

خدا کی کتاب کے سامنے جھک جانا

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ عیینہ بن حصن مدینہ آئے اور اپنے چچازاد بھائی حُر بن قیس کے یہاں ٹھہرے۔ یہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ تھا۔ آپ قرآن جاننے والوں کو اپنی مجلس میں بٹھاتے اور ان سے مشورہ لیا کرتے تھے، خواہ وہ بوڑھے ہوں یا جوان۔ حُر بن قیس بھی ایک عالم قرآن تھے اور خلیفہ دوم کی مجلس میں آیا کرتے تھے۔ عیینہ نے حُر بن قیس سے کہا: اے میرے بھتیجے! امیرالمومنین کے یہاں تمہاری پہنچ ہے، میرے لئے ان سے اجازت حاصل کرو اور ان سے میری ملاقات کرا دو۔ انھوں نے اجازت حاصل کی اور عیینہ کو امیرالمومنین عمر فاروق رض کے یہاں لے گئے۔ عیینہ جب وہاں پہنچے تو انھوں نے کہا: ھی یا ابن الخطاب فواللہ ما تعطینا الجزل ولا تحکم فینا بالعدل (اے خطاب کے لڑکے، خدا کی قسم تم نہ ہم کو کچھ دیتے ہو اور نہ ہمارے درمیان انصاف کرتے ہو) عمر فاروق رض یہ سن کر غصہ ہو گئے۔ قریب تھا کہ ان پر ٹوٹ پڑیں۔ اتنے میں حر بن قیس بولے۔ انھوں نے کہا: اے امیرالمومنین، اللہ نے اپنے نبی سے فرمایا ہے کہ معاف کرو، معروف کا حکم دو اور جاہلوں سے اعراض کرو (اعراف ۱۹۹) اور یہ شخص یقیناً جاہلوں میں سے ہے۔" عبداللہ بن عباس رض کہتے ہیں: خدا کی قسم جب انھوں نے قرآن کی آیت پڑھی تو عمر رض فوراً رک گئے۔ اس کے بعد انھوں نے ذرا بھی تجاوز نہیں کیا۔ وہ خدا کی کتاب کے سامنے ہمیشہ گردن جھکا دیتے تھے۔ (بخاری)

بات کو غلط انداز سے کہنے کا اثر نہ لینا

انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا رہا تھا۔ آپ موٹے کنارے کی نجرانی چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ راستہ میں ایک دیہاتی آپ سے ملا۔ اس نے آپ کی چادر پکڑی اور بڑے زور سے آپ کو جھٹکا دیا۔ میں نے دیکھا کہ زور سے کھینچنے کی وجہ سے آپ کے کندھے پر چادر کا نشان پڑ گیا۔ پھر اس نے کہا: یا محمد مُر لی من مال اللہ الذی عندک (اے محمد اللہ کا جو مال تمہارے پاس ہے اس میں سے مجھ کو دلاؤ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس گستاخی کا کوئی اثر نہیں لیا۔ آپ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور حکم دیا کہ اس کی ضرورت کے مطابق اس کو بیت المال سے دے دیا جائے (متفق علیہ)

ملی تعمیر کا کام

سب سے پہلے

ملت کے افراد میں

شعور پیدا کرنے کا کام ہے

اس کی

بہترین صورت یہ ہے کہ

الرسالہ کو

ایک ایک بستی اور

ایک ایک گھر میں

پہنچایا جائے۔



تبدیلیٔ مذہب پر پابندی لگانے والا قانون

۱۹۶۸ میں مدھیہ پردیش اسمبلی میں ایک قانون پاس ہوا۔ بظاہر اس کا نام آزادی مذہب (Freedom of Religion) کا قانون تھا۔ مگر حقیقۃً وہ "اینٹی کنورژن" قانون تھا جس کا مقصد ملک میں تبلیغی سرگرمیوں کو روکنا تھا۔ اس کے بعد اروناچل پردیش میں اکتوبر ۱۹۷۸ میں اسی نام سے ایک قانون پاس کیا گیا۔ اس کے مطابق مذہب تبدیل کرانے والے کی سزا دس ہزار روپے جرمانہ ہے۔ اب مسٹر او۔ پی۔ تیاگی نے اسی (فریڈم آف ریلیجن) کے نام سے لوک سبھا میں ایک بل پیش کیا ہے۔ یہ اگرچہ ایک پرائیویٹ بل ہے۔ تاہم حکمراں پارٹی بظاہر اس کی موافقت میں ہے اور اغلب ہے کہ وہ پاس ہو کر باقاعدہ قانون بن جائے۔

اس کوشش کا مقصد جبری تبدیلیٔ مذہب کو روکنا بتایا گیا ہے۔ اگر اس کا مقصد حقیقۃً یہی ہو تو کسی نئے قانون کی ضرورت نہ تھی۔ موجودہ عام قوانین ہی اس کو روکنے کے لئے کافی ہیں۔ کسی کا مذہب بدلنے میں طاقت (Force) یا فریب (Fraud) کا طریقہ استعمال کرنا اس وقت بھی قانونی جرم ہے۔ پھر نئے قانون کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ نئے قانون کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ "جبر" کے مفہوم کو اتنا وسیع کر دیا جائے کہ غیر جبری تبدیلی مذہب بھی اس کی تعریف میں داخل ہو جائے۔ مسٹر تیاگی کے بل کے مطابق خدا کی ناراضی سے ڈرانا (Threat of Divine Displeasure) بھی جبری طریقوں میں شامل ہے۔ اسی طرح ترغیب (Inducement) کی تشریح میں بتایا گیا ہے کہ Pecuniary or otherwise (مالی یا دوسرے طریقے) بھی اس میں شامل ہوں گے۔ بالفاظ دیگر جنت کی خوش خبری دینا یا روحانی سکون کی امید دلانا بھی وہ چیزیں ہیں جن کو غیر قانونی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس بل کے مطابق ایسے شخص کے لئے ایک سال کی قید اور تین ہزار روپے جرمانہ ہیں۔ اور اگر اس نے ان تدبیروں سے بچہ یا عورت یا پست قبائل کے کسی شخص کا مذہب بدلا تو اس کی سزا دو سال قید اور پانچ ہزار روپے جرمانہ ہے۔ رپورٹ ملتے ہی ایسے شخص کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ دستور ہند کی دفعہ ۲۵ میں ہر باشندہ کو ضمیر کی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے۔ ہر شخص کو حق ہے کہ وہ جس مذہب کو چاہے اختیار کرے، اس پر عمل کرے اور اس کی تبلیغ کرے۔ مگر اس قانون کے ذریعہ "آزادی" کے نام پر اسی دستوری حق کو چھین لیا گیا ہے۔

عیسائی فرقہ عام طور پر ایک پُرامن فرقہ ہے۔ مگر اس بل کے خلاف انھوں نے غیر معمولی بے چینی کا اظہار کیا ہے۔ ۲۹ مارچ ۱۹۷۹ کو بمبئی میں عیسائیوں کا ایک احتجاجی جلوس نکلا جس میں ایک لاکھ عیسائی شریک تھے۔ اس بل کو رد کنے کے لئے ان کی طرف سے مسلسل کوششیں ہو رہی ہیں اور تمام عیسائی فرقے، رومن کیتھولک سے لے کر پروٹسٹنٹ اور سیرین کرسچین تک سب اس میں متحد ہو گئے ہیں۔ عیسائیوں کی بے چینی کی وجہ یہ ہے کہ اس بل کی زد عملی طور پر انھیں کے اوپر پڑتی ہے۔ سارے ملک میں، خاص طور پر سرحدی علاقوں کے پس ماندہ قبائل میں ان کی تبلیغی کوششیں بڑے پیمانہ پر جاری ہیں۔ ۱۹۴۰ میں ناگالینڈ کے علاقہ میں ایک بھی عیسائی نہ تھا، آج وہاں کی آبادی میں ۶۶ فی صد عیسائی بستے ہیں۔ میزورام میں ان کی تعداد ۹۸ فی صد اور کیرلا میں ۲۱ فی صد ہو چکی ہے۔ تاہم مسلم قائدین نے اس معاملہ میں صرف اس اعلان کو کافی سمجھا ہے کہ "ہم اس معاملہ میں اپنے عیسائی بھائیوں کے ساتھ ہیں"۔ مسلم قائدین نے تبلیغ و دعوت کے فریضہ کو اپنی شرعی ذمہ داریوں سے حذف کر رکھا ہے، ایسی حالت میں ان کو اس قسم کے مسائل پر بے چین ہونے کی کیا ضرورت۔

ایک سفر

سیرت کے ایک جلسہ (۱۰ فروری ۱۹۷۹) میں شرکت کے لئے جھنجھنوں کا سفر ہوا۔ جھنجھنوں، راجستھان کا شہر ہے جس کو پانچ سو سال پہلے ایک مسلم نواب نے بسایا تھا۔ قدیم دور کی تاریخی عمارتیں اب بھی یہاں موجود ہیں۔ آبادی چالیس ہزار سے کچھ اوپر ہے جس میں تقریباً نصف مسلمان ہیں۔ مسلم اور غیر مسلم بستیاں بڑی حد تک الگ الگ واقع ہیں۔ دونوں فرقوں کے درمیان اچھے تعلقات ہیں۔ یہ علاقہ قائم خانی پٹھانوں کا علاقہ ہے جو فوجی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ روایتی جنگ کے زمانہ میں وہ اپنی بہادری کے لئے مشہور تھے۔ مگر موجودہ زمانہ میں عضلاتی طاقت کے بجائے علم نے اہمیت حاصل کرلی ہے۔ بدلتے ہوئے زمانہ کے لحاظ سے وہ اپنے آپ کو تیار نہ کرسکے۔ جو دستی طاقت ماضی کے حالات میں ان کو سرداری کے مقام پر پہنچاتی تھی، آج کے حالات میں وہ دستی طاقت صرف مزدوری کے میدان میں اپنا استعمال پارہی ہے۔ تعلیم میں پیچھے ہونا زمانہ سے پیچھے ہونے کے ہم معنی بن گیا۔

۱۰ فروری کو میں صبح سویرے جھنجھنوں پہنچا تو فجر کا وقت ہوچکا تھا۔ مسجد کے امام ایک اچھے قاری تھے۔ انھوں نے نماز میں سورہ فتح پڑھی۔ جب انھوں نے پُرشکوہ لہجہ میں پڑھا: انا فتحنا لک فتحا مبینا ـ ـ ـ ـ ـ تو اچانک اس کو سن کر ایسا محسوس ہوا جیسے اس سورہ کے الفاظ میں خدا مجھ سے کلام کررہا ہے۔ پچھلے مہینہ سے کچھ لوگوں نے راقم الحروف کے خلاف حمیت جاہلیہ (فتح ۲۶) کا مظاہرہ کررکھا ہے، اس کا دل پر بے حد اثر تھا۔ قاری صاحب کی زبان سے سورہ فتح کی آیتیں سن کر بے اختیار دل بھر آیا اور یہ دعا نکلی "خدایا! اپنے الفاظ کو تو اس عاجز بندے کے حق میں سچا کردے"

نماز کے بعد مجھے ایک صاحب کے مکان میں منتقل کردیا گیا۔ دن کا بیشتر حصہ اسی مکان میں گزرا۔ لوگ ملاقات کے لئے آتے رہے اور دینی موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ شام کو کچھ ساتھی مجھ کو درگاہ قمرالدین شاہ کی طرف لے گئے یہ درگاہ شہر کے کنارے ایک پہاڑی کے دامن میں ہے اور وسیع رقبہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ درگاہ کی چھت پر ہم کھڑے ہوئے تو پورا شہر ایک نظر میں دکھائی دے رہا تھا۔ سرسبز درختوں کے جھنڈ میں ڈوبے ہوئے مکانات بہت خوش منظر معلوم ہورہے تھے۔ جب ہم مکان کے اندر تھے تو جھنجھنوں بظاہر ایک "مکان" کا نام تھا۔ مگر جب ہم اس سے باہر نکل آئے تو جھنجھنوں ایک وسیع حقیقت کی صورت میں نظر آنے لگا۔ آدمی اپنے خول میں ہو تو زندگی ایک سمٹی ہوئی چیز معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اگر وہ اپنا خول توڑ کر باہر آجائے تو زندگی ایک آفاقی حقیقت بن جاتی ہے۔

ایک صاحب نے یہاں کا ایک پرانا لطیفہ بتایا جو پوری ملت پر صادق آتا ہے۔ جاہل مسلمانوں میں یہ عقیدہ ہے کہ کوئی مرجائے تو ملا (قاضی) کو بلاکر میلاد پڑھوا دو۔ اس کے بعد مردہ پر دوزخ کی آگ حرام ہوجاتی ہے اور وہ جنت

مکہ میں جب خدا کے دشمنوں نے خدا کے رسولؐ کو گھر سے بے گھر کرنے کا منصوبہ بنایا تو خدا نے اپنے رسول کے لئے دوسرا زیادہ بڑا دروازہ کھول دیا، اس نے مدینہ کو اسلامی دعوت کا مرکز بنا دیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص سنت ہے۔ وہ ایک کو حق کا راستہ روکنے کا مجرم ثابت کرکے دوسرے کو حق کا استقبال کرنے کا اعزاز دیتا ہے۔ وہ ایک کو ڈسکریڈٹ کرکے دوسرے کو کریڈٹ عطا فرماتا ہے۔ (۶ فروری ۱۹۷۹)

میں چلا جاتا ہے۔ ایک کسان کھیتوں پر کام کرکے دوپہر کو اپنے گھر آیا۔ اس کو بھوک لگ رہی تھی۔ وہ خود نماز نہیں پڑھتا تھا مگر عورت نماز پڑھتی تھی۔ وہ گھر ایسے وقت میں پہنچا کہ عورت ظہر کی نماز شروع کر چکی تھی۔ کسان کو انتظار سخت معلوم ہوا۔ اس نے کہا یہ کیا مصیبت ہے کہ مجھ کو بھوک لگ رہی ہے اور تمھاری نماز ختم نہیں ہوتی۔ عورت نے نماز کے بعد کہا: آپ نماز نہیں پڑھتے اور نماز کو برا بھی کہتے ہیں۔ آپ کو جنت کیسے ملے گی۔ آدمی نے اپنی مارواڑی زبان میں کہا کہ جنت ملنا کیا مشکل ہے:

"دیا کا جیٹرے نے ایک روپیہ اور ٹھے جنت کے ماں"

یعنے قاضی کو ایک روپیہ دو اور فوراً جنت کے اندر پہنچ جاؤ۔ (پہلے میلاد پڑھنے والے ملا یا قاضی کو صرف ایک روپیہ دینا کافی ہوتا تھا) موجودہ زمانہ میں ہر ایک نے اسی طرح سستے داموں اپنی جنت حاصل کر رکھی ہے۔ آج نہ کسی کو اپنے نفس کو دبانے کی ضرورت ہے نہ اپنے مصالح کو قربان کرنے کی۔ نہ کسی کو اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں میں اپنے کو باندھنے کی ضرورت ہے نہ جہنم کے اندیشے سے پگھلنے کی۔ نہ کسی کو خوف خدا میں آنسو بہانے کی ضرورت ہے اور نہ حق وانصاف کے آگے اپنا سر جھکانے کی۔ نہ خدا کے دین کو سمجھنے کے لئے کسی جدوجہد کی ضرورت ہے اور نہ اللہ کی راہ میں اپنا مال دینے کی۔ ہر ایک کے لئے بس اتنا کافی ہے کہ "ایک روپیہ" خرچ کرکے اپنی پسندیدہ "میلاد" کا تماشا دکھلائے اور اس کے بعد بے کھٹکے جنت میں پہنچ جائے۔ "میلاد" کی صورتیں الگ الگ ہیں۔ مگر یہ بات سب میں مشترک ہے کہ ہر ایک کسی نہ کسی سستی کارروائی کو جنت کا محفوظ ٹکٹ سمجھے ہوئے ہے۔ ہرے بھرے درخت پر ایک پھول اگانے کے لئے کائناتی منصوبہ بندی درکار ہوتی ہے۔ زمین وآسمان میں بے شمار قسم کی انتہائی بامعنی سرگرمیاں جاری ہوتی ہیں تب درخت کی شاخ پر ایک حسین پھول وجود میں آتا ہے۔ مگر جنت جو ایک پھول سے کھرب ہا کھرب گنا زیادہ حسین ہے، اس کے متعلق لوگوں نے سمجھ لیا ہے کہ وہ سطحی تماشوں سے حاصل ہو جائے گی۔

۱۱ فروری کو ہم پلانی دیکھنے گئے۔ پلانی ایک معمولی گاؤں تھا جو مشہور صنعت کار برلا کا آبائی وطن ہے۔ برلا نے اس کو جدید طرز پر ترقی دی اور اس کو ایک خوبصورت شہر بنا دیا۔ یہاں ترقی یافتہ فارم ہیں جن کی فواروں سے آب پاشی کی جاتی ہے۔ سائنسی تعلیم اور ٹکنکل تربیت کے ادارے ہیں۔ ایک بہت بڑا میوزیم ہے جہاں عملی نمونوں کے ذریعے دکھایا گیا ہے کہ قدرت کی طاقتوں کو استعمال کرکے آج کے انسان نے کس طرح ترقیات حاصل کیں۔ پہیہ کی دریافت سے لے کر جہاز سازی اور خلائی راکٹ تک ہر چیز اس کے اندر نہایت سلیقہ کے ساتھ سجائی گئی ہے۔ اس میوزیم کو ترتیب دینے والے ایک مسلمان تھے۔ انھیں کی نگرانی میں پورا کام ہوا ہے۔ کوئی شخص اپنی کمائی کو تعمیری سرگرمیوں میں کس طرح لگائے، پلانی اس کا ایک اچھا نمونہ پیش کرتا ہے۔

میوزیم میں عجائب قدرت کے نمونے دیکھ کر نکلے تو ظہر کا وقت ہو گیا تھا۔ ایک پارک میں نماز ادا کی گئی۔ نماز کے بعد کچھ وقت پارک میں گزرا۔ کھلی فضا، خالص ہوا، سنہری دھوپ، پھولوں کی قطاریں، درختوں کے مناظر، ان چیزوں نے دل کو عجیب کیفیت کر دی۔ میں نے سوچا: وہ خدا جو کائنات کی سطح پر انتہائی معنویت کا اہتمام کر رہا ہے، وہ انسانی سطح پر کیا بے معنی کارروائیوں پر راضی ہو گیا ہے۔ آسمان کی وسعت، سورج کی روشنی، ہوا کے جھونکے، پھولوں

کی نزاکت، درختوں کی سرسبزی، اپنے خالق کا تعارف ایک ایسی ہستی کی حیثیت سے کر رہی ہیں جو ناقابلِ قیاس حد تک جمال و کمال کا مجموعہ ہے۔ تتلیوں کے حسین پروں سے لے کر پھولوں کی نازک پنکھڑیوں تک، زمین کے سبزہ سے لے کر آسمان کے جگمگاتے ہوئے ستاروں تک ہر چیز کہہ رہی ہے کہ جس نے اس کو بنایا ہے وہ بے حد لطیف ذوق کا مالک ہے مگر کیسی عجیب بات ہے کہ اسی خدا کی طرف ہم نے ایک ایسے مذہب کو منسوب کر رکھا ہے جس میں حسن اور لطافت جیسی کوئی چیز نہیں۔ وہ، مذکورہ لطیفہ کے مطابق، بس یہ ہے کہ:

دیا کا جیڑے نے ایک روپیہ اور ملے جنت کے ماں:

ائفکاً آلھۃ دون اللہ تریدون۔ فما ظنکم برب العالمین (صافات) کیا جھوٹ موٹ کے معبودوں کو اللہ کے سوا چاہتے ہو۔ آخر کیا خیال کر رکھا ہے تم نے رب العالمین کے بارہ میں۔

کائنات کی سطح پر خدا ایک حسین اور لطیف ہستی کے روپ میں دکھائی دیتا ہے۔ وہ اعلیٰ ترین واقعات کو اعلیٰ ترین اہتمام کے ساتھ وجود میں لاتا ہے۔ مگر انسان کی سطح پر خدا جو کچھ چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم کچھ بے روح رسموں کو دہرائیں اور وہ زندہ جنتوں کے دروازے ہمارے لئے کھول دے۔ ہم کچھ رٹے ہوئے الفاظ کی تکرار کریں اور وہ معنویت کے خزانے ہمیں بخش دے۔ ہم مناظروں اور لفظی موشگافیوں میں مشغول ہوں اور وہ ہم کو ربانی عالم ہونے کا لقب عطا کرے۔ ہم توڑ پھوڑ کی سیاست چلائیں اور وہ ہم کو نظام صالح قائم کرنے کا کریڈٹ دے۔ ہم جلسوں اور تقریروں کے تماشے دکھائیں اور وہ ہمارے لئے عملی اور تعمیری جدوجہد کا سرٹیفکٹ جاری کرے۔ ہم عوام کی جذبات کا استحصال کر کے لیڈری کا کاروبار کریں اور وہ اپنے یہاں ہمارا نام مخلص خادموں کی فہرست میں لکھ لے۔ ہم نذرانے اور استقبال کی خاطر دوڑے کریں اور وہ اپنے فرشتوں سے کہے کہ دیکھو یہ میرا محبوب بندہ ہے جس نے میری راہ میں اپنے قدموں کو گرد آلود کیا۔

۱۱ فروری کو جب کہ ہم پلانی کا سائنسی شہر دیکھ رہے تھے، کیمپس کی ایک سڑک پر میری ملاقات ایک رکشہ والے سے ہوئی۔ یہ سترہ سال کا ایک نوجوان تھا۔ اس کے چہرے پر شرافت کے آثار دیکھ کر مجھے دلچسپی ہوئی "تمہارا نام کیا ہے" میں نے پوچھا "ممتاز خاں" تھکے ہوئے عزم کے ساتھ اس نے جواب دیا۔

Mumtaz Khan
C/O Metro Tailors
Nutan Market
Pilani 33313 (Rajasthan)

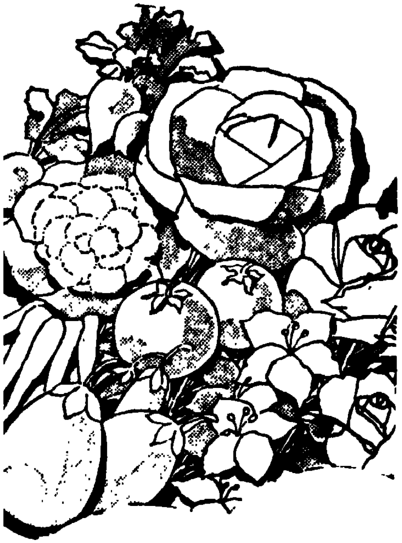
اس نے بتایا کہ اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ گھر کے حالات نے مجبور کر دیا کہ وہ رکشا چلا کر اپنی روزی حاصل کرے۔ اس کو تعلیم کا شوق ہے مگر تعلیم کی قیمت ادا کرنے کے لئے وہ پیسہ کہاں سے لائے۔ پلانی جہاں دوسرے نوجوان اپنا تعلیمی سفر کامیابی کے ساتھ طے کر رہے ہیں، وہ وہاں کی سڑکوں پر رکشا کھینچ کر اپنی زندگی کے دن پورے کر رہا ہے۔ مجھ کو وہ اونچا مینار یاد آیا جو میں نے پچھلے روز دیکھا تھا۔ مجھ کو بتایا گیا کہ اس منقش مینار پر اب تک ایک لاکھ روپے خرچ ہو چکے ہیں اور اس کی تعمیر کا کام ابھی جاری ہے۔ میں نے سوچا: اینٹ پتھر کے میناروں کو بلند کرنے کے لئے اتنا جوش دکھایا جا رہا ہے اور انسانی میناروں کو بلند کرنے سے کسی کو دلچسپی نہیں۔ اور یہ اس رسول کے امتی کر رہے ہیں جس نے فرمایا تھا: ما امرت بتشیید المساجد (مجھے

مساجد کی عمارتیں بلند کرنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے) قوم کے اندر اس قسم کے کتنے نوجوان ہیں جو قدرت سے بہترین صلاحیت لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ مگر حالات ان کی صلاحیتوں کو ابھرنے نہیں دیتے۔ اور جو لوگ اس پوزیشن میں ہیں کہ ان کی مدد کرکے ان کو اٹھائیں، ان کے پاس اپنی دولت کا مصرف نمائشی کاموں کے سوا اور کچھ نہیں۔

۱۰ فروری کی شام کو سیرت کے موضوع پر ایک تقریر ہوئی۔ اور مسجد میں دو دن نماز فجر کے بعد قرآن کا درس ہوا۔
۱۱ فروری کی شام کو میں دہلی واپس آگیا۔

ایک بار مجھے راجستھان کی ایک اور بستی میں جانے کا اتفاق ہوا۔ یہاں سڑک کے کنارے ایک مسجد تھی۔ مسجد کافی کشادہ اور پختہ بنی ہوئی تھی۔ مگر عرصہ سے ویران پڑی ہوئی تھی۔ مسجد کے اندرونی حصہ میں ابابیلوں کا قبضہ تھا اور صحن کا یہ حال تھا کہ جگہ جگہ بے ترتیب مٹی کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے۔ ہمارے ساتھیوں نے بستی والوں کو کہہ سن کر تیار کیا کہ مسجد کو آباد کریں اور وہاں ایک مکتب شروع کریں۔ ایک نوجوان کو تیار کیا گیا کہ وہ امام اور مدرس کی حیثیت سے اس مسجد میں قیام کریں اور اس طرح بستی کی اصلاح کا کام شروع ہو۔

"مسجد کا حال آپ دیکھ رہے ہیں" نوجوان نے کہا "یہ تو کوڑا خانہ ہو رہی ہے۔ یہاں بھلا کون سا کام کیا جا سکتا ہے"۔ میں نے کہا کہ آپ یہ نہ دیکھیے کہ اس وقت مسجد کا نقشہ کیا ہے۔ بلکہ یہ دیکھیے کہ مستقبل میں آپ اس کو کیا بنا سکتے ہیں۔ مسجد کی یہ حالت آپ کو کام کرنے کا زبردست موقع دے رہی ہے۔ آپ یہ کیجئے کہ مسجد کی صفائی کیجئے، اس کی سفیدی کرائیے۔ اس کے صحن کو درست کرکے یہاں درخت اور پھول لگائیے۔ یہ گویا بستی والوں کے سامنے آپ کا عملی تعارف ہوگا



اس طرح آپ ان کو بتائیں گے کہ آپ وہ شخص ہیں جو کوڑا خانہ کو گلزار بناتے ہیں۔ وہ بستی جو آج آپ کا استقبال کوڑا خانہ کے ساتھ کر رہی ہے، وہ آپ کو اپنے محبوب کی حیثیت سے قبول کرے گی۔ اس کے بعد میں اور میرے تمام ساتھی مسجد کی صفائی میں لگ گئے۔ چند گھنٹے میں مسجد صاف ستھری ہو گئی

مسجد اور مدرسہ کے لوگ عام طور پر چندے اور نذرانے کے طریقوں سے واقف ہیں۔ وہ خدا کی زمین کو گل و گلزار بنا کر اس سے خدا کی نعمتوں کی فصل کاٹنا نہیں جانتے۔ ہر مسجد اور ہر مدرسہ میں یہ موقع ہے کہ اس کی زمین کو صاف ستھرا کیا جائے۔ وہاں کیاریاں بنائی جائیں۔ اس میں درخت اور سبزیاں اور پھول بوئے جائیں۔ اس میں بیک وقت کئی فائدے ہیں۔ یہ ایک صحت بخش مشغلہ ہے۔ اس سے کم از کم جزئی طور پر معاش حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہ اللہ کے رزق کو خود اللہ سے مانگنا ہے۔ وغیرہ

کوئی سننے والا ہے جو سنے؟

دفتر کے صحن میں دوڑنے کی آواز نے مجھے چونکا دیا، دیکھا تو ہاکر ہاتھ میں اخبار لئے بھاگا چلا آرہا ہے۔ یہ اس کا روزانہ کا معمول ہے۔ صبح کا اخبار اول ترین وقت میں تمام خریداروں کے پاس پہنچانے کا اس کو اتنا خیال ہے کہ وہ دوڑتا ہوا چلتا ہے۔ اور اگر اخبار لینے کے بعد اس سے کوئی سوال کیا جائے تو وہ ٹھہر کر اس کا جواب نہیں دے گا بلکہ واپس بھاگتے ہوئے کہتا چلا جائے گا۔ وہ دوڑ رہا ہے تاکہ وہ بھاگتے ہوئے وقت کو پکڑ لے، تاکہ وہ وقت کے پیچھے نہ رہ جائے۔

یہ دنیا کے لئے انسان کی دوڑ دھوپ کی ایک مثال ہے جس کو آپ اپنے قریب ترین دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں اگر آپ کا حال یہ ہو کہ آپ صبح کی چائے "میں طویل وقت صرف کرنے کے بعد اپنے ساتھیوں کے درمیان بے تکلف باتیں کرتے ہوئے نہایت اطمینان کے ساتھ اخبار کی آمد کا انتظار کر رہے ہوں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ آخرت کے اقرار میں اتنے سنجیدہ بھی نہیں ہیں جتنا وہ شخص اپنے پیشے میں سنجیدہ ہے جس کا آپ انتظار کر رہے ہیں۔ آپ مسلمان ہیں، آپ اسلام کے داعی ہیں، لیکن اگر صورت حال یہ ہو تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کا مسلمان ہونا آپ کی حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ آپ کی اسلامی دعوت محض اس سے ایک روایتی وابستگی کا نتیجہ ہے یا زیادہ سے زیادہ وہ ایک ذہنی موضوع ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ آخرت کے لئے اس سے زیادہ بیتاب ہوتے جتنا ایک دنیا پرست دنیوی فائدوں کے لئے بے تاب ہوتا ہے۔ آخرت کی طلب میں آپ اس سے زیادہ تیز دوڑنے کی کوشش کرتے جتنا کوئی شخص اپنی ملازمت اور کاروبار کے لئے دوڑتا ہے، اپنے وقت اور اپنی صلاحیتوں کے استعمال میں آپ اس سے زیادہ مستعد ہوتے جتنا کہ ایک اخبار بیچنے والا اپنے کام میں نظر آتا ہے۔

اسلام آدمی کو زندگی کی سب سے بڑی کامیابی کے لئے بلاتا ہے۔ جس کے دل میں یہ بات اتر گئی ہو کیسے ممکن ہے کہ وہ شخص غیر متعلق کام میں یا کمتر درجے کے مقاصد میں اپنا وقت ضائع کرے۔ اسلام ہم کو موجودہ زندگی کی غفلتوں کے بدلے بے پناہ عذاب سے ڈراتا ہے۔ جو شخص فی الواقع اس خبر پر ایمان لایا ہو کیسے ممکن ہے کہ آپ اس کو بے فکری کے ساتھ قہقہہ لگاتا ہوا پائیں۔ اسلام کہتا ہے کہ تمہارے اوپر ایک عظیم خدا ہے جو ہر وقت تمہیں دیکھ رہا ہے۔ جو شخص اس حقیقت کو جانتا ہو۔ کیسے ممکن ہے کہ وہ ایک لمحے کے لئے بھی ایسے مشاغل میں مصروف ہونا پسند کرے جس کی خدائے ذوالجلال کے نزدیک کوئی قیمت نہ ہو، اسلام کہتا ہے کہ تمہاری زندگی بالکل غیر یقینی ہے، کسی بھی وقت موت کے فرشتے تمہاری گرفتاری کے لئے پہنچ سکتے ہیں۔ جو شخص حقیقی معنوں میں اس انتہائی نازک صورت حال کا احساس رکھتا ہو، کیسے ممکن ہے کہ وہ روزانہ اپنے اوقات کا ایک حصہ ایسے مشاغل میں صرف کرتا رہے جس کا طلب آخرت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جو شخص خدا سے ڈرتا ہو اس کے لئے ممکن نہیں ہے کہ ایک کام کو مہینوں اور سالوں کرتا رہے اور اس کو احساس نہ ہو کہ وہ ایک غلطی کو دہرا رہا ہے۔

"کیا یہی وہ تصویریں ہیں جو خدا اور آخرت پر ایمان لانے کے بعد بنتی ہیں" یہ فقرہ اکثر ایک دردناک آہ کے ساتھ میری زبان سے اس وقت نکل جاتا ہے جب میں اپنے گرد و پیش کے لوگوں کو دیکھتا ہوں۔ انسان کے لئے اس کے معاشی مفادات

اُخروی تقاضوں سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ خدا کی مرضی کے لئے سرگرم ہونے سے زیادہ اس کو یہ بات محبوب ہے کہ وہ اپنے ذوق کی تسکین اور اپنی عادتوں کی تکمیل میں لگا رہے۔ وہ اپنی زندگی کے مقررہ نقشہ کو نہیں بدل سکتا، خواہ اس کی وجہ سے اس کی عبادتیں ناقص ہو جائیں، خواہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو ٹھیک ٹھیک انجام نہ دے سکے، خواہ اس کو بالآخر اپنی بے حسی اور ناکردگی کو چھپانے کے لئے جھوٹے عذرات کا سہارا لینا پڑے۔

یہ شکایت مجھے صرف ان لوگوں سے نہیں ہے جو ملحدانہ ماحول میں پرورش پاکر نکلے ہیں۔ وہ لوگ جو "دیندار" کہے جاتے ہیں۔ جن کی طرف اسلامی مسائل معلوم کرنے کے لئے رجوع کیا جاتا ہے۔ ان کا حال بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے چند دن پہلے میں ایک راستے سے گزر رہا تھا کہ ایک پر جوش آواز میرے کان میں آئی — "ہر آدمی کی زبردست خواہش ہوتی ہے کہ اپنی اولاد کو پھلتا پھولتا دیکھے اس سے دل کو بڑی تسکین ہوتی ہے" دیکھا تو ایک بزرگ ایک دکان میں بیٹھے تقریر کر رہے تھے۔ چہرے پر داڑھی ان کے دین دار ہونے کی علامت تھی اور زبان اور وضع قطع بتا رہی تھی کہ یقیناً کوئی عالم ہوں گے۔ میں نہیں کہتا کہ یہ کوئی ناجائز خواہش ہے۔ مگر جب میں دیکھتا ہوں کہ مسلمانوں کے اندر یہ تمنا تو بہت زیادہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کو پھلتا پھولتا دیکھیں مگر اسلام کو پھلتا پھولتا دیکھنے کی تڑپ ان میں باقی نہیں ہے، تو یہ جائز خواہش بھی مجھے ایک جرم معلوم ہونے لگتی ہے۔ ایک بزرگ کو میں نے ایک مرتبہ دیکھا کہ وہ ایک نوجوان کو اس بات پر تنبیہ کر رہے تھے کہ وہ نماز کے بعد دعا کے لئے نہیں ٹھہرتا بلکہ سلام پھیرنے کے بعد فوراً اٹھ کر چلا جاتا ہے۔ بے شک یہ نوجوان کی غلطی تھی۔ مگر میں جانتا ہوں کہ خود ان بزرگ کا یہ حال ہے کہ صبح کی اور دوپہر کی نیند اکثر انھیں فجر اور ظہر کی نمازوں میں وقت پر مسجد پہنچنے نہیں دیتی۔ شام کی گفتگو میں وہ کبھی کبھی اتنا مصروف ہوتے ہیں کہ مسجد اس وقت پہنچتے ہیں جب امام ایک رکعت پوری کر چکا ہوتا ہے۔ آپ کو ایسے کتنے "عالم دین" ملیں گے جن کے سامنے اگر ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر کا ترجمہ "تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہئے جو لوگوں کو خیر کی طرف بلائے" —— کر دیا جائے تو وہ اس پر دو گھنٹے بحث کریں گے کہ یہاں مِنْ "تبعیضیہ" نہیں بلکہ "بیانیہ" ہے۔ یعنی آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ "تم کو ایسا گروہ بننا چاہئے جو لوگوں کو خیر کی طرف بلائے"۔ (نہ یہ کہ تم میں سے ــ ــ ــ) مگر ان حضرات کے ساتھ آپ مہینوں اور سالوں زندگی گزاریں، آپ یہ نہ دیکھیں گے کہ ان کے اندر فی الواقع دعوت الی الخیر کی کوئی واقعی تڑپ پائی جاتی ہے۔ وہ آیت میں عموم ثابت کرنے کے لئے قابلیت صرف کریں گے۔ مگر اس عموم کو اپنی ذات تک پہنچانے کی ضرورت نہیں سمجھیں گے۔ صلوٰۃ وُسطیٰ کا ترجمہ اگر "بیچ کی نماز" یا "عصر کی نماز" کر دیجئے تو وہ آپ کے اوپر جہالت کا فتویٰ صادر کر دیں گے۔ وہ اصرار کریں گے کہ قرآن میں جو صلوٰۃ وسطیٰ کا لفظ آیا ہے اس سے مراد "بہترین نماز" ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس سے مراد کوئی ایک نماز نہیں بلکہ ساری نمازیں ہیں۔ مگر ان کی اپنی نمازوں کو دیکھئے تو آپ یہ نہ پائیں گے کہ وہ اپنی نماز کو "بہتر" بنانے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ دوسروں پر تبلیغ کرتے ہوئے وہ نہایت جوش کے ساتھ اس واقعہ کو بیان کریں گے کہ:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کو لے کر غزوۂ بدر کے لئے نکلے، دوسری طرف مشرکین کا لشکر تھا۔ آپ نے فرمایا،

بڑھو ایک ایسی جنت کی طرف جس کی وسعت زمین و آسمان کے برابر ہے۔ ایک انصاری عمیر بن حمام نے یہ سنا تو ان کی زبان سے بخ بخ کے الفاظ نکل گئے یعنی خوب! آپ نے فرمایا، تم نے بخ بخ کیوں کہا۔ انھوں نے جواب دیا۔ خدا کی قسم صرف اس لئے کہ شاید میں بھی ان لوگوں میں سے ہوں۔ آپ نے فرمایا۔ ہاں تم انھیں میں سے ہو۔ یہ سن کر انھوں نے اپنے برتن میں سے کچھ کھجوریں نکالیں اور ان سے کھانے لگے۔ پھر بولے ان کھجوروں کو کھانے کے لئے میں کب تک زندہ رہوں گا۔ اِنَّهَا لَحَيٰوةٌ طَوِيْلَةٌ "یہ تو بڑی لمبی زندگی ہے۔ یہ کہہ کر انھوں نے بقیہ کھجوریں ایک طرف ڈال دیں اور جنگ میں کود پڑے اور لڑ کر شہید ہو گئے" (مسلم)

مگر خود ان مبلغین کا کیا حال ہے۔ مذکورہ صحابی نے تو خدا تک پہنچنے کے شوق میں اپنی وافی خوراک پھینک دی تھی مگر یہ حضرات اپنے ذوق اور اپنی عادتوں کو بھی خدا کی خاطر پھینکنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ بدر کے میدان میں اسلام اور کفر کا جو معرکہ ہوا تھا وہ آج ہر گلی اور ہر سڑک پر پوری شدت کے ساتھ جاری ہے مگر ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ وقت کے اس غزوے میں شرکت کے لئے اپنے موجودہ مفاد کو ترک کرنا تو درکنار، مستقبل کی تمناؤں اور اپنی آنے والی پشتوں کے مفاد کو بھی، خدا کے دین کے لئے خطرے میں ڈالنا وہ گوارا نہیں کر سکتے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ اسلام کے دعوے کے ساتھ اتنے بڑے تضاد کو لوگ کس طرح اپنے اندر جمع کئے ہوئے ہیں۔ ہر بار مجھے یہی جواب ملا کہ دراصل "تاویل" کے فتنے نے لوگوں کو اس تضاد میں مبتلا کر رکھا ہے۔ ہر آدمی نے اپنے طرزِ عمل کو صحیح ثابت کرنے کے لئے کچھ خوب صورت جوابات تراش رکھے ہیں اور ضرورت کے وقت وہ فوراً انھیں پیش کر دیتا ہے۔ ایک مسلمان ڈاکٹر کو میں نے ایک بار دعوتِ دین کی جدوجہد میں حصہ لینے کی ترغیب دلائی۔ انھوں نے فوراً اپنے پیشے کی اہمیت پر تقریر شروع کر دی۔ ان کے نزدیک ان کا پیشہ خدمتِ خلق کا ایک زبردست کام ہے جس کو وہ رات دن کی محنت سے انجام دے رہے ہیں۔ انھوں نے بعض سنگین مریضوں کا ذکر کیا جو ان کے زیرِ علاج تھے۔ انھوں نے کہا "بتائیے میں انھیں چھوڑ کر کیسے کہیں جا سکتا ہوں۔ میرا ایسا اقدام انسانیت دوستی ہوگی یا انسانیت دشمنی" بظاہر یہ بہت معقول جواب ہے۔ لیکن اگر میں آپ کو یاد دلاؤں کہ اکثر ڈاکٹروں کی "انسانیت دوستی" ہمیشہ ان مریضوں کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے جو اس کے زیرِ علاج ہوں اور ان میں بھی سب سے زیادہ اس کی توجہ کے مستحق وہ مریض ہوتے ہیں جو زیادہ (Paying) ہوں تو آپ سمجھ جائیں گے کہ اس خدمتِ خلق کی حقیقت کیا ہے۔

اسی طرح ہر شخص کے پاس اپنے طرزِ عمل کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ایک جواب موجود ہے۔ کوئی لوگوں کی ناکردگی کو اس بات کے لئے کافی سمجھے ہوئے ہے کہ وہ خود بھی کوئی کام نہ کرے، کوئی دوسروں کے غلط خیالات کو اپنے لئے رکاوٹ سمجھتا ہے، کوئی دقتوں اور پابندیوں کی ایک فہرست لئے بیٹھا ہے، کسی کو ایک ایسا فقہی اور قانونی پیمانہ مل گیا ہے جس سے ناپنے میں اس کا جامہ بالکل درست اترتا ہے، کسی نے احادیث کے ذخیرے میں سے اپنے مناسب حال چند موزوں حدیثوں کو چھانٹ لیا ہے جو اس کے طرزِ عمل کو صحیح ترین ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اسی طرح ہر شخص کے پاس اپنے غیر اسلامی رویے کی ایک اسلامی توجیہہ اور اپنی آخرت فراموش زندگی کی ایک خالص دینی تاویل موجود ہے۔ اور اگر آپ ان تاویلات کی حقیقت کھول دیں تو موجودہ

دور میں شیطان نے چند ایسے الفاظ مہیا کر دئے ہیں جن کے ذریعہ کسی بھی صحیح ترین تنقید کو نہایت آسانی سے رد کیا جاسکتا ہے ـــــ "یہ شدت پسندی ہے"۔ "یہ تمہارا انتہا پسندانہ ذوق ہے"۔ "تم یک رُخے انداز میں سوچتے ہو"۔ "تم اعتدال کے راستے سے ہٹ گئے ہو" وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ آپ کے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہیں ہوگا۔ کیوں کہ خدا کے رسول پہلے ہی اعلان فرما چکے ہیں کہ اَلدِّینُ یُسْرٌ!

مگر یاد رکھئے آج آپ ایک ناصح کو ان جوابات سے خاموش کر سکتے ہیں۔ مگر خدا کے یہاں اس قسم کے جوابات ہرگز کافی نہ ہوں گے۔ وہاں تو آپ کی پوری زندگی کا بخیہ ادھیڑ کر رکھ دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ تم خود دیکھ لو کہ دنیا کی زندگی میں تم جن مشاغل میں مصروف تھے ان کے پیچھے کیا کیا محرکات کام کر رہے تھے۔

میرے ایک ساتھی نے ایک مرتبہ بہت عمدہ بات کہی ـــــ "آخرت میں خدا کا انعام اسی کو ملے گا جس نے دنیا میں خدا کے انعام کو پالیا ہو"۔ اس بات پر غور کیجئے تو اس میں نصیحت کے بہت سے پہلو چھپے ہوئے ہیں۔ آپ اپنے کو مسلمان کہتے ہیں، آپ دین حق کے علم بردار ہیں، یہ دراصل اس بات کا اعلان ہے کہ آپ خدا کی جنت کے امیدوار ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ انعام "جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا" وہ محض دعووں اور خوش گمانیوں کے ذریعہ تو کسی کو نہیں مل سکتا۔ یہ انعام صرف اس کے لئے ہے جس نے دنیا میں اپنی آخرت طلبی کو نمایاں طور پر ثابت کر دیا ہو، جس نے اپنے مسلسل رویّے سے یہ دکھا دیا ہو کہ دوسرے انسانوں کے مقابلے میں وہ اس کے پانے کا استحقاق رکھتا ہے۔ جب دوسرے لوگ دنیا کی لذتوں میں کھوئے ہوئے تھے تو وہ خدا کے انعام کے تصور میں اتنا محو ہوا کہ اسے دنیا کی لذتیں بھول گئیں۔ جب دوسرے لوگ اپنے ذوق کو تسکین دینے میں مصروف تھے تو وہ خدا کی رضا حاصل کرنے کے لئے تڑپ رہا تھا، جب دوسرے لوگ سوتے تھے تو وہ جاگتا تھا، جب دوسرے آرام کرتے تھے تو وہ تکلیف اٹھاتا تھا، جب دوسرے لوگ ہنسی اور تفریح میں دل بہلا رہے تھے تو وہ آنسو بہا رہا ہوتا تھا۔ مختصر یہ کہ جب دوسرے لوگ دنیا کی زندگی میں اپنے آپ کو گم کئے ہوئے تھے تو وہ آخرت کی زندگی کے لئے اپنا ایک ایک لمحہ صرف کر رہا تھا۔

جنت کا مستحق ہونا دوسرے لفظوں میں آخرت میں کسی کا ممتاز مقام حاصل کرنا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ دنیا میں صرف وہی شخص کسی ممتاز مقام کو پاتا ہے جس نے اس کے لئے بے پناہ جدوجہد کی ہو۔ ٹھیک اسی طرح آخرت کے درجاتِ عالیہ بھی وہی لوگ پائیں گے جنھوں نے اپنے آپ کو اس کے لئے کھپا دیا ہو۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ اپنی سطحی زندگی کے نتیجہ میں وہ آخرت کے انعامات کو حاصل کرے گا تو یہ محض خوش فہمی ہے۔ ٹھیک ویسی ہی خوش فہمی جیسے کوئی شخص سمجھ لے کہ وہ بستر پر لیٹے لیٹے وہ مقام حاصل کر سکتا ہے جب کہ دنیا اسے "فاتح ایورسٹ" کے نام سے پکارے اور اس کو وہ اعزازات نصیب ہوں جو ہیلری اور تین زنگ کو لمبی جدوجہد کے بعد حاصل ہوئے۔

۱۶۴۲ء میں انگلینڈ کے دیہات میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ پیدائش کے وقت وہ اتنا کمزور تھا کہ دائیوں نے اس کی زندگی کی طرف سے مایوسی ظاہر کی۔ اس کا کمزور سر حفاظت کی خاطر چمڑے کی پٹی سے لپیٹ دیا گیا۔ اس کے بعد جب وہ بڑا ہو کر ہائی اسکول پہنچا تو وہ اپنے ساتھیوں میں سب سے پیچھے تھا۔ مگر یہی کمزور لڑکا جب پچاسی سال کی عمر میں مرا تو وہ نیوٹن کے

پُرعظمت نام سے مشہور ہو چکا تھا۔ نہ صرف انگلینڈ میں اس کو بلند ترین اعزازات حاصل ہوئے بلکہ ساری دنیا میں اپنی ذہنی عظمت کا اس نے ایسا سکہ بٹھایا کہ اس کے مرنے کے سو سال بعد جب دوربینی مطالعہ میں سائنس دانوں نے دیکھا کہ سیارہ یورینس نیوٹن کے قانون تجاذب کے بتائے ہوئے راستے سے کچھ ہٹا ہوا ہے تو انھوں نے نیوٹن کے اصول کی غلطی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ یہاں کوئی اور سیارہ ہونا چاہئے جس کی کشش سے اس کی رفتار میں یہ فرق پیدا ہوا ہے۔

نیوٹن کو یہ عظمت کیوں کر حاصل ہوئی اس کا جواب خود اس کی زبان سے سنئے۔ ایک مرتبہ اس کے کارناموں کی تعریف کی گئی تو اس نے کہا:

"I had no special sagacity -------
only the power of patient thought".

یعنی میرے اندر کوئی خصوصی قابلیت نہیں ہے۔ مجھے جو کچھ علاوہ صرف اس وجہ سے ملا کہ میں نے کائنات کو سمجھنے کے لئے انتھک جدوجہد سے کام لیا ہے۔ اپنی مشہور کتاب (Principia) کی تیاری کے دوران میں اٹھارہ مہینے تک اس کا یہ حال تھا کہ وہ گھنٹوں بے حس و حرکت پڑا سوچتا رہتا۔ اس کے بعد یکایک اپنی ڈسک پر جا کر کھڑا ہو جاتا اور گھنٹوں مسلسل لکھتا رہتا۔ اس کو اتنا بھی ہوش نہیں رہتا تھا کہ قریب کی کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھ جائے۔ اس کے سکریٹری کی رپورٹ ہے کہ اس دوران میں بہت کم ایسا ہوا کہ وہ دو بجے سے پہلے بستر پر گیا ہو اور بعض اوقات تو پانچ اور چھ بج جاتے تھے۔ کھانا بھی وہ اکثر بھول جاتا تھا۔ اس کی زندگی کی ضروریات بہت محدود تھیں۔ ایک مرتبہ اس سے پوچھا گیا کہ تم سگریٹ کیوں نہیں پیتے، اس نے جواب دیا:

"Because I do not want to
aquire any new necessities".

یعنی میں سگریٹ اس لئے نہیں پیتا کہ اس کی وجہ سے میری ضروریات زندگی میں خواہ مخواہ ایک نئی ضرورت کا اضافہ ہو جائے گا۔

ولیم ہرشل (William Harschell) ایک جرمن سائنس داں گزرا ہے۔ اس نے فلکیات کے مطالعہ میں انسان کے علم کو بہت آگے بڑھایا۔ اس کا حال یہ تھا کہ معاشی تنگی کی وجہ سے اسکول کے بعد وہ اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکا اور ایک ملازمت کر لی۔ لیکن صحت کی خرابی کی وجہ سے انیس سال کی عمر میں یہ ملازمت بھی چھوڑنی پڑی۔ اس کے بعد اس نے اپنے خاندانی پیشے کو اختیار کیا اور وائلن بجانے لگا۔ اسی دوران میں اس کو فلکیات کے موضوع پر ایک کتاب ملی۔ اس کتاب کو اس نے بہت غور سے پڑھا۔ اس کے بعد ہرشل کو ستاروں کے مطالعہ سے گہری دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اس کا یہ شوق اتنا بڑھا کہ کبھی کبھی رات کے وقت جب اس کی ٹولی ساز و نغمہ میں مصروف ہوتی تھی وہ مجلس چھوڑ کر تھوڑی دیر کے لئے باہر نکل جاتا تاکہ آسمان پر جگمگاتے ہوئے ستاروں کی ایک جھلک دیکھ آئے۔

ستاروں کے مطالعہ کے لئے دوربین ضروری تھی۔ مگر یہ اٹھارھویں صدی کا زمانہ تھا جب کہ دوربین ابھی جلد ہی ایجاد ہوئی تھی اور نہ صرف یہ کہ ناقص تھی بلکہ اس کا ملنا بھی آسان نہیں تھا۔ ہرشل نے خود اپنی دوربین بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے متعلق فنی واقفیت حاصل کرنے کے لئے اس نے ریاضی پڑھنی شروع کی اور لمبی محنت کے بعد خود اپنے ہاتھ سے دوربین

تیار کی۔ ظاہر ہے کہ اس کی پہلی دوربین ابھی بہت ناقص تھی۔ مگر وہ ہمت نہ ہارا۔ دوربین کو ترقی دینے اور اس کو بہتر بنانے میں اس کا انہماک اتنا بڑھا کہ اس کا پورا گھر دوربین کا ایک کارخانہ بن گیا۔ اس زمانے میں ہرشل کی مشغولیت کا یہ حال تھا کہ وہ کھانے کے لئے بھی اپنی ورکشاپ سے نہیں نکلتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی بہن کو اکثر اس طرح اسے کھانے کے لئے آمادہ کرنا پڑتا تھا کہ وہ اپنے کام میں لگا رہتا اور بہن اس کے پہلو میں کھڑی ہوئی اس کے منہ میں لقمہ ڈالتی جاتی۔

صاف راتوں میں جب کہ آسمان پر بادل نہیں ہوتے تھے، بہت کم ایسا ہوتا کہ ہرشل بستر کے اوپر نظر آتے۔ ایسی راتوں کا بہترین مصرف اس کے نزدیک یہ تھا کہ اس کو ستاروں کا مشاہدہ کرنے میں بسر کرے۔ اس کی انھیں کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اس کو تاریخ میں وہ مقام حاصل ہوا جس کو ایک مصنف نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

"...he had looked farther into space than any other eye had yet seen".

یعنی اس نے کائنات میں اتنی دور تک دیکھا جتنا اس سے پہلے کسی آنکھ نے نہیں دیکھا تھا۔

نومبر ۱۸۴۷ء کی ایک تاریخ کو جب ایک یوروپین ڈاکٹر کے کمرے میں اس کا ملازم داخل ہوا تو ڈاکٹر اور اس کے دو ساتھی اپنی کرسیوں سے گر کر فرش پر اوندھے منہ بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔ ملازم نے سمجھا کہ شاید ان لوگوں نے کوئی تیز قسم کی شراب پی لی ہے۔ اس نے ان کے کپڑے درست کئے اور خاموشی کے ساتھ باہر چلا گیا۔ مگر حقیقت کچھ اور تھی۔ یہ دراصل جیمز سمپسن اور اس کے دو اسسٹنٹ تھے جنھوں نے پہلی بار کلوروفارم کے اثرات کا تجربہ کرنے کے لئے اس کو سانس کے ذریعہ اپنے اندر داخل کر لیا تھا۔ سمپسن ایک دیہاتی نانبائی کے سات لڑکوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ چار سال کی عمر میں اس نے دیہات کے اسکول میں تعلیم شروع کی اور اس میں اتنی دلچسپی اور توجہ دکھائی کہ اس کا باپ اور بھائی اس پر راضی ہوگئے کہ نہایت ضروری مصارف پر قناعت کر کے اس کو اعلیٰ تعلیم کے لئے شہر بھیجیں۔ اس طرح وہ اڈنبرا یونیورسٹی پہنچا۔ اسی نانبائی کے لڑکے کے سر اس بات کا سہرا ہے کہ اس نے آپریشن کے موقع پر کلوروفارم کا استعمال دریافت کر کے انسانیت کو ایک طویل اور جانکاہ مصیبت سے نجات دی ــــ اس نے انسان کو وہ چیز دی جس کو ڈاکٹر جان براؤن نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے:

"...one of God's best gifts to his suffering children."

یعنی دکھی انسانوں کے نام خدا کے تحفوں میں سے ایک بہترین تحفہ ــــــ مگر سمپسن یہ تاریخی کام صرف اس وقت کر سکا جبکہ اس کی تحقیق میں اس نے اپنے آپ کو پوری طرح لگا دیا اور اس کے لئے اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالنے سے بھی گریز نہیں کیا۔

یہ ان لوگوں میں سے صرف چند کا ذکر ہے جنھوں نے دنیا میں عزت کا مقام حاصل کیا۔ آپ اس طرح کے بہت سے واقعات کو کتابوں میں پڑھ سکتے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جنتِ دنیوی میں صرف وہ لوگ داخل ہو سکے جنھوں نے بے پناہ مشقت اٹھائی۔ جنھوں نے اپنی ساری صلاحیتوں کو اس کے پیچھے جھونک دیا۔ دنیا اپنی پشت پر چلنے والے کروڑوں اور اربوں انسانوں میں سے صرف ان تھوڑے سے لوگوں کو عزت اور سربلندی کا مقام دینے کے لئے منتخب کرتی ہے جو اس کے لئے اپنے آپ کو فنا کر دیتے ہیں، جو اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دیتے ہیں پھر خدا کی جنت جو اس سے کہیں زیادہ قیمتی ہے، کس قدر

خام خیالی ہوگی اگر کوئی شخص سمجھے کہ محض سطحی قسم کے عمل کے ذریعہ وہ اسے حاصل کرلے گا:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۗءُ وَالضَّرَّاۗءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ○

(اے مسلمانو!) کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ تمھیں جنت میں داخلہ مل جائے گا۔ حالاں کہ ابھی تم پر وہ حالات گزرے ہی نہیں جو اس سے پہلے کے لوگوں پر گزر چکے ہیں۔ ان کو تکلیفیں اور مصیبتیں لاحق ہوئیں، وہ ہلا مارے گئے، یہاں تک کہ رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان پکار اٹھے کہ خدا کی مدد کب آئے گی۔ سن لو (ایسے لوگوں کے لئے) خدا کی مدد قریب ہے۔

آخر میں آپ کو میں ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں جو پچھلے دس سال سے میری یادداشت کا بہترین حصہ رہا ہے یہ ایک انگریز مسٹر آرنلڈ کا واقعہ ہے جو علی گڑھ میں فلسفہ کے پروفیسر تھے۔ ۱۸۹۲ء میں جب مولانا شبلی نے قسطنطنیہ کا سفر کیا تو جہاز میں پورٹ سعید تک مسٹر آرنلڈ کا بھی ساتھ رہا۔ مولانا شبلی لکھتے ہیں:

"۱۰ مئی کی صبح کو میں سوتے سے اٹھا تو ایک ہم سفر نے کہا کہ جہاز کا انجن ٹوٹ گیا۔ میں نے دیکھا تو واقعی کپتان اور جہاز کے ملازم گھبرائے پھرتے تھے اور اس کی درستی کی تدبیریں کر رہے تھے۔ انجن بالکل بے کار ہو گیا تھا اور جہاز نہایت آہستہ آہستہ ہوا کے سہارے چل رہا تھا۔ میں سخت گھبرایا اور نہایت ناگوار خیالات دل میں آنے لگے۔ اس اضطراب میں اور کیا کر سکتا تھا۔ دوڑا ہوا مسٹر آرنلڈ کے پاس گیا۔ وہ اس وقت نہایت اطمینان کے ساتھ کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ کو خبر بھی ہے۔ بولے کہ ہاں انجن ٹوٹ گیا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کو کچھ اضطراب نہیں۔ بھلا یہ کتاب دیکھنے کا موقع ہے۔ فرمایا کہ جہاز کو اگر برباد ہی ہونا ہے تو یہ تھوڑا سا وقت اور بھی قدر کے قابل ہے اور ایسے قابل قدر وقت کو رائگاں کرنا بالکل بے عقلی ہے۔" سفرنامہ روم و مصر و شام صفحہ ۱۲

سمندر کی لہروں کے درمیان جہاز کی یہ غیر یقینی حالت آٹھ گھنٹے قائم رہی۔ آٹھ گھنٹے کا یہ وقت مسٹر آرنلڈ کے لئے جو حیثیت رکھتا تھا مومن کے لئے وہی حیثیت اس کی پوری زندگی کی ہے۔ آپ ہر وقت اس خطرے میں مبتلا ہیں کہ اچانک آپ کی موت آجائے۔ ہر لمحہ آپ کے لئے زندگی کا آخری لمحہ ہے۔ اگر آدمی کو اس بات کا واقعی احساس ہو جائے تو وہ اسی طرح ہمہ تن مشغول نظر آئے گا جیسے امتحان میں بیٹھا ہوا وہ طالب علم جس کا وقت ختم ہو رہا ہو اور ابھی اسے کئی سوال کرنے باقی ہوں۔ لیکن اگر آپ غفلت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اگر آپ اپنے وقت کی اہمیت نہیں سمجھتے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کو اس نازک صورت حال کا احساس نہیں ہے جس میں آپ کی زندگی کا جہاز گھرا ہوا ہے۔ آپ موت سے نہیں ڈرتے آپ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ سوچئے کہ آپ کی زندگی آپ کے بارے میں کس چیز کا ثبوت دے رہی ہے۔

اسلامک یوتھ آرگنائزیشن (رام پور) کے اجتماع میں کی گئی تقریر — ۱۲ جولائی ۱۹۶۱

اقامت دین کے بارے میں

قرآن کی سورہ نمبر ۴۲ میں ارشاد ہوا ہے کہ جو دین اللہ نے دوسرے نبیوں کو دیا تھا وہی دین تم کو بھی دیا گیا ہے ۔ اس دین کو قائم رکھو، اس میں متفرق نہ ہو (شوریٰ) اس آیت کی تفسیر تمام مفسرین یہ کرتے ہیں کہ اس میں دین کے وہ اساسی احکام مراد ہیں جو تمام نبیوں کے یہاں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں ۔ اس میں شرائع اور منہاج مراد نہیں ہیں ۔ کیوں کہ قرآن کی صراحت کے مطابق ان میں مختلف نبیوں کے درمیان فرق پایا جاتا ہے (مائدہ ۴۸) شرائع اور منہاج جب مختلف ہوں تو ان کی متحدہ پیروی ممکن نہیں، متحدہ تعلیمات ہی کی متحدہ پیروی کی جاسکتی ہے ۔ اس لئے اس آیت میں حکم اقامت کا اطلاق اساسی تعلیمات پر ہوگا نہ کہ تفصیلی تعلیمات پر ۔ اس آیت کا منشا یہ ہے کہ تفصیلی احکام میں توسع اور حالات کی رعایت کا طریقہ اختیار کیا جائے اور مستقل زور اور تاکید صرف متفق علیہ باتوں پر دیا جائے ۔ اس طرح ملت کے اندر حقیقی دینی فضا پیدا ہوگی ۔ دین کے وہ ذیلی یا تفصیلی امور جن میں زمانہ اور حالات کے اعتبار سے فرق ہوتا رہتا ہے، ان کو اگر مستقل تاکید کی بنیاد بنایا گیا تو ملت کے اندر تفرق و انتشار ظہور میں آئے گا اور دین کے نام پر ایک ایسی فضا پیدا ہوگی جو دین کے لئے قاتل کی حیثیت رکھتی ہے (تفصیل کے لئے: تعبیر کی غلطی ، الاسلام)

موجودہ زمانہ میں کچھ لوگوں نے اس آیت کی یہ تفسیر کی کہ اقامت دین کے حکم کا مطلب یہ ہے کہ سارے اسلامی قوانین کو بحیثیت ایک مکمل نظام کے جاری و نافذ کیا جائے ۔ اب چوں کہ مکمل قانون کے نفاذ میں سب سے بڑی رکاوٹ حکومتی ادارہ تھا، اس تفسیر کے مطابق اقامت دین کا پہلا کام یہ قرار پایا کہ حکومت وقت سے تصادم کرکے اس سے اقتدار چھینا جائے تاکہ مکمل قانون کو نافذ کیا جاسکے ۔ مسلم اقلیت کے ملکوں میں اس قسم کے سیاسی جہاد کے مواقع نہیں تھے، اس لئے یہاں یہ تفسیر تقریری اور تحریری مہم تک محدود رہی ۔ مسلم اکثریت کے ممالک جہاں مواقع کھلے ہوئے تھے، وہاں اس نے قائم شدہ مسلم حکومت کے خلاف براہ راست اقدام کی صورت اختیار کی ۔ اس کے نتیجہ میں نہ صرف حرث و نسل کی ہلاکت اور باہمی فساد وجود میں آیا بلکہ اقامت دین کے نام پر یہ عظیم نقصان ہوا کہ ملت کے اندر دینی اتحاد کی وہ فضا بالکل برباد ہوگئی جو اقامت دین کے حکم کا مقصود اصلی تھا ۔ اقامت دین کی تحریک کے یہ برعکس نتائج کافی تھے کہ اس کے علم بردار اپنے فکر پر نظر ثانی کریں ۔ مگر انھوں نے یہ کیا کہ نئی نئی تفسیریں لکھ کر اپنے پیروؤں کے ذہن کو مزید پختہ کرنے کی کوشش کی ۔ یہاں ہم اس سلسلے میں ایک تفسیر میں شائع شدہ بحث کا جائزہ لینا چاہتے ہیں ۔ مذکورہ مفسر قرآن سورہ شوریٰ کی تفسیر کے تحت لکھتے ہیں :

" بعض لوگوں نے دیکھا کہ جس دین کو قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ تمام انبیاء علیہم السلام کے درمیان مشترک ہے اور شریعتیں ان سب کی مختلف رہی ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے: لکل جعلنا منکم شرعۃ و منہاجا ، اس لئے انھوں نے یہ رائے قائم کرلی کہ لامحالہ اس دین سے مراد شرعی احکام و ضوابط نہیں ہیں بلکہ

صرف توحید و آخرت اور کتاب و نبوت کا ماننا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت بجالانا ہے۔ یا حد سے حد اس میں وہ موٹے موٹے اخلاقی اصول شامل ہیں جو سب شریعتوں میں مشترک رہے ہیں۔ لیکن یہ بڑی سطحی رائے ہے جو محض سرسری نگاہ سے دین کی وحدت اور شرائع کے اختلاف کو دیکھ کر قائم کر لی گئی ہے اور یہ ایسی خطرناک رائے ہے کہ اگر اس کی اصلاح نہ کر دی جائے تو آگے بڑھ کر بات دین و شریعت کی اس تفریق تک جا پہنچے گی جس میں مبتلا ہو کر سینٹ پال نے دین بلا شریعت کا نظریہ پیش کیا اور سیدنا مسیح علیہ السلام کی امت کو خراب کر دیا۔ اس لئے کہ جب شریعت دین سے الگ ایک چیز ہے اور حکم صرف دین کو قائم کرنے کا ہے نہ کہ شریعت کو، تو لامحالہ مسلمان بھی عیسائیوں کی طرح شریعت کو غیر اہم اور اس کی اقامت کو غیر مقصود بالذات سمجھ کر نظر انداز کر دیں گے اور صرف ایمانیات اور موٹے موٹے اخلاقی اصولوں کو لے کر بیٹھ جائیں گے۔ اس طرح کے قیاسات سے دین کا مفہوم متعین کرنے کے بجائے آخر کیوں نہ ہم خود اللہ کی کتاب سے پوچھ لیں کہ جس دین کو قائم کرنے کا حکم یہاں دیا گیا ہے، آیا اس سے مراد صرف ایمانیات اور چند بڑے بڑے اخلاقی اصول ہی ہیں یا شرعی احکام بھی۔ (اس کے بعد مختلف آیتیں نقل کر کے دکھایا گیا ہے کہ قرآن میں دین کا لفظ ایمانیات کے علاوہ قوانین و احکام کے لئے بھی آیا ہے۔ اس لئے لازماً تمام احکام کو دین میں شمار ہونا چاہئے اور ان سب کو بروئے کار لانے کا نام اقامت دین ہونا چاہئے) ۹۰ - ۴۸۸

۱۔ مذکورہ بالا اقتباس میں "بعض" کا لفظ معاملہ کی سنگینی کو گھٹا رہا ہے۔ کیوں کہ یہ رائے صرف "بعض مفسرین" کی نہیں ہے بلکہ بلا استثناء تمام قابل ذکر مفسرین کی ہے۔

۲۔ مذکورہ رائے کو سطحی اور سرسری قرار دینے کے لئے کوئی دلیل نہیں۔ جب حکم کے الفاظ یہ ہیں کہ "تمام نبیوں کے دین کی پیروی کرو، اس میں متفرق نہ ہو" تو لامحالہ قرآن کی اس خاص آیت میں الدین سے دین کا مشترک حصہ مراد لینا ہوگا نہ کہ متفرق حصہ۔

۳۔ اقیموا الصلوٰۃ کی آیت میں کوئی شخص اقیموا الزکوٰۃ کو شامل نہ سمجھے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ حکم زکوٰۃ کا انکار کر رہا ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ زکوٰۃ کا حکم دوسری آیت میں ہے نہ کہ اقیموا الصلوٰۃ کی آیت میں۔ اسی طرح اقیموا الدین میں شرائع کو مراد نہ لینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شرائع سرے سے مطلوب نہیں ہیں۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ اس آیت میں شامل نہیں ہیں۔ ان کا حکم دوسری آیتوں سے نکلتا ہے اور وہاں جو الفاظ ہیں انہیں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس حکم کی نوعیت کیا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص ان الارض للہ (اعراف ۱۲۸) سے اجتماعی ملکیت کا اصول نکالے تو کہا جائے گا کہ اس آیت کا ملکیت کے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ملکیت کے بارے میں بھی بلاشبہ اسلام کے احکام ہیں۔ مگر وہ دوسری آیتوں سے معلوم ہوتے ہیں نہ کہ ان الارض للہ سے۔

۴۔ اس ضمن میں سینٹ پال کا حوالہ بالکل غیر متعلق ہے۔ سینٹ پالیت جس چیز کا نام ہے وہ یہ کہ کوئی شخص اپنے فعل (خواہ اعتقادی ہو یا عملی) سے نجات نہیں پاتا۔ بلکہ اس خاص عقیدہ کو ماننے سے نجات پاتا ہے کہ خدا کا بیٹا

مصلوب ہو کر انسان کے پیدائشی گناہوں کا کفارہ ہو گیا۔ بالفاظ دیگر، سینٹ پالیت یہ ہے کہ انسان کی نجات کا دار و مدار معروف معنوں میں نہ ایمانیات پر ہے اور نہ اعمال پر، بلکہ کفارہ کے مخصوص تصور کو مان لینے پر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بالکل ایک علیحدہ مذہب ہے۔ اقیموا الدین کی مذکورہ تفسیر سے اس کو کوئی مشابہت نہیں۔

۵۔ یہ بات بھی صحیح نہیں کہ جب اقامت دین کے حکم سے مراد صرف اساسات دین کی اقامت ہے تو بقیہ احکام و ضوابط کس لئے ہیں۔ قرآن سے ثابت ہے کہ شرعی احکام کی تکلیف باعتبار "وسع" ہوتی ہے۔ اس کا مطلب ہوا کہ جس حکم کی تعمیل کسی شخص یا گروہ کے وسع میں نہ ہو اس کے لئے وہ حکم اس وقت تک عملاً موقوف رہے گا جب تک اس کے اندر اس کی قدرت نہ پیدا ہو جائے۔ اساسات دین وہ ہیں جن کی استطاعت ہر شخص کو ہر وقت رہتی ہے، اللہ سے خوف و محبت کا تعلق قائم کرنا اور بندوں کے ساتھ انصاف اور خیر خواہی کا معاملہ کرنا کس کے لئے ممکن نہیں۔ اس لئے اساسات دین کی اقامت ایک عام حکم ہے جس کا مکلف ہر شخص ہمیشہ رہتا ہے۔ اس کے برعکس احکام اجتماعی کے نفاذ کا معاملہ اقتدار کا طالب ہے، اس لئے اس کے نفاذ کو اقتدار کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے۔ جس کو جتنا اقتدار حاصل ہو، اس کے اعتبار سے اس پر وہ احکام مفروض ہوتے چلے جائیں گے جو اس کے دائرہ اختیار میں آتے ہیں۔ اسی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں مدنی دور میں حکومتی قوانین جاری کئے اور ابو الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیوں تا عمر ایسا نہیں کیا۔ اس فرق کے باوجود دونوں اللہ کی نظر میں مومن کامل تھے۔ کیونکہ کسی کے دین کا مکمل ہونا یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کے اوپر دین کو مکمل طور پر غالب کرے نہ یہ کہ دوسروں کے اوپر مکمل داروغہ بننے کے لئے ایجی ٹیشن چلائے۔

۶۔ یہ اندیشہ بھی صحیح نہیں کہ یہ اہل اسلام کو انفرادی عمل پر قانع بناتا ہے۔ اقیموا الدین کی آیت میں جس توحید پر قائم ہونے کا حکم ہے، دوسرے مقامات (یوسف ۱۰۸) پر یہ عمومی حکم بھی موجود ہے کہ اس پیغام توحید کو دوسرے بندگان خدا تک پہنچاؤ۔ تنفیذ قانون بلاشبہ ایک مشروط حکم ہے۔ مگر دعوت الی اللہ ایک عام حکم ہے جو ہر حال میں مطلوب ہے۔ دعوت کا کام پوری امت کے لئے عظیم ترین اجتماعی نشانہ عطا کرتا ہے۔

۷۔ ایک لفظ اکثر ایک سے زیادہ معنی رکھتا ہے۔ "دین" کا لفظ بھی قرآن میں لغوی اور مرادی اعتبار سے کئی معنوں میں آیا ہے۔ ان تمام معانی کی فہرست بنانا اور یہ کہنا کہ اقیموا الدین میں لفظ دین کے یہ تمام معانی مراد ہیں، ایک غیر علمی بات ہے۔ کیوں کہ لفظ کا مفہوم ہمیشہ سیاق کے اعتبار سے متعین ہوتا ہے نہ کہ مختلف مفہومات کی گنتی سے۔ اس طریق استدلال کی غلطی اس سے واضح ہے کہ قرآن کی پہلی سورہ میں دین کا لفظ "جزا" کے معنی میں آیا ہے۔ اب اگر مذکورہ طریق استدلال کو صحیح سمجھا جائے تو اقامت دین کے مفہوم میں یہ بھی شامل کرنا پڑے گا کہ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ جد وجہد کر کے روز جزا کو برپا کریں تاکہ لوگوں کو ان کے عمل کا بدلہ دیا جا سکے۔ پھر کیا اس انقلابی تعبیر کے دعوے دار اپنے دین کو مکمل کرنے کے لئے مالک یوم الدین بننے کو بھی اپنے پروگرام میں شامل کریں گے۔

۸۔ اقیموا الدین کو اساسات دین کی اقامت کے معنی میں لینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ "موٹی موٹی تعلیمات کو

لے لیا اور باقی سب کو چھوڑ دیا" اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اس متفق علیہ دین کو پکڑو جو اصلاً اور دائماً مطلوب ہے۔ فروعی اور اختلافی چیزوں کو مدار اقامت نہ بناؤ۔ اس سے مراد "موٹی موٹی تعلیمات" نہیں ہیں بلکہ وہ اصلی اور حقیقی تعلیمات ہیں جن پر آخرت کی نجات کا انحصار ہے۔ انبیاء کی غیر اختلافی تعلیمات کیا تھیں، اس کے متعلق ہم کو قیاس کرنے کی ضرورت نہیں۔ قرآن کے تتبع سے اس کو واضح طور پر معلوم کیا جا سکتا ہے۔ چند حوالے ملاحظہ ہوں:

۱۔ اللہ کے سوا کسی کو الٰہ نہ بنانا	انبیاء	۲۵
۲۔ صرف ایک اللہ کی عبادت کرنا	فصلت	۱۴
۳۔ اللہ سے ڈر کر زندگی گزارنا	نحل	۲
۴۔ رزق طیب کھانا اور عمل صالح کرنا	مومنون	۵۱
۵۔ ایک دوسرے کے ساتھ انصاف برتنا	حدید	۲۵
۶۔ دوسروں کی ڈالی ہوئی اذیت پر صبر کرنا	احقاف	۳۵
۷۔ دعوت حق کا ساتھ دینا	آل عمران	۸۱
۸۔ لوگوں کو جہنم سے ڈرانا اور جنت کی خوش خبری دینا	نساء	۱۶۵

یہی تمام انبیاء کا دین رہا ہے اور یہی وہ دین ہے جو اصلاً اور حقیقتاً اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے۔ ظاہری اعمال بھی وہی مقبول ہیں جن میں مندرجہ بالا تعلیمات کی روح پائی جائے۔ اس کے بغیر کسی عمل کی کوئی قیمت نہیں۔ مزید یہ کہ انھیں تعلیمات میں اللہ کا پورا دین آجاتا ہے۔ جو شخص ان چیزوں پر قائم ہو جائے وہ پورے دین پر قائم ہو گیا۔ اللہ کے نزدیک اس نے اپنے دین کو کامل کر لیا۔ دین اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے کوئی خارجی "نظام" نہیں ہے جس کو اقتدار پر قبضہ کر کے لوگوں کے اوپر نافذ کیا جائے۔ دین حقیقتاً آدمی کی اپنی زندگی کا نقشہ ہے۔ آدمی کا اپنا وجود جس کے ساتھ وہ صبح و شام جی رہا ہے، جس کو لے کر وہ پیدا ہوتا ہے اور جس کو لے کر وہ مرجاتا ہے، اس وجود کو دین دار بنانا اور اس کو ہمہ تن اللہ کی مرضیات پر ڈھال لینا ہی دراصل اقامت دین ہے۔ یہ انسانی وجود کسی قانون یا کسی سیاسی ادارہ کی گرفت سے باہر کی چیز ہے۔ یہ صرف آدمی کے اپنے ارادہ کی گرفت میں آتا ہے۔ اس پر کسی دوسر کا حکم نہیں چلتا بلکہ صرف اپنا حکم چلتا ہے۔ اسی انسانی وجود پر خود اپنے ارادہ سے دین کو غالب کرنے کا نام اقامت دین ہے نہ کہ حکمرانوں سے سیاسی منازعت کرنے یا دوسروں کی پیٹھ پر کوڑا مارنے کا۔

سیاسی اقتدار بھی بلاشبہ اسلام میں مطلوب ہے۔ مگر وہ اہل اسلام پر اللہ تعالیٰ کا انعام (نور ۵۵) ہے۔ یہ انعام صرف اس وقت ملتا ہے جب کہ اہل اسلام کا کوئی گروہ قابل لحاظ تعداد میں اپنے اوپر مذکورہ دین کو قائم کر چکا ہو۔ سیاسیات دین کی اقامت کے بعد ہی شرائع دین کی اقامت کے مواقع کھولے جاتے ہیں۔ اصل دین پر خود قائم ہو جانا گویا اپنی پیٹھ کو "کوڑے" کے لئے پیش کر دینا ہے۔ جو لوگ اس خود سپردگی کا ثبوت دے دیں انہیں کو دوسروں کی پیٹھ پر کوڑا مارنے کا سیاسی اجازت نامہ عطا ہوتا ہے۔ خود سپردگی کی اس کیفیت کے بغیر لوگوں کو کوڑا

مارنا خدا کی زمین میں صرف فساد برپا کرنے کا باعث ہوتا ہے نہ کہ انصاف قائم کرنے کا۔ ایسے لوگ جو دوسروں کی پیٹھ پر کوڑا لگانے کے لئے تو بہت بے قرار ہوں۔ مگر خود اپنی "پیٹھ" پر لفظی تنقید کو بھی برداشت نہ کریں، وہ اللہ کی نظر میں ظالم ہیں۔ قیامت میں ان سے پوچھا جائے گا کہ جب تمہاری انانیت کا یہ حال تھا کہ تم لفظی کوڑے کی مار برداشت کرنے کے لئے بھی تیار نہ تھے تو تم کو کیا حق تھا کہ دوسروں کے اوپر مادی کوڑے برسانے کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔ اس تعبیر کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ جو چیز خدا کے نزدیک اہم تھی وہ غیر اہم بن گئی اور جو غیر اہم تھی وہ اہم قرار پائی۔ مذکورہ مفسر اقیموا الدین کی تفسیر کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"انبیاء علیہم السلام کو جب اس دین کے قائم کرنے اور قائم رکھنے کا حکم دیا گیا تو اس سے مراد صرف اتنی بات نہ تھی کہ وہ خود اس دین پر عمل کریں۔ اور اتنی بات بھی نہ تھی کہ وہ دوسروں میں اس کی تبلیغ کریں تاکہ لوگ اس کا برحق ہونا تسلیم کر لیں، بلکہ یہ بھی تھی کہ جب لوگ اسے تسلیم کر لیں تو اس سے آگے قدم بڑھا کر پورا کا پورا دین ان میں عملاً رائج اور نافذ کیا جائے تاکہ اس کے مطابق عملدرآمد ہونے لگے اور ہوتا رہے۔ اس میں شک نہیں کہ دعوت و تبلیغ اس کام کا لازمی ابتدائی مرحلہ ہے جس کے بغیر دوسرا مرحلہ پیش نہیں آسکتا۔ لیکن ہر صاحب عقل آدمی خود دیکھ سکتا ہے کہ اس حکم میں دعوت و تبلیغ کو مقصود کی حیثیت نہیں دی گئی ہے۔ بلکہ دین قائم کرنے اور قائم رکھنے کو مقصود قرار دیا گیا ہے۔ دعوت و تبلیغ اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ضرور ہے مگر بجائے خود مقصد نہیں ہے۔ کجا کہ کوئی شخص اسے انبیاء کے مشن کا مقصد وحید قرار دے بیٹھے" ۴۸۸

قرآن میں تمام انبیاء کے بارے میں صراحتہً یہ بات کہی گئی ہے کہ وہ صرف تبلیغ (پہنچا دینے) پر مامور تھے۔ قوموں کو پوری طرح باخبر کر دینے کے بعد ذاتی ذمہ داری کی حد تک ان کا کام ختم ہو جاتا تھا۔ "قائم کرنا اور قائم رکھنا" تمام تر مدعو کے اپنے ردعمل پر منحصر ہے۔ اس کو انبیاء کی ذمہ داری کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے۔ قرآن میں کوئی ایک آیت ایسی نہیں ہے جس میں نبیوں کے مشن کو "قائم کرنے اور قائم رکھنے" کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہو۔ اس کے برعکس کثرت سے ایسی آیتیں موجود ہیں جن میں پہنچا دینے کو ان کا فرض منصبی بتایا گیا ہے۔ مثلاً:

فهل على الرسل الا البلاغ المبين (نحل ۳۵) پس رسولوں پر ذمہ نہیں مگر پہنچا دینا کھول کر

وما نرسل المرسلين الا مبشرين ومنذرين (انعام ۴۸) اور نہیں بھیجتے ہیں ہم پیغمبروں کو مگر بشارت دینے والے اور ڈرانے والے۔

دعوتی جدوجہد کی عملی تفسیر انبیاء کرام کی زندگیاں ہیں، ہر نبی نے دعوت دین کے کام کو کامل اور مکمل صورت میں انجام دیا۔ اس لئے اس مہم کی اس انجام دہی کو "مقصود" کی حیثیت دی جائے گی جو تمام انبیاء کے یہاں مشترک طور پر پائی جاتی ہو۔ اور معلوم ہے کہ تمام انبیاء کے یہاں جو چیز مشترک طور پر پائی جاتی ہے وہ پہنچا دینا ہی ہے نہ کہ "پورے کے پورے دین کو عملاً رائج و نافذ کر دینا"۔ یہ واقعہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ دعوتی مشن کا اصل مقصود یہ ہے کہ مدعو تک خدا کا پیغام پوری طرح پہنچ جائے، نہ کہ اس کو قائم کرنا اور قائم رکھنا۔

ایجنسی کی شرائط

۱۔ کم از کم پانچ پرچوں پر ایجنسی دی جائے گی۔

۲۔ کمیشن پچیس فی صد

۳۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوں گے۔

۴۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی، پی روانہ ہوں گے۔

۵۔ غیر فروخت شدہ پرچے واپس لے لئے جائیں گے۔

مینجر الرسالہ جمعیتہ بلڈنگ۔ قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی ۶

Regd. No. D. (D) 532
Regd. R.N. No. 28822/76
Issue No XXX

May 1979

Al-Risala Monthly

Jamiat Building, Qasimjan Sreet, DELHI-110006 (INDIA)

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی سے شائع کیا

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

اندھیرا آئے تو اندھیرے کو نہ کوسیے، چراغ جلا دیجئے
اس کے بعد اندھیرا خودبخود ختم ہوجائے گا ——

شمارہ ۳۱
جون ۱۹۷۹

زر تعاون سالانہ ۲۴ روپے
خصوصی تعاون سالانہ ایک سو روپے
بیرونی ممالک سے ۱۵ ڈالر امریکی

قیمت فی پرچہ
دو روپے

الرسالہ

شمارہ ۳۱ جون ۱۹۷۹

جمعیۃ بلڈنگ • قاسم جان اسٹریٹ • دہلی ۶

دہرا نقصان ۔۔۔

"نیٹ جہاز کیا ہے" طالب علم سے یہ سوال پوچھا جائے اور اس کے جواب میں وہ جیٹ جہاز کی تفصیلات بتانے لگے تو امتحان کے ایک اصول کے مطابق اس کے نمبر کم کر دیئے جائیں گے۔ یعنی سوال اگر پانچ نمبر کا تھا تو غلط جواب کی وجہ سے اس کے دس نمبر کاٹ لئے جائیں گے کیونکہ غلط جواب اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ وہ نہ صرف نیٹ جہاز سے ناواقف تھا بلکہ جیٹ جہاز کو بھی نہیں جانتا تھا۔ امتحان کے اس اصول کو نمبر کی نفی (Minus Marking) کہتے ہیں۔

بعض امتحانات میں نمبر کی نفی کا جو طریقہ رائج ہے، وہ زندگی کے معاملہ میں بھی نہایت بے رحمی کے ساتھ کارفرما ہے۔ اگر کوئی شخص یا گروہ غلط اقدام کر بیٹھے تو صرف اتنا ہی نہیں ہوگا کہ وہ منزل پر نہیں پہنچے گا۔ بلکہ وہ پہلے سے بھی زیادہ منزل سے دور ہو جائے گا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مغرب کی نماز کے بعد میں مسجد سے نکلا تو ایک صاحب سیڑھیوں پر اپنے جوتے کا فیتہ کس رہے تھے۔ وہ ابھی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلے تھے۔ وہ ایک معروف کارخانہ دار ہیں۔ برسوں سے وہ کبھی مسجد میں نظر نہیں آئے تھے۔ میں حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ان کی طرف دیکھ رہا تھا کہ وہ بول پڑے: "یہ الرسالہ کا ظہور ہے"۔ انھوں نے بتایا کہ عرصہ ہوا ایک صاحب مجھے الرسالہ کے چند پرچے دے گئے تھے۔ میں نے ان کو پڑھے بغیر الماری میں ڈال دیا۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ میں بیمار پڑا۔ ایک روز جب کہ میں بستر پر پڑا ہوا تھا، وقت گزاری کے لئے الرسالہ کے پرچے نکالے اور ان کو دیکھنے لگا۔ چند ہی صفحات دیکھے تھے کہ اس کی کشش نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ میں نے سارے پرچے پڑھ ڈالے۔ اب ہر مہینے باقاعدہ خرید کر اس کو پڑھتا ہوں۔ الرسالہ اب میری زندگی کا جزء بن چکا ہے۔ اور اسی کا یہ کرشمہ ہے کہ میرے جیسا آزاد خیال آدمی آج پانچوں وقت مسجد میں آکر نماز ادا کر رہا ہے۔

الرسالہ کی ڈاک میں تقریباً روزانہ اس قسم کے خطوط ہوتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ الرسالہ اپنے قارئین کے حلقہ میں دینی جذبات کو جگانے اور دین دار زندگی پیدا کرنے میں بفضلہ مؤثر ثابت ہو رہا ہے۔ اب اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس کے پڑھنے والے بڑھیں۔ ہم اپنے ہمدردوں کے سامنے دوبارہ اس اپیل کو دہرائیں گے کہ وہ الرسالہ کی ایجنسی کو اپنی زندگی میں ایک ضروری جزء کی حیثیت سے شامل کر لیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس دینی لہر کو آگے بڑھانے کا سب سے مؤثر طریقہ ہے اور ہر شخص کم از کم پانچ پرچے کی ایجنسی بآسانی چلا سکتا ہے۔ الرسالہ کی ایجنسی عام معنوں میں صرف ایجنسی نہیں ہے بلکہ یہ ایک عملی پروگرام ہے جس کے ذریعہ اس تعمیری آواز کو پھیلایا جا سکتا ہے۔

وہ قیمت جو ادا نہیں کی گئی

بائبل میں ہے "میں نے طرب کیا، تونے رقص نہ کیا" کائنات ایک عظیم نمائش گاہ ہے۔ وہ قدرت اور حکمت اور معنویت کا ایک اتھاہ کارخانہ ہے۔ وہ اس قدر حسین ہے کہ اس کے حسن کو کسی بھی طرح لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ کائنات اپنے تمام جلووں کے ساتھ خدا کی ابدی طرب گاہ ہے۔ تاہم معلوم کائنات میں صرف انسان ہی وہ مخلوق ہے جو اس طرب گاہ کو سمجھ سکتا ہے اور اس کو دیکھ کر اس کے جمال و کمال پر رقص کرسکتا ہے۔ مگر وہی واحد مخلوق جس کو خدا نے اپنے دست خاص سے اس لئے بنایا تھا کہ وہ کائنات کی بے پناہ فن کاریوں کو دیکھے اور اس سے بےخود ہو کر رقص کرنے لگے، وہی سب سے زیادہ اس سے اعراض کرتا ہے۔ انسان سب کچھ کرتا ہے مگر وہی کام نہیں کرتا جس کو اسے سب سے زیادہ کرنا چاہئے۔

تمام مخلوقات میں صرف انسان کو اس قسم کا احساس و شعور دینا ظاہر کرتا ہے کہ انسان سے اس کے خدا کو کیا مطلوب ہے۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ خدا کے "طرب پر رقص کرے"۔ وہ کائنات میں خدا کے کرشموں کو اس طرح پائے کہ اس پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو جائے۔ وہ بے اختیار پکار اٹھے : فتبارك الله احسن الخالقين (کیسی بڑی شان ہے اللہ کی جو سب سے بہتر بنانے والا ہے) انسان کی اصل قیمت یہی ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو گویا وہ اس کائنات میں اپنے آپ کو بے قیمت کر رہا ہے۔ وہ اپنے وجود کو بے معنی بنا رہا ہے۔ خدا نے ایک عظیم آفاقی اسٹیج بنایا اور اس میں اپنے بہترین جلووں کے ساتھ ظاہر ہوا۔ اور یہ سب کچھ جس کے لئے کیا گیا وہ وہی تھا جس کو انسان کہا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں انسان اگر اس کی طرف سے آنکھیں بند کرلے، اگر اس کی طرف سے حمد کا ظہور نہ ہو تو یہ اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کی جو سزا بھی دی جائے وہ کم ہوگی۔

خدا کی دنیا بے حد حسین ہے۔ وہ جنت کی فضاؤں سے بھری ہوئی ہے۔ وہ خدا کے جمال و کمال کا آئینہ ہے۔ مگر انسان اس کے حسن کو دیکھ نہیں پاتا۔ انسان کے جہنمی سائے نے اس کو ڈھانپ رکھا ہے۔ کائنات کو اس کے جنتی روپ میں دیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اپنے بنائے ہوئے جھوٹے خول سے باہر آئے۔ وہ "انسانی دنیا" سے اوپر اٹھ کر خدائی دنیا میں جھانک سکے۔ انسان اپنے خول سے باہر نکلنے پر تیار نہیں ہوتا، اس لئے وہ خدا کی دنیا کو دیکھ بھی نہیں پاتا۔

وہی انسان انسان ہے جو تمام دیکھی جانے والی چیزوں سے زیادہ کائنات کو دیکھے۔ کائنات کے آئینہ میں اس کو خدا کا جلوہ نظر آنے لگے۔ جب کسی بندۂ خدا پر یہ تجربہ گزرتا ہے تو اس کا وہ حال ہوتا ہے جس کو انسانی لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی زبان خدا کی حمد و ثنا میں تر رہنے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ خدا کے نور میں ڈوب جاتا ہے۔ اس کے الفاظ جواب دینے لگتے ہیں۔ اس کا شدت احساس آنکھوں کی راہ سے بہہ نکلتا ہے۔ خدا کی خدائی کے اعتراف میں اس کا پورا وجود خاکستر ہو جاتا ہے۔

انسان اپنے آپ میں اتنا مشغول ہے کہ اس کو خدا کی خدائی کی خبر نہیں۔ وہ اپنی "مصنوعات" میں اتنا الجھا ہوا ہے کہ اس کو خدا کی مصنوعات دکھائی نہیں دیتیں۔ وہ اپنے جلووں میں اتنا گم ہے کہ اس کو خدا کے جلوے نظر نہیں آتے۔ انسان کی سب سے بڑی محرومی یہی ہے اور جو شخص دنیا میں محروم ہو وہ آخرت میں پانے والا کس طرح بن سکتا ہے۔

یہ وقت ہر شخص کی طرف دوڑا چلا آرہا ہے

موت ہر ایک پر آتی ہے۔ کوئی اس سے بچ نہیں سکتا۔ تاہم موتیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جب کہ آدمی اللہ کو اپنا مقصود بنائے ہوئے ہو۔ وہ اللہ کے لئے بولتا ہو اور اللہ کے لئے چپ ہوتا ہو۔ اس کی توجہ تمام تر آخرت کی طرف لگی ہوئی ہو۔ ایسے آدمی کے لئے موت کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے رب کی طرف سفر کر رہا تھا اور موت کے فرشتہ نے اس کے سفر کو مختصر کر کے اس کو اس کی منزل تک پہنچا دیا۔

دوسرا آدمی وہ ہے جس نے اپنے مالک کو بھلا رکھا ہے۔ اس کا بولنا اور اس کا چلنا اللہ کے لئے نہیں ہوتا۔ وہ اپنے رب کو چھوڑ کر کسی اور طرف بھاگ رہا ہے۔ ایسے شخص کے لئے موت کا دن اس کی گرفتاری کا دن ہے۔ اس کی مثال اس باغی کی سی ہے جو چند دن سرکشی دکھائے اور اس کے بعد اس کو پکڑ کر عدالت میں حاضر کر دیا جائے

بظاہر ایک ہی موت ہے جو دونوں آدمیوں پر آتی ہے۔ مگر دونوں میں اتنا ہی فرق ہے جتنا پھول اور آگ میں۔ ایک کے لئے موت رب العالمین کا مہمان بننا ہے اور دوسرے کے لئے موت رب العالمین کے قید خانہ میں ڈالا جانا۔ ایک کے لئے موت جنت کے باغوں میں داخلہ کا دروازہ ہے اور دوسرے کے لئے موت وہ دن ہے جب کہ اس کو جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں پھینک دیا جاتا ہے تاکہ اپنی سرکشی کے جرم میں وہاں وہ ابدی طور پر مبتلا رہے۔

مومن اور غیر مومن کی تعریف یہ ہے کہ مومن وہ ہے جس کی نگاہیں موت کے مسائل کی طرف لگی ہوئی ہوں، جو موت کے بعد آنے والی دنیا میں عزت حاصل کرنے کو اپنی تمام توجہات کا مرکز بنائے ہوئے ہو۔ اس کے برعکس غیر مومن وہ ہے جو زندگی کے مسائل میں الجھا ہوا ہو، جو موجودہ دنیا میں عزت اور کامیابی حاصل کرنے کو سب سے بڑی چیز سمجھتا ہو۔ آج کے حالات میں بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کامیاب وہی ہے جو موجودہ دنیا میں اپنی جڑیں مضبوط کئے ہوئے ہو۔ مگر موت اس فریب کو مکمل طور پر ڈھا دے گی۔ اس کے بعد اچانک یہ معلوم ہوگا کہ وہی شخص مضبوط بنیادوں پر کھڑا ہوا تھا جس کو دنیا والوں نے بے بنیاد سمجھ لیا تھا اور وہ تمام لوگ بالکل بے حقیقت تھے جو موت سے پہلے کے حالات میں بظاہر عزت اور ترقی کی بلندیوں پر بیٹھے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ موت ہر چیز کو باطل کر دے گی اور اس کے بعد وہی چیز بچے گی جس کی عالم آخرت میں کوئی قیمت ہو ـــــــ انسان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ ہر آن موت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہم چند سال (زیادہ سے زیادہ چند سال) موجودہ دنیا میں زندگی گزار کر موت کے بعد والی دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اس دوسری دنیا میں کامیاب ہونا ہی حقیقی کامیابی ہے اور وہاں ناکام ہونا ہی حقیقی ناکامی۔ ■

وہ جنت کو چھوڑ کر جہنم کو لے رہے ہیں

إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنُّوا بِهَا وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُونَ أُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ يَهْدِيهِمْ رَبُّهُم بِإِيمَانِهِمْ تَجْرِي مِن تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ

(یونس ۹ - ۷)

جن لوگوں کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے اور وہ دنیا کی زندگی پر راضی ہو گئے ہیں اور اس میں جی لگا بیٹھے ہیں، اور جو ہماری نشانیوں سے بے پروا ہیں، ایسے لوگوں کا ٹھکانا آگ ہے ان کے اعمال کی وجہ سے۔ جو لوگ یقین لائے اور نیک کام کیا ان کا رب ان کے ایمان کی وجہ سے ان کو راہ دے گا جنت کی، ان کے نیچے نہریں جاری ہوں گی آرام کے باغوں میں۔

انسانوں کی ایک قسم وہ ہے جن کو دنیا کی چیزیں اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ پیسہ کے فریب میں ہوتے ہیں۔ ان کو نظر آتا ہے کہ پیسہ سب کچھ ہے، اس لئے وہ پیسہ کماتے اور اس کے مسائل سے نمٹنے میں محو رہتے ہیں۔ کچھ لوگ شہرت و عزت کے فریب میں ہوتے ہیں۔ ان کی دل چسپیوں کا مرکز و محور وہ چیزیں بن جاتی ہیں جن سے ان کی امیج بڑھے، جن سے ان کی عوامی تصویر میں اضافہ ہو۔ کچھ لوگ اقتدار کے فریب میں ہوتے ہیں۔ ان کی توجہ اپنے اقتدار کے مسائل میں لگی رہتی ہے۔ یہ تمام لوگ اپنی دنیوی زندگی میں اتنا گم ہو جاتے ہیں کہ ان کے ذہن و فکر کی تمام طاقتیں اسی پر لگ جاتی ہیں۔ وہ انھیں چیزوں کے اندر جینے لگتے ہیں۔ ان کو دنیا میں جو کچھ مل رہا ہے، اسی پر وہ راضی اور مطمئن ہو جاتے ہیں۔ ان کی یہ ذہنی کیفیت ان کو آخرت کی طرف سے غافل کر دیتی ہے۔ ان کی زندگی ایسی بن جاتی ہے جیسے انھیں اللہ سے ملاقات کا کھٹکا ہی نہ ہو، جیسے وہ اس اندیشہ سے خالی ہو گئے ہوں کہ ہار اور جیت، کامیابی اور ناکامی کا اصل فیصلہ اللہ کے یہاں ہونے والا ہے۔ ان کی غفلت یہاں تک بڑھتی ہے کہ خدا کے دلائل ان کے سامنے ظاہر ہوتے ہیں مگر وہ بے پروائی کے ساتھ ان کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ دنیا میں ان کے معاملات کا درست ہونا ان کو اس غلط فہمی میں ڈال دیتا ہے کہ کسی دلیل اور ثبوت پر ان کو دھیان دینے کی ضرورت نہیں۔ خدا کی بات لفظوں یا خاموش اشاروں کی صورت میں ہوتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں مال و جائداد، عزت و شہرت اور عہدہ و اقتدار ایسی مادی صورتوں میں ہوتے ہیں جن کے مزے کو وہ چکھ رہے ہوں، جن کی اہمیت کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ "حقیر" کو چھوڑ کر "بڑی چیز" کو لے رہے ہیں۔ مگر حقیقۃً وہ جنت کو چھوڑ کر جہنم کو لے رہے ہوتے ہیں۔ موجودہ دنیا میں ان کی مدہوشی ان کو یہ بات سمجھنے نہیں دیتی۔ مگر مرنے کے بعد جب وہ اپنے سامنے جہنم کو بھڑکتا ہوا دیکھیں گے، اس وقت ان کو معلوم ہو گا کہ دنیا میں وہ جو کچھ کر رہے تھے اس کی حقیقت آخرت کے اعتبار سے کیا تھی۔

اس کے برعکس معاملہ ان لوگوں کا ہے جو خدا پر اس وقت سے پہلے یقین لے آتے ہیں جب کہ وہ اپنی طاقتوں اور عظمتوں کے ساتھ ظاہر ہو جائے گا۔ ان کا یہ یقین ان کو صحیح اور درست رویہ پر قائم رکھتا ہے۔ وہ اپنی کوششوں اور سرگرمیوں

وآخرت کی بنیاد پر چلاتے ہیں نہ کہ دنیا کی بنیاد پر۔ اللہ پر ان کا یقین ان کی رہنمائی کرتا رہتا ہے۔ ان کا ایمان اور عمل صالح ان کو ان نفسیاتی پیچیدگیوں سے پاک کر دیتا ہے جو کسی معاملہ میں حق کے پہلو کو سمجھنے میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ جب اللہ کی کوئی نشانی ظاہر ہوتی ہے تو وہ اس کو پہچان لیتے ہیں۔ جب اللہ کی کوئی دلیل سامنے آتی ہے تو اس کی معقولیت کو سمجھنے میں انہیں دیر نہیں لگتی۔ جب خدائی اشارے اپنی خاموش زبان میں بولتے ہیں تو ان کے کان ان کو سننے کے لئے بہرے ثابت نہیں ہوتے۔ اس طرح ان کا زندہ ایمان ان کو خدائی راستہ پر چلاتا رہتا ہے، یہاں تک کہ ان کو جنت میں پہنچا دیتا ہے جہاں وہ خوشیوں کے سرسبز باغوں کے اندر بنے ہوئے بہترین مکانات میں ہمیشہ رہیں گے۔

انسان کے لئے صحیح راستہ یہ ہے کہ وہ اپنے رب کو پکڑے اور اس کی مرضی کے مطابق زندگی گزارے۔ مگر موجودہ دنیا میں آدمی کو اس طرح رکھا گیا ہے کہ خدا اس کے سامنے موجود نہیں ہے۔ یہاں خدا کا ظہور آیات کی صورت میں ہوا ہے۔ آخرت میں خدا اپنی بے حجاب صورت میں نمایاں ہوگا، حتیٰ کہ لوگ اس کو چاند اور سورج کی طرح دیکھیں گے۔ مگر موجودہ دنیا میں وہ دلائل اور نشانیوں کے ذریعہ اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔ یہاں آدمی کو خدا کی کتاب میں خدا کو پانا ہے۔ قدرت کے پھیلے ہوئے کرشموں میں خدا کو دیکھنا ہے۔ خدا کی طرف پکارنے والے انسانوں کی آواز میں خدا کی آواز کو سننا ہے، جو شخص اس طرح خدا کو پائے، اسی نے خدا کو پایا۔ وہی خدا کا مومن بنا۔

یہی موجودہ دنیا میں آدمی کا اصل امتحان ہے۔ اگرچہ یہ بڑا سخت امتحان ہے۔ یہ "غیب" کو شہود بنانا ہے۔ خدا کے ظاہر ہونے سے پہلے ہی اس طرح اس کا مومن بن جانا ہے جیسے کہ وہ اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ ظاہر ہو چکا ہے۔ لیکن اگر ایک بار آدمی اپنے آپ کو اس مقام پر پہنچا دے تو خدا اس کا ہاتھ تھام لیتا ہے۔ وہ اس کی رہنمائی اور مدد کے لئے اتر آتا ہے۔ خدا اس وقت تک ہم سے الگ کھڑا رہتا ہے جب تک ہم غیب کے پردہ سے گزر کر اس کی طرف نہ لپکیں۔ مگر جب ہم اس کی طرف لپکتے ہیں تو اس کے بعد وہ ہم سے الگ نہیں رہتا۔ اب وہ ہمارا ہم نشین بن جاتا ہے۔ "اب وہ مومن کی آنکھ بن جاتا ہے جس سے وہ دیکھتا ہے۔ وہ مومن کا ہاتھ بن جاتا ہے جس سے وہ پکڑتا ہے، وہ مومن کا پاؤں بن جاتا ہے جس سے وہ چلتا ہے" جو ایک بار خدا کا دامن پکڑ لے، خدا خود ضامن بن جاتا ہے کہ اس کے ہاتھ سے اب خدا کا دامن کبھی نہ چھوٹے گا، وہ کبھی اپنے رب سے محروم نہ ہوگا۔ الا یہ کہ اس نے خدا کا دامن نہ پایا ہو، وہ کسی اور دامن کو خدا کا دامن سمجھ بیٹھا ہو۔

"ان کا رب ان کے ایمان کی وجہ سے ان کو جنت تک پہنچا دے گا"۔ — اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت میں داخلہ کسی آدمی کو اپنے ایمانی وجود کی وجہ سے ملے گا نہ کہ اس کے ظاہری کمالات کی وجہ سے۔ جس شخص کی شعوری ہستی اور اس کا اندرونی انسان اس قابل پایا جائے گا کہ جنت کی لطیف اور نفیس دنیا میں اس کو بسایا جائے، اسی کو وہاں بسنے کا اجازت نامہ عطا ہوگا۔ جنت کی دنیا کا شہری وہی شخص بن سکے گا جو اپنے فکر و مزاج اور اپنے کیفیات و رجحانات کے اعتبار سے وہاں کی آبادکاری کے لئے موزوں ثابت ہو۔ جن لوگوں کے اندر یہ اعلیٰ "انسان" نہ پایا جائے گا ان کو جنت کے ماحول سے دور پھینک دیا جائے گا جہاں وہ ابد تک عذاب کے اندھیروں میں بھٹکتے رہیں گے — جنت طیب روحوں کی آبادکاری کا مقام ہے اور جہنم خبیث روحوں کا قید خانہ۔ ■

جب کائنات اپنا بیان دے گی

مجھے ایک بار لکھنؤ کے ایک علاقہ میں جانا ہوا جہاں آم کے باغات تھے۔ میں نے دیکھا کہ درختوں پر پھل لگے ہوئے ہیں مگر سب کے سب کالے ہو رہے ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ دھوئیں کی وجہ سے کالے ہو گئے ہیں۔ ان باغات کے پاس اینٹ کے بھٹے تھے جن کی چمنیوں سے ہر وقت کوئلہ کا دھواں نکلتا رہتا تھا۔ اس دھوئیں کی وجہ سے تمام پھل کالے ہو کر خراب ہو گئے۔ ان کی بڑھوتری رک گئی۔ وہ منڈی میں بھیجنے کے قابل نہ رہے۔

یہی اس دنیا کی تمام چیزوں کا حال ہے۔ دنیا کے بنانے والے نے اس کو نہایت حکمت کے ساتھ بنایا ہے۔ اس کی ہر چیز بے حد نازک اور لطیف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات ایک انتہائی بامعنی کارخانہ ہے۔ وہ کسی ایسی چیز کو قبول نہیں کرتی جو اس کے مزاج کے خلاف ہو، جو اس کی تخلیقی اسکیم کے مطابق نہ ہو۔ مگر کائنات کے سب سے زیادہ سرسبز اور قیمتی حصہ پر انسان ہر وقت ظلم و فساد جاری کئے ہوئے ہے۔ حق کے نام پر حق کو قتل کیا جا رہا ہے۔ اور کائنات اپنی تمام معنویت کے باوجود خاموش کھڑی ہوئی ہے۔ وہ زمین پر سب کچھ ہوتے ہوئے دیکھتی ہے مگر اس کے بارے میں اپنا کوئی بیان نہیں دیتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے خدا نے ایک مقرر مدت تک کے لئے اس کو روک رکھا ہے۔ جب یہ مدت ختم ہو گی تو اچانک وہ بول پڑے گی۔ اس وقت وہ سب کچھ کہہ ڈالے گی جس کو آج وہ دیکھتی ہے مگر نہیں کہتی۔

آدمی اپنے اقتدار کی سیاست چلاتا ہے اور اس کو خدا کی سیاست کا نام دیتا ہے۔ وہ مکمل اصلاح کے نفاذ کا نعرہ لگاتا ہے اور جب آزمایا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ جزئی اصلاح پر بھی قائم نہیں۔ وہ اپنے پڑوسی کو ستاتا ہے اور دور کے ظالم کے خلاف جھنڈا لے کر کھڑا ہوتا ہے۔ وہ اپنی انا کی پرستش میں لگا ہوتا ہے اور دوسرے کی انانیت اور تعصب کا اعلان کرنے کے لئے اسٹیج سجاتا ہے۔ وہ مفاد پرستی اور استحصال میں غرق ہوتا ہے اور انصاف اور انسانیت کے عنوان پر تقریریں کرتا ہے۔ وہ ضد اور نفرت اور انتقام کے تحت کارروائی کرتا ہے اور زبان سے یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ صرف حق کے لئے ایسا کر رہا ہے۔ وہ اپنے بدترین شیطانی کاموں کو بیان کرنے کے لئے بھی نہایت خوب صورت الفاظ پا لیتا ہے۔ یہ سب کچھ انسانی دنیا میں ہو رہا ہے اور کائنات اپنی تمام نفاست اور لطافت کے باوجود چپ رہتی ہے۔ وہ سچ کو سچ نہیں کہتی اور جھوٹ کے جھوٹ ہونے کا اعلان نہیں کرتی۔

کیا کائنات کے اندر تضاد ہے، کیا یہ ایک گونگی کائنات ہے۔ جس کائنات کے پاس سریلے نغمے بکھیرنے والی چڑیاں ہوں، کیا اس کے پاس حق کا اعلان کرنے کے لئے زبان نہیں۔ قرآن اس سوال کا جواب دیتا ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ کائنات کی یہ خاموشی اس لئے ہے کہ خدا نے اس کو قیامت کے آنے تک خاموش رہنے کا حکم دے رکھا ہے۔ جیسے ہی صور پھونکا جائے گا تمام زبانوں کی مہریں ٹوٹ جائیں گی۔ اس وقت ساری کائنات ایک عظیم الشان ٹیپ ریکارڈ بن جائے گی اور پھر خدا کے گواہ کی حیثیت سے وہ سب کچھ بتائے گی جو حق اور عدل کے مطابق اسے بتانا چاہئے۔ اس وقت لوگوں کو معلوم ہو گا کہ جس کائنات کے پاس رات کو دن بنا دینے والا سورج تھا اس کے پاس یہ بھی انتظام تھا کہ تاریکی میں چھپے ہوئے اعمال کو اجالے میں لا سکے۔

حقیقی دین داری کیا ہے؟

ولكل امة جعلنا منسكا ليذكروا اسم الله على ما
رزقهم من بهيمة الانعام فالٰهكم اله واحد
فله اسلموا وبشر المخبتين الذين اذا ذكر الله
وجلت قلوبهم والصابرين على ما اصابهم والمقيمي
الصلوٰة ومما رزقنٰهم ينفقون والبدن جعلنٰها لكم
من شعائر الله لكم فيها خير فاذكروا اسم الله عليها
صواف فاذا وجبت جنوبها فكلوا منها واطعموا
القانع والمعتر كذٰلك سخرنٰها لكم لعلكم تشكرون
لن ينال الله لحومها ولا دماؤها ولكن يناله
التقوىٰ منكم كذٰلك سخرها لكم لتكبروا الله علىٰ
ما هدٰكم وبشر المحسنين

(حج ۳۷-۳۴)

اور ہر امت کے لئے ہم نے قربانی کرنا مقرر کیا تاکہ وہ اللہ کا نام لیں ان چوپایوں پر جو اس نے ان کو دئے ہیں۔ اللہ ہی تمھارا ایک اللہ ہے، تم اسی کے ہوکر رہو اور خوش خبری دے دو عاجزی کرنے والوں کو۔ وہ لوگ کہ جب اللہ کو یاد کیا جائے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور وہ سہنے والے ہیں جو ان پر پڑے۔ اور نماز قائم رکھنے والے ہیں اور ہمارے دئے میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور قربانی کے جانور کو ہم نے تمھارے لئے اللہ کی نشانی بنایا ہے۔ اس میں تمھارا بھلا ہے۔ پس تم ذبح کے وقت ان پر اللہ کا نام لو۔ جب وہ ذبح ہو جائیں تو تم خود بھی کھاؤ اور بے سوال کو اور سوال کرنے والے کو کھلاؤ۔ ہم نے ان جانوروں کو تمھارے تابع کر دیا ہے تاکہ تم شکر کرو۔ اللہ کو ان کا گوشت اور ان کا خون نہیں پہنچتا۔ اس طرح ہم نے ان جانوروں کو تمھارے بس میں کر دیا ہے تاکہ تم اللہ کی بڑائی کرو اس پر کہ اس نے تم کو راہ سجھائی اور خوش خبری دے دو نیکی کرنے والوں کو۔

ایک شخص ہے، اس نے قیمت دے کر ایک جانور خریدا اور قربانی کے دن منتر کی طرح کچھ رٹے ہوئے جملوں کو پڑھ کر اس کو ذبح کر دیا۔ گوشت کا کچھ حصہ خود کھایا، کچھ دوسروں کو دے دیا۔ خریداری کے وقت سے لے کر گوشت کھانے تک قربانی کے نام سے جو چیز اس نے جانی وہ بس ایک جانور تھا یا اس کا گوشت و خون۔ اس کی روح نے اس کے سوا کسی اور چیز کا تجربہ نہیں کیا۔

دوسرا شخص وہ ہے جس نے فدائیت کے جذبہ سے ایک جانور لیا۔ جب وہ اس کو مذبح کی طرف لے کر چلا تو اس کا دل کہہ رہا تھا: خدایا! میں جانور کو نہیں خود اپنے آپ کو تیری طرف لے کر آرہا ہوں۔ جب اس نے جانور کو مقررہ طریقہ پر ذبح کیا تو اس کی زبان سے نکلا: "خدایا! یہ میری اپنی جان کا ہدیہ ہے جو میں جانور کی جان کی صورت میں تجھ کو پیش کر رہا ہوں۔ تو اس کو قبول کرلے" جانور کی قربانی کے معاملہ نے اس کو اس قربانی کے معاملہ کو یاد دلایا جو بندے کی طرف سے خالق کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے اور جانور کی قربانی اس کی صرف ایک ظاہری علامت ہے۔ قربانی کے دوران اس کا دل پگھلتا رہا۔ اس کی آنکھیں آنسو بہاتی رہیں۔ قربانی اس کے اندر نرمی پیدا کرکے ہر قسم کے برے جذبات کو نکالتی رہی۔ وہ کبر، عداوت، انتقام اور خود نمائی کے جذبات کو اللہ کے لئے قربان کرتا رہا ——— جو شخص گوشت اور خون کی سطح پر رہا اس نے گویا اپنے اللہ کو قربانی کا صرف گوشت اور خون بھیجا اور جو شخص قربانی کے دوران تقوی کا تجربہ کرتا رہا اس نے گویا اپنے اللہ کو قربانی کا تقویٰ بھیجا۔ اور تقویٰ ہی وہ چیز ہے

جو اللہ کو اپنے بندوں سے مطلوب ہے، اس کو ہمارے گوشت اور خون کی ضرورت نہیں۔

یہی معاملہ پورے دین کا ہے۔ دین کا ایک "گوشت اور خون" ہے اور دین کا ایک "تقوی" ہے۔ ایک اس کا چھلکا ہے اور ایک اس کا مغز ہے۔ اللہ کو مغز کی ضرورت ہے نہ کہ چھلکے کی۔ جو لوگ چھلکے کی سطح پر دین کو پائیں، انھوں نے ایسے دین کو پایا جو دنیا کی زندگی میں خواہ دین نظر آئے مگر آخرت میں خدا کے یہاں اس کی کوئی قیمت نہ ہوگی۔ آخرت میں انھیں لوگوں کا دین قیمت والا ہوگا جنھوں نے مغز کی سطح پر دین کو پایا ہو۔

کچھ لوگ ایمان اور ذکر اور تلاوت اور نماز کا چرچا کرتے ہیں اور اس میں مشغول ہوتے ہیں۔ بظاہر وہ اچھا دینی کام کر رہے ہیں لیکن اگر ان کا حال یہ ہو کہ ایمان ان کے لئے زبان سے کچھ الفاظ بول دینے کا نام ہو۔ ذکر یہ ہو کہ گنتی کا ایک نصاب مقرر کیا جائے اور کچھ مقرر الفاظ کو اس کے مطابق صبح و شام دانوں پر شمار کر لیا جائے۔ تلاوت کا مطلب ان کے لئے یہ ہو کہ کتاب اللہ کے الفاظ کو، کسی غور و فکر کے بغیر، محض مخارج کی صحت کے ساتھ دہرا لیا جائے۔ نماز سے ان کو جو چیز ملے وہ بس یہ ہو کہ مقررہ وقت پر کچھ مقررہ اعمال کو اعضاء و جوارح کے ذریعہ ادا کر لیا۔ اگر ان کا حال یہ ہو تو گویا انھوں نے دین کے نام پر "گوشت اور خون" کا تحفہ اپنے رب کو بھیجا، وہ تقویٰ کا تحفہ اس کو نہ بھیج سکے۔ اور معلوم ہے کہ اللہ کو تقویٰ کا تحفہ مطلوب ہے نہ کہ گوشت اور خون کا۔

اسی طرح کچھ لوگ مکمل اسلامی نظام کے نفاذ کا نعرہ لگائیں۔ مگر ان کا مکمل اسلام عملاً جس چیز کا نام ہو وہ یہ کہ کوڑے اور پھانسی کی سزائیں جاری کی جائیں۔ اور اسی طرح کے کچھ اور حکومتی قوانین کے اجراء کا اعلان کر دیا جائے۔ ان کا مکمل اسلام ان کو بس خارجی اور ظاہری چیزیں دے۔ وہ ان کو نہ اللہ کی قربت کا تجربہ کرائے اور نہ دل کی گھلاوٹ کا۔ وہ نہ آدمی کو کبر اور انانیت سے خالی کرے اور نہ انتقام اور عداوت کے جذبات سے۔ وہ نہ ان کو نفسیاتی پیچیدگیوں سے بلند انسان بنائے اور نہ یہ مزاج بنائے کہ وہ دوسروں کے لئے وہی پسند کریں جو خود اپنے لئے پسند کرتے ہیں۔ وہ دوسروں پر شرعی سزائیں نافذ کرنے کا نعرہ لگائیں مگر خود لفظی تنقید کو بھی برداشت نہ کریں۔ ان کے اندر حقیقی معنوں میں نہ خدا کا خوف ابھرے اور نہ بندوں کی خیر خواہی۔ اگر ایسا ہو تو کہا جائے گا کہ انھوں نے اسلامی نظام کا صرف "گوشت اور خون" پایا ہے، اسلامی نظام کا "تقوی" پانے میں وہ ناکام ثابت ہوئے ہیں۔

اسی طرح جو لوگ دین کی ان شکلوں پر دوڑیں جن میں عوامی بھیڑ جمع ہوتی ہے۔ جن سے چندے اور نذرانے وصول ہوتے ہیں۔ جن سے سستی قیادت حاصل ہوتی ہے جن سے اخباری شہرت ملتی ہے، جن سے اعزازات اور مناصب کے دروازے کھلتے ہیں۔ جن کے ذریعہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی ایک شاندار جلسہ میں معزز مہمان بن کر جائے اور ایک لفظی تقریر کر کے خدمت اور عمل کا کریڈٹ حاصل کرلے۔ ایسے لوگ "گوشت اور خون" کی سطح پر دین داری دکھا رہے ہیں۔ جب کہ تقویٰ کی سطح پر دینداری یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو توڑے اور سچائی کے آگے اپنے کو جھکائے۔ خدا کو اشتہاری دین داری مطلوب نہیں ہے بلکہ وہ دینداری مطلوب ہے جو تقریری اسٹیج پر نہیں بلکہ خاموش عمل کے میدان میں ہوتی ہے۔ جہاں آدمی دوسرے سے زیادہ اپنے آپ کو دیکھتا ہے۔ جب وہ نفس پر چوٹ برداشت کرتے ہوئے دوسرے کو اس کا حق ادا کرتا ہے۔

خوش خیالیاں حقیقت کا بدل نہیں بن سکتیں!

سڑک پر مجمع ۲۱ نمبر کی بس کا انتظار کر رہا تھا۔ اتنے میں ایک بس آتی دکھائی دی اور سارے لوگ اس کی طرف دوڑ پڑے۔ "اوہ! یہ تو ۱۲ نمبر کی بس ہے"۔ بورڈ دیکھ کر ایک شخص بولا۔ "۱۲ کو ۲۱ کر لو اور چلے جاؤ" دوسرے نے کہا۔

ظاہر ہے کہ یہ صرف مذاق تھا۔ کوئی شخص ایسا نہیں کرے گا کہ کھریا مٹی لے کر بس پر اپنا مطلوبہ نمبر لکھے اور اس پر بیٹھ کر سمجھے کہ اب وہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا ہے۔ یہ ہندسہ کا فرق نہیں، حقیقت کا فرق تھا۔ اور حقیقت کے فرق کو ہندسہ کے فرق سے بدلا نہیں جا سکتا ——— یہ بات اپنی ذاتی زندگی کے معاملات میں ہر شخص جانتا ہے، مگر عجیب بات ہے کہ ملت کے رہنما جب ملت کا مسئلہ حل کرنے کے لئے اٹھتے ہیں تو وہاں وہ اس انتہائی معلوم حقیقت کو بھول جاتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ وہ چاہتے ہیں کہ ہندسہ کو بدل کر وہ اس کام کا کریڈٹ حاصل کر لیں جو صرف حقیقت کو بدلنے کے نتیجہ میں کسی کو ملتا ہے۔

ایک ایسا سماج جہاں امتیاز اور لیاقت کی بنیاد پر لوگوں کو درجات ملتے ہیں، ہم مراعات اور تحفظات کے عنوان پر کانفرنس کر رہے ہیں۔ ایک ایسا نظام جہاں علمی اور اقتصادی طاقت کے بل پر قوموں کے فیصلے ہوتے ہیں، ہم احتجاج اور مطالبات کے پوسٹر دیواروں پر چپکا رہے ہیں۔ ایک ایسی دنیا جہاں زبان و بیان نے بالکل نیا انداز اختیار کر لیا ہے، ہم اپنے روایتی کتب خانہ کے بورڈ پر "دور جدید" کا لفظ لکھنے کے لئے آرٹسٹ کی خدمات حاصل کر رہے ہیں۔ ایک ایسا زمانہ جہاں عالمی ذہن نے سیاست کو سیکولر بنیادوں پر قائم کرنے کا فیصلہ کر رکھا ہے، ہم عوام کا ذہن بدلے بغیر بیلٹ بکس سے اسلامی نظام برآمد کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ ایک ایسی آبادی جہاں اختلاف اور شکایت کے گہرے مادی اسباب موجود ہیں، ہم لفظی تقریروں کے کرشمے دکھا کر حالات کو درست کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ ایک ایسے معاشرہ میں جہاں ہم تعلیم، اقتصادیات، باہمی اتحاد ہر لحاظ سے تمام گروہوں میں سب سے پیچھے ہیں، ہم جلسوں اور کنونشنوں کے ذریعہ ملک کی قسمت بدلنے کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ ایک ایسا جغرافیہ جہاں ہمارے پاس اپنے تحفظ کی بھی طاقت نہیں، ہم "حریف کو نقصان پہنچاؤ" کا طریق کار اختیار کر کے باعزت زندگی حاصل کرنے کی تجویزیں پیش کر رہے ہیں۔ اس قسم کی تمام باتیں اسی طرح بے معنی ہیں جس طرح ۱۲ نمبر کی بس پر ۲۱ نمبر لکھ کر اپنی منزل کی طرف شروع کرنا۔ ■

دنیا میں مخلص افراد کی کمی نہیں۔ مگر زمین کی پیٹھ شاید ایسے لوگوں سے خالی ہے جو دوسروں کے ساتھ انصاف کرنا جانتے ہوں۔ آدمی اپنے اخلاص میں اتنا گم ہے کہ اس کو دوسرے کے اخلاص کی خبر نہیں۔ اور اگر دوسرے کی طرف سے کوئی اتفاقی تکلیف پہنچ جائے یا کوئی شکایت کی بات ہو جائے، جو اجتماعی زندگی میں بالکل فطری ہے، تو اس کے بعد آدمی کا حال عجیب ہو جاتا ہے۔ دوسرے شخص کا برا ہونا اور خود اپنا برسرِ حق ہونا اس کے لئے اتنا یقینی بن جاتا ہے کہ کوئی بھی دلیل یا کوئی بھی وضاحت اس کے دل کو صاف کرنے میں کامیاب ثابت نہیں ہوتی۔ خوش گمانی کی تمام قسموں کو وہ اپنے لئے خاص کر لیتا ہے اور بدگمانی کی تمام قسموں کو دوسروں کے لئے۔ (۶ مارچ ۱۹۷۹) ■

خدا کا سرا اس وقت آدمی کے ہاتھ آتا ہے جب خدا کی طرف بڑھنے میں دنیا کے سرے اس سے چھوٹ گئے ہوں

حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق کے شہر اُر میں پیدا ہوئے۔ مخالفین نے جب وہاں رہنا آپ کے لئے ناممکن بنا دیا تو آپ اللہ کے حکم سے عرب کے صحرا میں پہنچے اور مکہ میں بیت اللہ کی تعمیر کی جو اس وقت ایک غیر آباد مقام تھا۔ اس موقع پر آپ کی زبان سے جو دعائیں نکلیں ان میں سے ایک یہ تھی :

ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتک المحرم۔ ربنا لیقیموا الصلوٰة فاجعل افئدة من الناس تهوی الیهم وارزقهم من الثمرات لعلهم یشکرون۔ ربنا انک تعلم ما نخفی وما نعلن وما یخفی علی اللہ من شیئ فی الارض ولا فی السماء (ابراہیم ۳۸)

اے ہمارے رب میں نے اپنی اولاد کو تیرے محترم گھر کے پاس ایک میدان میں بسا دیا ہے جہاں کھیتی نہیں۔ اے ہمارے رب تاکہ وہ نماز قائم رکھیں۔ پس تو کچھ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اور ان کو روزی دے میووں سے۔ تاکہ وہ شکر کریں۔ اے ہمارے رب تو جانتا ہے جو ہم چھپاتے ہیں اور جو ہم ظاہر کرتے ہیں، اور اللہ سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں نہ زمین میں اور نہ آسمان میں

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کا یہ واقعہ ایک علامتی واقعہ ہے۔ یہ تاریخ کی زبان میں بتا رہا ہے کہ ایک بندۂ خدا کے ساتھ اس وقت کیا پیش آتا ہے جب کہ وہ بے آمیز حق کی دعوت کو لے کر کھڑا ہو جائے ــــــــ وقت کے قائم شدہ نظام میں وہ بے جگہ ہو جاتا ہے، مذہبی ادارے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے اس میں کوئی کشش باقی نہیں رہتی۔ دنیا کی ذی زرع وادیاں، اپنی تمام سرسبزی کے باوجود، اس کے لئے خشک ہو جاتی ہیں۔ وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ اپنے بیوی بچوں کو لے کر بے آب و معاشیات کی ایک زمین میں جا بسے اور اپنے رب سے کہے کہ : خدایا! تیرے سوا ان کا کوئی سہارا نہیں۔ انسانوں کی بنائی ہوئی دنیا نے ان کو رزق دینے سے انکار کر دیا ہے۔ اب تو ان کے قدموں کے نیچے سے ان کے لئے رزق کے چشمے جاری کر دے۔ یہ تاریخ انسانی کا نازک ترین لمحہ ہوتا ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب کہ کائنات کی نبض رک جاتی ہے۔ زمین و آسمان کی گردشیں نئے حکم کا انتظار کرنے لگتی ہیں۔ انسانی تاریخ نئے تجربہ سے متعارف ہوتی ہے: بیابان میں "چشمے" پھوٹ پڑتے ہیں۔ چھتیں پھاڑ کر خدا کے خزانے اترتے ہیں۔ داعی کی آواز ہواؤں کے دوش پر پھیلنے لگتی ہے۔ خدا اپنی طاقتوں کے ساتھ اپنے ان بندوں کی مدد پر اتر پڑتا ہے جن کو بے حقیقت سمجھ کر دنیا والوں نے اپنی مدد سے محروم کر دیا تھا۔ بے آمیز دعوت کا کام اس آسمان کے نیچے سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔ مگر یہی وہ کام ہے جو خدا کی مدد کو سب سے زیادہ کھینچنے والا ہے۔ اگرچہ یہ مدد اس وقت آتی ہے جب کہ دعوت کا اظہار اور اس کی پاداش میں داعی کی مظلومی، دونوں اپنی آخری انتہا پر پہنچ چکے ہوں۔

آدمی اگر اپنے آپ سے باخبر ہو جائے تو وہ
زیادہ بہتر طور پر خدا سے باخبر ہو سکتا ہے

آدمی اگر اپنے آپ کو موت کے کنارے کھڑا ہوا پائے تو وہ
زیادہ بہتر طور پر زندگی کا مقام حاصل کر سکتا ہے

آدمی اگر اصلاح کا آغاز اپنے آپ سے کرے تو وہ
زیادہ بہتر طور پر دوسرے کی اصلاح کر سکتا ہے

آدمی اگر چھوٹے مقاصد کو اپنا نشانہ بنائے تو وہ
زیادہ بہتر طور پر بڑے مقاصد تک پہنچ سکتا ہے

آدمی اگر یہ جان لے کہ اس کو چپ رہنا چاہئے تو وہ
زیادہ بہتر طور پر بولنے والا بن سکتا ہے۔

آدمی اگر لڑائی کے میدان سے ہٹ جائے تو وہ
زیادہ بہتر طور پر اپنی لڑائی کو جیت سکتا ہے

آدمی اگر اپنی غلطی کا اعتراف کرلے تو وہ
زیادہ بہتر طور پر اپنے آپ کو صحیح ثابت کر سکتا ہے

آدمی اگر اپنے جاہل ہونے کا اقرار کرلے تو وہ
زیادہ بہتر طور پر اپنے عالم ہونے کا ثبوت دے سکتا ہے

آدمی اگر خود اپنے امکانات کو بروئے کار لانے کے لئے سرگرم ہو تو وہ
زیادہ بہتر طور پر اس چیز کو پالے جس کو وہ دوسروں سے مانگ کر پانا چاہتا ہے

آدمی اگر جہنم کے شعلوں کو دیکھ لے تو وہ
زیادہ بہتر طور پر جنت کے باغوں کو دیکھ سکتا ہے

زیادہ بہتر طور پر

جب عقل چھین لی جائے

کہاجاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک بار دعا کی کہ "خدایا! میری قوم سے سب کچھ چھیننا مگر عقل نہ چھیننا"۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا "اے موسیٰ! جب ہم کسی سے چھیننے والے ہوتے ہیں تو اس کی عقل ہی تو سب سے پہلے چھینتے ہیں"۔

اللہ کا یہ فیصلہ جب کسی قوم پر نافذ ہوتا ہے تو اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کی تمام کارروائیوں پر بے عقلی چھا جاتی ہے۔ اس کا ہر فرد اس طرح بولتا ہے جیسے اس کو یہ ابتدائی اصول بھی معلوم نہ ہو کہ آدمی کو چاہئے کہ بولے تو بھلی بات بولے ورنہ چپ رہے۔ اس کے مقررین ایسی تقریریں کرتے ہیں جیسے انھیں خبر ہی نہ ہو کہ تقریر کا مطلب ہے بامعنی کلام سنانا نہ کہ کچھ الفاظ فضا میں بکھیرنا۔ اس کے عمل کرنے والے اس طرح عمل کرنے لگتے ہیں جیسے ان کو پتہ ہی نہ ہو کہ عمل کا مطلب ہے کوئی نتیجہ خیز کام کرنا نہ کہ محض لاحاصل اکھیڑ پچھاڑ کرنا۔ اس کے لیڈر ایسی سیاستیں چلاتے ہیں جیسے وہ جانتے ہی نہ ہوں کہ سیاست ایسی کوشش کا نام ہے جو سماج میں اصلاح لائے نہ کہ فساد اور بگاڑ پیدا کرے۔ اس کے اہل قلم ایسی تحریریں لکھتے اور چھاپتے ہیں جیسے ان کو اس بات کا شعور ہی نہ ہو کہ ایک قابل مطالعہ چیز پیش کرنے کا نام لکھنا ہے نہ کہ کچھ سطریں تیار کر کے چھاپ دینا۔ وہ اپنے حقوق کے لئے ایسی مطالباتی مہمیں چلاتے ہیں جیسے وہ اس حقیقت سے بالکل بے خبر ہوں کہ عمل سے استحقاق پیدا ہوتا ہے نہ کہ گدھے کی طرح چیخنے چلانے سے ــــــ ایسے لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں مگر اپنے مشاہدہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں جیسے انھوں نے نہیں دیکھا۔ وہ اپنے کانوں سے سنتے ہیں مگر سنی ہوئی بات کو اس طرح دہراتے ہیں جیسے انھوں نے نہیں سنا۔ وہ پڑھتے ہیں مگر پڑھی ہوئی چیز پر اپنا ردعمل اس طرح ظاہر کرتے ہیں جیسے انھوں نے نہیں پڑھا۔ حتیٰ کہ ان کا حال جانوروں کا سا ہو جاتا ہے کہ جو بظاہر آنکھ اور کان اور دل رکھتے ہیں۔ مگر ان کو کسی بات کی خبر نہیں ہوتی۔ یہی لوگ ہیں جن کے بارے میں قرآن میں کہا گیا ہے:

لهم قلوب لا يفقهون بها ولهم اعين لا يبصرون بها ولهم آذان لا يسمعون بها اولئك كالانعام بل هم اضل اولئك هم الغفلون

(اعراف ١٧٩)

ان کے دل ہیں جن سے وہ نہیں سمجھتے۔ ان کے آنکھیں ہیں جن سے وہ نہیں دیکھتے۔ ان کے کان ہیں جن سے وہ نہیں سنتے۔ وہ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ وہ ان سے بھی زیادہ بے راہ ہیں۔ یہ غافل لوگ ہیں۔

جب کوئی قوم اس سطح پر پہنچ جائے تو کوئی دلیل اس کو دلیل نظر نہیں آتی۔ دلیل کا وزن آدمی اپنی عقل سے سمجھتا ہے اور عقل کو کھو کر وہ پہلے ہی اس سے محروم ہو چکا ہے۔ کھلے کھلے دلائل کے مقابلہ میں وہ ایسے الفاظ کا سہارا پالے گا جو اس کے اپنے ذہن سے باہر اپنی کوئی قیمت نہ رکھتے ہوں۔ اس کے منصوبوں کا غلط ہونا تجربات سے بالکل ثابت ہو رہا ہوگا مگر بدترین ناکامی سے دوچار ہونے کے بعد وہ اسی ناقص منصوبہ کو ازسرنو دہرانے کے لئے کھڑا ہو جائے گا۔ کوئی معقول بات اس کی سمجھ میں نہ آئے گی۔ کیوں کہ کسی بات کی معقولیت کو سمجھنے کے لئے عقل کی ضرورت ہے۔ البتہ غیر معقول بات کو وہ خوب سمجھے گا کیوں کہ اس کو سمجھنے کے لئے بے عقلی کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔

ہماں ورق کہ سیہ گشتہ مدعا ایں جا است

قرآن کو خالی الذہن ہو کر پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی دعوت کا اصل نکتہ آخرت ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ موجودہ زمانہ میں جو بے شمار اسلامی تحریکیں اٹھیں، ان میں سے کسی تحریک نے بھی "انذار آخرت" کو اپنی دعوت کا بنیادی نکتہ نہیں بنایا۔ روایتی طور پر بلاشبہ ہر تحریک میں آخرت کا لفظ شامل رہا۔ مگر ایسا کسی تحریک میں نظر نہیں آتا کہ اس نے آخرت کے انتباہ کو اپنا نصب العین قرار دیا ہو اور یہی فکر اس کی تمام سرگرمیوں پر چھایا ہوا ہو۔ ۱۹۶۰ میں ایک بڑی اسلامی جماعت کا سالانہ اجتماع ہوا۔ اس موقع پر جماعت کے ذمہ دار اعلیٰ نے جو صدارتی تقریر کی، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے راقم الحروف نے لکھا تھا:

ایک جلسۂ عام کے موقع پر اسلامی تحریک کا تعارف کرنے کے لئے آپ خطبہ صدارت تیار کرتے ہیں جس میں شروع میں بتایا جاتا ہے کہ دعوت اسلامی کے تین نکات ہیں ——— خدا، آخرت، رسالت۔ مگر اس کے بعد " دنیا میں جو کچھ بگاڑ پایا جاتا ہے اس کا حقیقی سبب ان بنیادی باتوں سے انحراف ہے " کے فقرہ سے جو گریز شروع ہوتا ہے تو چالیس صفحات کا کا پورا خطبہ مسائل ملکی کی نذر ہو جاتا ہے اور کہیں بھی یہ بتانے کی نوبت نہیں آتی کہ مرنے کے بعد بھی تمہارا کوئی مسئلہ ہے جس سے تمہیں ڈرنا چاہئے۔ البتہ تقریر ختم ہونے لگتی ہے تو پھر روایتی ذہن مجبور کرتا ہے کہ اس قسم کا ایک فقرہ رکھ دیا جائے ——— "مومن کا اول و آخر مقصد رضائے الٰہی اور فوز آخرت ہے"۔ آپ کے اس طویل لفظی مجموعہ پر بے شک میں کوئی منطقی اعتراض نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ اس میں دنیا اور آخرت کی تمام کامیابیوں کو اسلام کی فہرست میں شامل کر دیا گیا ہے۔ مگر پوری تقریر پڑھ کر ہر آدمی سمجھ سکتا ہے کہ داعی کس بات سے لوگوں کو ڈرانا چاہتا ہے اور اس کے اوپر کیا چیز سوار ہے۔ ملک کے لسانی جھگڑے اور معاشی قضیئے اس کو نظر آتے ہیں۔ یا وہ دیکھ رہا ہے کہ اسرافیل صور لئے کھڑے ہیں اور اس بات کے منتظر ہیں کہ کس وقت حکم ہو اور پھونک مار کر دنیا کو تہ و بالا کر دیں۔ (تعبیر کی غلطی، مطبوعہ ۱۹۶۳، صفحہ ۳۲۰)

اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اسلامی تحریکوں کی کثرت کے باوجود وہ افراد نہیں پیدا ہو رہے ہیں جو اسلام کا اصل مقصود ہیں۔ آج اسلام کے جھنڈے ہر طرف لہرا رہے ہیں، لاؤڈ اسپیکر پر اسلامی الفاظ کا غلغلہ بلند ہے۔ اسلام کے نام پر سارے عالم میں آمد و رفت کا طوفان جاری ہے اسلامی جلسوں اور اسلامی کانفرنسوں کے شور سے زمین کی فضائیں معمور ہو رہی ہیں۔ پھر بھی مسلمان مغلوب ہیں۔ اس کے باوجود اسلام کا احیاء نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ کیا ہے۔

اس کی وجہ صرف ایک ہے، اسلام کا غلبہ اسلام کے الفاظ بولنے سے نہیں ہوتا بلکہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ اللہ سے ڈرنے والے لوگ پیدا ہو جائیں۔ اور یہی وہ چیز ہے جس کا تمام ہنگاموں کے باوجود کہیں پتہ نہیں۔ خدا کی بھری ہوئی زمین میں وہ انسان کہیں دکھائی نہیں دیتا جو خدا کے خوف سے کانپتا ہو، خدا کے تصور سے جس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہوں جس نے خدا کی بڑائی کے مقابلہ میں اپنے کو پست کر رکھا ہو۔ قیامت کے اندیشہ نے جس کی نیند اڑا رکھی ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارے لوگ ظاہری زندگی کی سطح پر جی رہے ہیں۔ آخرت کی سطح پر جینے والے اتنے نایاب ہیں کہ شاید اب ان کا کہیں وجود ہی نہیں۔ مکان کے چرچے ہوں مگر اینٹ موجود نہ ہو تو مکان کس طرح بن جائے گا (۱۰ مارچ ۱۹۷۹) ■

غیر اسلام کو اسلام کے نام پر کرنا

عباسی دور میں جب عقلی علوم مسلمانوں میں پھیلے تو ایک طبقہ اس کا سخت مخالف ہوگیا۔ اس زمانہ میں یہ فقرہ ضرب المثل بن گیا تھا: من تمنطق فقد تزندق (جس نے منطق سیکھی وہ زندیق ہوگیا) اسی طرح انیسویں صدی میں جب مغرب کے علوم اسلامی ملکوں میں داخل ہوئے اور لوگوں نے اس سے دلچسپی لینا شروع کیا تو ایک ازہری شاعر نے کہا:

ومن یقل بالطبع او بالعلة　　　فذاك كفر عند اهل الملة

سید جمال الدین افغانی ۱۸۷۱ میں مصر آئے تو ازہر کے بہت سے طلبہ ان کے پاس آنے لگے۔ ان کے غیر روایتی انداز سے طلبہ بہت متاثر ہوتے تھے۔ انھیں میں سے ایک محمد عبدہ تھے جو اس زمانہ میں ازہر کے طالب علم تھے۔ وہ جمال الدین افغانی سے اس درجہ قریب ہوئے کہ کہا جاتا ہے کہ جس طرح افلاطون کے بغیر سقراط کا علم ناپید ہو جاتا کیونکہ اس نے اپنی کوئی کتاب نہیں چھوڑی تھی۔ اسی طرح مفتی محمد عبدہ کے بغیر جمال الدین افغانی بھی گم نام ہو جاتے کیونکہ انھوں نے بھی اپنے افکار کو کتاب کی شکل میں مرتب نہیں کیا۔ یہ کام ان کے بعد مفتی محمد عبدہ نے کیا۔

محمد عبدہ جب ازہر میں طالب کی حیثیت سے تھے اور جمال الدین افغانی کے پاس آتے جاتے تھے تو ازہر میں ان کے استادوں نے ان کو بدعقیدہ قرار دے دیا۔ حتی کہ طلبہ میں سے کسی نے ایک روز ایک شیخ کے پاس خبر پہنچائی کہ محمد عبدہ وضو کے بغیر عصر کی نماز پڑھ رہے ہیں۔ ان کے بارے میں بدگمانی اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ استاد موصوف نے یقین کرلیا اور طلبہ کی ایک جماعت بھیجی کہ جاؤ ان کو پکڑ لاؤ۔ یہ لوگ پہنچے تو محمد عبدہ نماز کے لئے نیت باندھے کھڑے تھے۔ ان لڑکوں نے ان کو نماز کی حالت ہی میں پکڑ لیا اور گھسیٹتے ہوئے شیخ کے پاس لائے۔ شیخ نے ان کی تعزیر کا حکم دیا اور لڑکوں نے مل کر انھیں مارا۔

جمال الدین الافغانی، از محمود ابوریہ، صفحہ ۹

مومن جنت کا ایک پھول ہے

ایمان یہ ہے کہ آدمی اتنا بےنفس ہو جائے کہ دوسروں کی طرف سے جب اس کے دل پر چوٹ لگے تو وہ اس کو برداشت کر سکے۔ اس کو اپنے ناقص ہونے کا اتنا زیادہ احساس ہو کہ دوسروں کی طرف سے کی جانے والی تنقید کو وہ برا نہ مانے، دوسروں کی طرف سے پیش آنے والی بےعزتی کو وہ نظر انداز کر دے۔ اس کا دل اتنا صاف ہو جائے کہ وہ دوسروں کی زیادتیوں پر ان کو معاف کر سکے ان کی باتوں کو بھلا دیا کرے، ان کے لئے اس کے دل سے دعائیں نکلتی ہوں۔ اسی کیفیت کا نام قرآن کی زبان میں قلب سلیم (شعراء ۸۹) ہے۔ جنت کی دنیا کے شہری وہی لوگ بنیں گے جو قلب سلیم کے مالک ہوں۔ جو اپنے آپ کو منفی جذبات اور ردعمل کی نفسیات سے اوپر نہ اٹھا سکیں، وہ گویا "کانٹوں" کی سطح پر جی رہے ہیں۔ ایسے لوگ "پھولوں" کے ہم نشین کس طرح بن سکتے ہیں۔ ■

● جدید انسان کا المیہ

سالزنسٹین (Alexander Solzhenitsyn) ایک روسی ناول نگار ہے۔ اپنے تنقیدی ذہن کی وجہ سے اس کو روس سے نکال دیا گیا۔ ۱۹۷۴ میں وہ سوئٹزرلینڈ پہنچا اور وہاں سے امریکہ آیا۔ اس وقت سے وہ امریکہ کے شمال مشرقی علاقہ میں مقیم ہے۔

جون ۱۹۷۸ میں سالزنسٹین کا ایک لکچر ہارورڈ یونیورسٹی میں ہوا۔ تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ روسی انسان کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ ایک قسم کی روحانی گھٹن (Suffocation of Spiritual Life) میں مبتلا ہے۔

● موسیقی کی اذیت

حال میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس کا نام ہے: "جدید موسیقی کی اذیت"

Henry Pleasants,
The agony of Modern Music

اس میں دکھایا گیا ہے کہ عام تصور کے برعکس، موسیقی انسان کے لئے نفسیاتی اور حیاتیاتی طور پر اذیت بخش زیادہ ہے اور مسرت بخش کم۔

● ۲۹ واں دن

لسٹر براؤن (Lester R. Brown) کی ایک کتاب حال میں چھپی ہے جس کا نام ہے:

The Twent, Ninth Day

(۲۹ واں دن) کتاب کا یہ نام ایک فرانسیسی پہیلی سے لیا گیا ہے۔ ایک حوض ہے جس میں سوسن (Lily) کے درخت ہیں۔ پہلے دن اس سوسن میں صرف ایک پتی ہے۔ دوسرے دن دو ہو جاتی ہیں۔ تیسرے دن چار، چوتھے دن آٹھ۔ "اگر حوض ۳۰ ویں دن بھر جاتا ہے" پہیلی کہتی ہے "تو کب وہ آدھا بھرے گا" جواب یہ ہے کہ "۲۹ ویں دن" گویا نصف حوض بھرنے میں تو ۲۹ دن لگیں گے مگر اس کے بعد پورا حوض صرف ایک دن میں بھر جائے گا۔ پچھلا سفر ۲۹ دن میں طے ہوا، اگلا سفر صرف ایک دن میں طے ہو جائے گا۔

مشہور امریکی ماہر اقتصادیات لسٹر براؤن کے نزدیک یہی ہماری زمین کی صورت حال ہے۔ ہماری زمین جس پر اس وقت تقریباً چار ارب انسان بستے ہیں، اپنے ۲۹ ویں دن میں ہے۔

● تہذیب کے بعد ریگستان

مالتھس (۱۸۳۴ — ۱۷۶۶) نے کہا تھا کہ خوراک کے ذخیرے جس نسبت سے بڑھتے ہیں، آبادی میں اس سے دگنا رفتار سے اضافہ ہوتا ہے۔ مگر وہ یہ بتانے میں ناکام رہا کہ تہذیب انسانی کی ترقی اکثر اوقات پیداواری امکانات کو برباد کر دیتی ہے۔ مشرق اوسط جو انسان کا قدیم ترین مسکن رہا ہے۔ پچھلے ادوار میں وہاں بڑے بڑے جنگل تھے۔ اب یہ علاقہ بڑی حد تک بے درخت اور ریگستان ہو چکا ہے۔ ایک فرانسیسی مفکر نے کہا ہے:

THE FORESTS COME BEFORE CIVILIZATION, THE DESERTS AFTER THEM.
The Times of India, 28-5-1978

تہذیب سے پہلے جنگلات ہوتے ہیں اور تہذیب کے بعد ریگستان۔

● ہندستان کا حصہ

خلیج عرب کے ممالک کی کل آبادی ۱۲۰ لاکھ ہے۔ اس میں روزگار کے لئے جانے والے ہندستانیوں کی تعداد ½ فی صد ہے۔ اس وقت ہندستان کو عرب ملکوں سے غیر ملکی کرنسی کی صورت میں جو رقم حاصل ہو رہی ہے اس کی مقدار سالانہ ۱۵۰۰ کرور روپے ہے۔ دولت حاصل کرنے کے لئے لوگ پہلے "ولایت" جایا کرتے تھے، اب ان کی منزل عرب بن رہا ہے۔

وہ لوگ جو آخرت کے باغوں میں جگہ پائیں گے

آدمی کو چاہئے کہ خدا سے اتنا قریب ہو جائے کہ ہر وقت اس کو خدا کی یاد آتی رہے۔ اللہ کی بڑائی کا احساس اس کے اوپر اتنا چھا جائے کہ اپنا وجود اس کو بے حقیقت نظر آنے لگے۔ جنت اور جہنم کا اس کو اتنا یقین ہو جائے کہ دنیا کے آرام و تکلیف سے زیادہ اس کو آخرت کے آرام و تکلیف کی فکر رہنے لگے۔ وہ اپنے آپ کو اتنا اوپر اٹھائے کہ اپنی غلطیاں اس کو اس طرح دکھائی دینے لگیں جس طرح کسی کو اپنے دشمن کی غلطیاں دکھائی دیتی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو نفسیاتی گرہوں سے اتنا آزاد کرے کہ اختلاف اور شکایت کے باوجود دوسرے کے لئے اس کے دل سے دعائیں نکلنے لگیں۔ حق کا اعتراف نہ کرنا اس کو ایسا معلوم ہو گویا وہ اپنے آپ کو قتل کر رہا ہے۔ دوسرے کا آشیانہ اجاڑنا اس کو ایسا لگے جیسے وہ خود اپنے آشیانہ میں آگ لگا رہا ہے۔ یہی خدا پرستی کی زندگی ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جن کو خدا اپنی جنتوں میں جگہ دے گا۔

جو لوگ اللہ کے سچے بندے بن جائیں، ان کے لئے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ دنیا میں انھیں غالب کرے گا۔ یہ غلبہ ان کی خدا پرستی کا اصل انعام نہیں بلکہ اصل انعام کی ایک ابتدائی علامت ہے۔ خدا پرستوں کے لئے اللہ نے جو انعام مقدر کر رکھا ہے وہ یہ ہے کہ قیامت کے بعد آنے والی دنیا میں وہ ان کو غلبہ و سربلندی عطا کرے۔ ان کو ہر قسم کے خوف اور حزن سے پاک کر کے اپنی رحمتیں اور نعمتیں دائمی طور پر ان کی وراثت میں دے دے۔ اسی کا نام جنت والی زندگی ہے جو آخرت میں مومنین صالحین کو حاصل ہو گی۔ مگر جب اہل ایمان کا کوئی قابل لحاظ گروہ بن جاتا ہے تو اللہ اس دنیا میں بھی اس کو علامتی طور پر غالب کر دیتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں سرکش اور غافل انسانوں کو مغلوب کر کے دکھایا جاتا ہے کہ آخرت کی ابدی دنیا میں کون عزت اور برتری کے مقام پر ہو گا اور کون ذلت اور پستی کے گڑھے میں ڈال دیا جائے گا

یہ وقت کا سوال ہے نہ کہ قیمت کا

آکسفورڈ یونیورسٹی ۱۱۶۳ء میں قائم ہوئی۔ اس کے ہرے ہرے لان ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ ایک امریکن کروڑپتی نے اس کے لان دیکھے تو وہ ان کو بہت پسند آگئے۔ انھوں نے چاہا کہ ایسا ہی لان ان کی کوٹھی میں بھی ہو۔

"ایسا لان کتنے ڈالر میں تیار ہو جائے گا" انھوں نے آکسفورڈ کے مالی سے پوچھا۔

"مفت میں" مالی نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا

"وہ کیسے"

"اس طرح کہ آپ اپنی زمین کو ہموار کر کے اس پر گھاس جما دیجئے۔ جب گھاس بڑھے تو اس کو کاٹ کر اوپر سے رولر پھیر دیجئے۔ اسی طرح پانچ سو برس تک کرتے رہئے۔ جب پانچ سو سال پورے ہوں گے تو ایسا ہی لان آپ کے یہاں تیار ہو جائے گا۔ یہ وقت کا سوال ہے نہ کہ قیمت کا۔" ■

قانونِ فطرت اور قانونِ شریعت

زندگی کے معاملات کا بننا اور بگڑنا، ایک لفظ میں، منہاج السنہ پر منحصر ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے کہا:

عَجِبتُ لِقومٍ عَرَفوا الاسنادَ وصِحّتَہ یَذْھَبُونَ الیٰ رأیِ سفیان۔ واللہ تعالیٰ یقول: فَلیَحذرِ الذین یُخالفون عن أمرہ ان تُصیبَھم فتنۃٌ او یُصیبھم عذابٌ الیم (نور ۶۳)

مجھ کو ان لوگوں پر تعجب ہے جو حدیث کی سند اور صحت معلوم کرنے کے بعد سفیان ثوری کی رائے کو اختیار کرتے ہیں۔ حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: پس چاہئے کہ ڈریں وہ لوگ جو خلاف کرتے ہیں اس کے امر کے کہ پڑے ان پر کچھ خرابی یا پہنچے ان کو دردناک عذاب۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر جو شریعت نازل فرمائی اور رسولؐ نے جس کو اپنی زندگی میں برت کر اس کا کامل نمونہ پیش فرمایا، اس کو اس آیت میں امر رسول کہا گیا ہے۔ اس امر رسول کو اختیار کرنے میں، سب کی دنیا و آخرت کا بناؤ ہے اور اس امر رسول سے انحراف میں انسان کی دنیا و آخرت کا بگاڑ۔ یہ امر رسول یا سنت رسول انسانی زندگی کے لئے وہی اہمیت رکھتا ہے جو مادی دنیا کے لئے قانون فطرت۔ ہم ایک باغ کے مالک بننا چاہیں تو ہم قانون فطرت کی پیروی کرکے ہی باغ کے مالک بن سکتے ہیں۔ مثلاً ہم کو یہ کرنا پڑے گا کہ ہم بیج کو زمین میں دفن کریں۔ اگر ہم بیج کو فضا میں اچھالیں یا شاخوں کو زمین میں گاڑیں تو ہم اپنے لئے ایک ہرا بھرا باغ نہیں پا سکتے۔ ہم کو بہرحال یہ کرنا ہوگا کہ ہم بیج کو زمین میں گاڑیں اور فطرت کے مقررہ قانون کے مطابق اس کی پرورش کریں۔ اس کے بعد ہی ہم اپنے لئے ایک ہرا بھرا باغ دیکھ سکتے ہیں۔ ٹھیک یہی معاملہ قانون شریعت کا بھی ہے۔ جس طرح مادی کائنات کے لئے ایک دینُ اللہ ہے، اسی طرح انسانی زندگی کے لئے بھی ایک دینُ اللہ (آل عمران ۸۳) ہے۔ اللہ نے جس طرح مادی دنیا کے لئے ایک قانون مقرر کیا ہے، اسی طرح اس نے انسانی دنیا کے لئے بھی ایک قانون (رعد ۲) مقرر کیا ہے۔ جمادات و نباتات کی دنیا کے معاملات ہوں یا انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے معاملات، دونوں جگہ کوئی حقیقی نتیجہ خدا کے مقررہ راستہ کو اختیار کرکے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

فطرت کے نظام میں تبدیلی صرف مسائل پیدا کرتی ہے

امریکہ سے ایک ناول چھپا ہے جس کا نام ہے "اکیلی خاتون"

Harold Robbins, The Lonely Lady
New English Library, London, 1976, pp. 448

اس ناول میں امریکہ کے ترقی یافتہ معاشرہ کی ایک کمزوری کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ عورت کی غیر شادی شدہ زندگی بالآخر ایک ناقابل برداشت تنہائی پر ختم ہوتی ہے۔ کہانی کے مطابق، ایک خوبصورت اور نوجوان امریکی خاتون فلمی دنیا کی چمک دمک (Glamour) سے متاثر ہوتی ہے۔ وہ شادی شدہ زندگی کو چھوڑ کر فلم ایکٹرس بن جاتی ہے۔ اس کی باکمال نسوانیت

اس کی مدد کرتی ہے۔ وہ بہت جلد ترقی کی سیڑھیاں طے کرنے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ ترقی کے آسمان پر پہنچ جاتی ہے۔ دولت، شہرت، عزت اور چاہنے والوں کی بھیڑ، ہر چیز بافراط اس کے گرد جمع ہو جاتی ہے۔ مگر ترقی کی آخری انتہا پر پہنچ اس کو سکون نہیں دیتا۔ اب وہ ایک تلخ حقیقت (Bitter Truth) کو دریافت کرتی ہے:

That fame has a way of fading, and friends a way of disappearing when they are most needed.

یہ کہ شہرت بالآخر ختم ہو جاتی ہے۔ اور دوست بالآخر ساتھ چھوڑ دیتے ہیں جب کہ ایک عورت کو ان کی سب سے زیادہ ضرورت ہو ہے یہ امریکی خاتون نہایت حسرت بھرے انداز میں لکھتی ہے:

Only a woman knows what loneliness is

حقیقت یہ ہے کہ ایک عورت ہی اس بات کو جانتی ہے کہ اکیلا پن کیا ہے۔ ناول کا خلاصہ یہ ہے کہ عورت اکیلی نہیں رہ سکتی۔ فلم کے ذریعہ بڑی بڑی کمائی کرنا اور اپنے لئے ایک خود مختار زندگی حاصل کرنا بظاہر بڑا پرکشش معلوم ہوتا ہے۔ مگر جب عورت عمر زیادہ ہوتی ہے۔ جب اس کے ساتھیوں میں اس کے لئے کشش باقی نہیں رہتی تو وہ ایک ناقابل برداشت حادثہ سے د ہوتی ہے۔ اس کے پاس دولت اور مادی ساز و سامان کا انبار ہوتا ہے۔ مگر وہی چیز نہیں ہوتی جس کی ایک عورت کو سب زیادہ ضرورت ہے۔ یعنی زندگی کا چین۔ اس کے پاس سب کچھ ہوتا ہے مگر وہ انسان نہیں ہوتا جو اس کے صبح و شام میں ا ساتھی بن سکے۔ وہ ایک ایسے آباد گھر کی مالک نہیں ہوتی جس کو وہ اپنا گھر سمجھے:

Here is a loneliness born of independence, of honest individualism in a society where only dishonesty brings profit.

یہ ایک تنہائی ہے جو خود مختار زندگی سے برآمد ہوتی ہے، ایک دیانت دارانہ فردیت، ایک ایسے سماج میں جہاں بد ہی سب سے بڑا نفع بخش سرمایہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کا نظام بے حد نازک ترکیب کے ساتھ بنایا گیا ہے۔ اس میں ادنیٰ تبدیلی بھی بربادی پر ختم ہوتی ہے۔ جمادات اور نباتات کی دنیا کے لئے ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ کامیابی کا راز یہ ہے کہ فطرت کے ہوئے نظام سے انحراف نہ کیا جائے۔ یہاں مطلوب نتیجہ تک پہنچنا اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ فطرت کے مقررہ ڈھانچ کیا جائے۔ مگر وہی انسان جو جمادات اور نباتات کے معاملہ میں اس حقیقت کی مکمل پابندی کرتا ہے وہ خود اپنی زندگی معاملہ میں اس ابدی حقیقت کو بھول جاتا ہے۔ عورت اور مرد کے لئے فطرت کا بنایا ہوا نظام یہ ہے کہ وہ شادی شدہ گزاریں۔ ان کی جسمانی ساخت، ان کے نفسیاتی اور خاندانی مسائل، ان کے اجتماعی رشتے سب اپنی درستگی کے لئے شدہ زندگی کا تقاضا کرتے ہیں۔ عورت کا آزاد اور خود مختار ہونا، الفاظ کے اعتبار سے بظاہر بڑا خوبصورت ہے۔ مگر اس کا عملی تجربہ اتنا ہی بھیانک ہے۔ عورت اپنی جوانی کی عمر میں بڑی آسانی سے اس قسم کے نظریات کا شکا ہے۔ مگر جب اس کی عمر زیادہ ہوتی ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا راستہ غلط تھا۔ مگر یہ علم اس کو صرف ا ہوتا ہے جب کہ تلافی کا وقت نہیں ہوتا۔ اب اس کے لئے موجودہ دنیا میں جو چیز رہ جاتی ہے وہ صرف یہ کہ کتے خرگوشوں کو پال کر مصنوعی طور پر ان سے دل بہلائے اور بالآخر حسرت اور مایوسی کے قبرستان میں جا کر سو ر

زندگی بعد موت کا علمی ثبوت

انسبرک (آسٹریا) میں اکتوبر ۱۹۷۸ کے پہلے ہفتہ میں ایک کانفرنس ہوئی جس میں مغربی یورپ اور شمالی امریکہ کے ایک ہزار سائنس داں اور علماء مذاہب شریک ہوئے۔ اس کانفرنس کا مقصد اس سوال پر غور کرنا تھا کہ کیا موت کے بعد زندگی ہے۔ جن لوگوں نے اس موضوع پر تحقیقات کی ہیں، انھوں نے اپنی تحقیقات کے نتائج پیش کئے۔ کانفرنس کی اکثریت کا رجحان یہ تھا کہ موت کے بعد بھی زندگی کا تسلسل باقی رہتا ہے۔ تاہم کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اس سلسلے میں جو دلائل دئے جاتے ہیں وہ متعلقہ دعوے کے ثبوت کے لئے کافی نہیں ہیں۔ ایک ہفتہ تک بحث جاری رہی۔ آخر میں کانفرنس نے جو رزولیوشن پاس کیا، اس میں حسب ذیل الفاظ میں زندگی بعد موت کا اقرار کیا گیا ہے:

There is enough evidence now available to suggest that we cannot rule out an after-life.

The Times of India, 9-10 Oct.,1978

زندگی بعد موت کے حق میں اب اتنے کافی شواہد جمع ہو چکے ہیں کہ ہم اس کو خارج از امکان نہیں قرار دے سکتے۔

اس سلسلے میں ایک اہم کتاب رومیو ارر کے نام سے شائع ہوئی ہے:

Dr. Lyall Watson, The Romeo Error

اس کتاب میں مصنف نے کثیر تعداد میں ایسے لوگوں کے واقعات جمع کئے ہیں جن کو ڈاکٹروں نے "مردہ" قرار دے دیا تھا، پھر وہ "زندہ" ہو گئے۔ انھوں نے اپنی "موت" کے تجربات بتائے۔ یہ واقعات مختلف الگ الگ ملکوں سے جمع کئے گئے ہیں۔ مگر ان میں حیرت انگیز یکسانیت ہے۔ مثلاً "موت" کے بعد اپنے مردہ جسم سے الگ اپنے وجود کا احساس۔ ایک تیز روشنی کا دیکھنا۔ اپنے مردہ عزیزوں سے ملاقات، وغیرہ۔ اس یکسانیت کی وجہ سے علماء یہ ماننے پر مجبور ہوئے ہیں کہ ضرور ان میں کوئی صداقت ہے۔

کانفرنس میں جو مقالات پیش کئے گئے ان میں ایک اہم مقالہ ڈاکٹر کارلوز اوسس (Carlos Osis) کا تھا۔ انھوں نے ایک ہزار ایسے واقعات کا تجزیہ کیا جن میں مرنے والے لوگوں کے آخری لمحات کا ریکارڈ جمع کیا گیا ہے۔ یہ واقعات امریکہ اور ہندوستان کے لوگوں کے تھے۔ ماحول اور جغرافیہ کے غیر معمولی فرق کے باوجود مرنے والوں کے تأثرات انتہائی یکساں تھے۔ مثلاً ہر ایک کو آخر وقت میں ایسے الفاظ سنائی دیئے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو ایک اور دنیا میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں جہاں ان کے مرے ہوئے اعزہ پہلے سے موجود ہیں۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدمی جب موت کے بالکل قریب پہنچتا ہے تو اس کے اوپر سے غیب کے پردے ہٹنے لگتے ہیں۔ وہ دوسرے عالم کو دیکھنے لگتا ہے۔ اس وقت اس کی زبان سے جو کلمات نکلتے ہیں وہ گویا ایک ایسے شخص کے کلمات ہوتے ہیں جو اپنے سفر حیات کو مکمل کر کے اگلی دنیا کے دروازے پر کھڑا ہو گیا ہو۔ سورہ واقعہ کے اس بیان سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ جب جان حلق تک آجاتی ہے تو "ہم مرنے والے کے پاس ہوتے ہیں مگر تم نہیں دیکھتے" ۸۵

وہ مواقع جو استعمال نہ ہو سکے

فریڈرک ٹوکر (۱۹۲۹-۱۸۵۳) ایک انگریز آئی سی ایس تھا۔ وہ کمشنر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا کہ اس کے اندر مذہبی اور روحانی جذبہ پیدا ہوا۔ اس نے ۱۸۸۱ء میں سرکاری ملازمت سے استعفا دے دیا۔ انگلستان میں اس وقت جنرل ولیم بوتھ کے تحت سالویشن آرمی (نجات دہندہ فوج) کی تحریک چل رہی تھی۔ اس نے جنرل بوتھ کو آمادہ کیا کہ اس تحریک کی ایک شاخ ہندستان میں قائم کی جائے۔ چنانچہ ۱۹؍ستمبر ۱۸۸۲ کو اس کی پہلی شاخ بمبئی میں قائم ہوئی۔ فریڈرک ٹوکر (Frederick Tucker) نے اپنا نام فقیر سنگھ رکھ لیا۔ وہ پنجاب کے دیہاتوں میں ننگے پاؤں گھومتا اور لوگوں کو روزگار پر لگانے کی کوشش کرتا۔ اس نے دیہی بنک قائم کیے۔ گھریلو صنعتیں رائج کیں اور کالونیاں بنائیں، وغیرہ (ٹائمس آف انڈیا ۱۱ مارچ ۱۹۷۹)

"استعمار" کے زمانہ میں اس طرح کے بہت سے انگریز تھے جن کی فطرت زندہ تھی اور جن کے اندر دین حق ک بیج ڈالا جاسکتا تھا۔ مگر تمام قائدین سیاسی ہنگاموں میں لگے رہے۔ خدا کے پیغام کو خدا کے بندوں تک پہنچانے ک ضرورت کسی کو محسوس نہ ہوئی۔ اس قسم کے لوگ اگر آخرت میں کہیں کہ خدایا ہم حق کی تلاش میں تھے۔ مگر حق کے امانت داروں نے ہم کو حق سے آشنا نہیں کیا۔ وہ تو ہم سے صرف سیاسی لڑائی لڑتے رہے تو مجھے نہیں معلوم کہ ہمارے قائد کے پاس اس کا کیا جواب ہوگا۔

یہ ان مواقع کی ایک مثال تھی جو انفرادی اعتبار سے ہمارے لئے پیدا ہوئے۔ حالیہ زمانے می اسی قسم کے مواقع اجتماعی سطح پر بھی بار بار سامنے آئے۔ مگر مسلمان ان سے کوئی دعوتی فائدہ حاصل نہ کر سکے

خاندان ہیپس برگ (Hapsburgs) ایک زمانہ میں آسٹریا وہنگری پر حکومت کرتا تھا۔ ترکی کے سلطا سلیمان اعظم (۱۵۶۶-۱۵۲۰) کے زمانہ میں اس کے تخت پر شہنشاہ چارلس پنجم (Charles V) حکمراں تھا۔ اس وق وہ یورپ کا سب سے بڑا فرماں روا تسلیم کیا جاتا تھا۔ یورپ کے نصف سے زیادہ حصہ پر اس کی سلطنت پھیل چکی تھ اس حکومت کے تعلقات فرانس سے اچھے نہ تھے۔ فرانس کی یہ کوشش تھی کہ اس وسیع سلطنت کو مغرب کی سم بڑھنے سے روکے۔ اسی طرح مشرق میں عثمانی سلطنت ہیپس برگ حکمرانوں کے لئے سد راہ بنی ہوئی تھی۔ فرانس نے مح کیا کہ وہ اور سلطنت عثمانیہ دونوں ہیپس برگ کے مشترک حریف ہیں۔ اس نے اپنے محاذ کو مضبوط کرنے کے لئے سلا عثمانیہ سے تعلقات بڑھانا چاہا — چنانچہ فرانس کی حکومت نے ۱۵۳۴ میں اپنے سفیر کو قسطنطنیہ بھیج کر خود ہی ا طرف پہل کی۔ دونوں میں اچھے سیاسی تعلقات قائم ہو گئے۔ ایک سال بعد جب شاہ فرانس ncis I) اور شاہ چارلس پنجم میں جنگ چھڑی تو فرانس نے سلطان سلیمان سے مدد کی درخواست کی۔ سلطان سلیمان نے اس میں نہ صرف فرانس کی فوجی مدد کی بلکہ اس سے دوستی اور تجارت کا معاہدہ بھی کر لیا۔ اس معاہدہ کے مطابق فرانسیسیو صرف پانچ فی صد محصول کے معاوضہ میں تمام ترکی بندرگاہوں سے تجارت کرنے کی اجازت مل گئی تھی۔ فرانسیسی تاجرو

انی و فوجداری مقدمات ان کے اپنے قونصل کے سپرد کر دئے گئے۔ ان کو ترکی میں پوری مذہبی آزادی حاصل تھی اور ترکی
واقع عیسائیوں کے مقامات مقدسہ کی نگرانی بھی ان کا حق تھا۔ اس دوستانہ معاہدہ کی وجہ سے فرانس اور ترکی کے
فات تقریباً تین صدیوں تک بہت خوش گوار رہے۔ ان تعلقات سے فرانس میں بہت بڑے پیمانہ پر تبلیغ کا فائدہ حاصل
جاسکتا۔ مگر اس سلسلہ میں کچھ بھی نہ کیا جاسکا۔

اسی طرح ترکی اور روس قدیم زمانہ میں ایک دوسرے کے روایتی حریف تھے۔ اگست ۱۹۱۴ میں جب یورپ کی عالمگیر
ں چھڑی تو ایک طرف روس، برطانیہ اور فرانس تھے جن کو اتحادی طاقتیں (Allied Powers) کہا جاتا تھا۔ دوسری
ں جرمنی اور اٹلی وغیرہ تھے جن کو محوری طاقتیں (Axis Powers) کہا جاتا تھا۔ مصطفیٰ کمال اور بعض دوسرے لوگوں
رائے تھی کہ ترکوں کو اس جنگ سے علیحدہ رہنا چاہئے۔ اس وقت ترکی کے اقتدار پر انور پاشا اور ان کے پرجوش ساتھیوں کا
ہ تھا۔ انھوں نے روس اور برطانیہ کی دشمنی میں جرمنی کا ساتھ دیا۔ اس جنگ میں ترکوں کی شرکت نے اتحادیوں کے لئے سخت
اریاں پیدا کر دیں۔ ترکوں نے آبنائے باسفورس اور درۂ دانیال کو دشمن کے جہازوں کے لئے بند کر دیا۔ اس کی وجہ سے
انیہ اور فرانس کا تعلق روس سے منقطع ہوگیا۔ روس اس وقت ایک غیر صنعتی ملک تھا اس لئے جب تک برطانیہ اور فرانس کے
خانوں سے اس کو کافی مقدار میں سامان جنگ فراہم نہ ہوتا رہے وہ جدید طرز کی جنگ کو کامیابی کے ساتھ جاری نہیں رکھ
تا تھا۔ تاہم ترکی کے لئے یہ پالیسی بہت مہنگی پڑی۔ جنگ میں جرمنی کو شکست ہوئی اور اس کے بعد ترکی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا
طنطنیہ کے تخت پر اگرچہ برائے نام سلطان باقی رہا مگر عملاً ترکی کے تمام معاملات اتحادیوں کے قبضہ میں آگئے —— یہ سب
ہوا۔ مگر جرمنی سے اتنے لمبے قریبی تعلق کے باوجود جرمنی میں تبلیغ اسلام کا کوئی کام نہ کیا جاسکا۔

اس قسم کے سیاسی اور اقتصادی اتحاد کی مثالیں مسلم حکومتوں کی تاریخ میں کثرت سے ملیں گی۔ مگر ایسی کوئی مثال نہیں
ہے کہ دعوت و تبلیغ کے مقصد کی خاطر کسی سے اتحاد کیا گیا ہو۔ یا سیاسی اتحاد کے ذریعہ پیدا شدہ حالات سے دعوتی فائدہ
ھانے کی کوشش کی گئی ہو۔ اگر دعوتی مزاج ہوتا تو اس قسم کے اتحاد سے غیر معمولی دعوتی فائدے حاصل کئے جاسکتے تھے۔ اور
سلمانوں کی تاریخ اس سے بالکل مختلف ہوتی جو آج ہمیں نظر آتی ہے۔

موجودہ زمانہ میں انسانوں کے باہمی تعلقات میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ مگر تعلقات میں اضافہ
یہ فائدہ حاصل نہ ہو سکا کہ مسلمان نئے مواقع کو دوسرے لوگوں تک دین کا پیغام پہنچانے میں استعمال کرتے۔
فرادی روابط اور قومی تعلقات دونوں ہی اس قسم کا کوئی فائدہ حاصل کرنے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ ہمارے
سلاف کا یہ حال تھا کہ وہ ربط و تعلق کے ہر موقع کو دعوت کے لئے استعمال کرتے تھے۔ مگر آج مسلمانوں کے لئے
دسری قومیں صرف دو باتوں کا موضوع بن کر رہ گئی ہیں۔ معاشی فائدہ حاصل کرنا یا سیاسی جھگڑے کھڑے کرنا۔
یسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو یہ معلوم ہی نہیں کہ ان کے اور دوسری قوموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ ہے
کہ حقوق طلبی اور قومی محاذ آرائی کا۔ مسلمان اپنی لڑائی جھگڑے کی سیاست سے دوسری قوموں کو اسلام سے متوحش کرنے کا
م تو بہت بڑے پیمانہ پر کر رہے ہیں مگر ان کو اسلام کے قریب لانے سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں۔ ■

جو اس لئے عمل کرتے ہیں کہ انھیں کہا جائے

ایک "ظالم" حکمراں کو اقتدار سے ہٹانے کے لئے پُرشور جہاد شروع ہو تو بہت سے لوگ اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوجاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان میں ایسے بھی ہیں جو حکومت کی گولیاں کھا کر جان دے دیتے ہیں۔ لیکن ایک معمولی آدمی جو ان مجاہدین میں سے کسی مجاہد کے ظلم کا شکار ہو رہا ہو اور وہ اس مجاہد سے مل کر کہے کہ میرے اوپر اپنا یہ ظلم ختم کر دو تو مجاہد اسلام کو اس معاملہ سے کوئی دلچسپی نہ ہوگی۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "ظالم حکمراں" کو گدی سے ہٹانا ایک ایسا کام ہے جو اخبارات میں چھپتا ہے۔ اس میں لیڈری ملتی ہے۔ اس سے آدمی کا نام چمکتا ہے۔ اس کے برعکس ایک انفرادی معاملہ کو نپٹانا اپنے اندر کوئی اخباری اہمیت نہیں رکھتا۔ مزید یہ کہ اس میں اپنے نفس کو دبانا ہے جو ہمیشہ انسان کے لئے مشکل ترین کام رہا ہے۔ اجتماعی خطاب میں الفاظ بولنا کافی ہوجاتا ہے جب کہ انفرادی شکایت کو دور کرنے میں عمل کے تقاضے پورے کرنے ہوتے ہیں۔ پہلی صورت میں آدمی کی شان بڑھتی ہے، دوسری صورت میں اس کی شان گھٹتی ہے۔ پہلی صورت میں آدمی کا درجہ بلند ہوتا ہے اور دوسری صورت میں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو دوسرے کے مقابلہ میں نیچا کرنا پڑے گا۔

اسی طرح تقریر و تحریر کے اسٹیج پر دین کی علم برداری کرنی ہو تو بہت سے سورما جائیں گے جو اسلامی موضوعات پر الفاظ کے دریا بہا دیں۔ مگر اسلامی تعمیر کے لئے خاموش جدوجہد کرنا ہو تو اس میں اپنا حصہ ادا کرنے کا شوق کسی میں پیدا نہیں ہوگا۔ کسی شہر میں فساد ہوجائے تو رہنماؤں کا قافلہ امدادی چندہ جمع کرنے کے لئے نکل پڑے گا۔ لیکن اگر ایک مصیبت کا مارا آدمی ان کے پاس پہنچے اور ان سے اپنی امداد کے لئے کہے تو اس کی مدد کے لئے کوئی تڑپ ان کے اندر نہ پیدا ہوگی۔ مسلمانوں کی کسی آبادی پر آفت نازل ہو تو وہ اخباری بیان کے ذریعہ لوگوں سے "یوم دعا" منانے کی اپیل کریں گے۔ مگر ان کی اپنی ایک رات بھی ایسی نہ گزرے گی جب کہ ستم رسیدہ مسلمانوں کے غم میں ان کی نیند اڑ گئی ہو اور وہ رو رو کر اپنی تنہائیوں میں اللہ سے دعائیں مانگ رہے ہوں۔ وہ خود اپنا منصب یہ بتائیں گے کہ خدا نے ان کو احتساب کائنات کا کام سپرد کیا ہے لیکن اگر ان کی اپنی ذات میں کسی غلطی کی نشان دہی کیجئے تو بپھر اٹھیں گے اور چاہیں گے کہ ایسے گستاخ انسان کی جڑ کھود ڈالیں۔

کیوں ایسا ہے کہ پہلی قسم کے کام کا موقع ہو تو سارے رہنما اس کی طرف دوڑتے ہیں۔ اس کے برعکس دوسرے قسم کے کام کے لئے ان کے اندر کوئی اکساہٹ پیدا نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ پہلے کام میں شہرت و عزت ملتی ہے۔ جب کہ دوسرے کام میں آدمی کو اس قسم کا کوئی دنیوی کریڈٹ نہیں ملتا — وہ اسلام سے یہ قیمت لینا چاہتے ہیں کہ ان کو "کہا جائے"۔ اس لئے جہاں کہے جانے کی امید ہو وہاں وہ لپکتے ہیں اور جہاں یہ امید نہ ہو اس سے بے رغبت ہوجاتے ہیں۔ یہ واقعہ ثابت کرتا ہے کہ رہنماؤں میں جس اسلام کی دھوم ہے وہ اشتہاری اسلام ہے نہ کہ حقیقی اسلام — وہ دنیوی قیادت کا ایک بازار لگاتے ہیں اور اس کو مقدس ظاہر کرنے کے لئے اس کو اسلام کا نام دے دیتے ہیں۔ ان کو اس اسلام سے دلچسپی ہے جس میں اخباری اہمیت (نیوز ویلو) ہو جس سے ان کی قائدانہ امیج بنتی ہو، جس کے ذریعہ دنیا کا کوئی نفع حاصل ہوتا ہو۔ ان کو

اُس اسلام سے کوئی دلچسپی نہیں جس سے خدا خوش ہوتا ہو۔ جس سے آخرت کا انعام ملنے والا ہو۔ ایسے لوگوں کی ظاہری کامیابیاں اکثر انھیں دھوکے میں ڈال دیتی ہے۔ مگر انھیں اس حدیث رسول کو نہ بھولنا چاہیے جس کو بیان کرتے ہوئے رسول اللہ کے صحابی بے ہوش ہو گئے تھے :

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: ان اول الناس یقضی یوم القیامۃ علیہ رجل اُستشھد فأتی بہ فعرفہ نعمتہ فعرفھا، قال: فما عملت فیھا؟ قال: قاتلت فیك حتی استشھدت، قال: کذبت ولکنك قاتلت لأن یقال جَرِیءٌ فقد قیل، ثم اُمِرَ بہ فسحب علیٰ وجھہ حتی القی فی النار، ورجل تعلم العلم وعلّمہ وقرأ القرآن، فأتی بہ فعرفہ نعمہ فعرفھا، قال: فما عملت فیھا؟ قال: تعلمت العلم وعلمتہ، وقرأت فیك القرآن، قال: کذبت ولکنك تعلمت لیقال عالمٌ، وقرأت القرآن لیقال قارئٌ فقد قیل، ثم امر بہ فسحب علیٰ وجھہ حتی القی فی النار، ورجل وسع اللہ علیہ وأعطاہ من اصناف المال فأتی بہ فعرفہ نعمہ فعرفھا، قال: فما عملت فیھا؟ قال: ما ترکت من سبیل تحب ان ینفق فیھا الا أنفقت فیھا لك، قال: کذبت ولکنك فعلت لیقال ھو جوادٌ فقد قیل، ثم اُمر بہ فسحب علیٰ وجھہ ثم القی فی النار" (رواہ مسلم)

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا: قیامت کے دن سب سے پہلے جس کا فیصلہ کیا جائے گا وہ وہ شخص ہے جو شہید ہوا۔ اس کو لایا جائے گا۔ اللہ اس کو اپنی نعمتیں بتلائے گا۔ وہ ان کا اقرار کرے گا۔ اللہ فرمائے گا تو نے ان نعمتوں کے ساتھ کیا عمل کیا۔ وہ کہے گا میں نے تیری راہ میں جنگ کی یہاں تک کہ میں شہید ہو گیا۔ اللہ فرمائے گا تو نے جھوٹ کہا۔ بلکہ تو نے اس لئے جنگ کی تاکہ کہا جائے کہ تو بہادر ہے۔ سو کہا جا چکا۔ پھر حکم ہوگا اور اس کو منھ کے بل گھسیٹ کر آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ اس کے بعد اس شخص کو بلایا جائے گا جس نے علم دین سیکھا اور اس کی تعلیم دی اور قرآن کو پڑھا۔ اللہ اس کو اپنی نعمتیں بتائے گا وہ ان کا اقرار کرے گا۔ اللہ فرمائے گا تو نے ان نعمتوں کے ساتھ کیا عمل کیا۔ وہ کہے گا میں نے علم دین سیکھا اور سکھایا اور تیری راہ میں قرآن پڑھا۔ اللہ فرمائے گا تو نے جھوٹ کہا۔ بلکہ تو نے علم اس لئے سیکھا تاکہ تو عالم کہا جائے اور قرآن اس لئے پڑھا تاکہ تجھ کو قرآن پڑھنے والا کہا جائے۔ سو کہا جا چکا۔ پھر حکم ہوگا اور اس کو منھ کے بل گھسیٹ کر آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ اس کے بعد اس شخص کو بلایا جائے گا جس کو اللہ نے وسعت دی تھی اور مال عطا کیا تھا۔ اللہ اس کو اپنی نعمتیں بتائے گا۔ وہ ان کا اقرار کرے گا۔ اللہ فرمائے گا تو نے ان نعمتوں کے ساتھ کیا عمل کیا۔ وہ کہے گا میں نے ان کو تیرے پسندیدہ راستوں میں خرچ کیا۔ اللہ فرمائے گا تو نے جھوٹ کہا۔ بلکہ تو نے اس لئے خرچ کیا کہ تجھ کو سخی کہا جائے۔ سو کہا جا چکا۔ پھر حکم ہوگا اور اس کو منھ کے بل گھسیٹ کر آگ میں ڈال دیا جائے گا۔

یہ ان لوگوں کا حال ہے جنھوں نے دین کے نام پر جان دی، دین کی خدمت میں اپنی زندگیاں لگائیں۔ دین کے نام پر اپنے مال کو خرچ کیا۔ مگر یہ سب کچھ انھوں نے نمائش کے جذبہ کے تحت کیا۔ اس لئے وہ خدا کے یہاں غیر مقبول ٹھہرے اور جہنم میں داخل کر دیئے گئے۔ پھر ان لوگوں کا قیامت کے دن کیا حال ہوگا جنھوں نے دین کو تجارت بنایا۔ جنھوں نے دین کے نام پر دنیا کمائی۔ جو دین کو دینے کے بجائے صرف دین سے لیتے رہے۔ ■

جب موت آدمی کے ذہنی طلسم کو توڑ دے گی

ایران میں فروری ۱۹۷۹ میں شاہ مخالف عناصر غالب آگئے۔ اس کے بعد خفیہ انقلابی عدالتیں قائم ہوئیں۔ سرسری سماعت کے بعد ان افسروں کو گولی مار کر ہلاک کیا جانے لگا جنھوں نے شاہ کے حکم کی تعمیل میں شاہ مخالف عناصر کو کچلنے کی کوشش کی تھی۔ اس سلسلہ میں جو خبریں آرہی ہیں ان میں بڑی عبرت کا سامان ہے۔

جنرل ربیع شاہ کی خفیہ پولس ساواک (SAVAK) میں اعلیٰ افسر تھے۔ ۹ اپریل ۱۹۷۹ کو تہران میں ان کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ ایران کی نئی انقلابی حکومت میں ان پر مقدمہ چلایا گیا تھا۔ رائٹر کے مطابق انھوں نے اپنے بیان میں عدالت سے کہا:

> I am sorry I served somebody until it was too late to discover he was nothing.

مجھے افسوس ہے کہ میں شاہ ایران کے احکام کی تعمیل کرتا رہا۔ میں اس کے بے حقیقت ہونے کو صرف اس وقت جان سکا جب کہ اس کو جاننے کا وقت نکل چکا تھا ——— یہی صورت زیادہ بڑے پیمانہ پر موت کے وقت پیش آتی ہے۔ آدمی اپنی خواہشوں کے پیچھے دوڑتا رہتا ہے، یہاں تک کہ موت کا وقت آجاتا ہے۔ اس وقت اس کی آنکھ کھلتی ہے۔ اب اس کو معلوم ہوتا ہے کہ جن خوش نما خیالات اور خوب صورت الفاظ کے سہارے وہ جی رہا تھا ان کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ موت کے جھٹکے کے بعد اچانک وہ ہوش میں آجاتا ہے۔ مگر اب اس کا ہوش میں آنا بے کار ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ بدلہ پانے کا وقت ہوتا ہے نہ کہ عمل کرنے کا۔

اسی طرح، رائٹر کے مطابق، ایک اور ملزم جنرل خواجہ نوری نے عدالت کے سامنے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا:

> Because of the heavy censorship, I was unaware of the real situation

"خبروں پر بھاری سنسر قائم ہونے کی وجہ سے میں حقیقی صورت حال سے بالکل بے خبر رہا"۔ آخرت کے اعتبار سے بھی انسان کا حال یہی ہے۔ آدمی اپنے خیالات میں اس طرح گم رہتا ہے کہ اس کو باہر کے حقائق دکھائی نہیں دیتے۔ وہ اپنی خواہشات کے خول میں بند رہتا ہے۔ وہ لفظی توجیہات وضع کرتا ہے اور ان کے سہارے جیتا رہتا ہے۔ وہ اپنے مطابق حق اور ناحق کا ایک خود ساختہ ڈھانچہ گھڑتا ہے اور اپنے آپ کو اس کے حسب حال پا کر خوش ہوتا رہتا ہے۔ وہ اپنی خوش خیالیوں اور دنیوی کامیابیوں کے مطابق اپنے گرد ایک فرضی ہالہ بنا لیتا ہے اور اس کے اندر اس طرح صبح و شام کرتا رہتا ہے جیسے وہ ابدی حصار میں آگیا ہے، آدمی اسی طرح اپنی زندگی کے دن گزارتا رہتا ہے، یہاں تک کہ موت آکر اس کے ذہنی فریب کا پردہ پھاڑ دیتی ہے۔ اب اس کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ جس فکری گھروندے میں جی رہا تھا وہ فرضی طلسمات کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ وہ جن الفاظ کو لکھ اور بول رہا تھا وہ معانی سے بالکل خالی تھے۔ وہ جن کاموں میں مشغول تھا وہ عالم آخرت کے اعتبار سے کوئی قیمت نہ رکھتے تھے۔ جن مشاغل پر اس نے خدا اور اسلام کا بورڈ لگا رکھا تھا وہ محض اس کی ایک ذاتی تجارت تھی۔ وہ صرف اپنی انا کی تسکین کے لئے متحرک تھا نہ کہ حقیقۃً خدا کی رضا کے لئے۔ ■

ضمیر ـــــ دنیا میں خدا کی عدالت ہے

مرحوم ذوالفقار علی بھٹو (۱۹۷۹ ـ ۱۹۲۸) کو قتل کے الزام میں راولپنڈی جیل میں پھانسی دے دی گئی۔ پاکستان کے سابق وزیر اعظم واجب القتل تھے یا نہیں، اس میں دنیا کے علما قانون کی دو رائیں ہیں۔ تاہم اس میں دو رائے نہیں کہ پاکستان کے علم برداران اسلام نے ۴ اپریل کی رات کو اس شخص کو قتل کر دیا جس کا نام "ذوالفقار علی بھٹو" تھا۔

اس سلسلے میں ہم پاکستان کے علم برداران اسلام سے صرف ایک بات کہنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ کہ اصل مسئلہ دنیا کا نہیں بلکہ آخرت کا ہے۔ اگر فی الواقع آپ کے اس اقدام کا مقصد انصاف کے تقاضے پورا کرنا تھا تو اللہ کے یہاں آپ کے لئے اجر ہے۔ اور اگر یہ ایک قانونی ڈراما تھا جو سیاسی مقصد کے لئے کھیلا گیا تو آپ کو ڈرنا چاہیے کہ کل قائم ہونے والی بڑی عدالت میں آپ خدا کو کیا جواب دیں گے۔

ہم آپ سے گزارش کریں گے کہ آپ اپنا احتساب کر کے دیکھیں کہ آپ کہاں کھڑے ہوئے ہیں۔ تنہائی کے وقت میں جب کہ نہ کوئی آپ کے آگے ہو اور نہ پیچھے، نہ کوئی دائیں ہو اور نہ کوئی بائیں۔ بس آپ ہوں اور آپ کا خدا ہو۔ ایسے عالم میں آپ اپنے کو بے پردہ کر کے دیکھیں کہ اس پھانسی کا محرک آپ کے لئے کیا تھا۔ کیا یہ کہ ایک بے گناہ انسان کے قاتل کو اس کے قتل کی سزا مل جائے۔ یا اس کے پیچھے یہ چھپا ہوا جذبہ کام کر رہا تھا کہ ایک سیاسی حریف جس کے متعلق آپ جان چکے تھے کہ الکشن کے میدان میں آپ اس کو شکست نہیں دے سکتے، اس کو قتل کر کے ہمیشہ کے لئے سیاست کے میدان سے ہٹا دیں۔ خواہ اس مقصد کے لئے ایک عدالتی ڈرامہ ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

تنہائی کا احتساب جس میں آپ کا دل لرز رہا ہو اور آخرت کے خوف سے آپ کی پلکیں بھیگ گئی ہوں، اگر آپ کو یہ بتائے کہ آپ نے صرف ایک "قاتل" کو اس کے قتل کے جرم کی سزا دینے کے لئے ایسا کیا ہے، اس میں کوئی سیاسی جذبہ شامل نہیں ہے تو بلاشبہ آپ اللہ کے نزدیک بری الذمہ ہیں۔ لیکن اگر ایسا ہو کہ اپنا احتساب کرتے وقت آپ کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جائیں۔ آپ کو ایسا محسوس ہو کہ آپ کی اندرونی آواز آپ کی زبان سے بولے ہوئے الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہی ہے تو سمجھ لیجئے کہ خدا کے گواہ کی گواہی آپ کے خلاف ہے۔ آپ سے اتنا بڑا جرم ہو گیا ہے کہ آخرت میں ہمالیہ پہاڑ کے برابر سونا دے کر بھی آپ اپنے کو بری الذمہ نہ کرا سکیں۔ اس دن نہ کسی "جنرل" کو اس کی مسلح فوج بچانے والی ثابت ہو گی اور نہ کسی "اسلام پسند" کو کوئی فوجی حکمراں۔ آج کے تمام با معنی الفاظ اس وقت بے معنی ہو جائیں گے۔ آج کے تمام ساتھی اس دن ساتھ چھوڑ دیں گے۔ حتی کہ وہ لوگ بھی جو آج آپ کو مبارک باد کے تار بھیج رہے ہیں۔

باہر کے جن لوگوں نے اس کارروائی کی تائید کی، ان کا معاملہ بھی یہی ہے۔ وہ اپنے اندر جھانک کر دیکھیں۔ اگر وہ پائیں کہ ان کی تائید صرف اس لئے تھی کہ قاتل کو اس کے قتل کی سزا ملے تو اللہ کے یہاں ان کے لئے اجر ہے۔ اور اگر اس کے پیچھے دوسرے محرکات کام کر رہے ہوں تو وہ بھی یکساں طور پر اس ذمہ داری میں شریک ہیں۔ کیونکہ حدیث میں آیا ہے: اذا عملت الخطیئة فی الارض ـ ـ ـ من غاب عنها فرضیها کان کمن شهدها (ابوداؤد) ■

نظام مصطفیٰ کی نئی تعبیر

ذوالفقار علی بھٹو کی قید کے زمانہ میں پاکستان قومی اتحاد کے ایک حامی اخبار نے طنزیہ انداز میں لکھا تھا:

"۔۔۔اب تو بھٹو نے جیل میں سجادہ بچھالیا ہے، نمازیں پڑھنا شروع کر دی ہیں اور تسبیح ہاتھ میں لئے اوراد و وظائف میں مشغول دکھائی دیتے ہیں (المنبر فیصل آباد ۲۳ مئی ۱۹۷۸) ۴ اپریل ۱۹۷۹ کو راولپنڈی جیل میں مسٹر بھٹو کو پھانسی دے دی گئی۔ بی بی سی نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ مسٹر بھٹو کو جب پھانسی کے تختہ پر کھڑا کیا گیا تو آخری کلمات جو ان کی زبان سے نکلے وہ یہ تھے: "خدایا میری مدد کر، میں بے قصور ہوں" رپورٹر مسٹر مارک ٹولی (Mark Tully) کے لئے دنیا کو اس واقعہ کی خبر دینا اتنا مہنگا ثابت ہوا کہ نظام مصطفیٰ کے علم بردار نوجوانوں نے اسلام آباد میں رپورٹر کو گھیر کر راسٹک سے مارا اور حکومت نے اس کے خلاف راولپنڈی کے مجسٹریٹ کے یہاں مقدمہ دائر کر دیا ——— نظام مصطفیٰ کی یہ قسم بالکل نئی ہے کہ اس کے علم بردار کسی شخص کو صرف اس کے جرم کی سزا دینا کافی نہیں سمجھتے، اسی کے ساتھ وہ اس کو جہنم میں پہنچانا بھی ضروری خیال کرتے ہیں۔

ہم کو عیسائی ہوجانا چاہئے

ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے بعد ۵ اپریل ۱۹۷۹ کو راولپنڈی میں تعزیتی جلسہ ہورہا تھا۔ عورتیں اور مرد جمع تھے۔ غیر ملکی نامہ نگار بھی جائزہ لینے کے لئے آگئے۔ اس موقع پر ایک پاکستانی مسلم خاتون نے ایک مغربی نامہ نگار سے بات کرتے ہوئے کہا:

If this is Islam, we should all become Christians

اگر یہی اسلام ہے تو ہم سب کو عیسائی ہوجانا چاہئے۔ (ٹائمس آف انڈیا، ۶ اپریل ۱۹۷۹) خاتون کے جملہ کا مطلب یہ تھا کہ اسلام اگر اس کا نام ہے کہ اپنے سیاسی حریفوں کو اخلاقی مجرم بنا کر قتل کر دو تو ایسے اسلام سے مسیحیت بہتر ہے۔ یہ ہے وہ اسلام جس کی گواہی موجودہ زمانہ میں "نظام مصطفیٰ" کے علم بردار دے رہے ہیں۔

ایک اقدام سے کئی مسئلے پیدا ہوتے ہیں

مسٹر اندر ملہوترا نے ایک مضمون میں یہ دکھایا ہے کہ مسٹر بھٹو کی پھانسی کے کیا کیا اثرات کشمیر کی سیاست پر پڑے ہیں۔ اس سلسلہ میں کشمیری مسلمانوں کی ناراضی اور ضیاء الحق مردہ باد" کے نعروں کا تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

> ---Despite the law and order problem that has been created in the valley, the present situation provides this country with an opportunity to eliminate once and for all, the 'Pakistan Factor' from the politics of Kashmir.
> The Times of India, April 12, 1979

پاکستان کی موجودہ حکومت کے خلاف کشمیر میں جو مظاہرے ہوئے ہیں، ان کی وجہ سے اگرچہ وادی میں امن و نظم کے مسائل پیدا ہوئے ہیں۔ مگر یہ صورت حال ہندستان کے لئے موقع دے رہی ہے کہ وہ کشمیر کی سیاست سے "پاکستانی عامل" کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دے ——— اجتماعی زندگی میں کوئی اقدام بے شمار پہلوؤں سے اپنے اثرات چھوڑتا ہے۔ تاہم جو لوگ خود غرضی اور عداوت کی نفسیات میں مبتلا ہوں وہ ان پہلوؤں کو بہت کم دیکھ پاتے ہیں۔

جب زبان والے بے زبان ہوجائیں گے

قرآن میں قیامت کے دن کا حال بتاتے ہوئے کہا گیا ہے: وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ (تکویر) یعنی اس دن زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ پر قتل کی گئی تھی۔ قدیم زمانہ میں بعض عرب قبائل لڑکے کو اپنے لئے عزت اور طاقت کا نشان سمجھتے تھے اور اگر لڑکی پیدا ہو جائے تو اس کو اپنے لئے معیبت خیال کرتے تھے۔ یہ احساس کبھی اتنا شدید ہوتا کہ اپنی لڑکی کو پیدا ہونے کے بعد زندہ دفن کر دیتے۔ اس آیت کا اولین مصداق قدیم زمانہ کے عربوں کا یہی رواج ہے۔ تاہم بالواسطہ طور پر اس حکم میں اسی نوعیت کے دوسرے واقعات بھی شامل ہوں گے۔

ایک شخص ہے جس کی بعض غلطیوں سے موقع پاکر کچھ لوگ اس پر چڑھ دوڑتے ہیں۔ اس کو گرفتار کرتے ہیں۔ اس کو مجرم قرار دینے کے لئے سازشیں کرتے ہیں۔ اس پر بے ثبوت الزامات لگاتے ہیں فرضی عدالتیں قائم کرتے ہیں اور اس پر مقدمہ چلاکر اس کے خلاف نام نہاد قانونی فیصلے حاصل کرتے ہیں اور پھر اس کو پھانسی کے تختہ پر چڑھاتے ہیں یا گولی مار کر ہلاک کر دیتے ہیں۔ ایسے تمام لوگ بھی گویا اپنے آپ کو اسی مجرمانہ کٹہرے میں کھڑا کر رہے ہیں جہاں عرب کا وہ قدیم جاہل انسان کھڑا ہوا ہے جس نے اپنی بے گناہ بیٹی کو گڑھے میں دھکیل کر اوپر سے مٹی بھر دی تھی۔ کیونکہ کوئی فرد ہو یا حکومت، کسی کو حق نہیں ہے کہ جرم کے شرعی ثبوت کے بغیر کسی کو اس کی جان سے محروم کر دے۔ جو لوگ کسی کو اس قسم کی سزا دیں، جو ایسے بے ثبوت فیصلے کریں، جو اس کی موافقت میں بیانات جاری کریں، جو اس قسم کے معاملہ پر راضی ہوں اور زبان یا قلم سے اس کی تائید کریں، سب کے لئے یہ اندیشہ ہے کہ قیامت کے ہولناک دن خدا غضب ناک ہو کر ان سے پوچھے: تم نے کس جرم میں میرے اس بندے کو قتل کیا تھا۔ اور پھر اگر خدا اپنے فرشتوں کو یہ حکم دے کہ میرے اس مقتول بندے کو اس کی تمام غلطیوں کے باوجود آج زندگی دے دو اور اس کے قاتلوں کو اور قتل کی حمایت کرنے والوں کو ان کے تمام شاندار کارناموں کے باوجود موت کے گڑھے میں پھینک دو تو کون ہے جو قیامت کے دن خدا کو ایسے ایک فیصلہ سے رد کنے والا ہو۔

اسی طرح ایک شخص ہے جو لوگوں کو ان کی غلطیوں اور شرارتوں پر متنبہ کرتا ہے۔ وہ ان کے اوپر تنقید کرتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں وہ تمام لوگ اس کے مخالف ہو جاتے ہیں جن پر اس کی تنقیدوں کی زد پڑتی ہے۔ وہ بگڑ جاتے ہیں اور اس شخص کے بارے میں بے بنیاد باتیں مشہور کر کے اس کی کردارکشی کرتے ہیں۔ اس کے خلاف بے ثبوت شوشے چھوڑ کر اس کی دیانت داری کو لوگوں کی نظر میں مشتبہ بنا دیتے ہیں۔ اس کا علمی اور اشاعتی بائیکاٹ کر کے اس کو گم نامی کی قبر میں دفن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس پر جھوٹے مقدمے چلاکر اس کے لئے غیر ضروری مسائل پیدا کرتے ہیں اور اس کو ذہنی عذاب میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ یہ سارے لوگ بھی درجہ بدرجہ انھیں مجرم باپوں کی صف میں شامل ہیں جن کے اوپر خدا اتنا غضبناک ہوگا کہ ان کی طرف دیکھے گا بھی نہیں اور زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے خطاب کرتے ہوئے فرمائے گا: تو کس جرم میں گاڑی گئی تھی۔ جس طرح بیٹی کو مار کر عرب باپ کا خوش ہونا اس کے کام نہ آیا، اسی طرح ان دوسرے لوگوں کی جھوٹی خوش خیالیاں بھی ان کے کچھ کام نہ آئیں گی اور عجب نہیں کہ آخرت میں وہ گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں (۱۸ اپریل ۱۹۷۹)

آخرت کا راستہ صبر کا راستہ ہے

"وہ لوگ اپنے واجبات کو پورا کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی سختی ہر طرف پھیلی ہوئی ہوگی۔ وہ اللہ کی محبت میں غریب اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔ ہم تم کو صرف اللہ کی رضامندی کے لئے کھلا رہے ہیں۔ ہم تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتے ہیں اور نہ شکر گزاری چاہتے ہیں۔ ہم کو تو اپنے رب کی طرف سے ایک سخت اور تلخ دن کا اندیشہ ہے۔ پس اللہ ان کو اس دن کی سختی سے بچائے گا اور ان کو تازگی اور خوشی عطا کرے گا اور ان کے صبر کے بدلے ان کو جنت اور ریشمی لباس عطا کرے گا۔ وہ وہاں تختوں پر مسندیں لگائے ہوئے ہوں گے۔ وہاں نہ گرمی کی تکلیف ہوگی اور نہ سردی کی۔ جنت کے درخت ان پر جھکے ہوئے سایہ کر رہے ہوں گے۔ اس کے پھل ہر وقت ان کے بس میں ہوں گے۔ لوگ ان کے پاس چاندی کے برتن اور شیشے کے پیالے لئے پھر رہے ہوں گے۔ وہ شیشے بھی چاندی کے ہوں گے جن کو بھرنے والوں نے ٹھیک اندازہ کے مطابق بھرا ہوگا۔ ان کو وہاں ایسے پیالے پلائے جائیں گے جن میں سونٹھ کی آمیزش ہوگی۔ یہ جنت کا ایک چشمہ ہوگا جس کو سلسبیل کہا جاتا ہے۔ ان کی خدمت کے لئے ایسے لڑکے دوڑتے پھر رہے ہوں گے جو ہمیشہ لڑکے رہیں گے۔ تم ان کو دیکھو تو سمجھو کہ موتی ہیں جو بکھیر دیئے گئے ہیں۔ وہاں تم جدھر بھی نگاہ ڈالو گے ہر طرف نعمتیں اور بڑی بادشاہی دیکھو گے۔ ان کے اوپر باریک ریشم کے سبز لباس اور اطلس و دیبا کے کپڑے ہوں گے۔ ان کو چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے اور ان کا رب ان کو پاکیزہ شراب پلائے گا۔ یہ ہے تمہارا بدلہ اور تمہاری کوشش اللہ کے یہاں مقبول ہوئی (الدھر)

قرآن کا یہ ارشاد بتا رہا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جن کی کوششیں آخرت میں سعی مشکور (دہر ۲۲) کا درجہ حاصل کریں گی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو آخرت کی ہولناکیوں کا اتنا شدید احساس رکھتے ہوں کہ وہ ان کے اوپر ایک قسم کا آسمانی محاسب بن کر چھا جائے۔ ان کا حال یہ ہو جائے جیسے کہ وہ موت کے دوسری طرف جہنم کو بھڑکتا ہوا دیکھ رہے ہیں اور اسی کے زیر اثر سارا کام کر رہے ہیں۔ وہ جب کوئی عہد کریں، خواہ منت کا عہد ہو یا ایمان کا عہد یا قول و قرار کا عہد، تو وہ اس کو اس طرح پورا کریں جیسے وہ بے پناہ یقین کے ساتھ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ اگر انھوں نے اس کو پورا نہ کیا تو جہنم کی آگ انھیں پکڑ لے گی۔ ان کا ایمان باللہ ان پر جن باتوں کو لازم کر رہا ہے اور ان کا عہد ان کو جن چیزوں کا پابند بنا رہا ہے، ان کو وہ اس طرح پورا کریں جیسے وہ ایک ایسی سرحد پر کھڑے ہوئے ہیں جہاں ان کے لئے دو میں سے صرف ایک چیز کا انتخاب کا سوال ہے۔ یا قول و قرار کے تقاضوں کو پورا کرنا یا جانتے بوجھتے اپنے آپ کو جہنم کے الاؤ میں گرا دینا۔

آخرت کے احساس ہی کے تحت ان کے اندر جو دوسری خصوصیت پیدا ہوتی ہے وہ بندوں کے ساتھ مہربانی ہے۔ وہ اپنے لئے اپنے رب سے مہربانی چاہتے ہیں اس لئے وہ خود بھی دوسروں کے ساتھ مہربانی کرتے ہیں۔ وہ اپنی کمائی میں محتاجوں کا حق سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ ان لوگوں کا سہارا بنتے ہیں جو حالات کے نتیجہ میں بے بس ہو گئے تھے یا بندشوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ بندگان خدا کی خدمت کا یہ کام جو وہ کرتے ہیں، بدلہ اور شکرانہ وصول کرنے کے لئے نہیں کرتے۔ اس کا محرک تمام تر یہ ہوتا ہے کہ آخرت کے دن جب وہ خدا کے سامنے تمام کمزوروں سے زیادہ کمزور حالت میں کھڑے

ہوں، اس وقت ان کا خدا ان کو بے یار و مددگار نہ چھوڑے بلکہ ان کی مدد فرمائے۔ دنیا کی زندگی میں کسی کے ساتھ اچھا سلوک ان کے لئے دراصل ایک عملی دعا ہوتی ہے۔ وہ بھوکے کو کھلاتے ہیں تاکہ خدا ان کو کھلائے، وہ کمزوروں کو سہارا دیتے ہیں تاکہ خدا ان کو سہارا دے۔ وہ انسانوں کی طرف سے ڈالی ہوئی تکلیفوں کو معاف کرتے ہیں تاکہ خدا ان کی غلطیوں کو معاف کر دے۔

ان لوگوں کو یہ نعمتیں اس لئے ملیں گی کہ انھوں نے صبر کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کی دنیا میں کل کی دنیا کے لئے جینا، دکھائی دینے والے "جنت اور جہنم" کو نظر انداز کر کے نہ دکھائی دینے والے جنت و جہنم کے لئے سرگرم ہونا ایک بے حد مشکل کام ہے۔ اس میں ہر وقت آدمی کے صبر کا امتحان ہے۔ اس راہ میں کہیں ملتے ہوئے فائدوں سے محرومی کو گوارا کرنا پڑتا ہے۔ کبھی خارجی مجبوری کے بغیر خود سے اپنے آپ کو کسی چیز کا پابند کر لینا پڑتا ہے۔ کہیں اپنی بے عزتی کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ کہیں زیادہ کو چھوڑ کر کم پر قانع ہونا پڑتا ہے۔ کہیں قدرت رکھتے ہوئے اپنے ہاتھ پاؤں کو روک لینا پڑتا ہے۔ کہیں اپنی مقبولیت کو دفن کرنے پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ کہیں شہرت اور استقبال کے راستے کو چھوڑ کر گمنامی کے طریقے کو اختیار کرنا پڑتا ہے۔ کہیں الفاظ کا ذخیرہ ہوتے ہوئے اپنی زبان کو بند کر لینا پڑتا ہے۔ کہیں جانتے بوجھتے دوسرے کا بوجھ اپنے سر پر لے لینا پڑتا ہے۔ کہیں اپنے آپ کو ایک ایسے کام میں شریک کرنا پڑتا ہے جس میں کسی قسم کا کوئی کریڈٹ ملنے والا نہیں۔ غرض جنت کی طرف سفر کا سارا معاملہ صبر و برداشت کا معاملہ ہے۔ جو اپنے آپ کو دبانے اور کچلنے کے لئے تیار نہ ہو وہ کبھی اس راہ کو طے نہیں کر سکتا:

وقال الذین اوتوا العلم ویلکم ثواب اللہ خیر لمن آمن وعمل صالحا ولا یلقاہا الا الصابرون (قصص ۸۰)

اور کہا ان لوگوں نے جن کو علم ملا تھا، خرابی ہو تمھاری۔ اللہ کا ثواب بہتر ہے اس شخص کے لئے جو ایمان لایا اور نیک عمل کیا۔ اور یہ بات انھیں کے دل میں پڑتی ہے جو صبر کرنے والے ہیں۔

دنیا کی زندگی دراصل صبر کا امتحان ہے۔ صبر کی ایک قسم وہ ہے جو باہر کی دنیا کے خلاف ظاہر ہوتی ہے۔ آدمی ماحول کی رکاوٹوں کا خاموش مقابلہ کرتے ہوئے اپنے دینی سفر کو جاری رکھتا ہے۔ مگر سب سے بڑا صبر وہ ہے جو خود اپنے خلاف پیش آتا ہے۔ زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آنے کی وجہ سے اپنے کسی بھائی کے خلاف نفرت اور انتقام کی آگ بھڑک اٹھتی ہے، ایسے موقع پر منفی جذبات کی پرورش سے اپنے کو روکنا پڑتا ہے۔ کسی کی ترقی اور مقبولیت کو دیکھ کر اس کے خلاف حسد جاگ اٹھتا ہے۔ اس وقت دشمن جیسی بے رحمانہ نظر سے اپنے دل کو ٹٹولنا پڑتا ہے تاکہ حسد اور رقابت کے بیج کو نکال پھینکا جائے۔ کبھی آدمی ایک شخص کو اچھا سمجھتا ہے حالاں کہ اس کی وجہ صرف اس کا نیاز مندانہ انداز ہوتا ہے اور کبھی ایک شخص کو برا سمجھتا ہے حالاں کہ اس کی وجہ صرف اس کا تنقید و احتساب کا مزاج ہوتا ہے، ایسے مواقع پر اپنے آپ کو کھینچ کر ایسے مقام پر لے جانا پڑتا ہے جہاں وہ تعریف و تنقید سے بلند ہو کر دوسروں کے بارے میں رائے قائم کر سکے۔ دوسروں کے ساتھ انصاف اور خیر خواہی کے بغیر کوئی شخص دین دار نہیں بنتا اور انصاف اور خیر خواہی پر قائم ہونا صبر کے بغیر ممکن نہیں۔ ■

ذہنی خول : سب سے بڑی رکاوٹ

وقال الذین کفروا للذین آمنوا لو کان خیرا ما سبقونا الیه واذ لم یهتدوا به فسیقولون هذا افک قدیم (احقاف ۱۱)

انکار کرنے والے لوگ ماننے والوں کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ قرآن اگر کوئی اچھی چیز ہوتی تو اس کو قبول کرنے میں یہ لوگ ہم سے آگے نہ نکل جاتے۔ جب وہ اس کے بتانے سے راہ پر نہیں آئے تو اب وہ کہیں گے کہ یہ تو پرانا جھوٹ ہے۔

کسی معاشرہ میں جب حق کی آواز بلند ہوتی ہے تو عام طور پر وہ لوگ اس کی طرف کھنچتے ہیں جو کسی نہ کسی قسم کی کمی سے دوچار ہوں اور اپنے اندر خلا محسوس کرتے ہوں۔ ان کا اندرونی خلا کا احساس ان کے لئے ایک مددگار قوت بن جاتا ہے اور وہ کسی حجاب یا رکاوٹ کے بغیر حق کو پالیتے ہیں اور اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔

اس کے برعکس وہ لوگ جن کی عزت و شہرت کے کھونٹے گڑے ہوئے ہوں، جو فتح و کامرانی کے احساس میں گم ہوں جن کی تمام ضرورتیں بافراط پوری ہو رہی ہوں، جن کو ہر طرف اپنے لئے میدان کھلے ہوئے نظر آتے ہوں۔ ایسے لوگوں کے اندر ایک قسم کی قناعت پیدا ہو جاتی ہے، وہ اپنے سے باہر کسی آواز کو پانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

حق کی آواز کو قبول کرنے میں سب سے زیادہ پیچھے وہ لوگ رہتے ہیں جن کو روایتی مذہبی نظام میں بڑی بڑی گدیاں حاصل ہو گئی ہوں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کو اسلاف کا جانشین کہا جاتا ہے۔ مذہب کی نمائندگی کے اسٹیج پر وہ تقریری کمال دکھا رہے ہوتے ہیں، صدارت اور استقبال کے اعزازات ہر جگہ ان کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ ہدیے اور نذرانے کی رقمیں ان کے پاس اس طرح آنے لگتی ہیں گویا وہ مذہبی شہزادے ہیں اور ساری قوم ان کی باج گزار ہے۔ یہ صورت حال ان کے اور ان کے پیروؤں کے اندر یہ جھوٹا یقین پیدا کر دیتی ہے کہ وہی حق پر ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ حق کی آواز کی طرف نسبتاً کمتر درجہ کے لوگ بڑھ رہے ہیں، اور وہ اپنے اندر اس کے لئے کشش نہیں پاتے، تو وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ حق نہیں ہے۔ اگر وہ حق ہوتا تو لازم تھا کہ وہ سب سے پہلے ان کو اپنی طرف کھینچتا۔

خدا کو پانے کی واحد قیمت اپنی ذات کی نفی ہے۔ اپنی نفی کے بعد ہی خدا کا اثبات ہوتا ہے۔ خدا ظاہر کو نہیں باطن کو دیکھتا ہے۔ وہ ٹوٹے ہوئے دلوں کے پاس ہوتا ہے۔ وہ ان سینوں میں اترتا ہے جنھوں نے غیر خدائی چیزوں سے اپنے کو پوری طرح خالی کر لیا ہو۔ جب آدمی اس مقام پر پہنچتا ہے جہاں وہ خدا کا ہم صحبت بن سکے تو یہ وقت وہ ہوتا ہے جب کہ وہ ان دنیوی زخارف سے خالی ہو چکا ہوتا ہے جو انسانوں کی نظر میں اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ جن کی نظریں دنیا کی چمک دمک سے اوپر نہ اٹھی ہوں وہ ان کی اہمیت کو سمجھ نہیں پاتے۔ ایسے انسان کو وہ حق کا علمبردار سمجھنے کے بجائے ایک سرپھرا آدمی سمجھ لیتے ہیں۔ وہ اپنی "گدیوں" پر بیٹھے ہوئے نہایت اطمینان سے کہہ دیتے ہیں: برخود غلط قسم کے لوگ ہمیشہ اس قسم کا ڈھونگ کھڑا کرتے رہتے ہیں، یہ بھی اسی فہرست میں ایک اضافہ ہے۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

آخرت میں اللہ عیاناً سامنے آجائے گا۔ مگر موجودہ دنیا میں اللہ پر اس حال میں ایمان لانا ہے کہ وہ حالت غیب میں ہے۔ یہاں خدا کی نشانیوں سے خدا کو پہچاننا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس دنیا میں خدا دلیل اور برہان کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ قرآن میں بار بار کہا گیا ہے کہ آیات اللہ پر غور کرو۔ اللہ کی آیتوں کو ماننا خدا کو ماننا ہے۔ اور اللہ کی آیتوں کا انکار کرنا خدا کا انکار کرنا ہے، آیات کیا ہیں۔ یہ خدا کو پہچاننے کے دلائل ہیں جو کبھی فطرت کے اشاروں میں اور کبھی دال کے الفاظ کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔

صحیح دلیل خدا کی طرف سے آئی ہوئی بات ہوتی ہے۔ اس کی صحت کو پالینا خدا کو پالینا ہے اور اس کے آگے جھکنا خدا کے آگے جھک جانا۔ صحیح دلیل سامنے آنے کے بعد جو شخص جدال کرے، جو اپنی دولت اور وجاہت کے گھمنڈ میں اس کو نظر انداز کردے، وہ گویا خدا کو نظر انداز کر رہا ہے۔ اس کی مثال ایسے شخص کی مانند ہے جس کے پاس خدا خود آیا مگر اس نے خدا کا استقبال نہ کیا۔

پیغمبروں نے خدا کی طرف سے حق کی آواز بلند کی۔ مگر وقت کے غالب لوگوں نے اس کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کی بڑی وجہ ان کی خود فریبی تھی۔ چوں کہ وہ وقت کی معاشیات پر قابض تھے۔ اقتدار کے اداروں میں ان کو رتبہ حاصل تھا۔ اعوان و انصار کی بھیڑ ان کے گرد جمع تھی۔ اس بنا پر ان کے لئے یہ یقین کرنا مشکل ہو گیا کہ وہ حق پر نہیں ہیں۔ جب انھوں نے دیکھا کہ جس چیز کو حق کہا جاتا ہے اس کا انکار کرنے سے ان کا کچھ نہیں بگڑا۔ ان کا دبدبہ بدستور قائم ہے۔ ان کے مواقع پھر بھی کھلے ہوئے ہیں اور ان کے دنیوی کام اس کے باوجود بن رہے ہیں تو وہ ایک قسم کے نفسیاتی فریب میں مبتلا ہو گئے۔ وہ داعی حق کے مقابلہ میں اپنی کامیابیوں کو دیکھ کر دھوکے میں پڑ گئے۔ وہ سمجھنے لگے کہ "جب میں کامیاب ہوں تو یقیناً میں ہی حق پر ہوں"۔

ظاہری کامیابی کسی کے برسرحق ہونے کا کوئی ثبوت نہیں۔ مگر ظاہری کامیابی اکثر آدمی کو خود فریبی میں مبتلا کر دیتی ہے۔ آدمی کا رب بعض اوقات اس کو وقتی اور ظاہری کامیابی اس لئے دے دیتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے وہ اس کو آزمائے۔ وہ دیکھے کہ کیا وہ اپنی کامیابیوں کو دیکھ کر دھوکے میں پڑ جاتا ہے۔ مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے ذہنی خول میں اپنا ایک گھروندا بنا لیتا ہے اور اسی کے اندر جینے لگتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ اس کے خیالی گھروندے کا حقیقت کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ اپنے خود ساختہ گھروندے کے خانہ میں چوں کہ اس کو اپنی ذات درست نظر آتی ہے۔ اس لئے وہ سمجھ لیتا ہے کہ فی الواقع بھی وہ درست اور صحیح ہے۔

خدا زمین و آسمان کی خاموش زبان میں بولتا ہے۔ وہ اپنے چنے ہوئے بندوں کے ذریعہ اپنی بات کا اعلان کراتا ہے وہ انسان کے ضمیر میں داخل ہو کر حقیقت کا آئینہ اس کے سامنے کر دیتا ہے۔ مگر انسان اپنی جھوٹی خوش گمانیوں کی وجہ سے ان پر دھیان نہیں دیتا۔ خدا اس کو سچائی کی جھلک دکھاتا ہے۔ مگر وہ اپنے نفسیاتی بندھنوں کو توڑ کر اس کی طرف نہیں دوڑتا۔ خدا کا حسین روپ اس کے سامنے کھولا جاتا ہے۔ مگر وہ اس کی قدر دانی کا حق ادا نہیں کرتا۔ موت ان جھوٹی خوش گمانیوں کے طلسم کو توڑ دے گی۔ اس وقت آدمی کو معلوم ہوگا کہ وہ جہنم کے کنارے کھڑا ہوا تھا اگرچہ وہ اپنے آپ کو جنت کا مالک سمجھ رہا تھا۔ ■

خدا کی ایک سنت یہ بھی ہے

جب کسی قوم میں کوئی پیغمبر آتا ہے اور وہ قوم اس کی بات ماننے پر تیار نہیں ہوتی، تو خدا کی طرف سے ان کو بعض مشکلوں میں ڈال دیا جاتا ہے تاکہ ان میں قبولیت کا مادّہ پیدا ہو۔ "اور ہم نے تم سے پہلے بہت سی قوموں کی طرف رسول بھیجے تھے، پھر (جب انھوں نے نہیں مانا تو) ہم نے ان کو سختی اور تکلیف میں مبتلا کیا تاکہ وہ ڈھیلے پڑ جائیں۔" (انعام) اس قسم کے بعض واقعات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی پیش آئے ہیں (مومنون ۔ ۷۶) صحیحین میں عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ نبوت کے چند سال بعد جب مکہ والوں کی مخالفت اور سرکشی بہت بڑھ گئی تو تو آپ نے دعا فرمائی :

اللھم اعنی علیھم بسبع کسبع یوسف — خدایا ان کے مقابلہ میں میری مدد یوسفؑ کے سات سالہ قحط جیسے سات برسوں سے کر۔

اللہ نے دعا قبول فرمائی اور ایسا شدید کال پڑا کہ لوگ ہڈیاں اور چمڑا اور مردار تک کھانے پر مجبور ہو گئے۔ اس زمانہ میں یہ حال تھا کہ جب ایک شخص آسمان کی طرف نظر اٹھاتا تو بھوک کی شدت کی وجہ سے اس کو اوپر دھواں ہی دھواں دکھائی دیتا تھا۔ آخر ابوسفیان نے آکر آپ سے کہا کہ آپ تو صلہ رحمی کی دعوت دیتے ہیں۔ آپ کی قوم بھوکوں مر رہی ہے۔ اللہ سے دعا کیجئے کہ اس مصیبت کو ہم سے دور کر دے۔ قریش کے لوگ عام طور پر کہنے لگے تھے کہ خدایا ہم پر سے یہ عذاب دور کر دے تو ہم ایمان لائیں گے (دخان ۱۲) اللہ نے اپنے پیغمبر کی دعا قبول کی اور قحط کے حالات ختم ہو گئے۔ مگر ان کی سرکشی اس کے بعد بھی جاری رہی۔ یہاں تک کہ بدر کی جنگ کی شکل میں وہ پکڑ لئے گئے (دخان ۱۶) قرآن کی سورہ نمبر ۵۲ میں کہا گیا ہے :

بلاشبہ ظالموں کے لئے آخرت سے پہلے بھی عذاب ہے۔ مگر ان میں سے اکثر اس کو نہیں جانتے ۔۔۔ (طور ۔ ۴۷)

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ظالمانہ روش اختیار کرتے ہیں، ان کو آخرت کے رسواکن عذاب سے پہلے دنیا میں تنبیہی عذاب دئے جاتے ہیں۔ یہ دنیوی عذاب اس لئے ہوتا ہے کہ ان کے ظلم کی ہلکی سی سزا انھیں اسی دنیا میں دی جائے تاکہ وہ اس سے سبق لے کر اپنی اصلاح کرلیں (لیذیقھم بعض الذی عملوا لعلھم یرجعون) مگر اکثر لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب اس قسم کی کوئی دنیوی سزا ان کو ملتی ہے تو فوراً اس کی تاویل کر لیتے ہیں۔ وہ اس کو کسی عام سبب کا نتیجہ قرار دے کر اپنے لئے یہ تسکین حاصل کر لیتے ہیں کہ یہ ان کی ظالمانہ روش کی خدائی سزا نہیں ہے بلکہ اس کے اسباب کچھ اور ہیں۔ یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ اس لئے یہاں جو بھی خدائی نشانی یا سبق ظاہر کیا جاتا ہے وہ معمولی واقعات کے پردہ میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ یہ پردہ داری دوبارہ لوگوں کے لئے فتنہ بن جاتی ہے۔ وہ اس کو خدا کی طرف سے نہیں سمجھتے بلکہ ایک معمولی واقعہ سمجھ لیتے ہیں۔ جو وجہ "انسانی پیغمبر" کے انکار کی تھی، اسی بنا پر وہ ایک "دنیوی واقعہ" کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ■

بگاڑ کا سبب کیا ہے

دنیا میں بگاڑ کیوں ہے۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ یہاں کوئی ایسی طاقت نہیں جو لوگوں کو صدفی صد اپنی گرفت میں لے سکے۔ ہر طاقت، خواہ وہ حکومت اور قانون کی ہو یا کوئی اور، اس کی گرفت انسانی زندگی میں ایک حد پر جاکر ختم ہوجاتی ہے اس کے بعد آدمی کا اپنا ارادہ شروع ہوجاتا ہے۔ آدمی کو صدفی صد اپنی گرفت میں لینے والا دو میں سے کوئی ایک ہی ہوسکتا ہے —— اللہ یا آدمی کا اپنا ارادہ۔

آخرت اللہ کی گرفت کے ظہور کا مقام ہے۔ اور دنیا انسانی ارادہ کی گرفت کا امتحان — آخرت میں تمام انسان براہ راست خدا کی مکمل گرفت میں آجائیں گے۔ کسی کو ادنیٰ درجہ میں بھی ذاتی اختیار باقی نہیں رہے گا۔ یہی کیفیت موجودہ دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے۔ جو واقعہ آخرت میں براہ راست خدا کی طرف سے ہونے والا ہے، اسی کو دنیا میں خود اپنے ارادہ سے اپنے اوپر طاری کرنا ہے۔ اسی کا نام ایمان ہے۔ جنت اسی کے لئے ہے جو دنیا کی زندگی میں اپنے ارادہ سے اپنے آپ کو صدفی صد اللہ کی گرفت میں دے دے۔ باقی وہ لوگ جو آخرت میں خدا کی گرفت میں آئیں، ان کا گرفت میں آنا ان کے کچھ کام نہ آئے گا۔ وہ دن تو مالک کائنات کی طرف سے باغی اور سرکش انسانوں کی گرفتاری کا دن ہوگا۔ یہ گرفتاری صرف اس لئے ہوگی کہ ایسے لوگوں کو جہنم میں دھکیل دیا جائے۔ وہ کسی بھی درجہ میں ان کے کام آنے والی نہیں۔

اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اسلام نام ہے اپنے آپ کو حقیقت واقعہ کے مطابق بنانے کا۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ اس کائنات میں ہر قسم کا اختیار و اقتدار صرف خدا کو حاصل ہے۔ انسان کو بظاہر جو اختیار حاصل ہے، وہ محض عارضی ہے اور موت آتے ہی مکمل طور پر چھن جاتا ہے۔ اللہ کے مقابلہ میں اپنی اس عاجزانہ حیثیت کو موت سے پہلے مان لینا اور اپنے آپ کو ہمہ تن اس پر ڈھال لینے کا نام اسلام ہے۔ جس نے حالت غیب میں اپنے ارادہ سے ایسا کرلیا وہ جنتی ہے اور جو خدا کے ظاہر ہونے کے بعد اس کا اعتراف کرے اس کے لئے ابدی رسوائی کے سوا اور کچھ نہیں:

یوم نقول لجهنم هل امتلئت وتقول هل من مزید۔ وازلفت الجنة للمتقین غیر بعید۔ هذا ما توعدون لکل اواب حفیظ۔ من خشی الرحمٰن بالغیب وجاء بقلب منیب ادخلوها بسلٰم ذلك یوم الخلود۔ لهم ما یشاؤن فیها ولدینا مزید

(ق ۳۰-۳۵)

جس دن ہم دوزخ سے کہیں گے کیا تو بھر گئی۔ وہ بولے گی کچھ اور بھی ہے۔ اور جنت ڈر والوں کے قریب لائی جائے گی کہ کچھ دور نہ رہے گی۔ یہ ہے جس کا وعدہ تھا ہر ایک رجوع کرنے والے یاد رکھنے والے سے۔ جو ڈرا اللہ سے بن دیکھے اور لایا دل جس میں رجوع ہے۔ جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہوجاؤ۔ یہ دن ہے ہمیشہ رہنے کا۔ ان کو جنت میں سب کچھ ملے گا جو وہ چاہیں گے اور ہمارے پاس زیادہ بھی ہے۔ ■

شہادت کو وہ جنت کا مختصر راستہ سمجھتے تھے

شہید کے معنی گواہ کے ہیں۔ اس سے مراد اصلاً وہ لوگ ہیں جو دنیا میں لوگوں کو زندگی کی اس حقیقت سے رکریں کہ مرنے کے بعد انھیں خدا کی عدالت میں حساب کے لئے کھڑا ہونا ہے۔ جو لوگ دنیا میں چیتاونی دینے کا یہ کام یا گے وہ آخرت کی عدالت میں خدا کی طرف سے بطور گواہ پیش ہوں گے۔ ان کی گواہی کی بنیاد پر ان لوگوں کے اخروی قبل کا فیصلہ کیا جائے گا جن کے اوپر انھوں نے دنیا کی زندگی میں گواہی دی تھی۔ تاہم شہید کا لفظ مقتول فی سبیل اللہ لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اللہ کی راہ میں لڑ کر جان دینے والوں کی فضیلت میں جو احادیث آئی ہیں، ان میں سے ـ حدیث یہ ہے:

عن أبي قتادة رضي الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قام فيهم فذكر أن الجهاد في سبيل الله لإيمان بالله أفضل الأعمال، فقام رجل فقال: يا رسول الله أرأيت إن قتلت في سبيل الله تكفر نی خطایای؟ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: نعم، إن قتلت في سبيل الله وأنت صابر محتسب مقبل یر مدبر" ثم قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "كيف قلت؟" قال: أرأيت إن قتلت في سبيل الله ستكفر عني خطاياي؟ فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: "نعم وأنت صابر محتسب مقبل غير مدبر، إلا الدين فإن جبريل قال لي ذلك" رواه مسلم

بو قتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ اللہ کی راہ میں جہاد رنا اور اللہ پر ایمان لانا بہترین اعمال ہیں۔ ایک شخص نے اٹھ کر سوال کیا: اے خدا کے رسول اگر میں اللہ کی راہ میں ارا جاؤں تو کیا میری خطائیں معاف ہو جائیں گی۔ آپ نے فرمایا: "ہاں، اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ اور تم صابر ہو، اجر کے طلب گار ہو، آگے بڑھنے والے ہو، پیچھے مڑنے والے نہ ہو"۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تم نے کس طرح کہا تھا، اس نے کہا: اگر میں اللہ کی راہ میں مارا جاؤں تو کیا میری خطائیں معاف ہو جائیں گی۔ آپ نے فرمایا: ہاں، جب کہ تم صابر ہو، اجر کے طلب گار ہو، آگے بڑھنے والے ہو، پیچھے مڑنے والے نہیں ہو۔ سوا قرض کے کیونکہ جبریل نے مجھ کو یہی بتایا ہے۔

صحابہ کرام کے حالات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شہادت یا اللہ کی راہ میں قتل ہونے کو وہ جنت کا مختصر راستہ سمجھتے تھے سان کے نزدیک اصل مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنے رب کی جنت میں پہنچ جائیں۔ اللہ کی ناراضی سے بچنا اور اس کی رضا کو حاصل کرنا وہ چیز تھی جس کے لئے وہ سب سے زیادہ بے چین رہتے تھے۔ ہجرت کے بعد دشمنان اسلام سے مقابلہ چھڑا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ اللہ کی راہ میں جان دے دینا اللہ کی رضا اور اس کی جنت حاصل کرنے کا یقینی ذریعہ ہے۔ یہ سن کر وہ بیتابانہ اس کی طرف دوڑ پڑے۔ زندہ رہنے سے زیادہ اللہ کی خاطر مرجانا ان کے لئے محبوب بن گیا۔ کیونکہ یہ اللہ تک پہنچنے کا یقینی راستہ تھا اور اسی کے ساتھ قریبی بھی۔ شہادت ان کے لئے اللہ سے ملنے کا عنوان تھا نہ کہ حقیقتاً میدان جنگ کے لوگوں سے ملنے کا۔

ابن جریر نے شعبی کے واسطے سے نقل کیا ہے۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ہرمز کے نام خط روانہ کیا، وہ ان دنوں ایران کی سرحد پر متعین تھا۔ انھوں نے لکھا:

اما بعد فاسلم تسلم او اعتقد لنفسك وقومك الذمة واقرر بالجزية والا فلا تلومن الا نفسك فقد جئتك بقوم يحبون الموت كما تحبون الحياة (تاریخ طبری، جلد ۲)

اما بعد، اسلام لاؤ نجات پاؤ گے۔ اسلام منظور نہیں ہے تو اپنی اور اپنی قوم کی طرف سے جزیہ ادا کرو، ورنہ اپنے سوا کسی اور کو ملامت نہ کرنا۔ کیوں کہ میں تمھارے اوپر ایک ایسی قوم لے کر آیا ہوں جس کو موت اسی طرح محبوب ہے جس طرح تم کو زندگی۔

صحابہ کرام اللہ کی راہ میں لڑ کر شہید ہونے کو نہ صرف نجات آخرت کا یقینی ذریعہ سمجھتے تھے بلکہ ان کو یقین تھا کہ یہ وہ عمل ہے جو جنت کے سفر کو مختصر کر دیتا ہے۔ ابو بکر بن ابو موسیٰ اشعری رضہ کہتے ہیں کہ انھوں نے اپنے باپ سے سنا۔ جنگ کا موقع تھا۔ دشمن سامنے تھے۔ انھوں نے کہا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: ان ابواب الجنة تحت ظلال السيوف (جنت کے دروازے تلواروں کی چھاؤں میں ہیں) ایک شخص نے جو پھٹے کپڑے پہنے ہوئے تھا، کہا: اے ابو موسیٰ! کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے۔ انھوں نے کہا ہاں، وہ آدمی اسی وقت اپنے ساتھیوں میں آیا۔ ان کو سلام کیا۔ پھر اپنی تلوار کی میان توڑ ڈالی اور تلوار لے کر دشمنوں کی صف میں گھس گیا۔ وہ لڑتا رہا یہاں تک کہ مارا گیا (مسلم) جنگ بدر کے موقع پر جب دشمن بالکل قریب آ گئے تو آپؐ نے فرمایا: قوموا الى جنة عرضها السموات والارض (ایسی جنت کی طرف چلو جس کی چوڑائی آسمان و زمین کے برابر ہے) عمیر بن حمام انصاریؓ نے کہا "آسمان و زمین جیسی چوڑی" آپؐ نے فرمایا ہاں۔ ان کی زبان سے نکلا بخ بخ (واہ واہ) آپؐ نے فرمایا تم نے بخ بخ کیوں کہا۔ انھوں نے جواب دیا: خدا کی قسم اس امید میں کہ شاید میں بھی جنت والوں میں ہو جاؤں۔ آپ نے فرمایا تم ان میں سے ہو۔ انھوں نے کھجور نکالی اور کھانے لگے۔ پھر بولے: لئن انا حييت حتى آكل تمراتي هذه انها لحياة طويلة (اگر میں ان کھجوروں کے کھانے تک زندہ رہوں تو یہ بڑی لمبی زندگی ہوگی) انھوںؓ نے کھجوریں پھینک دیں، دشمنوں میں گھس گئے اور لڑتے ہوئے شہید ہو گئے (مسلم) انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ حرام بن ملحان رضہ کو جبار بن سلمیٰ کلابی نے نیزہ مارا۔ زخم کاری تھا۔ جسم سے خون ابل پڑا۔ حضرت حرام کی زبان سے نکلا: اللہ اکبر! فزت ورب الكعبة (کعبہ کے رب کی قسم میں کامیاب ہو گیا) یعنی جنت کو پانے میں (بخاری) عروہ بن زبیرؓ کہتے ہیں کہ ذی الحجہ ۸ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین ہزار آدمی موتہ کی طرف روانہ کئے۔ یہ لوگ سرحد شام پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ ہرقل ایک لاکھ یا دو لاکھ رومی لشکر کے ساتھ بلقار میں ٹھہرا ہوا ہے۔ مسلمانوں میں سے کچھ لوگوں نے کہا کہ مقابلہ سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دشمنوں کی تعداد سے مطلع کیا جائے۔ عبد اللہ بن رواحہ کھڑے ہوئے اور انھوں نے کہا:

يا قوم! والله ان التي تكرهون للتي خرجتم تطلبون الشهادة (البدایہ والنہایہ جلد ۴)

لوگو! خدا کی قسم جس چیز کو تم ناپسند کر رہے ہو، وہ وہی ہے جس کے لئے تم نکلے ہو۔ یعنی شہادت

خدمت دین کی مشکلات

پندرہ سال پہلے کا ایک واقعہ مجھے یاد آرہا ہے۔ رواں نامی بستی کے باہر ایک باغ میں جماعت اسلامی کا ضلعی ماہانہ اجتماع ہو رہا تھا۔ ظہر کا وقت تھا۔ اذان ہو چکی تھی، ایک بڑے درخت کے نیچے فرش بچھا ہوا تھا جہاں کچھ لوگ سنتیں پڑھ رہے تھے اور کچھ نماز کے وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک حادثہ پیش آیا۔ اجتماع کے بالکل قریب ایک بڑا سا گڑھا تھا جس کے عین کنارے سے راستہ گزرتا تھا۔ اس راستہ پر ایک بیل گاڑی جا رہی تھی۔ جیسے ہی وہ گڑھے کے کنارے پہنچی اس کا ایک طرف کا پہیہ پھسل گیا اور پوری گاڑی کروٹ ہو کر گڑھے میں اس طرح گر گئی کہ ایک پہیہ اوپر کھڑا تھا اور دوسرا نیچے دبا ہوا تھا۔ جیسے ہی ہم میں سے کچھ لوگوں کی نظر اس پر پڑی، وہ فوراً اس کی مدد کے لئے دوڑ پڑے۔ گاڑی سامان سے لدی ہوئی تھی۔ بیل بھی اس کے ساتھ جوئے میں پھنسے ہوئے تھے۔ بظاہر سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ چند لوگ کیسے اس مسئلہ کو حل کر سکیں گے۔ مگر یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا، بلکہ فی الفور اقدام کرنے کا وقت تھا۔ آنے والے فوراً اپنے کام میں لگ گئے۔ کچھ نے نیچے سے زور لگایا اور کچھ نے اوپر سے پکڑ کر گاڑی کو اٹھانا شروع کیا۔ میں ان خوش نصیبوں میں تھا جو گاڑی کو نیچے سے اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس کے بعد ایک حیرت انگیز واقعہ پیش آیا۔ یکایک ہم نے دیکھا کہ گاڑی اٹھا کر اوپر رکھ دی گئی ہے۔ واقعی ایسا ہی ہوا۔ جو چند آدمی اس کام میں لگے تھے ان سب کا متفقہ احساس تھا کہ گاڑی ہم نے نہیں اٹھائی ہے، بلکہ وہ تو کسی اور نے اٹھا کر کھڑی کر دی ہے۔ نیچے ہاتھ دینے والوں کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اوپر سے کوئی اس کو کھینچے چلا جا رہا ہے۔ اور جو لوگ اوپر تھے ان کو ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا گاڑی نیچے سے اٹھتی چلی آرہی ہے۔

یہ واقعہ جو پچھلے پندرہ سال سے میری یادداشت کا بہترین سرمایہ رہا ہے اس کو میں نے قصہ خوانی کے طور پر آپ کے سامنے پیش نہیں کیا ہے، خدا مجھ کو اس سے بچائے کہ میں قصہ خوانی کو اپنا طریقہ بناؤں اور قصے سنانے میں آپ کا وقت ضائع کردوں۔ میں نے اس کو صرف اس لئے بیان کیا ہے کہ آپ اس پر غور کریں۔ کیوں کہ اس کے اندر ہمارے لئے بڑی عبرت کا سامان ہے، یہ واقعہ ہمارے لئے اس بات کا پیغام ہے کہ خدا انسانوں کی مدد کرتا ہے، یہ ہمارے لئے خدا کی مدد کا ایک ذاتی تجربہ ہے۔ تاریخ میں ایسے بے شمار واقعات ہم پڑھتے ہیں۔ مگر یہ ایک ایسا واقعہ ہے جو ہماری اپنی زندگی میں پیش آیا ہے جس کا ہم نے براہ راست تجربہ کیا ہے۔ لدی ہوئی اور پھنسی ہوئی گاڑی کا محض چند آدمیوں کے ہاتھ لگانے سے دم بھر میں اٹھ کر کھڑی ہو جانا، یقیناً خدا کی مدد کی وجہ سے تھا۔ اگر ہم کو وہ آنکھیں حاصل ہوتیں جن سے غیر مادی حقیقتوں کو دیکھا جا سکے تو ہم دیکھتے کہ عین اس وقت جب کہ چند کمزور آدمی محض خدا کے بھروسے پر بالکل حسبۃً للہ ایک نیک کام کے لئے دوڑ پڑے تو اسی وقت آسمان سے فرشتوں کی بھی ایک فوج اتر آئی اور اس نے آن کی آن میں وہ کام کر دیا جو ہمارے کم زور ہاتھوں سے نہیں ہو سکتا تھا۔

دوستو! اسی طرح سے ایک اور گاڑی پھنسی ہوئی ہے۔ یہ دین کی گاڑی ہے۔ اسلام کی گاڑی چلتے چلتے حالات

پھنس گئی ہے۔ پاسبانوں کی غفلت سے باطل اس پر حملہ آور ہو گیا ہے۔ زمین کی خرابی سے اس کے پہیے اپنی جگہ سے ہٹ گئے ۔۔ اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ آپ اس کے لئے دوڑ پڑیں۔ آپ اس کو اٹھانے کے لئے اپنے وجود کو لگا دیں۔ آپ کی رگی کا بہترین مصرف، آپ کے اوقات کا اعلیٰ ترین استعمال اس وقت اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ یہی ہے کہ آپ خدا کے ی گاڑی کو اٹھانے میں لگے ہوئے ہوں۔ اس زمین پر انسان کے لئے اس سے بڑی اور کوئی سعادت نہیں۔ خدا کے دین کا مظلوم ا ہمارے لئے سعادت و کامرانی کا بہترین موقع فراہم کرتا ہے۔ یہ اگرچہ دین اور اہل دین کے لئے انتہائی سخت حالت ہے، مگر یں سخت حالات میں ہمارے لئے اس سب سے بڑی کامیابی کا راز چھپا ہوا ہے جس کی اس دنیا میں کوئی شخص تمنا کر سکتا ہے۔

انسان کے لئے اس سے بڑی اور کوئی سعادت نہیں کہ وہ خدا کے کام میں لگا ہوا ہو۔ ہمارا عاجز اور کمزور وجود خدا کی بت میں مصروف ہو۔ کیا اس سے بڑی بھی کوئی بات ہو سکتی ہے جس کی ہم آرزو کریں۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوتی اس سے ی بات یہ ہے کہ خدا کی مدد کے لئے اٹھنا خود ہم کو خدا کی مدد کا مستحق بناتا ہے۔ جب بندہ خدا کے کام میں مصروف ہوتا ہے تو وہ ا نہیں ہوتا، بلکہ خود خدا بھی اس کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ خدمت دین وہ بہترین وقت ہے جب بندے کو خدا کی معیت حاصل تی ہے۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ لمحات کس قدر قیمتی ہیں جب بندہ خدا کے ساتھ چل رہا ہو، جب وہ خدا کے سایہ میں سفر ر رہا ہو، جب خدا کے فرشتے اس کے ہم رکاب ہوں، جب وہ براہ راست خدا کی نگرانی میں آ گیا ہو۔ آپ جانتے ہیں کہ ایک معمولی دمی کو اگر کسی حاکم کی معیت حاصل ہو جائے تو وہ پھولا نہیں سماتا۔ پھر خدا کی معیت اور اس کی مدد کا کیا ٹھکانا۔

دین آج جس چیز کا تقاضا کر رہا ہے، اسے آپ ہی کو پورا کرنا ہے۔ یہ کام آپ کو انجام دینا ہے۔ خدا کی طرف سے آپ ایمان کی توفیق ملنا اور آخری رسول کی امت میں شامل کیا جانا، گویا خدا کی طرف سے آپ کو اس کام پر مقرر کیا جانا ہے۔ آپ ایمان، اس کام پر آپ کے تقرر کا نشان ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ جب کسی شخص کو کسی کام پر مقرر کیا جاتا ہے تو اس کے لئے اس ڈیوٹی کے مطابق تمام انتظامات بھی کر دیئے جاتے ہیں۔ ایک شخص کو حکومت کی طرف سے خط ملے کہ تم کو فلاں جنگلی علاقے میں ارسٹ افسر بنایا گیا ہے، تم وہاں جا کر اپنی ڈیوٹی سنبھالو۔ تو اس کے ذہن میں فوراً چند سوالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس قت وہ سرکاری ملازمتوں کے متعلق حکومت کے شائع شدہ قواعد و ضوابط سے رجوع کرے تو وہ دیکھے گا کہ وہاں اس کے مارے سوالات کا پیشگی جواب لکھ دیا گیا ہے۔ "گھر سے ڈیوٹی کے مقام تک جانے کی صورت کیا ہوگی" جواب یہ کہ تم کو پوری سافت کے لئے معقول سفر خرچ دیا جاتا ہے۔ "میں وہاں جا کر کس جگہ رہوں گا" اس کا جواب یہ ہوگا کہ وہاں تمہارے ہنے کے لئے سرکاری بنگلہ بنا ہوا ہے۔ "جنگل میں اپنی حفاظت کے لئے میں کیا کروں گا" حفاظتی دستہ تمہارے ساتھ وجود رہے گا۔ "گھر کے اخراجات کے لئے کیا ہوگا" تم کو ماہانہ تنخواہ کے طور پر ایک معقول رقم دی جائے گی" اسی طرح ملازم کے ہر سوال کا ایک اطمینان بخش جواب حکومت کے پاس موجود ہوگا۔ ہر تقرر لازماً یہ چاہتا ہے کہ جس کو مقرر کیا جائے، اس کی ضروریات اور مشکلات کا بھی اس میں پورا لحاظ کیا گیا ہو۔

اسی طرح خدا نے جب آپ کو ایک کام پر مقرر کیا ہے تو اس کے ساتھ اس نے یقینی طور پر آپ کی ہر ضرورت کا انتظام بھی کر دیا ہے۔ خدا تمام مہربانوں سے بڑھ کر مہربان ہے۔ اس کے ہاتھ میں زمین و آسمان کا اقتدار ہے۔ ذرائع و وسائل کا

سارا خزانہ اس کی مٹھی میں ہے۔ ناممکن ہے کہ وہ اپنے عاجز اور حقیر بندوں کو ایک کام پر مقرر کرے اور پھر ان کی ضروریات کا لحاظ نہ کرے۔ یہ اس کی صفت رحیمیت کے خلاف ہے، یہ اس کی شان اقتدار کے منافی ہے۔ بلاشبہ اس نے خادمان دین کی تمام ضروریات کا اس دنیا میں مکمل انتظام کر دیا ہے۔ ایسا انتظام کہ آخرت میں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ دین کی خدمت کرنا چاہتا تھا مگر دشواریوں اور مشکلوں کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکا۔

یہ انتظام کیا ہے اور ہم کس طرح اسے جانیں، اس کی میں نہایت آسان صورت آپ کو بتاؤں۔ آپ خدمت دین کے کام کا ارادہ کیجئے اور اس کے بعد سوچئے کہ اس کام میں آپ کی کیا کیا ضرورتیں ہو سکتی ہیں۔ جتنی معقول ضرورتیں اور واقعی مسائل آپ کی سمجھ میں آئیں، ان سب کی ایک فہرست بنا ڈالئے اور اس کے بعد خدا کی کتاب کھول کر اس کو ابتدا سے پڑھنا شروع کیجئے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک ملازم سرکار اپنی ملازمت کے مسائل کے متعلق جاننے کے لئے حکومت کے قواعد و ضوابط کا مطالعہ کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب آپ ایسا کریں گے تو آپ کو نظر آئے گا کہ خدا کی کتاب آپ کے ہر معقول مطالبے کا قطعی اور یقینی جواب دیتی چلی جا رہی ہے۔ کسی بھی ایسی حقیقی ضرورت کا آپ تصور نہیں کر سکتے جس کا خدا کی کتاب ذمہ نہ لے رہی ہو۔ اس معاملہ میں ہرگز آپ کتاب الٰہی کو خاموش نہ پائیں گے۔ اس کے بعد مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ خدا کی کتاب میں ہماری کسی ضرورت کے بارے میں ایک یقین دہانی کا ال جانا اس بات کی کافی ضمانت ہے کہ ہم اس پر بھروسہ کریں۔ ایمان کا مطلب خدا پر توکل ہے اور ایمان کے لفظی معنی بھروسہ اور اعتبار ہی کے آتے ہیں (یوسف ۱۱) خدا پر اور قرآن پر ایمان لانے کا اصل مطلب یہی ہے۔ اس لئے اگر ہم خدا کی کتاب میں ایک یقین دہانی پا لینے کے باوجود اس پر اعتماد نہ کریں تو یہ خود ہمارے ایمان کے خلاف ہوگا۔ ایسی صورت میں ہم کو خود اپنے ایمان پر نظر ثانی کرنی چاہئے نہ کہ ہم قرآن کے الفاظ پر شبہ کریں۔

۱۔ آیئے ہم اس حیثیت سے قرآن کا ایک مختصر مطالعہ کریں۔ موجودہ زمانے میں دین کی خدمت کرنے کا ارادہ ہم سے کن ضرورتوں کا تقاضا کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایک داعی کے سامنے سب سے پہلا سوال جو آتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ بڑا مشکل کام ہے اور میں نہایت کمزور ہوں۔ خاص طور پر اس کے لئے زبان و قلم کی زبردست طاقت درکار ہے اور مجھے اس پر قدرت نہیں۔ اس کا آغاز زبان و قلم ہی سے ہوتا ہے۔ اس لئے اس اعتبار سے اپنی بے مائگی کا احساس اور حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے پست ہمتی ——— یہ دو چیزیں سب سے پہلے موجودہ زمانے میں دعوتی کام کی بات سوچنے والے پر طاری ہوتی ہیں۔

یہ مسئلہ ذہن میں رکھ کر جب ہم قرآن کے صفحات پر نظر ڈالتے ہیں تو بنی اسرائیل کی تاریخ کا ایک واقعہ ہمارے سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ بنی اسرائیل کے ایک مرد صالح کو اللہ تعالیٰ کوہ طور پر بلا کر اس کو پیغمبری عطا کرتا ہے اور اس کو یہ خدمت سونپتا ہے کہ وہ فرعون اور مصر کی قبطی قوم کے پاس جا کر اس کو خدا کا پیغام پہنچائے۔ حضرت موسیٰ محکوم فرقہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کو ملک کی حکمراں قوم کو خطاب کرنے کا کام سونپا جا رہا تھا۔ اس تقرر کو سن کر وہ بے اختیار کہہ اٹھے کہ خدایا میں اپنے اندر اس کی ہمت نہیں پا رہا ہوں اور میری زبان میرا ساتھ دیتی ہوئی نظر نہیں آتی:

رَبِّ إِنِّيْ أَخَافُ أَنْ يُّكَذِّبُوْنِ وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ شعراء ۱۲-۱۳

خدایا مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھے جھٹلا دیں گے میرا سینہ تنگ ہو رہا ہے اور میری زبان نہیں چلتی۔

خدا کی طرف سے جواب ملتا ہے کہ تم ڈرو مت۔ تمھاری ضرورت کی سب چیزیں تم کو ہماری طرف سے دے دی گئیں ——

قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يَا مُوسٰى (طٰہٰ - ۳۶)

یہ مانگنے اور دئے جانے کا واقعہ جو قرآن میں نقل کیا گیا ہے، وہ بنی اسرائیل کی تاریخ کے ایک واقعہ کی شکل میں ہماری اسی قسم کی مانگ کا جواب ہے۔ امت محمدیہ کے افراد جو ختم نبوت کے بعد نبوت کے کام پر مامور کئے گئے ہیں ان کے لئے بنی اسرائیل کے پیغمبر کا یہ واقعہ ایک پیشگی بشارت ہے۔ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ اگر تم ہمارے دین کی دعوت دینے کے لئے اٹھو تو ہم تم کو زبان دیں گے جس سے تم بولو گے، اور ہم تمھاری ڈھارس بندھائیں گے۔ جس کے بعد تم بڑے بڑے مواقع پر کسی ہچکچاہٹ کے بغیر ہماری آواز پہنچا سکو گے۔ مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ اگر آج کسی بندۂ خدا کے اندر حقیقۃً داعی بننے کا جذبہ ابھر آئے اور وہ بے تابانہ اپنے رب کو پکار اٹھے کہ میں یہ کام کرنا چاہتا ہوں مگر:

اللھم یضیق صدری ولا ینطلق لسانی — خدایا میرا سینہ تنگ ہو رہا ہے اور میری زبان چلتی نہیں

تو یقیناً کلام الٰہی اس کو دوبارہ آواز دے گا کہے گا کہ جاؤ ہم نے تم کو وہ چیز دے دی جس کی تمھیں ضرورت تھی۔ وہی خدا آج بھی اس دنیا کا خدا ہے جس نے کوہ طور پر حضرت موسیٰ کو خطاب کیا تھا۔ وہ آج بھی وہی کچھ کر سکتا ہے جو اس نے ہزار دو ہزار برس پہلے اپنے ایک بندے کے ساتھ کیا تھا۔ وہ چاہے تو گونگے کو ناطق بنا دے اور بولتے ہوئے شخص کو گونگا کر دے۔ کم زور دل کو ہمت دے دے اور ہمت والے کو پست کر کے بٹھا دے۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ پھر ہم کیوں نہ اس کے اوپر بھروسہ کریں۔

۲۔ دوسری ضرورت جس کا اس سلسلے میں سوال پیدا ہوتا ہے، وہ معاش کا مسئلہ ہے۔ آدمی جب دین کی ضرورت پوری کرنے کے لئے اٹھتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی اپنی ضروریات تو ختم نہیں ہو جاتیں۔ اس کے جسمانی تقاضے، اس کا گھر، اس کا خاندان، اس سے بہت سی چیزیں مانگتے ہیں۔ اگر وہ دین کے کام کی طرف جھکے تو ذاتی کاموں میں کمی ہوتی ہے اور ذاتی ضروریات میں اپنی توجہ صرف کرے تو دین کا خانہ خالی رہ جاتا ہے۔ یہ دوسرا سوال ہے جو ہر داعی کے سامنے لازماً پیش آتا ہے اور اس کو پریشان کرتا ہے۔

یہ سوال لے کر ہم قرآن پڑھنا شروع کرتے ہیں تو بہت سے مقامات ہم کو ملتے ہیں جہاں اس معاملہ میں ہم کو خدا کی مدد کا یقین دلایا گیا ہے۔ یہاں تک کہ ہم قرآن کی ۶۵ ویں سورہ میں پہنچ جاتے ہیں اور وہاں یہ الفاظ لکھے ہوئے پاتے ہیں:

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (طلاق ۲)

جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا تو اللہ اس کے لئے کشادگی پیدا کر دے گا اور اس کو ایسی ایسی جگہوں سے رزق پہنچائے گا جہاں اس کا گمان بھی نہیں جا سکتا۔

یہ ایک بہت بڑی یقین دہانی ہے، یہ ایک عظیم انشورنس ہے جو خدا کی طرف سے اہل ایمان کو دیا گیا ہے۔ آج کا انسان سمجھتا ہے کہ صرف اس کا کھیت، اس کی دکان اور اس کی ملازمت واحد ذریعے ہیں جو کسی کو رزق دیتے ہیں۔ اس کو خدا کے عظیم سرچشمے کی سرے سے خبر ہی نہیں۔ اس کو معلوم ہی نہیں کہ یہاں ایک اور خزانہ ہے جو تمام معلوم خزانوں سے زیادہ بھرا ہوا ہے۔ یہاں ایک

اور دینے والا ہے جو تمام دینے والوں سے زیادہ دے سکتا ہے۔ اس لئے یہ لوگ خدا کے خزانے کو چھوڑ کر پست ادنیٰ خزانوں کے سامنے دامن پھیلائے کھڑے ہیں۔ وہ چھوٹے ذریعہ کو پاکر خوش ہیں۔ حالاں کہ وہ اس سے بڑا ذریعہ بھی حاصل کرسکتے تھے۔

موجودہ انسان کی مثال اس بے صبرے نوجوان کی سی ہے جس کو گھر پر باپ کی وراثت میں معقول زمین ملی ہو۔ مگر دیہات کے خشک ماحول سے گھبرا کر وہ بمبئی بھاگ جائے اور وہاں واشنگ فیکٹری میں کلرکی حاصل کرکے سمجھے کہ میں نے اپنے رزق کا ذریعہ حاصل کرلیا۔ حالاں کہ بمبئی کی اس ملازمانہ زندگی میں وہ جو کچھ حاصل کر رہا ہے، اس سے بہت زیادہ خود اپنے گھر پر وہ اپنے کھیتوں اور باغوں میں کام کرکے آزادانہ طور پر حاصل کرسکتا تھا۔

۳۔ اب تیسری ضرورت کا تصور کیجئے جو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب داعی مشکلات میں پھنس گیا ہو۔ جب حالات سے اس کا ٹکراؤ شروع ہوگیا ہو، جب باطل طاقتیں اس کو کچلنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی ہوں۔ یہ ہمارے احتیاج کا نازک وقت ہوتا ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب داعی کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔

اس صورت حال کا احساس لے کر جب ہم قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بار بار نازک اوقات میں اہل ایمان کی مدد کی ہے۔ بلکہ ایسے وقت میں مدد کے لئے پہنچنا، اس نے اپنے اوپر اہل ایمان کا حق قرار دیا ہے۔

كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ　　روم ۴۷　　اہل ایمان کی مدد کرنا ہمارے اوپر اہل ایمان کا حق ہے

بندے کے لئے احتیاج کا انتہائی وقت، آقا کے لئے بھی اس کی طرف متوجہ ہونے کا انتہائی وقت ہوتا ہے حتیٰ کہ نازک اوقات میں وہ یہاں تک کرتا ہے کہ اپنی مخصوص فوج کو اہل ایمان کی کمک کے لئے روانہ کردیتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

إِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ　　(انفال۔ ۹)　　جب تم اپنے رب سے مدد مانگ رہے تھے تو اللہ نے جواب دیا کہ میں ہزار فرشتے بھیج کر تمہاری مدد کروں گا

یہ ممکن نہیں ہے کہ خدا کے خادم حقیقی خادم پر خدا کے دشمن حملہ آور ہوں۔ انھوں نے اس کا نرغہ کرلیا ہو، اور خدا بس دور سے اس کا تماشا دیکھتا رہے، یہ بالکل ناقابل تصور ہے۔ ایسے مواقع پر تو خدا کی غیرت و حمیت دوسرے مواقع کے مقابلے میں اور زیادہ شدت کے ساتھ بھڑک اٹھتی ہے۔ مگر مدد کا یہ معاملہ صرف ایسے ہی لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو حقیقی خادم اور سچے وفادار ہوں۔ اکتوبر ۱۹۶۲ء میں جب تیز پور میں چینی حملہ کا خطرہ بہت بڑھ گیا تھا حکومت ہند کا ایک اعلیٰ افسر وہاں سے ڈر کر قبل از وقت بھاگ گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت نے اس کو ملازمت سے برخاست کردیا۔ اگر وہ جرأت اور وفاداری کے ساتھ اپنے مقام پر ڈٹا رہتا، تو ہو سکتا تھا کہ خطرہ پیش آنے کی صورت میں حکومت کا خاص ہوائی جہاز بھیجا جاتا کہ وہاں جاکر افسر اور اس کے خاندان کو شہر سے نکال لائے۔

یہ چند مثالیں یہ سمجھنے کے لئے کافی ہیں کہ کس طرح خدا نے اپنے دین کے خادموں کی تمام ضروریات و مسائل کا ذمہ لیا ہے۔ مگر یاد رکھئے قرآن میں ہماری ضرورتوں کے بارے میں یہ جو یقین دہانیاں کی گئی ہیں اس کا مطلب لازمی طور پر یہ نہیں ہے کہ خدا کے فرشتے ہر صبح و شام آسمان سے خوان لے کر اتریں گے اور ہمارے سامنے بچھا دیا کریں گے۔ اگرچہ ایسا بھی ہو سکتا ہے مگر عام حالات میں اللہ تعالیٰ کی سنت یہ نہیں ہے۔ ہماری احتیاجات کی تکمیل کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی مدد کا مطلب

دراصل یہ ہے کہ وہ حالات کو اس طرح ہمارے موافق بنادے گا کہ ہم بآسانی اپنی ضروریات پوری کرسکیں ۔ وہ ایسے امکانات پیدا کرے گا جن کو استعمال کرکے ہم اپنی کاربرآری کرسکتے ہوں، وہ لوگوں کے دلوں میں ہمارے متعلق ایسے خیالات ڈالے گا کہ وہ ہمارے کام آسکیں، وہ ہمارے ذہن کو ایسی تدبیروں کی طرف لے جائے گا، جس کے بعد مسائل خودبخود حل ہوجائیں گے۔ وہ ایمان کی برکت سے ذہنی اور نفسیاتی صلاحیتوں کو ایسی جلا دے گا کہ کم صلاحیت والے بہتر صلاحیت والوں سے زیادہ کام کرسکیں گے، مقابلے کے وقت وہ ہمارے دل کو مضبوط کرے گا اور دشمن کو مرعوب کرکے شکست کو آسان بنادے گا۔ مختصر یہ کہ ہمارے کام بھی انھیں ظاہری حالات کے اندر ہوں گے جیسے سب کے ہوتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایمان کی برکت اور اللہ تعالیٰ کی توجہ کی بنا پر حالات میں کچھ ایسا غیر معمولی پن آجائے گا کہ کمتر وسائل سے ہم زیادہ کام لے سکیں گے اور معمولی سازوسامان کے باوجود زیادہ نتائج حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔

دوستو! یہ باتیں جو میں نے آپ کے سامنے عرض کی ہیں، یہ کوئی جذباتی نعرہ نہیں ہے اور نہ شاعری ہے۔ یہ ایک سراپا حقیقت کا اظہار ہے۔ اگر اس دنیا میں کوئی چیز ممکن ہے تو سب سے بڑا ممکن یہ ہے کہ بندہ جب خدا کی مدد کا محتاج ہو تو خدا اس کی مدد کرے۔ اس زمین و آسمان میں ہر دوسرے امکان کے بارے میں مجھے شبہ ہو سکتا ہے۔ مگر یہ امکان میرے لئے ہر شبہ اور تردد سے بالاتر ہے کہ خدا اپنے ان بندوں کی مدد کرتا ہے جو اس کے دین کی مدد کے لئے اٹھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ بندے کے اندر کوئی ذاتی طاقت ہے۔ بعض مذاہب کی طرح میں اس نظریے پر کوئی عقیدہ نہیں رکھتا کہ انسان اپنی ریاضت سے خدا کو یا فطرت کی برتر طاقتوں کو مسخر کرلیتا ہے۔ میرے نزدیک یہ بالکل لغویات ہے۔ خدا کی مدد کو میں سب سے زیادہ قطعی اس لئے قرار دے رہا ہوں کہ یہ خدا کی اپنی صفت ہے۔ خدا کا رحیم اور قادر ہونا، اس کا خالق اور مالک ہونا لازمی طور پر تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنے عاجز اور محتاج بندوں کی مدد کرے۔ یاد رکھئے کہ یہ خدا کی شانِ خدائی کے بالکل خلاف ہے کہ وہ بندوں کو عاجز و مجبور کی حیثیت سے پیدا کرے۔ اور جب بندوں کا عجز کسی ضرورت کا محتاج ہو تو وہ ان کی مدد نہ فرمائے۔ یہ خدا کی شان کے خلاف ہے۔ اس لئے یہ قطعاً ناممکن ہے۔

دوستو! اگر آپ کے پاس سننے کے لئے کان ہوں تو خدا کی کتاب پکار رہی ہے ـــــ من انصاری الی اللہ (کون ہے جو خدا کے کام میں اس کا مددگار بنے) اور اسی کے ساتھ اس میں یہ ضمانت بھی موجود ہے کہ ـــــ ان تنصروا اللہ ینصرکم) اگر تم خدا کی مدد کے لئے اٹھوگے تو خدا تمھاری مدد کرے گا) خدا آپ کو ایسے کام کے لئے پکار رہا ہے جس میں وہ خود آپ کا مددگار ہے۔ دین کی خدمت خدا کی معیت کا راستہ ہے۔ اس کی مدد سے ہم کنار ہونے کا راستہ ہے۔ یہ وہ راستہ ہے جو آپ کو جنت کی طرف لے جاتا ہے، اگر ایک ایسے کام کے لئے بھی آپ نہیں اٹھیں گے تو اور کس کام کے لئے اٹھیں گے۔ اور اس خدمت کے بغیر مرگئے تو خدا کا سامنا کس طرح کریں گے۔

اٹھئے کہ اس سے بڑا کوئی کام نہیں، اٹھئے کہ اس سے بڑی کوئی سعادت نہیں ہوسکتی۔

جماعت اسلامی ضلع اعظم گڑھ کے اجتماع میں کی گئی ایک تقریر، جولائی ۱۹۶۳

ملاپورم، کیرلا کا ایک ضلع ہے جو دہلی سے ۲۸۰۰ کیلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ ندوۃ المجاہدین کے اجلاس میں شرکت کے لئے ۹ مارچ ۱۹۷۹ کو یہاں پہنچا اور ۱۶ مارچ کو دہلی واپس آیا۔ ذاتی طور پر میں ایک گوشہ نشین آدمی ہوں جلسوں اور کانفرنسوں کا مجھے بالکل ذوق نہیں۔ میرا مشغلہ بس کتابیں پڑھنا ہے اور پڑھنے کے دوران میں کوئی مضمون ذہن میں آجائے تو اس کو لکھ لینا۔ تاہم بعض اوقات دوستوں اور بزرگوں کے اصرار پر "السلامۃ فی الوحدۃ" کے اپنے اصول کو توڑنا پڑتا ہے۔ اسی قسم کا ایک واقعہ کیرلا کا سفر بھی تھا۔

ملاپورم کا ضلع ۱۹۶۸ میں بنا۔ یہاں کی کل آبادی پندرہ لاکھ ہے جس میں گیارہ لاکھ مسلمان ہیں۔ یعنی تقریباً ستر فیصد۔ تاہم یہاں کی زمینوں اور باغات میں ان کا حصہ پچاس فی صد سے زیادہ نہیں ہے کیرلا میں تعلیم کا رواج بہت ہے۔ مگر ریاست کے گیارہ ضلعوں میں تعلیم میں سب سے پیچھے ملاپورم ہے۔ نمبودری پاد کی وزارت کے زمانہ میں مسلم لیگ نے ان سے جو تعاون کیا، اس سے مسلمانوں کو کئی فائدے ہوئے۔ ان میں سے ایک کالی کٹ یونیورسٹی کا قیام ہے۔ یہ یونیورسٹی ملاپورم ضلع کی سرحد پر ہے اور اس میں مسلمانوں کی تعداد کافی ہے۔ یونیورسٹی کی انتظامیہ، اس کے اسٹاف اور طلبہ میں مسلمانوں کا تناسب نصف کے قریب ہے۔ وائس چانسلر بھی اکثر مسلمان ہوتا ہے۔ مسلم لیگ نے اس ریاست میں توازن طاقت کا مقام حاصل کر لیا ہے۔ اس میں اس واقعہ کا بھی دخل ہے کہ یہاں کے مسلمان ووٹروں کی ۸۰ فی صد تعداد مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے متحد ہے۔

ہم لوگوں کے قیام کا انتظام اگرچہ کالی کٹ میں کیا گیا تھا۔ مگر اجلاس کا انتظام ۳۰ کیلومیٹر کے فاصلہ پر پولیکل میں تھا۔ گاؤں کے باہر ایک میدان میں جلسہ گاہ تھی۔ چاروں طرف ناریل کے گھنے درختوں کے جھنڈ کھڑے ہوئے تھے اور درمیان میں کھلے میدان میں پنڈال بنایا گیا تھا۔ اس قدرتی منظر نے پنڈال میں عجیب حسن پیدا کر دیا تھا۔ تقریر و خطاب کے علاوہ بعض دوسرے پروگرام بھی رکھے گئے تھے۔ مثلاً پنڈال کے ایک حصہ میں ایک نمائش کا انتظام۔ اجلاس میں عرب شیوخ ایک درجن سے زیادہ تعداد میں شریک ہوئے۔

کالی کٹ میں مسجدوں کا طرز تعمیر نرالا ہے۔ ایک مسجد پانچ منزلہ دیکھی۔ بڑے بڑے ہال کی مانند ایک کے اوپر ایک پانچ "ہال" ہیں جو جدید طرز تعمیر کے مطابق کھمبوں (Pillars) پر کھڑے کئے گئے ہیں۔ ایک اور مسجد اسی ڈھنگ پر زیر تعمیر ہے۔ وہ اور زیادہ اونچی ہوگی۔ یہ جگہ کی قلت کا حل ہے۔ زمین پر پھیلنے کی جگہ کم ہو تو عمودی اٹھان (Vertical Growth) اس کا بہترین حل ہوتا ہے۔ اسی سے قومی تعمیر کا راز بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر "سیاسی" میدان میں پھیلنے کے مواقع کم ہوں تو زندہ قومیں زندگی کے دوسرے میدان پا لیتی ہیں جن میں نفوذ کر کے وہ اپنی سیاسی کمی کی تلافی کر سکیں اور بالآخر خود سیاست کو بھی اپنے دائرہ میں لے لیں۔

ندوۃ المجاہدین کے بانی مرحوم محمد کاتب طیباری (۱۸۹۱ - ۱۹۶۴م) تھے۔ اس مجلس کے تحت بہت سے ادارے اور تعلیم گاہیں قائم ہیں۔ ان کا کام پورے کیرلا میں ہو رہا ہے۔ انھوں نے ریاست میں چودہ "عربک کالج" قائم کئے ہیں جو ان کے اہتمام میں چل رہے ہیں۔ فارغین کو "افضل العلماء" کی سند ملتی ہے جو سرکاری طور پر تسلیم شدہ ہے۔ اس کے علاوہ ایک اعلیٰ تعلیمی ادارہ

الجامعۃ الندویۃ کے نام سے قائم ہے۔ ان کا اپنا پریس ہے جو ملیالم نیز عربی اور انگریزی زبانوں میں کتابیں چھاپتا ہے۔ ان کا ایک عربی پرچہ نکلتا ہے جس کا نام سلسبیل ہے۔ ملیالم زبان میں المنار (ماہنامہ) اور الشباب (پندرہ روزہ) نکلتے ہیں۔ ریاست میں تقریباً دو سو مسجدیں بھی ان کے اہتمام میں ہیں نیز دار الیتامیٰ وغیرہ کے نام سے متعدد ادارے قائم ہیں۔ انھوں نے اندھوں اور بہروں کی تعلیم کا بھی انتظام کیا ہے۔ سوراخ دار کاغذ جو اس قسم کے طالب علموں کے لئے ہوتے ہیں، انگریزی کے علاوہ ملیالم اور عربی میں بھی تیار کئے گئے ہیں۔ ایک اندھے بچے کے سامنے ہم نے ایک کاغذ نکال کر رکھا۔ ہمارے دیکھنے میں وہ ایک خالی کاغذ تھا جس میں متفرق طور پر چھوٹے چھوٹے سوراخ بنے ہوئے تھے۔ بچہ نے کاغذ پر انگلی پھیری اور قرأت کے ساتھ پڑھنے لگا: قل ھو اللہ احد، اللہ الصمد ―――― " مجھے قرآن کا وہ بیان یاد آیا، جس میں کہا گیا ہے کہ آخرت میں آدمی کی کھال تک گواہی دے گی۔ میں نے سوچا: اللہ اپنی قدرت کا ہاتھ چیزوں پر پھیرے گا اور ہر چیز اچانک وہ سب باتیں دہرانے لگے گی جو اللہ کے حکم سے اس پر نقش تھی، اگرچہ آج وہ ہم کو دکھائی نہیں دیتی۔

اس علاقہ کی ایک خصوصیت سب سے زیادہ اہم معلوم ہوئی۔ وہ یہ کہ یہاں قومی اور مذہبی تعصب نہیں ہے۔ اس صورت حال نے جنوب کے علاقے کو اسلامی دعوت کا نہایت عمدہ میدان بنا دیا ہے۔ یہاں کے مسلمان اگر دوسری قوموں تک اسلام کی دعوت پہنچانے میں سرگرم ہو جائیں تو اس کے عظیم الشان نتائج نکل سکتے ہیں

عرب شیوخ اور ہندوستانی علماء پر مشتمل ایک قافلہ نے دو دن تک کیرلا کے مختلف ادارے دیکھے۔ کچھ سو میل کے رقبہ میں قائم شدہ مدرسے، مسلم کالج، مسلم دار الیتامیٰ وغیرہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ کیرلا کی ریاست ایک بے حد ہری بھری ریاست ہے۔ بعض لوگوں کے خیال کے مطابق کشمیر سے بھی زیادہ خوبصورت۔ چنانچہ ہر ادارہ ایک خوبصورت باغ میں واقع ہے۔ اس علاقہ کے مسلمانوں نے جگہ جگہ کثرت سے تعلیمی اور رفاہی ادارے قائم کر رکھے ہیں۔ مثلاً یتیم خانے، اسکول، کالج، اندھوں اور گونگوں کو پڑھانا، اپاہجوں کو ہنر سکھانا، وغیرہ۔ ان اداروں میں عام طور پر قوم کے تعاون کے علاوہ حکومت سے بھی امداد لی جاتی ہے۔ اس طرح بہت بڑے پیمانہ پر قوم کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔ حکومت کی طرف سے امداد کی یہ صورتیں شمالی ہند میں بھی پوری طرح موجود ہیں اور دوسری قومیں ان کو حاصل کر کے بے شمار ادارے قائم کئے ہوئے ہیں۔ مگر شمالی ہند کے مسلمان ابھی اس امکان سے فائدہ اٹھانے میں بہت پیچھے ہیں۔ ان کے لیڈر جلسوں اور تقریروں اور مطالبوں میں مصروف ہیں اور اسی کے ساتھ ان کی قوم بھی۔ انھوں نے الفاظ کے ذریعہ سستی لیڈری حاصل کرنے کے نسخے دریافت کر رکھے ہیں۔ پھر ان کو عمل کے ذریعہ قیادت حاصل کرنے کی کیا ضرورت۔

کیرلا کے ضلع تریچور کا ایک مقام کدنگلور (Kodungallore) ہے۔ یہاں ایک قدیم مسجد ہے جس کا نام مسجد چرمان ہے۔ کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ (۶۲۹ء) میں یہاں ایک صحابی حبیب بن مالک رضی اللہ عنہ تشریف لائے۔ ان کے اثر سے اس وقت کا راجہ ساموری مسلمان ہو گیا۔ موجودہ مسجد اس کے لڑکے کی بنائی ہوئی بتائی جاتی ہے اگر یہ روایت صحیح ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مدینہ کے بعد یہ پہلی مسجد ہے جو دنیا کے کسی مقام پر بنائی گئی۔ اس تاریخی مسجد کو بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اور ۱۳ مارچ کو مغرب کی نماز اس مسجد میں پڑھی۔

Regd. R. N. No. 28822/76
Issue No. XXXI

June 1979

Al-Risala Monthly

Jamiat Building, Qasimjan Street, DELHI-110006 (INDIA)

ثانی اثنین خاں، پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی سے چھپواکر دفتر الرسالہ جمعیتہ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی سے شائع کیا

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

اسلامی دعوت

از

مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی-۶

اشاعت ۱۹۷۹ (جملہ حقوق محفوظ ہیں) قیمت دو روپے

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایک پتھر دوسرے پتھر سے ٹکراتا ہے تو وقتی طور پر کچھ روشنی نکلتی ہے اور جلد ہی بجھ جاتی ہے۔ مگر سورج کی روشنی کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ وہ کسی دوسری چیز کے ٹکرانے سے نہیں چمکتا بلکہ خود اپنی ذات میں روشن ہے۔ وہ نور اور حرارت کے ابدی بھنڈار سے روشنی لے کر اتھاہ خلا میں جگمگا رہا ہے۔ یہی حال اسلامی تحریکوں کا ہے۔ ایک تحریک وہ ہے جو وقتی حالات کے ردعمل سے پیدا ہوئی ہو۔ دوسری تحریک وہ ہے جو خدا کے ازلی نور کے پرتو سے چمک اٹھی ہو، جو آخرت کے ابدی محاسن کا دنیوی ظہور ہو۔ بظاہر دونوں تحریکیں اسلامی تحریکیں ہیں۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے دونوں میں اتنا ہی فرق ہے جتنا سورج میں اور پتھر کی رگڑ سے پیدا ہونے والی چنگاری میں۔ ایک انسانی ردعمل کا نتیجہ ہے، دوسری خدا سے قربت و تعلق کا ظہور۔ ایک قریبی حالات کے اثر سے پیدا ہوئی ہے، دوسری آخرت کی برتر دنیا کا انعکاس ہے۔ ایک کی رونق وقتی اور ہنگامی رونق ہے، دوسری کا حاصل ازلی اور ابدی بہشت کا دروازہ کھل جانا۔

ایجابی اسلامی تحریک براہ راست خدا اور رسول کے فیضان سے ابلتی ہے اور ردعمل کی تحریک وقتی حالات کے اثر سے۔ دوسرے لفظوں میں، ایجابی اسلامی تحریک زمانۂ نبوت سے اپنے سفر کا آغاز کرتی ہے اور ردعمل کی تحریک اپنے قریبی زمانہ کے سیاسی یا غیر سیاسی حالات سے۔ یہ فرق دونوں قسم کی تحریکوں میں زبردست فرق پیدا کر دیتا ہے۔ بظاہر دونوں ایک ہی قسم کے دینی الفاظ بولتے ہیں۔ مگر دونوں کے ذہن میں اسلامی اصطلاحات کا مفہوم اسی طرح بدل جاتا ہے جس طرح "پاپی" کا تلفظ ایک ہندی داں کے لئے گنہ گار کا مفہوم رکھتا ہے مگر ایک انگریزی داں کے لئے وہ خشخاش (Poppy) کے ہم معنی بن جاتا ہے۔

مثلاً ایک تحریک جس نے وقتی سیاسیات سے متاثر ہو کر دین کی تعبیر کی ہو، وہ اپنی سیاسی نفسیات کی بنا پر دین کو اسٹیٹ (ریاست) کے ہم معنی سمجھ لے گی اور بندے اور خدا کے تعلق کو ایک ایسا تعلق بنا دے گی جس میں دین کے نام پر آدمی کے حصہ میں صرف سیاسی بحثیں آتی ہیں۔ وہ عبدیت کے لطیف تر مقامات کا تجربہ ہی نہیں کر پاتا۔ اس کے برعکس نبوت کے فیضان سے دین کا تصور لینے والا آدمی اس کو اللہ سے اس برتر تعلق کے معنی میں لے گا جہاں آدمی کی اپنی انا ختم ہو جاتی ہے اور وہ اپنی پوری ہستی کو اپنے رب کے سامنے ڈال دیتا ہے۔ اسی طرح ایسی تحریک جس نے عملیاتی مذاہب کے اثر سے اپنا دینی تصور بنایا ہو وہ ذکر کو "جاپ" کے معنی میں لے گی۔ جب کہ پیغمبر کے صبح و شام سے ذکر کا مفہوم اخذ کرنے والا آدمی اس کو ایک عظیم نفسیاتی تجربہ کے ہم معنی سمجھے گا۔ اس کے نزدیک ذکر اس یاد الٰہی کا نام ہو گا جو خدائے برتر کی تجلیات میں ہمہ تن غرق ہونے سے کسی بندۂ خدا کے دل میں پیدا ہوتی ہے نہ کہ کسی قسم کی الفاظ شماری کا۔ حقیقی دین سے احتساب خویش کا ذہن ابھرے گا اور سیاسی دین سے احتساب اغیار کا۔ حقیقی ذکر ہو تو وہ دلوں کو پگھلاتا ہے، جب کہ شماریاتی ذکر کی ساری توجہ اس پر ہوتی ہے کہ گنتی کا مقررہ نصاب پورا کر لے۔

دین نہ خارجی ہنگامہ آرائی کا نام ہے اور نہ طلسماتی عملیات کا۔ یہ خدا کے باغ میں خدا کا پسندیدہ پھول اگانا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص اپنے شعور کو نفسانی آمیزشوں سے پاک کر کے اس کو ملکوتی شعور کی سطح پر پہنچائے۔ وہ اپنے وجود کو ان اعلیٰ اوصاف اور کیفیات کا مالک بنائے جو اس کو خدائے سبوح و قدوس کا ہم نشین بنانے والی ہوں، جو اس کو جنت کے پاکیزہ ماحول میں رہنے کا ابدی استحقاق عطا کر سکیں۔

توحید کی حقیقت

دین کی اصل توحید ہے۔ توحید کا مطلب ہے ایک اللہ پر اعتماد کرنا اور اسی کو اپنے خوف و محبت کے جذبات کا مرکز بنانا۔ انسان کو سوچنے اور محسوس کرنے کی جو صلاحیتیں دی گئی ہیں، وہ اپنا کوئی نہ کوئی توجہاتی مرکز چاہتی ہیں۔ آدمی فطری طور پر چاہتا ہے کہ کوئی ہو جس کی طرف وہ لپکے، جس سے وہ امید رکھے، جس کے اوپر وہ بھروسہ کرے، جس کی یاد کو وہ اپنا سرمایۂ حیات بنائے۔ آدمی اپنی ہستی کا ایک مرکز بنائے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ خواہ یہ مرکز دولت و اقتدار ہو یا قبریں اور دیوی دیوتا، یا کوئی دوسری چیز۔ یہ مرکز اگر اللہ کے سوا کوئی اور ہو تو یہ شرک ہے۔ اور اگر انسان صرف اللہ رب العالمین کو اپنی ہستی کا مرکز بنائے تو اسی کو توحید کہتے ہیں۔ اسلام کا تقاضا ہے کہ آدمی اپنی توجہات کو صرف اللہ کی طرف موڑ دے۔ اس کے سوا کوئی چیز اس کے لئے مرکز توجہ کی حیثیت سے باقی نہ رہے۔

توحید کی حقیقت کو کسی ایک لفظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اللہ کے ساتھ بندے کے ایک ایسے تعلق کا نام ہے جو محبت اور خوف اور توکل کے جذبات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ کوئی بندہ اس وقت اللہ کا موحد بنتا ہے جب کہ وہ اللہ کو اس طرح پالے کہ وہی اس کا محبوب بن جائے۔ اسی پر وہ سب سے زیادہ بھروسہ کرنے لگے۔ اس کو سب سے زیادہ جس بات کا اندیشہ ہو وہ یہ کہ کہیں اس سے کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہو جو اس کو خدا کی رحمتوں سے محروم کر دے۔ ان تمام انسانی جذبات کے لئے صرف اللہ کو خاص کر لینے کا نام توحید ہے۔ اس سلسلہ میں یہاں قرآن سے چند آیتیں نقل کی جاتی ہیں:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ○

بقرہ ۱۶۵

اور بعض وہ لوگ ہیں جو اللہ کے سوا اوروں کو اس کا برابر ٹھہراتے ہیں۔ ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ سے رکھنا چاہئے اور جو لوگ ایمان والے ہیں وہ سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔ اور کاش یہ بے انصاف دیکھ لیں اس وقت کو جب کہ وہ عذاب کو دیکھیں گے کہ ساری طاقت صرف اللہ کے لئے ہے اور اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ○

تغابن ۱۳

اللہ، اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ اور چاہئے کہ اللہ ہی پر بھروسہ کریں ایمان لانے والے۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ؕ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ○ انبیاء ۹۰

وہ لوگ دوڑتے تھے بھلائیوں پر اور پکارتے تھے ہم کو امید سے اور ڈر سے اور وہ ہمارے آگے عاجزی کرنے والے تھے۔

ان آیات کے مطابق توحید، اعتقادی طور پر یہ ہے کہ آدمی سب سے زیادہ اپنے رب سے محبت کرنے لگے۔ اس کے لئے سب سے زیادہ بھروسہ کی چیز اس کا خدا بن جائے۔ اس کی امیدیں اور اس کے اندیشے اللہ کے ساتھ اس طرح وابستہ ہو جائیں

کہ وہ اپنے روز و شب کے لمحات میں اس کو بے تابانہ پکارنے لگے۔

توحید کے عملی تقاضے

توحید کے عملی تقاضوں کو دو حصے میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ عبادات اور اخلاقیات۔ اللہ نے جو وسیع کائنات بنائی ہے، اس کی ہر چیز اپنے رب کی عبادت اور بندگی میں لگی ہوئی ہے۔ وہ "طوعاً و کرہاً" اسی دین توحید کو اختیار کئے ہوئے ہے جسے انسان کو اپنے ارادہ سے اپنی زندگی میں اختیار کرنا ہے:

أَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّإِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ
آل عمران - ۸۳

کیا وہ خدا کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں۔ حالاں کہ اسی کے حکم میں ہے جو کوئی آسمان اور زمین میں ہے، خوشی سے یا ناخوشی سے۔ اور سب اللہ ہی کی طرف پھیرے جائیں گے۔

درخت اور دوسری کھڑی ہوئی چیزیں اپنا سایہ زمین پر ڈال دیتی ہیں۔ اس طرح گویا وہ خدا کو سجدہ کر رہی ہیں (نحل ۴۸) یہی عبادت کی اصل حقیقت ہے۔ عبادت یہ ہے کہ آدمی اللہ کے قدموں میں اپنا سر رکھ دے۔ وہ اس کے آگے جھک جائے۔ وہ اپنے وجود کو خدا کے آگے اس طرح بچھا دے جس طرح درخت اپنے سایہ کے ساتھ زمین پر بچھ جاتا ہے۔

کائنات کی اخلاقیات کیا ہیں۔ اس کی اخلاقیات یہ ہیں کہ اس کا ہر جزء خدا کے مقررہ نقشہ پر ٹھیک ٹھیک قائم ہے (فرقان ۲) اسی کے ساتھ کائنات کا ہر جزء اس کے دوسرے اجزاء کے ساتھ پوری ہم آہنگی کے ساتھ عمل کرتا ہے (یٰس ۴۰) اپنے فرض منصبی سے بال برابر نہ ہٹنا اور دوسرے کائناتی اجزاء کے ساتھ دائمی طور پر متوافق رہتے ہوئے اپنا کام انجام دینا، یہ کائنات کا اخلاق ہے۔ یہی اخلاق آدمی کو بھی اپنی زندگی میں اختیار کرنا ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو ذمہ داریاں سونپی ہیں، ان پر اسے ہر حال میں قائم رہنا ہے اور جن بھائیوں کے درمیان رہ کر اس کو زندگی گزارنی ہے ان سے کامل اتحاد اور موافقت کرتے ہوئے اپنے حصہ کا کام انجام دینا ہے۔ اس معاملہ میں انسانی معاشرہ کی مثال، حدیث کے الفاظ میں، ایک جسم کی سی ہونی چاہئے۔ جسم کا ایک حصہ جب ایک صحیح عمل کرنا چاہتا ہے تو جسم کے بقیہ تمام حصے مکمل طور پر اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ جسم کے ایک حصہ کی آرام و تکلیف اس کے دوسرے تمام حصوں کی آرام و تکلیف ہوتی ہے۔ یہی فرض شناسی اور اجتماعیت انسان سے بھی دنیا کی زندگی میں مطلوب ہے۔

عبادت اور اخلاقیات کا یہ سبق جو کائنات کے خاموش نظام میں رکھا گیا ہے۔ یہی انسانی سطح پر پیغمبر کی زندگی میں نمایاں کیا گیا ہے۔ پیغمبر کی زندگی خدا پرستی کی عملی اور معیاری مثال ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب ۲۱) — اللہ کے رسول میں تمہارے لئے بہترین نمونہ ہے

رسول وہ کامل اور مکمل انسان ہے جس نے توحید کو اعتقادی اور عملی طور پر اس کی آخری معیاری صورت میں اپنایا — نیز اللہ تعالیٰ نے خصوصی اہتمام کے ذریعہ رسول کی زندگی کے ریکارڈ کو ہمیشہ کے لئے تاریخ میں محفوظ کر دیا۔ اب جو بندۂ خدا یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے رب کے یہاں اس حال میں پہنچے کہ اس کا رب اس سے راضی ہو، اس کو چاہئے کہ وہ خدا کے

دین کو خدا کی کتاب سے معلوم کرے اور پھر رسول کی سنت کی روشنی میں اس کو اپنی زندگی میں اختیار کرے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں جو آدمی کو خدا کی پکڑ سے بچانے والا اور اس کے انعامات کا مستحق بنانے والا ہو۔

دو قسم کی زندگیاں

قرآن کی چودھویں سورہ میں شجرۂ طیبہ اور شجرۂ خبیثہ کی مثال دے کر اس حقیقت کو سمجھایا گیا ہے کہ توحید کی بنیاد پر اٹھنے والی زندگی کیسی ہوتی ہے اور شرک کی بنیاد پر اٹھنے والی زندگی کیسی ——— "کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے کیسی مثال بیان فرمائی ہے۔ کلمۂ طیبہ ایسا ہی ہے جیسے شجرۂ طیبہ جس کی جڑ خوب گڑی ہوئی ہو۔ اور اس کی شاخیں بلند ہوں۔ وہ خدا کے حکم سے ہر فصل میں اپنا پھل دیتا ہے۔ اللہ لوگوں کے لئے مثالیں بیان کرتا ہے تاکہ وہ سمجھیں۔ اور کلمۂ خبیثہ کی مثال ایسی ہے جیسے شجرۂ خبیثہ کہ وہ زمین کے اوپر ہی اوپر سے اکھاڑ لیا جائے۔ اس کو کچھ ٹھہراؤ نہیں۔ اللہ ایمان والوں کو مضبوط کرتا ہے مضبوط بات سے دنیا میں اور آخرت میں ۔ اور اللہ بے انصاف لوگوں کو بے راہ کر دیتا ہے اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے" (ابراہیم ۲۷-۲۴)

زمین میں دو قسم کے درخت پائے جاتے ہیں۔ ایک شیشم اور چنار جیسے درخت جو زمین میں چٹان کی طرح گڑے ہوتے ہیں اور فضا کی پہنائیوں میں اپنی شاخیں پھیلائے رہتے ہیں۔ دوسرے برساتی پودے، جو زمین کے اوپر اوپر اُگ آتے ہیں اور جو بھی چاہتا ہے ان کو ہاتھ بڑھا کر اکھاڑ لیتا ہے۔ یہ دونوں قسم کے درخت گویا موحد اور مشرک کی زندگی کو علامتی طور پر بتا رہے ہیں۔ موحد انسان اس کائنات کا مطلوب "درخت" ہے۔ ایک شخص جب موحد بنتا ہے تو ساری کائنات اس کی رزق رسانی کے لیے مستعد ہو جاتی ہے۔ وہ ایک تناور درخت کی شکل میں اگنا شروع ہو جاتا ہے۔ زمین میں بھی اس کو جماؤ ملتا ہے اور آسمان تک بھی اس کی سرسبزیاں اور شادابیاں پہنچتی ہیں۔ خدا کی نصرتیں اس کے ساتھ ہوتی ہیں۔ وہ دونوں موسموں میں اپنی بہار دکھاتا ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

اس کے برعکس مشرک کی زندگی گویا برساتی جھاڑ جھنکاڑ کی مانند ہے۔ وہ زمین میں بس اوپر اوپر اُگ آتا ہے۔ خدا کی مدد اس کے ساتھ نہیں ہوتی۔ اس لئے نہ دنیا میں اس کو جماؤ حاصل ہوتا اور نہ آخرت کے موسم میں وہ کوئی پھل دیتا۔ اللہ تعالیٰ نے قانون امتحان کی بنا پر موجودہ دنیا میں جو مہلت دے رکھی ہے، اس کی وجہ سے اس کو وقتی طور پر زمین کی سطح پر اگنے کا موقع مل جاتا ہے۔ مگر امتحان کی مدت ختم ہوتے ہی اس کو زمین سے اکھاڑ دیا جائے گا۔ اس کے بعد اس کو آگ کی دنیا میں پھینک دیا جائے گا جہاں وہ جہنم کا ایندھن بنے۔ اور خدا کی یہ سرسبز و شاداب زمین نئے اہتمام اور سنوار کے ساتھ صرف ان لوگوں کی وراثت میں دے دی جائے گی جو موت سے پہلے کی زندگی میں سچے خدا پرست ثابت ہوئے تھے۔

موحدانہ زندگی اور مشرکانہ زندگی کا فرق اپنی کامل صورت میں اگرچہ صرف آخرت میں ظاہر ہوگا۔ تاہم اس کا ظہور اسی دنیا سے شروع ہو جاتا ہے۔ توحید پرست اگر تنہا ہے تو خدا کا انعام اس کو اس طرح ملتا ہے کہ باطل قوتیں، اپنی ساری کوشش کے باوجود، اس کی آواز کو مغلوب نہیں کر پاتیں، وہ نظریاتی طور پر غالب ہو کر رہتا ہے اور اگر توحید پرست قابل لحاظ تعداد میں مجتمع ہو جائیں تو ان کو زمین میں سیاسی اور سماجی غلبہ بھی دے دیا جاتا ہے۔

انسان کی منزل: جنت

اللہ نے انسان کو بہترین تخلیق پر پیدا کیا۔ پھر اس کے لیے ایک جنت بنائی کہ وہ اس میں فراغت کے ساتھ رہے۔ پھر اللہ کی حکمت مقتضی ہوئی کہ زمین کے اوپر امتحانی حالات کا پردہ ڈال دیا جائے۔ جنت کو اس نے، حدیث کے الفاظ میں، مکروہات سے ڈھانپ دیا۔ اس کے بعد اس نے انتظام کیا کہ زمین پر انسانی نسل پیدا ہو۔ وہ مختلف حالات سے گزرے تاکہ ہر ہر فرد کے بارے میں معلوم ہو کہ ان میں سے کون جنت کے ماحول میں بسانے کے قابل ہے اور کون اس قابل ہے کہ اس کو جنت کی دنیا سے باہر پھینک دیا جائے۔ اس وقت ہماری زمین اسی دور سے گزر رہی ہے۔ جب تمام لوگ اپنا اپنا تعارف پیش کر چکے ہوں گے تو امتحانی حالات ختم کر دئے جائیں گے اور جنت کی دنیا اپنی تمام تابانیوں کے ساتھ سامنے آجائے گی۔ جن لوگوں نے موجودہ امتحانی مدت میں، اپنے آپ کو جنتی معاشرہ کا اہل ثابت کیا ہوگا وہ وہاں خدائی انتظام واہتمام کے ساتھ بسائے جائیں گے۔ اور جن لوگوں نے اپنی موجودہ زندگی سے یہ ثبوت دیا ہوگا کہ وہ جنتی معاشرہ میں بسائے جانے کی اہلیت نہیں رکھتے، ان کو اسفل سافلین میں پھینک دیا جائے گا جہاں وہ دائمی طور پر ایک پرعذاب ماحول میں رہیں گے، دکھ بھری زندگی کے سوا کوئی اور زندگی ان کے لئے ممکن نہ ہوگی۔

آخرت کی مکمل دنیا کائنات کے کس مقام پر بنے گی اور اس کی متعین صورت کیا ہوگی، آج کا انسان اس کو سمجھ نہیں سکتا، ٹھیک ویسے ہی جیسے پیٹ کا ایک بچہ پیٹ کے باہر کی دنیا کو سمجھ نہیں سکتا۔ تاہم موجودہ دنیا میں وہ سارے اسباب موجود ہیں جن کا مطالعہ ہمارے لئے اگلی دنیا کے معاملہ کو قابل فہم بنا دیتا ہے۔ اللہ نے جس طرح موجودہ دنیا کو عدم سے بنایا، اسی طرح وہ ایک اور زیادہ بہتر دنیا کو از سر نو پیدا کر سکتا ہے۔ وہ بلاشبہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اسی طرح اللہ اس پر بھی قدرت رکھتا ہے کہ اسی موجودہ دنیا میں ایسی مستقل تبدیلیاں پیدا کر دے کہ یہی دنیا اپنے بدلے ہوئے روپ میں جنت کی دنیا بن جائے۔ جنت کے معاملہ کو قابل فہم بنانے کے لئے ذیل کی سطروں میں اس کا ایک تصوراتی خاکہ، ثانی الذکر امکان کی روشنی میں، قرآن وحدیث کے اشارات کی مدد سے پیش کیا جاتا ہے۔

جنت کی دنیا

کائنات ایک بے پناہ حد تک وسیع کارخانہ ہے۔ کائنات کے اندر ان گنت دنیائیں ہیں اور ان میں سے اکثر ہماری زمین سے کھرب ہا کھرب گنا زیادہ بڑی ہیں۔ کائنات میں دنیاؤں کی تعداد اس سے بھی زیادہ ہے جتنی تمام سمندروں کے کنارے ریت کے ذرے۔ یہ تمام دنیائیں اپنی ساری وسعتوں کے باوجود یا تو آگ کے بہت بڑے بڑے شعلے ہیں جن کو ستارے کہا جاتا ہے یا ان میں سے کچھ خشک چٹانوں اور چٹیل ریگستانوں کی صورت میں ہیں جن کو چاند اور سیارے کہا جاتا ہے۔ اتھاہ کائنات اور اس کے اندر پھیلی ہوئی ان گنت دنیاؤں میں زمین ہی واحد کرہ ہے جو سرسبز وشاداب ہے۔ زمین ایک بے حد حسین اور مکمل دنیا ہے۔ زمین وہ واحد مقام ہے جہاں زندگی کی رونقیں ہیں، پانی اور ہوا اور سبزہ ہے۔ طرح طرح کی غذائیں ہیں۔ انسان کی تمام ضرورتوں کا سامان غیر معمولی اہتمام کے ساتھ یہاں اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ زمین

ے

واحد کرہ ہے جہاں انسان ایک جگمگاتی ہوئی تہذیب بناتا ہے۔ وسیع کائنات میں زمین کے سوا کوئی دوسرا مقام نہیں جہاں تہذیب و تمدن کی تعمیر ممکن ہو۔ خلائی مسافروں نے بتایا ہے کہ خلا کے بقیہ کرے انسان جیسی زندگی کے لئے اس درجہ ناموافق ہیں کہ وہ بالکل جہنم معلوم ہوتے ہیں اور ان کے مقابلہ میں ہماری موجودہ زمین جنت۔ زمین کے سوا بقیہ کائنات میں انسان کے لئے کہیں ایک گلاس پانی بھی موجود نہیں۔ حتیٰ کہ امریکی خلاباز جس نے چاند کا سفر کیا، اس کو اس سفر میں پانی کی جگہ اپنا پیشاب صاف کرکے پینا پڑا۔

کیا عجب کہ زمین، اپنی امکانیات کے اعتبار سے، خدا کی بنائی ہوئی جنت ہو۔ جنت کی جن نعمتوں کا ذکر قرآن و حدیث میں ہے وہ سب وہی ہیں جو بتمام و کمال موجودہ زمین پر پائی جاتی ہیں۔ قرآن میں جنت کی تصویر موجودہ دنیا کے "پھلوں" کے مشابہ بتائی گئی ہے (بقرہ ۲۵) حدیث میں ہے کہ سیحون اور جیحون اور فرات اور نیل سب جنت کے دریا ہیں (مسلم) اس دنیا میں وہ سب کچھ انتہائی افراط کے ساتھ موجود ہے جو انسان کو خوشیوں اور کامیابیوں سے بھری ہوئی ایک زندگی بنانے کے لئے درکار ہے (ابراہیم ۳۴) مگر آج زمین کا حسن انسان کو نظر نہیں آتا۔ یہ ویسا ہی ہے جیسے کہ اللہ کی ہستی بے حد نمایاں ہے، وہ آسمان و زمین کا نور ہے۔ مگر انسان اللہ کو نہیں دیکھتا۔ اللہ نے اس زمین کو بے حد خوب بنایا ہے (الذی احسن کل شیئ خلقه، سجدہ ۷) مگر انسان دنیا کے حسن کو نہیں دیکھ پاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنے مصنوعی خول سے باہر نکلنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ آدمی کسی چیز کو جب دیکھتا ہے تو وہ اس کو اپنی "آنکھ" سے نہیں دیکھتا بلکہ اپنے "ذہن" سے دیکھتا ہے۔ اور آدمی کا حال یہ ہے کہ اس نے اپنے ذہن کو سطحیت، ظاہر پرستی، خود پسندی اور وقتی مفادات کے پردوں میں ڈھانپ رکھا ہے۔ ہر آدمی ایک بناوٹی خول میں بند ہے۔ اس صورت حال نے آدمی کو اس قابل نہیں رکھا کہ وہ اپنے آپ سے گزر کر کسی چیز کو اس کے اصلی روپ میں دیکھ سکے۔ وہ چیزوں کو خود ان کی سطح پر دیکھنے کے بجائے ان کو اپنی ذات کی سطح پر دیکھتا ہے۔ وہ ہر آن جہنمی دھوئیں میں گھرا ہوا ہوتا ہے۔ اس بنا پر وہ دنیا کی جنتی فضاؤں کو دیکھ نہیں سکتا۔ آدمی اگر اپنی ذات کے خول سے باہر آئے اور چیزوں کو خدا کی نظر سے دیکھے تو وہ دنیا کے "پھلوں" میں جنت خوشبو پائے گا اور دنیا کے "دریاؤں" میں جنت کا نظارہ کرے گا۔

تاہم اگر کوئی اپنے آپ کو اتنا اوپر اٹھائے کہ دنیا کو اس کے ربانی روپ میں دیکھ سکے تب بھی وہ اس کو برتنے اور اس سے لطف اندوز ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس کی دو خاص وجہیں ہیں۔ ایک اس لئے کہ انسان کو برنبائے امتحان جو آزادی اور اختیار دیا گیا ہے، اس کا غلط استعمال کرکے اس نے زمین کو ظلم و فساد سے بھر دیا ہے — (روم - ۴۱) دوسرے یہ کہ اللہ نے مخصوص مصالح کی بنا پر زمینی زندگی کے اوپر کبد (بلد ۴) کا پردہ ڈال دیا ہے۔ قیامت کے بعد جب زمین کو ان دونوں کمیوں سے پاک کرکے دوبارہ سنوارا جائے گا تو وہ اسی طرح نکھر اٹھے گی جس طرح گرمیوں کے سورج سے جلے ہوئے اور گرد و غبار سے اٹے ہوئے درخت بارش کے بعد نکھر جاتے ہیں۔ اس وقت ہماری یہ دنیا اتنی حسین اور اتنی لذیذ ہو جائے گی "جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی دل میں اس کا خیال گزرا"

جنت مکروہات سے ڈھکی ہوئی ہے

۱۔ ہماری دنیا کی ایک خرابی وہ ہے جو انسان کے ہاتھوں (بما کسبت ایدی الناس) پیدا ہوئی ہے۔ یہ زمین خدا کی زمین ہے۔ اس زمین کا انتظام خدا کے وہ پاک کارندے کر رہے ہیں جن کو فرشتے کہا جاتا ہے۔ تاہم انسان کو عارضی مدت کے لئے یہاں اختیار دے دیا گیا ہے۔ اس محدود اختیار کو انسان نے نہایت بری شکل میں استعمال کیا۔ انسان نے فرشتوں کے اس اندیشہ کو بدترین شکل میں درست ثابت کیا کہ انسان کو زمین میں اختیار دیا جائے گا تو وہ زمین پر فساد کرے گا اور خون بہائے گا (بقرہ ۳۰) انسانوں کے عوائق (شر و فساد) نے خدا کی دنیا کو اس قدر آلودہ کر دیا ہے کہ کسی خدا کے بندے کے لئے یہ ممکن نہیں رہا کہ دنیا کو اس کے اصلی روپ میں پا سکے۔

انسان خدا کا پرستار بننے کے بجائے اپنی پرستش کا بت کھڑا کرتا ہے۔ وہ خدا کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کے بجائے اپنی گھڑی ہوئی راہوں پر دوڑتا ہے۔ وہ کامیابی پا کر اکڑتا ہے۔ وہ اپنے بھائی کو اس کا حق دینے کے بجائے اس کو برباد کرنے کے منصوبے بناتا ہے۔ وہ خدا کے دیئے ہوئے مواقع کو حقیقی کاموں میں لگانے کے بجائے ان کو نمائشی کاموں میں برباد کرتا ہے۔ وہ کمزور کو ستاتا ہے اور جھوٹے مظاہرے کر کے حمایت حق کا کریڈٹ لیتا ہے۔ وہ کسی کی ترقی کو دیکھ کر حسد اور بغض میں مبتلا ہوتا ہے اور اس کو گرانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اعتراف کے طریقہ کو چھوڑ کر ہٹ دھرمی کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ وہ انسانیت کے لئے جینے کے بجائے اپنی ذات کے لئے جیتا ہے۔ وہ امن کے حدود میں کام کرنے کے بجائے قتل اور توڑ پھوڑ کے ذریعہ اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنی بڑائی قائم کرنے کی خاطر پوری قوم اور پوری انسانی نسل کو داؤ پر لگا دیتا ہے۔ انسان کی اس قسم کی بداعمالیوں نے خشکی اور تری کو فساد سے بھر دیا ہے۔ زمین کے جنتی چہرہ کے اوپر اپنا جہنمی پردہ ڈال دیا ہے۔

۲۔ دوسری چیز دنیا کے موجودہ نظام کی محدودیت ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ انسان کو ہم نے رنج اور مشقت (کبد) میں پیدا کیا ہے۔ یہ اس مصلحت سے ہے کہ انسان آپے سے باہر نہ ہو۔ وہ قادر مطلق کو یاد کرتا رہے۔ دنیا میں انسان کی زندگی ایسی ہی ہے جیسے پھول کے ساتھ کانٹا۔ یہاں ہر چیز کے ساتھ ایک "کانٹا" یا کبد لگا دیا گیا ہے۔ زندگی کے ساتھ موت، جوانی کے ساتھ بڑھاپا، طاقت کے ساتھ کمزوری، صحت کے ساتھ بیماری، لذت کے ساتھ محدودیت، آرام کے ساتھ اندیشہ، خوشی کے ساتھ اکتاہٹ، عمل کے ساتھ تکان، ترقی کے ساتھ مسائل۔ دوستی کے ساتھ دشمنی، معتدل موسم کے ساتھ شدید موسم، بارش کے ساتھ طوفان، نسیم صبح کے ساتھ آندھی، تمدن کے ساتھ کثافت (Pollution) کامیابی کے ساتھ حادثہ وغیرہ۔ دنیا میں پھولوں کے ساتھ اس طرح "کانٹے" کی یکجائی نے دنیا کی ہر خوشی اور یہاں کی ہر لذت کو بے معنی بنا دیا ہے۔ آدمی یہاں پا کر بھی نہیں پاتا، آدمی یہاں کامیاب ہو کر بھی اپنی کامیابی کا لطف نہیں اٹھاتا۔ حتیٰ کہ وہ اپنی اندرونی پیچیدگیوں اور خارجی مسائل کی وجہ سے اس قابل نہیں رہ جاتا کہ دنیا کو اس کے بے آمیز روپ میں دیکھ سکے۔

اپنے آپ کو حقیقت واقعہ کے مطابق بنانے والے

قیامت خدا کا وہ منصوبہ بند دھماکا ہے جو اس لئے آئے گا کہ زمین کو ان دونوں قسم کی خرابیوں سے پاک کر دے۔ اس کے بعد یہ ہوگا کہ خدا زمین کے معاملہ کو براہ راست اپنے چارج میں لے لے گا (مریم ۴۰) خدا اپنی زمین سے خبیث انسانوں

کو نکال دے گا (انفال ۳۷) اور یہاں صرف ان طیب انسانوں کو بسائے گا جو موجودہ امتحانی مدت میں اس کا ثبوت دے چکے ہوں کہ وہ خدا کی جنتی دنیا کے شہری بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ غَيْرَ بَعِيدٍ هَٰذَا مَا تُوعَدُونَ لِكُلِّ أَوَّابٍ حَفِيظٍ مَنْ خَشِيَ الرَّحْمَٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُنِيبٍ ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ ذَٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُودِ لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ

ق ۳۵ - ۳۱

اور جنت ڈر والوں کے لئے قریب لائی جائے گی، وہ کچھ دور نہ رہے گی۔ یہ ہے جس کا وعدہ تم سے کیا جاتا تھا۔ وہ ہر ایسے شخص کے لئے ہے جو رجوع ہونے والا یا د رکھنے والا ہو۔ جو بغیر دیکھے اللہ سے ڈرتا ہو اور ایسا دل لایا جس میں رجوع ہے۔ جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔ یہ دن ہے ہمیشہ رہنے کا۔ ان کے لئے وہاں سب کچھ ہے جو وہ چاہیں اور ہمارے پاس اور زیادہ بھی ہے۔

اللہ تعالےٰ کو اپنی جنت میں بسانے کے لئے وہ انسان مطلوب ہے جو اللہ کو نہ دیکھتے ہوئے بھی اس طرح رہے جیسے کوئی اللہ کو دیکھ کر رہتا ہے۔ اللہ کی بڑائی اور اس کے کمالات آدمی کے ذہن پر اس طرح چھا جائیں کہ وہ ہر وقت اس کو یاد آنے لگے۔ اس کا دل خدا کی باتوں سے لبریز رہے اور اس کی زندگی خدا کے گرد گھومنے لگے۔ ایک آقا اپنے اس ملازم سے بہت زیادہ خوش ہوتا ہے جو آقا کی غیر موجودگی میں بھی مکمل طور پر اس کا وفادار بنا رہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کو وہ انسان سب سے زیادہ پسند ہے جو اللہ کو نہ دیکھ کر بھی اس طرح رہتا ہو جیسے وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے، جو اللہ کی جنت اور جہنم کو نہ دیکھتے ہوئے بھی اس طرح ان کی طرف دل لگائے رہے جیسے کہ جنت اور جہنم اس کے سامنے کھڑی ہوئی ہیں۔

جس آدمی کے اندر یہ صفات نہ ہوں وہ گویا خدا کی معیاری دنیا کے لئے بے جوڑ ہے۔ وہ ایک ایسی دنیا میں رہنے کے قابل نہیں جہاں کی ہر چیز فطرت کی صراط مستقیم پر چل رہی ہو۔ جنت کی حسین دنیا میں رہنے کا اہل وہی ہے جو خدا کو اس طرح اپنا معبود بنائے کہ وہی اس کی زندگی بن جائے۔ جو اپنے شعور کو اس حد تک ترقی دے کہ اپنے آپ کو اپنے سے الگ ہو کر دیکھنے لگے۔ جو خود مختار ہو کر بھی پابند زندگی گزارے۔ جو آزاد ہو کر بھی اپنی آزادی کو صحیح حدود میں استعمال کرے۔ یہ بلند نظری اور حقیقت پسندی کا وہ مقام ہے جہاں آدمی نفسیاتی پردوں سے باہر آکر سوچتا ہے۔ جہاں وہ اپنے آپ کو ذاتی نگاہ سے نہیں بلکہ حقیقت واقعہ کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ جہاں وہ مجبور نہ ہوتے ہوئے بھی ہمہ تن اپنے آپ کو اپنے آقا کے آگے جھکا دیتا ہے۔ جہاں مخالف ترغیبات کے باوجود وہ اپنے آپ کو اللہ کے حدود پر قائم رکھتا ہے۔ جہاں ڈھٹائی کے مواقع ہوتے ہوئے بھی وہ سراپا اپنے کو حق کے آگے ڈال دیتا ہے۔ مالک کائنات کے ظہور کے بعد آدمی کا جو حال ہو گا وہ حال اس کا اسی وقت ہو جاتا ہے جب کہ مالک کائنات ابھی غیب کے پردہ میں ہے۔ آج کی دنیا میں حق پرستی اور معقولیت کی کوئی قیمت نہیں۔ آج ساری قیمت صرف طاقت میں ہے۔ جنت کی دنیا وہ دنیا ہوگی جہاں حق پرستی اور معقولیت قیمت والی چیزیں بن جائیں گی۔ اس لئے اس کا شہری وہی بن سکتا ہے جس نے موجودہ دنیا میں اپنے اندر ایسے انسان کی پرورش کی ہو جو حق کو ماننے والا اور معقولیت کو تسلیم کرنے والا ہے۔ اللہ کی ناپسندیدہ چیزیں گویا اللہ کا "شجرۂ ممنوعہ" ہیں۔ جنت میں قیام

کا اجازت نامہ اسی کو ملے گا جو دنیا میں اپنے عمل سے ثابت کرے کہ وہ آزاد اور خود مختار ہو کر بھی ممنوعہ درخت کے قریب نہیں جاتا۔ جو شخص دنیا کے امتحانی مرحلہ میں یہ ثبوت دے کہ وہ لغو اور تاثیم سے دور رہنے والا آدمی ہے، اسی سے امید کی جا سکتی ہے کہ وہ جنت کے لغو اور تاثیم سے خالی ماحول میں مناسب طور پر رہ سکے گا۔ جو شخص اس قسم کے ضبط نفس، انسانی شرافت اور بلند کرداری کا ثبوت نہ دے، اس کو جنت میں آبادی کا اہل نہیں قرار دیا جائے گا، بلکہ اس کو دور پھینک دیا جائے گا جہاں وہ محروم اور بے یار و مددگار ہو کر ابد تک عذاب سہتا رہے (انفال ۳۷)

جنت کی تعمیر

آخرت وہ دن ہے جب کہ، قرآن کے الفاظ میں، اشجار خبیثہ کو اس زمین سے اکھاڑ پھینکا جائے گا۔ اور صرف اشجار طیبہ کو یہاں باقی رہنے دیا جائے گا جو خدا کے خصوصی انتظامات کے تحت یہاں ہمیشہ کے لئے پھلیں پھولیں گے۔ زمینی جنت سے برے لوگوں کو نکالنے اور وہاں اچھے لوگوں کو بسانے کا ذکر بائبل میں ان الفاظ میں آیا ہے:

"تو بدکرداروں کے سبب سے بیزار نہ ہو۔ اور بدی کرنے والوں پر رشک نہ کر۔ کیونکہ وہ گھاس کی طرح جلد کاٹ ڈالے جائیں گے۔ خداوند میں مطمئن رہ اور صبر سے اس کی آس رکھ۔ قہر سے باز آ اور غضب کو چھوڑ دے۔ کیوں کہ بدکردار کاٹ ڈالے جائیں گے۔ لیکن جن کو خداوند کی آس ہے ملک کے وارث ہوں گے۔ تھوڑی دیر میں شریر نابود ہو جائے گا۔ تو اس کی جگہ کو غور سے دیکھے گا، پر وہ نہ ہوگا۔ لیکن حلیم ملک کے وارث ہوں گے۔ اور سلامتی کی فراوانی سے شادماں رہیں گے۔ شریروں کے بازو توڑے جائیں گے۔ لیکن خداوند صادقوں کو سنبھالتا ہے۔ کامل لوگوں کے ایام کو خداوند جانتا ہے۔ ان کی میراث ہمیشہ کے لئے ہوگی۔ جن کو وہ برکت دیتا ہے وہ زمین کے وارث ہوں گے۔ اور جن پر وہ لعنت کرتا ہے وہ کاٹ ڈالے جائیں گے۔ بدی کو چھوڑ دے اور نیکی کر۔ اور ہمیشہ تک آباد رہ۔ کیوں کہ خداوند انصاف کو پسند کرتا ہے۔ اور اپنے مقدسوں کو ترک نہیں کرتا۔ وہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہیں۔ پر شریروں کی نسل کاٹ ڈالی جائے گی۔ صادق زمین کے وارث ہوں گے۔ اور اس میں ہمیشہ بسے رہیں گے۔ خداوند کی آس رکھ اور اسی کی راہ پر چلتا رہ۔ اور وہ تجھے سرفراز کر کے زمین کا وارث بنائے گا۔

(زبور، داؤد کا مزمور ۳۷)

قیامت کے دھماکے کے بعد جو دنیا بنے گی وہ ہر قسم کی محدودیت اور ناموافق حالات سے پاک ہوگی۔ حدیث میں آیا ہے:

عن ابی سعید، انّ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال ینادی مناد انّ لکم ان تصحوا فلا تسقموا ابدا وانّ لکم ان تحیوا فلا تموتوا ابدا وانّ لکم ان تشبوا فلا تھرموا ابدا وانّ لکم ان تنعموا فلا تبلسوا ابدا (مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آخرت میں ایک پکارنے والا جنت والوں سے پکار کر یہ کہے گا کہ اب تم ہمیشہ تندرست رہو گے کبھی بیمار نہ ہو گے۔ اب تم ہمیشہ زندہ رہو گے کبھی تم کو موت نہ آئے گی۔ اب تم ہمیشہ جوان رہو گے کبھی بوڑھے نہ ہو گے۔ اب تم ہمیشہ نعمتوں میں رہو گے کبھی محتاج نہ ہو گے۔

قرآن و حدیث میں کثرت سے ایسے اشارے ملتے ہیں جو بتاتے ہیں کہ کس طرح وہ تمام ناخوش گوار اور ناموافق چیزیں آخرت

کی دنیا سے حذف کردی جائیں گی جو آج "کید" بن کر ہم کو گھیرے ہوئے ہیں۔ موجودہ دنیا میں آدمی محنت ومشقت کے بعد کوئی چیز پاتا ہے، جنت میں صرف اشتہار (زخرف ۷۱) کسی چیز کو پانے کے لئے کافی ہوگی۔ آخرت کی دنیا ہر قسم کے دکھ اور ہر طرح کے اندیشوں سے بالکل خالی ہوگی (احقاف ۱۳) اہل جنت جب اس کو دیکھیں گے تو پکار اٹھیں گے: الحمد للہ الذی اذھب عنا الحزن (فاطر ۳۴) سب تعریف اللہ کے لئے ہے جس نے ہم سے غم کو دور کر دیا۔ اسی کے ساتھ زمین کے امکانات کو بڑھانے کے لئے اس کو بڑا کر دیا جائے گا (وَإِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ) اس کی ایک صورت یہ ہے کہ غالباً پہاڑوں اور سمندروں کو ختم کر کے پوری زمین کو سطح کر دیا جائے گا، جس کے اشارے قرآن میں متعدد مقامات پر ملتے ہیں۔ اسی کے ساتھ غالباً اس کے حجم میں بھی اضافہ کر دیا جائے گا۔ اس کی تصدیق موجودہ جغرافی مطالعہ سے بھی ہوتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں ایک مستقل نظریہ توسیع زمین کا نظریہ (Expanding Earth Theory) کے نام سے وجود میں آیا ہے۔ جغرافی ماہرین نے اندازہ کیا ہے کہ پچھلے دو سو ملین سال میں ہماری زمین تقریباً بیس فی صد تک غبارہ کی طرح پھول گئی ہے۔ اور اب بھی پھولتی اور بڑھتی جا رہی ہے:

New Scientist, London, February 8, 1978, p. 389.

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت ہماری موجودہ زمین ہی پر تعمیر ہوگی (زمر ۷۴) آج یہ زمین انسان کے چارج میں ہے اس وقت خدا براہ راست اس کو اپنے قبضے میں لے لے گا (مریم ۴۰) اچھے اور برے ایک دوسرے سے الگ کر دیئے جائیں گے (روم ۱۴) اور زمین کو اللہ اپنے پسندیدہ بندوں کے حوالے کر دے گا (انبیاء ۱۰۵) اس وقت زمین براہ راست خدا کے نور سے جگمگائے گی (زمر ۶۹) زمین پر جنتی ماحول پیدا کرنے کے لئے اس میں بہت سی تبدیلیاں کی جائیں گی (ابراہیم ۴۸) اس کے اوپر سے پہاڑوں کو ختم کر کے ہموار کر دیا جائے گا (طٰہٰ ۱۰۷) دریاؤں اور سمندروں کو سطح زمین کے نیچے کر دیا جائے گا (انفطار ۳) اور اس کے بعد زیر زمین آب رسانی کا نظام قائم کیا جائے گا (تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ) زمین کا آبادی کا رقبہ موجودہ رقبہ سے کئی گنا زیادہ بڑھ جائے گا (انشقاق ۳) ساری زمین ہموار کھلی ہوئی ہو جائے گی (کہف ۴۷) سخت سردی اور سخت گرمی کو ختم کر کے موسموں کو بالکل معتدل کر دیا جائے گا (دہر ۱۳) اس قسم کی اور بہت سی خوش گوار تبدیلیاں کرنے کے بعد زمین پر نہایت عمدہ مکانات، بہترین پارکوں اور باغوں میں بنائے جائیں گے (صف ۱۲) وہاں کا ماحول بے حد ستھرا ماحول ہوگا جو ہر قسم کی لغویات وخرافات سے بالکل پاک ہوگا (واقعہ ۲۵) وہاں اللہ کی بڑائی کے سوا کسی اور کی بڑائی کا چرچا نہ ہوگا (زمر ۷۵) وہاں ہر طرف امن وسلامتی کا ماحول ہوگا (واقعہ ۲۰) وہاں عالی شان کثیر منزلہ عمارتیں ہوں گی (زمر ۲۰) اہل جنت کو ہر قسم کی شاہانہ نعمتیں اور عزت ومرتبہ حاصل ہوگا (دہر ۲۰) وہاں انسان کی تمام مطلوبہ لذتیں مزید اضافہ کے ساتھ موجود ہوں گی (حم سجدہ ۳۱) وہاں کی مشغولیتیں بھی سب کی سب فرحت بخش ہوں گی (یس ۵۵) جب زمین کا یہ نیا انتظام ہوگا تو زمین سے تمام برے انسان اکھاڑ پھینکے جائیں گے (ابراہیم ۲۶) زمین پر صرف وہ لوگ باقی رہیں گے جو موجودہ زندگی میں باقیمت ثابت ہوئے ہوں (رعد ۱۷) جنھوں نے اپنی پہلی زندگی میں عبد صالح کی حیثیت سے زندگی گزاری ہو (انبیاء ۱۰۵) اصل جنت غالباً اسی زمین پر قائم ہوگی مگر اہل جنت کی پہنچ ساری کائنات

تک ہوگی (حدید ۲۱) وہ پوری کائنات میں جہاں چاہیں گے دیکھیں گے اور جس سے چاہیں گے بات کریں گے (صافات ۵۵) وہ جہاں چاہیں گے بآسانی جاسکیں گے (زمر ۷۴)۔ جس طرح آج کی دنیا میں پانی اور ہوا اور روشنی اور دوسرے بے شمار سامان خدائی انتظام کے تحت مسلسل فراہم کئے جارہے ہیں اسی طرح جنت میں انسان کی تمام مرغوب چیزیں اس کو خدائی انتظام کے تحت فراہم ہوں گی۔

نیوانگلینڈ کے طبی جرنل (Journal of Medicine) میں ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ صنعتی کثافت نے امریکی باشندوں کی صحت کے لئے طرح طرح کے مسائل پیدا کردیئے ہیں ان میں سے ایک کے الفاظ میں یہ ہے:

Industrial pollution has raised the lead content in the bodies of Americans to 500 times the human body's natural level. *The Times of India*, April 29, 1979.

انسانی جسم میں فطری طور پر جست کی جو مقدار ہوتی ہے، اس کے مقابلہ میں امریکیوں کے جسم میں پانچ سو گنا زیادہ جست ہوگیا ہے۔ اور اس کی وجہ صنعتی کثافت ہے، اس قسم کے بے شمار مسئلے ہیں جو موجودہ زمانہ میں صنعتی کثافت نے پیدا کئے ہیں۔ ہماری مشینی صنعت اگر ایک طرف ہماری ضرورت کے سامان تیار کرتی ہے تو اسی کے ساتھ وہ پانی کو اور فضا کو اپنی کثافتوں سے بھر دیتی ہے۔ انسان ابھی تک ایسی ٹکنالوجی دریافت نہ کرسکا جو کثافت پیدا کئے بغیر تمدن کی گاڑی چلا سکے۔

قدرت ہماری زندگی کے تمام سامان بے حساب مقدار میں مہیا کرتی ہے اور اس کے لئے ان گنت صنعتیں چلاتی ہے۔ درخت سے لے کر زندہ اجسام تک اور ذرہ سے لے کر شمسی اور کہکشانی مجموعوں تک ہر چیز متحرک ہے، ہر چیز انتہائی پیچیدہ صنعتی نظام ہے جو ہمارے لئے زندگی کے اسباب مہیا کرتا ہے۔ مگر اتنے بڑے پیمانہ پر صنعتی سرگرمیاں جاری ہونے کے باوجود ہمارے لئے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں حرکت ہے مگر شور نہیں۔ یہاں سامان تیار ہو رہے ہیں مگر دھواں نہیں۔ یہاں پرانی چیزیں نئی صورت اختیار کرتی رہتی ہیں مگر کہیں کوئی گندگی نہیں۔ اللہ کی اس عظیم الشان صنعت گاہ میں صرف چند تمدنی چیزیں انسان کے اوپر چھوڑ دی گئی ہیں۔ مثلاً مکان، سواری، برتن، کپڑا، فرنیچر وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی خام اشیاء بنائیں اور ان کو تیار شدہ سامان کی صورت دینے کے لئے بھی اعلیٰ درجہ کے مواقع فراہم کردئے۔ اور اس کے بعد انسان کے ذمہ یہ کام سپرد کر دیا کہ وہ ان کو استعمال کر کے اپنے لئے تمدنی اشیاء تیار کرے۔

نظام کائنات میں انسان کی اس محدود شرکت نے خشکی اور تری کو کثافتوں سے بھر دیا ہے۔ آخرت میں جب جنتی دنیا بنے گی تو تمدن کی تعمیر کا کام بھی اللہ براہ راست اپنے انتظام میں لے لے گا۔ آج ہم اپنے "مکانات" خود بناتے ہیں۔ اس وقت بنے بنائے مکانات (زمر ۲۰) ہم کو خدا کی طرف سے مہیا کئے جائیں گے جس طرح آج بھی بے شمار قدرتی چیزیں بنی بنائی حالت میں ہم کو دی جارہی ہیں۔ اس وقت ایسی سواریاں دی جائیں گی جو بے حد تیز رفتار ہوں گی مگر وہ زمین کی مانند ہوں گی جو ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ رہی ہے مگر کوئی شور نہیں کرتی۔ اس وقت تمدنی کارخانے قائم ہوں گے۔ مگر وہ درخت کے کارخانہ کی مانند ہوں گے جو فضا کو آلودہ کرنے کے بجائے اس کو آکسیجن سے معطر کرتا رہتا ہے۔ وہاں آدمی کھائے گا اور پیئے گا۔ مگر اس کا جسمانی نظام کوئی غلاظت نہیں نکالے گا۔ بلکہ پھول کے نظام کی مانند ہوگا جو اپنے اندر کی کثافت کو خوشبو کی صورت میں خارج کرتا ہے۔ وہاں ہر قسم کی بہترین سرگرمیاں جاری ہوں گی۔ مگر وہ کسی قسم کی ناخوش گواری

پیدا نہیں کریں گی، نہ اپنے لئے اور نہ دوسروں کے لئے۔

جنت کی شہریت کس کو ملے گی

یہ حسین و لذیذ جنت جو قیامت کے بعد بننے والی ہے، اسی کے شہریوں کا نام مومن و مسلم ہے۔ موجودہ زندگی اسی اہلیت کا امتحان ہے۔ یہاں لوگوں کے اعمال کے مطابق ان کا انتخاب کیا جا رہا ہے۔ جو لوگ اس بات کا ثبوت دیں کہ وہ جنت کے لطیف ماحول میں بسائے جانے کے قابل ہیں، ان کو وہاں کی شہریت عطا کی جائے گی۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جنت میں لوگوں کے منھ سے جو بات نکلے گی وہ یہ کہ خدایا، پاک ہے تیری ذات، اور آپس میں ان کی ملاقات سلام ہوگی۔ اور ان کی آخری بات یہ ہوگی کہ سب خوبی اللہ کے لئے ہے (یونس ۱۰) اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت میں ایک طرف خدا کی بڑائی اور اس کی شکر گزاری کا ماحول ہوگا۔ لوگ اپنے رب کے لئے بہترین جذبات سے سرشار ہوں گے۔ دوسری طرف ان کے درمیان آپس میں جو فضا ہوگی وہ تمام تر سلامتی اور محبت کی فضا ہوگی نہ کہ ضد اور منافست کی۔ ایسی حالت میں جنت کی دنیا میں داخلہ کا مستحق وہی قرار پا سکتا ہے جس نے موجودہ دنیا کی امتحانی مدت میں اپنے عمل سے یہ ثبوت دیا ہو کہ وہ خدا اور اس کے بندوں کے لئے اسی قسم کے اعلیٰ جذبات و کیفیات رکھنے والا انسان ہے۔ حدیث میں ہے کہ جنت میں وہ شخص نہیں جائے گا جس کے اندر رائی کے دانہ کے برابر بھی کبر ہو۔ پوچھا گیا کہ کبر کیا ہے۔ فرمایا: حق کو نظر انداز کرنا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت میں حقیقتوں کے اعتراف کا اور ہر بندۂ خدا کے احترام کا ماحول ہوگا، اس لئے جنت میں آبادکاری کا مستحق وہی شخص ہو سکتا ہے جس نے آج کے امتحانی مرحلہ میں اپنے رویہ سے یہ ثابت کیا ہو کہ وہ حق کو پہچاننے والا اور اس کے آگے جھک جانے والا ہے خواہ اس کے ساتھ کوئی دباؤ شامل نہ ہو۔ اسی طرح وہ انسان کا احترام کرنے والا ہے خواہ وہ اپنے پیچھے دولت اور اقتدار کا زور نہ رکھتا ہو۔ قرآن و حدیث میں جس قسم کے لوگوں کے لئے جہنم کی وعید ہے اور جن کو جنت کی خوش خبری دی گئی ہے، وہ سب گویا وہ اوصاف ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ کس قسم کے لوگ جہنم میں دھکیل دئے جائیں گے اور کون سی خصوصیات رکھنے والے لوگ ہیں جو جنت کے ماحول میں رہنے کے مستحق قرار پائیں گے ——— اسلام کی عبادات اور اعمال سب اسی لئے ہیں کہ وہ آدمی کا تزکیہ کرکے اس کو اس قابل بنائیں کہ وہ جنتی معاشرہ میں بسائے جانے کے قابل ہو سکے۔

ایک ہندستانی صحافی ٹوکیو گیا۔ وہاں ایک گفتگو کے دوران اس کے جاپانی دوست نے اس کو بتایا کہ دودھ کی پیداوار جو اس وقت جاپان میں ہے، اس کے لحاظ سے ہم اپنی آبادی کے صرف دو تہائی حصہ کو دودھ مہیا کر پاتے ہیں۔ ہندستانی نے فوراً کہا کہ آپ لوگ نہایت آسانی سے پوری آبادی کو دودھ فراہم کر سکتے ہیں۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ دودھ کی مقدار جتنی کم ہے، اتنا اس کے اندر پانی ملا دیں۔ جاپانی یہ سنتے ہی فوراً سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے اپنے ہندستانی دوست کے کان میں چپکے سے کہا: اچھا ہوا کہ یہ بات تم نے صرف مجھ سے کہی، اس قسم کی تدبیر یہاں عوام میں ہرگز بیان نہ کرنا۔ ورنہ لوگ تم کو قتل کر دیں گے:

"Do not pronounce such remedies here; they will murder you": *Weekend Review*, New Delhi, October 14, 1967.

گویا ایک ایسا شخص جو غذا میں ملاوٹ کا مزاج رکھتا ہو وہ جاپانی معاشرہ میں رہنے کے قابل نہیں۔ جاپانی معاشرہ ایسے کسی آدمی کو قبول نہیں کر سکتا۔ اس چھوٹی سی مثال سے جنت کے معاملہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ جنت گویا قلوب سلیمہ (شعراء ۸۹) اور نفوس مطمئنہ (فجر ۲۷) کی کالونی ہے۔ وہ ایسے لوگوں کا معاشرہ ہے جو ہر قسم کی نفسیاتی پیچیدگیوں سے آزاد ہوں۔ اس لئے وہاں کی دنیا میں صرف انھیں لوگوں کو بسایا جائے گا جو دنیا کی امتحانی زندگی میں اس بات کا ثبوت دے چکے ہوں کہ وہ اپنے اندر پیچیدگیوں سے آزاد روح (Complex-free soul) رکھتے ہیں۔

جنت کا ماحول وہ ماحول ہوگا جہاں ہر طرف خدا کی حمد ہو رہی ہوگی، خدا کی کبریائی کے سوا کسی اور کی کبریائی کا وہاں وجود نہ ہوگا۔ اس لئے وہی لوگ جنت کی دنیا میں رہنے کے قابل قرار پائیں گے جو موجودہ دنیا میں خدا کی حمد اور اس کی کبریائی سے سرشار رہے ہوں۔ اپنی ذات کی کبریائی چاہنے سے جن کا سینہ خالی رہا ہو۔ جنت کی دنیا میں قول وعمل کا تضاد نہ ہوگا۔ وہاں کوئی کسی کو دھوکہ نہ دے گا۔ وہاں کوئی کسی کا استحصال کرنا نہ چاہے گا۔ وہاں کوئی کسی کو آزار نہ پہنچائے گا، اس لئے جنت کا باشندہ وہی شخص ہو سکتا ہے جس نے موجودہ زندگی میں اپنے عمل سے دکھایا ہو کہ وہ شہریت کے ان اعلیٰ معیاروں پر پورا اترتا ہے۔ جنت مکمل طور پر مثبت سرگرمیوں کی دنیا ہوگی۔ اس لئے وہاں کی بستیوں میں رہائش اختیار کرنے کا اجازت نامہ صرف انھیں لوگوں کو ملے گا جنھوں نے آج کی دنیا میں یہ ثبوت دیا ہو کہ وہ خالص مثبت مزاج رکھنے والے لوگ ہیں اور منفی اور تخریبی کارروائیوں سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتے۔ جنت کی دنیا ایک ایسی دنیا ہے جہاں آدمی دوسروں کی شرارتوں اور نالائقیوں سے محفوظ ہوگا، اس لئے جنت کی آبادیوں میں رہنے کے قابل وہی شخص ہے جس نے دنیا میں یہ ثبوت دیا ہو کہ وہ ایک ایسا شخص ہے جو دوسروں کو اپنی شرارتوں اور نالائقیوں سے محفوظ رکھنے والا ہے۔ جنت کا ماحول خرافات سے، گندگیوں سے اور فضول چیزوں سے پاک ہوگا، اس لئے جنت کی کالونیوں میں بسانے کے لئے انھیں لوگوں کا انتخاب کیا جائے گا جو اس قسم کی بے ہودگیوں سے دور رہنے والے ثابت ہوئے ہوں۔

اہل جنت کی مثال

درخت موجودہ دنیا میں، جنت کے شہریوں کے امثال (Doubles) ہیں۔ قرآن میں ایمان کو درخت سے تشبیہ دی گئی ہے (ابراہیم ۲۴) انسانی وجود کی مثال زمین کی سی ہے۔ توحید کا عقیدہ اس زمین کے لئے بیج کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب ایک آدمی توحید کو اپناتا ہے تو گویا وہ اپنی ہستی کی زمین پر شجرۂ طیبہ کا بیج بوتا ہے۔ اگر زمین تیار ہے تو بیج اگنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس کی جڑیں انسان کی ہستی میں داخل ہونا شروع ہو جاتی ہیں، اس کی شاخیں اس کے وجود کے چاروں طرف ابھرنے لگتی ہیں۔ جو لوگ کامل شجر بنیں گے وہ یہاں ابدی طور پر نشوونما پائیں گے۔ اور جو جھاڑ جھنکاڑ ہوں گے ان کو اکھاڑ کر پھینک دیا جائے گا۔

درخت اس لئے وجود میں نہیں آتا کہ دوسروں کے خلاف تقریر و تحریر کی مہم چلائے اور خارجی دنیا میں نظام اشجار قائم کرنے کے لئے توڑ پھوڑ کا طوفان برپا کرے۔ گدھے اور بھیڑیئے ممکن ہے ایسا کرتے ہوں مگر درختوں کا

یہ کام نہیں۔ درخت ایک انفرادی وحدت ہے۔ اس کی اپنی خاموش دنیا ہے۔ درخت کا سارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی فطرت میں چھپی ہوئی امکانیات کو بروئے کار لائے۔ وہ زمین اور ہوا اور سورج اور دوسرے بے شمار کائناتی انتظامات سے اپنے لئے غذا حاصل کرتا ہے اور پھر اپنے کو ایک ایسے کامل وجود کی صورت میں کھڑا کرتا ہے جس کی جڑیں زمین میں گہرائی تک جمی ہوئی ہوں اور جس کی شاخیں آسمان تک پہنچ رہی ہوں۔ وہ ایک انتہائی بامعنی وجود ہوتا ہے۔ اس کی جڑوں میں کروروں بیکٹیریا اس لئے مصروف عمل ہوتے ہیں کہ ہوا سے نائٹروجن نکال کر اس کو غذا فراہم کریں۔ مگر کوئی مزدوروں کا مسئلہ (Labour problem) نہیں پیدا ہوتا۔ وہ لکڑی اور پتی اور پھول اور پھل کی تیاری کے لئے ایک عظیم الشان انڈسٹری قائم کرتا ہے۔ مگر اس کی انڈسٹری کوئی فضائی کثافت پیدا نہیں کرتی۔ اس کے برعکس اس کی "چمنیاں" تر و تازہ آکسیجن نکال کر فضا کو صحت بخش ہوا سے بھر دیتی ہیں۔ درخت زمین کا حسن ہے۔ وہ ہر موسم میں پھل دیتا ہے۔ وہ بارش کے عمل میں مدد دیتا ہے۔ وہ زمین کے کٹاؤ کو روکتا ہے۔ وہ سایہ اور لکڑی اور کھاد دیتا ہے، تاہم کسی کو اس سے فخر و غرور کا تجربہ نہیں ہوتا۔ وہ کائنات کے مجموعہ میں اس طرح ہم آہنگ ہے کہ دوسروں کو اس سے صرف نفع پہنچے، کسی کو اس سے کسی تکلیف کا تجربہ نہ ہو۔ آدمی درخت پر پتھر پھینکتا ہے اور درخت اس کے بدلے میں اس کے لئے پھل گراتا ہے۔ آدمی درخت کو کاربن دیتا ہے۔ درخت اس کے بدلے میں آکسیجن لوٹاتا ہے۔ وہ ایک کھڑا ہوا باعظمت وجود ہے۔ مگر وہ اپنا سایہ زمین پر ڈال کر اپنے خالق کی کبریائی کا اعتراف کرتا ہے۔ اس کی نفع بخشیاں اس کے دشمن کے لئے بھی اسی طرح کھلی ہوئی ہیں جس طرح اس کے دوست کے لئے۔ درخت، اپنی ابتدائی صورت میں ایک معمولی مادی مجموعہ ہے۔ مگر خدا کی کائنات سے اپنا رزق لے کر، وہ اپنے آپ کو قدرت کے ایک شاہکار کی صورت میں زمین کے اوپر کھڑا کر دیتا ہے۔

درخت دنیا کی زندگی میں مومنین جنت کا تعارف ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ وہ نفوس زکیہ کیسے ہوتے ہیں جن کو اللہ اپنی جنت کی آبادکاری کے لئے چنتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو ایسا بنائیں کہ ان کا سینہ اللہ کی حمد کے سوا ہر حمد سے خالی ہو۔ جو بڑائی کے بجائے عجز کو اپنا کمال سمجھتے ہوں۔ جن کے پاس دوسروں کے لئے نفع رسانی ہو نہ کہ ضرر رسانی۔ جو ہر قسم کے منفی جذبات سے پاک ہو کر خدائی زمین پر لہلہاتے ہوں۔ یہی لوگ جنت کی کالونیوں میں بسائے جائیں گے۔ اور جنت کی لطیف اور نفیس دنیا ایسے ہی لوگوں کے لئے بنائی گئی ہے۔

آخرت میں ایک طرف زمینی زندگی کو ہر قسم کی محدودیتوں سے پاک کر دیا جائے گا، دوسری طرف تمام اشجار خبیثہ (غیر صالح لوگوں) کو یہاں سے اکھاڑ پھینکا جائے گا اور صرف اشجار طیبہ (صالح لوگوں) کو یہاں آبادکاری کا موقع دیا جائے گا۔ اس وقت یہ دنیا، خدا کی مزید نعمتوں کے ساتھ، جنت کی دنیا بن جائے گی۔ ایک طرف خوف و حزن اور دوسری طرف اشجار خبیثہ کے حذف کے بعد جو دنیا بنے گی وہ ایک ایسا سرسبز و شاداب باغ ہوگا جس کو دیکھ کر آدمی کہے گا: کاش میں نے اپنا سب کچھ لٹا کر اس کو حاصل کیا ہوتا۔

دین کا ماخذ قرآن وسنت نہ کہ تاریخ

ایک شخص غریب خاندان میں پیدا ہوا۔ اس کے لئے زندگی کی صورت صرف یہ تھی کہ اپنی کوششوں پر بھروسہ کرے اور ماحول کے اندر اپنا اعتبار اور اعتماد پیدا کرکے اپنی جگہ بنائے۔ اس نے محنت اور دیانت داری کو اپنا اصول بنایا۔ اس کا طریقہ کامیاب رہا۔ اس نے اپنے عمل سے غیر معمولی ترقی حاصل کی —— اس نے اپنے لئے بہت بڑا مکان تعمیر کیا۔ باغ اور کھیت بنائے۔ تجارتیں قائم کیں۔ اپنے ساتھی اور مددگار پیدا کئے۔ وہ شخص جس نے زندگی کا آغاز معمولی محنت مزدوری سے کیا تھا، اپنی آخر عمر میں اس نے یہ درجہ حاصل کیا کہ وہ اپنے علاقہ کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ بااثر آدمی بن چکا تھا۔ اس نے اپنے بچوں کو وصیت کی کہ تم لوگ ہمیشہ میری راہ پر چلنا اور بچوں نے قسم کھاکر وعدہ کیا کہ وہ ایسا ہی کریں گے۔ یہ ایک امن پسند اور تعمیری مزاج رکھنے والا آدمی تھا۔ تاہم عمر کے آخری حصہ میں کچھ مفسدین نے اس کو مقدمہ بازی میں الجھا دیا۔ دیوانی اور فوجداری دونوں قسم کے مقدمات چلنے لگے۔ یہ مقدمات ابھی جاری تھے کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔

اب جو بیٹے اس شخص کے وارث بنے، ان کو اپنے سفر کا آغاز وہاں سے ملا جہاں ان کا باپ ان سے جدا ہوا تھا۔ وہ بعد کی تاریخ کے وارث تھے نہ کہ حقیقۃً باپ کے ابتدائی اصولِ حیات کے۔ باپ کے لئے زندگی محنت اور دیانت داری کا نام تھی۔ مگر بیٹوں کو نظر آیا کہ زندگی نام ہے مقدمہ لڑنے اور حریفوں سے ٹکراؤ کرنے کا۔ باپ نے مثبت تعمیر میں زندگی کا راز پایا تھا، بیٹوں کو اغیار کی تخریب میں زندگی کا راز دکھائی دینے لگا۔ باپ نے ساری عمر تعمیر و ترقی کے کاموں میں صرف کی تھی۔ بیٹوں نے اپنی ساری عمر اپنے مفروضہ دشمنوں سے لڑنے بھڑنے میں گزار دی۔ حتیٰ کہ باپ کا اثاثہ بھی اس میں ضائع کر دیا۔ پھر بھی وہ اپنے طور پر یہی سمجھتے رہے کہ وہ باپ کے اسوہ کی تعمیل میں ایسا کر رہے ہیں۔

ایسا ہی کچھ حال موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکوں کا ہے۔ اسلام کا آغاز ساتویں صدی عیسوی میں ہوا تو اس وقت وہ نام تھا تعلق باللہ کا، فکر آخرت کا۔ رسول خدا کے نمونہ کو سامنے رکھ کر زندگی گزارنے کا، اپنے آپ کو فرشتوں کا ہم نشین بنانے کا۔ جہنم سے ڈرنے اور جنت کا مشتاق ہونے کا، اللہ کی عبادت گزاری کا اور بندوں کے ساتھ انصاف اور خیر خواہی کا معاملہ کرنے کا۔ مگر اس آغاز کے بعد اسلام کی ایک دنیوی تاریخ بنی۔ یہ تاریخ چلتی رہی۔ حتیٰ کہ اسلام ساری دنیا میں سب سے زیادہ غالب قوت بن گیا۔ یہ صورت ایک ہزار سال تک قائم رہی۔ اس کے بعد پہیہ دوسرے رخ پر چلنا شروع ہوا۔ دوسری قوموں نے نئی نئی قوتوں سے مسلح ہو کر مسلمانوں کے اوپر غلبہ حاصل کر لیا اور ان کو ہر میدان میں پیچھے دھکیل دیا۔

اس صورت حال سے مسلمانوں کو جھٹکا لگا۔ اس کے ردعمل کے طور پر انیسویں صدی عیسوی میں مسلم ملکوں میں جوابی تحریکیں اٹھنا شروع ہوئیں۔ یہ تحریکیں بظاہر مختلف ناموں سے شروع ہوئیں۔ ان کے پروگرام بھی اکثر اوقات الگ الگ رہے مگر ایک بات سب میں مشترک تھی۔ تقریباً تمام تحریکیں ردعمل کی نفسیات کے تحت پیدا ہوئیں۔ ان کا مقصد کسی نہ کسی طور پر حملہ آور قوتوں کا مقابلہ کرنا تھا۔ بالفاظ دیگر، وہ "باپ" کی ابتدائی زندگی کے احوال سے متاثر ہو کر نہیں اٹھیں بلکہ وہ باپ کی زندگی کے آخری احوال کے اثر سے پیدا ہوئیں۔ ان کو مثبت فکر نے پیدا نہیں کیا۔ بلکہ منفی جذبات ان کے ابھرنے کا سبب بنے۔ ابتدائی

دور کے مسلمانوں کے لئے اسلام کا مطلب یہ تھا کہ اپنی زندگی کو اللہ کی مرضی پر ڈھالیں تاکہ موت کے بعد آنے والی زندگی میں خدا ان کو جنتوں میں داخل کرے۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے لئے اسلام کا مطلب یہ بن گیا کہ دوسروں سے اپنے حقوق و مطالبات کے لئے لڑتے رہیں۔ ایک کا رخ اگر آسمانی چیزوں کی طرف تھا تو دوسرے کا رخ دنیوی چیزوں اور دنیوی حریفوں کی طرف ہوگیا۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے اتنی معقولیت برتی کہ اس فرق کا اعتراف کرتے ہوئے انھوں نے اعلان کیا کہ ان کی تحریک ملت کے تحفظ یا اس کے دفاع کی تحریک ہے نہ کہ مطلق معنوں میں پیغمبرانہ مشن کو زندہ کرنے کی۔ تاہم بعض ایسے حوصلہ مند بھی تھے جو اس کمتر حیثیت پر قانع نہ ہوئے۔ انھوں نے کہنا شروع کیا کہ وہ جس "انقلابی" مقصد کے لئے اٹھے ہیں وہی اسلام کا اصلی اور ابدی مقصد ہے۔ تمام انبیاء اسی لئے آئے کہ باطل طاقتوں سے لڑیں اور ان سے لڑکر اسلامی قانون کی حکومت قائم کریں۔ اس طرح مذہب ان نئی تشریح کے خانہ میں، مذہب جنگ بن گیا۔ ذاتی اصلاح کی تڑپ نے خارجی انقلاب کی تڑپ کی صورت اختیار کرلی۔ گویا بیٹوں کے لئے "مقدمہ بازی"، باپ کا وقتی یا اضافی عمل نہ رہا، بلکہ وہی ان کا اصل مقصدِ حیات قرار پایا۔ یہی وہ اصل دین بن گیا جس پر خدا کے یہاں جنت اور جہنم کا فیصلہ ہوا ہے۔

اسلام کی جدید تاریخ کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے۔ لوگ اسلام کے لئے سرفروشی کررہے ہیں حالاں کہ وہ اسلام سے بہت دور ہیں۔ وہ خدا کا نعرہ بلند کررہے ہیں حالاں کہ وہ ابھی تک خدا سے متعارف ہی نہیں ہوئے۔ اسلام کے نام پر ایسی تحریکیں وجود میں آئی ہیں جنھوں نے کام یہ سمجھا ہے کہ وہ کسی نہ کسی مفروضہ دشمن سے ٹکراتی رہیں۔ اس ٹکراؤ کو وہ دین و ملت کا کام سمجھتی ہیں۔ کوئی بیرونی استعمار سے متصادم ہے۔ کوئی غیر مسلم اکثریت کے خلاف احتجاجی سیاست چلا رہا ہے۔ کوئی اپنے ملک کے مسلم حکمراں کو اقتدار سے ہٹانے اور اس کے ساتھیوں کو گولی مارنے میں جنت کی خوشبو پارہا ہے۔ لڑائی والا دین ہر ایک کی سمجھ میں آرہا ہے۔ مگر سیدھا اور سچا دین جو خدا نے اپنے رسول کی معرفت بھیجا تھا وہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ مذکورہ مثال کے مطابق، اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے اپنی دینی فکر کا آغاز "مقدمہ بازی" کے مرحلہ سے کیا۔ وہ "محنت اور دیانت داری" کے مرحلہ سے اپنے فکر کا آغاز نہ کرسکے۔

اس صورت حال کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ دین اختیار کرنے کے باوجود آدمی اسی اصلی چیز سے محروم رہ گیا جو دین کا حقیقی مطلوب تھا۔ اس کے نتیجہ میں دین داری ایک خارج رخی عمل بن گیا۔ حالاں کہ دین داری تمام تر ایک اندر رخی عمل ہے۔ اب کوئی اپنے اندر جھانکنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ البتہ دوسروں کے بارے میں گرما گرم مباحثے ہر جگہ جاری ہیں۔ اپنے قریب ایک شخص پر ظلم ہو رہا ہو گا مگر اس کی نہ اسے خبر ہوگی اور نہ اس میں اپنا حصہ ادا کرنے کی فرصت۔ البتہ دور کے مقامات پر ہونے والے واقعات سے وہ انتہائی حد تک باخبر ہوگا تاکہ ٹرنک کال کے ذریعہ اس سے رابطہ قائم کرے اور ہوائی جہاز پر اڑکر فوراً وہاں پہنچے۔ ایسے کاموں سے کسی کو دلچسپی نہیں جن میں قلبی اہمیت ہے۔ البتہ وہ کام جن میں اخباری اہمیت (نیوز ویلو) ہے، ان کے لئے سرگرمی دکھانے میں ہر ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا چاہتا ہے۔ کسی کو یہ ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ اپنے نفس کے اندر چھپی ہوئی برائیوں سے لڑے۔ البتہ باہر کی برائیوں پر بیان دینے اور تقریر کرنے میں کوئی پیچھے نہیں رہنا چاہتا۔ اور یہ سب کچھ نتیجہ ہے دین کا صحیح تصور نہ ہونے کا۔

اسلامی جہاد کیا ہے

جہاد کو اسلام میں افضل ترین عبادت کہا گیا ہے۔ اس لئے ہر ایک اپنی سرگرمیوں کو افضل ترین عمل کا درجہ دینے کے لئے اس کو جہاد کا نام دے دیتا ہے۔ کوئی ملت کے مادی حقوق کے لئے دوسری قوموں کے خلاف احتجاج اور مطالبات کی مہم جاری رکھے ہوئے ہے اور اس کو اسلامی جہاد کہہ رہا ہے اور کوئی آزادیٔ قوم اور استخلاص وطن کے لئے لڑائی لڑنے کو۔ کوئی حکومتِ اسلامی کے قیام کے نام پر مسلمانوں کے اندر باہمی قتل و خون جاری کرنے کو جہاد قرار دے رہا ہے اور کوئی بدعت اور مشرکانہ رسوم کے خلاف مناظرہ اور مجادلہ کرنے کو۔ کوئی دوروں اور تقریروں کے مظاہرے کر کے مجاہد اسلام کا لقب لے رہا ہے اور کوئی اسلام کو دنیوی ہنگاموں کا موضوع بنا کر۔ مگر یہ تمام صورتیں جہاد کے لفظ کو غلط استعمال کرنے کی صورتیں ہیں۔ یہ اسلامی جہاد نہیں ہے۔ بلکہ جہاد کے نام پر اسلام کو قتل کرنا ہے۔ یہ خود اللہ کی راہ کے خلاف جہاد ہے نہ کہ اللہ کی راہ میں جہاد۔

قوم و وطن کی پکار اسلام کے نزدیک جاہلیت کی پکار ہے پھر اس کو اسلامی جہاد کس طرح کہا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کے لئے دوسری قومیں مدعو کی حیثیت رکھتی ہیں اور مدعو اقوام سے دنیوی اجر کا طالب ہونا صریح طور پر سنت انبیاء کے خلاف ہے پھر اس قسم کے حقوق کے لئے مطالباتی مہم چلانا جہاد کس طرح ہو سکتا ہے۔ جدال اور مناظرہ سے اسلام میں صریح طور پر منع کیا گیا ہے اور حکمت اور نصیحت کے ساتھ تبلیغ کا حکم دیا گیا ہے۔ ایسی حالت میں بحث و جدال کے اکھاڑے قائم کرنا کیوں کر خدا کا مطلوبہ جہاد ہو سکتا ہے۔ اسلام کے نام پر جلسوں اور جلوسوں کی دھوم مچانا اور دنیوی نشانوں کے لئے تحریکیں برپا کرنا رسول اور اصحاب رسول کے طریقہ کے بالکل خلاف ہے۔ پھر ایسے خلاف سنت کام کو اسلامی جہاد کا نام دینا کس طرح صحیح ہوگا۔ مسلمانوں کے درمیان باہمی لڑائی کو ہر حال میں ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ جمہور کا اتفاق ہے کہ مسلم حکمرانوں کے خلاف بغاوت کرنا اور ان کو اقتدار سے ہٹانے کے لئے جنگ کرنا حرام ہے۔ خواہ ان کی امارت بجبر قائم ہوئی ہو اور خواہ مسلم حکمراں فاسق اور ظالم ہی کیوں نہ ہو (امام نووی، شرح مسلم) ایسی حالت میں "ظالم" حکمراں کو ہٹانے کے نام پر مسلمانوں کا دو حصوں میں تقسیم ہونا اور باہم ایک دوسرے کے خلاف جنگ کرنا کیوں کر وہ چیز ہو سکتی ہے جس کو جہاد فی سبیل اللہ کہا جائے۔ حدیث میں بلاشبہ ظالم سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنے کو افضل الجہاد بتایا گیا ہے مگر اس سے مراد ظالم حکمراں کے سامنے حق کی ایک بات کہنا ہے نہ کہ اس کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی مہم چلانا۔

جہاد کے معنی عربی زبان میں ہیں: بھرپور کوشش کرنا، پوری طاقت صرف دینا۔ یہ لفظ، عمومی استعمال میں، ایسے موقع کے لئے بولا جاتا ہے جب کہ کسی مقصد کے حصول کے لئے اپنی ساری کوشش لگا دی جائے۔ قرآن میں ہے اقسموا باللہ جھد ایمانھم (فاطر ۱۲) یعنی بہت زور لگا کر قسم کھانا۔ وان جاھداک علیٰ ان تشرک بی (لقمان ۱۵) یعنی مشرکانہ طریقہ پر قائم رکھنے کے لئے بہت کوشش کرنا۔ جاھدوا فینا (عنکبوت ۶۹) یعنی اللہ کے لئے مشقتیں جھیلنا لایجدون الاجھدھم (توبہ ۷۹) یعنی محنت کی کمائی۔ ان استعمالات سے اسلامی جہاد یا جہاد فی سبیل اللہ کا مطلب

بھا جاسکتا ہے۔ اس کا مطلب ہے اللہ کے دین کو اختیار کرنے کے بعد اس کی راہ میں وہ ساری محنت وقوت صرف
ا جائے جس کی خدا کے دین کو ضرورت ہو۔

اللہ کا دین کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آدمی اللہ کو خالق اور مالک اور معبود تسلیم کرے۔ وہ اپنی محبت اور عقیدت
ں خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے۔ وہ اسی سے ڈرے اور اسی پر ہر قسم کا اعتماد کرے۔ اللہ کو آدمی جب اس طرح
پنی نفسیات میں شامل کرتا ہے تو اس کے بعد اس کے اندر ایک نئی زندگی وجود میں آتی ہے۔ اب اس کے لئے سب
ے زیادہ قابل اطاعت چیز وہ ہو جاتی ہے جو اللہ کے رسول کے ذریعہ اس کو ملی ہو۔ اس کے لئے سب سے زیادہ اہم
ت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ خدا کے یہاں عزت اور خوشی پانے کو اصل کامیابی سمجھے اور دنیا کی کامیابی اس کی نظر میں بے وقعت
و جائے۔ خدا ورسول کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کو وہ جنت کی طرف چلنا سمجھتا ہے۔ اور اس کے خلاف چلتے ہوئے اس
و ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ جہنم کے شعلوں کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کی توجہات کا مرکز اللہ بن جاتا ہے۔ اس کی عبادتیں
للہ کے لئے خاص ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنے اخلاق اور معاملات میں اللہ کے حرام وحلال کا لحاظ کرنے لگتا ہے۔ خدا اپنے تمام
جلال وجبروت کے ساتھ اس کا نگراں بن جاتا ہے جس کی نگرانی میں وہ اپنی تمام زندگی گزارتا رہتا ہے، یہاں تک کہ مرکر
س کے پاس پہنچ جاتا ہے۔

یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ یہاں آدمی ہر وقت نفسانی ترغیبات کے زیر اثر رہتا ہے۔ اس کے علاوہ اس دنیا
میں اکثر شیطان کا اور باطل پرستوں کا غلبہ رہتا ہے۔ یہی صورت حال اس چیز کی ضرورت پیدا کرتی ہے جس کو جہاد کہا
گیا ہے۔ آدمی کو ہر قسم کی ترغیبات اور رکاوٹوں کا مقابلہ کرتے ہوئے دین پر قائم رہنا پڑتا ہے۔ اس کو ایک غیر خدائی دنیا
میں خدا والا بن کر جینا پڑتا ہے۔ اپنے کو دیندار بنانے کے لئے اپنے کو جاہد بنانا پڑتا ہے۔ دین پر قائم رہنے کے لئے انھیں
غیر معمولی کوششوں کا نام جہاد ہے۔

قرآن میں اسلامی جہاد کا لفظ تین مواقع کے لئے استعمال کیا گیا ہے: استقامت، دعوتی جد وجہد اور قتال فی
سبیل اللہ۔ جہاد اولاً اس بات کا نام ہے کہ اللہ کے دین کو اختیار کرنے میں جو مشکلات پیش آئیں ان کو جھیلتے ہوئے اپنے
آپ کو دین پر قائم رکھا جائے۔ مال کا نقصان ہو تو اس کو برداشت کیا جائے۔ عزت اور حیثیت کو خطرہ ہو تو اس کو گوارا کیا جائے۔
جسمانی تکلیف پہنچے تو اس پر صبر کیا جائے۔ نفس کو روکنے اور دبانے کی ضرورت ہو تو اس سے دریغ نہ کیا جائے۔ حالات کی
کوئی بھی شدت آدمی کو حق کی راہ سے ہٹانے والی ثابت نہ ہو:

مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَاءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۔ وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (عنکبوت ۷-۵)

جو شخص اللہ سے ملاقات کی امید رکھتا ہے تو اللہ کا وعدہ یقیناً آنے والا ہے اور وہ سنتا اور جانتا ہے اور جو شخص محنت اٹھائے تو وہ اپنے ہی لئے محنت اٹھاتا ہے۔ اللہ کو جہان والوں کی حاجت نہیں۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے تو ہم ان کی برائیاں ان سے دور کر دیں گے اور بدلہ دیں گے

ان کو بہتر سے بہتر کاموں کا۔

اس جہاد کا میدان جنگ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ زندگی کے ہر میدان میں ہر وقت جاری رہتا ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا ہے:

ان الرجل لیجاهد وما ضرب یوما من الدهر بسیف (تفسیر ابن کثیر، ثالث ۲۹)

آدمی بلا شبہ مجاہد ہوتا ہے حالاں کہ وہ کبھی ایک دن کے لئے بھی تلوار نہیں چلاتا۔

جہاد کی دوسری صورت وہ ہے جو اللہ کے پیغام کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے کی جاتی ہے۔ یہ ایک مشکل ترین کام ہے اور سخت ترین جدوجہد کے ذریعہ اس کو انجام دینا پڑتا ہے۔ اسی لئے قرآن میں دعوتی مہم کو جہاد کہا گیا ہے:

وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوا فَأَبٰى أَكْثَرُ النَّاسِ إِلَّا كُفُورًا وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيرًا ۔ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِينَ وَجَاهِدْهُم بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا ۔ (فرقان ۵۲ ـ ۵۰)

اور ہم نے ان کے درمیان طرح طرح سے نصیحت بیان کی تاکہ وہ دھیان کریں۔ مگر اکثر لوگوں نے انکار ہی کیا اور اگر ہم چاہتے تو ہم ہر بستی میں کوئی ڈرانے والا اٹھاتے۔ پس تو منکروں کا کہا نہ مان اور قرآن کے ذریعہ ان پر خوب کوشش کر۔

یہ دعوت و تبلیغ امت مسلمہ کا اصل مشن ہے۔ ختم نبوت کے بعد امت کی یہ لازمی ذمہ داری ہے کہ دنیا کی تمام قوموں تک خدا کے پیغام کو پہنچائے، اس کے لئے ہر قسم کی مشقتوں کو برداشت کرے اور وقت اور مال سے لے کر جسم و جان کی تمام طاقتوں کو اس کی راہ میں لگا دے:

وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهِ ۚ هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ۚ مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرٰهِيمَ ۚ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِن قَبْلُ وَفِي هٰذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ ۚ فَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللّٰهِ ۚ هُوَ مَوْلٰكُمْ ۖ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيرُ ○ (حج آخر)

اور اللہ کے کام میں خوب کوشش کرو جیسا کہ کوشش کرنے کا حق ہے۔ اس نے تم کو چن لیا ہے، اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ تمہارے باپ ابراہیم کی ملت۔ اللہ نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے پہلے سے اور اس قرآن میں۔ تاکہ رسول تم پر بتانے والا ہو اور تم لوگوں پر بتانے والے بنو۔ پس نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ کو مضبوط پکڑو۔ وہی تمہارا کارساز ہے۔ پس کیسا اچھا کارساز ہے اور کیسا اچھا مددگار۔

جہاد کی تیسری صورت قتال ہے۔ اہل ایمان مخالفوں کی طرف سے آئی ہوئی مصیبتوں پر صبر کرتے ہیں۔ وہ ہر طرح کی مشقتیں برداشت کرتے ہوئے دعوت الی اللہ کا کام جاری رکھتے ہیں۔ تاہم کبھی ایسا ہوتا ہے کہ منکرین حق عمومی قسم کی مخالفانہ کارروائیوں سے گزر کر جنگ و قتال کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں جب ان کی طرف سے ابتدار (توبہ ۱۳) ہو جائے۔ (الجهاد ان تقاتل الکفار اذا لقیتم، ترغیب و ترہیب) نیز اہل اسلام اپنی تنظیم اور اپنے وسائل اور مواقع کے لحاظ سے اس پوزیشن میں ہوں کہ کامیاب دفاع کر سکیں تو وہ مخالفین کے جنگی چیلنج کا جواب میدان جنگ میں دیتے ہیں۔ یہ جنگ اہل ایمان کے لئے معروف قسم کی کوئی جنگ نہیں ہوتی۔ یہ دراصل ان کے صبر و استقامت کا ایک امتحان ہوتا ہے جو حالات کے اعتبار سے کبھی انھیں پیش آتا ہے۔ اہل ایمان اپنے ایمان پر قائم رہتے ہوئے اور اپنی

دعوتی ذمہ داریوں کو انجام دیتے ہوئے اول دن سے ایک "جنگ" سے دوچار رہتے ہیں۔ یہ جنگ ابتداءً اپنے نفس کے محرکات سے، شیطان کی ترغیبات سے اور گرد وپیش کے مخالفانہ حالات کے مقابلہ میں ہوتی ہے۔ عمومی الفاظ میں اس کو صبر کہا جاتا ہے۔ یہ صبر اور مصابرت جب بعض حالات میں شدید تر صورت اختیار کرے تو اسی کا نام جہاد ہے۔ یہ آدمی کے ایمان اور استقامت علی الحق کا شدید ترین امتحان ہے۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دشمن سے جنگ کی تمنا نہ کرو۔ البتہ اگر جنگ پیش آجائے تو پوری پامردی کے ساتھ مقابلہ کرو (لا تتمنوا لقاء العدو واسألوا اللہ العافیۃ فاذا لقیتم فاصبروا، متفق علیہ) جہاد بالسیف کے سلسلہ میں قرآن کی ایک آیت یہ ہے:

انفروا خفافا وثقالا وجاهدوا باموالكم وانفسكم في سبيل الله ذلكم خير لكم ان كنتم تعلمون ○

اے ایمان والو نکلو ہلکے اور بھاری اور لڑو اپنے مال سے اور اپنی جان سے اللہ کی راہ میں۔ یہ تمہارے لئے بہتر ہے، اگر تم سمجھو۔

توبہ - ۴۱

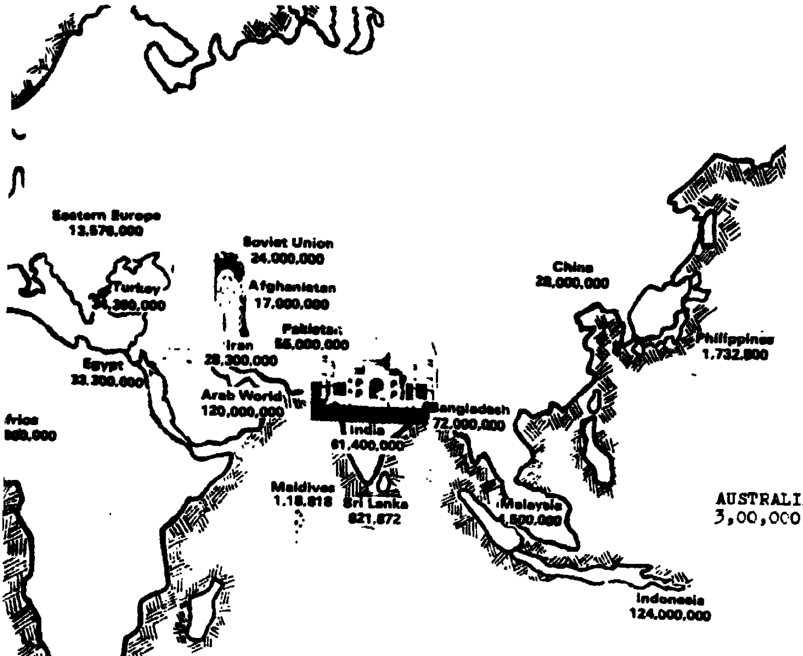
حدیث کے الفاظ میں، جنت کو مکروہات سے ڈھانپ دیا گیا ہے۔ ایک آدمی جب جنت کی طرف اپنا سفر شروع کرتا ہے تو اس کو بے شمار قسم کے ناموافق حالات اور رکاوٹوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ ان دشواریوں اور ناخوش گواریوں کو عبور کرکے اپنا سفر جاری رکھنے میں جو محنت صرف کرنی پڑتی ہے اسی کا نام جہاد ہے ——— ایک شخص جب اپنے بنے ہوئے نقشہ کو توڑ کر حق کو اختیار کرتا ہے تو وہ جہاد کرتا ہے۔ جب وہ اپنے مقابلہ میں دوسرے کے فضل کا اعتراف کرنے کے لئے اپنی "انا" کو کچلتا ہے تو وہ جہاد کرتا ہے۔ جب وہ "غیب" کے فائدہ کے شوق میں ظاہری عزت اور فائدہ کو قربان کرتا ہے تو وہ جہاد کرتا ہے۔ جب وہ الفاظ کا ذخیرہ ہوتے ہوئے خدا کے خوف سے اپنی زبان کو بند کرلیتا ہے تو وہ جہاد کرتا ہے، جب وہ خدا کی خاطر شہرت کے راستوں کو چھوڑ دیتا ہے اور گمنامی کے راستوں کو اپنے لئے پسند کرلیتا ہے تو وہ جہاد کرتا ہے۔ اسی طرح پوری زندگی میں آدمی آسانی کے مقابلہ میں دشواری کو ترجیح دیتا ہے۔ وہ اپنی انا کو غذا دینے کے بجائے اپنی انا کو مارتا ہے۔ وہ مشکلات کو عذر بنانے کے بجائے مشکلات کو عبور کرنے کے لئے اپنی ساری طاقت لگا دیتا ہے۔ یہی جہاد ہے جو مومن کی پوری حیات میں جاری رہتا ہے۔ اسی جدوجہد کا ایک امکانی مرحلہ جنگ ہے۔ تاہم عام جہاد اور جنگ میں یہ فرق ہے کہ عام جہاد تو ہر حال میں اور ہر مومن کی زندگی میں ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ جب کہ جنگ مخصوص حالات میں پیش آتی ہے اور مخصوص شرائط کی تکمیل کے بعد لڑی جاتی ہے۔ ان حالات اور ان شرائط کے بغیر اگر کوئی جنگی جہاد شروع کردے تو وہ جہاد نہیں ہوگا بلکہ فساد ہوگا جس سے اللہ اور اس کا رسول بری ہیں۔

جہاد غیر خدا پرست دنیا میں خدا پرست بننے کی کوشش ہے۔ یہ ایک طرف اپنے آپ کو نفس اور شیطان کی ترغیبات سے روکنا ہے اور دوسری جانب خارج سے سامنے آنے والی رکاوٹوں کی مزاحمت کرتے ہوئے اپنے رب کی طرف اپنے سفر کو جاری رکھنا ہے۔ فتنوں سے بھری ہوئی دنیا میں ایک بندہ اپنے رب کے راستہ پر چلنے کے لئے جو کوشش کرتا ہے اسی کا نام جہاد ہے جو کبھی آدمی کے اپنے اندر ہوتی ہے اور کبھی اس کے باہر۔

بعض لوگوں کے نزدیک جہاد یہ ہے کہ وقت کے حکمرانوں سے لڑ کر ان سے "اقتدار کی کنجیاں" چھینی جائیں تاکہ اسلام کو ایک مکمل ریاستی نظام کی حیثیت سے زمین پر نافذ کیا جاسکے۔ مگر اس قسم کے نظریہ کا کوئی تعلق نہ اسلام سے ہے اور نہ جہاد سے۔ قرآن و حدیث کے پورے ذخیرہ میں کوئی ایک نص بھی ایسی موجود نہیں ہے جس سے اس انقلابی جہاد کا حکم نکلتا ہو۔ قرآن کے مطابق اللہ کو اصلاً جو چیز مطلوب ہے وہ یہ کہ آدمی ایمان اور عمل صالح کی زندگی اختیار کرے۔ جب ایک قابل لحاظ گروہ اس قسم کی ایک زندگی اختیار کر لیتا ہے تو بطور انعام اس کو زمین کا اقتدار بھی دے دیا جاتا ہے (نور ۵۵) مگر یہ نظریہ اپنے حصہ کا کام چھوڑ کر خدا کے حصہ کا کام انجام دینا چاہتا ہے۔

یہ نظریہ اسلام کے پورے معاملہ کو الٹ دیتا ہے۔ وہ اسلام کو عملاً ایک قسم کے سیاسی عمل کا عنوان بنا دیتا ہے جس طرح، مثال کے طور پر، کمیونزم بنا ہوا ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ انسان کی تمام سرگرمیوں کا رخ آخرت کی طرف ہو۔ وہ ہمہ تن اگلی دنیا کی طرف متوجہ ہو جائے۔ مگر یہ نظریہ انسانی سرگرمیوں کو موجودہ دنیا کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں آخرت رخی زندگی کے بجائے دنیا رخی یا سیاست رخی زندگی وجود میں آتی ہے۔ آدمی آخرت کے عذاب سے نجات پانے کے لئے فکر مند ہونے کے بجائے دنیا میں سیاسی انقلاب برپا کرنے کو اپنی توجہات کا مرکز بنا لیتا ہے۔ اسی طرح اس نظریہ کے نتیجہ میں ایسا ہوتا ہے کہ احتساب خویش کے بجائے "احتساب کائنات" آدمی کا نصب العین بن جاتا ہے۔ آدمی کی کوششوں کا نشانہ اس کی اپنی ذات کے بجائے خارجی دنیا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی اصلاح کے لئے بے تاب ہونے کے بجائے وقت کے حکمرانوں سے لڑنے کو سب سے بڑا کام سمجھ لیتا ہے تاکہ ان سے "اقتدار کی کنجیاں" چھین لے اور اسلام کو تمام شعبہ ہائے زندگی میں نافذ کر دے۔

یہ "مکمل اسلام" اس قدر ناقص اسلام ہے کہ اسلام کا کوئی ایک جز بھی اس کے اندر صحیح طور پر اپنی جگہ نہیں پاتا۔ افراد کے اندر سیاسی مزاج پیدا کر کے وہ آدمی کو اس کی سب سے بڑی نعمت (اللہ کی قربت) سے محروم کر دیتا ہے۔ ایسے آدمی کا ذہن بے معنی سیاسی بحثوں میں مشغول ہوتا ہے نہ کہ یاد الٰہی میں۔ ایسے لوگوں کا نشانہ عین اپنے مزاج کے تحت حکومت بن جاتی ہے۔ موقع پاتے ہی وہ حکمراں گروہ کے مقابلہ میں حزب مخالف کا کردار ادا کرنے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ملت کو دو متحارب گروہوں میں بانٹ کر پورے ملک کو قتل اور فساد سے بھر دیتے ہیں۔ سب سے زیادہ بر پھل جو اس نام نہاد مکمل اسلام سے نکلتا ہے وہ دین حق کی الٹی شہادت ہے۔ اللہ کا دین اللہ کے بندوں کے لئے رحمت م وہ اس لئے آیا ہے کہ آدمی کو جنت کی فضاؤں کا تعارف کرائے۔ مگر اس نظریہ کے نتیجہ میں دین کی جو تصویر بنتی ہے وہ یہ ک دین نام ہے آپس کی لڑائی کا، دین کے نام پر دنیوی ہنگامے کرنے کا۔ کوڑا مار سیاست اور گولی مار حکومت کا۔ یہ تصو اتنی قبیح ہوتی ہے کہ لوگ پکار اٹھتے ہیں ——— "اگر اسی کا نام اسلام ہے تو غیر اسلام ہمارے لئے زیادہ اچھا ہے"



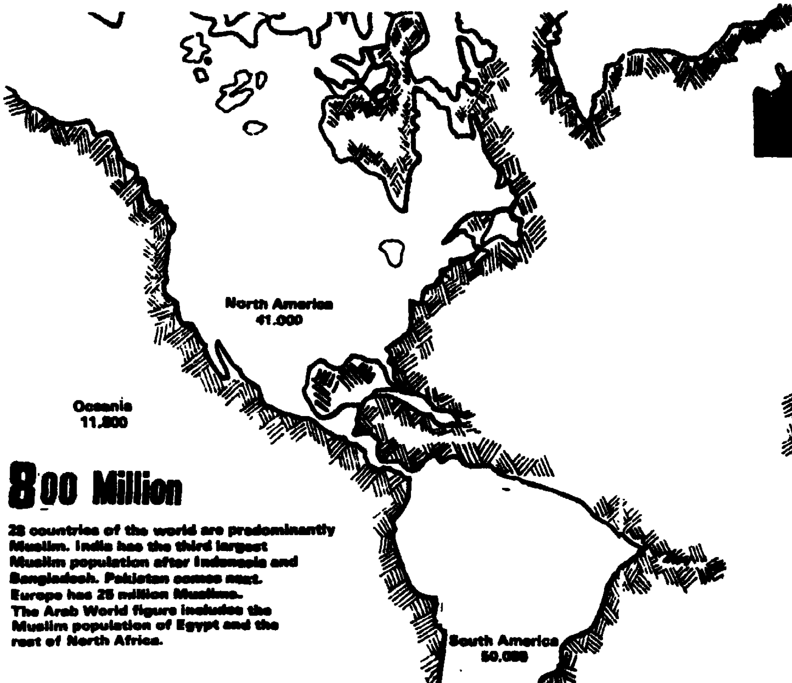
تقریباً ۳۰ سال پہلے کی بات ہے۔ راقم الحروف نے کسی مسلم اخبار میں ایک تصویر دیکھی۔ یہ تصویر بیت المقدس کی تھی۔ اس تصویر کے نیچے جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا:

"ارض مقدس جس پر چالیس کروڑ مسلمانوں کی جانیں قربان ہیں"

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں نے، پچھلے برسوں میں، بے شمار تعداد میں ارض مقدس پر اپنی جانیں قربان کردی ہیں۔ مگر عملاً نتیجہ بالکل برعکس نکلا۔ ۳۰ سال پہلے ارض قدس کی جتنی زمین یہودیوں کے قبضہ میں تھی، آج اس کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ رقبہ پر وہ اپنا اقتدار قائم کرچکے ہیں۔ مزید حیرت یہ ہے کہ اس تیس سالہ مدت میں مسلمانوں کی تعداد ساری دنیا میں ۴۰ کروڑ سے بڑھ کر ۸۰ کرور ہوچکی ہے۔ مگر اپنے "دشمنوں" کے مقابلہ میں وہ کہیں بھی کوئی حقیقی کامیابی حاصل نہ کرسکے۔

تعداد کی کثرت اور تحریکوں کے ہجوم کے باوجود مسلمان کیوں ناکام ہو رہے ہیں۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے وہ یہ کہ وہ اپنے اصل فریضۂ منصبی کو ادا نہیں کر رہے ہیں۔ مسلمان کے ساتھ خدا کے تمام اجتماعی وعدے اس شرط پر ہیں کہ وہ دنیا میں اُس اجتماعی کام کو انجام دیں جس کے لئے انھیں چنا گیا ہے۔ اگر وہ اس کام کے لئے نہ اٹھیں تو وہ خدا کی نظر میں مجرم ہیں۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

یہ کام کیا ہے۔ یہ کہ وہ تمام انسانوں کو اللہ کا پیغام پہنچائیں۔ پیغام رسانی کا یہ کام کوئی قومی کام نہیں ہے، نہ اس کا سیاسی اور اقتصادی مفادات سے کوئی براہ راست تعلق ہے۔ یہ ایک خالص خدائی اور اخروی کام ہے۔ اللہ تعالٰے نے انسان کو امتحان کے لئے پیدا کیا ہے۔ دنیا میں ایک وقت تک زندگی کا موقع دینے کے بعد وہ تمام انسانوں کو آخرت میں حاضر



کرے گا اور وہاں ان کے عمل کے مطابق ان کے لئے دائمی جنت یا دائمی جہنم کا فیصلہ کرے گا۔

خدا اگرچہ اپنے بندوں کے احوال سے خوب واقف ہے مگر اس نے اپنی اس عدالت کے لئے جو طریقہ مقرر کیا ہے، وہ یہ ہے کہ ہر زمانہ میں خود انسانوں میں ایسے لوگ اٹھیں جو خدا کی طرف سے لوگوں کو آنے والے یوم الحساب سے باخبر کریں، یہ لوگ جو دنیا میں قوموں کو خدا کا پیغام پہنچائیں گے، یہی آخرت میں ان کے اوپر خدا کے گواہ بنیں گے۔ وہ آخرت کی عدالت میں کھڑے ہو کر کہیں گے کہ کس نے پیغام خداوندی کو مانا اور کس نے اس کا انکار کیا۔ ان کی گواہی کے مطابق خدا ہر ایک کے اوپر اپنا فیصلہ صادر کرے گا۔

مسلمانوں کا اصل جرم یہ ہے کہ وہ اپنی اس حیثیت کو بھول گئے ہیں۔ وہ قوموں کے اوپر خدا کے گواہ بن کر نہیں کھڑے ہو رہے ہیں۔ خدا کو اپنی سنت کے مطابق اپنی عدالت کے لئے گواہ مطلوب ہیں (وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَاءَ آل عمران ـ ۱۴۰) مگر سارا عالم اسلام اس ذمہ داری کو بھولا ہوا ہے۔ وہ اس خدائی منصوبہ میں اپنے کو شامل نہیں کر رہا ہے۔ اس صورت حال نے مسلمانوں کو مجرم کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا ہے، بجائے کہ وہ خدا کی نصرتوں کے مستحق قرار پائیں۔

پچھلے برسوں میں پٹرول کی قدرتی طاقت نے بلاشبہ مسلم دنیا کو کافی سہارا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ خداداد خزانہ اگر ظاہر نہ ہوا ہوتا تو مسلمان، حالیہ صدیوں میں اپنی بے حساب نادانیوں کی وجہ سے، آج بین اقوامی اچھوت کی سطح پر پہنچ چکے ہوتے۔ ہماری نام نہاد انقلابی تحریکیں کسی بھی درجہ میں ہم کو بچانے والی ثابت نہیں ہو سکتی تھیں۔

اسلام اور سیاست

دین میں بگاڑ کی جو صورتیں ہیں ان میں سے ایک وہ ہے جس کو قرآن میں مضاہاۃ (توبہ ۳۰) کہا گیا ہے۔ مضاہاۃ
ے معنی ہیں مشابہت۔ عربی میں کہتے ہیں ھو ضھیّك (وہ تمھارا ہم شکل ہے) اس سے مراد ہے: گمراہ قوموں کے نظریات و
فائد سے متاثر ہو کر دینی تعلیمات کو ان کے ہم رنگ بنا کر پیش کرنا۔ یہود کا اپنے نبی عزیر (عزرا) کو ابن اللہ (خدا کا فرزند
جازی) کہنا یا عیسائیوں کا اپنے نبی مسیح کو ابن اللہ (خدا کا فرزند مجازی یا فرزند حقیقی) قرار دینا اس کی مثالیں ہیں۔ مشرک
موں میں باری تعالیٰ کی تجسیم یا حلول کا عقیدہ قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے۔ ہندوستان میں اس کا نمونہ اوتار کا عقیدہ ہے
نی خدا کا انسانی روپ میں ظاہر ہونا۔ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنے انبیاء کو عظمت دینے کے لئے ان کو انھیں الفاظ
ر اصطلاحات میں بیان کرنا شروع کیا جن الفاظ اور اصطلاحات میں مشرک قومیں اپنے بڑوں کی عظمت بیان کرتی تھیں۔
ن قوموں نے اپنے بزرگوں یا بادشاہوں کی عظمت بتانے کے لئے کہا کہ وہ خدا کا تجسد (Incarnation) ہیں۔ یہود و نصاریٰ
ے کہنا شروع کیا کہ حضرت عزیر اور حضرت مسیح اللہ کے فرزند ہیں۔ اللہ ان کی شکل میں دنیا کی زندگی میں ظاہر ہوا ہے۔

اسلام کی سیاسی تعبیر

خدا کے دین میں بگاڑ کی یہ صورت ہر زمانہ میں پائی گئی ہے اور موجودہ زمانہ میں بھی پائی جاتی ہے۔ جو لوگ دین
ِ خدائی عظمتوں کی سطح پر پائے ہوئے نہ ہوں وہ اس کو دنیوی عظمتوں کی سطح پر اتارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسری عالمی
نگ کے بعد جب اشتراکی نظریات کو بہت زیادہ فروغ ہوا تو کچھ لوگوں نے سمجھا کہ اسلام کی عظمت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے
ہ اس کو اشتراکیت کے مطابق ثابت کیا جائے۔ اسی زمانہ میں "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح وضع ہوئی۔ حتیٰ کہ کہا گیا
کہ تاریخ کے سب سے پہلے اشتراکی حضرت محمدؐ تھے۔

جو لوگ کیفیاتی سطح پر حقیقت کو پائے ہوئے نہ ہوں وہ حقیقت کو کمیاتی زبان میں بیان کر کے اس کو اپنے لئے
قابل فہم بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسلام کو سیاسی اصطلاحات میں بیان کرنا بھی اسی کی ایک مثال ہے۔ موجودہ زمانہ
ں جب سیاسی نظریات کو فروغ ہوا تو کچھ لوگوں کو نظر آیا کہ اسلام کی شان کو نمایاں کرنے کی سب سے اعلیٰ صورت یہ ہے کہ اسلام
و ایک مکمل سیاسی نظام کے روپ میں پیش کیا جائے۔ اس آخری فکر کو موجودہ زمانہ میں اسی طرح مقبولیت حاصل ہوئی جس
رح قدیم زمانہ کے عیسائیوں میں تثلیث کے نظریہ کو ہوئی، جس کو مسیحی متکلمین نے یونانیوں کے "اقانیم ثلاثہ" کے جواب میں
ضع کیا تھا۔ موجودہ زمانہ میں اسلام کی سیاسی تشریح کی مقبولیت کی دو بڑی وجہیں تھیں۔ ایک یہ کہ یہ تشریح اسلام کو زمانہ
ے باعظمت نظریہ کے لباس میں دکھا رہی تھی۔ دوسری وجہ ردعمل کی نفسیات تھیں۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو مختلف
وموں سے جو سیاسی مقابلہ پیش آیا، اس کا قدرتی نتیجہ تھا کہ ان کے اندر جوابی سیاسی مزاج پیدا ہو۔ چنانچہ مسلمانوں
ے درمیان مختلف عنوانات کے تحت سیاسی تحریکیں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اسلام کا سیاسی نظام کا تصور ان تمام تحریکوں کے لئے فکری
ہارا بن گیا۔ اسلام کا سیاسی تصور موجودہ زمانہ کے بہت سے لوگوں کے نزدیک اسلام کے حق میں وقت کا ایک قصیدہ بھی تھا

اور ان کی ردعمل کی نفسیات کے لئے فکری تسکین کا ذریعہ بھی۔

موجودہ زمانہ کی مسلم تاریخ کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں جو تحریکیں اٹھیں وہ زیادہ تر خارجی حالات، خاص طور پر سیاسی حالات، کے ردعمل کے طور پر اٹھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کے احیاء کی کوششیں سیاسی مقابلہ آرائی کی سمت میں چل پڑیں۔ اس عملی غلطی کے ساتھ جو فکری غلطی پیش آئی اس نے معاملہ کی سنگینی کو بہت زیادہ بڑھادیا۔ دین کو وقت کے اسلوب میں بیان کرنے کی کوششوں نے بالآخر دین کی سیاسی تعبیر کا رخ اختیار کرلیا۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے انیسویں صدی کے یورپ میں صنعتی مزدوروں کے مسئلہ کو حل کرنے کی کوششوں میں بالآخر مارکسزم کی مادی تعبیر تاریخ وجود میں آئی۔ بندے اور خدا کا تعلق جو حقیقتہً ایک ملکوتی تعلق تھا، اس نے ایک قسم کے سیاسی تعلق کی صورت اختیار کرلی۔ اسلام سیاسی ہنگامہ آرائیوں کا عنوان بن گیا۔ جب کہ اسلام فی الحقیقت یہ ہے کہ بندے اور خدا کے درمیان وہ نفسیاتی تعلق قائم ہو جب کہ بندہ اپنے رب میں جینے لگے، وہ آخرت کی فضاؤں میں سانس لینے لگے۔ اس کے اندر وہ ملکوتی انسان جنم لے جو اس کو جنت کی ابدی دنیا کا شہری بنا سکے۔

وقت کے اسلوب میں دین کو بیان کرنا جتنا ضروری ہے، وقت کے فکر میں دین کو ڈھالنا اتنا ہی غلط ہے۔ اول الذکر تجدید دین ہے اور ثانی الذکر تحریف دین۔ ہر دور کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے۔ ہر دور میں کچھ الفاظ اور کچھ اسلوب ہوتے ہیں جن میں آدمی سوچتا ہے، جن میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ جب زمانہ بدلتا ہے تو الفاظ سے ذہن کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ایک لفظ جو قدیم دور میں انسان کی نفسیات کو متحرک کرتا تھا، نئے دور میں وہ لفظ اپنی یہ انقلابی قیمت کھو دیتا ہے۔ اس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ ذہن اور الفاظ کے درمیان دوبارہ رشتہ قائم کیا جائے۔ تاہم یہ "جدت" صرف الفاظ اور اسلوب کے اعتبار سے ہوتی ہے، نہ کہ فکر کے اعتبار سے۔

اسلامی تحریک کیا ہے

اسلامی تحریک انسانی باغبانی کی تحریک ہے۔ جس طرح باغبان ایک ایک پودے پر انفرادی توجہ دے کر اس کو پورا درخت بنانے کی کوشش کرتا ہے، اسی طرح اسلامی تحریک بھی فرد فرد کو نشانہ بناتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہر وہ شخص جو زمین پر پیدا ہوا ہے، وہ سچے معنوں میں اللہ کا بندہ بنے اور اپنے اندر وہ خصوصیات پیدا کرے جو اس کو اگلی زندگی میں جنتی دنیا کا شہری بنا سکیں۔ اسلامی تحریک کی کامیابی یہ ہے کہ خدا کی زمین پر ایسے بندے جنم لیں جو خدا میں جینے والے اور خدا میں سانس لینے والے ہوں۔ جو نفسیاتی پیچیدگیوں سے آزاد روح (Complex-free soul) کے مالک ہوں۔ یہ وہ انسان ہیں جو نئی پیدائش کا تجربہ کرتے ہیں۔ پہلی بار وہ اپنی ماؤں کے پیٹ سے نکلے تھے، اب وہ دوبارہ اسلام کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں۔ یہ نئی پیدا شدہ روحیں وہ ہوتی ہیں کہ جب ان کے سامنے حق آتا ہے تو عزت کا سوال ان کے لئے قبول حق میں رکاوٹ نہیں بنتا۔ وہ "کھانا کھانے والے اور بازار میں چلنے والے" انسان کے ظاہری حلیہ سے گزر کر اس کے اندر چھپے ہوئے اس انسان کو دیکھ لیتے ہیں جو خدا سے رزق پاکر بولتا ہے اور خدا کی دنیا میں سیر کرکے لوگوں کو اس کے احوال سناتا ہے۔ وہ ایک معمولی انسان کے اندر چھپی ہوئی غیر معمولی عظمتوں سے باخبر ہو جاتے ہیں۔ وہ بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں

کہ "خدایا ہم نے تیری آواز کو پہچان لیا۔ ہم اس پر ایمان لائے۔ ہم کو معاف فرما، ہم کو اپنی رحمتوں میں داخل کرے" خدا کی یاد سے ان کی روحیں اس طرح ترو تازہ ہو جاتی ہیں جس طرح بارش پاکر درخت نکھر اٹھتا ہے۔ جو ایمان خدا کا خوف نہ پیدا کرے وہ جھوٹا ایمان ہے۔ جنگل میں شیر دھاڑتا ہے تو درخت کے بندر اس طرح زمین پر ٹپک پڑتے ہیں جیسے خزاں کے موسم میں درخت کی پتیاں جھڑتی ہیں۔ اگر انسان پر خدا کی ہیبت اتنی بھی طاری نہ ہو جتنی بندر کو شیر کے تصور سے ہوتی ہے تو اس نے خدا کو پایا کیا۔

اسلامی دعوت کی کوششوں کا مرکز اصلاً کوئی "اسٹیٹ" نہیں بلکہ وہ افراد ہیں جن کے لئے جنت یا جہنم کا فیصلہ ہونا ہے۔ خدا کی عدالت میں "اسٹیٹ" نہیں کھڑا کیا جائے گا بلکہ افراد کھڑے کئے جائیں گے اور ہر ایک کا الگ الگ حساب ہوگا۔ اسلام کے داعی کی سرگرمیوں کا اصل محرک یہ ہوتا ہے کہ وہ انسان کو اس خطرے سے بچائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی دعوت کا نشانہ اصلاح نظام نہیں، اصلاح انسان ہے۔ اس اصول کی اہمیت صرف اس لئے نہیں ہے کہ افراد ہی کسی نظام کو بناتے یا بگاڑتے ہیں، افراد سے باہر کسی نظام کا وجود نہیں۔ اس سے بڑھ کر اس کی اہمیت یہ ہے کہ زندگی کا اصل مسئلہ جنت اور جہنم کا مسئلہ ہے اور یہ بات کہ کون جنتی ہے اور کون جہنمی، اس کا فیصلہ ہر فرد کے لئے الگ الگ کیا جائے گا نہ کہ مشترکہ طور پر۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی دعوت فرد کو اپنا نشانہ بناتی ہے۔ اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ایک ایک انسان کو اس قابل بنائے کہ مرنے کے بعد جب وہ خدا کے سامنے پہنچے تو اس کا خدا اس کو جہنم میں نہ ڈالے بلکہ اس کے لئے جنت کا فیصلہ کرے۔ اسلام ایک مستقل فکر اور ایجابی حقیقت ہے۔ وہ اس خدا کی طرف سے آیا ہے جو اپنی ذات میں ازلی و ابدی ہے۔ وہ انسان کی ناقابل تغیر فطرت کا مثنیٰ ہے۔ وہ ایک ایسا دین ہے جو کائنات میں مسلسل طور پر اول روز سے قائم ہے۔ انسان جب اس حیثیت سے اسلام کو پاتا ہے تو وہ فرشتوں کے قافلہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہ خدا کی ابدی دنیا کا شہری بن جاتا ہے۔ وہ فانی کائنات سے گزر کر باقی رہنے والی کائنات میں داخل ہو جاتا ہے۔ جب کوئی شخص اس فوق الفطری تجربہ سے دوچار ہوتا ہے تو اس کے اندر ایک نیا انسان جنم لیتا ہے۔ اب وہ خدا کے رزق سے کھاتا ہے۔ وہ خدا کے دیدار سے آنکھیں ٹھنڈی کرتا ہے۔ وہ خدا کے پڑوس میں اپنی صبح و شام گزارنے لگتا ہے —— اسی ربانی یافت کا نام ایمان ہے۔ موجودہ زندگی میں یہ یافت آدمی کو حسیاتی معنوں میں حاصل ہوتی ہے۔ موت کے بعد آنے والی دنیا میں وہ مادی اور حقیقی طور پر اس کو حاصل ہوگی جس کا دوسرا نام جنت ہے۔

اسلام کو سیاسی نعرہ کے طور پر استعمال کرنا

مگر اسلام جب سیاست بن جائے تو وہ آدمی کو اس حقیقی اسلام سے محروم کر دیتا ہے۔ اسلام کی دھوم کے درمیان وہی چیز غائب ہو جاتی ہے جو اسلام کا اصل مقصود تھی۔ اسلام اسی طرح دنیوی ہنگامہ آرائیوں کا عنوان بن جاتا ہے جس طرح مثال کے طور پر، سوشلزم اور کمیونزم بنے ہوئے ہیں۔ یہی نہیں، بلکہ اس قسم کی تحریک خود اسلامی نظام کے قیام کے امکانات کو بھی ختم کر دیتی ہے۔ کیوں کہ اسلامی نظام کو اسلامی افراد قائم کرتے ہیں اور اس قسم کی تحریکیں حقیقی اسلامی افراد کی پیدائش کا دروازہ ہی بند کر دیتی ہیں۔

"غریبی ہٹاؤ" کے نعرہ پر ایک تحریک اٹھتی ہے۔ مگر اس تحریک کے لوگ جس کے گرد جمع ہوتے ہیں وہ کوئی غریب نہیں ہوتا بلکہ ایک امیر لیڈر ہوتا ہے۔ کچھ لوگ مزدور کے مسئلہ کے نام پر اٹھتے ہیں۔ مگر وہ اپنی اجتماعیت کے لئے جس مرکزی ہستی کو پاتے ہیں وہ ایک ایسا لیڈر ہوتا ہے جو خود بہت بڑا لینڈ لارڈ ہے۔ ان واقعات کی وجہ یہ ہے کہ "غریب" کا وجود لوگوں کی نظر میں اتنا حقیر ہے کہ وہ انھیں دکھائی نہیں دیتا۔ وہ لوگوں کے لئے مرکزِ توجہ نہیں بنتا۔ لوگ کسی بڑی شخصیت ہی کے گرد جمع ہو سکتے ہیں جو ان کو قد آور دکھائی دیتی ہو اور یہ ان کو "لیڈر" ہی کی صورت میں ملتا ہے خواہ اس کا غریبی اور مزدوری سے کوئی تعلق نہ ہو۔

یہی صورت حال مذہب میں بھی پیش آتی ہے۔ مذہب کیا ہے، اپنے لئے ایک ملجا اور مرجع کو پالینا۔ جب مذہب کے نام پر وہ لوگ جمع ہوں جو مومنین بالغیب ہوں، وہ خدا کو نہ دیکھتے ہوئے بھی اس کو دیکھنے لگے ہوں، جو دنیا میں رہتے ہوئے بھی آخرت میں بسنے لگے ہوں تو ایسے لوگوں کا ملجا اور مرجع خدا کی ذات بن جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے سب سے بڑی حقیقت خدا ہوتی ہے۔ ان کے لئے یہ بات خارج از بحث ہوتی ہے کہ وہ خدا کے سوا کسی اور کے گرد جمع ہوں، وہ خدا کے سوا کسی اور کو اپنا مرکز و مرجع بنائیں۔

مگر جب مذہب کے گرد ایسے لوگ جمع ہو جائیں جو ایمان بالغیب کے مقام پر نہ ہوں۔ جن کو خدا سے زیادہ دوسری چیزیں نظر آتی ہوں، جو چھپی ہوئی دنیا سے زیادہ اس دنیا کو دیکھتے ہوں جو ان کی آنکھوں کے سامنے پھیلی ہوئی ہو، تو ان کا حال وہی ہوتا ہے جو غریبوں اور مزدوروں کے نام پر اٹھنے والے لوگوں کا ہوتا ہے۔ وہ خدا کے نام پر اٹھتے ہیں مگر اپنی ظاہر پرستی کی وجہ سے کسی غیر خدا پر اٹک کر رہ جاتے ہیں۔ وہ اخروی نظام کا لفظ بولتے ہیں مگر عملاً وہ ایک دنیوی نظام پر ایمان لائے ہوتے ہیں۔ ان کا اسلام موت سے پہلے کی دنیا میں عزت حاصل کرنے کا ایک عنوان ہوتا ہے نہ کہ موت کے بعد کی دنیا میں عزت و کامیابی حاصل کرنے کا۔

اسلام فوجداری قانون کا نام نہیں

موجودہ زمانہ میں کچھ تحریکیں ابھری ہیں جو اسلام کے حدود و تعزیرات (سزاؤں) کے اجراء کو اسلامی نظام کے نفاذ کا نام دیتی ہیں، یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ اسلام کے اس "فوجداری" تصور نے اسلام کے اصل مدعا کو ختم کر دیا ہے۔ کسی تعلیم گاہ میں بید کی سزاؤں کا اجراء تعلیم گاہ کے اندر ڈسپلن قائم کرنے سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ اصل تعلیمی مقصد سے۔ اسی طرح اسلام میں جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں، وہ مسلم معاشرہ کی تنظیم کے لئے ہیں۔ یہی اسلام کا اصل مقصد نہیں ہے۔ دور اول میں جب مدینہ میں اسلامی ریاست قائم ہوئی تو، مذکورہ معنوں میں، وہاں اسلامی نظام قائم ہو گیا۔ مگر اسی معاشرہ میں وہ "مسلمان" بھی تھے جن کے بارہ میں قرآن میں اعلان کیا گیا کہ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (منافقین جہنم کے سب سے نچلے درجہ میں ہوں گے) حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا اصل مقصد افراد کا تزکیہ ہے جو ان کے اندر وہ باطنی اوصاف پیدا کرے جو ان کو جنت کا مستحق بنانے والے ہوں۔ اسلام کی کوششوں کا نشانہ لوگوں کو جنتی انسان بنانا ہے نہ کہ ان کو کوڑے مارنا اور پھانسی دینا۔ ایک شخص جرم کرتا ہے۔ نظام اسلامی کے علمبردار اس کے لئے دعائیں نہیں کرتے،

تنہائیوں میں اس سے مل کر اس کو دردمندانہ نصیحت نہیں کرتے، اس کی اصلاح کے لئے وہ خیرخواہانہ کوشش نہیں کرتے جو ایک باپ اپنے بیٹے کے لئے کرتا ہے۔ وہ صرف یہ کرتے ہیں کہ اس کو کوڑا مارنے اور پھانسی دینے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ نظام اسلامی کے نام پر نظام فوجداری قائم کرنے کے علم بردار ہیں۔ نظام اسلامی قائم کرنے والے وہ ہیں جو اللہ کے بندوں کو اللہ کی جنت میں پہنچانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ وہ حکمت اور خیرخواہی کے تمام تقاضوں کے تحت لوگوں کی اصلاح میں سرگرم ہوں۔ انتقامی جذبہ سے نہیں بلکہ اصلاح کے جذبہ سے ان کے اوپر حکم الٰہی کی تعمیل کریں خواہ وہ شخص کوئی غیر ہو یا خود اپنا بیٹا ہو۔

قوانین کا مقصد معاشرہ کی تنظیم

موجودہ زمانہ میں اسلام کے نام پر اٹھنے والی تحریکیں اکثر ردعمل کی تحریکیں تھیں نہ کہ حقیقۃً ایجابی اسلامی تحریکیں۔ پچھلی صدیوں میں مغربی قومیں نئی طاقتوں سے مسلح ہو کر اٹھیں اور انھوں نے پوری مسلم دنیا کو مغلوب کر لیا۔ وہ نہ صرف ان کی سیاست پر چھا گئیں بلکہ فکری اور ذہنی شعبوں پر بھی انھوں نے قبضہ کر لیا۔ مسلمانوں میں اس کا ردعمل ہونا فطری تھا۔ بہت سے لوگ اپنے ان نئے دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ ایک دفاع کا کام تھا اور اگر دفاع کے عنوان کے تحت اس کو کیا جاتا تو اس میں کوئی حرج نہ تھا۔ مگر جوش مقابلہ میں اسی کو دین کا اصل مدعا کہا جانے لگا۔ یہاں تک کہ کچھ لوگوں نے اسی کی بنیاد پر پورے دین کی تعبیر کر ڈالی۔ انھوں نے قرآن و حدیث کی تشریح اس انداز میں کی گویا قوموں سے لڑنا اور ان کے اوپر اپنی سیاست قائم کرنا ہی امت مسلمہ کا اصل مشن ہے۔ اس ٹکراؤ کا نشانہ ابتداءً غیر مسلم قومیں تھیں۔ مگر دوسری جنگ عظیم کے بعد جب مسلم ملکوں کو غیر مسلم قوموں کے سیاسی تسلط سے آزادی مل گئی تو ان کے حربی مشن کا نشانہ خود مسلم حکمراں قرار پائے۔ کیوں کہ وہ امت مسلمہ کے اصل نصب العین (اسلامی قانون کا نفاذ) کو عمل میں نہیں لا رہے تھے۔ اس لئے ضروری تھا کہ ان سے ٹکرا کر ان کو ہٹایا جائے اور حکومتی اقتدار پر قابض ہو کر اسلامی قانون کو نافذ کیا جائے۔

اس نظریہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاست جو دین کا صرف ایک اضافی حصہ ہے، وہ دین کا اعتقادی حصہ بن گیا۔ اسلام کے اجتماعی قوانین حقیقۃً مسلم معاشرہ کی تنظیم کے لئے ہیں جو معاشرہ کی صلاحیت کے بقدر اس میں نافذ کئے جاتے ہیں۔ مگر اس تشریح دین نے اس کو جنت اور جہنم کا مسئلہ بنا دیا۔ اسلامی قانون کو نافذ کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگاؤ تو جنت میں جاؤ گے، ورنہ جہنم میں جلو گے۔ یہ وہی غلطی تھی جو پہلی صدی ہجری میں شیعہ حضرات نے کی۔ وہ خلافت کے عہدہ پر بنی ہاشم کے کسی فرد کو دیکھنا چاہتے تھے۔ اپنی اس سیاسی خواہش کو دینی جواز عطا کرنے کے لئے انھوں نے خاندانی خلافت کا عقیدہ وضع کیا اور اس طرح ایک سیاسی مسئلہ کو اعتقادی مسئلہ بنا دیا۔ یہی غلطی دوسری بار موجودہ زمانہ کے مصلحین نے کی ہے۔ قانون اسلامی کا نفاذ کسی مسلم معاشرہ کی ایک تنظیمی ضرورت تھی جس طرح مسجد نمازیوں کے کسی گروہ کی عمارتی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر اس کو انھوں نے مسلمانوں کی اعتقادی ضرورت بنا دیا۔ اس کے نتیجہ میں جدید اسلامی تاریخ کی سب سے بڑی برائی وجود میں آئی۔ ہر مسلم ملک میں مسلمان دو حصوں میں بٹ گئے۔ ایک حکمراں اور ان کے حامیوں کا، دوسرا اسلامی سیاست کے

علم بردار علی کا۔ یہ دونوں ایک کبھی نہ ختم ہونے والی جنگ میں مصروف ہیں اور مسلمان کا جان و مال جو دوسرے مسلمان کے لئے حرام تھا، ہر ایک نے اپنے لئے جائز کر لیا ہے۔ وہ جنگ جو اپنے نفس سے لڑنی تھی یا خدا کے منکرین سے، وہ آپس میں بہت بڑے پیمانہ پر جاری ہے۔ مزید لطف یہ ہے کہ اس غیر اسلامی جنگ کو ہر ایک نے اسلامی جہاد کا نام دے رکھا ہے۔

فتنہ کی واپسی

اسلام کو سیاست بنانے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ وہ فتنہ (آزمائش) جس کو رسول اور اصحاب رسول نے بے پناہ قربانیوں کے بعد ختم کیا تھا، وہ اسلامی تاریخ میں دوبارہ لوٹ آیا۔ قدیم زمانہ میں سیاست اور شرک دونوں ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ شاہی خاندان لوگوں میں یہ عقیدہ بٹھا کر حکومت کیا کرتا تھا کہ وہ دیوتا کی اولاد ہے۔ وہ خدا کی خدائی میں شریک ہے، وہ آسمانی دیوتاؤں کا دنیوی ظہور ہے۔ اسی بنا پر جب توحید خالص کی دعوت اٹھتی تو مشرکانہ عقائد کی بنیاد پر حکومت کرنے والے لوگ سمجھتے کہ یہ دعوت ان کے حق حکومت کو بے اعتبار بنا رہی ہے۔ وہ اس کو مٹانے کے لئے اپنی ساری طاقت اس کے خلاف لگا دیتے۔ اس طرح توحید کی دعوت اپنے آغاز ہی میں حکمرانوں کی حریف بن کر سخت مشکلات کا شکار ہو جاتی۔ چنانچہ قرآن میں حکم دیا گیا کہ وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ (ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لئے ہو جائے) یعنی اہل شرک کی یہ حیثیت ختم ہو جائے کہ وہ خدا کے بندوں کے لئے آزمائش بنے ہوئے ہیں اور ان کو دین توحید اختیار کرنے سے روکتے ہیں۔ خدا کے عقیدہ کو بزور سیاسی ادارہ سے جدا کر دو تاکہ دین کا معاملہ تمام تر الٰہیاتی معاملہ بن جائے، وہ سیاسی معاملہ نہ رہے۔ اقتدار کے معاملہ سے اس کا اعتقادی تعلق ختم ہو جائے۔ دین کا تمام تر اللہ کے لئے ہو جانا یہ ہے کہ فتنہ (آزمائش) کی حالت ختم ہو جائے، دونوں کے درمیان کوئی اور چیز حائل نہ رہے۔

رسول اور اصحاب رسول کے ذریعہ جو تاریخ ساز انقلاب لایا گیا، اس نے شرک کو مقام اقتدار سے ہٹا دیا، اس نے مذہبی عقیدہ اور سیاسی ادارہ کے درمیان تعلق کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ اس طرح تاریخ میں پہلی بار یہ امکان پیدا ہوا کہ سیاسی ادارہ سے ٹکراؤ کا خطرہ مول لئے بغیر دعوتِ توحید کا کام کیا جا سکے۔ مگر مسلمانوں نے نئے عنوان سے دوبارہ یہ مشکلات دعوتی کام کی راہ میں پیدا کر دیں۔ پہلی صدی ہجری میں اہل بیت کی خلافت کو عقیدہ کا مسئلہ بنانا اس کی پہلی مثال تھی۔ اور موجودہ زمانہ میں "مکمل قانون کے نفاذ" کو علی الاطلاق امت مسلمہ کا فریضہ بتانا اس کی دوسری مثال ہے اس تعبیر نے سیاسی جدوجہد کو عقیدہ کا مسئلہ بنا دیا۔ اب ہر ملک کے مسلمان "مکمل اسلامی قانون کے نفاذ" کے نام پر اپنے ملک کے حکمرانوں سے ٹکرا رہے ہیں اور سیاسی ادارہ دوبارہ نئے عنوان سے اسلام کا حریف بن گیا ہے جس طرح وہ ڈیڑھ ہزار سال پہلے اس کا حریف بنا ہوا تھا۔

احادیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد سب سے زیادہ جس چیز کا خطرہ محسوس کیا تھا وہ یہ کہ مسلمان آپس میں لڑیں گے۔ تاریخ سے اور موجودہ حالات سے اس کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمان آپس کی لڑائیوں میں جتنا زیادہ مشغول رہے ہیں اور مشغول ہیں اس کی مثال کسی بھی دوسری قوم میں نہیں ملتی۔

ے لڑنے میں دوسری قومیں ہم سے آگے نظر آئیں گی۔ مگر خود اپنے ہم قوموں کے قتل وخون میں بہر حال مسلمان سب سے ‌یادہ آگے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی سیاست کو عقیدہ بنانا ہے۔ قدیم زمانہ میں جو باہمی لڑائیاں جاری رہیں، ‌ن میں عام طور پر ان لوگوں کا ہاتھ کام کرتا ہوا نظر آتا ہے جنھوں نے یہ عقیدہ بنا لیا تھا کہ خلافت ایک مخصوص خاندان کا حق ہے۔ ‌ن کے علاوہ شرعاً کسی کو مسلمانوں کے اوپر حکومت کرنا جائز نہیں۔ موجودہ زمانہ میں جمہوری اور سائنسی انقلابات نے اس ذہن کو فعال عقیدہ کی حیثیت سے ختم کر دیا تھا۔ مگر عین اس وقت قانون اسلامی کے نفاذ کو علی الاطلاق فرض بتانے والا ‌ظریہ وجود میں آگیا اور اس نے اس باہمی لڑائی کو نئے عنوان سے مسلمانوں کے درمیان زندہ کر دیا۔

اسلامی نظام کیسے قائم ہوتا ہے

"سیاسی اسلام"، کے نظریہ کا مزید نقصان یہ ہے کہ وہ مطلوبہ اسلامی سیاست قائم کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہ نظریہ گویا گاڑی کو گھوڑے کے آگے باندھنا ہے۔ درخت زرخیز زمین میں اگتا ہے نہ کہ پتھر کی چٹانوں پر۔ ‌سی طرح اسلامی نظام ہمیشہ حقیقی اسلامی معاشرہ میں قائم ہوتا ہے۔ جہاں اسلامی معاشرہ نہ پایا جائے، وہاں سیاسی تحریک چلا کر یا پھانسی اور گولی کی سزاؤں کے ذریعہ اسلام کا سیاسی درخت اگایا نہیں جا سکتا۔

جو شخص کسی عہدہ کا امیدوار ہو، اسلام کے مطابق، وہ اس عہدہ کے لئے سب سے زیادہ غیر موزوں شخص ہے۔ شریعت کی یہ تعلیم احادیث سے واضح طور پر ثابت ہے۔ یہاں چند روایتیں نقل کی جاتی ہیں:

‌ن اخونکم عندنا من طلبہ	(ابو داؤد)	جو شخص طالب ہو، ہمارے نزدیک وہ سب سے زیادہ اس کا نااہل ہے
انا واللہ لا نولی علی ھٰذا العمل احدا سألہ ‌ولا احدا حرص علیہ	(بخاری ومسلم)	خدا کی قسم حکومتی عہدہ پر ہم ایسے کسی شخص کا تقرر نہیں کرتے جو اس کو مانگے نہ ایسے کسی شخص کا جو اس کو چاہتا ہو۔
لا نستعمل علیٰ عملنا ھذا من ارادہ	(بخاری ومسلم)	ہم اپنی حکومت کے کام پر ایسے شخص کو مقرر نہیں کرتے جو اس کی خواہش رکھتا ہو۔
تجدون خیر الناس اشدھم کراھیۃ لھذا الامر حتی یقع فیہ	(بخاری ومسلم)	تم سب سے بہتر اس شخص کو پاؤ گے جو حکومتی منصب کو سب سے زیادہ ناپسند کرتا ہو، یہاں تک کہ مجبوراً اس میں مبتلا ہو جائے۔

‌س سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کون سا معاشرہ ہے جس کے اندر اسلامی نظام قائم ہوتا ہے۔ یہ وہ معاشرہ ہے جس کے افراد میں ‌قتدار پسندی نہ پائی جاتی ہو۔ جس کے سربرآوردہ لوگ خود شعوری کے اس مقام پر ہوں کہ وہ دوسرے کے مقابلہ میں ‌پنی نااہلی کو جانتے ہوں۔ جس کے افراد اتنے بلند نظر ہوں کہ عہدوں کے معاملہ میں اپنی ذات کی نفی کر کے سوچتے ہوں۔ ایسے ‌لوگوں کے درمیان جب عہدیدار کے تقرر کا سوال آتا ہے تو سب میں جو موزوں ترین شخص ہوتا ہے وہ خود بخود ابھر کر سامنے ‌آتا ہے۔ اور جب اس کا تقرر ہو جاتا ہے تو سارے لوگ فوراً اس کے تقرر کو مان لیتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر معاشرہ کا ‌حال ہو کہ اس کے افراد اپنی اپنی اہلیتوں کو جاننے کے ماہر ہوں تو ایسے معاشرہ میں صرف باہمی لڑائیاں جنم لیتی ہیں،

اس سے اسلامی نظام برآمد نہیں ہوتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں صحابہ کا جو گروہ جمع ہوا تھا، وہ وہی لوگ تھے جو اپنی نفی کرکے سوچتے تھے۔ چنانچہ آپ کے زمانہ میں کامیابی کے ساتھ نظام قائم ہوا اور چلتا رہا۔ خلیفہ اول اور خلیفہ دوم کے زمانہ میں اسی قسم کے لوگ معاشرہ پر چھائے ہوئے تھے۔ اس لئے ان کے زمانہ میں بھی اسلامی نظام کامیابی کے ساتھ قائم رہا۔ خلیفہ سوم اور چہارم کے زمانہ میں صورت حال بدل گئی۔ اب اسلامی معاشرہ میں ایسے لوگوں کی کثرت ہو گئی جو اپنی ذات کی نفی کرکے سوچنا نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ عہدہ اور خلافت کے دعوے دار کھڑے ہونا شروع ہو گئے۔ اور باہمی لڑائیوں کا وہ سلسلہ شروع ہوا جس میں حقیقی اسلامی نظام منتشر ہو کر رہ گیا۔

جس معاشرہ کے لوگ اپنی ذات کی نفی کرکے سوچنا نہ جانتے ہوں وہاں اسلامی تحریک کا کام یہ ہے کہ ایسے افراد وجود میں لانے کی کوشش کرے جو فرائض کے معاملہ میں اپنے کو شامل کرکے سوچنے والے ہوں اور عہدوں کے معاملہ میں اپنے کو الگ کرکے سوچیں۔ اسلامی نظام قائم کرنے کا یہی واحد طریقہ ہے۔ اس کے برعکس مطالبہ اور ایجی ٹیشن کے ذریعہ اسلامی نظام نافذ کرنے کی کوشش ایک بے معنی کوشش ہے جو صرف ٹکراؤ کو جنم دیتی ہے۔ ایسے معاشرہ میں اس قسم کی تحریک عملاً مدعیان اقتدار کی تعداد میں اضافہ کے ہم معنی بن جاتی ہے۔ وہ فساد کو بڑھاتی ہے نہ یہ کہ معاشرہ میں اصلاح پیدا کرے۔

اقتدار کی طلب انسان کی سب سے بڑی طلب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں اقتدار کی جنگ جاری رہی ہے۔ سماج کے اندر ہمیشہ کثیر تعداد میں ایسے لوگ موجود رہتے ہیں جو کسی نہ کسی طرح اقتدار اور مرتبہ کے مقام پر پہنچنے کا خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ تاریخ اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ انسانی معاشرہ ہمیشہ اقتدار اور بڑائی چاہنے والوں کا دنگل بنا رہا ہے۔ ایسی حالت میں کسی اصلاحی تحریک کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ قلوب کی راہ سے لوگوں کے اندر داخل ہو کر ان کے جذبۂ اقتدار پسندی کو کم کرے۔ اس ابتدائی اصلاحی کام کو قابل لحاظ حد تک کئے بغیر جو لوگ "مطالبہ نظام اسلامی" کی مہم لے کر کود پڑیں وہ صرف فساد فی الارض میں اضافہ کریں گے۔ کیوں کہ اس قسم کی مطالباتی مہم طالبین اقتدار کی تعداد میں اضافہ کے ہم معنی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اقتدار کی رسہ کشی جو پہلے صرف عام دنیا داروں کے درمیان جاری تھی، اس میں مذہبی لوگوں کی بھیڑ کا بھی اضافہ ہو جائے۔ مزید اس شناعت کے ساتھ کہ اقتدار کی جو جنگ پہلے سیاست کے نام پر ہو رہی تھی وہ مذہب کے نام پر ہونے لگے۔ خدا کا دین جاہ طلبی کے بازار میں ایک سیاسی سودا بن کر رہ جائے۔

غیر جذباتی فیصلہ کرنے کی صلاحیت

اسلامی تحریک کو سیاسی تحریک بنانا پوری قوم کو جذباتی بنا کر رکھ دیتا ہے۔ جب کہ اسلام کو قائم کرنے کے لئے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ ایسے انسانوں کی ایک جماعت ہے جو غیر جذباتی فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں، اس قسم کی تحریک، بالفرض ایک حکومت کو ختم کرنے میں کامیاب ہو جائے تب بھی وہ نئی صالح حکومت بنانے میں کامیاب نہیں

ہو سکتی۔ کیوں کہ عین اپنی فطرت کے نتیجہ ہیں، وہ ان افراد سے محروم ہوگی جو کسی نظام کو اسلامی طریق پر چلانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

ایک بار مجھے ایک کارخانہ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ مجھے ایک مشین دکھائی گئی۔ کارخانہ کے مالک نے ایک بٹن دبایا۔ فوراً مشین کا بڑا پہیہ (Fly wheel) تیزی سے گھومنے لگا۔ پہیہ اپنی پوری رفتار سے ایک رخ پر گھوم رہا تھا کہ انھوں نے دوسرا بٹن دبایا۔ اس کے بعد اچانک پہیہ نے رفتار بدلی اور تقریباً رکے بغیر دوسرے رُخ پر اسی تیزی سے گھومنے لگا۔ یہ صلاحیت جو ایک مشین کو کامیاب بناتی ہے وہی اسلامی سیاست کی کامیابی کے لئے درکار ہے۔ اسلامی سیاست کو وہی لوگ کامیابی کے ساتھ چلا سکتے ہیں جو اپنے آپ پر اتنا زیادہ قابو رکھنے والے ہوں کہ نئی صورت حال پیش آنے کے بعد اچانک وہ اپنے رخ کو تبدیل کر سکیں۔

اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے ایسے افراد درکار ہیں جو مذکورہ پہیے کی طرح بیک وقت اپنا رُخ تبدیل کر سکتے ہوں۔ جو جنگی جنون کی عین انتہا پر پہنچ کر صلح کا فیصلہ کر سکیں۔ جو غصہ اور انتقام کی بھڑکتی ہوئی آگ کے درمیان معاف کر دینے اور بھول جانے کا اعلان کر سکیں۔ جو لیڈری کے عالی شان مواقع کے ہوتے ہوئے اپنے آپ کو گم نامی کے گوشہ میں لے جانے پر راضی ہو جائیں۔ جو انتہائی اشتعال انگیز واقعات کے درمیان کھڑے ہو کر ایک انتہائی ٹھنڈا فیصلہ کر سکیں۔ جو فتح کے جلو میں ہوتے ہوئے غیر فاتحانہ رویہ کا مظاہرہ کر سکیں۔ یہ متضاد خصوصیات صرف انھیں لوگوں میں پیدا ہو سکتی ہیں جن کے خوف خدا نے ان کے "انا" کے خول کو چکنا چور کر دیا ہو۔ جن کے محاسبہ نفس نے ان کا یہ حال کر دیا ہو کہ وہ اپنے آپ کو اسی بے آمیز نظر سے دیکھنے لگیں جس نظر سے خدا انھیں دیکھ رہا ہے۔ جن کے ایمان نے ان کو اتنا باشعور بنا دیا ہو کہ ان کا شعور ان کے نفس کو کنٹرول کرنے لگے نہ کہ نفس ان کے شعور کا ——

انھیں اوصاف کے حاملین اسلامی نظام قائم کرتے ہیں۔ مگر اسلام کو سیاسی تحریک بنانے کے بعد جو سب سے بڑا نقصان ہوتا ہے وہ یہ کہ اس قسم کے افراد کی پیدائش کا امکان مکمل طور پر ختم ہو جاتا ہے۔ اسلام کے نام پر سیاسی تحریک چلانا گویا "آشیانہ" کے نام پر اس شاخ کو کاٹنا ہے جس پر بالآخر آشیانہ قائم ہونے والا ہے۔

دعوتی کام کی ہمہ گیری

مسلمان کا مشن دعوت الی اللہ ہے۔ یہی عمل اس کی دنیا و آخرت کی فلاح کا ضامن ہے۔ اسی عمل کو انجام دینے سے وہ اس کا مستحق قرار پاتا ہے کہ خدا کے یہاں امت محمدی کی حیثیت سے اٹھایا جائے۔ اور یہی وہ عمل ہے جو دنیا میں اس کی حفاظت و کامیابی کو یقینی بناتا ہے۔ اس کام کو چھوڑنے کے بعد مسلمان اللہ کی نظر میں اسی طرح بے حقیقت ہو جائیں گے جس طرح یہود اپنی داعیانہ حیثیت کو چھوڑنے کے بعد [illegible] بے حقیقت ہوگئے۔ اس سلسلے میں قرآن کی حسب ذیل آیت کا مطالعہ کیجئے:

يَاأَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ من ربك وان لم تفعل فما بلغت رسالته والله يعصمك من الناس ان الله لا يهدى القوم الكفرين

(مائدہ ۶۷)

اے پیغمبر! تمھارے رب کی طرف سے جو کچھ تمھارے اوپر اتارا گیا ہے اس کو لوگوں تک پہنچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے پیغمبری کا حق ادا نہ کیا۔ اور اللہ تم کو لوگوں کے شر سے بچائے گا۔ اللہ کبھی راہ نہیں دیتا منکر قوم کو۔

آیت کا خطاب اگرچہ بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ مگر آپ کی تبعیت میں آپ کی امت بھی اس میں شامل ہے۔ اس آیت سے پہلی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ تبلیغ ما انزل اللہ (اللہ کے اتارے ہوئے علم کو لوگوں تک پہنچانا) وہ اصل کام ہے جو اللہ کو مسلمانوں سے مطلوب ہے۔ "اور اس طرح ہم نے تم کو بیچ کی امت بنا دیا تاکہ تم لوگوں پر بتانے والے (گواہ) بنو اور رسول ہو تم پر بتانے والا (بقرہ ۱۴۳) مسلمان کی اس حیثیت کو حدیث میں انتم شہداء اللہ فی الارض (تم زمین میں اللہ کے گواہ ہو) کے الفاظ میں واضح کیا گیا ہے۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ کوئی شخص یا گروہ جس منصب پر متعین کیا جائے، اسی خاص منصب کی ادائگی یا عدم ادائگی پر اس کے مستقبل کا انحصار ہوتا ہے۔ اگر وہ اس متعین فریضہ کو ادا کرے تو اس کے لئے ہر قسم کے انعامات ہیں۔ اور اگر وہ اس فریضہ کو چھوڑ دے تو دوسرا کوئی کام، خواہ وہ کتنے ہی بڑے پیمانہ پر کیا جائے، اس کو اپنے آقا کی نظر میں کسی رتبہ کا مستحق نہیں بناتا۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کو اس تنبیہ سے ڈرنا چاہئے جو ان کے پیشرو حاملین کتاب (یہود) کو اس وقت دی گئی جب کہ وہ "اللہ کی طرف سے بتانے" کا کام چھوڑ بیٹھے اور اللہ کی طرف منسوب کر کے (اعراف ۲۸) دوسرے دوسرے کام کرنے لگے:

واذ اخذ الله ميثاق الذين اوتوا الكتٰب لتبيننه للناس ولا تكتمونه فنبذوه وراء ظهورهم واشتروا به ثمنا قليلا فبئس ما يشترون ۝ لا تحسبن الذين يفرحون بما اتوا ويحبون ان يحمدوا بما لم يفعلوا فلا تحسبنهم بمفازة من العذاب ولهم عذاب اليم

(آل عمران ۱۸۷-۱۸۸)

اور جب اللہ نے اقرار لیا اہل کتاب سے کہ تم اس کو لوگوں کے سامنے بیان کرو گے اور اس کو نہیں چھپاؤ گے، پھر انھوں نے اس اقرار کو پیٹھ کے پیچھے پھینک دیا اور اس کے بدلے میں مول لے لیا تھوڑا۔ پس کیسی بری چیز ہے جس کو وہ لے رہے ہیں۔ جو لوگ اپنے اس کردار پر خوش ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جو کام نہیں کیا اس پر ان کی تعریف ہو، ایسے لوگوں کو عذاب

سے بچاؤ میں نہ سمجھو اور ان کو دردناک سزا ہوگی۔

کوئی گروہ جو آسمانی کتاب کا حامل ہو، وہ اللہ کی نظر میں اس وقت بے حقیقت ہو جاتا ہے جب کہ وہ اللہ کے حکم کے مطابق اللہ کی اتاری ہوئی ہدایت کو اللہ کے بندوں تک نہ پہنچا رہا ہو۔ دعوت الی اللہ کے کام کو چھوڑ کر دوسرے کام کرنا اور اس کو مطلوبہ دینی کام کا عنوان دینا صرف آدمی کے جرم میں اضافہ کرتا ہے۔ وہ اس کو دینی کریڈٹ کا مستحق نہیں بناتا۔

مسائل کا حل دعوت الی اللہ

دعوت کا حکم دیتے ہوئے یہ کہنا کہ "اللہ تم کو لوگوں سے بچائے گا" واضح کرتا ہے کہ دعوتی عمل ہی میں مسلمانوں کے تمام مسائل کے حل کا راز بھی چھپا ہوا ہے۔ دنیا میں مسلمان جن لوگوں کے درمیان ہیں، ان کی طرف سے بے شمار متوقع اور غیر متوقع مشکلیں پیش آتی ہیں۔ مگر مسلمانوں کو ان سب پر الگ الگ طاقت خرچ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان کے لئے ان کے رب نے ایک ایسا سرا دے دیا ہے جو تمام چیزوں کا جامع ہے۔ اور وہ سرا دعوت الی اللہ ہے۔ ایک شخص اپنی زندگی میں بے شمار ضرورتوں کا محتاج ہوتا ہے۔ مگر وہ ہر ضرورت پر الگ الگ دھیان نہیں دیتا بلکہ اپنی ساری طاقت اس چیز کو حاصل کرنے میں لگا دیتا ہے جس کو "پیسہ" کہتے ہیں۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ پیسہ قاضی الحاجات اور حل المشکلات ہے۔ پیسہ بظاہر ایک چیز ہے مگر وہ ہاتھ آجائے تو بقیہ ضرورتیں خود بخود پوری ہوتی چلی جاتی ہیں۔ ایسا ہی کچھ معاملہ دعوت الی اللہ کے کام کا ہے۔ وہ تمام مسائل جو دنیا کی زندگی میں مسلمانوں کو پیش آئیں، ان سب کا مشترک حل دعوت ہے۔ دعوت الی اللہ میں عصمت من الناس کا راز چھپا ہوا ہے۔ "اللہ منکروں کو راہ نہیں دیتا"، کا مطلب یہ ہے کہ دعوتی کام کے بعد یہ ہوگا کہ تمہارے معاندین تمہارے خلاف اپنے عزائم کی تکمیل کے مواقع نہ پا سکیں گے، تمہارے دعوتی عمل کے نتیجہ میں ان کی راہیں مسدود ہوتی چلی جائیں گی۔ دعوت الی اللہ کا یہی تسخیری پہلو ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں ملتا ہے جو آپ نے مکہ کے منکرین کے سامنے پیش کیا تھا:

کلمة واحدة تعطونها تملکون بها العرب وتدين لکم بها العجم (البدایہ والنہایہ جلد ۲ صفحہ ۱۲۳)

تم مجھے ایک کلمہ دے دو، اس سے تم تمام عرب کے مالک ہو جاؤ گے اور عجم تمہارا مطیع فرمان ہوگا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اس قرآنی تعلیم کا مکمل نمونہ ہے۔ آپ نے مختلف پیش آمدہ مسائل کو براہ راست نشانہ بنانے کے بجائے اپنی ساری توجہ دعوت کے کام پر لگا دی۔ اسی سے اللہ نے دوسرے تمام مسائل کے حل کی راہیں نکال دیں۔ مثال کے طور پر معاہدہ حدیبیہ (۶ ھ) کے وقت منکرین نے آپ کو مسائل و مشکلات کے جنگل میں گھیر لیا تھا۔ حتی کہ بیت اللہ الحرام کی زیارت کا حق دینے پر بھی وہ راضی نہ تھے۔ اس وقت آپ نے یہ کیا کہ منکرین کی خود اپنی شرائط کو مانتے ہوئے ان سے دس سال کا ناجنگ معاہدہ کر لیا۔ یہ منکروں کو ان کی منہ مانگی قیمت دے کر اپنے لئے دعوتی کام کی راہ کھولنا تھا۔ مسئلہ جنگ کی سطح پر تھا مگر آپ نے اس کا حل دعوت کی سطح پر تلاش کیا۔ چنانچہ اس معاہدہ کے بعد جیسے ہی امن ہوا، آپ نے ایک طرف رؤساء ملوک کو دعوتی وفود بھیجنے شروع کئے اور دوسری طرف عرب کے قبائل

میں دعوت کا کام پوری طاقت کے ساتھ جاری کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کی تعداد بہت تیزی سے بڑھنے لگی۔ حدیبیہ کے میدان سے آپ تقریباً ڈیڑھ ہزار مسلمانوں کے ساتھ واپس ہوئے تھے۔ دو سال بعد (۸ ھ) آپ نے دس ہزار مسلمانوں کے ساتھ مکہ کو خون بہائے بغیر فتح کر لیا۔ یہی طریق کار تھا جس نے ساتویں صدی ہجری میں تاتاریوں کے خلاف مسلمانوں کی مدد کی۔ تاتاری فوجوں کی یلغار اتنی زبردست تھی کہ اس زمانہ میں کہا جانے لگا تھا کہ اذا قیل لک ان التتر انهزموا فلا تصدق (اگر تم سے کہا جائے کہ تاتاری ہار گئے تو اس کو مت ماننا) مگر وہ فتنہ جس کے حل سے مسلمانوں کی تلوار عاجز ہو رہی تھی۔ اس کو دعوت نے حل کر دیا۔ مسلمانوں کی دعوتی جدوجہد سے تاتاری بڑی تعداد میں مسلمان ہو گئے۔ وہ لوگ جو مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لئے نکلے تھے وہ خود مسلمانوں میں شامل ہو کر ملت اسلامی کا جزء بن گئے۔

بعد کے دور میں مسلمانوں کو جو مسائل پیش آئے، اس کی واحد سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کے اندر دعوتی ذہن ختم ہو گیا۔ وہ "دینی جدوجہد" کے نام پر دوسرے دوسرے کام کرنے لگے۔ ظاہر ہے کہ خدا کی اس دنیا میں اس قسم کے خود ساختہ طریقوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ آپ اگر گیہوں کے دانہ کے شکل کے پتھر تراشیں اور ان کو زمین میں بوئیں تو ان پتھروں کے ٹکڑوں سے گیہوں کا پودا نہیں اُگ سکتا، خواہ آپ نے اس کی تراش میں کتنی ہی کاریگری دکھائی ہو۔ گیہوں کی فصل گیہوں کے دانوں سے اگتی ہے نہ کہ پتھر کے ہم شکل ٹکڑوں سے۔ اس بات کو یہاں ہم چند مثالوں سے واضح کریں گے۔

دعوتی غفلت کے نتائج

ا۔ موجودہ زمانہ میں مسلم قوموں کے لئے جو مسائل پیدا ہوئے ان میں سب سے بڑا مسئلہ "استعمار" کا سمجھا جاتا ہے۔ اس نے نہ صرف مسلم قوموں کو سیاسی طور مغلوب کیا بلکہ بے شمار دوسرے مصائب میں مبتلا کر دیا۔ انگریزوں کے درمیان اگر تبلیغی کام کیا جاتا تو عین ممکن تھا کہ انگلستان زیادہ بہتر طور پر دوسرا ترکی ثابت ہوتا۔ انگریزوں کے اندر قبولیت اسلام کا مادہ ہونے کا یہ ثبوت کافی ہے کہ عین اقتدار کے زمانہ میں ان کے افراد مسلمان ہوتے رہے۔ مگر پچھلی کئی سو برس کے اندر کبھی مسلمانوں میں یہ ذہن پیدا نہیں ہوا کہ وہ انگریزوں کے اوپر خدا کے دین کی تبلیغ کریں۔ حتیٰ کہ اگر کسی نے اس قسم کی تجویز پیش کی تو کہا گیا کہ یہ انگریزوں کا ایجنٹ ہے اور چاہتا ہے کہ مسلمانوں کو جہادِ آزادی کے محاذ سے ہٹا دے۔ تاہم موجودہ زمانہ میں اس سلسلے میں جو غفلتیں کی گئی ہیں، ان کا میں یہاں ذکر نہیں کروں گا۔ میں انگلستان کی ایک تازہ مطبوعہ کتاب "تاتار خاں کا انگریز"* نامی کتاب کے مصنف گیبریل رونے کے ایک مضمون کا حوالہ دوں گا۔ یہ مضمون لندن کے اخبار سنڈے ٹائمز (۲۲ اکتوبر ۱۹۷۸) میں شائع ہوا ہے۔ انگریز مصنف نے بعض تاریخی دستاویزات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے:

"For a crucial moment in the thirteenth century England faced the prospect of being totally converted-lock, stock and barrel-into a Muslim country."

تیرھویں صدی عیسوی میں ایک نازک لمحہ میں انگلستان کے لئے یہ امکان پیدا ہو گیا تھا کہ وہ مکمل طور پر ایک مسلم ملک میں تبدیل ہو جائے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انگلستان کا بادشاہ جان لاک لینڈ (۱۲۱۶ - ۱۱۶۷) کلیسا کے رویہ کی وجہ

*Gabriel Ronay, *The Tartar Khan's Englishman*, Cassel, London, 1978.

سے عیسائیت سے بیزار ہو گیا۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ اپنی رعایا سمیت مسلمان ہو جائے اور مسلم خلیفہ کی اطاعت قبول کرے۔ اس نے ۱۲۱۳ء میں سلطنت موحدین کے امیر ناصر لدین اللہ کے پاس ایک خفیہ وفد بھیجا جو تین افراد پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ سفر کرکے مراکش پہنچے اور امیر ناصر لدین اللہ سے ملے۔ انھوں نے امیر کو شاہ جان کا خط پیش کیا اور ترجمان کے ذریعہ اپنے بادشاہ کی خواہش سے اس کو آگاہ کیا کہ وہ امیر کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنا چاہتا ہے۔ مگر ناصر لدین اللہ دعوت وتبلیغ کا مزاج نہ رکھتا تھا۔ وہ اس پیش کش میں دل چسپی نہ لے سکا اور وفد ناکام اپنے وطن واپس لوٹ گیا۔ شاہ انگلستان کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ سخت غمگین ہوا اور بہت رویا۔ شاہ انگلستان کو اس وقت اگر اسلام میں داخل کر لیا جاتا تو اس میں کوئی شک نہیں کہ پورا انگلستان مسلمان ہو جاتا اور اس کے بعد استعمار کی تاریخ اور یورپ کی نشاۃ ثانیہ کی تاریخ بالکل دوسری ہوتی۔ وہ لوگ جو حالیہ صدیوں میں اسلام کا جھنڈا گرانے کے درپے ہوئے، وہ اسلام کا جھنڈا بلند کرنے والے بن جاتے۔ حتیٰ کہ اسرائیل کا مسئلہ سرے سے وجود میں نہ آتا جس نے آج سارے عالم اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔

۲۔ اسرائیل کو اگرچہ انگریزوں نے پیدا کیا۔ مگر آج اس کا سب سے بڑا سہارا امریکہ ہے۔ اس مسئلہ نے مسلم دنیا کو بہت بڑے پیمانہ پر متاثر کیا ہے اور پوری مسلم دنیا اس کے خلاف متحد ہے۔ تاہم ۴۰ سال کی طویل جدوجہد کے باوجود ابھی تک مسلمانوں کو اس محاذ پر کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ جہاں تک یہودیوں کے قبول اسلام کا تعلق ہے ہمیں اس معاملہ میں کوئی خوش گمانی نہیں۔ اگرچہ اتمام حجت کے لئے ہم کو یہود تک بھی اسلام کی دعوت پہنچانا چاہئے۔ مگر مخصوص وجوہ سے عملاً اس کی بہت کم امید کی جاسکتی ہے کہ یہود کی کوئی قابل لحاظ تعداد اسلام قبول کرے۔ تاہم جہاں تک تبلیغی طریق کار کا تعلق ہے، یہاں بھی اس کی افادیت مسلّم ہے۔ تبلیغی طریق کار کے براہ راست طور پر یہود پر موثر ہونے کی اگرچہ زیادہ امید نہیں کی جاسکتی۔ تاہم بالواسطہ طور پر ان پر اثر انداز ہونے کے پورے امکانات تھے۔ مگر دعوتی ذوق نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان اس کو استعمال نہ کر سکے۔

بالواسطہ طریق کار سے مراد امریکہ پر تبلیغ ہے۔ یہ ایک معلوم بات ہے کہ اسرائیل کا اصل سرپرست امریکہ ہے۔ امریکہ ہی وہ طاقت ہے جو اسرائیل کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ امریکہ، سائنٹفک معاشرہ ہونے کی بنا پر، آج اسلام کی تبلیغ کا سب سے کامیاب میدان بن سکتا ہے۔ مگر مسلمانوں کا تبلیغی کام امریکہ میں صفر کے درجہ میں ہے۔ جب کہ ہندوازم اور بدھ ازم تک نے وہاں اپنے لئے کام کے نہایت قیمتی مواقع پائے ہیں۔ یہاں ہم یاد دلائیں گے کہ ۱۸۸۴ میں جب کہ سید جمال الدین افغانی اور ان کے شاگرد مفتی محمد عبدہ پیرس میں تھے۔ سید جمال الدین افغانی نے اپنے شاگرد سے کہا:

ان اهل اوربا مستعدون لقبول الاسلام اذا احسنت الدعوة اليه - فقد قارنوا بين الدين الاسلامي وبين غيره فوجدوا البون شاسعا من حيث يسر العقائد وقرب تناولها - واقرب من اهل اوربا الى قبول الاسلام اهل امريكا لانه لا يوجد بينهم وبين الامم الاسلامية

یورپ کے لوگ اسلام قبول کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اگر اس کی دعوت اچھی طرح ان کے سامنے پیش کی جائے۔ کیوں کہ انھوں نے اسلام اور دوسرے مذہبوں کا تقابلی مطالعہ کیا تو انھوں نے پایا کہ عقیدہ کی سادگی اور عمل کی آسانی کے اعتبار سے دونوں میں بہت فرق ہے، اور مغربی اقوام میں

عداوات موروثة ولا اضغان مدفونة مثلما هو الحال بين المسلمين والأوربيين
جمال الدين الافغانی، تالیف محمود ابوریہ، ۵۰

قبول اسلام کے اعتبار سے سب سے زیادہ قریب امریکہ کے لوگ ہیں۔ کیونکہ ان کے اور اسلامی قوموں کے درمیان اس طرح کی قدیم عداوتیں نہیں ہیں جو مسلمان اور یورپی قوموں میں ہیں۔

اپنے استاد کی زبان سے یہ بات سن کر مفتی محمد عبدہ نے ان سے کہا: پھر کیوں نہ ہم ایسا کریں کہ سیاسی مقابلہ آرائی کو چھوڑ کر امریکہ میں تبلیغ و دعوت کا کام کریں۔ جمال الدین افغانی کے سیاسی ذوق کو تبلیغی کام ایک ہلکا کام معلوم ہوا، انھوں نے کہا: انما انت مثبط (تم تو حوصلہ پست کرنے والی باتیں کرتے ہو) سید جمال الدین افغانی انتہائی غیر معمولی صلاحیت کے آدمی تھے۔ وہ اگر اپنی پوری طاقت تبلیغ و دعوت کے کام میں لگا دیتے تو وہ امریکہ میں زبردست دعوتی کام پھیلا سکتے تھے۔ اور اگر انھوں نے سو سال پہلے یہ کام شروع کر دیا ہوتا تو عجب نہیں کہ آج امریکہ ایک مسلم ملک بن چکا ہوتا۔ اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ امریکہ میں اسلام پھیل جانے کے بعد اسرائیل کی تاریخ اس سے بالکل مختلف ہوتی جو آج ہمیں نظر آتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں، وہ تاریخ دوبارہ نئی صورت میں دہرائی جاتی جب کہ قبیلہ ہوازن (۶ ہزار) کے مسلمان ہو جانے کے بعد قبیلہ ثقیف (طائف) نے ہتھیار ڈال دئے تھے (ظہور اسلام، صفحہ ۳۹)

۳۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا ایک بہت بڑا مسئلہ ان کی سائنسی اور صنعتی پس ماندگی ہے۔ اسی پس ماندگی کا یہ نتیجہ ہے کہ بے پناہ قربانیوں کے باوجود انھوں نے مغربی استعمار سے جو سیاسی آزادی حاصل کی تھی وہ صنعتی محکومی کی صورت میں دوبارہ ان کی طرف لوٹ آئی۔ حتی کہ تیل پیدا کرنے والے مسلم ممالک اپنے تیل سے جو دولت حاصل کرتے ہیں وہ دوبارہ مختلف بہانوں سے انھیں مغربی ملکوں میں واپس چلی جاتی ہے جو صنعت اور سائنس میں اپنی برتری کی وجہ سے مسلم ملکوں کی تمام سرگرمیوں پر اپنا سایہ ڈالے ہوئے ہیں۔

بظاہر اس مسئلہ کا تبلیغ و دعوت کے کام سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دونوں میں نہایت گہرا تعلق ہے۔ صنعت اور سائنس کو وجود میں لانے والے بالآخر انسان ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اگر ہاتھ آجائیں تو صنعت اور سائنس خود بخود ہاتھ آجائے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود لکھنا نہیں جانتے تھے (عنکبوت ۴۸) مگر آپ کی دعوت کے ذریعہ ایسے لوگ اسلام میں داخل ہوئے جو لکھنا جانتے تھے۔ انھوں نے اپنے ہاتھ سے آپ کی وحی کو کتابی صورت میں لکھا۔ موجودہ زمانہ میں اس سلسلے میں جاپان کی مثال دی جا سکتی ہے۔ جاپان صنعت اور سائنس کے اعتبار سے آج صف اول کی قوموں میں شمار ہوتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ انیسویں صدی کے آخر میں جاپان میں اسلام کی اشاعت کے غیر معمولی امکانات پیدا ہو گئے تھے۔ جاپان کا بادشاہ میجی (۱۹۱۲ – ۱۸۶۸) جاپان میں مسیحیت کے داخلہ سے سخت متوحش تھا۔ کیوں کہ اس کے نزدیک مسیحیت، مذہبی لباس میں، مغرب کی استعماری طاقتوں کا ہراول دستہ تھا۔ اس نے مسیحیت کو روکنے کے لئے یہ تدبیر سوچی کہ جاپان میں اسلام کو پھیلایا جائے۔ وہ اسلام کو ایک بے ضرر چیز سمجھتا تھا۔ جب کہ مسیحیت کے داخلہ کا مطلب اس کے نزدیک استعمار کا دروازہ کھولنے کے ہم معنی تھا۔ شاہ میجی نے ۱۸۹۱ میں ترکی کے سلطان عبدالحمید ثانی

(۱۸۴۲ - ۱۹۱۸) کے پاس ایک سرکاری وفد بھیجا۔ اس وفد کے پاس شاہ جاپان کا ایک خط تھا جس میں درخواست کی گئی تھی کہ سلطان "اپنے مبلغین کو جاپان بھیجے جو جاپانیوں کو مذہب اسلام کی تعلیمات سے واقف کرائیں اور اس طرح جاپان اور عالم اسلام کے درمیان معنوی رشتہ قائم ہو" مگر نہ سلطان میں دعوت وتبلیغ کا جذبہ تھا اور نہ ان علماء میں جو اس کے گردوپیش جمع تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ پیش کش شکریہ کے ساتھ واپس کردی گئی اور اس سمت میں کوئی کام شروع نہ ہوسکا۔ اگر موقع سے فائدہ اٹھایا جاتا اور ۱۸۹۱ سے جاپان میں تبلیغ اسلام کا کام شروع ہوجاتا تو پورے اعتماد کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ آج جاپان ایک مسلم ملک ہوتا اور اس کا مسلم ملک ہونا مسلمانوں کی سائنسی اور صنعتی پس ماندگی کی مکمل تلافی کردیتا۔

۳۔ اب اس مسئلہ کو لیجئے جس کو "ہندستانی مسلمانوں کا مسئلہ" کہا جاتا ہے۔ یہ مسئلہ بھی تمام تر دعوت وتبلیغ کے کام سے غفلت کی پیداوار ہے۔ ہندستان میں اسلام کی طویل تاریخ میں کبھی تبلیغ کی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی۔ یہاں جو لوگ اسلام کے حلقہ میں داخل ہوئے وہ زیادہ تر خود اپنے جذبہ سے داخل ہوئے نہ کہ حقیقۃً مسلمانوں کی کسی دعوتی کوشش سے۔ صوفیاء کے ہاتھ پر ماضی میں کثرت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا ہے۔ مگر یہ کہنا مشکل ہے کہ تبدیلی مذہب کے یہ واقعات ارادی طور پر کسی قابل ذکر تبلیغی کوشش کا نتیجہ تھے۔ یہ زیادہ تر قدیم حالات کی بنا پر تھا جب کہ مذہبی تعصب نہیں تھا اور لوگ معمولی اسباب سے اپنا مذہب بدلنے کے لئے تیار ہوجاتے تھے۔ جواہر لال نہرو نے لکھا ہے: "اسلام کی آمد ہندستان کی تاریخ میں کافی اہمیت رکھتی ہے۔ اس نے ان خرابیوں کو جو ہندو سماج میں پیدا ہوگئی تھیں، یعنی ذاتوں کی تفریق، چھوت چھات اور انتہا درجہ کی خلوت پسندی کو بالکل آشکارا کردیا۔ اسلام کے اخوت کے نظریے اور مسلمانوں کی عملی مساوات نے ہندوؤں کے ذہن پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ خصوصاً وہ لوگ جو ہندو سماج میں برابری کے حق سے محروم تھے، اس سے بہت متاثر ہوئے۔ اس نے تاثر نے ملک میں بہت سی تحریکیں پیدا کیں۔ چنانچہ بہت سے لوگ اپنا مذہب چھوڑ کر نئے مذہب میں شامل ہوگئے۔ ان شامل ہونے والوں میں اکثریت پنچ ذات کی تھی۔ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے سیاسی اور اقتصادی مصلحتوں کی بنا پر مذہب تبدیل کیا تھا۔ حکمراں طاقت کا مذہب قبول کرنے میں جو فائدہ تھا وہ ظاہر ہے۔ یہاں ایک چیز خاص طور پر قابل لحاظ ہے۔ عام طور پر پوری پوری جماعتیں ہندو سے مسلمان ہوجاتی تھیں۔ اس سے ہمیں اس اثر کا پتہ چلتا ہے جو ان دنوں جماعت کو حاصل تھا۔ اعلیٰ ذاتوں میں سے تو فرداً فرداً بھی لوگ تبدیل مذہب کرتے تھے۔ مگر نیچی ذاتوں میں ایک مقام کی کوئی پوری برادری یا سارے کا سارا گاؤں اسلام قبول کرلیتا تھا" جواہر لال نہرو مزید لکھتے ہیں "اس زمانہ میں لوگوں نے خواہ انفرادی طور پر اسلام قبول کیا یا جماعتی طور پر، ہندو قوم نے اس کی مخالفت نہیں کی۔ انھیں اس کی پروا نہ تھی کہ ان کے کچھ لوگ کسی دوسرے مذہب کے پیرو بن جائیں۔ پرانے زمانہ میں تو یہ حال تھا۔ مگر آج کل معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اب اگر کوئی شخص اسلام یا مسیحیت قبول کرتا ہے تو ہر طرف غم وغصہ کے جذبات مشتعل ہوجاتے ہیں۔ آج کل کا یہ شور وغوغا سیاسی اسباب کے تحت ہے۔ کوئی دوسری جماعت کا مذہب اختیار کرلیتا ہے تو سمجھا جاتا ہے کہ اس سے اس جماعت کو تقویت پہنچی۔ سیاسی اختیارات میں اس کی نیابت کے حقوق بڑھے" (ڈسکوری آف انڈیا ۱۹۴۵، صفحات ۲۷۹ - ۸۱)

ماضی کی تاریخ میں کثرت سے ایسے واقعات موجود ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ اس ملک میں اگر سنجیدگی کے ساتھ

اسلام کی تبلیغ کی گئی ہوتی تو یہاں اس کی اشاعت کے غیر معمولی امکانات تھے۔ مثلاً ۱۸۵۷ کے نام نہاد جہاد آزادی کے بعد جب مسلمانوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تو بہت سے علمار روپوش ہو گئے۔ ان میں سے ایک بڑی تعداد ہمالیہ کے جنگلوں میں پھیل گئی اور "دعا تعویذ" کے انداز پر کام کرنے لگی۔ ان کے اثر سے اس علاقہ کے لوگ کثرت سے مسلمان ہو گئے۔ چنانچہ آسام سے لے کر کشمیر تک پہاڑوں میں جو چھوٹی چھوٹی بستیاں پھیلی ہوئی ہیں، ان میں مسلمان بڑی تعداد میں آباد ہیں اور یہ اسی وقت کی یادگار ہیں۔ اسی طرح علمار کی ایک تعداد مشرقی بنگال کے پس ماندہ علاقہ میں داخل ہو گئی جہاں اس زمانہ میں سڑکیں وغیرہ کم ہونے کی وجہ سے انگریزی دار و گیر کا خطرہ نہیں تھا۔ یہ لوگ خاموشی کے ساتھ وہاں خانقاہیں بنا کر رہنے لگے۔ ان کے اثر سے اس علاقہ کی اکثریت مسلمان ہو گئی۔ یہی کام اگر حقیقی شعور اور منصوبہ بندی کے تحت کیا جاتا تو آج ملک کی تاریخ دوسری ہوتی اور اسی کے ساتھ مسلمانوں کی بھی۔

موجودہ زمانے میں مسلمانوں نے بے شمار تحریکیں اٹھائیں۔ حتیٰ کہ ان کی تحریکوں کے غلغلہ سے فضائے آسمانی گونج اٹھی۔ مگر وہی ایک کام انھوں نے نہ کیا جو ان کے خدا نے سب سے زیادہ ان پر فرض کیا تھا یعنی اللہ کے دین کو اس کے تمام بندوں تک پہنچانا۔ تاہم مسلمانوں کی کسی کوشش کے بغیر دین فطرت لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنا رہا ہے کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب کہ دنیا میں کہیں نہ کہیں یہ واقعہ پیش نہ آتا ہو کہ اللہ کے بندے اللہ کے دین کو قبول کر کے اس میں داخل نہ ہو رہے ہوں۔ مسلمانوں کو تو یہ توفیق بھی نہ ہو سکی کہ وہ کوئی ایسی ایجنسی قائم کرتے جو ان نومسلموں کے اعداد و شمار جمع کر کے شائع کرتی، البتہ عالمی ادارہ مذہب World Religions Institute نے حال میں کچھ اعداد و شمار شائع کئے ہیں۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ۱۹۷۱ سے ۱۹۷۵ء تک کے پانچ سالوں میں تقریباً پانچ لاکھ آدمیوں نے اسلام قبول کیا۔ یہ اعداد و شمار صرف یورپ اور امریکہ سے متعلق ہیں۔ افریقہ میں مسلمانوں کی پس ماندگی اور عیسائی مشنریوں کی غیر معمولی جدوجہد کے باوجود عیسائی بننے والوں کے مقابلہ میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ السٹریٹڈ ویکلی کے سابق ایڈیٹر مسٹر خوشونت سنگھ نے اپنے افریقی دورہ کے تاثرات کے ذیل میں لکھا تھا:

> "کینیا اور یوگنڈا کے اپنے آخری سفر میں میں نے عیسائیوں اور مسلمانوں کی ان تبلیغی کوششوں کا جائزہ لیا جو نیگرو قبائل کے درمیان جاری ہیں۔ عیسائیوں نے تسلیم کیا کہ مسلم عرب بردہ فروشوں کی ناخوش گوار یادوں کے باوجود افریقہ کے سیاہ فام باشندوں میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد عیسائی بننے والوں سے زیادہ ہے۔"
>
> (السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا۔ ۷ جولائی ۱۹۷۴ء، صفحہ ۲۷)

اگرچہ ہمارے پاس قطعی اعداد و شمار نہیں ہیں تاہم یہ اندازہ مبالغہ آمیز نہیں کہ آج بھی کسی خاص تبلیغی کوشش کے بغیر دنیا بھر میں جو لوگ مسلمان ہو رہے ہیں ان کی تعداد سالانہ دو لاکھ سے زیادہ ہے۔ اگر ان نومسلموں سے روابط قائم کئے جائیں اور ان سے معلوم کیا جائے کہ اسلام کی کون سی خصوصیت نے انھیں متاثر کیا اور پھر ان معلومات کی روشنی میں عالمی سطح پر اسلام کی اشاعت کی منصوبہ بندی کی جائے تو صرف دس برس میں اسلام کی سربلندی کا وہ خواب پورا ہو سکتا ہے جس کو دوسری راہوں سے دو سو برس سے حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے مگر وہ حاصل نہیں ہوتا۔

نوٹ: یہ مقالہ ایک تقریر پر مبنی ہے جو ندوۃ المجاہدین کیرلا کے اجلاس بمقام ملاپورم ۱۱ مارچ ۱۹۷۹ کی گئی۔

اسلام کی نظریاتی طاقت

۱۹۴۰ کا واقعہ ہے۔ میرے بڑے بھائی عبدالعزیز خاں (پیدائش ۱۹۲۰) کے پیٹ میں سخت درد اٹھا۔ ڈاکٹر انیس اس وقت اعظم گڑھ میں سول سرجن تھے۔ ان کو بلایا گیا۔ انھوں نے دیکھ کر بتایا کہ یہ اپنڈکس کا کیس ہے اور اس کا علاج صرف آپریشن ہے۔ اس کے بعد انھوں نے مشورہ دیا کہ ان کو فوراً لکھنؤ لے جائیے۔ "اپنڈکس کا آپریشن تو اس زمانہ میں معمولی آپریشن سمجھا جاتا ہے" میں نے کہا "پھر اس کے لئے آپ ہم کو لکھنؤ کیوں بھیج رہے ہیں۔ یہیں اعظم گڑھ کے اسپتال میں کیوں آپریشن نہیں کر دیتے۔"

ڈاکٹر انیس میری یہ بات سن کر سنجیدہ ہو گئے۔ "آپ صحیح کہتے ہیں" انھوں نے کہا "مگر مسئلہ یہ ہے کہ یہاں ہمارے پاس تربیت یافتہ ہیلپر (کارکن) نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر ہم نے پیٹ میں شگاف ڈالنے کے بعد اپنا کام کر لیا اور چاک کو دوبارہ سینے کا وقت آیا تو ہمارے پاس ایسے ماہر آدمی ہونے چاہئیں جو خود سے یہ جان لیں کہ ہمیں کس قسم کے دھاگے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم کو پتلے دھاگے کی ضرورت ہو اور ہمارے پاس کھڑا ہوا آدمی موٹا دھاگا سوئی میں ڈال کر ہمیں دینے لگے تو سارا کام خراب ہو جائے۔ کیوں کہ یہ بے حد نازک لمحہ ہوتا ہے۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ ہم اپنے ساتھی کے کام کو دیکھیں اور جب وہ غلط دھاگہ ڈالے تو ہم کہیں کہ دیکھو موٹا دھاگا مت دینا، پتلا دھاگا دینا۔ اس کو بتائے بغیر جاننا چاہئے کہ ایک کے بعد دوسرا کونسا عمل کیا جانے والا ہے اور اس میں اس کو کیا حصہ ادا کرنا ہے۔" سول سرجن نے اپنی گفتگو اس جملہ پر ختم کی —————— "میرے ساتھی کو جاننا چاہئے کہ میں آئندہ کیا کرنے والا ہوں۔"

یہی بات ملت کی تعمیر کے لئے بھی صحیح ہے۔ ہر زمانہ میں ایسے حالات پیدا ہوتے ہیں جو قوم کے لئے اپنی منزل کی طرف سفر کی نئی راہیں کھولتے ہیں۔ یہ حالات لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کرتے ہوئے نہیں آتے۔ وہ عالم واقعات میں خاموشی کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ ملت کے افراد کا امتحان ہوتا ہے کہ کیا وہ اتنے حساس اور باشعور ہیں کہ خود سے جان لیں کہ خدائی اسکیم میں اپنا حصہ ادا کرنے کے لئے انھیں کیا کرنا چاہئے۔ اس وقت ملت کے افراد اگر پیشگی اپنے حصہ کا عمل جان لیں تو وہ صرف "۲۳" سال میں کامیابی کی بلندیوں پر پہنچ سکتے ہیں اور اگر وہ قدرت کے اشاروں کو نہ سمجھیں تو دوسری راہوں پر ۲۳ سو سال کا شور و غل بھی کوئی نتیجہ پیدا کرنے والا نہیں ہے۔

ایک مثال لیجئے۔ مکہ میں پیغمبرؐ کی رہنمائی میں جو دعوت اٹھی اور مختلف واقعات کے جلو میں جس طرح اس کی آواز سارے ملک میں پھیل گئی، اس کے نتیجہ میں بعثت کے پندرھویں سال یہ صورت حال تھی کہ قدیم عرب کے ہزاروں لوگ دل سے اسلام کی حقانیت کو مان چکے تھے۔ مگر اس ڈر سے وہ اسلام قبول کرنے سے رکے ہوئے تھے کہ اگر انھوں نے اپنے اسلام کا اعلان کیا تو وہ سارے قریش سے اعلان جنگ کے ہم معنی بن جائے گا۔ یہ ایک بے حد نازک لمحہ تھا۔ ایک طرف قریش کی ایذا رسانی بے حد بڑھ چکی تھی۔ قریش نے مسلمانوں کو بیت اللہ سے روکا۔ ان کو ان کے گھروں اور

جائداد وں سے نکالا، ان کی معاشیات کو تباہ کیا۔ ان کو نیست ونابود کرنے کے لیے وحشیانہ لڑائیاں لڑیں۔ ان کے لئے امن کے ساتھ رہنا ناممکن بنا دیا۔ اس کے نتیجہ میں ایسا ہونا فطری تھا کہ مسلمانوں کے دل میں قریش کے خلاف نفرت اور دشمنی کی آگ بھڑک رہی ہو۔ مگر پیغمبر کی رہنمائی میں انھوں نے قدرت کے اشارہ کو پڑھ لیا۔ انھوں نے جان لیا کہ ربانی منصوبہ میں اس وقت انھیں جو حصہ ادا کرنا ہے وہ صبر ہے نہ کہ میدان مقابلہ میں شجاعت دکھانا۔ یعنی یہ کہ وہ جنگ وجدال کی صورت حال کو ہر قیمت پر ختم کر دیں تاکہ لوگ قریش سے جنگ مول لینے کے اندیشے سے مامون ہو کر اسلام کی طرف بڑھ سکیں۔ انھوں نے اپنی تلواروں کو یک طرفہ طور پر میان میں کر لیا اور قریش کے ظالمانہ مطالبات تک کو مان کر ان سے دس سال کا ناجنگ معاہدہ کر لیا۔ اس کے مطابق قریش پابند ہو گئے کہ وہ دس برس تک نہ مسلمانوں سے جنگ کریں گے اور نہ نئے اسلام میں داخل ہونے والوں سے۔ حدیبیہ کا معاہدہ (۶ ھ) اللہ کی اسکیم میں اپنے کو شامل کرنے کا ہی معاملہ تھا۔ اگرچہ یہ ناقابل برداشت کو برداشت کرنا تھا۔ مگر جب مسلمانوں نے اللہ کے بھروسہ پر ایسا کیا تو اس کے نتائج ظاہر ہونا شروع ہوئے۔ جب یہ خبر پھیلی کہ قریش اور مسلمانوں کے درمیان یہ معاہدہ ہو گیا ہے کہ دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے خلاف جنگ نہیں چھیڑے گا تو متاثر قبیلے قریش کی جارحیت سے بے خوف ہو کر اسلام میں داخل ہونا شروع ہو گئے۔ مسلمانوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ معاہدۂ حدیبیہ کے وقت مسلمانوں کی جماعت چودہ سو افراد پر مشتمل تھی اور اس کے بعد صرف دو برس میں ان کی تعداد دس ہزار ہو گئی۔ اب طاقت کا توازن مسلمانوں کی طرف تھا۔ کسی خون خرابہ کے بغیر محض رعب و دبدبہ کے ذریعہ مرکز عرب (مکہ) پر ان کا قبضہ ہو گیا۔

یہی خدائی منصوبہ موجودہ زمانہ میں ایک اور صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ پچھلے سو برس سے مسلمان دیگر قوموں سے لڑائی بھڑائی میں مشغول ہیں۔ ان قوموں سے مسلمانوں کو جو شدید تکلیفیں پہنچیں، اس کی وجہ سے مسلمانوں کو ان سے دشمنی اور نفرت پیدا ہو گئی اور انھوں نے ان کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ نتیجۃً خود ان قوموں کے اندر بھی مسلمانوں سے اور ان کی ہر چیز سے عناد بڑھتا چلا گیا۔ مگر عین اس وقت جب کہ یہ کش مکش کسی نتیجہ تک پہنچے بغیر جاری تھی، ساری دنیا میں ایک اور انقلاب ابھر آیا۔ یہ وہ فکری انقلاب ہے جو انیسویں صدی کے الحاد کے رد عمل کے طور پر پیدا ہوا ہے۔ موجودہ زمانہ میں تقابلی مطالعۂ ادیان، صنعتی تہذیب کے نتائج سے مایوسی، سائنس کی موافق مذہب دریافتیں اور دوسرے وجوہ سے ساری دنیا میں ایک نیا ذہن پیدا ہوا ہے۔ لوگ از سر نو مذہبی تعلیمات کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم جدید مذہبی دلچسپیوں کی اس فہرست میں اسلام کا نام ابھی بہت پیچھے ہے۔ اس کی وجہ ہماری وہ لفظی اور غیر لفظی لڑائیاں ہیں جو ہم نے غیر مسلم قوموں سے ساری دنیا میں چھیڑ رکھی ہیں۔ نئے موافق امکانات دوبارہ قدرت کی خاموش زبان میں سو برس سے یہ اشارہ کر رہے ہیں کہ آج دوبارہ ایک "صلح حدیبیہ" کی ضرورت ہے۔ اللہ کے دین کو آج مجاہدانہ اقدام نہیں بلکہ صابرانہ پسپائی درکار ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہم غیر مسلم اقوام کے خلاف اپنی تمام سیاسی اور احتجاجی سرگرمیاں یک طرفہ طور پر بند کر دیں۔ تاکہ فریقین کے درمیان تناؤ ختم ہو اور لوگ معتدل فضا میں اسلام کا مطالعہ شروع کر سکیں۔ اس طرح وہ قومیں جو آج اسلام کی حریف بنی ہوئی ہیں، اسلام کی مدعو بن جائیں گی۔ دور جدید نے اسلام کے حق میں جو

علمی تصدیقات فراہم کی ہیں وہ اپنا کام کرنا شروع کریں گی۔ ایک نسل بھی نہیں گزرے گی کہ وہ وقت سامنے آجائے گا جس کی پیشین گوئی حدیث میں ان الفاظ میں کی گئی ہے ——— "کوئی خیمہ یا مکان ایسا نہیں بچے گا جس میں اسلام داخل نہ ہو گیا ہو۔"

نئے امکانات

موجودہ زمانہ میں اسلام کی دعوت و اشاعت کے جو امکانات پیدا ہوئے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ یہ دریافت کہ ساری کائنات کا مادہ ایک ہے اور وہ ایک قانون کے تحت چل رہی ہے، اس سے توحید کا عقیدہ آج کے انسان کے لئے ہمیشہ سے زیادہ قابل فہم بن گیا ہے۔

۲۔ بہت سی دریافتیں ہیں جنھوں نے آخرت کو قابل فہم بنا دیا ہے۔ مثلاً ٹیلی وژن کے ذریعہ اس بات کا قابل فہم ہو جانا کہ موجودہ دنیا کے اندر ایک اور دنیا موجود ہو سکتی ہے اگرچہ وہ ظاہری آنکھوں سے دکھائی نہ دیتی ہو۔

۳۔ یہ دریافت کہ انسان اپنی محدودیتوں کی وجہ سے صرف جزئی علم تک پہنچ سکتا ہے، اس سے وحی و الہام کی اہمیت ثابت ہو جاتی ہے۔

۴۔ موجودہ زمانہ میں مذاہب کے تقابلی مطالعہ نے ثابت کیا ہے کہ تمام مذاہب میں اسلام ہی واحد مذہب ہے جس کو تاریخ کی اعتباریت حاصل ہے۔

۵۔ سیاسی ادارہ کو مذہبی عقیدہ سے جدا کرنے کا کام جو اسلام کے ابتدائی زمانہ میں شروع ہوا تھا، اس کو مغرب کے فکری انقلاب نے تکمیل تک پہنچا دیا ہے۔ آج توحید کی دعوت کو ان غیر ضروری مشکلات سے آزاد رہ کر انجام دیا جا سکتا ہے جو قدیم زمانہ کی مشرکانہ بادشاہت کی وجہ سے پیش آتی تھیں۔

۶۔ جدید جمہوری انقلاب نے ساری دنیا میں آزادی اظہار خیال کو انسان کا فطری حق ثابت کیا ہے۔ اس نے تاریخ میں پہلی بار یہ امکان پیدا کیا ہے کہ توحید کی دعوت کو سیاسی ٹکراؤ کے بغیر جاری کیا جا سکے۔

۷۔ پریس کی ایجاد، مواصلاتی ذرائع کی ترقی اور ابلاغ عامہ کے جدید طریقوں کا ظہور میں آنا۔ ان چیزوں نے اس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ جدید ذرائع کو استعمال کر کے بے حد وسیع پیمانہ پر اسلام کی اشاعت کی جا سکے۔

۸۔ جدید اقتصادی صورتوں نے مسلمانوں کو ہر خطہ زمین پر پہنچا دیا ہے۔ ان مسلمانوں کو منظم کر کے اسلام کی دعوت کو بیک وقت عالمی سطح پر شروع کیا جا سکتا ہے جو اس سے پہلے کبھی ممکن نہ ہوا تھا۔

۹۔ موجودہ زمانہ میں بے شمار نئی تحقیقات سامنے آئی ہیں جو اسلام کی مؤید ہیں۔ ان کو استعمال کر کے اسلامی علم کلام کو خالص حقائق کی بنیاد پر مرتب کیا جا سکتا ہے جو قدیم قیاسی علم کلام کے مقابلہ میں بے شمار گنا زیادہ طاقت ور ہو گا۔

۱۰۔ صحیح فلسفہ اور بہتر زندگی پانے کی بے شمار کوششوں کے بعد آج کا انسان مایوسی کے مقام پر کھڑا ہوا ہے۔ اس صورت حال نے اس بات کا امکان پیدا کر دیا ہے کہ اسلام کو نئے صحیح تر نظریہ کی حیثیت سے سامنے لایا جائے اور آج کا انسان اس کو اپنے دل کی آواز پاکر قبول کرے۔

چند مثالیں

بیسویں صدی کے آغاز میں یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ یورپ اپنی تمام مادی ترقیوں کے باوجود ایک احساس ناکامی سے دوچار ہے۔ اس کو نظر آرہا ہے کہ اس کی سائنس اور ٹکنالوجی نے اس کو مشینیں اور سواریاں تو دیں، مگر اس کو وہ فلسفۂ حیات نہ مل سکا جو اس کو یقین کی دولت عطا کرتا۔ انگریز فلسفی بریڈلے (۱۹۲۴ - ۱۸۴۶) نے موجودہ صدی کے ربع اول میں کہا تھا:

"دنیا کو ایک نئے مذہب (New religion) کی ضرورت ہے۔ ہمیں ایک ایسا عقیدہ چاہئے جو تمام انسانی مفادات کا تعین کرے اور ضروری تناسب کے ساتھ اس کے جواز کی بنیاد ہو، اور اسی کے ساتھ وہ تصور عطا کرے جس سے انسان اس پر اعتماد کے ساتھ قائم ہو سکے۔"

Essays on Truth & Reality. p. 446

اس کے بعد خود مغربی ممالک میں ایسے لوگ اٹھے جنھوں نے مسلمانوں کو یاد دلایا کہ ان کے پاس خدا کی جو امانت ہے، وہ یورپ کی اس فکری کمی کو پورا کر سکتی ہے، وہ اس کو لے کر اٹھیں اور اہل عالم تک اس کو پہنچا کر اپنا خدائی فریضہ ادا کریں۔ لارڈ بی۔ ایچ۔ کے۔ لوتھین (۱۹۴۰-۱۸۸۲) چالیس سال پہلے ہندستان آئے تھے اور ۱۹۳۸ میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تقسیم اسناد کے جلسہ کی صدارت کی تھی۔ اس موقع پر انھوں نے اپنے خطبہ میں کہا تھا:

"یورپ اپنے سیاسی، معاشی، تمدنی اور عائلی مسائل کا تسلی بخش حل دریافت کرنے میں ناکام ہو چکا ہے۔ آپ حضرات کا دعویٰ ہے کہ اسلام زندگی کا مکمل دستور العمل ہے اور اس میں اجتماعی مسائل کا بہترین حل موجود ہے۔ میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ بلاد مغرب میں جا کر وہاں کے باشندوں کو اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کریں۔" (خطبہ تقسیم اسناد)

پروفیسر منٹگمری واٹ (- ۱۹۰۹) نے اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں مسلمانوں کی غیرت کو پکارا۔ پیغمبر اسلام کی سیرت پر اپنی کتاب میں انھوں نے لکھا:

"دنیا بہت تیزی سے ایک ہوتی جا رہی ہے اور اس ایک دنیا میں یہ رجحان بڑھ رہا ہے کہ اس کے اندر اتحاد اور یکسانیت ہو۔ اس رجحان کی وجہ سے یقیناً وہ دن آئے گا جب کہ یہاں اخلاقی اصولوں کا ایک ایسا نظام ہوگا جو نہ صرف عالمی جواز رکھتا ہوگا بلکہ فی الواقع وہ ساری دنیا میں تسلیم کیا جا چکا ہوگا۔ مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ محمدؐ تمام نوع انسانی کے لئے ایک عملی اور اخلاقی نمونہ ہیں۔ یہ کہہ کر وہ دنیا کو دعوت دے رہے ہیں کہ وہ ان پیرائے قائم کر سکے۔ اب تک یہ معاملہ دنیا کی بہت کم توجہ اپنی طرف مائل کر سکا ہے۔ مگر اسلام کی قوت کی وجہ سے یہ بالآخر اہمیت حاصل کرے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا محمدؐ کی زندگی اور تعلیمات میں سیکھنے کے قابل کچھ اصول ہیں جو مستقبل کی دنیا کو واحد اخلاقی نظام عطا کر سکیں۔

" دنیا کو ابھی تک اس سوال کا آخری جواب نہیں دیا گیا ہے۔ مسلمانوں نے محمد کے بارے میں اپنے دعوے کی تائید میں اب تک جو کچھ کہا ہے۔ وہ اس سلسلہ میں بس ایک ابتدائی بیان کی حیثیت رکھتا ہے اور بہت کم غیر مسلم

اس سے مطمئن ہو سکے ہیں۔ تاہم یہ موضوع ابھی کھلا ہوا ہے۔ دنیا کا ردعمل محمدؐ کے بارے میں کیا ہوتا ہے۔ یہ کسی حد تک اس پر منحصر ہے کہ آج کے مسلمان اس کے لئے کیا کرتے ہیں۔ انھیں اب بھی یہ موقع حاصل ہے کہ بقیہ دنیا کے سامنے اپنے مقدمہ کو زیادہ بہتر اور مکمل طور پر پیش کریں۔ کیا مسلمان یہ دکھا سکیں گے کہ ایک متحدہ دنیا کی اخلاقیات کے لئے محمدؐ کی زندگی ایک آئیڈیل انسان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر مسلمان اپنے مقدمہ کو بہتر طور پر پیش کر سکیں تو عیسائیوں میں وہ ایسے لوگ پائیں گے جو اس کو سننے کے لئے تیار ہیں۔" (صفحہ ۲۳۳)

Montgomery Watt, *Mohammad As Model For Universal Morality.*

اس طرح کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ مگر کیسی عجیب بات ہے۔ مسلمان اس پوری مدت میں مغربی قوموں سے سیاسی لڑائی تو لڑتے رہے جس میں مغرب صریح طور پر ان کے اوپر برتری رکھتا تھا۔ مگر فکری اور اعتقادی میدان، جو مغربی قوموں کا کمزور گوشہ تھا، وہاں ان پر کوئی جد و جہد نہ کی۔ نادانی کی ایسی عجیب و غریب مثال شاید پوری تاریخ میں کوئی دوسری نہیں ملے گی۔

فکری اور نظریاتی طاقت کی اہمیت کیا ہے، اس کی ایک مثال یہاں ہم خود جدید مغربی تاریخ سے پیش کریں گے۔ پہلی جنگ عظیم (۱۸-۱۹۱۴) کے دوران روس میں کمیونسٹوں کا غلبہ برطانیہ عظمیٰ کے لئے ایک سوالیہ نشان تھا۔ کیونکہ یہ برطانوی سلطنت کے "مشرقی حصہ" کے لئے خطرہ کے ہم معنی تھا۔ نومبر ۱۹۱۸ء میں انگریز فوجی افسروں کا ایک وفد صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے سمرقند پہنچا' اگرچہ بظاہر یہ بتایا گیا تھا کہ یہ ایک تجارتی وفد ہے اور وسط ایشیا کی کپاس کا سودا کرنے جا رہا ہے۔ وفد کے ممبران یہ تھے:

کرنل بیلی	F.M. Bailey
کرنل ایتھرٹن	P.T. Etherton
میجر بلیکر	L.V.S. Blacker

واپسی کے بعد کرنل ایتھرٹن نے ایک کتاب لکھی جس کا نام ہے "وسط ایشیا کے قلب میں"

In The Heart Of Central Asia

انھوں نے اپنی اس کتاب میں جو باتیں لکھیں، ان میں سے ایک یہ تھی:

The new set of ideas of the Bolsheviks was potentially much more of a menace to English domination in the Orient than all the Czar's armies in the past.

یعنی بالشویکوں کے نظریات بالقوہ طور پر برطانیہ کے مشرقی مقبوضات کے لئے اس سے زیادہ بڑا خطرہ ہیں جتنا کہ ماضی میں زار کی تمام فوجیں ہو سکتی تھیں۔ (۹۳-۹۲) اسلام جو رب العالمین کا بھیجا ہوا دین ہے، اس کی نظریاتی طاقت دوسرے تمام نظریات سے بے شمار گنا زیادہ ہے۔ اگر مسلمان اس کو لے کر اٹھیں تو ان کا تسخیری سیلاب اتنا بے پناہ ہوگا جس کے مقابلہ میں "بڑی طاقتوں" کی تمام فوجیں بھی عاجز ہو کر رہ جائیں۔

دنیا کی موجودہ آبادی تقریباً چار ارب ہے۔ ان میں سے دو آدمی ہر سکنڈ میں مر جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ۲۴ گھنٹے میں تقریباً ایک لاکھ ۷۳ ہزار آدمی اس دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں تاکہ خدا کے دربار میں حاضر ہو کر یہ گواہی دیں کہ باخبر کرنے والوں نے ہم کو حقیقت سے باخبر نہیں کیا ——— کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو کروروں انسانوں سے ان کی آخرت چھین رہے ہیں۔ مگر خود اپنے بارہ میں انھیں یقین ہے کہ ان کی آخرت کسی حال میں چھننے والی نہیں۔

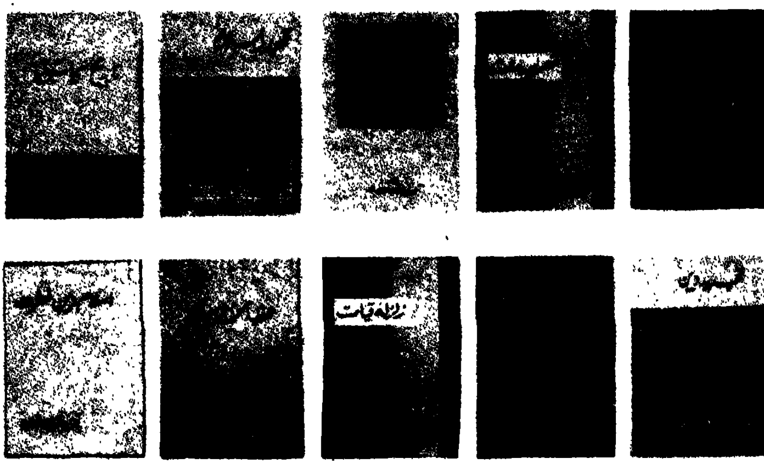
وہ شہر کی ایک پُر رونق سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔ لوگ پیدل اور سواریوں پر ادھر سے اُدھر جاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

"یہ نازک چہرے، یہ خوب صورت جسم، یہ ہنستی ہوئی مورتیں مرنے کے بعد بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈال دی جائیں گی" یہ سوچ کر بے اختیار اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اور پھر ایک آہ کے ساتھ اس کی زبان سے وہ الفاظ نکلے جن کو انسانوں کے سوا پوری کائنات نے سنا: "کیا اس سے بڑی کوئی بات ہے جس کے لئے آدمی تڑپے، کیا اس سے بڑی کوئی خبر ہے جس کو بتانے والے دوسروں کو بتائیں"

کیسی عجیب بات ہے۔ آدمی اُسی بات سے بے خبر ہے جس کو اسے سب سے زیادہ جاننا چاہئے۔ اُسی خبر کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے کوئی نہیں اٹھتا جس کو سب سے زیادہ دوسروں تک پہنچانے کی ضرورت ہے۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر



- **دین کیا ہے**
  صفحات ۳۲ قیمت ۱/۵۰ روپے
- **تجدیدِ دین**
  صفحات ۴۸ قیمت -/۲ روپے
- **مذہب اور جدید چیلنج**
  صفحات ۲۲۴ قیمت ۱۳/۵۰ روپے
- **تعمیرِ ملت**
  صفحات ۴۸ قیمت -/۲ روپے
- **الاسلام**
  صفحات ۱۶۷ قیمت -/۱۲ روپے
- **اسلام دینِ فطرت**
  صفحات ۴۸ قیمت -/۲ روپے
- **ظہورِ اسلام**
  صفحات ۲۰۰ قیمت -/۱۲ روپے
- **زلزلۂ قیامت**
  صفحات ۶۴ قیمت -/۳ روپے
- **اسلامی دعوت**
  صفحات ۴۸ قیمت -/۲ روپے
- **تاریخ کا سبق**
  صفحات ۴۸ قیمت -/۲ روپے
- **عقلیاتِ اسلام**
  صفحات ۴۸ قیمت -/۲ روپے
- **قرآن کا مطلوب انسان**
  صفحات ۸۰ قیمت -/۴ روپے

مکتبہ الرسالہ

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶

MAKTABA AL-RISALA ● JAMIAT BUILDING ● QASIMJAN STREET ● DELHI 110006

Al-Risala Monthly

Jamiat Building, Qasim'an Street, DELHI-110006 (INDIA)

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی سے شائع کیا

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

الرسالہ

شمارہ ۳۳ اگست ۱۹۷۹

جمعیۃ بلڈنگ □ قاسم جان اسٹریٹ □ دہلی- 110006

ایک مشہور مصنف کا واقعہ ہے۔ اس نے ایک ناول لکھا۔ یہ ناول غیر معمولی طور پر ضخیم تھا۔ اس کو دیکھ کر اس کے ایک دوست نے کہا ——— "اف اتنا لمبا ناول، اس کو لکھتے لکھتے تم اکتا نہیں گئے"۔ ناول نگار نے فوراً جواب دیا:

"ہرگز نہیں۔ میری توجہ ہمیشہ اگلے پیراگراف پر مرتکز رہتی تھی"

زندگی بھی اسی قسم کی ایک طویل اکتا دینے والی کہانی ہے جو ہماری کامیابیوں اور ناکامیوں کے واقعات کے ساتھ ہر آن لکھی جا رہی ہے۔ اس طویل اور خشک کہانی سے مسلسل دل چسپی باقی رکھنے کی واحد صورت یہ ہے کہ آدمی کی توجہ ہمیشہ کہانی کے اگلے پیراگراف پر جمی رہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ایک صاحب نے کہا "اب ہم اپنی طاقت کو استعمال ر کے اپنا مسئلہ حل کریں گے"۔ میں نے کہا کہ اس قسم ے الفاظ محض الفاظ ہیں جن کے کوئی معنی نہیں۔ کیوں کہ ستعمال سے پہلے صلاحیتِ استعمال درکار ہوتی ہے ور وہ ہمارے اندر موجود نہیں۔ کوئی عملی منصوبہ پہلے یک موافق زمین چاہتا ہے۔ موجودہ حالات میں سب سے پہلا کام یہ ہے کہ مسلمانوں میں آپس کی لڑائی ختم ہو کر اتحاد پیدا ہو۔ جہالت کی جگہ تعلیم بڑھے۔ جذباتیت کے بدلے حقیقت پسندی آئے۔ انتشار ختم ہو کر اطاعت کا جذبہ پیدا ہو۔ بے صبری کے بجائے لوگ برداشت کرنے والے بن جائیں۔ یہ چیزیں قوم کے اندر ایک درجہ میں آجائیں۔ اس کے بعد ہی کوئی عملی منصوبہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ ضروری حد تک یہ اوصاف پیدا کئے بغیر اقدام کا منصوبہ بنانا ایسا ہی ہے جیسے پل بننے سے پہلے کار کو دوڑا دینا۔

"اس انداز میں سوچنے والے اور کتنے لوگ ہیں" انھوں نے کہا۔ میں نے کہا کہ یہی تو مسئلہ ہے۔ فی الحال ایسے لوگ ضروری مقدار سے بہت کم ہیں اس لئے ہم کو پہلی کوشش اسی کی کرنی ہے۔ پھر میں نے بے تکلفی کے انداز میں کہا "الرسالہ میں اسی مزاج کو پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مگر آپ لوگ اس کی اشاعت کو بڑھانے کے لئے تعاون نہیں کرتے"۔

"آپ نے بھی کہاں کی بات کہاں جوڑ دی" انھوں نے کہا۔ مطلب یہ کہ کہاں اتنا بڑا عالمی مسئلہ اور کہاں الرسالہ۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری ناکامی کی سب سے بڑی وجہ ہمارا یہی مزاج ہے۔ آغاز جب بھی ہوگا چھوٹا ہوگا۔ مگر ہم "چھوٹے آغاز" سے شروع کرنا نہیں چاہتے اس لئے ہم آغاز بھی نہیں کر پاتے۔

مطالعۂ قرآن :

زیرِ نظر شمارہ سے ایک نیا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ یہ قرآن کے ترجمہ و تفسیر کا سلسلہ ہے۔ یہ موجودہ شکل میں انشاء اللہ مسلسل جاری رہے گا اور بعد کو اصل متن کے ساتھ دو یا زیادہ جلدوں میں شائع کر دیا جائے گا۔

ترجمہ نہ پوری طرح لفظی ہے اور نہ پوری طرح با محاورہ۔ بلکہ درمیان کی ایک صورت اختیار کی گئی ہے تاکہ دونوں پہلوؤں کی رعایت شامل رہے۔

تفسیر میں حتی الامکان تفصیلات سے اجتناب کیا جائے گا۔ زیادہ تر جو چیز پیش نظر رکھی گئی ہے وہ یہ کہ قرآن کی فطری سادگی اس کی تفسیر میں باقی رہے۔ قرآن ایک طرف خدا کے جلال کا اظہار ہے اور دوسری طرف انسان کی عبدیت کا آئینہ ہے۔ تفسیر میں بس انھیں پہلوؤں کو غیر فنی انداز میں نمایاں کرنا ہمارا مقصود ہوگا۔

اسلوب یہ رکھا گیا ہے کہ ہر صفحہ بذاتِ خود مکمل ہو۔ ہر صفحہ کے اوپر قرآن کے کسی ٹکڑے (پیراگراف) کا ترجمہ ہوگا جس کے آخر میں آیت نمبر درج ہوگا۔ اس کے بعد ایک لکیر دے کر نیچے کی سطروں میں سادہ انداز میں اس کی تشریح ہوگی۔

الرسالہ کی ہر اشاعت کے درمیانی صفحات میں یہ تفسیر شامل ہوگی۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہر شمارہ میں کم از کم ۸ صفحات تفسیر کے شامل کئے جائیں۔ تاہم اگر قارئین چاہیں گے تو اس مقدار میں تبدیلی کی جا سکتی ہے۔

قارئین سے گزارش ہے کہ اس کو دیکھنے کے بعد اپنی آراء سے مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ اس سے استفادہ کیا جا سکے۔

ابتدائی تیاریوں سے پہلے آگے کا کام نہیں کیا جا سکتا

جارج برنارڈ شا انگریزی زبان کا مشہور ادیب اور مفکر ہے۔ اس نے شیکسپیر سے اپنا مقابلہ کرتے ہوئے کہا ہے:

He was a much taller man than me. But I stand on his shoulders.

وہ مجھ سے بہت زیادہ لمبا انسان تھا مگر میں اس کے کندھے پر کھڑا ہوا ہوں۔ برنارڈ شا شیکسپیر کے مرنے کے تقریباً ڈھائی سو سال بعد ۱۸۵۶ میں پیدا ہوا۔ شیکسپیر (۱۶۱۶ — ۱۵۶۴) نے اپنے زمانہ میں انگریزی زبان کو جہاں پایا تھا اس پر اس نے اپنی کوششوں سے مزید اضافہ کیا۔ حتیٰ کہ اس کو ترقی کے ایک نئے مرحلہ میں پہنچا دیا۔ شیکسپیر کے بعد سیکڑوں اہل قلم پیدا ہوئے جو اس کو مزید آگے بڑھاتے رہے۔ یہاں تک کہ زبان اس اعلیٰ ترقی یافتہ مرحلہ تک پہنچ گئی جہاں سے برنارڈ شا کو موقع ملا کہ وہ اپنی قلمی جدوجہد کا آغاز کرے۔ برنارڈ شا کے پیش رووں نے اگر اس کے لئے "کندھا" فراہم نہ کیا ہوتا تو برنارڈ شا کے لئے ناممکن تھا کہ وہ ادبی ترقی کے اس بلند مقام پر پہنچے جہاں وہ اپنی کوششوں سے پہنچا۔

یہی اصول زندگی کے تمام معاملات میں جاری ہے۔ پچھلے لوگ جب ابتدائی منزلیں طے کر چکے ہوں، اسی وقت یہ ممکن ہے کہ بعد کے لوگ آگے کی منزلوں پر اپنا سفر جاری کریں۔ اگر پچھلے لوگوں نے اپنے حصہ کا کام نہ کیا ہو تو آگے آنے والوں کو آگے کے بجائے پیچھے سے اپنا سفر شروع کرنا پڑے گا۔ کیونکہ سفر ہمیشہ وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں آپ کھڑے ہوئے ہوں، نہ کہ وہاں سے جہاں آپ پہنچنا چاہتے ہیں۔ جس مکان کے نیچے کی دیواریں ابھی تیار نہ ہوئی ہوں اس مکان کی بالائی منزلیں کس چیز کے اوپر کھڑی کی جائیں گی۔

جو قوم ایک ایسے ماضی کی وارث ہو جس نے وراثت میں اپنی اگلی نسلوں کو صرف رومانی شاعری اور پرجوش تقریریں دی ہوں۔ جو غیر پختہ اقدامات کے نتیجہ میں بربادیوں سے دوچار ہوتی رہی ہو۔ جو جذباتی خوش فہمیوں کی غذا کھاتے کھاتے حقیقت پسندی کا مزاج کھو بیٹھی ہو۔ جس نے ابتدائی استحکام سے پہلے سیاست بازی میں پڑ کر اپنے مواقع کو ضائع کیا ہو۔ جو اپنی ہنگامہ آرائیوں کی وجہ سے تعلیم، صنعت، تجارت اور زمانی شعور میں تمام قوموں سے پیچھے ہو گئی ہو۔ جو مطالباتی مہموں اور احتجاجی سیاستوں میں یہ بھول گئی ہو کہ مانگنے سے پہلے منوانے کی طاقت پیدا کرنا ضروری ہے۔ ایسی پچھڑی ہوئی قوم کی اگلی نسلیں آگے کی منزل سے اپنا سفر شروع نہیں کر سکتیں۔ ان کو لامحالہ وہاں سے چلنا پڑے گا جہاں سے ان کے باپ دادا نے اپنے راستہ کو چھوڑا تھا۔ ایسے لوگ اگر دوبارہ لفظوں کی اسی بہادری میں مشغول ہو جائیں جس میں ان کے پیش رو مشغول تھے تو یہ صرف اس وقت کو مزید ضائع کرنے کے ہم معنی ہوگا جس کو ان کے باپ دادا بہت بڑی مقدار میں ضائع کر چکے ہیں۔ عملی نتیجہ صرف عملی کاموں کے ذریعہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ الفاظ کی کھیتی سے عمل کی فصل کاٹی نہیں جا سکتی۔ قدرت کو ایک درخت اگانا ہوتا ہے تو وہ بیج سے اپنا عمل شروع کرتی ہے۔ یہ قدرت کی طرف سے انسان کے لئے ایک خاموش سبق ہے — "بیج" سے چل کر کوئی بھی شخص "درخت" تک پہنچ سکتا ہے۔ مگر درخت سے چل کر درخت تک پہنچنا چاہیں تو ایسا واقعہ اس زمین پر کبھی نہیں ہوگا

غیر دینی کام پر دینی کام کا کریڈٹ لینا

وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُونَهُ فَنَبَذُوهُ وَرَآءَ ظُهُورِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُونَ ۝ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَفْرَحُونَ بِمَآ أَتَوْا وَيُحِبُّونَ أَنْ يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِنَ الْعَذَابِ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ (آل عمران ۸۸ - ۱۸۷)

اور جب اللہ نے اہل کتاب سے عہد لیا کہ تم اس کو لوگوں کے سامنے بیان کروگے اور اس کو نہ چھپاؤ گے۔ پھر انھوں نے اس عہد کو پس پشت ڈال دیا اور اس کے بدلہ میں مول لے لیا تھوڑا۔ کیسی بری چیز ہے جس کو وہ لے رہے ہیں۔ جو لوگ اپنے اس کام پر خوش ہیں اور چاہتے ہیں کہ بن کئے پر ان کی تعریف ہو، ان کو مت سمجھو کہ وہ عذاب سے بچاؤ میں رہیں گے اور ان کو دردناک سزا ہوگی۔

"بن کئے پر تعریف چاہنا" سے مراد ہے غیر دینی کام پر دینی کام کا کریڈٹ لینا۔ قومی اور دنیوی محرکات کے تحت سرگرمی دکھانا اور اس کے حق میں کتاب الٰہی کے حوالے اس طرح پیش کرنا گویا یہ سب کچھ دین خداوندی کے احیار کے لئے کیا جارہا ہے۔ اس طرح کا مظاہرہ کرنے والے اس خوش گمانی میں مبتلا نہ ہوں کہ وہ خدا کے یہاں دین داری کا انعام پائیں گے اور ان کو بے دینوں کے زمرہ میں شامل نہ کیا جائے گا۔ ان کے نمائشی کام ان کو خدا کی پکڑ سے بچانے والے ثابت نہیں ہوسکتے۔

ان آیتوں میں یہود کے کردار پر تنقید ہے۔ یہود نے اپنی مذہبی کتاب تورات کو ترک نہیں کیا تھا اور نہ اس کے تذکرہ کو چھوڑ رکھا تھا۔ ان کے یہاں تورات پڑھنے پڑھانے کا رواج تھا۔ اپنی تقریبات اور رسوم کو وہ مذہبی انداز سے انجام دیتے تھے۔ نبیوں اور بزرگوں کے قصے بے شمار تعداد میں ان کے درمیان پھیلے ہوئے تھے۔ مذہبی علمار کثرت سے ان کے درمیان موجود تھے۔ وہ جو کچھ کر رہے تھے سب دین یہود کے نام پر کر رہے تھے۔ حتیٰ کہ اپنے دنیوی اور قومی کاموں کے ذیل میں بھی کتب مقدسہ کے حوالے دیتے تھے۔ مگر باعتبار حقیقت یہ دین یہود کا استحصال تھا نہ کہ اس پر عمل کرنا۔ تورات کی حیثیت ان کے نزدیک رہنما کتاب کی نہیں رہ گئی تھی۔ بلکہ وہ ایک ایسی کتاب تھی جو ان کے لئے فخر کا نشان ہو اور ان کی قومی سرگرمیوں کو سند جواز عطا کرے۔

انھوں نے عقیدہ بنایا کہ اسرائیلی نسل کے تمام لوگ جنت میں جائیں گے اور اس کے لئے ان کو اپنے دین میں دلیل مل گئی (آل عمران) اپنی جاہلیت کی زندگی کے نتیجہ میں پیش آنے والے مصائب کی خاطر وہ قومی فنڈ قائم کرتے اور اس کی اہمیت ثابت کرنے کے لئے تورات کا حکم پیش کرتے (بقرہ ۸۵) وہ اپنے علمار اور بزرگوں کے پیچھے چلتے اور اپنی اس شخصیت پرستی کو خدا پرستی کا نام دے دیتے (توبہ ۳۱) حتیٰ کہ انھوں نے نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو ماننے سے انکار کیا اور اپنے کو برسرحق ثابت کرنے کے لئے تورات سے دلیل پیش کی (آل عمران ۱۸۳) یہودیوں کی صہیونی تحریک جو تمام تر قومی احیار کی تحریک ہے، اس کے لئے بھی ان کو دلائل تورات ہی کے صفحات سے مل رہے ہیں۔ کیوں کہ ان کے

نزدیک یہ اس وعدہ الٰہی کو پانے کی کوشش ہے جو خداوند نے اپنی کتاب میں ان کے لئے لکھ دیا ہے۔۔۔ ـــــ یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن میں آیات اللہ کو دے کر "ثمن قلیل" لینا کہا گیا ہے۔ یعنی دنیوی سرگرمیوں اور قومی تحریکوں کے لئے آسمانی سند پیش کرنا، احیاء دین کا نام لینا اور احیاء قوم کے کام میں مشغول رہنا، اللہ کی کتاب کو پڑھنا پڑھانا مگر عملاً مقصود یہ ہونا کہ قوم کے اندر مذہبی قیادت حاصل ہو جائے۔

یہود کے سپرد جو مشن کیا گیا، وہ یہ تھا کہ وہ اللہ کی دی ہوئی کتاب کو اس کی اصل صورت میں لوگوں کے سامنے بیان کریں گے۔ وہ توحید کی تعلیمات سے دنیا والوں کو باخبر کریں گے۔ یہ وہی چیز تھی جس کو دعوت الی اللہ یا شہادت علی الناس کے نام سے امت محمدی پر فرض کیا گیا ہے۔ یہ ایک خالص اخروی کام ہے اور اس کو اخروی انداز ہی میں انجام دینا ہے۔ مگر یہود نے دعوت آخرت اور پیغام توحید کے مشن کو چھوڑ دیا۔ عام قوموں کی طرح انھوں نے ایک دنیادارانہ زندگی اختیار کر لی۔ البتہ اس کے ساتھ وہ تورات کا درس اس طرح دیتے رہے گویا کتاب اللہ کی رسی ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹی ہے۔ گویا وہ جو کچھ کر رہے ہیں عین خدا کے حکم کے تحت کر رہے ہیں۔ تورات کی تعلیمات کی انھوں نے ایسی تشریح و تعبیر کی جو ان کی اپنی خود ساختہ زندگی پر چسپاں ہوتی ہو اور اس کی تصدیق کر رہی ہو۔ انھوں نے تعمیل نفس کا کام کیا اور اس پر تعمیل خداوندی کا لیبل لگا دیا۔ انھوں نے قومی احیاء کی سرگرمیوں کو دینی احیاء کی سرگرمیوں کا مقام دے دیا۔ انھوں نے قیادتی عزائم کے تحت تحریکیں اٹھائیں اور ان کو یہ حیثیت دے دی گویا یہ سب خداوند عالم کا بول بالا کرنے کے لئے کیا جا رہا ہے۔ ایسے لوگ گویا ایک ایسے کام کا کریڈٹ لینا چاہتے ہیں جس کو انھوں نے حقیقۃً کیا نہیں۔ اس قسم کا دھوکا خدا کے یہاں نہیں چل سکتا۔ ان کے نمائشی کام ان کو خدا کے یہاں بچانے والے ثابت نہ ہوں گے۔ اپنی تمام خوش فہمیوں کے باوجود وہ اسی آگ کے عذاب میں ڈال دیئے جائیں گے جس کو وہ صرف دوسروں کے لئے سمجھتے تھے۔

دعوت حق کا کام خالص اخروی کام ہے۔ یہ کام صرف وہی گروہ انجام دے سکتا ہے جو آخرت کی سطح پر جی رہا ہو۔ جو لوگ خود اپنے لئے جنت اور جہنم کو سب سے بڑا مسئلہ بنائے ہوئے ہوں وہی محسوس کر سکتے ہیں کہ سب سے بڑا کام یہ ہے کہ لوگوں کو جنت اور جہنم کے مسئلہ سے آگاہ کیا جائے۔ کتاب آسمانی کے حامل گروہ پر جب زوال آتا ہے تو وہ دنیا کی سطح پر جینے لگتا ہے۔ اب دنیا کی عزت و ذلت اس کے لئے سب سے بڑی چیز بن جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ "انذار آخرت" کے کام کا محرک اس کے اندر باقی نہیں رہتا۔ اب وہ خدا کے دین کو اپنی دنیوی زندگی کی سطح پر اتار لاتا ہے۔ وہ اپنی قومی تحریکوں کو پیغمبرانہ تحریک کا عنوان دیتا ہے۔ وہ اپنے دنیوی مسائل کے لئے اٹھتا ہے اور اس کو آسمانی ہدایت کی اصطلاحات میں بیان کرتا ہے۔ وہ مادی مقاصد کے لئے ہنگامے کھڑے کرتا ہے اور اس کو خدا کی راہ میں جہاد کرنا بتاتا ہے۔ وہ اپنی لیڈری کو بچانے کے لئے اٹھتا ہے اور نعرہ یہ لگاتا ہے کہ "ملک و ملت کو بچاؤ" ـــــ

یہ سب گویا بن کئے پر کئے کی تعریف چاہنا ہے۔ مگر اس قسم کی کوشش کسی کو صرف سزا کا مستحق بناتی ہے نہ کہ انعام کا۔ (۱۳ جون ۱۹۷۹)

"لوگ طاقتور سے دبتے ہیں اور کمزوروں کے اوپر شیر بنتے ہیں" ایک شخص نے کہا "پھر اللہ نے کمزوروں کو کیوں پیدا کیا۔ اس نے کیوں ایسے انسان پیدا کئے جن کے اوپر کتے بھونکیں اور بھیڑئے جن کو اپنی شیطانی ہوس کا شکار بنائیں" دوسرے شخص نے جواب دیا "کمزور اس لئے پیدا کئے گئے ہیں تاکہ خدا ان کے ذریعہ سے لوگوں کے ایمان کو جانچے۔ جو لوگ دنیا میں کمزوروں پر رحم کرتے ہیں، خدا قیامت کے دن ان پر رحم کرے گا۔ جو لوگ کمزوروں پر ظلم کرتے ہیں، خدا ان پر غضب ناک ہوگا اور ان کو دائمی عذاب میں ڈال دے گا۔ کم زور لوگ خدا کے خاص بندے ہیں۔ وہ لوگوں کو جنت اور جہنم کا سرٹیفکٹ تقسیم کر رہے ہیں" (۲۴ جنوری ۱۹۷۹)

شریر کچلے جائیں گے

مالی نے ایک باغ لگایا۔ باغ میں کچھ شیشم اور چنار جیسے درخت تھے۔ وہ اپنے موٹے تنے اور پھیلی ہوئی شاخوں کے ساتھ زمین پر اس طرح جمے ہوئے تھے کہ ہاتھی بھی ان کو اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتا تھا۔ اسی کے ساتھ باغ میں کچھ پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ یہاں مالی نے چھوٹے پودے لگا رکھے تھے۔ ان پودوں کے تنے کمزور تھے۔ ان کی شاخیں بہت نازک تھیں۔ دونوں قسم کے درخت بظاہر مختلف ہونے کے باوجود مالی کی اسکیم میں یکساں طور پر شامل تھے۔ وہ اپنے آپ نہیں اگ آئے تھے۔ بلکہ مالی نے ایک ایک پودے کو اپنی پسند کے تحت لگایا تھا۔ بعض مصلحتوں کی بنا پر اگر اس نے بھاری بھرکم درخت لگائے تھے تو بعض دوسری مصلحتوں کی خاطر اسی نے باغ کے کمزور پودوں کا انتخاب کیا تھا۔

کچھ شریر لوگ باغ کے اندر گھس آئے۔ انھوں نے مالی کو نہیں دیکھا۔ انھوں نے سمجھا کہ یہ ایک خالی باغ ہے اور یہاں وہ جو کچھ چاہیں کر سکتے ہیں۔ شیشم اور چنار کی قسم کے درختوں کا تو وہ کچھ بگاڑ نہیں سکتے تھے، اس لئے ان کو دیکھ کر وہ آگے بڑھ گئے۔ مگر پھولوں کے نرم و نازک پودوں کی بابت انھوں نے سمجھا کہ وہ ان پر قابو یافتہ ہیں۔ وہ ان کو اپنی شرارتوں کا تختۂ مشق بنا سکتے ہیں۔ پودے نہ اپنا بچاؤ کر سکتے تھے اور نہ شریروں کا ہاتھ پکڑ سکتے تھے۔ انھوں نے سمجھا کہ ان کے اوپر ان کا کوئی سرپرست نہیں ہے۔ یہ شریر ان نازک پودوں کے اوپر ٹوٹ پڑے۔ انھوں نے کچھ پودوں کو جڑ سے اکھاڑا۔ کچھ کے پھول توڑ ڈالے۔ کچھ کی شاخوں اور پتیوں کو ویران کر دیا۔

وہ قہقہے لگا رہے تھے اور خوشیاں منا رہے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہم فاتح ہیں۔ ہم نے اپنی بڑائی قائم کر لی ہے۔ اتنے میں مالی اپنے تمام آدمیوں کے ساتھ باغ میں آپہنچا۔ "تم نے جو کچھ کیا ہے میرے پودوں کے ساتھ نہیں کیا بلکہ خود میرے ساتھ کیا ہے" وہ گرج دار آواز میں بولا "میرے ہاتھ کی لگائی ہوئی کلیوں کو مسل کر تم نے میری توہین کی ہے۔ آج میں تم کو تمھاری شرارت کا مزا چکھاؤں گا" یہ کہہ کر اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ ان میں سے ایک ایک شخص کو پکڑو اور ان کا سر توڑ ڈالو" انھوں نے میرے کمزوروں پر رحم نہیں کیا اس لئے آج میں بھی ان پر رحم نہیں کروں گا" وہی شریر جو ایک لمحہ پہلے تک بہادر بنے ہوئے تھے۔ جن کے پاس الفاظ کا لامتناہی ذخیرہ موجود تھا۔ جو اپنی غلطی تسلیم کرنے کے لئے کسی قیمت پر تیار نہ تھے، اچانک

بالکل ڈھ پڑے۔ اب وہ معافی مانگ رہے تھے اور اپنے جرم کا اقرار کر رہے تھے۔ مگر وہاں کوئی نہ تھا جو ان کی فریاد کو سنے۔ وہ ذلت کی مار کھاتے رہے اور اپنے کئے کی سزا بھگتتے رہے (۸ جون ۱۹۷۹)

دنیا اور آخرت کی مثال بھی ایسی ہی ہے جیسے مالی اور باغ کی مثال۔ اللہ نے ایک بہترین دنیا بنائی۔ اس میں طرح طرح کے انسان پیدا کئے۔ کوئی طاقت ور کوئی کمزور۔ دونوں قسم کے انسان خدا کی تخلیق تھے۔ دونوں کو خدا نے اپنی حکمتوں اور مصلحتوں کے تحت بنایا تھا۔ ہر ایک کی جان و مال اور اس کی عزت و آبرو قابل احترام تھی۔ ہر ایک خدا کا حرم تھا۔ مگر شریروں کو یہاں خدا نظر نہ آیا، وہ سمجھے کہ یہ ایک خالی باغ ہے۔ اس کا کوئی مالک اور سرپرست نہیں۔ وہ طاقتور انسانوں کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تھے۔ ان کو انھوں نے چھوڑ دیا۔ وہ اپنے کبر کی تسکین اور اپنے شرارتی منصوبوں کی تکمیل کے لئے کمزور انسانوں پر ٹوٹ پڑے۔ جو کمزور بھی ان کی زد میں آیا، اس کی پھلواری کو انھوں نے ویران کیا۔ اس پر ہر قسم کی بیہودگی کو اپنے لئے جائز کر لیا۔

شریر اپنے شیطانی مشغلوں میں مصروف تھے۔ وہ فاتحانہ قہقہے لگا رہے تھے کہ اچانک زمین و آسمان کا پردہ پھٹا۔ کائنات کا مالک اپنے تمام جلال و جبروت کے ساتھ سامنے آگیا۔ اس کی آواز سے تمام مخلوقات سہم اٹھیں۔ شریر اس کو دیکھتے ہی گھٹنوں کے بل گر پڑے۔ وہ رو رہے تھے اور معافی مانگ رہے تھے مگر خدا ان کے اوپر اتنا غضب ناک تھا کہ اس نے ان کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ ان میں بدنام قسم کے ڈاکو اور سرکش بھی تھے اور وہ بھی تھے جو دنیا میں مذہب کی گدیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ جو اخلاق اور انسانیت کے چیمپین بنے ہوئے تھے۔ جو "ملک و قوم" کے ناخدا کہے جاتے تھے۔ مگر خدا سب پر یکساں غضب ناک تھا۔ کیوں کہ ہر ایک نے دنیا میں گھمنڈ کیا تھا۔ ہر ایک نے خدا کی ننھی کلیوں کو مسلا تھا۔ خدا نے حکم دیا کہ ان سب کو ایک زنجیر میں باندھو اور ان کو ابدی محرومی کے گڑھے میں دھکیل دو۔ وہ چیختے رہے اور فریاد کرتے رہے۔ مگر وہاں کوئی نہ تھا جو ان کی فریاد کو سنے۔ خدا کے فرشتوں کے ہاتھوں زیر کر کے وہ رسوائی اور ناکامی کے اس گڑھے میں پہنچا دئے گئے جو خدا نے سرکشوں اور متکبروں کے لئے پہلے سے بنا رکھی تھی۔

کسی درخت کی پتی، اس کا پھول اور اس کا پھل درخت کا سب سے زیادہ کمزور حصہ ہوتے ہیں۔ مگر ایک شخص جب پتیوں کے حسن، پھولوں کی رنگ کاری اور پھلوں کی لطافت پر غور کرتا ہے تو اس کو محسوس ہوتا ہے کہ درخت کے یہ نرم و نازک حصے اس کے مضبوط تنے اور شاخوں سے زیادہ قدرت کی توجہ کا مستحق رہے ہیں۔ یہ خدا کی خاموش دنیا کا ایک اشارہ ہے جو بتلاتا ہے کہ انسان سے خدا کو کیا مطلوب ہے ــــــــــ لوگ طاقتور "تنوں" پر اپنے حسن سلوک کا ثبوت دے رہے ہیں حالانکہ ان کا خدا ان سے "پھولوں" اور "پتیوں" کی سطح پر حسن سلوک کا نذرانہ مانگ رہا ہے۔ لوگ "بڑوں" کا استقبال کر کے اپنی شرافت اور انسانیت کا مظاہرہ کر رہے ہیں، حالاں کہ خدا جہاں ان کی شرافت اور انسانیت کو دیکھنے کا منتظر ہے وہ اس کے وہ بندے ہیں جن کو "چھوٹا" سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ لوگ شہرت کے مواقع پر پیسہ دے کر فیاضی کا ٹائٹل لے رہے ہیں۔ حالاں کہ خدا کے یہاں فیاضی کا ٹائٹل اس کو ملتا ہے جو ایسے مواقع پر پیسہ دے جہاں جیب خالی کر کے بھی شہرت حاصل نہیں ہوتی

روزہ محتاط زندگی کی مشق ہے

ایک شخص جو زندگی کا مطلب یہ سمجھتا ہو کہ "جسم کو تندرست رکھو، کھاؤ پیو اور خوش رہو"، اس کی سمجھ میں روزہ کا فائدہ نہیں آتا۔ وہ کہتا ہے کہ آخر روزہ کی ضرورت کیا ہے اور اس کو اسلام میں کیوں فرض کیا گیا ہے۔ ایک عام دنیا پرست کے سامنے زندگی کا جو نقشہ ہوتا ہے اس میں روزہ کا جوڑ بیٹھتا ہوا نظر نہیں آتا۔ وہ یا تو سرے سے روزہ نہیں رکھتا اور اگر روایتی اثرات کے تحت رکھتا بھی ہے تو وہ اس کی اصل زندگی کے ساتھ ایک بے جوڑ ضمیمہ کی مانند رہتا ہے، وہ اس کی شعوری ہستی کا جزء نہیں بنتا۔ حالاں کہ حقیقی روزہ وہ ہے جو محض روایتی ضمیمہ نہ ہو بلکہ آدمی کے پورے وجود میں شامل ہو جائے۔

اگر چہ تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ روزہ کے اندر گہرے طبی فوائد بھی ہیں ۔ خاص طور پر قلب کی بیماریوں کے لئے یہ ایک نہایت کارگر حفاظتی تدبیر ہے۔ مگر اس قسم کے فوائد کا انکار نہ کرتے ہوئے ہم کہیں گے کہ یہ روزہ کا اصل مقصود نہیں ہے۔ یہ اس کے مختلف ضمنی فوائد میں سے ایک فائدہ ہے۔ روزہ اصلاً ایک بہت بڑی حکمت کے لئے مقرر کیا گیا ہے، ایک ایسی حکمت جو آدمی کو حاصل نہ ہو تو اس کی ساری زندگی اکارت ہو کر رہ جائے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ روزہ فرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے اندر تقویٰ پیدا ہو (بقرہ ۱۸۳) عربی زبان میں تقویٰ کا مطلب ہے بچنا، پرہیز کرنا۔ فرس تَّقِي اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو پاؤں میں تکلیف کی وجہ سے چلنے سے ڈرے۔ متقی کا لفظ زیادہ جامع طور پر تقریباً اسی مفہوم کے لئے بولا جاتا ہے جس کے لئے محتاط (Cautious) کا لفظ بولا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ روزہ کا مقصد آدمی کے اندر اس نفسیاتی حالت کو بیدار کرنا ہے جس کو ہم اپنی زبان میں پردا، کھٹک اور احتیاط سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہی صفت قرآن کی بھی بتائی گئی ہے (ذٰلك الكتاب لاريب فيه هدى للمتقين) یعنی اس کتاب میں ان لوگوں کے لئے رہنمائی ہے جن کے دلوں میں کھٹک ہو۔ جو اس بات کے لئے اندیشہ میں رہتے ہوں کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا۔ تاکہ جو غلط ہے اس کو چھوڑ دیں اور جو صحیح ہے اس کو اپنے لئے اختیار کرلیں۔ یہی تقویٰ یا کھٹک کی حالت ساری نیکیوں کی بنیاد ہے۔ کیونکہ جس کو کھٹک ہو وہی اس کے بارے میں سنجیدہ ہو گا کہ وہ غلط کو چھوڑ دے اور صحیح پر چلنے کا اہتمام کرے۔ جس کے دل میں کھٹک ہی نہ ہو وہ اس قسم کی تمیز کرنے کی ضرورت کیوں سمجھے گا۔ وہ تو صرف اپنی خواہشوں پر چلے گا۔ ظاہری طور پر دیکھنے میں جو چیز اس کو پسند آئے گی، اس کو لے لے گا، خواہ وہ چیز صحیح ہو یا غلط۔

روزہ یہی کھٹک کی حالت پیدا کرنے کی ایک تدبیر ہے۔ روزہ کے ذریعہ آدمی کی روزانہ زندگی میں یہ بات شامل کر دی جاتی ہے کہ وہ اپنے روز و شب کے معاملات کو "کھٹک" کی نظر سے دیکھے۔ یہ ایک مشق ہے جو شعبان کی ۲۹ تاریخ سے شروع ہو جاتی ہے۔ ۲۹ شعبان کی شام کو آدمی کی نظریں آسمان میں چاند دیکھنے کے لئے گڑ جاتی ہیں کہ کہیں وہ گردش زمین کے اس لمحہ میں تو داخل نہیں ہو گیا ہے جب کہ اس کو اپنی زندگی کے نقشہ کو بالکل بدل دینا ہے

سحر کب ہوتی ہے اور سورج کب غروب ہوتا ہے، اس کو ٹھیک ٹھیک جاننے کے لئے وہ فکرمند رہتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اپنی زندگی کے نظام میں اس کو ان کی رعایت کرتے ہوئے چلنا ہے۔ دیگر ایام میں بھوک اور خواہش اس کی رہنما تھی مگر اب اس کو نہایت صحت کے ساتھ یہ جاننا پڑتا ہے کہ کتنے بج کر کتنے منٹ پر کھانا پینا ہے اور کتنے بج کر کتنے منٹ کے بعد کھانا پینا بالکل بند کر دینا ہے۔ جو دن پہلے کسی احتیاط اور اندیشہ کے بغیر گزرتے تھے، انھیں دنوں کے بارے میں اب وہ یہ مسئلہ جاننا ضروری سمجھنے لگتا ہے کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے، کیا کھانا ہے اور کیا نہیں کھانا ہے، ایسا نہ کرو ورنہ روزہ ٹوٹ جائے گا۔ ویسا نہ کرو ورنہ روزہ رکھ کر بھی تم بے روزہ ہو جاؤ گے۔ غرض ایک مہینے تک تمام رات اور تمام دن اس مشق میں گزر جاتے ہیں کہ آدمی کہاں تک جا سکتا ہے اور کہاں تک نہیں جا سکتا۔ اس کو کس طرح رہنا چاہئے اور کس طرح نہیں رہنا چاہئے۔ روزہ کا مقصد یہ ہے کہ آدمی کے روزمرہ کے معمولات میں "کیا کر سکتے ہو، کیا نہیں کر سکتے" کا مسئلہ کھڑا کر کے اس کو تیار کیا جائے کہ وہ اسی کو اپنا مستقل مزاج بنا لے۔ یہ کھٹک کی زندگی ہی ایمانی زندگی ہے اور یہی ساری عمر کے لئے مومن سے مطلوب ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روزہ کی جو دعائیں منقول ہیں وہ اس کیفیت کو بتاتی ہیں جو روزہ کے ذریعہ انسانی نفسیات میں پیدا کرنا مقصود ہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ پورا کرنے کے بعد شام کو جب آپ افطار فرماتے تو آپ کی زبان سے کچھ دعائیہ کلمات نکلتے۔ اس سلسلہ میں حدیث کی کتابوں میں مختلف دعائیں آئی ہیں۔ یہاں مسئلہ کو سمجھنے کے لئے چند دعائیں نقل کی جاتی ہیں۔

الحمد للہ الذی اعاننی فصمت ورزقنی فافطرت	شکر اللہ کے لئے ہے جس نے مدد کی تو میں نے روزہ رکھا اور جس نے رزق دیا تو میں نے افطار کیا۔
اللّٰھم لک صمنا و علیٰ رزقک افطرنا فتقبل منا انک انت السمیع العلیم	اے اللہ ہم نے تیرے ہی لئے روزہ رکھا اور تیرے ہی رزق سے افطار کیا۔ تو ہمارے روزے کو قبول فرمالے۔ یقیناً تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔
اللّٰھم لک صمت وعلیٰ رزقک افطرت	اے اللہ، میں نے تیرے ہی لئے روزہ رکھا اور تیرے ہی دئے ہوئے رزق سے افطار کیا۔
الحمد للہ ذھب الظمأ وابتلت العروق وثبت الاجر انشاء اللہ	شکر اللہ کا، پیاس بجھ گئی اور رگیں تر ہو گئیں اور اللہ نے چاہا تو اجر ضرور ملے گا۔

ان دعاؤں کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بس ان کو رٹ لیا جائے اور لفظی منتر کی طرح ان کو افطار کے وقت زبان سے دہرا دیا جائے۔ یہ دعائیں دراصل ان کیفیات کا اظہار ہیں جو بندہ مومن کے اندر روزہ رکھنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ ایک خدا کا بندہ خدا کے لئے دن بھر بھوکا پیاسا رہنے کے بعد شام کو جب کھانا اور پانی سے اپنے جسم کو شاد کام کرتا ہے اس وقت اس کے قلب میں اپنے رب کے بارے میں جو کیفیات امنڈتی ہیں، وہ کیفیات ان لفظوں کی صورت میں ڈھل گئی ہیں۔

یہ اور اس طرح کی دوسری دعائیں جو حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں، وہ سب سے زیادہ قیمتی ذریعہ یہ جاننے کا ہیں کہ روزہ کی حقیقت کیا ہے اور ہمیں اپنے روزہ کو کس معیار پر جانچنا چاہئے۔ وہ معیار یہ ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ وہ کیفیات جن کا ذکر ان دعائیہ کلمات میں ہے، وہ ہمارے اندر امنڈتی ہیں یا نہیں۔ اگر ہمارا روزہ ان کیفیات میں ڈھل رہا ہو تو ہمارا روزہ روزہ ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو ہم کو ڈرنا چاہئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے روزہ کو یہ کہہ کر ہماری طرف لوٹا دیا جائے ـــــ تمہارا روزہ تو محض کھانا پینا چھوڑنا تھا۔ اور جب آدمی غیر متقیانہ روش کو نہ چھوڑے تو خدا کو اس کی حاجت نہیں کہ کوئی شخص خواہ مخواہ اپنا کھانا پانی چھوڑ دے۔

سلیمان بن عامر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص افطار کرے تو اس کو چاہئے کہ کھجور سے افطار کرے۔ کیوں کہ اس میں برکت ہے۔ اور کھجور نہ پائے تو اس کو چاہئے کہ پانی سے افطار کرے کیونکہ وہ پاک ہے (احمد، ترمذی، ابو داؤد، ابن ماجہ، دارمی) اس طرح کی روایات روزہ کی ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ وہ یہ کہ مومن کو چاہئے کہ وہ سادہ اور فطری زندگی اختیار کرے۔ اور مصنوعی لوازم اور غیر ضروری تکلفات سے پرہیز کرے۔ پانی اور کھجور سے افطار دراصل سادہ اور فطری زندگی کی علامت ہے جس کی مشق عین اس وقت کرائی جاتی ہے جب کہ آدمی بھوک پیاس سے بے قرار ہونے کی وجہ سے سب سے زیادہ اس کے قریب ہوتا ہے کہ غیر سادہ اور غیر فطری زندگی پر ٹوٹ پڑے۔

دنیا میں اسلامی زندگی کو پانے کی واحد اور لازمی شرط یہ ہے کہ آدمی سادہ اور فطری زندگی پر اپنے کو راضی کرلے۔ سادہ زندگی آدمی کو ان غیر ضروری لوازم سے بچاتی ہے جن میں مشغول ہونے کے بعد وہ اس قابل ہی نہیں رہتا کہ وہ دین کے کاموں میں زیادہ توجہ دے سکے۔ سادہ زندگی ایک مومن کے لئے موجودہ دنیا میں وہی اہمیت رکھتی ہے جو ایک مریض کے لئے پرہیز کی اہمیت ہوتی ہے۔ سادہ زندگی، آدمی کو غیر ضروری تکلفات سے فارغ رکھ کر دین میں بھرپور حصہ لینے کے قابل بناتی ہے۔ اس کے برعکس غیر سادہ زندگی آدمی کو غیر ضروری مشاغل میں پھنسا کر دین سے دور کر دیتی ہے۔

یہی معاملہ فطری زندگی کا ہے۔ آدمی فطرت سے جتنا زیادہ قریب ہوگا اتنا ہی وہ خدا سے قریب ہوگا۔ آدمی جب کھجور اور پانی سے افطار کرتا ہے تو اس کو کھجور اور پانی کا خالق یاد آتا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ حلوہ اور مصنوعی مشروبات سے افطار کرے تو اس کو حلوہ بنانے والے اور مصنوعی مشروبات تیار کرنے والے یاد آتے ہیں۔ اول الذکر افطار اس کو خدائی صنعتوں کی یاد کی طرف لے جاتی ہے اور ثانی الذکر انسانی صنعتوں کی یاد کی طرف۔

روزہ کی حالت میں کسی کے منھ میں کھانا چلا جائے تو وہ سہم اٹھتا ہے کہ اس کا روزہ کہیں جاتا نہ رہے یہی تقویٰ ہے اور یہی کیفیت آدمی سے اس کے تمام معاملات میں مطلوب ہے۔ آدمی اپنے دل کو خدا کی یاد سے غافل پائے تو اس کو اندیشہ لگے کہ وہ خدا کی رحمتوں سے محروم تو نہیں ہوگیا ہے۔ وہ کسی کو حقیر و ذلیل سمجھتے ہوئے ڈرے کہ عزت و ذلت تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ کیا معلوم خدا اس کو عزت دے اور مجھ کو ذلیل کر دے۔ جب آدمی کے اوپر اس قسم کی فکرمندی چھاتی ہے تو قدرتی طور پر اس کی عادتیں سادہ ہو جاتی ہیں۔ وہ تکلفات سے دور ہو جاتا ہے۔ وہ فطرت کی سطح پر زندگی گزارنے لگتا ہے۔

عمل کی کمی کو الفاظ کی زیادتی سے پورا نہیں کیا جاسکتا

مسٹر سی۔ایس۔جھا اقوام متحدہ میں ہندوستان کے نمائندہ رہ چکے ہیں۔ اگست۔ستمبر ۱۹۶۵ میں ہند و پاک جنگ کے بعد تاشقند میں جو کانفرنس ہوئی، اس میں وہ شریک تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس کانفرنس میں سابق صدر محمد ایوب خاں کا رجحان مصالحت کی طرف تھا۔ مگر ذوالفقار علی بھٹو اور مسٹر عزیز احمد کا خیال تھا کہ ہندستان جب تک کشمیر کے معاملہ میں پاکستان کے موقف کو نہ تسلیم کرے، کوئی معاہدہ نہیں ہونا چاہئے۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں کہ ۶ جنوری ۱۹۶۶ کو روسی میزبانوں کی طرف سے کھانے کی ایک دعوت تھی۔ مسٹر عزیز احمد نے گفتگو کے دوران اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالا جس پر تین سطروں میں ایک عبارت لکھی ہوئی تھی۔ ان کے بیان کے مطابق یہ ان کی طرف سے مشترکہ اعلامیہ کا مجوزہ مضمون تھا۔ جو مسٹر بھٹو نے پنسل سے لکھا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ "طرفین نے کشمیر کے سوال پر تبادلہ خیال کیا اور اس پر متفق ہوئے کہ وہ اقوام متحدہ کے چارٹر اور اقوام متحدہ کے رزولیوشن کے مطابق پرامن حل کے لئے باہم گفتگو کریں گے"۔ اس کے بعد مسٹر جھا لکھتے ہیں: بظاہر اس کا مطلب یہ تھا کہ مسٹر بھٹو جس چیز کو جنگ کے ذریعہ حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں اس کو وہ تاشقند میں حاصل کر لینا چاہتے ہیں (السٹریٹڈ ویکلی ۶ مئی ۱۹۷۹)

It seemed that Bhutto wished to succeed in Tashkent
in what he had failed to achieve by war !

آخری جملہ میں مسٹر جھا نے جو تبصرہ کیا ہے، وہ موجودہ دور کی پوری مسلم سیاست پر صادق آتا ہے۔ ہمارے قائدین آج جس سیاست میں مشغول ہیں وہ ہر جگہ یہی ہے کہ میدان مقابلہ میں ہاری ہوئی بازی کو تقریروں اور تحریروں کے زور پر دوبارہ جیت لیں۔ عدم تیاری، ناقص منصوبہ بندی، اتحاد کی کمی، صورت حال کا غلط اندازہ، یہ وہ چیزیں ہیں جنھوں نے ہمارے قائدین کے بڑے بڑے اقدامات کو ناکام بنا دیا ہے۔ ان کے لئے دوسرا راستہ یہ تھا کہ اپنی غلطی کا اعتراف کرتے اور دوبارہ صحیح تیاری کرکے کھوئی ہوئی چیز کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ مگر وہ حیرت انگیز عبارت کے ساتھ الفاظ کو عمل کا قائم مقام بنانے میں مشغول ہیں۔

زندگی کے معاملات کا فیصلہ عمل کے میدان میں ہوتا ہے نہ کہ الفاظ کے میدان میں۔ عمل کے حقیقی میدان میں جو لوگ قیادتی اہلیت کا ثبوت نہ دے سکیں وہ اکثر بحث و گفتگو کی میز پر یا تقریر کے پنڈال میں لفظوں کے کرتب دکھا کر اپنے کو باعمل ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر اس قسم کی عملیت صرف آدمی کے جرم میں اضافہ کرتی ہے۔ ایک شخص جب حقیقی عمل امتحان میں ناکام ہو جائے تو اس کے لئے صحیح راستہ صرف یہ ہے کہ اپنی نااہلی کا اعتراف کرکے خاموش بیٹھ جائے یا پھر اپنے منصوبہ کی خامیوں کو درست کرکے دوبارہ صحیح تر انداز سے اس کی جدوجہد شروع کرے۔ اس کے بجائے لفظی کمالات کے ذریعہ عمل کا کریڈٹ لینے کی کوشش کرنا ایک ایسا فعل ہے جو نہ خدا کی نگاہ میں کوئی قیمت رکھتا ہے اور نہ بندوں کی نگاہ میں۔

جو کھوتا ہے وہی پائے گا

حدیث میں ہے کہ پیغمبروں کو دنیا کی زندگی میں سب سے زیادہ مصائب میں مبتلا کیا جاتا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء اور ان کے ساتھیوں کو ہر قسم کی تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ حتیٰ کہ وہ دنیا میں بے جگہ بنا دیئے گئے۔ اس سلسلے میں قرآن کے چند حوالے حسب ذیل ہیں:

ان کو ان کے گھروں سے نکالا گیا۔	آل عمران	۱۹۵
ان کو گم نامی کے غار میں ڈال دیا گیا	یوسف	۱۵
وہ اعزاز کے مقامات سے محروم ہو گئے	ہود	۶۲
ان کا مذاق اڑایا گیا	زخرف	۷
ان کو داعی حق کے بجائے ایک معمولی انسان سمجھا گیا	مومنون	۳۴
ان کو شاعر اور مجنون قرار دیا گیا	صافات	۳۶
لوگوں نے ان کو کم عقل اور جھوٹا جانا	اعراف	۶۶
ان کو اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور کیا گیا	ابراہیم	۱۳
زمین اپنی ساری کشادگی کے باوجود ان پر تنگ کر دی گئی	توبہ	۲۵

یہ تکلیفیں جو پیغمبروں پر ڈالی گئیں وہ یقیناً اللہ کے علم میں تھیں اور اللہ چاہتا تو اپنے نبیوں کو ان سے بچا سکتا تھا۔ مگر اللہ نے ایسا نہیں کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ داعی کے اندر جو اوصاف مطلوب ہیں وہ اس کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتے۔ قرآن کے الفاظ میں، داعی کے لئے ضروری ہے کہ وہ مقال (قوم کی زبان میں بولنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ وہ وطأ شدید (مزمل) کے مرحلہ سے گزرے۔ ایک روح جو حق کی راہ میں روندی گئی ہو، اسی کی زبان سے وہ مؤثر کلمات نکلتے ہیں جن کو خدا کے دین کی دعوت کہا جاتا ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت سے فلسطین کا ایک شخص متاثر ہوا۔ اس نے آپ کے پاس آکر کہا: اے استاد میں تیرے ساتھ رہوں گا اور جہاں کہیں تو جائے گا میں تیرے پیچھے چلوں گا۔ حضرت مسیح نے جواب دیا:

> لومڑیوں کے بھٹ ہوتے ہیں اور ہوا کے پرندوں کے گھونسلے۔ مگر ابن آدم کے لئے سر دھرنے کی بھی جگہ نہیں (متی ۸ : ۲۱ – ۲۰)

عیسائی روایات کے مطابق حضرت مسیح کے پاس اپنا کوئی گھر نہ تھا۔ وہ دن بھر وعظ و تلقین میں مشغول رہتے اور رات کو کہیں سو رہتے۔ یہی اکثر پیغمبروں کا حال رہا ہے۔ ایک اچھا گھر اس بات کی ایک علامت ہے کہ آدمی نے دنیا میں اپنی ایک زندگی بنائی ہے۔ مگر معروف معنوں میں ان کا کوئی "گھر" نہیں ہوتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں پیغمبر کی زندگی ایک ایسے سوار کی زندگی ہوتی ہے جو تھوڑی دیر دنیا کے کسی درخت کے سایہ میں ٹھہرے اور اس کے بعد

آخرت کی منزل کے لئے آگے روانہ ہوجائے ۔

انبیاء اور ان کے ساتھی "گھر" سے محروم کیوں رکھے گئے ۔ اس کا جواب ہم کو ایک حدیث میں ملتا ہے ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اللہ نے فرشتہ کے ذریعہ میرے پاس یہ پیغام بھیجا کہ مکہ کی وادی کو تمھارے لئے سونا بنا دیا جائے ۔ میں نے کہا اے میرے رب نہیں ۔ بلکہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ایک روز کھاؤں اور ایک روز بھوکا رہوں ۔ تاکہ جب بھوک ستائے تو میں تجھ سے عاجزی کروں اور جب مجھے سیری حاصل ہو تو میں تیرا شکر کروں اور تیری تعریف کروں" ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حالات کے بغیر کیفیات پیدا نہیں ہوسکتیں ۔ انبیاء دنیا کی زندگی میں "گھر والے" نہیں بنائے گئے ۔ انھوں نے دنیا کے سرد و گرم کے درمیان بے گھر ہونے کا مزہ چکھا تاکہ آخرت کے گھر کی تڑپ ان کے اندر کمال درجہ میں پیدا ہو ۔ آخرت میں بے جگہ ہوجانے کی حقیقت ان کے اوپر پوری طرح کھل جائے ۔ جنت کے مکانات سے محرومی کے بعد انسان کا کیا حال ہوگا ، اس کا احساس ان کے اندر شدت سے ابھر آئے ۔ پیغمبروں کا مشن یہ تھا کہ وہ دنیا والوں کو آخرت کے معاملہ کی سنگینی سے پوری طرح باخبر کردیں ۔ وہ لوگوں کو بتادیں کہ جو شخص آخرت میں بے گھر ہوگیا ، اس کے لئے ابدی عذاب کے سوا اور کچھ نہیں ۔ اس قسم کی ایک دعوت وہی شخص دے سکتا ہے جو موت سے پہلے موت کے بعد کے احوال کو دیکھنے لگا ہو ۔ جو شخص اس مقام پر نہ ہو اس کے کلام میں آخرت کی ٹیسیں شامل نہیں ہوسکتیں اور جس کے کلام میں آخرت کی ٹیسیں شامل نہ ہوں اس کا آخرت کی پیغام رسانی کے لئے اٹھنا ایک قسم کی شاعری ہے نہ کہ حقیقی معنوں میں دعوت ۔ ایسا داعی اس شخص کی مانند نہیں ہوسکتا جو ایک منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور پھر دوسروں کو اسے دکھاتا ہے ۔

اگرچہ آدمی کے عجز کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے رب سے عافیت مانگے ۔ وہ ہمیشہ یہ التجا کرے کہ اللہ اس کو کسی مشکل میں نہ ڈالے ۔ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ آدمی کی خدا پرستی جب تک اس کو اپنی طرف اس طرح نہ کھینچ لے کہ دوسری تمام مصلحتوں کے سرے اس کے ہاتھ سے چھوٹ جائیں ، وہ حقیقی معنوں میں خدا والا نہیں بن سکتا ۔ جب تک اس کا یہ حال نہ ہو کہ آخرت کے شوق میں اس کی دنیا برباد ہوجائے ، اس وقت تک وہ اگلی دنیا کی تجلیات کا مشاہدہ نہیں کرسکتا ۔ جب تک اس کی جنت کی طلب اس درجہ کو نہ پہنچ جائے کہ دنیا میں گھر بنانا اس کو یاد نہ رہے ، اس وقت تک وہ جنت کی حقیقت سے آشنا نہیں ہوسکتا ۔ دنیا میں خانہ بربادی کا تجربہ کرنے کے بعد ہی آدمی آخرت میں خانہ آبادی کی اہمیت اور معنویت کو سمجھتا ہے ۔ اس کے بعد ہی اس کے اندر وہ داعیانہ سنجیدگی پیدا ہوتی ہے جو اس کو آخرت کا منذر اور مبشر بنا سکے ۔ داعی کا کلام آخرت میں بسا ہوا کلام ہوتا ہے اور کوئی شخص جب تک آخرت کی طلب میں اس انتہا تک نہ جائے کہ اس کی خاطر اس کی زندگی برباد ہوجائے ، وہ آخرت میں بسے ہوئے الفاظ میں کلام نہیں کرسکتا ۔

گھر کا لفظ ابتدائی طور پر اس در و دیوار کے لئے بولا جاتا ہے جہاں آدمی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روز و شب گزارتا ہے ۔ مگر اس کے آگے آدمی کا ایک اور گھر ہے ۔ یہ اعوان و انصار کا وہ حلقہ ہے جو کسی کے لئے دوستوں اور رشتہ داروں کے ذریعہ بنتا ہے اور کسی کے لئے اس کے معتقدین اور متاثرین کے ذریعہ ۔ کسی کے لئے گاہکوں (Clients) اور چندہ دہندگان کے ذریعہ بنتا ہے اور کسی کے لئے تالیاں بجانے والے اور استقبال کرنے والے عوام کے ذریعہ ۔ یہ حلقہ یا دائرہ

خواص کے لئے اتنا ہی اہم ہوتا ہے جتنا ایک عام آدمی کے لئے ایک اچھا گھر۔ کوئی قائد ایسے ایک حلقہ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس لئے جب کسی خوش قسمت انسان کے گرد ایسا حلقہ بن جائے تو ہر قیمت پر وہ اس کو باقی رکھنا ضروری خیال کرتا ہے۔ حالاں کہ یہ "حلقہ" ہی وہ چیز ہے جو خواص کے لئے سب سے زیادہ قاتل ثابت ہوتا ہے۔

ایک آدمی جب آخرت کے لئے فکرمند ہوتا ہے تو وہ دنیا میں اپنے گھر کو برباد کر لیتا ہے۔ یہی معاملہ خواص کے ساتھ پیش آتا ہے۔ جو شخص حقیقی معنوں میں آخرت کو اپنا مسئلہ بنائے گا اس کے ساتھ لازماً یہ ہوگا کہ دنیا میں اس کا حلقہ ٹوٹنے لگے گا۔ اخروی مصلحتوں کی طرف جھکاؤ کی وجہ سے وہ دنیوی مصلحتوں کی رعایت نہ کر سکے گا۔ خدا کو خوش کرنے کی کوشش میں وہ بندوں کو ناراض کرے گا۔ اس کی مقبولیت نامقبولیت میں تبدیل ہو جائے گی۔ استقبالیہ دینے والے اس کو نظر انداز کریں گے۔ شان دار خطابات کے بجائے اس کو برے الفاظ کا تحفہ پیش کیا جائے گا۔ لوگوں کی نظر میں باعزت بننے کے بجائے لوگوں کی نظر میں وہ حقیر ہو جائے گا۔ ادارے اور کانفرنسیں اس کو دعوت نامے روانہ کرنا بھول جائیں گی۔ کسی زندہ انسان کے لئے بلاشبہ یہ بڑا سخت امتحان ہے۔ مگر جب تک آدمی اس امتحان کی بھٹی پر نہ پہنچے وہ اعلیٰ ایمانی کیفیات کا تجربہ نہیں کرتا، وہ خدا کی طرف سے بولنے کے قابل نہیں ہوتا۔

آخرت کا داعی وہی بن سکتا ہے جو آخرت کے مسئلہ میں شدت احساس سے پگھل رہا ہو۔ یہ شدت ایک ایسے شخص میں پیدا نہیں ہو سکتی جو دنیا کی زندگی میں "گھر والا" بنا ہوا ہو۔ اس قسم کی آتشین کیفیت کا مالک تو وہی شخص ہو سکتا ہے جو دنیا میں بے گھر اور بے یار و مددگار ہو جائے۔ ایسے ہی ایک انسان کے اندر وہ احساس محرومی جاگتا ہے جو اس کو پانے کے لئے بے تاب کر دے۔ اپنی نفسیاتی کیفیت کے اعتبار سے یہی وہ شخص ہوتا ہے جو لوگوں کو آخرت سے اس طرح ہوشیار کرے جیسے کہ لوگ آگ کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں۔ جس کو آگ کی لپٹیں لگ رہی ہوں وہی جانتا ہے کہ آگ کیا ہے اور وہی اس قابل ہے کہ آتشیں الفاظ میں لوگوں کو آنے والے خطرہ سے آگاہ کرے۔ جو محرومی کی زمین پر کھڑا ہو وہی یافت کا پیغام بر بن سکتا ہے۔ جس نے محرومی کا تجربہ نہیں کیا، اس کے لئے یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ لوگوں کو آخرت کی محرومی کے مسئلہ سے ہوشیار کرنے والا بنے —— لوگ جس چیز کو بچانے میں لگے ہوئے ہیں اسی کو کھونے میں ان کی کامیابی کا راز چھپا ہوا ہے۔

لوگ ایسے کاموں کی طرف دوڑتے ہیں جن میں کچھ کئے بغیر "مصلح ملت زندہ باد" کے استقبالئے ملتے ہوں۔ جس میں صرف کچھ الفاظ بول کر عمل اور جد و جہد کا خطاب عطا کیا جاتا ہو۔ جس میں ایک تقریری نمائش پر شہرت اور عزت کے خزانے لٹائے جاتے ہوں۔ جس میں نعروں اور جھنڈوں کی سیاست چلانے پر آسمانی نظام قائم کرنے کا کریڈٹ ملتا ہو۔ جس میں آدمی دوسروں سے چندہ لے کر لاکھ روپیہ کی تھیلی بنائے اور پھر ہوائی جہاز میں اڑ کر "مظلومین" کی امداد کے لئے سفر کرے —— ہر آدمی جھوٹے الفاظ کی ایک ڈکشنری لئے ہوئے ہے، صرف اس لئے کہ جھوٹے الفاظ کی ڈکشنری دنیا کے بازار میں سب سے زیادہ دھوم کے ساتھ بکتی ہے۔ کاش لوگوں کو معلوم ہوتا کہ اس دنیا میں سب سے قیمتی سودا وہ ہے جو بکنے سے رہ گیا ہو۔ کیوں کہ خدا خود اس کا خریدار ہوگا۔

وہ اپنے خلاف تنقید سن کر بھپر اٹھا

ازرا پاونڈ (۱۹۷۲—۱۸۸۵) مشہور امریکی شاعر اور تنقید نگار ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور سے اس کی پہلی ملاقات ۳۰ جون ۱۹۱۲ کو لندن میں ہوئی۔ وہ ٹیگور کی صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوا۔ ٹیگور کی نظم گیتان جلی کا انگریزی ترجمہ چھپا تو ازرا پاونڈ (Ezra Pound) نے لکھا کہ ٹیگور کے کلام میں وہ عظمت پائی جاتی ہے جو دانتے کی خصوصیت ہے۔ اس نے یہاں تک کہا کہ وہ ہم میں سے کسی بھی شخص کے مقابلہ میں زیادہ عظیم ہیں۔

...... greater than any one of us

ازرا پاونڈ نے ٹیگور کی بابت یہ الفاظ مارچ ۱۹۱۳ میں ایک امریکی رسالہ (Fortnightly Review) میں لکھے تھے صرف ایک ماہ بعد ۲۲ اپریل ۱۹۱۳ کو اس نے رسالہ (Poetry) کے ایڈیٹر کے نام ایک خط لکھا جس میں ٹیگور کو فضول (Superfluous) قرار دیا اور کہا کہ ان کے کلام میں صرف بعض پرانی باتوں کی تکرار ہے اور اصل بنگالی زبان میں جو ادبی چاشنی تھی وہ بھی انگریزی ترجمہ میں ختم ہو گئی ہے۔

ٹیگور کے بارہ میں ازرا پاونڈ کی رائے میں یہ تبدیلی کیسے آئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ازرا پاونڈ نے کالی موہن گھوش کی مدد سے کبیر کی نظموں کا انگریزی ترجمہ شروع کیا۔ یہ ترجمہ کتابی صورت سے پہلے میگزین میں قسط وار چھپا۔ ٹیگور نے اس ترجمہ کو دیکھا تو وہ ان کو بہت ناقص معلوم ہوا۔ انھوں نے اس کے ادبی معیار پر سخت تنقید کی۔ اس تنقید کو پڑھ کر ازرا پاونڈ بگڑ گیا اور وہی ٹیگور جس کی بابت وہ اس سے پہلے غیر معمولی تعریفی کلمہ کہہ چکا تھا، اس کی ہجو کرنے لگا۔ (ٹائمس آف انڈیا، ۱۸ مارچ ۱۹۷۹)

بیشتر انسانوں کے لئے سب سے زیادہ قابل نفرت چیز ان کی اپنی ذات پر تنقید ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیشتر انسانوں کے لئے پرستش کا مرکز ان کی اپنی ذات ہوتی ہے اور آدمی کی فطرت ہے کہ وہ اپنی پرستش کے مرکز پر تنقید کبھی گوارا نہیں کرتا۔

آدمی جب کسی کی تعریف کرتا ہے تو اکثر حالات میں وہ خود اپنی تعریف کی ایک صورت ہوتی ہے۔ ایک لیڈر جب اسٹیج پر کھڑا ہوتا ہے اور پنڈال میں بھرے ہوئے عوام کے سامنے فیاضانہ الفاظ کا تحفہ پیش کرتا ہے تو دراصل وہ عوام کو ان کے اس عطیہ کا بدلہ دے رہا ہوتا ہے کہ انھوں نے اس کے تقریری تھیٹر میں جمع ہو کر اس کی شان میں اضافہ کیا۔ ایک شخص جب کسی ایسے شخص کے اعتراف میں قصیدہ پڑھتا ہے جو اس کا حریف نہیں ہے تو یہ دراصل اپنے وسعت ظرف اور اپنی شرافت کے اشتہار کی ایک بے ضرر صورت ہوتی ہے۔ ایک صاحب قلم جب دوسرے صاحب قلم کے تذکرہ میں الفاظ کے پھول کھلاتا ہے تو وہ یا تو بالواسطہ طور پر اس کے کسی سابقہ قصیدہ کا شکرانہ ادا کر رہا ہوتا ہے یا یہ کہتا ہے کہ تم بھی اسی طرح میرا قصیدہ شائع کرنا۔ کبھی ایک تعریف اس لئے بھی شائع کی جاتی ہے کہ کسی سابقہ تنقید کی وجہ سے اپنی بگڑی ہوئی تصویر کو متوازن کیا جا سکے۔ حقیقی توصیفی کلمات وہ ہیں جو اپنے بھائی کی خیر خواہی کے جذبہ کے تحت نکلے ہوں۔ مگر یہی چیز دنیا میں سب سے زیادہ کمیاب ہے۔ کسی کو حقیقی خیر خواہی کا ایک کلمہ دینا اتنی بڑی فیاضی ہے جو شاذ و نادر ہی کسی خوش نصیب کے حصہ میں آتی ہے۔

صرف "کرنا" کافی نہیں

بالٹی کے پیندے میں سوراخ ہو اور اوپر سے آپ اس میں پانی ڈالیں تو سارا پانی بہہ کر نکلتا رہے گا اور بالٹی کے اپنے حصہ میں کچھ نہیں آئے گا۔ ایسا ہی معاملہ انسان کا بھی ہے۔ آدمی کا وہی عمل حقیقۃً عمل ہے جو خود اس کو کچھ دے رہا ہو۔ اگر آدمی بظاہر سرگرمیاں دکھا رہا ہو اور اس کا اپنا وجود کچھ پانے سے محروم ہو تو اس کی سرگرمیوں کی کوئی حقیقت نہیں۔ عمل وہی عمل ہے جس کے دوران آدمی کے ذہن میں شعور کی چنگاری پڑے۔ اس کے دل میں سوز و تڑپ کا کوئی لاوا ابلے۔ اس کی روح کے اندر کوئی کیمیاتی ہل چل پیدا ہو۔ اس کے اندرون میں کوئی ایسا حادثہ گزرے جو برتر حقیقتوں کی کوئی کھڑکی اس کے لئے کھول دے۔ یہی یافت کسی عمل کی کامیابی کا اصل معیار ہے۔ وہی عمل عمل ہے جو آدمی کو اس قسم کے تحفے دے رہا ہو۔ جس عمل سے آدمی کو یہ چیزیں نہ ملیں وہ ایسا ہی ہے جیسے سوراخ دار بالٹی میں پانی گرانا۔

دیکھنے کی چیز یہ نہیں ہے کہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ آپ کیا ہو رہے ہیں۔ اگر آپ کی "مصروفیات" بہت بڑھی ہوئی ہوں، اگر بتانے کے لئے آپ کے پاس بہت سے کارنامے ہوں مگر آپ کی اندرونی ہستی خالی ہو، آپ خود کچھ نہ ہو رہے ہوں تو آپ کی مصروفیات محض بے فائدہ سرگرمیاں (Idle Business) ہیں۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں — ہوائیں ہوں مگر ان سے آکسیجن نہ ملے۔ پانی ہو مگر اس سے سیرابی حاصل نہ ہو۔ غذا ہو مگر اس سے آدمی کو قوت نہ ملے۔ سورج ہو مگر وہ روشنی نہ دے رہا ہو تو ایسا ہونا ہونا نہیں ہے بلکہ نہ ہونے کی بدترین شکل ہے۔ اسی طرح جو عمل آدمی کی اپنی غذا نہ بن رہا ہو وہ عمل نہیں صرف بے عملی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ بے معنی کوئی چیز۔

پتھر کے اوپر آپ پانی ڈالیں تو وہ بظاہر پانی سے بھیگ جائے گا۔ اس کے چاروں طرف پانی پانی نظر آئے گا۔ مگر پتھر پانی کے مزہ اور تراوٹ کو نہیں جانتا، اس نے پانی کی اس دوسری حیثیت کا تجربہ نہیں کیا۔ اس کے برعکس ایک زندہ آدمی جب پیاس کے وقت پانی پیتا ہے تو اس کی رگیں تر ہو جاتی ہیں، وہ پانی کی حقیقت کا ایک "اندرونی تجربہ" کرتا ہے۔ اس مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ کرنا کیا ہے اور ہونا کیا۔ کرنا یہ ہے کہ آدمی کچھ مقررہ اعمال کو بس رسمی طور پر دہرا لے۔ آدمی کی زبان کچھ الفاظ بولے مگر وہ الفاظ اس کے دل کی دھڑکن نہ بن رہے ہوں۔ آدمی اپنے ہاتھ پاؤں سے کچھ عمل کرے مگر اس کا عمل اس کی روح کو نہ چھوئے۔ اس کی حرکات و سکنات اس کے دل و دماغ میں ارتعاش نہ پیدا کریں۔ اس کے برعکس ہونا یہ ہے کہ آدمی کا عمل اس کے لئے روحانی تجربہ بن رہا ہو۔ اس کی اندرونی ہستی کو بار بار کیفی غذائیں مل رہی ہوں۔ اس کا جسمانی عمل اس کے غیر جسمانی وجود میں ہل چل پیدا کر رہا ہو۔ وہی کرتا کرنا ہے جس کے درمیان آدمی خود بھی کچھ ہو رہا ہو۔ جو کرنا ہونا نہ بنے، حقیقت کے اعتبار سے اس کی کوئی قیمت نہیں۔ وہ گویا ایک ایسا پتھر ہے جو بظاہر پانی سے بھیگ رہا ہے مگر پانی کا مزہ نہیں پاتا ہے۔

ایک خدا کے سوا تمام سہارے جھوٹے ثابت ہوں گے

• اور جن لوگوں نے انکار کیا ان سے قیامت کے دن کہا جائے گا: کیا تم کو میری باتیں سنائی نہیں جاتی تھیں۔ پھر تم نے گھمنڈ کیا اور مجرم بن کر رہے۔ اور جب کہا جاتا کہ اللہ کا وعدہ سچ ہے اور اس گھڑی کے آنے میں کوئی شک نہیں۔ تو تم کہتے کہ ہم نہیں جانتے وہ گھڑی کیا ہے۔ ہم کو تو اس کا بس ایک خیال سا ہے اور ہم کو یقین نہیں ہوتا۔ اور کھل گئیں ان پر برائیاں ان کاموں کی جو وہ کرتے تھے۔ اور اب ان پر وہ چیز الٹ پڑی جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ اور کہا جائے گا کہ آج ہم تم کو اسی طرح بھلا دیتے ہیں جس طرح تم اس دن کی ملاقات کو بھول گئے تھے۔ اور تمھارا ٹھکانا اب دوزخ ہے اور کوئی تم کو مدد دینے والا نہیں" ـــــ قرآن کی سورہ نمبر ۴۵ میں قیامت کا یہ منظر پیش کرنے کے بعد کہا گیا ہے:

ذالکم بانکم اتخذتم آیات اللہ ھزوا وغرتکم الحیوۃ الدنیا فالیوم لایخرجون منہا ولاھم یستعتبون (جاثیہ ۳۵)

یہ اس وجہ سے کہ تم نے اللہ کی باتوں کی ہنسی اڑائی اور تم کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال دیا۔ پس آج یہ لوگ نہ دوزخ سے نکالے جائیں گے اور نہ ان سے عذر قبول کیا جائے گا۔

ہر آدمی کسی نہ کسی ناز پر جی رہا ہے۔ کسی کو یہ ناز ہے کہ اس کے پاس اقتدار ہے، کوئی اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ کسی کو یہ ناز ہے کہ اس کے پاس پیسہ ہے، اس کا کوئی کام اٹکا ہوا نہیں رہ سکتا۔ کسی کو یہ ناز ہے کہ اس کا اپنا حلقہ اور اس کے اپنے اعوان و انصار ہیں جو ہر موقع پر اس کی مدد کے لئے کافی ہیں۔ کسی کو یہ ناز ہے کہ وہ بزرگوں کا دامن تھامے ہوئے ہے، دنیا سے لے کر آخرت تک کہیں اس کا کچھ بگڑنے والا نہیں۔ کوئی کسی جماعت سے وابستہ ہے اور کوئی کسی ادارہ سے، کوئی عوامی قافلہ میں شریک ہے تو کوئی سرکاری قافلہ میں، غرض ہر ایک اپنے کو کسی نہ کسی سہارے پر کھڑا کئے ہوئے ہے اور اس کے ناز پر جی رہا ہے۔ یہی ناز یا غرہ دعوت حق سے بے پروائی برتنے کا سب سے بڑا سبب ہوتا ہے۔ اللہ کی باتیں کھلے کھلے دلائل کے ساتھ آدمی کے سامنے آتی ہیں۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ ان دلائل کا کوئی حقیقی جواب اس کے پاس نہیں ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ اس کو نہیں مانتا۔ اس کا ناز اس کو جھوٹے بھروسے کی نفسیات میں مبتلا رکھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگر میں اس دعوت کو نہ مانوں تو میرا کچھ بگڑنے والا نہیں۔ دلائل کے اعتبار سے خالی ہو کر بھی وہ اپنے جھوٹے سہارے کو پکڑے رہتا ہے۔ مگر جب قیامت آئے گی تو معلوم ہوگا کہ یہ سارے سہارے بالکل بے حقیقت تھے۔ انھوں نے دنیا میں خدا کی نشانیوں کی پروا نہ کی تو قیامت کے دن خدا بھی ان کی پروا نہ کرے گا۔ دنیا میں جھوٹے سہاروں پر جینے والے آخرت میں بالکل بے سہارا ہو کر رہ جائیں گے۔ ابدی بربادی ان پر ٹوٹ پڑے گی اور کوئی بھی چیز نہ ہوگی جو ان کو اس سے بچانے والی ثابت ہو ـــــ آدمی جہنم کے کنارے کھڑا ہوا ہے۔ مگر کسی نہ کسی گھڑے ہوئے سہارے کی بدولت وہ اپنے کو جہنم سے مامون سمجھے ہوئے ہے۔

کوئی شخص آگ سے کھیلنا چاہے تو فوراً اس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ آگ جلانے والی چیز ہے، کھیلنے والی چیز نہیں۔ مگر لوگ کبر، ظلم، بے انصافی، نفسانیت، حق تلفی اور مصلحت پرستی جیسی چیزوں میں مشغول رہتے ہیں۔ انھیں محسوس نہیں ہوتا کہ وہ ایسے انگاروں سے کھیل رہے ہیں جو دنیا کی آگ سے کہیں زیادہ ہولناک ہے۔

دین کا اصل کام وہی ہے جو اپنے آپ سے شروع ہو۔ آدمی کے اندر احتساب اور خود فکری کا مزاج پیدا ہو۔ وہ موت کو یاد کرے اور آخرت کے لئے فکر مند ہو۔ اس قسم کا دین آدمی کے اندر پیدا ہوا یا نہیں، اس کی پہچان یہ ہے کہ آدمی کا بولنا کم ہو جائے۔ وہ دوسروں سے زیادہ وہ اپنے بارے میں سوچنے لگے۔ شکایت اور اختلاف کے موقع پر وہ تواضع کا رویہ اختیار کرے۔ کسی سے معاملہ کرتے ہوئے وہ سمجھے کہ رب العالمین سے معاملہ کر رہا ہے خواہ وہ آدمی کمزور ہو یا طاقت ور۔

جب بھی کسی کو زمین پر چھوٹا یا بڑا اقتدار ملتا ہے، وہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس کا اقتدار ہمیشہ باقی رہے گا۔ حالاں کہ زمانہ نے کبھی کسی کے اس گمان کی تائید نہیں کی ہے۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ اگلا شخص جو پہلے شخص کو قبر میں لٹاتا ہے وہ دوبارہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس کا اقتدار ہمیشہ زمین پر باقی رہے گا۔

آخرت وہ عالم ہے جہاں صداقتیں اپنی اصلی شکل میں کھول دی جائیں گی۔ دنیا میں سچائی کا اعلان اسی عالم آخرت کا لفظی اظہار ہوتا ہے جو موت یا قیامت کے بعد حقیقی طور پر بے نقاب کی جانے والی ہے۔ یہ دنیا والوں کے لئے آخرت کی ایک کھڑکی کھولنے کے ہم معنی ہے۔ ایسی حالت میں سچائی کے اعلان کو سن کر جو لوگ منفی ردعمل کا مظاہرہ کریں، انھیں ڈرنا چاہئے کہ کہیں وہ اپنے کو اس اندیشہ میں تو مبتلا نہیں کر رہے ہیں کہ اگلی دنیا میں وہ اس حال میں اٹھیں کہ وہ اندھے اور بہرے ہوں۔ دنیا میں وہ اس بات کا ثبوت نہ دے سکے کہ وہ آخرت والی حقیقتوں کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ پھر آخرت کی دنیا میں وہ آنکھ والے کیوں کر قرار پائیں گے۔

ساری دنیا میں کوئی ایک آدمی بھی ایسا نہ ملے گا جو آم کی گٹھلی کو آم سمجھے یا بیل کے چھلکے کو بیل سمجھ کر کھائے۔ مگر ساری دنیا میں بے شمار لوگ ہیں جو الفاظ شماری کو ذکر سمجھتے ہیں اور کوڑا مارنے کو اسلامی نظام۔ گٹھلی اور چھلکے کو پھل کہنے والا اسی دنیا کے بازار میں بے قیمت ہو جاتا ہے۔ اس لئے ہر ایک کو اس کا بے حقیقت ہونا معلوم ہے، کوئی شخص پھل کے بازار میں گٹھلی اور چھلکا لے کر بیٹھنے کی جرأت نہیں کرتا۔ دوسری طرف لاکھوں لوگ ہیں جو الفاظ شماری اور کوڑا ماری والے دین کے نام پر بڑی بڑی دکانیں سجائے ہوئے ہیں۔ انھیں اس کے بے حقیقت ہونے کی خبر نہیں۔ شاید صرف اس لئے کہ اس قسم کے سودے کا بے قیمت ہونا موت کے بعد ظاہر ہوتا ہے۔ پہلی چیز انسانوں کے بازار میں بے قیمت ہے اور دوسری چیز اللہ کے بازار میں۔

کام کسی ظاہری دھوم کا نام نہیں بلکہ اندرونی یافت کا نام ہے۔ کبھی کرنے سے زیادہ بڑا کام یہ ہوتا ہے کہ آدمی ٹھٹک کر رہ جائے۔ کبھی بولنے سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہوتی ہے کہ آدمی پر چپ لگ گئی ہو۔ کبھی وہ چیز زیادہ قابل ذکر ہوتی ہے جو کسی اخبار میں نہ چھپے۔ کبھی وہ روداد زیادہ قیمتی ہوتی ہے جب کہ آدمی کی زبان سے الفاظ نہ نکلیں بلکہ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک جائیں۔

کتنے لوگ آپ دیکھیں گے کہ وہ اپنی جوانی میں بڑے جوش و خروش میں نظر آتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھرے ہوئے اور پائے ہوئے انسان ہیں۔ مگر آخر عمر میں وہ بالکل بے آس ہو کر رہ گئے۔ ان کا بڑھاپا اس طرح گزرا جیسے ان کے پاس جینے کے لئے کچھ نہ ہو۔ جیسے وہ خالی ہاتھ ہوں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ خارجی کارناموں میں جی رہے تھے۔ خود اپنے میں نہیں جی رہے تھے۔ جب تک کارنامے دکھانے کے مواقع تھے وہ اپنے آپ کو بھرپور محسوس کرتے رہے اور جب کارنامے دکھانے کی طاقت نہ رہی تو وہ اس طرح ڈھ گئے جیسے ایک بے جڑ کا درخت تھا جو ہوا کا جھونکا لگتے ہی گر گیا۔

آدمی کا یہی حال آخرت میں ہوگا۔ جو لوگ دنیا کے تام جھام کے سہارے قائم ہیں۔ جو کار اور بنگلہ اور شہرت اور استقبال اور اخباری سرخیوں میں جی رہے ہیں وہ موت کے بعد اچانک محسوس کریں گے کہ اب ان کے پاس کچھ نہیں رہا۔ وہ جینے کے تمام سہاروں سے محروم ہو گئے۔ آپ کے پاس صرف ظاہری رونقیں تھیں جن کو موت نے باطل کر دیا۔ اندرونی رونق آپ کے پاس تھی ہی نہیں جو موت کے بعد آپ کا ساتھ دے۔ ایسی حالت میں آپ کا انجام اس کے سوا اور کیا ہے کہ آخرت کے اندھیرے میں ابدی طور پر بھٹکتے رہیں۔

جنت ایک ایسی دنیا ہے جہاں ایک آدمی دوسرے آدمی کے بوائق (شرارتوں) سے محفوظ ہو۔ جہاں نفسیاتی پیچیدگیوں سے آزاد انسان بستے ہوں۔ جہاں کی فضاؤں میں انسانی احترام اور حقیقتوں کا اعتراف کامل درجہ میں پایا جاتا ہو۔ جہاں انسان پھولوں کی طرح مہکتے ہوں اور نسیم صبح کی طرح متحرک ہوتے ہوں۔ جہاں کا ماحول بغض، حسد، عصبیت، مفاد پرستی اور تنگ نظری سے بالکل ناآشنا ہو۔ جہاں خدا کی خدائی اور عبد کی عبدیت اپنی کامل ترین شکل میں نمایاں ہو۔ جنت ایسی ہی ایک لطیف اور نفیس دنیا ہوگی۔ موجودہ دنیا میں آدمی کا اصل کام یہی ہے کہ وہ اپنے اندر وہ اوصاف پیدا کرے جو اس کو جنت کی دنیا کا شہری بنا سکیں۔ کسی کو جنتی دنیا کا داخلہ اسی وقت مل سکتا ہے جب کہ اس نے وہاں کے ماحول کے مطابق شہری اوصاف اپنے اندر پیدا کئے ہوں۔ جو لوگ اپنے اندر یہ اوصاف پیدا کرنے میں ناکام رہیں وہ وہاں کی دنیا کے لئے اسی طرح نااہل رہیں گے جس طرح کوئی جاہل آدمی یونیورسٹی کی دنیا میں پروفیسری کے لئے۔ یونیورسٹی علم کی دنیا ہے۔ اس کی شہریت اسی شخص کو مل سکتی ہے جو علمی دنیا کے آداب کے مطابق زندگی گزارنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کر چکا ہو۔ اسی طرح جنتی دنیا کی شہریت بھی اس کو ملے گی جو اس بات کا ثبوت دے کہ وہ جنتی کردار کے ساتھ رہنے کی استعداد رکھتا ہے۔

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ساڑھے سات روپیہ ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ نوے روپے یا ماہانہ ساڑھے سات روپے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم ○

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

سب تعریف اللہ کے لئے ہے جو سارے جہان کا مالک ہے۔ بہت مہربان نہایت رحم والا ہے۔ انصاف کے دن کا مالک ہے۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔ ہم کو سیدھا راستہ دکھا۔ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے فضل کیا۔ ان کا راستہ نہیں جن پر تیرا غضب ہوا اور نہ ان لوگوں کا راستہ جو راستہ سے بھٹک گئے۔

بندے کے لئے کسی کام کا سب سے بہتر آغاز یہ ہے کہ وہ اپنے کام کو اپنے رب کے نام سے شروع کرے۔ وہ ہستی جو تمام رحمتوں کا خزانہ ہے اور جس کی رحمتیں ہر وقت ابلتی رہتی ہیں، اس کے نام سے کسی کام کا آغاز کرنا گویا اس سے یہ دعا کرنا ہے کہ تو اپنی بے پایاں رحمتوں کے ساتھ میری مدد پر آجا اور میرے کام کو خیر و خوبی کے ساتھ مکمل کردے۔ یہ بندے کی طرف سے اپنی بندگی کا اعتراف ہے اور اسی کے ساتھ اس کی کامیابی کی الٰہی ضمانت بھی۔

قرآن کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ مومن کے قلبی احساسات کے لئے صحیح ترین الفاظ مہیا کرتا ہے۔ بسم اللہ اور سورہ فاتحہ اسی نوعیت کے دعائیہ کلام ہیں۔ سچائی کو پا لینے کے بعد فطری طور پر آدمی کے اندر جو جذبہ ابھرتا ہے، اسی جذبہ کو ان الفاظ میں مجسّم کر دیا گیا ہے۔

آدمی کا وجود اس کے لئے اللہ کا ایک عظیم عطیہ ہے۔ اس کی عظمت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اگر کسی آدمی سے کہا جائے کہ تم اپنی دونوں آنکھوں کو نکلوا دو یا دونوں پیروں کو کٹوا دو، اس کے بعد تم کو ملک کی بادشاہی دے دی جائے گی تو کوئی بھی شخص اس کے لئے تیار نہ ہوگا۔ گویا کہ یہ ابتدائی قدرتی عطیے بھی بادشاہ کی بادشاہی سے زیاد قیمتی ہیں۔ اسی طرح آدمی جب اپنے گرد و پیش کی دنیا کو دیکھتا ہے تو یہاں ہر طرف خدا کی مالکیت اور رحیمیت ابلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس کو ہر طرف غیر معمولی اہتمام نظر آتا ہے۔ اس کو دکھائی دیتا ہے کہ دنیا کی تمام چیزیں حیرت انگیز طور پر انسانی زندگی کے موافق بنا دی گئی ہیں۔ یہ مشاہدہ اس کو بتاتا ہے کہ کائنات کا یہ عظیم کارخانہ بے مقصد نہیں ہو سکتا۔ لازمی طور پر ایسا دن آنا چاہئے جب ناشکروں سے ان کی ناشکرگزار زندگی کی بازپرس کی جائے اور شکرگزاروں کو ان کی شکر گزار زندگی کا انعام دیا جائے۔ وہ بے اختیار کہہ اٹھتا ہے کہ خدایا! تو فیصلہ کے دن کا مالک ہے۔ میں اپنے آپ کو تیرے آگے ڈالتا ہوں اور تجھ سے مدد چاہتا ہوں، تو مجھ کو اپنے سایہ میں لے لے۔ خدایا! ہم کو وہ راستہ دکھا جو تیرے نزدیک سچا راستہ ہے۔ ہم کو اس راستہ پر چلنے کی توفیق دے جو تیرے مقبول بندوں کا راستہ ہے۔ ہم کو اس راستہ سے بچا جو بھٹکے ہوئے لوگوں کا راستہ ہے یا ان لوگوں کا جو اپنی ڈھٹائی کی وجہ سے تیرے غضب کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اللہ کا مطلوب بندہ وہ ہے جو ان احساسات و کیفیات کے ساتھ دنیا میں جی رہا ہو۔ سورۂ فاتحہ اس بندۂ مومن کی چھوٹی تصویر ہے اور بقیہ قرآن اس بندۂ مومن کی بڑی تصویر۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۰

الف لام میم ۔ یہ اللہ کی کتاب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ راہ دکھاتی ہے ڈر رکھنے والوں کو۔ جو یقین کرتے ہیں بن دیکھے اور نماز قائم کرتے ہیں۔ اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں اور جو ایمان لاتے ہیں اس پر جو تمھارے اوپر اترا اور جو تم سے پہلے اتارا گیا۔ اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ انھیں لوگوں نے اپنے رب کی راہ پائی ہے اور وہی کامیابی کو پہنچنے والے ہیں ہر ۔ ۱

اس میں شک نہیں کہ قرآن ہدایت کی کتاب ہے۔ مگر وہ ہدایت کی کتاب اس کے لئے ہے جو فی الواقع ہدایت کو جاننے کے معاملہ میں سنجیدہ ہو، جو اس کی پروا اور کھٹک رکھتا ہو۔ سچی طلب جو فطرت کی زمین پر اگتی ہے وہ خود پانے ہی کا ایک آغاز ہوتا ہے۔ سچی طلب اور سچی یافت دونوں ایک ہی سفر کے پچھلے اور اگلے مرحلے ہیں۔ یہ گویا خود اپنی فطرت کے بند صفحات کو کھولنا ہے۔ جب آدمی اس کا سچا ارادہ کرتا ہے تو فوراً فطرت کی مطابقت اور اللہ کی نصرت اس کا ساتھ دینے لگتی ہے، اس کو اپنی فطرت کی مبہم پکار کا متعین جواب ملنا شروع ہو جاتا ہے۔

ایک آدمی کے اندر سچی طلب کا جاگنا عالم ظاہر کے پیچھے عالم باطن کو دیکھنے کی کوشش کرنا ہے۔ یہ تلاش جب یافت کے مرحلہ میں پہنچتی ہے تو وہ ایمان بالغیب بن جاتی ہے۔ وہی چیز جو ابتدائی مرحلہ میں ایک برتر حقیقت کے آگے اپنے کو ڈال دینے کی بے قراری کا نام ہوتا ہے وہ بعد کے مرحلہ میں اللہ کا نمازی بننے کی صورت میں ڈھل جاتا ہے۔ وہی جذبہ جو ابتداءً اپنے کو خیر اعلیٰ کے لئے وقف کر دینے کے ہم معنی ہوتا ہے وہ بعد کے مرحلہ میں اللہ کی راہ میں اپنے اثاثہ کو خرچ کرنے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ وہی کھوج جو زندگی کے ہنگاموں کے آگے اس کا آخری انجام معلوم کرنے کی صورت میں کسی کے اندر ابھرتی ہے وہ آخرت پر یقین کی صورت میں اپنے سوال کا جواب پالیتی ہے۔

سچائی کو پانا گویا اپنے شعور کو حقیقت اعلیٰ کے ہم سطح کر لینا ہے۔ جو لوگ اس طرح حق کو پالیں وہ ہر قسم کی نفسیاتی گرہوں سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ وہ سچائی کو اس کے بے آمیز روپ میں دیکھنے لگتے ہیں، اس لئے سچائی جہاں بھی ہو اور جس بندۂ خدا کی زبان سے اس کا اعلان کیا جا رہا ہو وہ فوراً اس کو پہچان لیتے ہیں اور اس پر لبیک کہتے ہیں۔ کوئی جمود، کوئی تقلید اور کوئی تعصباتی دیوار ان کے لئے اعتراف حق میں رکاوٹ نہیں بنتی۔ جن لوگوں کے اندر یہ خصوصیات ہیں وہ اللہ کے سایہ میں آجاتے ہیں۔ اللہ کا بنایا ہوا نظام ان کو قبول کر لیتا ہے ان کو دنیا میں اس سچے راستہ پر چلنے کی توفیق مل جاتی ہے جس کی آخری منزل یہ ہے کہ آدمی آخرت کی ابدی نعمتوں میں داخل ہو جائے۔

حق کو وہی پا سکتا ہے جو اس کا ڈھونڈنے والا ہے اور جو ڈھونڈنے والا ہے وہ ضرور اس کو پاتا ہے۔ یہاں ڈھونڈنے اور پانے میں کوئی فاصلہ نہیں۔

جن لوگوں نے انکار کیا، ان کے لئے یکساں ہے ڈراؤ یا نہ ڈراؤ، وہ ماننے والے نہیں ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگادی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔ اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے ۷-۶

ایک شخص اپنی آنکھ کو بند کرلے تو آنکھ رکھتے ہوئے بھی وہ سورج کو نہ دیکھے گا۔ کوئی شخص اپنے کان میں روئی ڈال لے تو کان رکھتے ہوئے بھی وہ باہر کی آواز کو نہیں سنے گا۔ ایسا ہی کچھ معاملہ حق کا بھی ہے۔ حق کا اعلان خواہ کتنا ہی واضح صورت میں ہو رہا ہو مگر کسی کے لئے وہ قابل فہم یا قابل قبول اس وقت بنتا ہے جب کہ وہ اس کے لئے اپنے دل کے دروازے کھلا رکھے۔ جو شخص اپنے دل کے دروازے بند کرلے، اس کے لئے کائنات میں خدا کی خاموش پکار اور پیغمبر کی زبان سے اس کا لفظی اعلان دونوں بے سود ثابت ہوں گے۔

حق کی دعوت جب اپنی بے آمیز شکل میں اٹھتی ہے تو وہ اتنا زیادہ مبنی برحقیقت اور اتنا زیادہ مطابق فطرت ہوتی ہے کہ کوئی شخص اس کی نوعیت کو سمجھنے سے عاجز نہیں رہ سکتا۔ جو شخص بھی کھلے ذہن سے اس کو دیکھے گا اس کا دل گواہی دے گا کہ یہ عین حق ہے۔ مگر اس وقت عملی صورت حال یہ ہوتی ہے کہ ایک طرف وقت کا ڈھانچہ ہوتا ہے جو صدیوں کے عمل سے ایک خاص صورت میں قائم ہو جاتا ہے۔ اس ڈھانچہ کے تحت کچھ مذہبی یا غیر مذہبی گدیاں بن جاتی ہیں جن پر کچھ لوگ بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں۔ کچھ عزت و شہرت کی صورتیں رائج ہو جاتی ہیں جن کے جھنڈے اٹھا کر کچھ لوگ وقت کے اکابر کا مقام حاصل کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ کچھ کاروبار اور مفادات قائم ہو جاتے ہیں جن کے ساتھ اپنے کو وابستہ کر کے بہت سے لوگ اطمینان کی زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔

ان حالات میں جب ایک غیر معروف کونے سے اللہ اپنے ایک بندے کو کھڑا کرتا ہے اور اس کی زبان سے اپنی مرضی کا اعلان کراتا ہے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس قسم کے لوگوں کو اپنی بنی بنائی دنیا بھنگ ہوتی نظر آتی ہے۔ حق کے پیغام کی تمام تر صداقت کے باوجود دو چیزیں ان کے لئے اس کو صحیح طور پر سمجھنے میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ ایک کبر، دوسرے دنیا پرستی۔ جو لوگ مروجہ ڈھانچہ میں بڑائی کے مقامات پر بیٹھے ہوئے ہوں ان کو ایک "چھوٹے آدمی" کی بات ماننے میں اپنی عزت خطرہ میں پڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ احساس ان کے اندر گھمنڈ کی نفسیات جگادیتا ہے۔ داعی کو وہ اپنے مقابلہ میں حقیر سمجھ کر اس کی دعوت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اسی طرح دنیوی مفادات کا سوال بھی قبول حق میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ کیونکہ حق کا داعی مروجہ ڈھانچہ کا نمائندہ نہیں ہوتا۔ وہ ایک نئی اور غیر مانوس آواز کو لے کر اٹھتا ہے، اس لئے اس کو ماننے کی صورت میں لوگوں کو اپنے مفادات کا ڈھانچہ ٹوٹتا ہوا نظر آتا ہے۔

یہی وہ مانع کیفیت ہے جس کو قرآن میں مہر لگانے سے تعبیر کیا گیا ہے، جو لوگ دعوت حق کے معاملہ کو سنجیدہ معاملہ نہ سمجھیں۔ جو گھمنڈ اور دنیا پرستی کی نفسیات میں مبتلا ہوں ان کے ذہن کے اوپر ایسے غیر محسوس پردے پڑ جاتے ہیں جو حق بات کو ان کے ذہن میں داخل نہیں ہونے دیتے۔ کسی چیز کے بارے میں آدمی کے اندر مخالفانہ نفسیات جاگ اٹھیں تو اس کے بعد وہ اس کی معقولیت کو سمجھ نہیں پاتا۔ خواہ اس کے حق میں کتنے ہی واضح دلائل پیش کئے جا رہے ہوں۔

اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور آخرت کے دن پر، حالاں کہ وہ ایمان والے نہیں ہیں۔ وہ اللہ کو اور مومنین کو دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ مگر وہ صرف اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں اور وہ اس کا شعور نہیں رکھتے۔ ان کے دلوں میں روگ ہے تو اللہ نے ان کے روگ کو بڑھا دیا۔ اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ کہتے تھے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ آگاہ، یہی لوگ فساد کرنے والے ہیں مگر وہ نہیں سمجھتے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی اسی طرح ایمان لے آؤ جس طرح اور لوگ ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کہ کیا ہم اس طرح ایمان لائیں جس طرح بے وقوف لوگ ایمان لائے ہیں۔ آگاہ، کہ بے وقوف یہی لوگ ہیں مگر وہ نہیں جانتے۔ اور جب وہ ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اور جب اپنے شیطانوں کی مجلس میں پہنچتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمھارے ساتھ ہیں۔ ہم تو ان سے محض ہنسی کرتے ہیں۔ اللہ ان سے ہنسی کر رہا ہے اور ان کو ان کی سرکشی میں ڈھیل دے رہا ہے، وہ بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے راہ کے بدلے گمراہی خریدی تو ان کی تجارت سود مند نہ ہوئی اور وہ نہ ہوئے راہ پانے والے ۸ ـ ۱۶

جو لوگ فائدوں اور مصلحتوں کو اولین اہمیت دئے ہوئے ہوتے ہیں ان کے نزدیک یہ نادانی کی بات ہوتی ہے کہ کوئی شخص تحفظات کے بغیر اپنے آپ کو ہمہ تن حق کے حوالے کر دے۔ ایسے لوگوں کی حقیقی وفاداریاں اپنے دنیوی مفادات کے ساتھ ہوتی ہیں۔ البتہ اسی کے ساتھ وہ حق سے بھی اپنا ایک ظاہری رشتہ قائم کر لیتے ہیں۔ اس کو وہ عقل مندی سمجھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح ان کی دنیا بھی محفوظ ہے اور اسی کے ساتھ ان کو حق پرستی کا تمغہ بھی حاصل ہے۔ مگر یہ ایک ایسی خوش فہمی ہے جو صرف آدمی کے اپنے دماغ میں ہوتی ہے۔ اس کے دماغ کے باہر کہیں اس کا وجود نہیں ہوتا۔ آزمائش کا ہر موقع ان کو سچے دین سے کچھ اور دور اور اپنے مفاد پرستانہ دین سے کچھ اور قریب کر دیتا ہے۔ اس طرح گویا ان کے نفاق کا مرض بڑھتا رہتا ہے۔ ایسے لوگ جب سچے مسلمانوں کو دیکھتے ہیں تو ان کا احساس یہ ہوتا ہے کہ وہ خواہ مخواہ سچائی کی خاطر اپنے کو برباد کر رہے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں اپنے طریقے کو وہ اصلاح کا طریقہ کہتے ہیں۔ کیوں کہ ان کو نظر آتا ہے کہ اس طرح کسی سے جھگڑا مول لئے بغیر اپنے سفر کو کامیابی کے ساتھ طے کیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ صرف بے شعوری کی بات ہے۔ اگر وہ گہرائی کے ساتھ سوچیں تو ان پر کھلے گا کہ اصلاح یہ ہے کہ بندے صرف اپنے رب کے ہو جائیں۔ اس کے برعکس فساد یہ ہے کہ خدا اور بندے کے تعلق کو درست کرنے کے لئے جو تحریک چلے اس میں روڑے اٹکائے جائیں۔ ان کا یہ بظاہر نفع کا سودا حقیقتاً گھاٹے کا سودا ہے۔ کیونکہ وہ بے آمیز حق کو چھوڑ کر ملاوٹی حق کو اپنے لئے پسند کر رہے ہیں جو کسی کے کچھ کام آنے والا نہیں۔ اپنے دنیوی معاملات میں ہوشیار ہونا اور آخرت کے معاملہ میں سرسری توقعات کو کافی سمجھنا گویا خدا کے سامنے جھوٹ بولنا ہے۔ جو لوگ ایسا کریں ان کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ اس قسم کی جھوٹی زندگی آدمی کو اللہ کے یہاں عذاب کے سوا کسی اور چیز کا مستحق نہیں بناتی۔

ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے آگ جلائی۔ جب آگ نے اس کے اردگرد کو روشن کردیا تو اللہ نے ان کی بینائی سلب کرلی اور ان کو اندھیرے میں چھوڑ دیا کہ ان کو کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں۔ اب یہ لوٹنے والے نہیں ہیں۔ یا ان کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان سے بارش ہو رہی ہو، اس میں تاریکی بھی ہو اور گرج چمک بھی۔ وہ کڑک سے ڈر کر موت سے بچنے کے لئے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس رہے ہوں۔ حالاں کہ اللہ منکروں کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہے۔ قریب ہے کہ بجلی ان کی نگاہوں کو اچک لے۔ جب بھی ان پر بجلی چمکتی ہے، اس میں وہ چل پڑتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو وہ رک جاتے ہیں۔ اور اگر اللہ چاہے تو ان کے کان اور ان کی آنکھوں کو سلب کرلے۔ اللہ یقیناً ہر چیز پر قادر ہے ۲۰ – ۱۷

کسی کمرہ میں کالی اور سفید چیزیں ہوں تو جب تک اندھیرا ہے وہ اندھیرے میں گم رہیں گی۔ مگر روشنی جلاتے ہی کالی چیز کالی اور سفید چیز سفید دکھائی دینے لگے گی۔ یہی حال اللہ کی طرف سے اٹھنے والی دعوت نبوت کا ہے۔ یہ خدائی روشنی جب ظاہر ہوتی ہے تو اس کے اجالے میں ہدایت اور ضلالت صاف صاف دکھائی دینے لگتی ہیں۔ نیک عمل کیا ہے اور اس کے ثمرات کیا ہیں، برا عمل کیا ہے اور اس کے ثمرات کیا ہیں، سب کھل کر ٹھیک ٹھیک سامنے آجاتا ہے۔ مگر جو لوگ اپنے آپ کو حق کے تابع کرنے کے بجائے حق کو اپنا تابع بنائے ہوئے تھے، وہ اس صورت حال کو دیکھ کر گھبرا اٹھتے ہیں۔ ان کا چھپا ہوا حسد اور گھمنڈ زندہ ہو کر ان کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ خدائی آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھتے ہی ان کی منفی نفسیات ابھر آتی ہیں۔ ان کے اندرونی تعصبات ان کے حواس پر اس طرح چھا جاتے ہیں کہ آنکھ، کان، زبان رکھتے ہوئے بھی وہ ایسے ہو جاتے ہیں گویا کہ وہ اندھے ہیں، وہ بہرے ہیں، وہ گونگے ہیں۔ اب وہ نہ تو کسی پکارنے والے کی پکار کو سن سکتے ہیں، نہ اس کی پکار کا جواب دے سکتے ہیں نہ کسی قسم کی نشانی سے رہنمائی حاصل کرسکتے ہیں۔ ان کے لئے صحیح رویہ یہ تھا کہ وہ پکارنے والے کی پکار پر غور کرتے۔ مگر اس کے بجائے انھوں نے اس سے بچنے کا سادہ سا علاج یہ دریافت کیا ہے کہ اس کی بات کو سرے سے سنا ہی نہ جائے، اس کو کوئی اہمیت ہی نہ دی جائے۔

اسی طرح ایک اور نفسیات ہے جو حق کو قبول کرنے میں رکاوٹ بنتی ہے۔ یہ ڈر کی نفسیات ہے۔ بارش اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ مگر بارش جب آتی ہے تو اپنے ساتھ کڑک اور گرج بھی لے آتی ہے جس سے کمزور لوگ ہیبت کھا جاتے ہیں۔ اسی طرح جب اللہ کی طرف سے حق کی دعوت اٹھتی ہے تو ایک طرف اگر وہ انسانوں کے لئے عظیم کامرانیوں کا امکان کھولتی ہے تو دوسری طرف اس میں کچھ وقتی اندیشے بھی دکھائی دیتے ہیں —— اس کو ماننے کی صورت میں اپنی بڑائی کا خاتمہ، زندگی کے بنے بنائے نقشہ کو بدلنے کی ضرورت، رواجی ڈھانچہ سے ٹکراؤ کے مسائل آخرت کے بارے میں خوش خیالیوں کے بجائے حقائق پر بھروسہ کرنا۔ اس قسم کے اندیشوں کو دیکھ کر وہ کبھی رک جاتے ہیں اور کبھی تذبذب کے ساتھ چند قدم آگے بڑھتے ہیں۔ مگر یہ احتیاطیں ان کے کچھ بھی کام آنے والی نہیں ہیں کیونکہ خدائی پکار کے لئے اپنے کو کھلے دل سے پیش نہ کر کے وہ زیادہ شدید طور پر اپنے کو خدا کی نظر میں قابل سزا بنا رہے ہیں۔

اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں تاکہ تم دوزخ سے بچ جاؤ۔ وہ ذات جس نے زمین کو تمھارے لئے بچھونا بنایا اور آسمان کو چھت بنایا، اور اتارا آسمان سے پانی اور اس سے پیدا کئے پھل تمھاری غذا کے لئے پس تم کسی کو اللہ کے برابر نہ ٹھہراؤ حالاں کہ تم جانتے ہو۔ اگر تم اس کلام کے متعلق شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے کے اوپر اتارا ہے تو لاؤ اس کے مانند ایک سورہ اور بلالو اپنے حمایتیوں کو بھی اللہ کے سوا، اگر تم سچے ہو۔ پس اگر تم یہ نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن بنیں گے آدمی اور پتھر۔ وہ تیار کی گئی ہے کافروں کے لئے۔ اور خوش خبری دے دو ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کئے اس بات کی کہ ان کے لئے ایسے باغ ہوں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ جب بھی ان کو ان باغوں میں سے کوئی پھل کھانے کو ملے گا تو وہ کہیں گے: یہ وہی ہے جو اس سے پہلے ہم کو دیا گیا تھا۔ اور ملے گا ان کو ایک دوسرے سے ملتا جلتا۔ اور ان کے لئے وہاں ستھری عورتیں ہوں گی۔ اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ۲۵-۲۱

انسان اور انسان کے سوا جو کچھ زمین و آسمان میں ہے سب کا پیدا کرنے والا صرف اللہ ہے۔ اس نے پوری کائنات کو نہایت حکمت کے ساتھ قائم کیا ہے۔ وہ ہر آن ان کی پرورش کر رہا ہے۔ اس لئے انسان کے لئے صحیح رویہ صرف یہ ہے کہ وہ اللہ کو بغیر کسی شرکت کے خالق، مالک اور رازق تسلیم کرے، وہ اس کو اپنا سب کچھ بنالے۔ مگر خدا چونکہ نظر نہیں آتا اس لئے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کسی نظر آنے والی چیز کو اہم سمجھ کر اس کو خدائی کے مقام پر بٹھا لیتا ہے۔ وہ ایک مخلوق کو، جزئی یا کلی طور پر، خالق کے برابر ٹھہرا لیتا ہے، کبھی اس کو خدا کا نام دے کر اور کبھی خدا کا نام دئے بغیر۔

یہی انسان کی اصل گمراہی ہے۔ پیغمبر کی دعوت یہ ہوتی ہے کہ آدمی صرف ایک خدا کو بڑائی کا مقام دے۔ اس کے علاوہ جس جس کو اس نے خدائی عظمت کے مقام پر بٹھا رکھا ہے اس کو عظمت کے مقام سے اتار دے۔ جب خالص خدا پرستی کی دعوت اٹھتی ہے تو وہ تمام لوگ اپنے اوپر اس کی زد پڑتی ہوئی محسوس کرنے لگتے ہیں جن کا دل خدا کے سوا کہیں اور اٹکا ہوا ہو۔ جنھوں نے خدا کے سوا کسی اور کے لئے بھی عظمت کو خاص کر رکھا ہو۔ ایسے لوگوں کو اپنے فرضی معبودوں سے جو شدید تعلق ہو چکا ہوتا ہے اس کی وجہ سے ان کے لئے یہ یقین کرنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ بے حقیقت ہیں اور حقیقت صرف اس پیغام کی ہے جو آدمیوں میں سے ایک آدمی کی زبان سے سنایا جا رہا ہے۔

جو دعوت خدا کی طرف سے اٹھے اس کے اندر لازمی طور پر خدائی شان شامل ہو جاتی ہے۔ اس کا ناقابل تقلید اسلوب اور اس کا غیر مفتوح استدلال اس بات کی کھلی علامت ہوتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے ہے۔ اس کے باوجود جو لوگ انکار کریں ان کو خدا کی دنیا میں جہنم کے سوا کہیں اور پناہ نہیں مل سکتی۔ البتہ جو لوگ خدا کے کلام میں خدا کو پالیں انھوں نے گویا آج کی دنیا میں کل کی دنیا کو دیکھ لیا۔ یہی لوگ ہیں جو آخرت کے باغوں میں داخل کئے جائیں گے۔

اللہ اس سے نہیں شرماتا کہ بیان کرے مثال مچھر کی یا اس سے بھی کسی چھوٹی چیز کی۔ پھر جو ایمان والے ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ حق ہے ان کے رب کی جانب سے۔ اور جو منکر ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس مثال کو بیان کر کے اللہ نے کیا چاہا ہے۔ اللہ اس کے ذریعہ بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو اس سے راہ دکھاتا ہے۔ اور وہ گمراہ کرتا ہے ان لوگوں کو جو نافرمانی کرنے والے ہیں۔ جو اللہ کے عہد کو اس کے باندھنے کے بعد توڑتے ہیں اور اس چیز کو توڑتے ہیں جس کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور زمین میں بگاڑ پیدا کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں نقصان اٹھانے والے۔ تم کس طرح اللہ کا انکار کرتے ہو حالاں کہ تم بے جان تھے تو اس نے تم کو زندگی عطا کی۔ پھر وہ تم کو موت دے گا۔ پھر زندہ کرے گا۔ پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ وہی ہے جس نے تمہارے لئے وہ سب کچھ پیدا کیا جو زمین میں ہے۔ پھر آسمان کی طرف توجہ کی اور سات آسمان درست کئے۔ اور وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے ۲۹-۲۶

کسی بندہ کے اوپر اللہ کا سب سے پہلا حق یہ ہے کہ وہ عبدیت کے اس عہد کو نبھائے جو پیدا کرنے والے اور پیدا کئے جانے والے کے درمیان اول روز سے قائم ہو چکا ہے۔ پھر انسانوں کے درمیان وہ اس طرح رہے کہ وہ ان تمام رشتوں اور تعلقات کو پوری طرح استوار کئے ہوئے ہو جن کے استوار کئے جانے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ تیسری چیز یہ کہ جب خدا اپنے ایک بندہ کی زبان سے اپنے پیغام کا اعلان کرائے تو اس کے خلاف بے بنیاد باتیں نکال کر خدا کے بندوں کو اس سے بدکایا نہ جائے۔ حق کی دعوت دینا دراصل لوگوں کو حالتِ فطری پر لانے کی کوشش کرنا ہے۔ اس لئے جو شخص لوگوں کو اس سے روکتا ہے وہ زمین میں فساد ڈالنے کا مجرم بنتا ہے۔

اللہ کا یہ احسان کہ وہ آدمی کو عدم سے وجود میں لے آیا، اتنا بڑا احسان ہے کہ آدمی کو ہمہ تن اس کے آگے بچھ جانا چاہئے۔ پھر اللہ نے انسان کو پیدا کر کے یونہی چھوڑ نہیں دیا بلکہ اس کو رہنے کے لئے ایک ایسی زمین دی جو اس کے لئے انتہائی طور پر موافق ڈھنگ سے بنائی گئی تھی۔ پھر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ بلکہ اس سے بہت آگے کی ہے۔ انسان ہر وقت اس نازک امکان کے کنارے کھڑا ہوا ہے کہ اس کی موت آجائے اور اچانک وہ مالکِ کائنات کے سامنے حساب کتاب کے لئے پیش کر دیا جائے۔ ان باتوں کا تقاضا ہے کہ آدمی ہمہ تن اللہ کا ہو جائے، اس کی یاد اور اس کی اطاعت میں زندگی گزارے۔ ساری عمر وہ اس کا بندہ بنا رہے۔

پیغمبرانہ دعوت کے انتہائی واضح اور مدلل ہونے کے باوجود کیوں بہت سے لوگ اس کو قبول نہیں کر پاتے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ شوشے نکالنے کا فتنہ ہے۔ آدمی کے اندر نصیحت پکڑنے کا ذہن نہ ہو تو وہ کسی بات کو سنجیدگی کے ساتھ نہیں لیتا ایسے آدمی کے سامنے جب بھی کوئی دلیل آتی ہے تو وہ اس کو سطحی طور پر دیکھ کر ایک شوشہ نکال لیتا ہے۔ اس طرح وہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ دعوت کوئی معقول دعوت نہیں ہے۔ اگر وہ معقول دعوت ہوتی تو کیسے ممکن تھا کہ اس میں اس قسم کی بے وزن باتیں شامل ہوں۔ مگر جو نصیحت پکڑنے والے ذہن ہیں جو باتوں پر سنجیدگی سے غور کرتے ہیں، ان کو حق کے پہچاننے میں دیر نہیں لگتی، خواہ حق کو "مچھر" جیسی مثالوں ہی میں کیوں نہ بیان کیا گیا ہو۔

اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ فرشتوں نے کہا: کیا تو زمین میں ایسے لوگوں کو بسائے گا جو اس میں فساد کریں اور خون بہائیں = اور ہم تیری حمد کرتے ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ اللہ نے کہا میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اور اللہ نے سکھا دئے آدم کو سارے نام، پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے ان لوگوں کے نام بتاؤ۔ فرشتوں نے کہا کہ تو پاک ہے۔ ہم تو وہی جانتے ہیں جو تو نے ہم کو بتایا۔ بے شک تو ہی علم والا اور حکمت والا ہے۔ اللہ نے کہا اے آدم! ان کو بتاؤ ان لوگوں کے نام۔ تو جب آدم نے بتائے ان کو ان لوگوں کے نام تو اللہ نے کہا کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ آسمانوں اور زمین کے بھید کو میں ہی جانتا ہوں۔ اور مجھ کو معلوم ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو ۳۳-۳۰

خلیفہ کے لفظی معنی ہیں کسی کے بعد اس کی جگہ لینے والا، جانشین۔ وراثتی اقتدار کے زمانہ میں یہ لفظ کثرت سے حکمرانوں کے لئے استعمال ہوا جو ایک کے بعد دوسرے کی جگہ تخت پر بیٹھتے تھے۔ اس طرح استعمالی مفہوم کے لحاظ سے خلیفہ کا لفظ صاحب اقتدار کے ہم معنی ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ نے جب انسان کو پیدا کیا تو یہ بھی فیصلہ فرمایا کہ وہ ایک با اختیار مخلوق کی حیثیت سے زمین پر آباد ہوگا۔ فرشتوں کو اندیشہ ہوا کہ اختیار و اقتدار پاکر انسان بگڑ نہ جائے اور زمین میں خوں ریزی کرنے لگے۔ فرشتوں کا یہ اندیشہ غلط نہ تھا۔ اللہ کو بھی اس امکان کا پورا علم تھا۔ مگر اللہ کی نظر اس بات پر تھی کہ انسانوں میں اگر بہت سے لوگ آزادی پاکر بگڑیں گے تو ایک قابل لحاظ تعداد ان لوگوں کی بھی ہوگی جو آزادی اور اختیار کے باوجود اپنی حیثیت کو اور اپنے رب کے مقام کو پہچانیں گے اور کسی دباؤ کے بغیر خود اپنے ارادہ سے تسلیم و اطاعت کا طریقہ اختیار کریں گے۔ یہ دوسری قسم کے لوگ اگرچہ نسبتاً کم تعداد میں ہوں گے مگر وہ فصل کے دانوں کی طرح قیمتی ہوں گے۔ فصل میں لکڑی اور بھس کی مقدار ہمیشہ بہت زیادہ ہوتی ہے۔ مگر دانے، کم ہونے کے باوجود، اتنے قیمتی ہوتے ہیں کہ ان کی خاطر لکڑی اور بھس کے ڈھیر کو بھی اُگنے اور پھیلنے کا موقع دے دیا جاتا ہے۔

اللہ نے اپنی قدرت سے آدم کی تمام ذریت کو بیک وقت ان کے سامنے کر دیا۔ پھر فرشتوں سے کہا کہ دیکھو یہ ہے اولاد آدم۔ اب بتاؤ کہ ان میں کون کون اور کیسے کیسے لوگ ہیں۔ فرشتے عدم واقفیت کی وجہ سے بتا نہ سکے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کو ان کے ناموں، بالفاظ دیگر شخصیتوں سے آگاہ کیا اور پھر کہا کہ فرشتوں کے سامنے ان کا تعارف کراؤ۔ جب آدم نے تعارف کرایا تو فرشتوں کو معلوم ہوا کہ آدم کی اولاد میں، فسادیوں اور برے لوگوں کے علاوہ کیسے کیسے صلحاؤ متقین ہوں گے ——— انسان کا سب سے بڑا جرم، انکار رب کے بعد، زمین میں فساد کرنا اور خون بہانا ہے۔ کسی فرد یا گروہ کے لئے جائز نہیں کہ وہ ایسی کارروائیاں کرے جس کے نتیجہ میں زمین پر خدا کا قائم کیا ہوا فطری نظام بگڑ جائے، انسان انسان کی جان مارنے لگے۔ ایسا ہر فعل آدمی کو خدا کی رحمتوں سے محروم کر دیتا ہے۔ زمین میں خدا کے بنائے ہوئے فطری نظام کا قائم رہنا اس کی اصلاح ہے اور زمین کے فطری نظام کو بگاڑنا اس کا فساد۔

اتحاد کی قیمت: شخصی جذبات کی قربانی

آپ کسی مسلم لیڈر سے ملئے۔ کسی مسلم ادارہ میں جائیے۔ ہر ایک آپ کو اپنے کارناموں کی لمبی فہرست بتائے گا۔ ہر جگہ آپ کو شاندار ایڈریس شاندار فریم میں دیواروں کی زینت بنے ہوئے دکھائی دیں گے۔ ہمارا ہر لیڈر اور ہمارا ہر ادارہ اپنے بیان کے مطابق، عظیم الشان کارنامے انجام دے رہا ہے۔ مگر ان کارناموں کو ان کی مجموعی صورت میں دیکھنا چاہیں تو وہ کہیں نظر نہیں آتے۔ افراد کی مجموعی صورت ہی کا نام اسلام یا ملت اسلام ہے۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ اسلامی افراد الگ الگ فتوحات کے جھنڈے لہرا رہے ہیں مگر اسلام ساری دنیا میں مغلوب ہے۔ ملت کے افراد الگ الگ کامیابیوں کے مینار کھڑے کر رہے ہیں مگر ملت ناکامی کی پستی میں پڑی ہوئی ہے۔ اینٹیں سونے کی ہیں مگر ان کے ملنے سے جو محل بنا ہے وہ مٹی کا ہے۔ درخت سیب کے ہیں مگر ان سے جو باغ تیار ہوا ہے وہ ببول کا خارستان ہے۔

اس عجیب و غریب تضاد کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس کام کو اسلام کا کام بتایا جا رہا ہے وہ حقیقۃً اسلام کا کام ہے ہی نہیں۔ یہ سب افراد کے اپنے کاروبار ہیں۔ اس لئے افراد کی سطح پر ان کے کچھ جلوے نظر آتے ہیں مگر اجتماع (اسلام) کی سطح پر ان کا کوئی نشان دکھائی نہیں دیتا۔ لوگوں نے اپنی قیادت کے کاروبار پر ملت کا لیبل لگا رکھا ہے۔ اپنی ذاتی تجارت کو اسلام کا نام دے دیا ہے۔ ایسی حالت میں ان کی سرگرمیوں کے نتائج اسلام یا ملت اسلام کی سطح پر کیوں کر نظر آئیں گے۔

ایک بڑے شہر میں ایک لاکھ کامیاب دکانیں ہیں۔ ہر دکان دار صبح شام پیسے کما رہا ہے۔ آپ جس دکان دار سے بھی ملیں، اس کے پاس اپنی کامیابیوں کی داستان بتانے کے لئے بے شمار الفاظ ہوں گے۔ تاہم اگر آپ چاہیں کہ ان ایک لاکھ دکان داروں کی کمائیاں کسی ایک مقام پر روپیوں کے پہاڑ کی صورت میں دکھائی دیں تو آپ کو بالکل ناکامی ہوگی۔ کیوں کہ ہر دکان دار جو کما رہا ہے وہ اپنی ذات کے لئے کما رہا ہے نہ کہ کسی "مجموعہ" کے لئے۔ چنانچہ ہر دکان دار کا اپنا مکان شاندار طور پر بن رہا ہے۔ اس کی ذاتی زندگی میں اس کی کمائی کی چمک دمک آپ خوب دیکھ سکتے ہیں۔ مگر کسی مجموعہ کے لئے وہ کما ہی نہیں رہا ہے اس لئے مجموعہ کی سطح پر اس کی کامیابیاں نظر بھی نہیں آتیں۔ افراد کے کاروبار افراد کی سطح پر نظر آ سکتے ہیں۔ اجتماع کی سطح پر وہ کیوں کر دکھائی دیں گے۔ اس سے اسلام کے معاملہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ افراد کا اسلامی کام اسی وقت اسلامی کام ہے جب کہ اس کا فائدہ مجموعۂ اسلام کو مل رہا ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ انفرادی کاروبار ہے خواہ اس کو کرتے ہوئے کتنا ہی زیادہ اسلام کی تلاوت کی جا رہی ہو۔ اور اس کے اوپر کتنے ہی عالی شان اسلامی بورڈ لگے ہوئے ہوں۔

جوتے اور کپڑے کی دکان آدمی اس لئے کھولتا ہے کہ اس سے اس کو نفع حاصل ہو، اسی مزاج کے تحت اگر کسی بظاہر اسلامی کام کو کیا جائے تو اس کا ظاہری طور پر اسلامی ہونا اس کو خدا کی نظر میں اسلامی نہیں بناتا۔ کیونکہ اسلام میں عمل کا دارومدار نیت پر ہے۔ اللہ کو وہ عمل پسند ہے جو صرف اس کی رضا حاصل کرنے کے لئے کیا گیا ہو۔ پھر جس کام کو دنیوی مقاصد کے لئے کیا جائے اس پر خدا کی برکتیں کس طرح نازل ہوں گی۔

پہاڑوں پر بے شمار چھوٹے چھوٹے جھرنے جاری ہوتے ہیں۔ اپنی انفرادی حیثیت میں وہ صرف پانی کے سوت کی مانند

ہوتے ہیں۔ مگر جب قدرت ان کو ایک دھارے میں ملا دیتی ہے تو ان کا ملنا ایک بڑے دریا کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہی چیز اہل ایمان کی اسلامی کوششوں کے سلسلہ میں بھی مطلوب ہے۔ "اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح مل کر لڑتے ہیں جیسے کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں (صف ۴) وہی اسلامی عمل اللہ کے نزدیک اسلامی عمل ہے جس کا رخ اجتماعیت کی طرف ہو۔ جب کہ انفرادی کوششیں اس طرح جاری ہوں کہ بالآخر وہ سب کی سب مل کر ایک دریا بن جائیں۔ اس کے برعکس اگر افراد کی اسلامی کوششیں الگ الگ جھرنوں کی صورت میں بہتی رہیں اور دوسروں کی اسلامی کوششوں سے مل کر ایک بڑا دھارا نہ بنیں تو وہ خدا کے نزدیک بے قیمت ہیں۔

اگر لوگ ذاتی محرک کے تحت کام کر رہے ہوں تو ان کا اسلامی عمل انفرادی عمل بن کر رہ جاتا ہے اور اگر وہ خدا کے لئے متحرک ہوئے ہوں تو ناممکن ہے کہ ان کا عمل صرف اپنی ذات کے گرد گھومے، دوسروں کے ساتھ مل کر بڑا دھارا نہ بنے۔ لوہے کے ٹکڑے اسی وقت تک الگ الگ رہتے ہیں جب کہ ان کے درمیان کوئی مقناطیس نہ ہو۔ جب ان کے درمیان ایک مقناطیس آجائے تو لازماً وہ سب مقناطیس کے گرد جڑ کر ایک ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اہل اسلام کی کوششیں اگر حقیقۃً خدا کے لئے ہو رہی ہوں تو خدا کی ذات ایک عظیم مقناطیس بن جاتی ہے جو تمام کوششوں کو ایک نقطہ کے گرد سمیٹ دیتی ہے — اہل اسلام کی کوششوں کا انتشار اس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ خدا کے لئے نہ ہو بلکہ اپنی ذات کے لئے ہو۔

اجتماعی کام کے لئے جب کچھ لوگ ساتھ ہوتے ہیں تو طرح طرح کی ناموافق باتیں پیش آتی ہیں۔ کبھی مزاجوں کا اختلاف دل شکنی کا باعث ہوتا ہے۔ کبھی کسی کی تنقید سے خفت اٹھانی پڑتی ہے۔ کبھی ایک شخص کی کمزوری سے دوسرے کو تکلیف پہنچتی ہے۔ کبھی ضرورت ہوتی ہے کہ سنانے کے شوق کو دبا کر سننے کے لئے اپنے کو آمادہ کیا جائے۔ کبھی تقاضا ہوتا ہے کہ دوسرے کی صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے آپ کو پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کے لئے راضی کیا جائے۔ غرض بار بار ایسے مواقع سامنے آتے ہیں جہاں اپنی انفرادیت کو کچلنے کا سوال ہوتا ہے۔ یہی مواقع آدمی کے جذبہ اتحاد کا امتحان ہوتے ہیں۔

کوئی بڑا اسلامی کام صرف وہ لوگ کرتے ہیں جن کے اندر اتنی بلندی ہو کہ وہ مفاد اور مصلحت کے بغیر جڑ سکتے ہوں۔ وہ اس وقت بھی اپنے بھائی کی قدر کریں جب کہ اس سے ان کی ذات کو خوشامد کی غذا نہ مل رہی ہو — وہ اپنے بھائی کے اوپر خرچ کریں مگر ان کے اندر اپنے بڑے ہونے کا احساس نہ پیدا ہو۔ وہ اپنے بھائی کی کمزوری کو دیکھیں مگر اس کو نمایاں کرنے کا جذبہ ان کے اندر نہ ابھرے۔ وہ دوسرے کی زبان سے اپنے بارے میں کڑوی بات سنیں مگر ان کے دل میں دوسرے کے لئے نفرت کا جذبہ نہ پیدا ہو۔ دوسرے کی طرف سے ان کے مزاج کے خلاف رویہ ظاہر ہو مگر اس کو وہ دوسرے کے بارے میں رائے قائم کرنے کی بنیاد نہ بنائیں۔ دوسرے کی ذات سے ان کا کوئی مفاد وابستہ نہ ہو پھر بھی وہ خدا کے لئے اس سے محبت کریں —— اسی کا نام "صبر" ہے۔ اور اسی قسم کے صبر والے لوگ کوئی بڑا دینی کام کرتے ہیں اور انھیں لوگوں کے ملنے سے وہ چیز وجود میں آتی ہے جس کا نام اسلامی اتحاد ہے۔

اتحاد کے لئے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ شخصی قربانی ہے۔ جس گروہ کے افراد میں یہ طاقت ہو کہ وہ اپنے شخصی تقاضوں کو اجتماع کی خاطر دبا سکیں، ان میں اتحاد قائم ہو کر رہتا ہے، اور وہی ہیں جو کوئی بڑا کام کرتے ہیں۔

دنیا کے بارے میں سنجیدہ، آخرت کے بارے میں سنجیدہ نہیں

ایک لیڈر کا سیاسی مفاد دوسرے لیڈر سے وابستہ ہو تو وہ اس کی خوبیوں سے آخری حد تک واقف ہو جاتا ہے اور دل کھول کر اس کا اعتراف کرتا ہے۔ اسی طرح ایک دکان دار کے پاس جب کوئی آدمی نوٹوں کی گڈیاں لے کر شادی کا سامان خریدنے کے لئے جاتا ہے تو دکان دار اس سے کمال نرمی اور اخلاق کے ساتھ پیش آتا ہے۔ ڈاکوؤں کی پارٹی حد درجہ اتفاق و اتحاد کے ساتھ کام کرتی ہے۔ اسمگلنگ کی دنیا میں دیانت داری اور قول کی پابندی کا اصول انتہائی معیاری صورت میں قائم ہوتا ہے۔ لوگ اپنے دنیا کے معاملات میں پوری طرح سنجیدہ ہیں۔ کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ ایسے نہ بنیں تو وہ اپنے مطلوبہ فوائد کو حاصل نہیں کر سکتے۔ اس لئے جہاں دنیوی مفاد اور دنیوی مصلحت کا معاملہ ہو، وہ بہت جلد با اصول اور با اخلاق انسان بن جاتے ہیں۔ مگر جہاں دنیوی مفاد خطرہ میں نظر نہ آئے اور دنیوی مصلحتوں کے بگڑ جانے کا اندیشہ نہ ہو وہاں وہ بالکل بے حس اور بے کردار بن جاتے ہیں۔ دنیا کی چیزوں میں ان کی حسّاسیت خوب کام کرتی ہے۔ وہ معاملہ کی نزاکتوں کو فوراً سمجھ لیتے ہیں اور فوراً اپنے رویہ کو اس کے مطابق بنا لیتے ہیں۔ مگر جہاں ان کی اپنی ذات محفوظ نظر آئے۔ جہاں دنیوی مفادات خطرہ میں نہ ہوں وہاں وہ ایسے بن جاتے ہیں گویا ان کے اندر احساس نام کی کوئی چیز موجود ہی نہیں۔ ایک ہوشیار آدمی اچانک بالکل بے وقوف اور ایک حساس آدمی اچانک بالکل بے حس دکھائی دینے لگتا ہے۔

لوگ خواہ مذہبی ہوں یا غیر مذہبی، ان کا اصلی مذہب صرف دنیا پرستی ہے۔ خدا پرستی سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ اگر وہ مذہبی ہوتے تو جو اخلاقیات کسی کے اندر دنیا کے زور پر ابھرتی ہیں وہی اخلاقیات ان کے اندر آخرت کے زور پر پیدا ہوتیں۔ سچا مذہب یہ ہے کہ آدمی خالص اصول پسندی اور اعتراف حقیقت کی بنیاد پر دوسرے کے فضل کو مانے، خواہ اس کے لئے کوئی ظاہری دباؤ موجود نہ ہو۔ آخرت کے خوف نے اس کے اندر نرمی اور تواضع پیدا کر دی ہو۔ اللہ کی رضا حاصل کرنے کا جذبہ اس کو اتحاد و اتفاق پر مجبور کر دے۔ جہنم سے بچنے اور جنت حاصل کرنے کے شوق میں وہ عہد کو پورا کرنے والا اور معاملات میں دیانت داری برتنے والا بن گیا ہو۔

کچھ ایسے لوگ بھی ملیں گے جو عام حالات میں شرافت اور معقولیت کا ثبوت دیں گے۔ لیکن اگر ان کے خلاف کوئی قابل شکایت بات ہو جائے تو وہ فوراً بدل جائیں گے۔ ان سے شرافت اور معقولیت کا تحفہ صرف اس کو مل سکتا ہے جو ان کی "انا" کو خوش کر رہا ہو۔ جو ان کی اپنی بڑائی کے تانے بانے کو منتشر نہ کرے۔ مگر جس شخص سے انھیں کسی قسم کی ٹھیس پہنچ جائے، اس کے لئے وہ مکمل طور پر غیر شریف اور غیر معقول انسان بن جاتے ہیں۔ اس قسم کے کردار کے لوگوں کا بھی دین و مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ مذہب نام ہے حقیقت اعلیٰ کو معیار بنانے کا۔ مگر وہ اپنے عمل سے بتا رہے ہیں کہ وہ خود اپنی ذات کو معیار بنائے ہوئے ہیں۔ وہ خود پرست ہیں نہ کہ خدا پرست۔ جتنا سنجیدہ وہ اپنی ذات کے بارے میں ہیں اتنے ہی سنجیدہ اگر وہ آخرت کے بارے میں ہوتے تو وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتے تھے۔

اصل کام ابھی باقی ہے

حال میں مختلف مسلم ملکوں میں اسلام کے نام پر جو ہنگامے شروع ہوئے ہیں، انھوں نے دنیا بھر میں لوگوں کے لئے بحث و گفتگو کا نیا موضوع پیدا کر دیا ہے۔ مغربی اخبارات میں اس قسم کی سرخیاں اب عام ہو گئی ہیں:

جنگی اسلام بر سر عمل	Militant Islam is on the march
اللہ کے سپاہیوں کا اقدام	Soldiers of Allah advance.
مسلم دنیا کی جنگ جوئی پھر زندہ	Muslim World rekindles its militancy.

اس میں یہ اضافہ کرنا ضروری ہے کہ اسلام کی "عسکریت" پہلے اغیار کے حملوں کو پسپا کرنے کے لئے بر سر عمل آئی تھی۔ مگر آج اسلامی عسکریت خود اپنوں کو قتل کرنے کے لئے متحرک ہوئی ہے۔ اغیار کا مقابلہ کرنا اسلام میں عین مطلوب ہے۔ مگر اپنوں کی قتل و غارت گری کا کوئی تعلق اسلام سے نہیں۔ یہ کچھ لوگوں کا اپنا گھڑا ہوا اسلام ہے نہ کہ قرآن و سنت کا اسلام۔

اسلام کا چرچا آج ساری دنیا میں بہت بڑے پیمانہ پر ہو رہا ہے۔ پریس، ریڈیو، ٹیلی وژن، تعلیم گاہ، کانفرنس، غرض تمام اشاعتی ذرائع سے آج اسلام کے اتنے چرچے ہو رہے ہیں جتنے شاید تاریخ میں کبھی نہیں ہوئے تھے۔ ممکن ہے یہ اس بات کی علامت ہو کہ وہ وقت آگیا ہے جب کہ، حدیث کی پیشین گوئی کے مطابق، کوئی کچا پکا گھر زمین پر ایسا نہیں بچے گا جس میں اسلام کی آواز داخل نہ ہو گئی ہو۔ تاہم جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، اس واقعہ میں ان کے لئے بظاہر خوشی کا زیادہ موقع نہیں کیوں کہ جو کچھ ہو رہا ہے اس میں ان کا وہ حصہ نہیں ہے جو کہ حقیقی طور پر ہونا چاہئے۔ قرآن کی تجارت کا بڑا حصہ آج غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہے۔ ظاہر ہے کہ صحت و نفاست کے ساتھ قرآن کی اشاعت ایک مطلوب کام ہے۔ مگر یقینی ہے کہ جو غیر مسلم اس کام کو کر رہے ہیں وہ اس کے لئے خدا کے یہاں کسی اجر کی توقع نہیں رکھ سکتے۔

ہمارے لئے سب سے زیادہ قابلِ غور بات یہ ہے کہ اسلام کے نام پر ساری دنیا میں ہلچل کے باوجود اسلام کا اصل کام ابھی ہونا باقی ہے۔ ایک مسلمان اور دوسرے مسلمان کے درمیان جو رشتہ ہے وہ خیر خواہی اور اتحاد کا رشتہ ہے۔ اس پہلو سے وہی تحریک اسلامی تحریک ہے جو مسلمانوں کے درمیان برادرانہ تعلق کو مضبوط کرے۔ جو ان کو ایک واحد جسمانی نظام کی طرح باہم جوڑ دے۔ مگر موجودہ تحریکیں اس کے برعکس نتیجہ ظاہر کر رہی ہیں۔ ہماری موجودہ تحریکیں، کم از کم عملاً، مسلمانوں کو فرقوں اور گروہوں میں بانٹ رہی ہیں، حتیٰ کہ ہر گروہ کا قرآن اور ہر گروہ کی حدیث بھی الگ الگ ہے۔ ہر گروہ کی علیٰحدہ تنظیم، علیٰحدہ صحافت، علیٰحدہ لٹریچر، حتیٰ کہ علیٰحدہ مسجدیں قائم ہیں۔ اور اگر ان میں سے کسی گروہ کو اتفاق سے کہیں اقتدار حاصل ہو جائے، خواہ وہ ایک ادارہ میں ہو یا ایک ملک میں، تو اس کی ساری کوشش یہ ہوتی ہے کہ دوسرے گروہ کے افراد کو اپنے دائرہ سے باہر نکال پھینکے۔ اور اگر ممکن ہو تو گولی اور پھانسی کے ذریعہ ان کا وجود مٹا ڈالے۔ ہر گروہ اپنے کارناموں کو نمایاں کرنے اور دوسرے گروہ کے کاموں پر پردہ ڈالنے میں لگا ہوا ہے۔ ہر گروہ اس کوشش میں ہے کہ اسلام اور ملت اسلام کے لئے ہونے والے تمام کاموں کا کریڈٹ اپنے حصہ میں جمع کرے۔ ہر گروہ

اس خام خیالی میں مبتلا ہے کہ حق تمام تر اس کی طرف ہے اور ناحق تمام تر دوسروں کی طرف ——— اصحاب رسول اسلام کے ذریعہ آخرت کا انعام چاہتے تھے، ان کے پیچھے چلنے والے آج اسلام کے ذریعہ دنیا کا انعام لینے کی کوشش میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں۔

جہاں تک مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلق کا سوال ہے، معاملہ اور بھی زیادہ نازک ہے۔ مسلمان اور غیر مسلموں کے درمیان جو تعلق ہے وہ عام معنوں میں ایک قوم اور دوسری قوم کا تعلق نہیں ہے، بلکہ داعی اور مدعو کا تعلق ہے۔ مگر دنیا بھر میں بے شمار اسلامی ہنگاموں کے باوجود مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ابھی تک داعی اور مدعو کا رشتہ قائم نہ ہو سکا۔ حالاں کہ اللہ کو ہم سے اصلاً جو چیز مطلوب ہے وہ یہی ہے۔ مسلمان اس دنیا میں شاہد ہیں اور دوسری قومیں مشہود۔ مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ غیر مسلم قوموں کے سیاسی اور مادی حریف بنے ہوئے ہیں۔ جب تک ایسا نہ ہو کہ ایک داعی کے مقام پر کھڑا ہو اور دوسرا اپنے کو مدعو کے مقام پر پائے، ہماری اسلامی سرگرمیوں کا نہ وہ فائدہ مل سکتا ہے جو قرآن میں بتایا گیا ہے اور نہ اس قسم کے اعمال آخرت کی عدالت میں ہم کو بری الذمہ کرنے والے ثابت ہو سکتے ہیں۔ دو آدمی باہم گالی گلوج کر رہے ہوں، آپ ان کو شرافت اخلاق کی تلقین کرنے جائیں اور ان کے سر پر ایک بھاری پتھر پٹک دیں، تو آپ کے لئے اس میں کچھ نہیں۔ کیوں کہ بظاہر اگرچہ گالی گلوج سے منع کرنے کا واقعہ پیش آیا۔ مگر آپ کے اور گالی دینے والے کے درمیان مصلح کا تعلق قائم نہیں ہوا۔ پھر خدا کے یہاں آپ کو اس سے کیا مل سکتا ہے۔

موجودہ زمانہ کے غیر مسلموں کی نظر میں مسلمانوں کی حیثیت بس عام قوموں کی طرح ایک قوم کی ہے۔ اور ایسا تصور قائم کرنے میں وہ حق بجانب ہیں۔ اسلامی شخصیتیں اور اسلامی جماعتیں اپنی پڑوسی غیر مسلم قوموں کو اللہ کا پیغام پہنچانے کے لئے اپنے اندر کوئی رغبت نہیں پاتیں۔ البتہ مسلمانوں کے اوپر غیر مسلم قوموں کے "مظالم" کے خلاف احتجاجی بیانات جاری کرنے میں ہر ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا چاہتا ہے۔ ان کی معاشیات یا سیاسیات کے کسی حصہ پر اگر غیر مسلموں نے قبضہ کر لیا تو وہ فوراً اس کے خلاف ایجی ٹیشن چلانے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ سوچ ان میں کبھی نہیں ابھرتی کہ اس قسم کے ہنگاموں کی وجہ سے غیر مسلم ہم کو اپنا دنیوی حریف سمجھ لیتے ہیں اور نتیجۃً اسلامی تحریک ان کی نظر میں اخروی تحریک نہیں رہتی بلکہ ایک قسم کی دنیوی تحریک بن کر رہ جاتی ہے۔ کچھ مسلمان اسلام کو عملیاتی مجموعہ کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں۔ کچھ دوسرے مسلمان ہیں جو اسلام کو سیاسی احکام کے مجموعہ کی حیثیت سے سامنے لا رہے ہیں۔ اس کی وجہ سے عام لوگوں کو اسلام یا تو دوسرے مذاہب کی طرح ایک رسمی مذہب نظر آتا ہے یا کمیونزم کی طرح ایک سیاسی مذہب ———

قرآن کے مطابق مسلمان کا کام شہادت علی الناس ہے۔ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم لوگوں کو جہنم سے ڈرانے والے اور جنت کی خوش خبری دینے والے بنیں۔ مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ سیکولرزم کے احیار سے لے کر اپنے حقوق کی بازیابی تک بے شمار کاموں کے لئے غیر مسلم قوموں سے دست و گریباں ہیں۔ مگر اسی ایک کام کے لئے نہیں اٹھتے جو اللہ نے اصلاً ان کے اوپر فرض کیا تھا۔ یہ غفلت اتنی بڑی ہے کہ اندیشہ ہے کہ مسلمان اللہ کی نظر میں بے قیمت ہو جائیں۔ اور پھر نہ دنیا میں ان کو خدا کا سایہ حاصل ہو اور نہ آخرت میں۔

قدیم آسمانی صحیفے

حضرت موسیٰ کے بعد تین بڑے مواقع ایسے آئے ہیں جب کہ غیر اسرائیلی اقتدار نے بائبل کے "عہد نامہ عتیق" کو برباد کیا۔ پہلی بار بابل کے بادشاہ بخت نصر (۶۰۵ - ۵۶۲ ق م) نے ۵۸۶ ق م میں تمام فلسطین پر حملہ کیا۔ بیت المقدس کو آگ لگادی جس میں حضرت سلیمان نے تورات کی تختیاں رکھوائی تھیں۔ پچاس سال بعد عزرا نبی نے دوبارہ اپنے حافظہ سے پہلے پانچ صحیفوں کو لکھوایا۔ پھر نحمیاہ نے کچھ اور کتابوں کے اضافے کئے۔ دوسری بار انطیوخوس چہارم نے، جو یونانی انطاکیہ کا بادشاہ تھا، بیت المقدس پر ۱۶۸ ق م میں حملہ کیا اور مقدس صحیفوں کو جلا دیا۔ یہوداہ مقابی نے کچھ اضافہ کے ساتھ دوبارہ ان کو مرتب کیا۔ تیسری بار رومی بادشاہ تیتس (۴۰ - ۸۱) نے ۷۰ء میں بیت المقدس پر حملہ کیا اور اس کو ہیکل سلیمان سمیت برباد کرکے اس کو ملبہ میں تبدیل کردیا۔

جہاں تک عہد نامہ جدید کا تعلق ہے، اس کے بارے میں فرانسیسی مستشرق موسیو ایتین دینیہ (Eaton Dien) نے لکھا ہے:

"اللہ نے جو انجیل حضرت عیسیٰؑ کو ان کی اور ان کی قوم کی زبان میں دی تھی، وہ تو کوئی شک نہیں کہ ضائع ہوچکی ہے اور اب اس کا نام و نشان بھی نہیں رہ گیا ہے یا وہ خود تلف ہوگئیں یا بالقصد تلف کردی گئیں۔ اسی وجہ سے عیسائیوں نے اس کی جگہ چار "تالیفات" کو اپنا لیا جن کی صحت اور تاریخی حیثیت مشکوک ہے۔ کیوں کہ یہ یونانی زبان میں ملتی ہیں جس کا مزاج حضرت عیسیٰ کی اصل سامی زبان سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ اس لئے ان یونانی انجیلوں کا اپنے آثارنے والے سے رشتہ یہود کی توراۃ اور عربوں کے قرآن سے کہیں زیادہ کمزور ہے" (اضواء علی المسیحیہ ۵۲ - ۵۳)

یہ سائنس اور مذہب کا تصادم نہ تھا

ابتداءً جن لوگوں نے سائنسی تحقیقات کا کام کیا، وہ کسی بھی درجہ میں مذہب کے مخالف نہ تھے۔ آئزک نیوٹن (۱۶۴۲ - ۱۷۲۷) نے جب فلکیاتی اجرام کی گردش کے قوانین دریافت کئے تو اس نے اپنے ایک دوست کو لکھا: "سیاروں کی مسلسل گردش صرف کشش ثقل کی وجہ سے نہیں ہوسکتی اس کے لئے کوئی خدائی بازو (Divine Arm) ہونا ضروری ہے"۔ ڈارون نے اپنی کتاب اصل الانواع لکھی تو اس نے صاف لفظوں میں خالق (Creator) کے وجود کا اقرار کیا۔ اور اپنی کتاب ان الفاظ پر ختم کی: "زندگی کے اس تصور میں کتنی عظمت ہے کہ خالق نے ابتداءً زندگی کی کچھ سادہ اقسام پیدا کیں اور ان سے زندگی کی انتہائی سادہ اور حیرت انگیز انواع وجود میں آگئیں"۔

اس کے باوجود کیوں ایسا ہوا کہ سائنس مذہب کی دشمن بن گئی۔ اس کی وجہ حقیقۃً سائنس اور مذہب کے درمیان کوئی تصادم نہ تھا، جیسا کہ ڈریپر (۱۸۱۱ - ۱۸۸۲) اور دوسرے لوگوں نے سمجھا ہے۔ یہ دراصل سائنس اور قدیم علم کلام کا تصادم تھا جو مصریات اور یونانیات کی بنیاد پر وضع ہوا تھا نہ کہ خدائی مذہب کی بنیاد پر۔ مذہب کے نمائندوں نے غلطی سے اس کو مذہب اور سائنس کا تصادم سمجھ لیا اور سائنس سے ٹکرا گئے۔ اس غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک زمانی طاقت جو مذہب کی خادم بن سکتی تھی وہ اول روز سے مذہب کی حریف بن گئی۔

آخرت والے عمل سے دنیا کا فائدہ چاہنا

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دور فتنہ کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا

وَقَلَّتْ فُقَهَاءُكُمْ وَكَثُرَتْ قُرَّاءُكُمْ وَتُفُقِّهَ لِغَيْرِ الدِّيْنِ وَالْتُمِسَتِ الدُّنْيَا بِعَمَلِ الْآخِرَةِ (ترغیب و ترہیب)

اس وقت دین کی سمجھ رکھنے والے کم ہو جائیں گے اور دین کے پڑھنے والے بہت ہوں گے۔ دین کو دنیا کے لئے پڑھا جائے گا آخرت کے عمل کے ذریعہ دنیا چاہی جائے گی۔

امت مسلمہ کا بگاڑ یہ نہیں ہے کہ وہ دین کا نام لینا چھوڑ دے یا اس کے درمیان سے دینی شکلیں مٹ گئی ہوں۔ ایسا نہ پچھلی امتوں کے ساتھ ہوا اور نہ امت مسلمہ کے ساتھ کبھی ہوگا۔ امت کا بگاڑ یہ ہے کہ دین کو دنیا کے لئے کیا جانے لگے ——

دینی کام اس جذبہ کے تحت کئے جائیں کہ اس سے مال و اولاد میں برکت ہوگی۔ دین و ملت کے نام پر چندے وصول کئے جائیں اور ان کو ذاتی مفاد میں استعمال کیا جائے۔ جاہ و اقتدار کے ہنگامے کھڑے کئے جائیں اور اس کے لئے دلیل قرآن و سنت سے پیش کی جائے۔ آدمی خدا کے حرام و حلال سے بے نیاز ہو کر کمائے اور اس کے بعد جب وہ اپنا ایک مکان بنائے تو اس پر لکھ دے ھٰذا من فضل ربی (یہ میرے رب کا انعام ہے) اس کی عملی زندگی کا دین سے کوئی تعلق نہ ہو اور جب اس کی خدا فراموش زندگی اس کو ایک کار کی مالک بنا دے تو وہ اپنی گاڑی کے لئے ۷۸۶ نمبر حاصل کرے تاکہ اس کی گاڑی حادثہ سے محفوظ رہے۔ اس بگاڑ کی آخری صورت یہ ہے کہ آدمی خدا کے دین کی ایسی تشریح و تفسیر کرے کہ وہ دین جو آخرت کی چیتاونی کے لئے آیا تھا وہ دنیوی اور سیاسی ہنگاموں کا عنوان بن جائے۔

ہم ایک ایسی دنیا میں ہیں جہاں ہر طرف خدا اور مذہب کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ مگر حقیقی زندگیوں میں خدا اور مذہب کا کہیں وجود نہیں۔ مذہب پر تحریری مظاہرے اور تقریری مشاعرے اتنی کثرت سے جاری ہیں کہ پچھلی تاریخ میں اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ مگر زمین و آسمان اس انسان کو دیکھنے کے لئے ترس رہے ہیں جو فی الواقع خدا سے ڈرتا ہو اور جس نے سنجیدگی کے ساتھ مذہب کو اپنی عملی زندگی میں اختیار کیا ہو۔ لفظی قسم کے مذہبی پہلوانوں کے ہجوم میں حقیقی مذہبی پہلوان اس طرح نایاب ہے کہ ڈھونڈنے سے بھی کہیں نہیں ملتا۔

لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ انصاف اور انسانیت کے نعرے بلند کرتے ہیں مگر عملاً صرف ذاتی مفاد کی سطح پر جی رہے ہیں کسی کا ذاتی مفاد پیسہ کمانا ہے اور کسی کا عزت، شہرت، مرتبہ اور اقتدار حاصل کرنا۔ کوئی "نوٹ" جمع کرنے میں لگا ہوا ہے اور کوئی "ووٹ" کے مسائل میں الجھا ہوا ہے۔ کوئی گھر اور کاروبار کے دائرہ میں اپنے مستقبل کا خواب دیکھ رہا ہے، کوئی اسٹیج اور اخبار کی دنیا میں نمایاں ہونے کو اپنی توجہات کا مرکز بنائے ہوئے ہے۔ خدا کی زمین ایسے انسانوں سے خالی نظر آتی ہے جو خدا کی یاد میں جیتے ہوں، جو آخرت کی فکر میں تڑپتے ہوں۔ جنھوں نے اپنے آپ کو انصاف کے ترازو پر کھڑا کر رکھا ہو۔ جن کے لئے دنیا، اپنی تمام سرسبزی کے باوجود، سرسبز نہ ہو بلکہ ایک وسیع قید خانہ بن گئی ہو۔

علمی جہاد ——— انفاق فی سبیل اللہ کا بہترین مصرف

اسلام کا مطلب اپنے جان اور مال کو اللہ کے حوالے کرنا ہے۔ یہ حوالگی مکمل معنوں میں ہے۔ تاہم ایک خاص حد تک اس کو لازم قرار دیا گیا ہے۔ زکوٰۃ اسی قسم کا ایک حکم ہے جو یاد دلاتا ہے کہ آدمی کے مال میں خدا اور اس کے دین کا بھی حق ہے۔

قرآن میں زکوٰۃ کے جو مصارف بتائے گئے ہیں ان میں سے ایک فی سبیل اللہ (توبہ ۶۰) ہے۔ یعنی اللہ کے راستہ میں دینا۔ اس سلسلے میں فی سبیل اللہ کا مفہوم متعین کرنے کے لئے بہت سی علمی و فقہی بحثیں کی گئی ہیں۔ شیخ یوسف القرضاوی (قطر) نے اس موضوع پر اپنی تحقیقی کتاب "فقہ الزکوٰۃ" میں مفصل اور مدلل گفتگو کی ہے اور آخر میں یہ فیصلہ دیا ہے کہ فی سبیل اللہ سے مراد صرف قتال نہیں ہے، نہ شخصی تملیک اس کے لئے ضروری ہے، بلکہ عمومی نوعیت کا تربیتی اور علمی جہاد بھی اس میں داخل ہے۔ اور شاید آج مسلمان اس کے سب سے زیادہ ضرورت مند ہیں"۔ ذیل میں شیخ یوسف القرضاوی کی بحث کا ایک حصہ نقل کیا جاتا ہے۔ شیخ موصوف لکھتے ہیں:

"موجودہ حالات میں فی سبیل اللہ سے جو اولین اور اہم ترین چیز مراد لی جائے گی وہ ہے صحیح اسلامی زندگی کے احیاء کا وہ پروگرام جو اسلام کے جملہ احکام، عقائد، تصورات، شعائر، شرعی قوانین اور اخلاق و آداب کو بروئے کار لانے کے لئے ہو۔

یہ کام اس قدر اہم اور ضروری ہے کہ اسلام کے غیرت مندوں کو اپنی زکوٰۃ کا مال اور اپنی اعانتیں اس پر صرف کرنی چاہئیں۔

ہماری رائے یہ ہے کہ بحالات موجودہ زکوٰۃ کے اس مصرف کو ثقافتی، تربیتی اور علمی جہاد کے لئے استعمال کرنا بہتر ہوگا۔ بشرطیکہ وہ خالص اور صحیح اسلامی جہاد ہو۔

عصر حاضر میں اسلام کے پیغام کو عام کرنے کے لئے جو سرگرمیوں کی ضرورت ہے۔ اس کی چند مثالیں ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں۔ ان کا شمار بجا طور پر فی سبیل اللہ میں کیا جا سکتا ہے۔

صحیح اسلام کو پیش کرنے کے لئے دعوتی مراکز قائم کرنا جن کے ذریعہ دنیا کے گوشہ گوشہ میں ادیان و مذاہب کی کش مکش کے درمیان غیر مسلمین تک اسلام کا پیغام پہنچایا

سورہ توبہ (آیت ۶۰) میں صدقات کے آٹھ مصارف بیان کئے گئے ہیں جن میں سے پہلے چار مصارف (فقراء، مساکین، عاملین، مولفۃ القلوب) کے لئے حرف لام استعمال ہوا ہے۔ یعنی یہ کہا گیا کہ صدقات " ان کے لئے" ہیں۔ مگر بعد کے چار مصارف (غلام، قرضدار، سبیل اللہ، مسافر) کے لئے حرف فی استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہا گیا کہ صدقات ان کی مد میں صرف کرنے کے لئے ہیں۔ پہلے چار مستحقین کے لئے لام ہے جو تملیک کا معنی دیتا ہے۔ بقیہ چار مستحقین کے لئے فی ہے جو عربی زبان میں ظرفیت کے لئے آتا ہے ——— حکم کے الفاظ میں اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ پہلی چار اصناف کو زکوٰۃ اس طور پر ملتی ہے کہ وہ اس کی مالک ہو جاتی ہیں جب کہ بقیہ چار اصناف کی حیثیت چار مدات کی ہے (فقہ الزکوٰۃ از شیخ یوسف القرضاوی، قطر)

جاسکے یقیناً جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

اسلامی ممالک کے اندر ایسے اسلامی مراکز قائم کرنا بھی جہاد فی سبیل اللہ میں شامل ہے جو مسلم نوجوانوں کی صحیح تربیت کریں۔ اسلام کے اعتدال پسندانہ نقطۂ نظر کے مطابق ان کی رہنمائی کریں، الحاد، فکری انحراف اور عملی بے راہ روی سے انھیں بچائیں اور انھیں اسلام کی حمایت و نصرت اور اس کے دشمنوں سے نبرد آزمائی کے [illegible] کریں۔

اسی طرح خالص اسلامی پرچہ کا اجراء جو گمراہ صحافت کے درمیان اللہ کا کلمہ بلند کرنے حق بات کا اظہار کرنے، اسلام پر عائد کئے جانے والے جھوٹے الزامات کی تردید کرنے، شبہات کا ازالہ کرنے، اور اسلام کو ہر قسم کی حاشیہ آرائی اور شائبوں سے پاک کر کے صحیح شکل میں پیش کرنے کی خدمت انجام دے ——— بلاشبہ جہاد فی سبیل اللہ ہے

ایسی دینی کتاب کی وسیع پیمانہ پر اشاعت جو بنیادی اہمیت کی حامل ہو اور جو اسلام کو یا اس کے کسی پہلو کو اس خوبی کے ساتھ پیش کرے کہ اس کے پوشیدہ جواہر پر سے پردہ اٹھ جائے۔ اس کی تعلیمات کی خوبیاں نمایاں ہوں اور اس کے حقائق بے نقاب ہوں جہاد فی سبیل اللہ کے مترادف ہے۔

پختہ کار، امانت دار اور مخلص افراد کو فارغ کرنا تاکہ وہ دین کی خدمت کریں، اس کی روشنی چار دانگ عالم میں پھیلائیں، اس کے دشمنوں کی چالوں کو بے اثر کر کے رکھ دیں۔ فرزندان اسلام میں بیداری پیدا کریں اور عیسائی مشن، الحاد اور اباحیت کے طوفان کا مقابلہ کریں من جملہ جہاد فی سبیل اللہ کے ہے اور دین حق کے داعیوں کی معاونت کرنا جن پر خارج سے اسلام دشمن طاقتیں داخلی عناصر۔ مرتد اور سرکش افراد۔ کی مدد سے مسلط ہو جاتی ہیں اور انھیں طرح طرح کی اذیتیں اور تکلیفیں دینے لگتی ہیں۔ ان کی معاونت کرنا تاکہ وہ کفر اور سرکشی کے مقابلہ میں ثابت قدم رہیں سراسر جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

مسلمانوں کو چاہئے کہ زکوٰۃ کے صرف میں ایسے کاموں کو اولین اہمیت دیں کیوں کہ اسلام کے مددگار اللہ کے بعد فرزندانِ اسلام ہی ہیں اور خاص طور سے ایسے دور میں جب کہ اسلام غربت سے دوچار ہے۔

فقہ الزکوٰۃ، ترجمہ از مولانا شمس پیرزادہ۔ ممبئی

آخرت کی فکر نے ان کو دیوانہ بنا دیا تھا

حسن بصری تابعی نے بڑی تعداد میں اصحاب رسول اللہ کو دیکھا تھا۔ انھوں نے اپنی ایک تقریر میں اپنے زمانہ کے لوگوں سے کہا:

لقد ادرکت سبعین بدریا۔ اکثر لباسهم الصوف، ولو رأیتموهم لقلتم مجانین۔ ولو رأوا واخیارکم لقالوا ما لهولاء من خلاق، ولو رأوا واشرارکم لقالوا مایومن هولاء بیوم الحساب۔ ولقد رأیت اقواما کانت الدنیا اهون علی احدهم من التراب تحت قدمیه

میں نے ستر بدری صحابہ کو دیکھا ہے۔ ان کا لباس اکثر صوف کا ہوتا تھا۔ اگر تم انھیں دیکھتے تو کہتے کہ یہ پاگل ہیں۔ اگر وہ تمھارے اچھوں کو دیکھیں تو کہیں گے کہ دین میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔ اگر وہ تمھارے بروں کو دیکھیں تو وہ کہیں گے کہ یہ لوگ روز حساب پر ایمان نہیں رکھتے۔ میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں کہ دنیا ان کے نزدیک پاؤں کے نیچے کی مٹی سے بھی زیادہ بے حقیقت تھی۔

سب سے بری چیز: خودپسندی

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین چیزیں نجات دینے والی ہیں اور تین چیزیں ہلاک کرنے والی۔ نجات دینے والی چیزیں یہ ہیں: کھلے اور چھپے اللہ کا ڈر رکھنا، خوشی اور ناراضی دونوں حالتوں میں حق بات کہنا اور خوش حالی اور غریبی دونوں میں اعتدال پر قائم رہنا۔ ہلاک کرنے والی چیزیں یہ ہیں کہ خواہش کی پیروی کی جائے۔ بخل کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اور آدمی کی خودپسندی۔ اور یہ آخری چیز سب سے زیادہ سخت ہے (بیہقی)

کمزوروں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرنا

جنگ بدر (۲ھ) میں مشرکین کے جو ستر افراد گرفتار کرکے مدینہ لائے گئے، ان میں سے ایک کا نام سہیل بن عمرو تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ سہیل ایک آتش بیان مقرر ہے، آپ کے خلاف تقریریں کرتا رہتا ہے۔ اس کے دانت تڑوا دیجیے۔ آپ نے فرمایا: "اگر میں اس کے دانت تڑواؤں تو اللہ میرے دانت توڑ دے گا اگرچہ میں رسول ہوں" (سیرت ابن ہشام) جنگ بدر کے قیدیوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف صحابہ کے گھروں میں بانٹ دیا اور ہدایت فرمائی: استوصوا بالاساری خیرا (ان قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا) ان میں سے ایک قیدی ابوعزیز کا بیان ہے کہ مجھے جن انصاریوں کے گھر میں رکھا گیا وہ صبح و شام مجھ کو روٹی کھلاتے اور خود صرف کھجوریں کھا کر رہ جاتے۔ یمامہ کے سردار ثمامہ بن اثال جب گرفتار ہو کر آئے تو جب تک وہ قید میں رہے، آپ کے حکم سے ان کو عمدہ کھانا اور دودھ مہیا کیا جاتا رہا۔

مومن ہر وقت یاد رکھتا ہے کہ اس کی آخری منزل قبر ہے

ابونعیم نے عروہ کے واسطے سے نقل کیا ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ ایک روز ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے۔ آپ نے دیکھا کہ وہ کجاوہ کے ٹاٹ پر لیٹے ہوئے ہیں اور ایک گٹھری کا تکیہ بنا رکھا ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: تم نے وہ نہیں کیا

جو تمہارے ساتھیوں نے کیا ہے۔ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اے امیرالمومنین! یہ میری خواب گاہ (قبر) تک پہنچانے کے لئے کافی ہے (یا امیرالمؤمنین! ھذا یبلغنی المقیل، حلیۃ الاولیاء، جلد ۱)

آخرت کی سختی کا خیال ہر چیز سے بے رغبت کر دیتا ہے

ابوالدرداء رضی اللہ عنہ اسلام سے پہلے تجارت کرتے تھے۔ اسلام کے بعد ان کی تجارت چھوٹ گئی۔ ابن عساکر کی ایک روایت کے مطابق انھوں نے کہا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں ابوالدرداء کی جان ہے، آج مجھ کو یہ بھی پسند نہیں کہ مسجد کے دروازہ پر میری ایک دکان ہو۔ میری ایک بھی جماعت کی نماز نہ چھوٹتی ہو۔ میں روزانہ چالیس دینار نفع کماؤں اور سب کا سب اللہ کے راستہ میں صدقہ کر دوں۔" پوچھا گیا: اے ابوالدرداء! کیا چیز ہے جس نے آپ کے لئے اس کو ناپسندیدہ بنا دیا ہے۔ جواب دیا: حساب کی سختی (شدۃ الحساب، کنز العمال، جلد ۲ صفحہ ۱۴۹)

آدمی لمبے انتظامات کرتا ہے حالاں کہ وہ جلد ہی مرنے والا ہے

ابونعیم نے عبداللہ بن ابوہذیل سے نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جب اپنا گھر بنایا تو انھوں نے عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے کہا، آؤ دیکھو میں نے کیا بنایا ہے۔ عمار رضی اللہ عنہ گئے اور ان کا مکان دیکھا۔ پھر فرمایا: دور کی امید کر رہے ہو اور جلد ہی مرو گے (تامل بعید او تموت قریبا، حلیۃ الاولیاء، جلد ۱ صفحہ ۱۴۲)

آخرت سے پہلے دنیا میں بدلہ

ابوفرات کہتے ہیں کہ عثمان رضی اللہ عنہ کا ایک غلام تھا۔ ایک روز آپ نے اپنے غلام سے کہا: میں نے تیرا کان ملا تھا، تو مجھ سے اس کا بدلہ لے لے۔ اس نے آپ کا کان پکڑا۔ آپ نے فرمایا اشدد (سختی سے مل): کتنا اچھا ہے کہ دنیا میں بدلہ ہو جائے، آخرت میں بدلہ کے لئے نہ رہے۔ (یا حبذا قصاص فی الدنیا لا قصاص فی الآخرۃ)

موت کے قریب پہنچ کر

بلال بن رباح رضی اللہ عنہ کی موت کا وقت آیا تو ان کے گھر کے لوگ جمع ہوئے اور کہا: واکربا ہ (ہائے غم) بلال نے جواب میں کہا: واطربا ہ، غدا القی الاحبۃ محمد او صحبہ (ہائے خوشی۔ کل میں اپنے دوستوں سے ملوں گا، محمد اور ان کے اصحاب سے) خلیفہ ثانی عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا آخر وقت آیا تو آپ کی زبان سے نکلا: إن نجوت کفافا لا وزر ولا اجر انی لسعید (اگر میں برابر برابر چھوٹ جاؤں، نہ سزا ہو نہ انعام ملے تو یقیناً میں کامیاب رہا)

سب سے زیادہ فکر جہنم کے عذاب سے بچنے کی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی ام حبیبہ رض نے ایک روز ان لفظوں میں دعا مانگی:

اللّٰھم امتعنی بزوجی رسول اللّٰہ وبابی سفیان وباخی معاویہ (مسلم)	خدایا! میرے شوہر رسول اللہ اور میرے باپ ابوسفیان اور میرے بھائی معاویہ کا سایہ میرے اوپر دراز رکھ۔

آپ نے سن کر فرمایا: ام حبیبہ! عمریں تو سب کی اللہ کے یہاں مقرر ہو چکی ہیں۔ تم کو دعا کرنی تھی تو عذاب جہنم سے نجات پانے کی دعا کرتیں۔

مومن کی آنکھ کی ٹھنڈک یہ ہے کہ اس کی اولاد دیندار ہو

مقداد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ حال تھا کہ ایک گھر میں کوئی اسلام کا ماننے والا ہوتا، کوئی اس کا انکار کرنے والا۔ ایک مسلمان اپنے باپ، اپنے بیٹے یا اپنے بھائی کو حالت کفر میں دیکھتا۔ اس سے سخت تکلیف ہوتی۔ اس کے دل کو اللہ نے جس ایمان کے لئے کھول دیا تھا، اس کی وجہ سے اس کو یقین ہوتا کہ یہ اسی حالت پر رہا تو ہلاک ہو جائے گا اور آگ کے عذاب میں داخل ہوگا۔ اس لئے اپنے ان رشتہ داروں کو دیکھ کر اس کی آنکھیں ٹھنڈی نہ ہوتیں (وقد فتح اللہ قفل قلبہ للایمان لیعلم انہ قد ھلک من دخل النار فلا تقر عینہ، حلیۃ الاولیاء جلد اول) ایسے ہی لوگوں کے بارہ میں اللہ نے یہ آیت اتاری:

ربنا ھب لنا من ازواجنا وذریاتنا قرۃ اعین واجعلنا للمتقین اماما (شعراء)

اے ہمارے رب! ہم کو اپنی بیویوں اور اپنی اولاد میں آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہم کو متقیوں کا امام بنادے۔

جنت کی حرص

طبرانی اور ابن عساکر نے بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مکہ کے مسلمان ہجرت کرکے مدینہ آئے۔ یہاں کا پانی ان کو پسند نہ آیا۔ بنی غفار کے ایک آدمی کے پاس ایک کنواں تھا جس کو بیر رومہ کہا جاتا تھا۔ مہاجرین کو اس کا پانی پسند تھا۔ اس کا مالک ایک مشک پانی ایک مُد (صاع کا چوتھائی) کے عوض بیچتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آدمی سے کہا: بعنیھا بعین فی الجنۃ (اس کنویں کو جنت کے ایک چشمہ کے عوض مجھے بیچ دے)۔ اس آدمی نے کہا: میرے اور میرے عیال کے پاس اس کے سوا کوئی ذریعہ نہیں۔ اس لئے اس کو میں اس طرح نہیں دے سکتا۔ اس واقعہ کی خبر عثمان رضی اللہ عنہ کو پہنچی۔ انھوں نے بیر رومہ کو ۳۵ ہزار درہم دے کر خرید لیا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر کہا: اے خدا کے رسولؐ! کیا اس کنوئیں کے عوض میرے لئے بھی جنت کا چشمہ ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ انھوں نے اس کو عام مسلمانوں کو دے دیا۔

ایک کے لئے برکت، دوسرے کے لئے وبال

عبدالرزاق نے سعید بن مسیب کے واسطہ سے نقل کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کو غزوۂ حنین کے بعد کچھ عطیہ دیا۔ حضرت حکیم رضؓ کو وہ کم معلوم ہوا۔ آپؐ نے دوبارہ عطا فرمایا۔ انھوں نے کہا اے خدا کے رسولؐ! آپ کا کون سا عطیہ بہتر تھا۔ آپ نے فرمایا پہلا۔ پھر آپ نے کہا:

یا حکیم بن حزام! ان ھذا المال خضرۃ حلوۃ فمن اخذہ بسخاوۃ نفس وحسن اکلۃ بورک لہ فیہ ومن اخذہ باستشراف نفس وسوء اکلۃ لم یبارک لہ فیہ وکان کالذی یاکل ولا یشبع۔ والید العلیا خیر من الید السفلی۔ قال ومنک یا رسول اللہ قال ومنی

(کنز العمال جلد ۳)

اے حکیم! یہ مال سرسبز و شیریں ہے۔ جس نے اس کو سخاوت نفس اور بہتر طریق پر کھانے کے لئے لیا اس کے لئے اس میں برکت دی جائے گی۔ اور جس نے اس کو حرص نفس کے ساتھ لیا اور برے طریقہ سے کھایا اس کے لئے اس میں برکت نہ دی جائے گی۔ اور وہ اس آدمی کی طرح ہوگا جو کھاتا ہے مگر سیر نہیں ہوتا۔ اور اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے۔ پوچھا: خواہ آپ سے لے

اے خدا کے رسول۔ فرمایا خواہ مجھ سے لے

دنیا میں جاہ پسندی آخرت میں ذلت کا باعث ہوگی

بخاری نے ابو مجلز سے روایت کیا ہے۔ معاویہ رضی نکلے وہ ایک مقام پر پہنچے جہاں عبداللہ بن عامر رضی اور عبداللہ بن زبیر رضی بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت معاویہ رضی کو دیکھ کر عبداللہ بن عامر رضی کھڑے ہو گئے اور عبداللہ بن زبیر بیٹھے رہے۔ حضرت معاویہ رضی نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: جس کو یہ بات پسند ہو کہ اللہ کے بندے اس کے لئے کھڑے رہیں تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے (من سرہ ان یمثل لہ عباد اللہ قیاما فلیتبوأ بیتا من النار، الادب المفرد صفحہ ۱۴۴)

آخرت کی خاطر دنیا کو چھوڑنا

ابونعیم نے عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کے واسطہ سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عمر رضی اللہ عنہ کے پاس عراق سے کچھ لوگ آئے۔ کھانے کا وقت ہوا تو آپ ان کے پاس ایک بڑا پیالہ لائے جس میں بے چھنے آٹے کی روٹی اور روغن زیتون تھا۔ ان لوگوں سے کہا کھاؤ۔ انھوں نے آہستہ آہستہ بہت تھوڑا تھوڑا کھانا شروع کیا۔ آپ نے فرمایا: اے اہل عراق! تم جو کچھ کر رہے ہو، میں دیکھ رہا ہوں۔ سنو! اگر میں چاہوں تو میرے لئے بھی اچھا اور نرم کھانا تیار ہو سکتا ہے جیسا کہ تمھارے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ پھر فرمایا:

ولکنا نستبقی من دنیانا نجدہ فی آخرتنا۔ اما سمعتم اللہ عز وجل قال لقوم (اذهبتم طیباتکم فی حیاتکم الدنیا)

مگر ہم اپنی دنیا میں باقی رکھتے ہیں تاکہ ہم اس کو اپنی آخرت میں پائیں۔ کیا تم نے نہیں سنا کہ اللہ نے ایک گروہ کے لئے فرمایا: تم اپنی اچھی چیزیں اپنی دنیوی زندگی میں حاصل کر چکے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: تم لوگ کیا چاہتے ہو۔ کیا میٹھا اور نمکین اور گرم اور سرد۔ جو بھی کھاؤ، پھینکنے ہی کی چیز پیٹ میں بنے گی (حلیۃ الاولیار جلد ۱) سائب بن یزید کہتے ہیں۔ میں نے کئی بار شام کا کھانا عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ کھایا۔ وہ معمولی روٹی اور سادہ گوشت کھاتے پھر اپنے ہاتھ کو اپنے پاؤں سے پونچھ لیتے اور فرماتے: آل عمر رضی کا تولیہ یہی ہے (یاکل الخبز واللحم ثم یمسح یدہ علی قدمہ ثم یقول: هذا منديل عمر وآل عمر)

دنیا کے معاملات میں بے نفسی

خرجہ ابن ابی الدنیا من روایۃ محمد بن مهاجر عن یونس بن میسرۃ قال: لیس الزهادۃ فی الدنیا بتحریم الحلال ولا اضاعۃ المال ولکن الزهادۃ فی الدنیا ان تکون بما فی ید اللہ اوثق منک بما فی یدک وان تکون حالک فی المصیبۃ حالک اذا لم تصب بها سواء وان یکون مادحک وذامک فی الحق سواء

جامع العلوم والحکم صفحہ ۲۵۴

ابن ابی الدنیا نے محمد بن مہاجر کے واسطہ سے یونس بن میسرہ کا قول نقل کیا ہے۔ زہد یہ نہیں ہے کہ حلال چیزوں کو حرام کر لو یا مال کو ضائع کرو۔ بلکہ زہد یہ ہے کہ تمھارے پاس جو کچھ ہے اس سے زیادہ اعتماد تم کو اس پر ہو جو اللہ کے پاس ہے۔ اور مصیبت میں تمھارا جو حال ہوتا ہے وہی اس وقت بھی ہو جب کہ مصیبت نہ ہو۔ اور حق کے معاملہ میں تعریف کرنے والا اور مذمت کرنے والا دونوں تمھاری نظر میں برابر ہو جائیں۔

خدا کو ہمارے دل کی تڑپ مطلوب ہے

عبد اللہ بن جدعان ایک مشرک مگر نیک دل عرب تھا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے مرگیا۔ اس نے جاہلیت کے زمانہ میں بہت سے ایسے کام کئے تھے جن کو عام طور پر نیک کام سمجھا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں پوچھا گیا کہ کیا اس کو اس کے نیک اعمال کا بدلہ ملے گا۔ آپ نے فرمایا: اس کی زبان سے کبھی یہ نہیں نکلا کہ اللھم اغفر لی (اے اللہ مجھے بخش دے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے اصل میں جو چیز مطلوب ہے وہ یہ کہ ان کے اندر عجز کی کیفیت پیدا ہو۔ وہ شدید طور پر یہ محسوس کرنے لگیں کہ تمام چیزوں کا مالک صرف اللہ ہے۔ اسی کے دینے سے وہ پائیں گے، وہ اگر نہ دے تو وہ کچھ بھی نہیں پا سکتے۔ اس حقیقتِ واقعہ کو اپنے اندر اتار لینے کا نام ایمان ہے۔ جو اس یافت کے مقام تک نہ پہنچے اس کی پوری زندگی بے قیمت ہے، حتیٰ کہ اس کا بظاہر نیک عمل بھی۔ اللہ کے یہاں وہ کام مقبول ہوتا ہے جو صرف اس کی خاطر کیا گیا ہو۔ محض انسانی ہمدردی یا خدمتِ خلق کے جذبہ کے تحت کیا ہوا کام اللہ کو پسند نہیں۔ کیونکہ وہ آدمی کی اپنی بڑائی کی تسکین کے لئے ہوتا ہے جب کہ خدا کی اس دنیا میں خدا کے سوا کسی کو کسی بھی قسم کی کوئی بڑائی حاصل نہیں۔

اسلامی انقلاب اسلامی لوگوں کے ذریعہ آتا ہے

غزوہ بدر کے موقع پر ایک بہادر مشرک نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ میں چلنے کی درخواست کی۔ مگر آپ نے اس کو قبول نہیں کیا۔ آپ نے اس سے پوچھا: کیا تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہو۔ اس نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا: میں کسی مشرک سے مدد نہیں لے سکتا۔ اس کے بعد اس نے کلمہ کا اقرار کیا اور مسلمان ہو کر غزوہ میں شرکت کی ——— یہ پیغمبر اسلام کی سیاست تھی۔ مگر موجودہ زمانہ میں اسلامی سیاست کے ایسے قائدین پیدا ہوئے ہیں جن کا سارا انحصار غیر اسلامی طاقتوں کے تعاون پر ہوتا ہے۔ تاہم انھیں اپنی اس سیاست کے غیر اسلامی ہونے کا احساس صرف اس وقت ہوتا ہے جب کہ ان کے لائے ہوئے "انقلاب" پر غیر اسلامی عناصر قبضہ کرلیں اور ان کے اپنے حصہ میں احتجاج اور ماتم کے سوا کچھ باقی نہ رہے۔

دو آنکھیں جو عذاب سے محفوظ رہیں گی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عینان لا تمسھما النار، عین بکت من خشیۃ اللہ وعین باتت تحرس فی سبیل اللہ (دو آنکھیں ہیں جن کو جہنم کی آگ نہیں چھوئے گی۔ ایک وہ آنکھ جو خدا کے ڈر سے روئے۔ دوسری وہ آنکھ جو خدا کی راہ میں چوکیداری کرتے ہوئے رات گزارے) جہاں تک عین خاشعہ کا سوال ہے، اس کا مفہوم ہمیشہ اور ہر حال میں ایک ہی رہتا ہے۔ اس کا مطلب ہمیشہ یہ رہے گا کہ آدمی کو خدا کی یاد اس طرح تڑپائے کہ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئیں۔ مگر عینِ حارسہ کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اسلام کی جغرافی سرحدوں کی حفاظت کرتا جس طرح اس میں داخل ہے، اسی طرح ایک بندۂ مومن کا یہ عمل بھی اس کے ذیل میں آتا ہے کہ وہ خدا کے دین پر جاہلانہ حملوں کو دیکھ کر بے تاب ہو جائے اور اس کے دفاع کے لئے علمی تیاری میں اس طرح لگا ہوا ہو کہ اس کی آنکھ کتابوں کے مطالعہ میں غرق ہو ـــ کتب خانوں کی الماریوں میں اس کی آنکھ دینِ حق کے دفاع کے لئے مواد ڈھونڈ رہی ہو۔

بھیونڈی، مہاراشٹر کا ایک صنعتی شہر ہے جو دہلی سے ۱۴۰۰ کیلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ جمعیۃ اہل حدیث کے اجتماع میں شرکت کے لئے یہاں آنے کا اتفاق ہوا۔ ۲۴ مارچ ۱۹۷۹ء کو بھیونڈی پہنچا۔ اجتماع سے فراغت کے بعد ایک روز بمبئی میں گزرا اور اس کے بعد ۲۹ مارچ کو دہلی واپسی ہوئی۔

بھیونڈی ایک صنعتی شہر ہے۔ یہاں کا خاص کاروبار پارچہ بافی ہے۔ پاور لوم کی مشینی موسیقی شہر میں رات دن کے کسی بھی حصہ میں سنی جاسکتی ہے۔ شہر کی دیواروں پر جگہ جگہ میونسپلٹی کی طرف سے لکھا گیا ہے "اپنے شہر کو صاف ستھرا رکھئے" مگر آس پاس کا ماحول آپ کو بتائے گا کہ نہ صرف شہریوں نے بلکہ خود اعلان کرنے والوں نے بھی ان الفاظ کو بہت کم قابل توجہ سمجھا ہے۔ بھیونڈی کی آبادی تقریباً تین لاکھ ہے۔ اس میں مسلم آبادی کا تناسب تقریباً ۶۵ فی صد ہے۔ تاہم تعلیم میں ان کا تناسب آبادی میں ان کے تناسب سے بہت کم ہے۔ ایک بچہ یہاں بآسانی روزگار پا لیتا ہے۔ اس لئے اکثر والدین بچہ کو تعلیم گاہ میں بٹھانے کے بجائے کارخانہ میں بھیجنا زیادہ مفید سمجھتے ہیں۔ کاروبار میں بظاہر ہر طرف مسلمان ہی مسلمان نظر آتے ہیں مگر یہاں کی کاروباری سرگرمیوں میں ان کا حقیقی حصہ مقابلۃً بہت کم ہے۔ پُر شور لوم تقریباً صد فی صد ان کے ہیں۔ تاہم پچاس فی صد سے زیادہ لوم وہ ہیں جن کی حیثیت محض "مزدور" کی ہے کیوں کہ وہ دوسروں کے دیئے ہوئے سوت کو اجرت پر بُن رہے ہوتے ہیں۔ بنائی سے پہلے کا کام (سوت تیار کرنا) اور بُنائی کے بعد کا کام (مارکیٹنگ) دونوں دوسرے لوگوں کے قبضہ میں ہیں۔

یہ توکل کی عجیب وغریب قسم ہے جو موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے حصہ میں آئی ہے۔ اسلام میں توکل کا مطلب یہ ہے کہ ظاہری اندیشوں سے بے پروا ہو کر اپنے مقصد کی خاطر اپنی قوت اور اپنے مال کو خرچ کرنا۔ مگر موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے توکل کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ اگر بے فکری کی زندگی گزارنے کے لئے کچھ پیسے مل رہے ہوں تو زیادہ کی فکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔

بمبئی میں ادارۂ دعوت القرآن کے دفتر میں ایک مفصل تقریر (۲۷ مارچ) ہوئی۔ پڑھا لکھا طبقہ معقول تعداد میں جمع ہوگیا تھا۔ اس کے بعد جمعیۃ اہل حدیث بمبئی کے دفتر میں ایک تقریر ہوئی اور مسجد میں درس حدیث دینے کا موقع ملا۔ بمبئی میں مسلمانوں کے بہت سے ادارے کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں۔ مسجدیں عام طور پر نہایت شان دار بنی ہوئی ہیں۔ اس کی وجہ بمبئی کے مسلمانوں کا مزاج ہے۔ بمبئی کا مسلمان عام طور پر "کاروباری مزاج" کا ہوتا ہے۔ کاروبار آدمی کے اندر سادگی، اتحاد اور حقیقت پسندی پیدا کرتا ہے۔ ان کا یہ مزاج ان کے لئے کاروباری اعتبار سے بھی مفید ہوا ہے اور دینی اعتبار سے بھی۔ ایک بزرگ بمبئی میں کامیابی کے ساتھ کئی دینی ادارے چلا رہے ہیں۔ انھوں نے کہا "ہم لوگ تو یہاں اختلاف کو ترستے ہیں بمبئی میں ایک معقول منصوبہ لے کر اٹھنے والے کو فوراً ساتھی مل جاتے ہیں جو خاموشی کے ساتھ اس کو ہر طرح کا تعاون دیتے ہیں اس کے برعکس اسی ملک میں ایسے مقامات بھی ہیں جہاں کوئی منصوبہ چلانے کی کوشش کیجئے تو ساتھ کوئی نہ دے گا البتہ اختلاف کرنے والے اور رکاوٹیں ڈالنے والے بہت مل جائیں گے۔

جمعیۃ اہل حدیث کے اجتماع کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو بتایا جائے کہ دین وہ ہے جو آدمی کو قرآن و سنت سے ملا ہو نہ کہیں اور سے۔ زیادہ تر تقریریں اسی نکتہ پر مرکوز رہیں۔ راقم الحروف نے اجتماع کے علاوہ رئیس ہائی اسکول میں دو تقریریں کیں۔ نیز شہر میں بعض اور مقامات پر اہل علم افراد کی نشستیں ہوئیں جن کو خطاب کرنے کا موقع ملا۔

بھیونڈی میں ابھی تک تعلیمی اور تعمیری کاموں کی طرف نسبتاً کم توجہ رہی ہے۔ تاہم اب کچھ مسلمانوں کو اس کمی کو پورا کرنے کا احساس ہوا ہے۔ ہم نے ایک زیر تعمیر ادارہ دیکھا جو انجمن فرقانیہ کے نام سے بن رہا ہے۔ اس ادارہ میں ایک تین منزلہ مسجد بھی ہوگی۔ یہاں ایک تعلیم گاہ، چھوٹی بچتوں کو جمع کرنے کی اسکیم اور اس طرح کے دوسرے منصوبے چلائے جائیں گے۔ اسی طرح کچھ لوگوں نے دار الاخوان کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے۔ اس میں ایک اسلامی دار المطالعہ ہے۔ اس کے علاوہ غیر سودی کوآپریٹو کریڈٹ سوسائٹی کے نام سے ایک اسکیم چلائی جا رہی ہے۔ اس طرح کے اور بھی کئی ادارے زیر تعمیر ہیں جو مستقبل کے بارے میں اچھی امید کی علامت ہیں۔

مارچ کی ۲۸ تاریخ تھی اور راجدھانی اکسپریس ۱۲۰ کیلومیٹر کی رفتار سے دہلی کی طرف دوڑی چلی جا رہی تھی۔ اتنے میں سنائی دیا کہ ٹکٹ کا معائنہ کرنے والا عملہ ایک مسافر سے جھگڑ رہا ہے۔ مشکل یہ تھی کہ عملہ انگریزی میں بول رہا تھا اور مسافر کہہ رہا تھا کہ میں انگریزی نہیں جانتا۔ اس مسافر نے اپنا نام "راجندر" بتایا۔ جب کہ ٹکٹ پر اس کا نام "پرتاپ" لکھا ہوا تھا۔ مسافر نے کہا کہ میرا ٹکٹ میرے بیوپاری نے کرایا ہے، اس لئے مجھے نہیں معلوم کہ اس نے کیا نام لکھوایا۔ نام میں اس فرق کی وجہ سے عملہ نے فیصلہ دیا کہ وہ مسافر کو بڑودہ میں اتار کر پولس کے حوالے کر دے گا۔ وہاں اس کو "اپنے آپ کو ثابت کرنا ہوگا"۔ اسی طرح ایک مسافر کا نام صحیح تھا مگر کاغذ پر مسٹر کی جگہ "مسز" لکھ گیا تھا۔ اس کو فیصلہ سنایا گیا کہ اس کا ۱۴۳ روپیے کا ٹکٹ اس نقص کی وجہ سے بے کار ہو چکا ہے۔ اس کو دوسرا ٹکٹ مع جرمانہ ۲۳۶ روپے میں خریدنا ہوگا —— جہاں اہم شخصیتوں (VIPs) کا معاملہ ہو وہاں خوب جانچ پڑتال ہوتی ہے، اور جب صرف عوام کا معاملہ ہو تو ان کو بھیڑ بکری کی طرح حالات کا شکار ہونے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

راجدھانی ایکسپریس یا ہوائی جہاز سفر کی مدت کو مختصر کر دیتے ہیں۔ مگر ایسا سفر راقم الحروف کے ذوق کے انتہائی خلاف ہے۔ یہ ایک قسم کا ڈبہ بند سفر ہوتا ہے۔ کھڑکیوں میں موٹے شیشے لگے ہوتے ہیں، اور آپ باہر کی دنیا کو صرف شیشوں کے واسطے سے دیکھ سکتے ہیں۔ مسافر کے دائیں بائیں قدرت کی دنیا پھیلی ہوئی ہوتی ہے مگر وہ اس کے براہ راست مشاہدہ میں نہیں آتی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان شادی ہو اور اس کے بعد دونوں کو ایک ایسے کمرہ میں بٹھا دیا جائے جہاں ان کے درمیان موٹے شیشہ کی دیوار حائل ہو۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوں مگر ایک دوسرے سے مل نہ سکتے ہوں —— باہر درخت کی پتیاں ہل رہی ہیں، مگر ان کی ہوائیں مسافر تک نہیں پہنچتیں۔ باہر چڑیاں چہچہا رہی ہیں مگر ان کی آوازیں ہم کو سنائی نہیں دیتیں۔ سورج کی کرنیں آسمان سے آ رہی ہیں مگر وہ مسافر کے وجود کو نہیں چھوتیں۔ ہم خدا کی کائنات میں سفر کر رہے ہوتے ہیں مگر سارا سفر اس طرح طے ہوتا ہے جیسے کہ ہم الگ ہیں اور وہ الگ۔ تمدن کی ترقی نے انسان کو فطرت کی دنیا سے کتنا دور کر دیا ہے!

موت کے کنارے

★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★

آج وہ بے وقت مجھ سے ملنے آگیا تھا اور بہت کم میرے پاس ٹھہرا۔ خلاف معمول اس نے چائے بھی قبول نہیں کی۔ "مجھے بہت جلد گھر پہنچنا ہے۔ وہاں میری بیوی میرا انتظار کر رہی ہوگی" اس نے کہا اور اپنا اسکوٹر اسٹارٹ کرکے تیزی سے روانہ ہوگیا۔ اس کی واپسی کو بمشکل آدھ گھنٹہ ہوا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس کی بیوی گھبرائی ہوئی آواز میں بول رہی تھی "آپ کے دوست کا ــــ" اس نے کہا۔ بظاہر اس کا جملہ ادھورا تھا۔ مگر اس کے رونے کی آواز نے اس کو پورا کر دیا۔ میں ٹیلی فون بند کرکے فوراً اس کے گھر کی طرف بھاگا۔ معلوم ہوا کہ اس کا انتقال ہوچکا ہے۔ مجھ سے رخصت ہوکر وہ اپنے گھر پہنچا۔ ابھی سیڑھیوں ہی پر تھا کہ لڑھک کر گر پڑا۔ لوگ اٹھا کر اندر لے گئے۔ فوراً ڈاکٹر بلایا گیا مگر ڈاکٹر نے آکر صرف یہ خبر دی کہ وہ اس دنیا سے جاچکا ہے۔

اسکوٹر پر سوار ہوکر وہ میرے یہاں سے روانہ ہوا تو بظاہر وہ اپنے گھر جارہا تھا۔ مگر حقیقۃً وہ موت کی طرف جارہا تھا۔ یہ کوئی اتفاقی واقعہ نہیں۔ اس طرح کے واقعات ہر روز اور ہر جگہ پیش آرہے ہیں۔ ۲۶ مئی ۱۹۷۹ کو امریکہ کا ایک بڑا جیٹ جہاز جس میں ۲۷۱ مسافر سوار تھے، اوہیرے (O'Hare) ہوائی اڈے سے اڑا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ زمین پر گر گیا۔ جہاز سمیت سارے مسافر جل کر راکھ ہوگئے۔ یہ معاملہ چند انسانوں کا نہیں بلکہ یہی معاملہ تمام انسانوں کا ہے۔ سارے انسان جو زمین پر چلتے اور دوڑتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ سب موت کی منزل کی طرف جارہے ہیں۔ ہر آدمی سب سے زیادہ جس چیز کے قریب ہے وہ موت ہے۔ ہر آدمی موت کے کنارے کھڑا ہوا ہے۔ ہر آدمی ہر آن اس خطرہ میں مبتلا ہے کہ اس کا آخری وقت آجائے اور وہ اچانک اس دنیا سے اٹھا کر اگلی دنیا میں پہنچا دیا جائے، جہاں سے کسی کو واپس نہیں آنا ہے۔ جہاں آدمی کے لئے یا تو جنت ہے یا جہنم۔

ایک اندھا آدمی چلتے چلتے کنویں کے کنارے پہنچ جائے تو ہر آدمی جانتا ہے کہ اس وقت سب سے بڑا کام یہ ہے کہ اس کو کنویں کے خطرہ سے آگاہ کیا جائے۔ حتٰی کہ ایسے نازک موقع پر آدمی قبلہ و کعبہ کی زبان اور نحو و صرف کے قواعد تک بھول جاتا ہے اور بے اختیار پکار اٹھتا ہے "کنواں کنواں۔" مگر کیسی عجیب بات ہے کہ ساری انسانیت اس سے بھی زیادہ خطرناک "کنویں" کے کنارے کھڑی ہوئی ہے۔ مگر ہر آدمی دوسرے دوسرے کاموں میں لگا ہوا ہے۔ کوئی شخص "کنواں کنواں" پکارنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ حتٰی کہ اگر کوئی دیوانہ اس قسم کی پکار بلند کرے تو لوگوں کی طرف سے جواب ملتا ہے ــــ "یہ شخص قوم کو بزدلی کی نیند سلانا چاہتا ہے، وہ جہاد کے جذبہ کو ختم کر رہا ہے، وہ حقیقی مسائل سے لوگوں کو ہٹا دینا چاہتا ہے، وہ زندگی کا پیغام بر نہیں بلکہ موت کا داعی ہے۔ وہ مایوسی اور بے ہمتی کا سبق دے رہا ہے۔"

لوگ کنویں کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ محفوظ مکان میں ہیں۔ لوگ موت کی طرف بڑھ رہے ہیں مگر خوش ہیں کہ وہ زندگی کا سفر طے کر رہے ہیں۔

■ صدارت سے انکار

البرٹ آئن سٹین ایک یہودی سائنس داں تھا۔ اسرائیل کے پہلے صدر ویزمین کے انتقال کے بعد ۱۹۵۲ میں آئن سٹین کو اسرائیل کی صدارت کا عہدہ پیش کیا گیا مگر اس نے اس عہدہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے سفیر ابا ایبان سے کہا: "میں فطرت کے بارے میں بہت کم جانتا ہوں اور انسان کے بارے میں تو بمشکل کوئی چیز مجھے معلوم ہے۔ میں اسرائیل کی طرف سے اس پیش کش سے بہت متاثر ہوں اور اسی کے ساتھ مجھے افسوس اور شرمندگی بھی ہے کہ میں اس کو قبول نہیں کر سکتا۔ میں اپنی تمام زندگی میں موضوعی چیزوں پر کام کرتا رہا ہوں۔ اس لئے میں عوام سے درست طور پر معاملہ کرنے اور سرکاری امور کو برتنے کی فطری استعداد اور تجربہ دونوں سے محروم ہوں۔ میری بڑھتی ہوئی عمر نے میری قوت کو متاثر نہ کیا ہوتا تب بھی تنہا ان وجوہ سے میں اس اعلیٰ عہدہ کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لئے غیر موزوں تھا۔

■ تمثیل کی زبان میں

کسی سیٹھ نے خواب میں دیکھا کہ لکشمی جی کہہ رہی ہیں: "سیٹھ! اب تیرا پنیہ (نیک کام) ختم ہو گیا ہے۔ اس لئے میں چند دنوں میں تیرے گھر سے چلی جاؤں گی۔ تجھے مجھ سے جو مانگنا ہو مانگ لے"۔ سیٹھ نے کہا: "کل صبح اپنے گھر والوں سے صلاح و مشورہ کر کے جو مانگنا ہو گا مانگ لوں گا۔"

صبح ہوئی تو سیٹھ نے خواب کی بات سب کے سامنے رکھی۔ کنبے میں سے کسی نے ہیرے جواہرات مانگنے کے لئے کہا کسی نے سونے کا ڈھیر۔ کسی نے اناج اور کسی نے گاڑی یا کوٹھی مانگنے کی صلاح دی۔ آخر میں سیٹھ کی چھوٹی بہو نے کہا: "پتا جی! جب لکشمی کو جانا ہی ہے۔ تو یہ چیزیں ملنے پر بھی رہیں گی کیسے؟ آپ تو محض یہ مانگئے کہ کنبے میں پیار بنا رہے۔ کنبے کے سب لوگوں میں پریم بنا رہے گا تو مصیبت کے دن بھی آرام سے کٹ جائیں گے۔"

سیٹھ کو یہ تجویز پسند آئی اور جب رات کو پھر خواب میں لکشمی کے درشن ہوئے، اس نے کہا "بولو کیا مانگتے ہو"، سیٹھ نے کہا "دیوی! آپ جانا ہی چاہتی ہیں تو خوشی سے جائیے لیکن یہ بردان دیجئے کہ ہمارے کنبے کے لوگوں میں ہمیشہ پریم بنا رہے"

لکشمی بولیں "سیٹھ تو نے ایسا بردان مانگا کہ مجھے باندھ ہی لیا۔ بھلا جس کنبے کے افراد میں پریم پیار ہے وہاں سے میں جا کیسے سکتی ہوں۔ (ڈاکٹر سی۔ آر تیتھیہ گوڑ گاؤں)

اہم اعلان

مولانا وحیدالدین خاں کی کتابوں کے بعض عربی ترجمے (مطبوعہ قاہرہ) محدود تعداد میں مکتبہ الرسالہ کے پاس موجود ہیں جنکی تفصیل یہ ہے

١۔ الاسلام یتحدی (ساتواں ایڈیشن) ٢٦٣ صفحات قیمت ٢٠ روپے

٢۔ الدین فی مواجھۃ العلم (چوتھا ایڈیشن) ١١٢ صفحات 〃 ١٠ روپے

٣۔ حکمۃ الدین (دوسرا ایڈیشن) ٨٧ صفحات 〃 ٨ روپے

۴۔ الاسلام والعصر الحدیث (دوسرا ایڈیشن) ٧٧ صفحات 〃 ٨ روپے

۵۔ مسئولیات الدعوۃ (تیسرا ایڈیشن) ٣٩ صفحات 〃 ٢ روپے

٦۔ نحو تدوین جدید للعلوم الاسلامیۃ ٢٦ صفحات 〃 ٢ روپے

٧۔ امکانات جدیدۃ للدعوۃ ٣۴ صفحات 〃 ٢ روپے

محصول ڈاک بذمہ خریدار — قیمت مکمل سٹ مع محصول ڈاک ۵۵ روپے — پوری رقم پیشگی روانہ فرمائیں

Regd. D. (D) 532
Regd. R.N. No. 28822/76
Issue No. XXXIII

August 1979

Al-Risala Monthly

JAMIAT BUILDING, QASIMJAN STREET, DELHI-110006

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خان

الرسالہ

شمارہ ۳۴ □ ستمبر ۱۹۷۹

جمعیۃ بلڈنگ □ قاسم جان اسٹریٹ □ دہلی 110006

فہرست

خدا پرستی کی جانچ

قرآن میں ارشاد ہوا ہے — "اور جب ہم نے پیغمبروں سے ان کا عہد لیا اور تم سے اور نوح سے اور ابراہیم سے اور موسیٰ سے اور عیسیٰ بن مریم سے، اور ہم نے ان سے گاڑھا عہد (میثاق غلیظ) لیا۔ تاکہ اللہ پوچھے سچوں سے ان کا سچ اور اس نے تیار کر رکھا ہے منکروں کے لئے دردناک عذاب (احزاب ۸) اس آیت میں میثاق غلیظ سے کیا مراد ہے، اس کا ذکر دوسرے مقام پر ان لفظوں میں ہے "اور جب اللہ نے اقرار لیا پیغمبروں کا کہ جو کچھ میں تم کو کتاب اور حکمت دوں، پھر تمھارے پاس کوئی پیغمبر آئے جو سچا کرنے والا ہو اس چیز کا جو تمھارے پاس ہے تو تم ضرور اس پر ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے۔ اللہ نے کہا کیا تم نے اقرار کیا اور اس پر میری ڈالی ہوئی ذمہ داری کو اٹھایا۔ وہ بولے ہم نے اقرار کیا۔ اللہ نے کہا تو گواہ رہنا اور میں بھی تمھارے ساتھ گواہ ہوں۔ پھر جو کوئی اس عہد سے پھر جائے تو وہی لوگ نافرمان ٹھہریں گے (آل عمران ۸۲) — اس عہد کا تعلق پیغمبروں کے واسطہ سے دراصل ان کے امتیوں سے تھا۔ چنانچہ دوسرے مقامات پر واسطہ کو کو حذف کر کے براہ راست پیغمبر کی امت کا ذکر کیا گیا ہے (مائدہ ۱۲)

جب کوئی حق کا داعی اٹھتا ہے تو وہ خلا میں نہیں اٹھتا۔ وہ ایسے لوگوں کے درمیان اٹھتا ہے جو پچھلے داعیان حق میں سے کسی نہ کسی سے اپنے کو منسوب کئے ہوتے ہیں۔ وہ اس یقین کے ساتھ جی رہے ہوتے ہیں کہ وہ عین حق پر ہیں اور انھوں نے اللہ کے برگزیدہ بندوں کا دامن تھام رکھا ہے۔ ان کی اس نفسیات کی وجہ سے نئے داعی کی آواز ان کو اپیل نہیں کرتی۔ وہ عقیدتیں اور وفاداریاں جو ماضی کی روایات پر قائم ہوں وہ ہمیشہ بہت طاقت ور ہوتی ہیں۔ مزید یہ کہ اس روایتی نظام کے ساتھ بے شمار فوائد اور مصلحتیں وابستہ ہو جاتی ہیں۔ وہ اجتماعی تعلقات کی بنیاد بن چکا ہوتا ہے۔ دوسری طرف نیا داعی ایک معمولی انسان نظر آتا ہے۔ اس سے اپنے آپ کو جوڑنا ایک ایسی حقیر چیز سے جوڑنے کے ہم معنی ہوتا ہے جس کی بظاہر کوئی قیمت نہ ہو، جو ماحول کے اندر اپنے کو بے زمین بنا لینے کے ہم معنی ہو۔ ان وجوہ سے کسی معاشرہ میں نئے داعی حق کا اٹھنا اس معاشرہ کو سخت ترین آزمائش میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اب خدا پرست ہونے کا ثبوت دینے کے لئے بالکل نیا معیار سامنے آجاتا ہے۔ وہ لوگ جو عظمتوں کے مینار کے سایہ میں اپنا دین پائے ہوئے تھے ان کو اللہ کی خاطر بے قیمت ہو جانے کی سطح پر اپنی دین داری کا ثبوت دینا ہوتا ہے۔ جو لوگ گدیوں والے دین پر اپنی نشستیں حاصل کئے ہوئے تھے، ان کو بے گھر ہو جانے والے دین پر اپنے کو قانع بنانا پڑتا ہے۔ جو لوگ مشہور و معروف بزرگوں سے وابستگی پر فخر کر رہے تھے، ان کو غیر معروف بزرگ سے وابستگی کی سطح پر اپنے کو اتارنا پڑتا ہے۔ جن لوگوں نے اپنے ارادی فیصلہ کے بغیر وراثتی طور پر دین کو پایا تھا، اب ان کو شعور اور ارادہ کے تحت اللہ کے دین کو پہچاننے کے امتحان میں کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ جن لوگوں نے محفوظ دنیوی مفادات کی زمین پر اپنی خدا پرستی کا جھنڈا گاڑ رکھا تھا، ان کو دنیا کی بربادی کی قیمت پر خدا کا پرستار بننا پڑتا ہے۔ ●

[illegible]

اُطْلُبْ قَلْبَكَ فِي ثَلَاثَةِ مَوَاطِنَ عِنْدَ سَمَاعِ الْقُرْآنِ وَفِي مَجَالِسِ الذِّكْرِ وَفِي أَوْقَاتِ الْخَلْوَةِ فَإِنْ لَمْ تَجِدْهُ فِي هٰذِهِ الْمَوَاطِنِ فَسَلِ اللّٰهَ أَنْ يَمُنَّ عَلَيْكَ بِقَلْبٍ فَإِنَّهُ لَا قَلْبَ لَكَ (عبداللہ بن مسعود)

تین مواقع پر تم اپنے دل کو تلاش کرو۔ قرآن سننے کے وقت، ذکر کی مجلسوں میں اور تنہائی کے اوقات میں۔ اگر ان مواقع پر تم اس کو نہ پاؤ تو اللہ سے دعا کرو کہ وہ تم کو ایک دل دیدے۔ کیوں کہ تمھارے پاس دل نہیں ہے۔

انسان کے سینہ میں دل اس لئے رکھا گیا ہے کہ وہ خدا کی تجلیات کا مسکن بنے۔ دل گویا خدا کا گھر ہے۔ اس لئے جب خدا کا کلام پڑھا جائے تو چاہئے کہ انسان کا دل اس سے دہل اٹھے۔ جب خدا کا چرچا کیا جائے تو دل اس کی عظمت کے احساس سے تڑپ اٹھے۔ جب آدمی اپنی تنہائیوں میں ہو تو اس کا دل خدا کو اپنا ہم نشین پائے اور اس پر وہ تجربات گزریں جو خدا کی یاد سے قلب انسانی پر گزرتے ہیں۔ اگر ایسا ہو تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی کا دل زندہ ہے۔ وہ فی الواقع صاحب دل ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا دل مر چکا ہے اس کو وہ دل حاصل نہیں جو خدا کی تجلیات کا مہبط بن سکے۔ وہ لمحات جب کہ دل کے تار خصوصی طور پر جاگ اٹھتے ہیں، اس وقت بھی اس کے دل کے تار نہیں جاگتے۔ وہ یاد دلانے والے مواقع جب کہ انسان خدا کے بہت قریب پہنچ جاتا ہے، وہ بھی اس کو خدا کی یاد دلانے والے ثابت نہیں ہوتے۔ ایسے آدمی کو جاننا چاہئے کہ وہ اپنی سب سے قیمتی متاع (دل) سے محروم ہو گیا ہے۔ اس کو سب سے زیادہ جس چیز کی دعا کرنی چاہئے وہ یہ کہ اس کا رب اس کو ایک دل عطا کر دے۔

کائنات خاموش زبان میں کہتی ہے

ڈھاک ایک معمولی درخت ہے۔ مگر اس کے اوپر بے حد حسین پھول اگتے ہیں۔ موسم خزاں کے پت جھڑ کے بعد اس کا درخت بظاہر ایک سوکھی لکڑی کی مانند، اس سے بھی زیادہ ایک سوکھی زمین پر کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک خاموش انقلاب ہوتا ہے۔ حیرت انگیز طور پر نہایت خوش رنگ پھول اس کی شاخوں میں کھل اٹھتے ہیں۔ سوکھی لکڑی کا ایک ڈھانچہ لطیف اور رنگین پھولوں سے ڈھک جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ایک محروم اور بے قیمت وجود کے لئے خدا نے خصوصی طور پر اپنی خوب صورت چھتری بھیج دی ہے۔

ایسا شاید اس لئے ہوتا ہے کہ کوئی بندۂ خدا اس کو دیکھ کر کہے ——— "خدایا! میں بھی ایک ڈھاک ہوں، تو چاہے تو میرے اوپر حسین پھول کھلا دے۔ میں ایک ٹھنٹھ ہوں، تو چاہے تو مجھ کو سرسبز و شاداب کر دے۔ میں ایک بے معنی وجود ہوں، تو چاہے تو میری زندگی کو معنویت سے بھر دے۔ میں جہنم کے کنارے کھڑا ہوں، تو چاہے تو مجھ کو جنت میں داخل کر دے" (سنماڑ ۲۴ مارچ ۱۹۷۹)

جب تمام حقیقتیں کھل جائیں گی

قرآن میں ارشاد ہوا ہے ——— جب زمین اپنے بھونچال سے ہلائی جائے گی۔ اور زمین اپنے بوجھ کو نکال ڈالے گی۔ اس وقت آدمی کہے گا کہ اس کو کیا ہوا۔ اس دن زمین سب خبریں بتا دے گی۔ کیوں کہ تمھارے رب کا اس کو یہی حکم ہوگا۔ اس دن لوگ مختلف جماعتوں میں آئیں گے تاکہ اپنے اعمال کو دیکھیں۔ پس جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا (زلزال) دوسرے مقام پر ارشاد ہوا ہے: اور جس روز اللہ کے دشمن آگ کی طرف اکٹھے کئے جائیں گے پھر وہ جدا جدا کئے جائیں گے۔ پھر جب سب وہاں پہنچ جائیں گے تو ان کے کان، ان کی آنکھیں اور ان کے چمڑے ان پر گواہی دیں گے کہ وہ دنیا میں کیا کرتے تھے۔ وہ اپنے اعضا سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی۔ وہ جواب دیں گے کہ ہم کو اسی اللہ نے بلوایا ہے جس نے ہر چیز کو بلوایا ہے۔ اسی نے تم کو پہلی بار پیدا کیا اور اسی کے پاس پھر لائے گئے ہو۔ تم دنیا میں اس سے چھپ نہ سکتے تھے کہ تمھارے کان اور آنکھیں اور چمڑے تمھارے خلاف گواہی دیں۔ بلکہ تم اس گمان میں رہے کہ اللہ کو تمھارے بہت سے اعمال کی خبر ہی نہیں۔ تمھارے اس گمان نے جو تم نے اپنے رب سے کیا تھا تم کو ہلاک کیا۔ پس آج تم خسارہ میں پڑ گئے۔ یہ لوگ صبر کریں تب بھی آگ ہی ان کا ٹھکانا ہے اور اگر عذر کرنا چاہیں تو اب کوئی عذر مقبول نہیں۔ ہم نے دنیا میں ان کے کچھ ساتھی مقرر کر دئے تھے جو انھیں آگے اور پیچھے ہر چیز خوش نما بنا کر دکھاتے تھے۔ ان کے حق میں اللہ کا قول پورا ہو کر رہا۔ جو ان سے پہلے جنوں اور انسانوں پر پورا ہوا تھا۔ یقیناً وہ سب خسارے میں رہے (حم سجدہ)

دنیا میں آدمی ظالمانہ رویہ اختیار کرتا ہے۔ وہ سچائی کے پیغام کو ٹھکراتا ہے۔ وہ حق دار کو اس کا حق ادا کرنے سے انکار کرتا ہے۔ وہ جس پر قابو پا جاتا ہے اس کے اوپر خداوند بننے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنی ذات کو صداقت کا معیار بنا لیتا ہے۔ وہ دنیا میں اس طرح رہتا ہے جیسے کہ وہ یہاں آزاد ہے کہ جو چاہے کرے اور جس طرح چاہے اپنے اختیارات کو استعمال کرے۔ مزید یہ کہ ہر آدمی کے پاس الفاظ کا نہ ختم ہونے والا ذخیرہ ہے جس سے وہ اپنی ظالمانہ کارروائیوں کو چھپا سکے۔ ہر آدمی کے پاس خوبصورت تاویلات ہیں جن سے وہ اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کر سکے۔ یہ سب کچھ یہاں بہت بڑے پیمانہ پر ہو رہا ہے مگر ساری کائنات خاموش کھڑی ہوئی اس کو دیکھ رہی ہے۔ درختوں کی پتیاں مظلوم کی حمایت میں نہیں بولتیں۔ سورج اور چاند حق کی طرف سے اپنا کوئی بیان نہیں دیتے۔ زمین و آسمان اپنی تمام وسعتوں کے باوجود ایک غیر جانب دار تماشائی کی طرح کھڑے رہتے ہیں۔ دنیا میں بولنے والی زبان صرف ایک ہی نظر آتی ہے اور وہ انسان کی زبان ہے۔ مگر انسان کا یہ حال ہے کہ وہ حق کی پامالی کو دیکھتا ہے اور اس سے بے تعلقی ظاہر کرتا ہے۔ وہ خود غرضیوں اور مصلحتوں کے تحت بولتا ہے۔ وہ طاقت ور کی طرف داری کرتا ہے خواہ وہ باطل پر ہو اور کمزور کو نظر انداز کرتا ہے خواہ وہ حق پر ہو۔ ایک ایسی کائنات جہاں چڑیوں کے سریلے نغمے بلند ہوتے ہوں۔ جہاں سورج روزانہ اندھیرے کو اجالے میں بدلتا ہو، وہاں کوئی حق کی حمایت میں بولنے والا نہیں۔ وہاں کوئی بے انصافی

کا پردہ پھاڑنے والا نہیں۔

آنے والی قیامت اسی سوال کا جواب ہے۔ قیامت کے دن کائنات کا مالک اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ ظاہر ہو جائے گا۔ اس دن حق کی حکمرانی ہوگی۔ اس دن زمین و آسمان کی تمام چیزیں بول پڑیں گی۔ حتیٰ کہ آدمی کے اپنے اعضا بھی سچائی کی گواہی دینے لگیں گے۔ اس کے بعد عزت والا وہ ہوگا جو خدا کے نزدیک حق پر تھا اور وہ تمام لوگ ذلت کے ابدی عذاب میں دھکیل دئے جائیں گے جو خدا کے نزدیک ناحق پر چل رہے تھے۔

ایک عظیم الشان شہر ہے۔ ہر قسم کی رونقوں سے بھرا ہوا۔ اس کے بعد اچانک بھونچال آتا ہے۔ پورا شہر خاک کا ڈھیر بن جاتا ہے۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو شہر کی سڑکوں پر عالی شان سواریوں میں دوڑتے تھے ان کی حقیقت ایک بے زور کیڑے سے زیادہ نہ تھی۔ ان کے اونچے اونچے سجے ہوئے مکانات اینٹ پتھر کے ملبہ سے زیادہ حقیقت نہ رکھتے تھے۔ ان کا صدر اور گورنر بھی اتنا ہی بے قیمت تھا جتنا ایک عام مزدور۔ زلزلہ نے شہر کی تمام مصنوعی شان و شوکت کو باطل کر دیا۔ اس کے بعد جو بچا وہ وہی تھا جو شہر کی اصل حقیقت تھی۔

قیامت بھی اسی قسم کا ایک زلزلہ ہے۔ قیامت کیا ہے۔ پردہ کا ہٹا دیا جانا، تمام غیر واقعی چیزوں کا باطل کر دیا جانا۔ موجودہ دنیا میں آدمی اس طرح زندگی گزار رہا ہے کہ اصل حقیقتیں اس سے اوجھل ہیں۔ خدا اور آخرت کا عالم جو اصل عالم ہے، وہ یہاں مکمل طور پر غیب میں ہے۔ انسان نظر آتا ہے مگر خدا نظر نہیں آتا۔ قیامت کے آتے ہی یہ حالت بدل جائے گی۔ خدا اپنے تمام جلال کے ساتھ سامنے آجائے گا۔ جنت، دوزخ، فرشتے، سب آنکھوں کے سامنے ہوں گے۔ اس حقیقی عالم کی نسبت سے انسان کی جو اصل حیثیت ہے وہ پوری طرح کھل جائے گی۔ دنیا میں آدمی اپنے حقیقی وجود کو ایک ظاہری پردہ میں چھپائے ہوئے ہوتا ہے۔ وہ بے زور ہو کر بھی زور آور دکھائی دیتا ہے آخرت میں وہ اپنے اصلی اور حقیقی روپ میں بے پردہ ہو جائے گا۔ آدمی اپنی اندرونی حقیقت کے اعتبار سے جیسا ہے، ویسا ہی وہ ظاہر کے اعتبار سے ہو جائے گا۔ اس سے بچے ہوئے صرف وہ لوگ ہوں گے جن کو رب العالمین اپنی رحمتوں میں لے لے، جن کو وہ اپنی مغفرت میں ڈھانپ لے۔

موجودہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ اس امتحان کی وجہ سے لوگوں کو آزادی ہے۔ اس وقتی آزادی سے فائدہ اٹھا کر ہر آدمی اچھل کود رہا ہے۔ مگر جب امتحان کی کاپی چھین لی جائے گی تو آدمی اپنے آپ کو اس اصلی مقام پر کھڑا ہوا پائے گا جہاں وہ اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے تھا۔

کیسا عجیب وہ وقت ہوگا ——— کتنے شان دار قلعے اس دن ملبہ کا ڈھیر ہوں گے۔ کتنے "بڑے" اس دن کیڑے مکوڑوں کی مانند رینگ رہے ہوں گے۔ کتنے خوش پوشاک اس دن گدھوں اور کتوں کی طرح دکھائی دیں گے۔ کتنے زبان آور اس دن گونگوں کی مانند کھڑے ہوں گے۔ کتنے "دین دار" اس دن اس طرح نظر آئیں گے جیسے ان کا دین خداوندی سے کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ کتنے اپنی دولت پر ناز کرنے والے اس دن اس حال میں ہوں گے کہ ان کے پاس ایک کوڑی بھی نہ ہوگی جس سے وہ آخرت کی دنیا کی کوئی چیز حاصل کر سکیں۔

MOHAMMAD:
ON TOP OF THE HUNDRED BESTS

(Mohammad) was the only man in history who was supremely successful on both the religious and the secular levels. Of humble origins, Mohammad founded and promulgated one of the world's greatest religions and became an immensely effective political leader. Today, thirteen centuries after his death, his influence is still powerful and pervasive. The Bedouine tribesmen of Arabia had been no match for the larger armies of the kingdomes in the settled agricultural areas to the north. However, unified by Mohammad for the first time in history, and inspired by their fervent belief in the one true God, these small Arab armies now embarked upon one of the most astonishing series of conquests in human history. For a while, it must have seemed that the Muslims would overwhelm all of Christian Europe. However, in 732, at the famous battle of Tours, a Muslim army which had advanced into the centre of France, was at last defeated by the Franks. Nevertheless, in a scant century of fighting, these Bedouin tribesmen,, inspired by the word of the prophet, had carved out an empire stretching from the borders of India to the Atlantic ocean—the largest empire that the world had yet seen. Of many important historical events, one might say that they were inevitable and would have occured even without the particular political leader who guided them. But this cannot be said of the Arab conquests. Nothing similar had occured before Mohammad, and there is no reason to believe that the conquests would have been achieved without him We see then, that The Arab conquests of the seventh century have continued to play an important role in human history, down to the present day. It is this unparalleled combination of secular and religious influence which I feel entitles Mohammad to be considered the most influential single figure in human history.

Dr. Michael H. Hart, The 100, New York 1978

آپ سب سے بڑے تھے

میرا یہ انتخاب کہ محمدؐ دنیا کی تمام انتہائی بااثر شخصیتوں میں سرفہرست ہیں، کچھ قارئین کو اچنبھے میں ڈال سکتا ہے۔ کچھ اور لوگ اس پر معترض ہو سکتے ہیں۔ مگر محمدؐ تاریخ کے واحد شخص تھے جنھوں نے اعلیٰ ترین کامیابی حاصل کی، مذہبی سطح پر بھی اور دنیاوی سطح پر بھی۔ محمدؐ نے معمولی حیثیت سے آغاز کر کے ایک عظیم ترین مذہب کی بنیاد رکھی اور اس کو پھیلایا۔ وہ انتہائی مؤثر سیاسی لیڈر بن گئے۔ ان کی وفات کے تیرہ صدیوں بعد آج بھی ان کے اثرات غالب اور طاقتور ہیں۔

اس کتاب میں جو اہم تاریخی شخصیتوں کا انتخاب کیا گیا ہے، ان کی اکثریت اس خوش قسمتی کی مالک تھی کہ وہ تہذیب کے مرکزوں میں پیدا ہوئی اور وہاں پلی بڑھی۔ وہ ایسی قوموں کے فرد تھے جن میں اعلیٰ تمدن تھا یا ان کو سیاسی مرکزیت حاصل تھی۔ مگر محمدؐ ۵۷۰ء میں مکہ کے شہر میں پیدا ہوئے جو جنوبی عرب میں واقع تھا اور اس وقت دنیا کا ایک پس ماندہ علاقہ سمجھا جاتا تھا۔ تجارت، آرٹ اور علم میں اس کو کوئی مرکزیت حاصل نہ تھی۔ چھ سال کی عمر میں یتیم ہو کر ان کی پرورش ایک معمولی ماحول میں ہوئی۔ اسلامی روایات مزید بتاتی ہیں کہ وہ بے پڑھے لکھے تھے۔ ان کی اقتصادی حالت ۲۵ سال کی عمر میں صرف اس وقت بہتر ہوئی جب کہ انھوں نے ایک دولت مند بیوہ سے شادی کی جن کی عمر ۴۰ سال تھی۔ تاہم چالیس سال کی عمر تک بظاہر کوئی ایسی علامت نہ تھی کہ وہ کوئی ممتاز شخصیت کے انسان ہیں۔

بیشتر عرب اس وقت آسمانی کتاب سے محروم تھے۔ وہ بہت سے دیوتاؤں پر عقیدہ رکھتے تھے۔ تاہم مکہ میں محدود تعداد میں کچھ یہودی اور عیسائی تھے۔ محمدؐ نے سب سے پہلے انھیں سے واحد اور قادر مطلق خدا کا تصور لیا جو تمام کائنات کا حکمراں تھا۔ جب ان کی عمر چالیس سال کی ہوئی تو محمدؐ کو یقین ہو گیا کہ یہ ایک سچا خدا (اللہ) ان سے کلام کر رہا ہے۔ اور اس نے سچے مذہب کی تبلیغ کے لئے ان کا انتخاب کر لیا ہے۔

تین سال تک محمدؐ صرف اپنے قریبی دوستوں اور متعلقین پر تبلیغ کرتے رہے۔ پھر تقریباً ۶۱۳ء میں انھوں نے عوام میں تبلیغ شروع کی۔ دھیرے دھیرے لوگوں نے ان کے مذہب کو قبول کرنا شروع کیا تو مکہ کے سرداران کو اپنے لئے ایک خطرناک مصیبت سمجھنے لگے۔ ۶۲۲ء میں محمدؐ کو اپنی حفاظت کا خطرہ محسوس ہونے لگا اور وہ مدینہ چلے گئے جو مکہ کے شمال میں تقریباً ۲۰۰ میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ یہاں ان کو قابل لحاظ سیاسی طاقت کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

یہ ہجرت پیغمبر کی زندگی میں ایک نقطۂ انقلاب تھا۔ مکہ میں ان کے ساتھیوں کی تعداد صرف چند تھی۔ مدینہ میں ان کے ساتھیوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ انھوں نے جلد اتنا اثر پیدا کر لیا کہ عملاً وہ مدینہ کے مطلق حکمراں بن گئے۔ اگلے چند سال میں، جب کہ محمدؐ کے ساتھیوں کی تعداد تیزی سے بڑھی، مدینہ اور مکہ کے درمیان جنگوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا یہ جنگ ۶۳۰ء میں ختم ہوئی جب کہ محمدؐ دوبارہ فاتح کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہوئے۔ ان کی زندگی کے بقیہ ڈھائی سالوں میں عرب قبیلے بہت تیزی سے ان کے نئے مذہب میں داخل ہو گئے۔ ۶۳۲ء میں جب محمدؐ کا انتقال ہوا تو وہ تمام جنوبی عرب کے حکمراں بن چکے تھے۔

عرب کے بدو قبائل ماضی سے سخت جنگ جو چلے آ رہے تھے۔ مگر ان کی تعداد کم تھی اور وہ اختلاف اور باہمی لڑائیوں کے نتیجہ میں برباد ہو رہے تھے۔ وہ شمالی عرب کے زرعی علاقوں میں آباد شہنشاہیتوں کی بڑی فوجوں سے کوئی نسبت نہ رکھتے تھے۔ تاہم محمدؐ نے پہلی بار ان کو منظم کیا۔ ایک خدا پر پُر جوش اعتقاد سے مسلح ہو کر یہ چھوٹی عرب فوجیں انسانی تاریخ کی سب سے حیرت ناک فتوحات کے لئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ عرب کے شمال مشرق میں ساسانیوں کی عظیم نو پارسی شہنشاہیت تھی، عرب کے شمال جنوب میں بازنطینی یا مشرقی رومی شہنشاہیت تھی جس کا مرکز قسطنطنیہ تھا۔ عددی اعتبار سے عرب اپنے حریفوں کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہ رکھتے تھے۔ تاہم جنگ کے میدان میں ان پُر جوش عربوں نے بہت تیزی سے تمام میسوپوٹامیہ، شام اور فلسطین کو فتح کر لیا۔ ۶۴۲ میں مصر کو بازنطینی سلطنت سے توڑ لیا گیا۔ ایرانی فوجیں ۶۳۷ میں قادسیہ اور ۶۴۲ میں نہاوند کی جنگوں میں پسپا کر دی گئیں۔

مگر یہ عظیم فتوحات، جو کہ محمدؐ کے قریبی ساتھیوں اور ابتدائی خلفاء ابوبکرؓ اور عمر بن الخطابؓ کی رہنمائی میں انجام پائیں، عرب پیش قدمیوں کی انتہا نہ تھیں۔ ۷۱۱ تک عرب فوجوں نے شمالی افریقہ سے لے کر بحر اٹلانٹک تک مکمل طور پر فتح کر لیا تھا۔ یہاں سے وہ شمال میں مڑے اور آبنائے جبرالٹر کو پار کرتے ہوئے اسپین کی گاتھ سلطنت کو مغلوب کر کے اس پر قبضہ حاصل کر لیا۔

تھوڑی دیر کے لئے محسوس ہونے لگا کہ مسلمان تمام مسیحی یورپ پر قابض ہو جائیں گے۔ مگر ۷۳۲ میں تورس کی مشہور جنگ میں ایک مسلمان فوج، جو کہ فرانس کے مرکز تک پہنچ چکی تھی، بالآخر فرانسیسیوں کے ہاتھوں شکست کھا گئی۔ تاہم ان بدو قبائل نے، جو کہ پیغمبر کی تعلیمات سے متاثر تھے، ایک صدی کی قلیل مدت میں ایک ایسی سلطنت قائم کر لی جو ہندستان کی سرحدوں سے لے کر بحر اٹلانٹک کے ساحل تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ اتنی بڑی سلطنت تھی جیسی سلطنت اس سے پہلے تاریخ نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ تمام ممالک جو عربوں نے فتح کئے، ہر جگہ بہت بڑے پیمانہ پر لوگوں نے نئے مذہب کو قبول کر لیا۔

یہ تمام فتوحات مستقل ثابت نہ ہو سکیں۔ ایرانی اگرچہ پیغمبرؐ کے مذہب پر قائم رہے، تاہم انھوں نے عربوں کے اقتدار سے آزادی حاصل کر لی۔ اسپین میں سات سو سال کی جنگوں کے بعد آخر کار عیسائیوں نے پورے جزیرہ نما کو دوبارہ فتح کر لیا۔ تاہم میسوپوٹامیہ اور مصر جو کہ قدیم تہذیب کے گہوارہ رہے ہیں، بدستور عرب باقی رہے اور اسی طرح شمالی افریقہ کا پورا ساحلی علاقہ بھی۔ نیا مذہب، بلاشبہ درمیانی صدیوں میں مسلمانوں کی ابتدائی مقبوضہ سرحدوں سے بہت آگے تک پھیلتا رہا۔ آج اس کے ماننے والوں کی تعداد افریقہ اور وسط ایشیا میں دسیوں ملین ہے اور پاکستان اور شمالی ہندوستان اور انڈونیشیا میں اور بھی زیادہ ہے۔ انڈونیشیا میں اسلام ایک اتحادی عامل ثابت ہوا ہے۔ تاہم برصغیر ہند میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان کشاکش اتحاد کے راستہ میں ایک بڑی رکاوٹ رہی ہے۔

اب اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ محمدؐ کے اثرات مجموعی طور پر انسانی تاریخ کے اوپر کیا ہیں۔ تمام مذاہب کی طرح اسلام اپنے پیروؤں کی زندگی کو غیر معمولی طور پر متاثر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے تمام بڑے مذاہب کے بانیوں نے

ہماری اس کتاب میں نمایاں طور پر جگہ پائی ہے۔ چوں کہ عیسائی سرسری اندازہ کے مطابق، دنیا میں مسلمانوں کے مقابلہ میں تقریباً دگنی تعداد میں ہیں۔ ابتدائی طور پر یہ بات عجیب معلوم ہوگی کہ محمدؐ کو ہم نے اس کتاب میں مسیحؑ سے اوپر رکھا ہے۔ ہمارے اس فیصلہ کے دو بڑے وجوہ ہیں۔ اول محمدؐ نے اسلام کی ترقی میں اس سے کہیں زیادہ اہم حصہ ادا کیا ہے جتنا مسیحؑ نے عیسائی مذہب کی ترقی کے لئے کیا ہے۔ مسیحیت کی بنیادی اخلاقیات، جس حد تک وہ یہودیت سے مختلف ہیں، ان کی تعلیم اگرچہ حضرت مسیح نے دی۔ مگر مسیحی الٰہیات کا وضع کرنے والا اصلاً سینٹ پال ہے۔ وہی اس کا اصل مبلغ ہے اور عہد نامہ جدید کے بڑے حصہ کا مصنف بھی۔

مگر اسلام کی الٰہیات اور اس کے بنیادی اخلاقی اصول دونوں کو دینے والے خود محمدؐ تھے۔ مزید یہ کہ نئے مذہب کی تبلیغ میں انھوں نے کلیدی حصہ ادا کیا اور اسلام کے مذہبی اعمال کو قائم کیا۔ پھر وہی ہیں جو کہ مسلمانوں کی مقدس کتاب قرآن کے مصنف ہیں، جو کہ محمدؐ کے کچھ واردات قلب کا ریکارڈ ہے اور جس کی بابت ان کا یقین تھا کہ وہ براہ راست خدا کی طرف سے ان پر الہام کیا گیا ہے۔ ان الہامات کا اکثر حصہ محمدؐ کی زندگی ہی میں صحت کے ساتھ لکھ لیا گیا تھا اور ان کی وفات کے جلد ہی بعد ان کو ایک مستند مجموعہ کی صورت میں مرتب کر لیا گیا۔ اس لئے قرآن قریبی طور پر محمدؐ کے خیالات اور تعلیمات کی نمائندگی کرتا ہے اور بڑی حد تک ان کے بولے ہوئے اصل الفاظ کا بھی۔ مسیحؑ کی تعلیمات کے بارے میں اس قسم کا تفصیلی مجموعہ موجود نہیں۔ قرآن چوں کہ مسلمانوں کے لئے اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ بائبل مسیحیوں کے لئے۔ اس لئے قرآن کے واسطے سے مسلمانوں کے اوپر محمدؐ کا اثر غیر معمولی رہا ہے۔ اغلب ہے کہ محمدؐ کے اضافی اثرات اسلام پر اس سے بہت زیادہ ہوں جتنا کہ مسیحؑ اور سینٹ پال کا مجموعی اثر مسیحیت پر۔ البتہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خالص مذہبی سطح پر محمدؐ کے اثرات انسانی تاریخ پر اتنے ہی ہیں جتنے مسیحؑ کے ہیں۔ مزید یہ کہ محمدؐ (بمقابلہ مسیحؑ کے) دنیاوی لیڈر بھی تھے اور مذہبی لیڈر بھی۔ درحقیقت عرب فتوحات کے پیچھے قوت محرکہ کی حیثیت سے ان کو تمام زمانوں میں سب سے زیادہ با اثر سیاسی لیڈر کہا جا سکتا ہے۔

اکثر اہم تاریخی واقعات کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ناگزیر تھے اور جس خاص سیاسی لیڈر نے اس کی رہنمائی کی، اس کے بغیر بھی وہ وقوع میں آتے۔ مثال کے طور پر، جنوبی امریکہ اس وقت بھی اسپین سے آزادی حاصل کر لیتا اگر سائمن بولیور کا سرے سے وجود نہ ہوتا۔ مگر یہی بات عرب فتوحات کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی۔ محمدؐ سے پہلے عرب میں اس قسم کا کوئی واقعہ ظہور میں نہیں آیا۔ اور یہ یقین کرنے کی کوئی بنیاد نہیں ہے کہ ان کے بغیر بھی یہ فتوحات حاصل ہوتیں۔ انسانی تاریخ میں اس سے ملتی جلتی فتوحات صرف منگولوں کی ہیں جو انھوں نے تیرھویں صدی میں حاصل کیں۔ یہ فتوحات بنیادی طور پر چنگیز خاں کے اثر سے ہوئیں۔ تاہم یہ فتوحات عربوں کی فتوحات سے وسیع تر ہونے کے باوجود مستقل قائم نہ رہ سکیں اور آج منگولوں کے پاس صرف وہی علاقے ہیں جو ان کے پاس چنگیز خاں سے پہلے تھے۔

عربوں کی فتوحات کا معاملہ بالکل مختلف ہے، عراق سے مراکش تک عرب قوموں کا ایک پورا سلسلہ پھیلا ہوا ہے جو نہ صرف اسلام میں اپنے عقیدہ کی وجہ سے متحد ہیں بلکہ عربی زبان، تاریخ اور کلچر بھی سب کا ایک ہے۔ مسلم مذہب میں قرآن

کی مرکزیت اور یہ واقعہ کہ وہ عربی زبان میں لکھا گیا ہے، اس نے غالباً عربی کو اس سے بچایا ہے کہ وہ مختلف اور ایک دوسرے کے لئے ناقابل فہم زبانوں میں تقسیم ہو جائے۔ حالاں کہ درمیانی تیرہ صدیوں میں ایسا ہونا بالکل قرین قیاس تھا۔ عرب ریاستوں میں اختلاف اور تقسیمیں یقیناً موجود ہیں اور وہ قابل لحاظ ہیں، مگر جزئی عدم اتحاد کو دیکھ کر ہمیں اتنا اندھا نہیں ہونا چاہئے کہ ہم ان اہم اتحادی اجزا کو نہ دیکھیں جو مسلسل ان کے درمیان پائے جا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ۷۴-۱۹۷۳ کی سردیوں میں عربوں نے تیل کا بائیکاٹ کیا تو ایران اور انڈونیشیا اس میں شریک نہیں ہوئے۔ مگر یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ تمام عرب ریاستیں اور صرف عرب ریاستیں اس منصوبہ میں شریک ہوئیں۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ ساتویں صدی میں عربوں کی فتوحات انسانی تاریخ میں مسلسل اہم حصہ ادا کر رہی ہیں۔ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ مذہبی اور دنیاوی اثرات کا یہی بے نظیر اجتماع ہے جو میری نظر میں محمد کو اس لائق بناتا ہے کہ ان کو تاریخ کا سب سے زیادہ با اثر واحد شخص قرار دیا جائے۔ (انگریزی سے ترجمہ)

یہ مضمون مائیکل ہارٹ (پیدائش ۱۹۳۲) کی کتاب ایک سو (The 100) سے ماخوذ ہے۔ مصنف ایک امریکی عالم فلکیات ہیں اور اسی کے ساتھ مورخ بھی۔ انھوں نے اور ان کی اعلیٰ تعلیم یافتہ بیوی نے مل کر دنیا کی مشہور شخصیتوں کا مطالعہ کیا ہے۔ اس مطالعہ کا حاصل انھوں نے ۵۷۲ صفحات کی ایک انگریزی کتاب کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں ایک سو ایسے آدمیوں کے حالات درج ہیں جنھوں نے مصنف کے نزدیک تاریخ پر نمایاں ترین اثرات ڈالے۔ کتاب میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو سرفہرست رکھا گیا ہے۔ کیوں کہ مصنف کے مطالعہ کے مطابق وہ تاریخ کے سب سے بڑے انسان ہیں۔ انسانی تاریخ پر آپ نے جو اثرات ڈالے وہ کسی دوسرے واحد شخص نے نہیں ڈالے۔ اس کتاب میں نمبر ۳ پر حضرت مسیحؑ، نمبر ۱۶ پر حضرت موسیٰؑ اور نمبر ۵۱ پر حضرت عمر بن الخطابؓ کو رکھا گیا ہے۔ یہاں کتاب کے اس حصہ کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ہے۔ اس کتاب کی قیمت ساڑھے بارہ ڈالر ہے۔ کتاب میں اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غیر معمولی خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ تاہم طریق مطالعہ کے اعتبار سے اس میں وہ خامیاں موجود ہیں جو غیر مسلم سیرت نگاروں کے یہاں اکثر پائی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہنا کہ آپ نے ابتداءً یہود یوں اور عیسائیوں سے توحید کا تصور لیا۔ یا یہ کہ آپ قرآن کے مصنف تھے۔ یہ باتیں نہ صرف ہمارے عقائد کے خلاف ہیں بلکہ خالص علمی پہلو سے بھی بالکل بے بنیاد ہیں اور ان کے رد میں اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ان مزعومات کے علمی اور تاریخی طور پر باطل ثابت ہونے کے باوجود مغربی علماء کیوں انھیں دہراتے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ ان کا مخصوص ذہن ہے، وہ "علم" کے کسی غیر زمینی ماخذ کو نہیں مانتے۔ اس لئے ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک شخص نے زمین سے ماوراء کسی ذریعہ سے کیسے علم حاصل کر لیا۔ جب آدمی کے ذہن میں کوئی بات بیٹھ جائے تو اس کے خلاف کوئی بات، خواہ وہ کتنی ہی مدلل ہو، اس کے ذہن کی پکڑ میں نہیں آتی۔ وہ اپنی بات کو اس طرح دہراتا رہتا ہے جیسے کہ وہ بدستور ایک مسلمہ صداقت ہے۔ خواہ اس کو کتنے ہی معقول دلائل سے رد کیا جا چکا ہو (مترجم)

عید: نئی زندگی کے آغاز کا دن ہے

عید آغازِ حیات کا دن ہے۔ روزہ کا مہینہ احتساب کا مہینہ ہے اور عید کا دن اس کے بعد نئے حوصلوں کے ساتھ مستقبل کی طرف اپنا سفر شروع کرنے کا۔

روزہ کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی دنیا سے اور دنیا کی چیزوں سے ایک محدود مدت کے لئے کٹ کر اللہ کی طرف متوجہ ہو جائے۔ حتیٰ کہ اپنی فطری ضروریات تک میں کمی کر دے۔ رمضان کا اعتکاف اسی کی انتہائی صورت ہے جب کہ بندہ ماسوا سے قطع تعلق کر کے خدا کے گھر میں آکر پڑ جاتا ہے۔ اس کا مطلب لوگوں کو رہبان بنانا نہیں ہے۔ یہ "حساب کئے جانے سے پہلے اپنا حساب کرلو"، کا ایک وقتی لمحہ ہے تاکہ مستقل زندگی کے لئے لوگوں کو تیار کیا جائے۔ عید کا دن اس وقتی لمحہ کا خاتمہ ہے جب کہ مسلمان نئے شعور اور نئی قوت عمل کے ساتھ از سر نو زندگی کے میدان میں داخل ہوتا ہے۔ تزکیۂ نفس اور صبر اور تعلق باللہ کی جو دولت اس نے روزہ کے ذریعہ پائی ہے، اس کو ساری زندگی میں پھیلانے کے لئے دوبارہ دنیا کے ہنگاموں میں واپس آجاتا ہے ——— روزہ وقتی طور پر عالم مادی سے کٹنا اور عید دوبارہ عالم مادی میں لوٹ آنا ہے۔ روزہ جس طرح محض بھوک پیاس نہیں ہے۔ اسی طرح عید محض کھیل تماشے کا نام نہیں ہے۔ روزہ اللہ سے قربت حاصل کرنے کی کوشش ہے اور عید اس نئے بہتر سال کا آغاز ہے جو روزہ کے بعد روزہ داروں کے لئے مقدر کیا گیا ہے۔

آئیے ہم عید سے اپنی نئی زندگی شروع کریں۔ عید کے دن کو اپنی دینی و ملّی تعمیر کے آغاز کا دن بنائیں۔ آج ہم نئی ایمانی قوت اور نئے عملی حوصلہ کے ساتھ زندگی کی جدوجہد میں داخل ہوں۔ ہمارا سینہ خدا کے نور سے روشن ہو۔ ہماری مسجدیں خدا کے ذکر سے آباد ہوں۔ ہمارے گھر تقویٰ اور تواضع کے گھر بن جائیں۔ اللہ کے لئے ہم سب ایک ہو کر وہ جدوجہد شروع کریں جس کے نتیجہ میں ہم کو دنیا میں اللہ کی نصرت ملتی ہے اور آخرت میں اللہ کی جنت۔ روزہ کے بعد عید کا آنا روزہ داروں کے لئے خوش خبری ہے۔ یہ اللہ کی طرف سے اعلان ہے کہ اگر ہم نے روزہ کی اسپرٹ کو زندگی میں استعمال کیا تو ہم دونوں جہان کی خوشیوں سے ہمکنار ہوں گے

عید ایک خوش خبری ہے۔ اس بات کی خوش خبری کہ ہم خوشی کو پا سکتے ہیں، ہم خوشی کی طرف بڑھ رہے ہیں، ہم خوشی کے کنارے پہنچ گئے ہیں۔ مگر منزل تک پہنچنے کے لئے ابھی ہم کو ایک جست لگانی ہے۔ روزہ نے صبر اور تعلق باللہ کی جو طاقت دی ہے اس کو بھرپور استعمال کیجئے۔ اور اس کے بعد آپ کامیابی کی آخری منزل پر ہوں گے۔

روس کی آبادی اس وقت ۲۵ کروڑ ہے۔ لڑکوں اور لڑکیوں میں آزادانہ تعلقات کے رجحان نے پیدائش کے تناسب کو موت کے تناسب سے کم کر دیا ہے۔ یہ صورت حال بے حد تشویش ناک ہے۔ چنانچہ روسی حکومت پچھلے چند سال سے بچوں کی پیدائش پر بہت زور دے رہی ہے۔ حتیٰ کہ نئے بچہ کی پیدائش پر خصوصی انعام دیا جاتا ہے۔

روسی حکمرانوں کی یہ کوشش کامیاب ہوئی ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس کا فائدہ زیادہ تر مسلمانوں کے حصہ میں چلا گیا ہے۔ تازہ اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ زیادہ بچہ پیدا کرنے والی عورتیں زیادہ تر مسلمان ہیں۔ یہ تناسب اگر جاری رہے تو ایک اندازہ کے مطابق، ۲۵ سال میں سوویت یونین میں مسلم آبادی ایک سو ملین تک جا پہنچے گی۔ جب کہ وہاں کی موجودہ مسلم آبادی ۴۵ ملین ہے۔ صیہونی عالمی کانگرس کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ اگر پیدائش کی موجودہ رفتار جاری رہے تو اس صدی کے آخر تک ہر تین روسی شہریوں میں سے ایک روسی مسلمان ہوگا (کرسینٹ، ٹورنٹو)

مستقبل میں مسلم غلبہ کے خطرہ سے بچنے کے لئے روسی حکومت نے ایک نئی مہم شروع کی ہے جس کا نام ہے روسیانا (Russification) اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس سے روکا جائے کہ وہ ملک میں اتنی اکثریت حاصل کر لیں کہ اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کے زور پر اپنا علیحدہ تشخص (Seperate Identity) قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ روسی حکومت کی پریشانی کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ روس کا مغربی ایشیائی حصہ جہاں مسلمان زیادہ آباد ہیں، وہ قدرتی دولت سے مالا مال ہے۔ یہ علاقہ نہ صرف کپاس اور زرعی پیداوار کے لئے اہمیت رکھتا ہے بلکہ کئی بڑے بڑے تیل کے چشمے بھی اس میں واقع ہیں۔ تاہم روسی بنانے کی مہم ابھی تک بالکل ناکام ثابت ہوئی ہے۔ مذہبی عبادات اور رسوم، جن پر حکومت نے پابندیاں لگائی ہیں، وہ پوشیدہ طور پر پہلے سے زیادہ رائج ہوگئی ہیں (ٹائمس آف انڈیا ۲۴ مارچ ۱۹۷۹)

اسلامی زندگی فطرت کے عین مطابق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دنیا اور آخرت دونوں جہان کی سعادتوں کا مجموعہ ہے جب کوئی فرد یا کوئی سماج اسلامی زندگی اختیار کرتا ہے تو وہ کائنات کے پورے نظام کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتا ہے وہ دنیا میں کوئی فساد پیدا نہیں کرتا اور آخرت میں بننے والے معیاری سماج کے لئے بھی قابل قبول ٹھہرتا ہے۔ اس کے برعکس غیر اسلامی طریقے فطرت سے ہٹے ہوئے طریقے ہیں۔ وہ طرح طرح کے بے شمار مسائل پیدا کرتے ہیں

جس سماج میں نکاح کو بے جا قید سمجھ لیا جائے اور آزادانہ شہوت رانی کو پسند کیا جانے لگے وہاں قدرتی طور پر بچے ناخواندہ مہمان سمجھے جانے لگتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں آبادی میں کمی ہونا شروع ہوتی ہے اور بالآخر قومی طاقت کمزور ہو جاتی ہے۔ مستقل صنفی تعلق کے بجائے آزادانہ صنفی تعلقات وجود میں آتے ہیں جس کی وجہ سے خاندانی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ لوگ گھریلو ذمہ داریوں سے بھاگنے لگتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پیدا شدہ بچوں کا کوئی سرپرست نہیں ہوتا۔ بچے خودرو پودوں کی طرح اگتے ہیں، سماجی وفاداریوں کا ان کے اندر کوئی شعور نہیں ہوتا۔ وہ صرف ملک کے جرائم میں اضافہ کا سبب بنتے ہیں۔ جوانی کی عمر میں مردوں کو گرل فرینڈ اور عورتوں کو بوائے فرینڈ ملتے رہتے ہیں۔ مگر جب شباب کی کشش ختم ہوتی ہے تو مرد و عورت دونوں اکیلے ہو کر رہ جاتے ہیں۔

کام سے پہلے کام کی بنیاد تیار کیجئے

علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام ۱۸۷۵ میں ہوا۔ ۱۹۲۰ میں مسلم یونیورسٹی وجود میں آئی۔ مگر مسلمانوں کے اس سب سے بڑے تعلیمی ادارہ میں تجارتی تعلیم (کامرس) کا شعبہ پہلی بار ۱۹۴۵ میں قائم ہو سکا۔ یعنی ادارہ کے ابتدائی قیام کے ۷۰ سال بعد۔

یونیورسٹی میں تجارتی شعبہ کے قائم ہونے کا لطیفہ بڑا سبق آموز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ڈاکٹر ضیاء الدین (سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی) مجوزہ میڈیکل کالج کے چندہ کے لئے مختلف شہروں کا دورہ کر رہے تھے۔ اس سلسلہ میں وہ کانپور پہنچے۔ وہاں چندہ کی مہم کے دوران ایک تاجر نے پوچھا "آپ کو اپنے میڈیکل کالج کے لئے سب سے زیادہ چندہ کس طبقہ سے ملا" ڈاکٹر ضیاء الدین نے بتایا کہ تاجروں سے۔ تاجر نے کہا: جب قومی منصوبوں میں زیادہ تعاون آپ کو تاجروں سے ملتا ہے تو قوم کو تجارتی ترقی کی راہ پر لانے کے لئے آپ اپنی یونیورسٹی میں تجارتی تعلیم کا شعبہ کیوں نہیں کھولتے۔ اس واقعہ سے سابق وائس چانسلر کو احساس ہوا اور واپس آکر انھوں نے اس کی کوشش شروع کی یہاں تک کہ ۱۹۴۵ میں پہلی بار مسلم یونیورسٹی میں کامرس کا شعبہ کھولا گیا۔

یہ واقعہ اگرچہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پر صرف جزئی طور پر صادق آتا ہے۔ مگر ہماری عام قیادت کی وہ مکمل تصویر ہے۔ ہمارے لیڈروں کا یہ حال ہے کہ ان کی ساری بنیاد قومی چندہ پر قائم ہے۔ وہ آئے دن قوم سے چندہ مانگنے کے لئے نئی نئی اسکیمیں لے کر اٹھتے رہتے ہیں۔ مگر یہ لیڈر اپنے آپ کو اس کا ذمہ دار نہیں سمجھتے کہ وہ قوم کو چندہ دینے کے قابل بنانے کے لئے بھی ان کے درمیان کوئی منصوبہ چلائیں اور اس کے لئے جدوجہد کریں۔

کسی منصوبہ کی کامیابی سے پہلے یہ ضروری ہے کہ قوم کو اس کے لئے تیار کیا جا چکا ہو۔ اگر آپ "مسلمانوں کا انگریزی اخبار" وجود میں لانا چاہتے ہیں تو یہ اسی وقت ممکن ہے کہ مسلمانوں میں ایک بڑا طبقہ ایسا پیدا ہو گیا ہو جو انگریزی میں اخبار کے مطالعہ کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ ایک مسلم یونیورسٹی حقیقی معنوں میں مسلم یونیورسٹی رہے تو یہ اسی وقت ممکن ہے کہ آپ مسلم نوجوانوں میں محنت اور جدوجہد کا اتنا حوصلہ پیدا کر دیں کہ وہ امتیازی لیاقت پیدا کر کے مسلسل اس پر اپنا قبضہ باقی رکھ سکیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ اردو زبان باقی رہے تو یہ اسی وقت ممکن ہے کہ عوام میں اردو لٹریچر کی طلب اتنی بڑھ جائے کہ خود اپنے بل پر اس کے تحفظ کا انتظام ہو جائے۔

یہی معاملہ ملی تعمیر کے تمام شعبوں کا ہے۔ اگر آپ ملت کو اوپر اٹھانا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے فرد کو اٹھانے کا انتظام کیجئے۔ اگر آپ ملی ترقی کے لئے کوئی اقدام کرنا چاہتے ہیں تو اس سے پہلے ابتدائی سطح پر ضروری تیاریاں کر لیجئے۔ "چھت" والے کام اسی وقت بن سکتے ہیں جبکہ "بنیاد" کی سطح پر آپ نے اپنے حصہ کا کام پورا کر لیا ہو ——

پہلے کچھ سہنا پڑتا ہے

بعض قوموں میں گودنا گدانے کا رواج ہے، پہچان کے لئے یا تبرک کے لئے جسم کے کسی حصہ پر خاص شکلیں یا نام بنوا لیتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ مطلوبہ شکل کے مطابق پہلے سوئی سے چھید کیا جاتا ہے اور پھر ان چھیدوں میں مسالہ بھر دیا جاتا ہے۔ اس طرح کالے رنگ کا نقشہ بن جاتا ہے جو عمر بھر رہتا ہے۔

قصہ ہے کہ ایک آدمی گودنا گودنے والے کے پاس گیا اور کہا کہ میرے ہاتھ پر شیر کی شکل بنا دو۔ گودنے والے نے اپنی سوئی اٹھائی اور نشان لگانا شروع کیا۔ سوئی کی چبھن آدمی کے لئے تکلیف دہ ثابت ہوئی۔ اس نے کہا "کیا بنا رہے ہو" گودنے والے نے کہا "دم"۔ آدمی نے کہا "کیا دم کے بغیر شیر نہیں ہوتا"۔ گودنے والے نے کہا اچھا۔ اور دوسری چیز بنانے لگا۔ اب پھر سوئی کی نوک چبھنے لگی۔ آدمی نے کہا اب کیا بنا رہے ہو۔ اس نے کہا "پاؤں"۔ آدمی نے کہا "کیا پاؤں ضروری ہے" گودنے والے نے کہا ٹھیک ہے۔ اس کو چھوڑ دیتا ہوں۔ اب وہ دوسری چیز گودنے لگا۔ آدمی کے اندر پھر بے چینی پیدا ہوئی۔ اس نے کہا "اب کیا بنا رہے ہو"۔ اس نے کہا "جبڑا"۔ آدمی نے کہا کیا جبڑا ضروری ہے۔ تم بغیر جبڑے ہی کے شیر بنا دو"۔ غرض اس طرح وہ ایک ایک چیز کو منع کرتا گیا اور بالآخر یہ ہوا کہ شیر کی تصویر نہ بن سکی، صرف چند متفرق نشانات اس کے ہاتھ پر بن کر رہ گئے —— ہر مقصد کے لئے ابتداءً کچھ سہنا پڑتا ہے۔ اگر آدمی سہنے کے لئے تیار نہ ہو تو وہ کسی بھی مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

عبدالحمید چھوٹانی (پیدائش ۱۹۲۳) پاکستان کے ایک ممتاز سائنس داں ہیں۔ وہ بمبئی آئے۔ اس موقع پر ایک اخباری رپورٹر نے ان سے انٹرویو لیتے ہوئے سوال کیا: "انجینیرنگ کے میدان میں پاکستان اتنا پیچھے کیوں ہے" مسٹر چھوٹانی نے جواب دیا: "یہ صحیح ہے کہ ہم انجینیرنگ میں ابھی تک قابل قدر ترقی حاصل نہ کر سکے۔ اس کی خاص وجہ ہے ہمارے یہاں بنیاد (Base) کی کمزوری۔ اکا دکا انڈسٹری سے آخر کتنی ترقی کی امید کی جا سکتی ہے (اخبار عالم ۱۴ اپریل ۱۹۷۹)

یعنی تعلیم گاہیں اسی وقت انجینیر زیادہ پیدا کریں گی جب کہ ان کی کھپت کے لئے ملک میں زیادہ صنعتیں بھی موجود ہوں۔ صنعتوں کی کمی ہو تو کوئی ملک زیادہ انجینیر پیدا نہیں کر سکتا۔

اسی طرح ہر کام کی ایک بنیاد ہوتی ہے۔ بنیاد کے بغیر کوئی اقدام کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ مثلاً جمہوری دور میں سیاست کی بنیاد عوامی رائے ہے۔ اگر آپ کو عوامی ووٹروں کی اکثریت حاصل نہ ہو تو گویا آپ کے پاس وہ بنیاد ہی نہیں ہے جس پر الیکشن لڑے جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر آپ الکشن میں کود دیں تو لازماً آپ ہاریں گے اور اگر آپ کے اندر اعتراف کا مادہ نہیں ہے تو مزید یہ حماقت کریں گے کہ اپنی ہار کو چھپانے کے لئے یہ شور کریں گے کہ الکشن میں دھاندلی ہوئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اگر موقع ملے گا تو فوج سے ساز باز کر کے مقبول عوام لیڈروں کو قتل کرائیں گے تاکہ آپ عوامی بنیاد نہ ہونے کے باوجود حکومت کی گدی پر پہنچ سکیں۔ اگرچہ اس قسم کی کوشش کبھی کسی کے لئے نتیجہ خیز نہیں ہوئی ہے۔ مستقبل کے اعتبار سے، یہ ملک کی بربادی ہے اور بالآخر خود اپنے آپ کی بھی۔

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دل چسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زرتعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ساڑھے سات روپیہ ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، بہرحال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ نوے روپے یا ماہانہ ساڑھے سات روپے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل کے ساتھ سخت ترین واقعات پیش آئے۔ وقت کی جابر سلطنت کے مقابلہ میں وہ بالکل بے یار و مددگار ہو گئے۔ پھر بھی اللہ نے معجزاتی طور پر ان کو بچا لیا۔ مصر سے نکل کر وہ ایک ایسے غیر آباد علاقہ میں پہنچے جہاں خشک بیابان اور طویل پہاڑوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ مگر اللہ نے چٹانوں کے اندر سے ان کے لئے پانی کے چشمے جاری کر دئے اور ان کی غذا کے لئے اوپر سے من و سلویٰ نازل فرمایا۔

بنی اسرائیل کے ساتھ اللہ کا یہ معاملہ قرآن میں محض ایک قصہ کے طور پر بیان نہیں ہوا ہے۔ بلکہ اس میں بہت بڑا سبق ہے۔ یہ تاریخ کی زبان میں داعی کے مقام کو بتایا گیا ہے۔ اللہ کے پیغام کا علم بردار بننے کے لئے آدمی کو اللہ کی سطح پر جینا پڑتا ہے۔ اس کو اپنے آپ کو عالم آخرت سے اتنا زیادہ متعلق کرنا پڑتا ہے کہ موجودہ دنیا کے سرے اس کے ہاتھ سے چھوٹنے لگتے ہیں۔ حق کا داعی وہی شخص بن سکتا ہے جو اپنے آپ کو اتنا زیادہ غیر اللہ سے کاٹے اور اللہ کے ساتھ اپنے کو اتنا زیادہ جوڑے کہ اس کی ہستی تمام تر اللہ رب العالمین کے اوپر منحصر ہو جائے۔ وہ عجز کے اس مقام پر پہنچ جائے جہاں خدا کی نصرت ہی اس کے لئے واحد سہارا ہو۔ اس کا شعور احتیاج اتنا کامل ہو جائے کہ پانی کا ہر گھونٹ اس کو خدا کی طرف سے اترا ہوا گھونٹ معلوم ہونے لگے، کھانے کا ہر لقمہ جو وہ اپنی حلق سے اتارے، اس کو محسوس ہو کہ یہ براہ راست اس کے پاس خدا کی طرف سے بھیجا گیا ہے۔ عبدیت کے اس کامل شعور کی سطح پر آدمی کی زبان سے جو کلمات نکلتے ہیں، اسی کا نام دعوت ہے۔ اس کے بغیر جو لکھا یا بولا جائے وہ تصنیف اور تقریر ہے نہ کہ اللہ کے پیغام کی پیغام رسانی۔

ایک راہ گیر نے دیکھا کہ ریلوے کا پل ٹوٹ گیا ہے۔ اتنے میں اس کو ایک اکسپریس ٹرین طوفانی رفتار کے ساتھ آتی ہوئی نظر آئی۔ اس وقت سیکڑوں مسافروں سے لدی ہوئی ٹرین کو بچانے کی ایک ہی صورت تھی: وہ اپنے خون سے اپنے کپڑے کو لال کرے اور اس کو لے کر ریلوے لائن پر کھڑا ہو جائے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ راہ گیر نے اپنے خون کی قیمت دے کر اپنے آپ کو وہاں پہنچا دیا جہاں امکانی طور پر دوسرے مسافر پہنچنے والے تھے۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہو سکا کہ وہ دوسرے مسافروں کو آنے والے خطرہ سے آگاہ کرے۔ ایک شخص جو آگ میں جل رہا ہو وہی یہ کہہ سکتا ہے کہ "آگ جلاتی ہے"۔ وہ شخص جس پر جلنے کا تجربہ نہیں گزرا، اس کے لئے "آگ جلاتی ہے" کا جملہ محض دور کا ایک جملہ ہے، وہ آگ کے جلانے کی خبر نہیں ہے۔ داعی اگر اپنے دنیوی امکانات کو بچانے کی خاطر زمانہ سازی کرے، وہ اپنے دنیوی نقصانات کی خاطر لوگوں سے لڑے، وہ عوامی مقبولیت کو باقی رکھنے کے لئے ان کی پسندیدہ بولی بولنے لگے۔ وہ بربادی کے اندیشہ کی بنا پر مصلحت پرستی کا طریقہ اختیار کرے۔ تو یہ اس کے مشن کی نفی کے ہم معنی ہوگا۔ اس طرح وہ اپنے ظاہری فائدوں کو محفوظ کرلے گا، مگر اس کا دوسرا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ داعیانہ تجربات سے محروم ہو جائے گا۔ وہ زبان سے آخرت کی بات کرے گا مگر عملاً دنیا میں جی رہا ہوگا۔ وہ لفظی طور پر اپنے آپ کو خدا کا داعی ظاہر کرے گا مگر حقیقت کے اعتبار سے اس کا پورا وجود غیر اللہ میں اٹکا ہوا ہوگا۔ وہ تحریر و تقریر میں حق پرستی کی نمائندگی کرے گا مگر اپنی روز مرہ کی زندگی میں وہ خود پسندی

اور مفاد پرستی کو اپنا مذہب بنائے ہوئے ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی بربادی کی قیمت پر ہی آخرت کی آبادی کا پیغام دیا جا سکتا ہے۔ جو اپنے آپ کو دنیا کی بربادی سے بچائے، وہ گویا اپنے آپ کو مقام دعوت تک پہنچنے سے بچا رہا ہے۔ ایسے شخص کا دعوتی تقریر کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص رات دن دنیا کو سمیٹنے میں لگا ہوا ہو اور دوسرے سے کہے کہ زہد اور قناعت کا طریقہ اختیار کرو۔

کسی بندۂ خدا کی زبان سے حق کی آواز کا اٹھنا مدعو کے اعتبار سے اس کے اوپر خدا کی حجت کا اتمام ہے۔ اور داعی کے اعتبار سے اس کو دعوت حق کا کریڈٹ دینا ہے۔ بندوں کی نظر میں کوئی دعوت اسی وقت دعوت ہے جب کہ وہ شاعری اور تفریح کی سطح پر نہ دی جا رہی ہو بلکہ حقیقی زندگی کی سطح پر کسی روح سے ابلی ہو۔ اسی طرح کوئی بندہ اللہ کی نظر میں اسی وقت دعوتی شرف کا مستحق بنتا ہے جب کہ وہ اللہ کا ہم صحبت بن کر دعوت خداوندی کے لئے اٹھا ہو۔ اس کے بغیر نہ بندوں کی نظر میں اس کی کوئی قیمت ہے اور نہ اللہ کی نظر میں۔

ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من احبَّ دنیاہ اضرَّ بآخرتہ ومن احبَّ آخرتہ اضرَّ بدنیاہ فآثروا ما یبقیٰ علیٰ ما یفنیٰ (مسند احمد، بیہقی)

جو اپنی دنیا سے محبت کرے گا وہ اپنی آخرت کو کھودے گا اور جو اپنی آخرت سے محبت کرے گا وہ اپنی دنیا کو کھودے گا۔ پس جو باقی رہنے والا ہے اس کو ترجیح دو اس پر جو فنا ہونے والا ہے۔

جب آدمی دنیا میں آرام اور عزت سمیٹنا چاہتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آخرت کی طرف سے اس کی توجہ ہٹ جاتی ہے۔ اسی طرح جب ایک شخص کو آخرت کی فکر لگتی ہے تو بالکل قدرتی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ دنیا کی چیزوں کے لئے اس کی فکر کم ہو جاتی ہے اور نتیجۃً اس کو دنیا کے معاملہ میں نقصان پر قانع ہونا پڑتا ہے۔

یہی واقعہ داعی کے معاملہ میں مزید شدت کے ساتھ پیش آتا ہے۔ ایک شخص جو ذاتی طور پر مومن و مسلم بننا چاہے، اس کے مقابلہ میں اس کی ذمہ داریاں کئی گنا زیادہ بڑھ جاتی ہیں جو دوسروں کو ایمان و اسلام کی دعوت پہنچانا چاہتا ہو۔ عام آدمی اگر مومن ہے تو داعی کو شاہد بننا پڑتا ہے۔ دوسرے لوگ جس چیز پر صرف ایمان لائے ہوئے ہیں، داعی کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اس کو "دیکھے" تاکہ دیکھی ہوئی چیز کی طرح وہ دوسروں کو اس کی بابت خبردار کر سکے۔

غیبی حقیقتوں کو اس دنیا میں صرف تصور کی نگاہ سے دیکھا جا سکتا ہے، اس لئے یہ دیکھنا اس وقت وقوع میں آتا ہے جب کہ نظر آنے والی چیزوں سے وہ اپنی توجہ کو اتنا زیادہ ہٹائے کہ اس کی تمام توجہات عالم آخرت کی طرف لگ جائیں۔ آخرت کو دیکھنا صرف اس وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ آدمی دنیا کو نہ دیکھنے پر راضی ہو جائے —— دنیا کو کھونے والا ہی آخرت کو پاتا ہے اور جو شخص دنیا میں بے توجہ ہو جائے وہی وہ شخص بنتا ہے جو آخرت کو دیکھے اور دوسروں کو اسے دکھائے۔ جس کی نگاہیں دنیا میں اٹکی ہوئی ہوں، وہ کبھی آخرت کو دیکھنے والا نہیں بن سکتا۔ اس لئے وہ کبھی داعی کے مقام پر بھی کھڑا نہیں ہو سکتا۔ دعوت آخرت کی واحد قیمت بربادئ دنیا ہے۔ جو اپنی دنیا کو برباد کرنے کے لئے تیار نہ ہو اس کو آخرت کی دعوت کے میدان میں قدم بھی نہیں رکھنا چاہئے۔

ایک معجزہ جو کبھی پیش نہیں آیا

ایک مصیبت زدہ بستی تھی۔ ڈاکوؤں نے اس کے باشندوں کے گھروں کو جلا دیا تھا۔ ان کی معاشیات تہس نہس ہوگئی تھیں۔ ان کو اپنے چاروں طرف ناکامی اور بربادی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ایک روز اچانک بستی کے ایک بزرگ کو ایک معجزاتی تدبیر سوجھی۔ ان کو نظر آیا کہ بستی کے مسئلہ کا بہترین حل یہ ہے کہ وہ ہر روز کسی خالی میدان میں جا کر ۱۵ پھلجھڑیاں چھوڑیں۔ انھوں نے اس پر عمل شروع کر دیا۔ چند روز کے بعد ان کو اندازہ ہوا کہ ان کے پاس پھلجھڑیوں کی تعداد زیادہ ہے۔ اب وہ روزانہ ۱۰۱ پھلجھڑیاں چھوڑنے لگے۔ مزید اضافہ ہوا تو انھوں نے پھلجھڑیوں کی تعداد ۲۵۱ اور آخر میں ۳۰۱ کر دی۔ منصوبہ کامیاب رہا۔ ادھر وہ پھلجھڑیاں چھوڑتے رہے، ادھر بستی کے مکانات کے ملبہ سے شاندار کوٹھیاں ابھرنا شروع ہوگئیں۔ لوگوں کی اجڑی ہوئی دکانیں از سر نو تعمیر ہو کر سامان سے اور گاہکوں سے بھر گئیں۔ ان کے نوجوان تعلیم و ترقی کے میدانوں میں بے روک ٹوک دوڑنے لگے۔ ہر طرف بستی کی عزت و اقبال کے جھنڈے لہرانے لگے۔ ان کے دشمن ذلیل و خوار ہو کر ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سو گئے ـــــ اس تمام کارروائی میں ۲۱۲۶ پھلجھڑیاں استعمال ہوئیں اور حیرت انگیز طور پر اس میں صرف دو ہفتے لگے۔ ۹ جولائی ۱۹۷۹ کو تاریخ انسانی کی یہ انوکھی مہم شروع ہوئی اور ۲۵ جولائی ۱۹۷۹ کو شاندار کامیابیوں کے ساتھ ختم ہوگئی۔

اس بے نظیر کامیابی پر شاعروں نے اشعار لکھے۔ بیان دینے والوں نے بیانات دیئے۔ تقریر کرنے والوں نے تقریریں کیں۔ بزرگ کے اپنے اخبار نے موٹی موٹی سرخیوں کے ساتھ اس کے فاتحانہ کارنامے شائع کئے۔ مگر بستی والے ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں: "یہ معجزہ کہاں پیش آیا۔ ہم کو اس کا کوئی علم نہیں۔ ہم تو اب بھی اسی بُری حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔ ہمارے مکانات اب بھی ٹوٹے ہوئے ہیں۔ ہماری دکانیں اب بھی اجڑی ہوئی ہیں۔ ہمارے بچوں کا مستقبل اب بھی اسی طرح غیر یقینی ہے جس طرح وہ پہلے غیر یقینی تھا۔ یہ انوکھا معجزہ شاید ایک انوکھا راز بھی ہے جس کو صرف پھلجھڑی سیاست کے ماہرین ہی جان سکتے ہیں۔ دوسرا کوئی شخص اس کو سمجھ نہیں سکتا۔

آدمی الفاظ پالیتا ہے

صدر سادات نے ایک تقریر میں کہا: مصر اب تک ایک نامعلوم خوف و ہراس میں مبتلا تھا جس کی وجہ سے مصر ٹھٹھر کر رہ گیا تھا۔ اب مصر کو اس خوف سے نجات مل گئی ہے۔ اب ہم فخر کے ساتھ ایک نئے مصر کی تعمیر کر سکتے ہیں (۱۹ جولائی ۱۹۷۹) مصر اور اسرائیل کے درمیان سمجھوتہ بہت سے لوگوں کے نزدیک عرب مفادات سے غداری ہے۔ مگر اسی واقعہ کے بارے میں صدر سادات نے یہ الفاظ پالئے کہ وہ مصر کے لئے نئے شاندار دور کا دروازہ کھولتا ہے۔

جنت میں کون لوگ آباد کئے جائیں گے

آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کو دیں گے جو زمین میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا۔ اور عاقبت صرف ڈرنے والوں کے لئے ہے۔ جو شخص بھلائی لے کر آیا تو اس کو ملے گا اس سے بہتر اور جو بدی لے کر آیا تو ایسے لوگوں کو جو بدی کے کام کرتے ہیں اتنا ہی بدلہ ملے گا جتنا وہ کرتے تھے (قصص ۸۳ - ۸۴)

موجودہ زندگی میں جو لوگ اس بات کا ثبوت دیں کہ وہ گھمنڈ کی نفسیات سے پاک ہیں اور وہ بگاڑ کا مزاج نہیں رکھتے ہیں، ان کو جنت کی نفیس اور لطیف آبادیوں میں بسایا جائے گا۔ اس کے برعکس جو لوگ گھمنڈ کو اپنی غذا بنائیں، جن کی فسادی کارروائیوں سے ان کے پڑوسیوں اور ان کے متعلقین کو امن حاصل نہ ہو وہ جہنم کے پُرعذاب ماحول میں پھینک دئے جائیں گے۔

بڑا بننے کا مطلب کیا ہے۔ کوئی بھی شخص خدا کے مقابلہ میں اپنے کو بڑا نہیں بتاتا۔ نہ کوئی یہ دعویٰ لے کر اٹھتا کہ وہ زمین و آسمان یا سورج اور چاند سے بڑا ہے۔ بڑائی کا اظہار ہمیشہ انسان کے مقابلہ میں ہوتا ہے۔ آدمی کا بڑا بننا یہ ہے کہ وہ اپنے جیسے دوسرے انسانوں کے اوپر اپنا اقتدار قائم کرے۔ حالاں کہ وہ صرف عاجز اور بے طاقت وجود کی حیثیت سے پیدا کیا گیا ہے۔ وہ کسی انسان کی طرف سے آئی ہوئی تنقید کے اوپر بپھر اٹھے۔ حالاں کہ کوئی بھی انسان ایسا نہیں جو تنقید سے بالاتر ہو۔ اس کے پاس حق کا پیغام آئے تو وہ اس کو ماننے سے انکار کر دے حالاں کہ عبدیت کا تقاضا ہے کہ آدمی حق کے آگے جھک جائے۔ کسی کے زبان یا قلم سے اس کے احساس برتری کو ٹھیس پہنچے تو وہ اس کو بخشنے کے لئے تیار نہ ہو۔ حالاں کہ برتری کا حق اس دنیا میں صرف ایک اللہ کو ہے۔

زمین میں فساد برپا کرنا کیا ہے۔ یہ کہ معاملات اور برتاؤ میں ایسا رویہ اختیار کیا جائے جو خدا کی مقرر کی ہوئی حدود کے خلاف ہو۔ قرآن کے مطابق فساد کی کچھ صورتیں یہ ہیں: اللہ سے نڈر ہو کر زندگی گزارنا (اعراف ۵۶) اللہ کے راستہ سے روکنا (نحل ۸۸) دلیل آجانے کے بعد اس کو نہ ماننا (آل عمران ۶۳) داعی کو حقیر سمجھ کر نظرانداز کرنا (اعراف ۷۴) کرشمے دکھا کر لوگوں کو حق سے پھیرنا (یونس ۸۱) کبر اور ظلم کی وجہ سے حق کا انکار کرنا (نمل ۱۴) شریف آدمیوں کو بے عزت کرنا (نمل ۳۴) چال بازی کا طریقہ اختیار کرنا (بقرہ ۱۱) رشتہ داروں سے قطع تعلق کرنا (محمد ۲۲) دوسرے کا مال چرانا (یوسف ۷۳) کھیتی کو ویران کرنا اور انسان کو قتل کرنا (بقرہ ۲۰۵) عہد کرنے کے بعد اس کو توڑنا (رعد ۲۵) اسراف کا طریقہ اختیار کرنا (شعراء ۱۵۲) مال و دولت پر فخر کرنا (قصص ۷۷) قوت و طاقت کا غلط استعمال کرنا (فجر ۱۲) کمزوروں کا استحصال کرنا (بقرہ ۲۰۵) باہمی لڑائی پیدا کرنا (مائدہ ۶۴) اختلاف و انتشار برپا کرنا (اعراف ۱۴۲) ناپ تول میں کمی کرنا (ہود ۸۵) کسی کی نسل ختم کرنے کی کوشش کرنا (قصص ۴) مال کو صرف دنیا کے مقاصد میں خرچ کرنا (قصص ۷۷) وغیرہ ●

تذکیر القرآن

اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہ کیا۔ اس نے انکار کیا اور گھمنڈ کیا اور کافروں میں سے ہوگیا۔ اور ہم نے کہا اے آدم، تم اور تمھاری بیوی دونوں جنت میں رہو اور اس میں سے کھاؤ فراغت کے ساتھ جہاں سے چاہو۔ اور اس درخت کے نزدیک مت جانا ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔ پھر شیطان نے اس درخت کے ذریعہ دونوں کو لغزش میں مبتلا کردیا اور ان کو اس عیش سے نکال دیا جس میں وہ تھے۔ اور ہم نے کہا تم سب اترو یہاں سے۔ تم ایک دوسرے کے دشمن ہوگے۔ اور تمھارے لئے زمین میں ٹھہرنا اور کام چلانا ہے ایک مدت تک۔ پھر آدم نے سیکھ لئے اپنے رب سے چند بول تو اللہ اس پر متوجہ ہوا۔ بے شک وہ توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔ ہم نے کہا تم سب یہاں سے اترو۔ پھر جب آئے تمھارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لئے نہ کوئی ڈر ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے اور جو لوگ انکار کریں گے اور ہماری نشانیوں کو جھٹلائیں گے تو وہی لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ۳۹ - ۳۴

آدمؑ کو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں اور ابلیس کے درمیان کھڑا کیا اور سجدہ کے امتحان کے ذریعہ آدم کو عملی طور پر بتایا کہ ان کے لئے زمین پر دو ممکن راہیں ہوں گی۔ ایک فرشتوں کی طرح حکم الٰہی کے سامنے جھک جانا، خواہ اس کا مطلب اپنے سے کمتر ایک بندے کے آگے جھکنا کیوں نہ ہو۔ دوسرا ابلیس کی طرح اپنے کو بڑا سمجھنا اور دوسرے کے آگے جھکنے سے انکار کر دینا۔ انسان کی پوری زندگی اسی امتحان کی رزم گاہ ہے۔ یہاں ہر وقت آدمی کو دو رویوں میں سے کسی ایک رویہ کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ ایک ملکوتی رویہ، یعنی دنیا کی زندگی میں جو معاملہ بھی پیش آئے، اللہ کے حکم کی تعمیل میں آدمی حق و انصاف کے آگے جھک جائے۔ دوسرا شیطانی رویہ، یعنی جب کوئی معاملہ پیش آئے تو آدمی کے اندر حسد اور گھمنڈ کی نفسیات جاگ اٹھیں اور وہ ان کے زیر اثر آکر صاحب معاملہ کے آگے جھکنے سے انکار کر دے۔

ممنوعہ درخت کا معاملہ بھی اسی ذیل کا ایک عملی سبق ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے بھٹکنے کا آغاز یہاں سے ہوتا ہے کہ وہ شیطان کے ورغلانے میں آجائے اور اس حد میں قدم رکھ دے جس میں جانے سے اللہ نے منع کیا ہے۔ "منع کیے ہوئے پھل" کو کھاتے ہی آدمی اللہ کی نصرت، بالفاظ دیگر جنت کے استحقاق سے محروم ہو جاتا ہے۔ تاہم یہ محرومی ایسی نہیں ہے جس کی تلافی نہ ہو سکتی ہو۔ یہ امکان آدمی کے لئے پھر بھی کھلا رہتا ہے کہ وہ دوبارہ اپنے رب کی طرف لوٹے اور اپنے رویہ کو درست کرتے ہوئے اللہ سے معافی کا طلب گار ہو۔ جب بندہ اس طرح پلٹتا ہے تو اللہ بھی اس کی طرف پلٹ آتا ہے اور اس کو اس طرح پاک کر دیتا ہے گویا اس نے گناہ ہی نہیں کیا تھا۔

کسی انسانی آبادی میں اللہ کی دعوت کا اٹھنا بھی اسی قسم کا ایک سخت امتحان ہے۔ داعیٔ حق بھی گویا ایک "آدم" ہوتا ہے جس کے سامنے لوگوں کو جھک جانا ہے۔ اگر وہ اپنے کبر اور اپنے تعصب کی وجہ سے اس کا اعتراف نہ کریں تو گویا کہ انھوں نے ابلیس کی پیروی کی۔ خدا اس دنیا میں عیاناً سامنے نہیں آتا، وہ اپنی نشانیوں کے ذریعہ لوگوں کو جانچتا ہے۔ جس نے خدا کی نشانی میں خدا کو پایا اسی نے خدا کو پایا اور جس نے خدا کی نشانی میں خدا کو نہیں پایا وہ خدا سے محروم رہا۔

اے بنی اسرائیل! یاد کرو میرے اس احسان کو جو میں نے تمھارے اوپر کیا۔ اور میرے عہد کو پورا کرو، میں تمھارے عہد کو پورا کروں گا۔ اور میرا ہی ڈر رکھو۔ اور ایمان لاؤ اس چیز پر جو میں نے اتاری ہے۔ تصدیق کرتی ہوئی اس چیز کی جو تمھارے پاس ہے۔ اور تم سب سے پہلے اس کا انکار کرنے والے نہ بنو۔ اور نہ لو میری آیتوں پر مول تھوڑا۔ اور مجھ سے ڈرو۔ اور صحیح میں غلط کو نہ ملاؤ اور سچ کو نہ چھپاؤ حالاں کہ تم جانتے ہو۔ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور جھکنے والوں کے ساتھ جھک جاؤ۔ تم لوگوں سے نیک کام کرنے کو کہتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔ حالاں کہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو، کیا تم سمجھتے نہیں۔ اور مدد چاہو صبر اور نماز سے اور بے شک وہ بھاری ہے مگر ان لوگوں پر نہیں جو ڈرنے والے ہیں۔ جو گمان رکھتے ہیں کہ ان کو اپنے رب سے ملنا ہے اور وہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں ۴۰۔۴۶

کسی گروہ پر اللہ کا سب سے بڑا انعام یہ ہے کہ وہ اس کے پاس اپنا پیغمبر بھیجے اور اس کے ذریعے اس گروہ کے اوپر ابدی فلاح کا راستہ کھولے۔ نبی آخرالزماں کی بعثت سے پہلے یہ نعمت بنی اسرائیل (یہود) کو دی گئی تھی مگر مدت گزرنے کے بعد ان کا دین ان کے لیے ایک قسم کی تقلیدی رسم بن گیا تھا نہ کہ شعوری فیصلہ کے تحت اختیار کی ہوئی ایک چیز۔ نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت نے حقیقت کھول دی۔ ان میں سے جن افراد کا شعور زندہ تھا وہ فوراً آپ کی صداقت کو پہچان گئے اور آپ کے ساتھی بن گئے۔ اور جن لوگوں کے لیے ان کا دین آبائی رواج بن چکا تھا ان کو آپ کی آواز ناموس آواز لگی۔ وہ بدک گئے اور آپ کے مخالف بن کر کھڑے ہو گئے۔

اگرچہ آپ کی نبوت کے بارے میں تورات میں اتنی واضح علامتیں تھیں کہ یہود کے لیے آپ کی صداقت کو سمجھنا مشکل نہ تھا، مگر دنیوی مفاد اور مصلحتوں کی خاطر انھوں نے آپ کو ماننے سے انکار کر دیا۔ صدیوں کے عمل سے ان کے یہاں جو مذہبی ڈھانچہ بن گیا تھا اس میں ان کو سرداری حاصل ہو گئی تھی۔ وہ بزرگوں کی گدیوں پر بیٹھ کر عوام کا مرجع بنے ہوئے تھے۔ مذہب کے نام پر طرح طرح کے نذرانے سال بھر ان کو ملتے رہتے تھے۔ ان کو نظر آیا کہ اگر انھوں نے نبی عربی کو سچا مان لیا تو ان کی مذہبی بڑائی ختم ہو جائے گی۔ مفادات کا سارا ڈھانچہ ٹوٹ جائے گا۔ یہود کو چوں کہ اس وقت عرب میں مذہب کی نمائندگی کا مقام حاصل تھا، لوگ ان سے نبی عربی کی بابت پوچھتے۔ وہ معصومانہ انداز میں کوئی ایسی شوشہ کی بات کہہ دیتے جس سے پیغمبر کی ذات اور آپ کا مشن لوگوں کی نظر میں مشتبہ ہو جائے۔ اپنے وعظوں میں وہ لوگوں سے کہتے کہ حق پرست بنو اور حق کا ساتھ دو۔ مگر عملاً جب خود ان کے لیے حق کا ساتھ دینے کا وقت آیا تو وہ حق کا ساتھ نہ دے سکے۔

خدا کی پکار پر لبیک کہنا جب اس قیمت پر ہو کہ آدمی کو اپنی زندگی کا ڈھانچہ بدلنا پڑے، عزت و شرف کی گدیوں سے اپنے کو اتارنا ہو تو یہ وقت ان لوگوں کے لیے بڑا سخت ہوتا ہے جو انھیں دنیوی جلوؤں میں اپنا مذہبی مقام بنائے ہوئے ہوں، مگر وہ لوگ جو خشوع کی سطح پر جی رہے ہوں ان کے لیے یہ چیزیں رکاوٹ نہیں بنتیں۔ وہ اللہ کی یاد میں، اللہ کے لیے خرچ کرنے میں، اللہ کے حکم کے آگے جھک جانے میں اور اللہ کے لیے صبر کرنے میں وہ چیز پا لیتے ہیں جو دوسرے لوگ دنیا کے تماشوں میں پاتے ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ ڈرنے کی چیز اللہ کا غضب ہے نہ کہ دنیوی اندیشے۔

اے بنی اسرائیل میرے اس احسان کو یاد کرو جو میں نے تمھارے اوپر کیا اور اس بات کو کہ میں نے تم کو دنیا والوں پر فضیلت دی۔ اور ڈرو اس دن سے کہ کوئی جان کسی دوسری جان کے کچھ کام نہ آئے گی۔ نہ اس کی طرف سے کوئی سفارش قبول ہوگی۔ اور نہ اس سے بدلے میں کچھ لیا جائے گا اور نہ ان کی کوئی مدد کی جائے گی۔ اور جب ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں سے چھڑایا۔ وہ تم کو بڑی تکلیف دیتے تھے۔ تمھارے بیٹوں کو ذبح کرتے اور تمھاری عورتوں کو جیتی رکھتے۔ اور اس میں تمھارے رب کی طرف سے بھاری آزمائش تھی۔ اور جب ہم نے دریا کو پھاڑ کر تمھیں پار کرایا پھر بچایا تم کو اور ڈبا دیا فرعون کے لوگوں کو اور تم دیکھتے رہے۔ اور جب ہم نے موسیٰ سے وعدہ کیا چالیس رات کا۔ پھر تم نے اس کے بعد بچھڑے کو معبود بنایا اور تم ظالم تھے۔ پھر ہم نے اس کے بعد تم کو معاف کر دیا تاکہ تم شکر گزار بنو۔ اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور فیصلہ کرنے والی چیز۔ تاکہ تم راہ پاؤ۔ اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم! تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔ اب اپنے پیدا کرنے والے کی طرف متوجہ ہو اور اپنے مجرموں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرو۔ یہ تمھارے لئے تمھارے پیدا کرنے والے کے نزدیک بہتر ہے۔ تو اللہ نے تمھاری توبہ قبول فرمائی۔ بے شک وہی توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔ اور جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ ہم تمھارا یقین نہیں کریں گے جب تک ہم اللہ کو سامنے نہ دیکھ لیں تو تم کو بجلی نے پکڑ لیا اور تم دیکھ رہے تھے۔ پھر ہم نے تمھاری موت کے بعد تم کو اٹھایا تاکہ تم شکر گزار بنو۔ اور ہم نے تمھارے اوپر بدلیوں کا سایہ کیا اور تم پر من وسلویٰ اتارا۔ کھاؤ ستھری چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو دی ہیں اور انھوں نے ہمارا کچھ نقصان نہیں کیا، وہ اپنا ہی نقصان کرتے رہے   ۴۷ ـ ۵۷

یہود کو اللہ تعالیٰ نے تمام دنیا پر فضیلت دی تھی۔ یعنی ان کو اپنے اس خاص کام کے لئے چنا تھا کہ ان کے پاس اپنی وحی بھیجے اور ان کے ذریعہ دوسری قوموں کو اپنی مرضی سے باخبر کرے۔ پھر اس منصب کی نسبت سے ان کو اور بہت سی نعمتیں اور سہولتیں دی گئیں ـــــ اپنے دشمنوں پر غلبہ، وقتی لغزشوں سے درگزر، غیر معمولی حالات میں غیر معمولی نصرت اور "خداوند کی طرف سے ان کے لئے روٹی کا انتظام" وغیرہ۔ اس سے یہود کی اگلی نسلیں اس غلط فہمی میں پڑ گئیں کہ ہم اللہ کی خاص امت ہیں۔ ہم ہر حال میں آخرت کی کامیابی حاصل کریں گے۔ مگر خدا کے اس قسم کے معاملات کسی کے لئے پشتینی نہیں ہوتے۔ کسی گروہ کے اگلے لوگوں کا فیصلہ ان کے پچھلے لوگوں کی بنیاد پر نہیں کیا جاتا بلکہ ہر فرد کا الگ الگ ہوتا ہے۔ خدا کے انصاف کا دن اتنا سخت ہوگا کہ وہاں اپنے عمل کے سوا کوئی بھی دوسری چیز کسی کے کام آنے والی نہیں۔

سچی دین داری یہ ہے کہ آدمی اللہ کے سوا کسی کو معبود نہ بنائے۔ اللہ کو دیکھے بغیر اللہ پر یقین کرے۔ آخرت کے حساب سے ڈر کر زندگی گزارے۔ پاک روزی سے اپنی ضروریات پوری کرے۔ جن لوگوں پر اس کو اختیار حاصل ہے ان کو جرم کرنے سے روک دے۔

اور جب ہم نے کہا کہ داخل ہو جاؤ اس شہر میں اور کھاؤ اس میں سے جہاں سے چاہو فراغت کے ساتھ اور داخل ہو دروازہ میں سر جھکائے ہوئے اور کہو کہ اے رب! ہماری خطاؤں کو بخش دے۔ ہم تمھاری خطاؤں کو بخش دیں گے اور نیکی کرنے والوں کو زیادہ بھی دیں گے۔ تو انھوں نے بدل دیا اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی دوسری بات سے۔ اس پر ہم نے ان لوگوں کے اوپر جنھوں نے ظلم کیا، ان کی نافرمانی کے سبب سے آسمان سے عذاب اُتارا۔ اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی مانگا تو ہم نے کہا اپنا عصا پتھر پر مارو تو اس سے پھوٹ نکلے بارہ چشمے۔ ہر گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ پہچان لیا۔ کھاؤ اور پیو اللہ کے رزق سے اور نہ پھرو زمین میں فساد مچانے والے بن کر۔ اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم ایک ہی قسم کے کھانے پر ہرگز صبر نہیں کر سکتے۔ اپنے رب کو ہمارے لئے پکارو کہ وہ نکالے ہم کو جو اگتا ہے زمین سے، ساگ اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز۔ موسیٰ نے کہا کیا تم ایک بہتر چیز کے بدلے ایک ادنیٰ چیز لینا چاہتے ہو۔ کسی شہر میں اترو تو تم کو ملے گی وہ چیز جو تم مانگتے ہو۔ اور ڈال دی گئی ان پر ذلت اور محتاجی اور وہ غضب الٰہی کے مستحق ہو گئے۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ وہ اللہ کی نشانیوں کا انکار کرتے تھے اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ یہ اس وجہ سے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد پر نہ رہتے تھے۔ یوں ہے کہ جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابی، ان میں سے جو کوئی یقین لایا اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور کام کیا نیک تو اس کے لئے اجر ہے اس کے رب کے پاس۔ اور ان کے لئے نہ کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ ۶۲-۵۸

یہود پر اللہ تعالیٰ نے خصوصی انعامات کئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ وہ خدا کے شکر گزار بندے بنتے۔ مگر انھوں نے بالکل برعکس ثبوت دیا۔ ایک بڑا شہر ان کے قبضہ میں دے دیا گیا اور کہا گیا کہ اس میں داخل ہو تو فاتحانہ تمکنت سے نہیں بلکہ عجز کے ساتھ اور اللہ سے معافی مانگتے ہوئے۔ مگر وہ اس کے بجائے تفریحی کلمات بولتے لگے۔ ان کو من وسلویٰ کی قدرتی غذائیں دی گئیں تاکہ وہ معاشی جد وجہد سے فارغ رہ کر احکام الٰہی کی بجا آوری میں زیادہ سے زیادہ مشغول ہوں مگر انھوں نے چٹپٹے اور مسالہ دار کھانوں کا مطالبہ شروع کر دیا۔ انھوں نے دنیا میں ضرورت پر قناعت نہ کر کے لذت کی تلاش کی۔ ان کی بے حسی اتنی بڑھی کہ اللہ کی کھلی کھلی نشانیاں بھی ان کے دلوں کو پگھلانے کے لئے کافی ثابت نہ ہوئیں۔ ان کی تنبیہ کے لئے جو اللہ کے بندے اُٹھے ان کو انھوں نے ٹھکرایا حتیٰ کہ قتل کر ڈالا۔ یہود میں یہ ڈھٹائی اس لئے پیدا ہوئی کہ انھوں نے سمجھ لیا کہ وہ نجات یافتہ گروہ ہیں۔ مگر خدا کے یہاں نسلی اور گروہی بنیاد پر کوئی فیصلہ ہونے والا نہیں۔ ایک یہودی کو بھی اسی خدائی قانون سے جانچا جائے گا جس سے ایک غیر یہودی کو جانچا جائے گا۔ جنت اسی کے لئے ہے جو جنت والے عمل کرے نہ کہ کسی نسل یا گروہ کے لئے۔ زمین پر شکر، صبر، تواضع اور قناعت کے ساتھ رہنا زمین کی اصلاح ہے۔ اس کے برعکس ناشکری، بے صبری، گھمنڈ اور حرص کے ساتھ رہنا زمین میں فساد برپا کرنا ہے، کیونکہ اس سے خدا کا قائم کیا ہوا فطری نظام ٹوٹتا ہے۔

اور جب ہم نے تم سے تمہارا عہد لیا اور طور پہاڑ کو تمہارے اوپر اٹھایا۔ پکڑو اس چیز کو جو ہم نے تم کو دی ہے مضبوطی کے ساتھ، اور جو کچھ اس میں ہے اس کو یاد رکھو تاکہ تم بچو۔ اس کے بعد تم اس سے پھر گئے۔ اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ضرور تم ہلاک ہو جاتے۔ اور ان لوگوں کا حال تم جانتے ہو جو سبت (سنیچر) کے معاملہ میں اللہ کے حکم سے نکل گئے تو ہم نے ان کو کہا کہ تم لوگ ذلیل بندر بن جاؤ۔ پھر ہم نے اس کو عبرت بنا دیا ان لوگوں کے لئے جو اس کے روبرو تھے اور ان لوگوں کے لئے جو اس کے بعد آئے۔ اور اس میں ہم نے نصیحت رکھ دی ڈر والوں کے لئے ۶۶ - ۶۳

بائبل کی روایات بتاتی ہیں کہ حضرت موسیٰ ؑ کے زمانہ میں جب یہود سے یہ عہد لیا گیا کہ وہ خدائی تعلیمات پر ٹھیک ٹھیک عمل کریں گے تو "خدا نے پہاڑ کو ان کے اوپر الٹ کر اوندھا کر دیا اور ان سے کہا کہ توریت کو یا تو قبول کرو ورنہ یہیں تم سب کو ہلاک کر دیا جائے گا (تالمود) یہی معاملہ ہر اس شخص کا ہے جو اللہ پر ایمان لاتا ہے۔ ایمان لانا گویا اللہ سے یہ عہد کرنا ہے کہ آدمی کا جینا اور مرنا خدا کی مرضی کے مطابق ہوگا۔ یہ ایک بے حد سنگین اقرار ہے۔ اس میں ایک طرف عاجز بندہ ہوتا ہے اور دوسری طرف وہ خدا ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں آسمان و زمین کی طاقتیں ہیں۔ اگر بندہ اپنے عہد پر پورا اترے تو اس کے لئے خدا کی لازوال نعمتیں ہیں۔ اور اگر وہ عہد کرکے اس سے پھر جائے تو اس کے لئے یہ شدید خطرہ ہے کہ اس کا خدا اس کو جہنم میں ڈال دے جہاں وہ اس طرح جلتا رہے کہ اس سے نکلنے کا کوئی راستہ اس کے لئے باقی نہ ہو۔

ایمانی عہد کے وقت حضرت موسیٰ ؑ کی قوم پر جو کیفیت گزری تھی وہی ہر بندۂ مومن سے مطلوب ہے۔ ہر شخص جو اپنے آپ کو اللہ کے ساتھ ایمان کی رسی میں باندھتا ہے، اس کو اس کی سنگینی سے اس طرح کانپنا چاہئے گویا کہ اس نے اگر اس عہد کے خلاف کیا تو "زمین و آسمان اس کے اوپر گر پڑیں گے"

ایک گروہ جس کو اللہ کی طرف سے شریعت دی جائے اس کی گمراہی کی ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ عملاً اس کے خلاف چلے اور تاویلوں کے ذریعہ یہ ظاہر کرے کہ وہ عین خدا کے حکم پر قائم ہے۔ یہود کو یہ حکم تھا کہ وہ سنیچر کے دن کو روزہ اور عبادت کے لئے مخصوص رکھیں۔ اس دن کسی قسم کا کوئی دنیوی کام نہ کریں۔ مگر انھوں نے اس حرمت کو باقی نہ رکھا۔ وہ دوسرے دنوں کی طرح سنیچر کے دن بھی اپنے دنیوی کاروبار کرنے لگے۔ البتہ وہ طرح طرح کی لفظی تاویلوں سے ظاہر کرتے کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ عین خدا کے حکم کے مطابق ہے۔ ان کی یہ ڈھٹائی اللہ کو اتنی ناپسند ہوئی کہ وہ بندر بنا دئے گئے ـــــ جب بھی آدمی شریعت سے انحراف کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو جانوروں کی سطح پر لے جاتا ہے جو کسی اخلاقی ضابطہ کے پابند نہیں ہیں۔ اس لئے جو لوگ شریعت کے ساتھ اس قسم کا کھیل کریں ان کو ڈرنا چاہئے کہ خدا کا قانون ان کو اسی حیوانی ذلت میں نہ مبتلا کر دے جس میں یہود اپنے اسی قسم کے فعل کی وجہ سے مبتلا ہوئے۔

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ تم ایک گائے ذبح کرو۔ انھوں نے کہا: کیا تم ہم سے ہنسی کر رہے ہو۔ موسیٰ نے کہا کہ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں ایسا نادان بنوں، انھوں نے کہا، اپنے رب سے درخواست کرو کہ وہ ہم سے بیان کرے کہ وہ گائے کیسی ہو۔ موسیٰ نے کہا، اللہ فرماتا ہے کہ وہ گائے نہ بوڑھی ہو نہ بچہ۔ ان کے بیچ کی ہو۔ اب کر ڈالو جو حکم تم کو ملا ہے۔ انھوں نے کہا، اپنے رب سے درخواست کرو، وہ بیان کرے کہ اس کا رنگ کیا ہو۔ موسیٰ نے کہا، اللہ فرماتا ہے کہ وہ گہرے زرد رنگ کی ہو، دیکھنے والوں کو اچھی معلوم ہوتی ہو۔ انھوں نے کہا اپنے رب سے درخواست کرو کہ وہ ہم سے بیان کردے کہ وہ کیسی ہو۔ کیوں کہ گائے میں ہم کو شبہ پڑ گیا ہے۔ اور اللہ نے چاہا تو ہم راہ پالیں گے۔ موسیٰ نے کہا اللہ فرماتا ہے کہ وہ ایسی گائے ہو کہ محنت کرنے والی نہ ہو، زمین کو جوتنے والی اور کھیتوں کو پانی دینے والی نہ ہو۔ وہ سالم ہو، اس میں کوئی داغ نہ ہو۔ انھوں نے کہا: اب تم واضح بات لائے۔ پھر انھوں نے اس کو ذبح کیا۔ اور وہ ذبح کرتے نظر نہ آتے تھے۔ اور جب تم نے ایک شخص کو مار ڈالا، پھر ایک دوسرے پر اس کا الزام ڈالنے لگے۔ حالاں کہ اللہ کو ظاہر کرنا منظور تھا جو کچھ تم چھپانا چاہتے تھے۔ پس ہم نے حکم دیا کہ مارو اس مردے کو اس گائے کا ایک ٹکڑا۔ اس طرح زندہ کرتا ہے اللہ مردوں کو۔ اور وہ تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھو۔ پھر اس کے بعد تمھارے دل سخت ہو گئے۔ پس وہ پتھر کی مانند ہو گئے یا اس سے بھی زیادہ سخت۔ پتھروں میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے نہریں پھوٹ نکلتی ہیں، بعض پتھر پھٹ جاتے ہیں اور ان سے پانی نکل آتا ہے اور بعض پتھر ایسے بھی ہوتے ہیں جو اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں۔ اور اللہ اس سے بے خبر نہیں جو تم کرتے ہو ۷۴ — ۶۷

حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں بنی اسرائیل میں قتل کا ایک واقعہ ہوا۔ قاتل کا پتہ لگانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے نبی کے واسطہ سے ان کو یہ حکم دیا کہ ایک گائے ذبح کرو اور اس کا گوشت مقتول پر مارو، مقتول اللہ کے حکم سے قاتل کا نام بتا دے گا۔ یہ ایک معجزاتی تدبیر تھی جو چند مقاصد کے لئے اختیار کی گئی (۱) مصریوں کے اثر سے بنی اسرائیل میں گائے کے مقدس ہونے کا ذہن پیدا ہو گیا تھا۔ اللہ نے چاہا کہ اس واقعہ کے ذیل میں ان کے ہاتھ سے گائے کو ذبح کرا کے اس تقدس کو توڑا جائے (۲) یہ سبق دینا مقصود تھا کہ اللہ کی طرف سے جب کوئی حکم آئے تو اس کو سادہ معنوں میں لے کر فوراً اس کی تعمیل کر دو۔ اگر حکم کی تفصیلات اور حدود متعین کرنے کے لئے موشگافیاں کیں تو ایک سادہ حکم بھی شرائط کا اضافہ ہوتے ہوتے ایک سخت حکم بن جائے گا۔ (۳) اس واقعہ کے ذریعہ بنی اسرائیل کو بتایا گیا کہ اللہ کس طرح مرنے کے بعد آدمی کو زندہ کر کے دوبارہ اٹھائے گا۔

فطرت کا ہر واقعہ اللہ کی ایک نشانی ہے۔ اگر آدمی اللہ کی نشانیوں سے سبق لے تو اس کا دل نرم ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ نشانیوں سے عبرت نہ پکڑے تو اس کا دل سخت ہوتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو جاتا ہے۔ وہ اس قابل نہیں رہتا کہ ہدایت کی کوئی بات قبول کر سکے۔

کیا تم یہ امید رکھتے ہو کہ یہود تمہارے کہنے سے ایمان لے آئیں گے۔ حالاں کہ ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں کہ وہ اللہ کا کلام سنتے تھے اور پھر اس کو بدل ڈالتے تھے سمجھنے کے بعد، اور وہ جانتے ہیں۔ جب وہ مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہوئے ہیں۔ اور جب آپس میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں: کیا تم ان کو وہ باتیں بتاتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں کہ وہ تمہارے رب کے پاس تم سے حجت کریں۔ کیا تم سمجھتے نہیں۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ کو معلوم ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔ اور ان میں ان پڑھ ہیں جو نہیں جانتے کتاب کو مگر آرزوئیں۔ ان کے پاس گمان کے سوا اور کچھ نہیں۔ پس خرابی ہے ان لوگوں کے لئے جو اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے۔ تاکہ اس کے ذریعہ تھوڑی سی پونجی حاصل کرلیں۔ پس خرابی ہے اس چیز کی بدولت جو ان کے ہاتھوں نے لکھی۔ اور ان کے لئے خرابی ہے اپنی اس کمائی سے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ ہم کو دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی مگر صرف گنتی کے چند دن۔ کہو کیا تم نے اللہ کے پاس سے اس کے لئے کوئی عہد لے لیا ہے کہ اللہ اپنے عہد کے خلاف نہیں کرے گا۔ یا اللہ کے اوپر ایسی بات کہتے ہو جو تم نہیں جانتے۔ ہاں جس نے کوئی برائی کی اور اس کے گناہ نے اس کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ تو وہی لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کئے، وہ جنت والے لوگ ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ۸۲ - ۷۵

کوئی بات خواہ کتنی ہی سچی ہو، اس کا انکار کرنے کے لئے آدمی کچھ نہ کچھ الفاظ پالیتا ہے۔ یہی تاویل و توجیہ ہے اور یہی وہ سب سے بڑا اعتماد ہے جس کے اوپر آدمی حق کا انکار کرتا ہے۔ اسی تاویل و توجیہ کی آخری صورت کا نام تحریف ہے۔ یہ ذہنیت بالآخر اللہ کے معاملہ کی سنگینی کو دل سے نکال دیتی ہے۔ آدمی خدا کے حکم کو سنتا ہے اور لفظی تاویلات کے ذریعہ یہ ظاہر کرتا رہتا ہے کہ اس کا اپنا معاملہ اس کی زد میں نہیں آتا۔ وہ خدا کا نام لیتا ہے مگر اس کی قساوت اس کو ایسے ایسے کاموں کے لئے ڈھیٹ بنا دیتی ہے کہ یہ یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ فی الواقع یہ مانتا ہے کہ خدا سنتا اور دیکھتا ہے۔ جب کوئی گروہ اس نوبت کو پہنچتا ہے تو اس کے عوام خوش گمانیوں میں جینے لگتے ہیں اور خواص کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ دین کو تجارت بنا لیتے ہیں، ٹھیک ویسے ہی جیسے کوئی شخص دنیوی مال کو تجارت بناتا ہے، وہ عزت، شہرت، دولت کے لئے متحرک ہوتے ہیں۔ مگر ان کا خدا کی پکڑ سے بے خوف دل اس کو اس طرح بیان کرتا ہے گویا کہ یہی دین فطرت کا عین تقاضا ہے۔ اتنی بڑی ڈھٹائی پر انسان کو کیا چیز آمادہ کرتی ہے، وہ یہ عقیدہ کہ جہنم کا عذاب ہمارے لئے نہیں ہے، وہ صرف دوسروں کے لئے ہے۔ اس خود ساختہ عقیدہ کے نتیجہ میں وہ بھول جاتے ہیں کہ خدا اس سے بلند ہے کہ کسی سے جانب دارانہ وعدہ کرلے۔ جو چیز خدا کے شایان شان ہے وہ صرف یہ کہ وہ ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرے جو اس کی صفت عدل کا تقاضا ہو۔

اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو گے اور نیک سلوک کرو گے ماں باپ کے ساتھ، قرابت داروں کے ساتھ، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ۔ اور یہ کہ لوگوں سے اچھی بات کہو۔ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ پھر تم اس سے پھر گئے سوا تھوڑے لوگوں کے۔ اور تم اقرار کرکے اس سے ہٹ جانے والے لوگ ہو۔ ۸۳

انسان کے اوپر اللہ کا پہلا حق یہ ہے کہ وہ اللہ کا عبادت گزار بنے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے۔ دوسرا حق بندوں کے ساتھ حسن سلوک ہے۔ اس حسن سلوک کا آغاز اپنے ماں باپ سے ہوتا ہے اور پھر رشتہ داروں اور پڑوسیوں سے گزر کر ان تمام انسانوں تک پہنچ جاتا ہے جن سے عملی زندگی میں سابقہ پیش آئے۔ ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان جب بھی کوئی معاملہ پڑے تو وہاں ایک ہی برتاؤ اپنے بھائی کے ساتھ درست ہے۔ اور وہ وہی ہے جو انصاف اور خیر خواہی کے مطابق ہو۔

اس معاملہ میں آدمی کا اصل امتحان "یتیموں اور مسکینوں" بالفاظ دیگر، کمزور افراد کے ساتھ ہوتا ہے۔ کیوں کہ جو طاقت در ہے اس کا طاقت ور ہونا خود اس بات کی ضمانت ہے کہ لوگ اس کے ساتھ حسن سلوک کریں۔ مگر کمزور آدمی کے ساتھ حسن سلوک کے لئے اس قسم کا کوئی اضافی محرک نہیں۔ اس لئے سب سے زیادہ حسن سلوک جہاں مطلوب ہے وہ کمزور لوگ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں ہر چیز کی نفی ہو جاتی ہے وہاں خدا ہوتا ہے۔ ایسے آدمی کے ساتھ وہی شخص حسن سلوک کرے گا جو فی الواقع اللہ کی خوشنودی کے لئے ایسا کر رہا ہو۔ کیوں کہ وہاں کوئی دوسرا محرک موجود ہی نہیں۔

جب معاملہ کمزور آدمی سے ہو تو مختلف وجوہ سے حسن سلوک کا شعور دب جاتا ہے۔ کمزور آدمی کو مدد دی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پانے والے کے مقابلہ میں دینے والا اپنے کو کچھ اونچا سمجھنے لگتا ہے۔ یہ نفسیات کمزور آدمی کی عزت نفس کو ملحوظ رکھنے میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ کمزور کی بات سے متوقع نیاز مندی کا اظہار نہ ہو تو فوراً اس کو نااہل سمجھ لیا جاتا ہے اور اس کا اظہار مختلف تکلیف دہ صورتوں میں ہوتا رہتا ہے۔ ایک دو بار مدد کرنے کے بعد یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ شخص مستقل طور پر میرے سر نہ ہو جائے، اس لئے اس سے چھٹی لینے کی خاطر اس کے ساتھ غیر شریفانہ انداز اختیار کیا جاتا ہے۔ وغیرہ

بھلی بات بولنا تمام اعمال کا خلاصہ ہے، ایک حقیقی خیر خواہی کا کلمہ کہنا آدمی کے لئے ہمیشہ سب سے زیادہ دشوار ہوتا ہے۔ آدمی اچھی اچھی تقریریں کرتا ہے۔ مگر جب ایک اچھی بات کسی دوسرے کے اعتراف کے ہم معنی ہو تو آدمی ایسی اچھی بات منھ سے نکالنے کے لئے سب سے زیادہ بخیل ہوتا ہے۔ سامنے کا آدمی اگر بے زور ہے تو اس کے لئے شرافت کے الفاظ بولنا بھی وہ ضروری نہیں سمجھتا۔ اگر کسی سے شکایت یا برہمی پیدا ہو جائے تو آدمی سمجھ لیتا ہے کہ وہ انصاف کے خدائی حکم سے اس کو مستثنیٰ کرنے میں حق بجانب ہے۔

مسلمان آپس میں کیسے رہیں

حدثنا عبد اللہ بن مسلمۃ عن مالک عن ابن شہاب عن انس بن مالک ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: لا تباغضوا ولا تحاسدوا ولا تدابروا، وکونوا عباد اللہ اخوانا، ولا یحل لمسلم ان یہجر اخاہ فوق ثلاث لیال (رواہ ابوداؤد) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آپس میں ایک دوسرے سے بغض نہ کرو۔ ایک دوسرے سے حسد نہ کرو۔ ایک دوسرے سے پیٹھ نہ پھیرو۔ سب اللہ کے بندے بھائی بھائی بن جاؤ۔ کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ اپنے بھائی کو تین رات سے زیادہ چھوڑے۔

اللہ کے وہ بندے جو اللہ کو حقیقی معنوں میں اپنا معبود بنالیں، ان کا دل ہر قسم کے منفی جذبات سے خالی ہو جاتا ہے۔ جن لوگوں کا دل خدا کی بلندیوں میں اٹکا ہوا ہو، وہ دنیا کی پستیوں میں لت پت ہو کر نہیں رہ سکتے۔ ایسے لوگ اپنے بھائیوں کے درمیان اس طرح رہتے لگتے ہیں جیسے ہوا لوگوں کے درمیان سے گزرتی ہے مگر وہ کسی سے نہیں ٹکراتی۔ جیسے پھول کی مہک ہر ایک کو پہنچتی ہے مگر وہ ایک اور دوسرے میں کوئی امتیاز نہیں کرتی۔ جیسے روشنی ہر ایک کے پاس آتی ہے مگر وہ کسی سے خوش اور کسی سے خفا نہیں ہوتی۔ ایسے لوگ اسی طرح ایک دوسرے کے مکمل ساتھی ہوتے ہیں جیسے باغ کے درخت ایک دوسرے کے ساتھ بغیر کسی قسم کی باہمی رنجش کے ایک مقام پر کھڑے ہوئے ہوں۔

اسلام کے رزق سے آدمی کو حصہ ملا ہے یا نہیں، اس کی ایک واضح پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کے درمیان اس طرح رہنے لگے کہ اس کو نہ کسی سے بغض ہو اور نہ حسد۔ کسی قابل شکایت بات پیش آنے پر وہ اپنے بھائی سے بگڑ نہ جاتا ہو۔ وہ سارے لوگوں کو اللہ کی عیال سمجھ کر اس طرح رہ رہا ہو جیسے ایک باپ کی اولاد مل جل کر رہتی ہے۔ اس قسم کا ذہن جس شخص کے اندر پیدا ہو جائے وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے ایسا ہو جائے گا کہ کسی بھائی سے اگر اس کا بگاڑ ہو جائے اور وقتی تاثر سے مغلوب ہو کر وہ اس سے جدائی اختیار کرے تو تین دن گزرتے گزرتے اس کا سینہ پھٹنے لگے گا۔ وقتی جذبہ نے اس کو جس بھائی سے دور کیا تھا اس سے وہ اپنے رب کی خاطر دوبارہ اس طرح مل جائے گا جیسے کہ اس کے ساتھ کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

سب سے آگے، سب سے پیچھے

دنیا بھر میں مسلمانوں کے ۴۴ آزاد ممالک ہیں جن کی آبادی تقریباً ۷۰ کروڑ ہے۔ جغرافی طور پر کل دنیا کا ۲۱ فی صد وہ حصہ ہے جہاں مسلمانوں کو اقتدار حاصل ہے۔ مسلمان دنیا کی کل آبادی کا تقریباً ۲۳ فی صد ہیں۔ دنیا کے قدرتی ذرائع کا تقریباً نصف حصہ ان کے قبضہ میں ہے۔ مگر تعلیم، باہمی اتحاد، صنعتی ترقی میں وہ دنیا بھر میں سب سے پیچھے ہیں۔

اللہ کی عبادت کرنا اور بندوں کو اپنی ایذا سے بچانا

عن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قال سألت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقلت یا رسول اللہ ای الاعمال افضل قال الصلاۃ علی میقاتہا قلت ثم ماذا یا رسول اللہ۔ قال ان یسلم الناس من لسانک (ترغیب وترہیب بحوالہ طبرانی)

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اے خدا کے رسول کون سا کام افضل ہے۔ آپ نے فرمایا وقت پر نماز ادا کرنا۔ میں نے پوچھا اے خدا کے رسول اس کے بعد کون سا کام افضل ہے۔ آپ نے فرمایا: یہ کہ لوگ تمھاری زبان سے محفوظ رہیں۔

اللہ کو پہچاننا سب سے بڑی عبادت ہے

انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ رسول اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا اور کہا: اے خدا کے رسول! کون سا عمل افضل ہے (ای الاعمال افضل) آپ نے فرمایا: اللہ عزوجل کی معرفت (العلم باللہ عز وجل) آدمی نے دوبارہ پوچھا اے خدا کے رسول! کون سا عمل افضل ہے۔ آپ نے فرمایا۔ اللہ عزوجل کی معرفت۔ آدمی نے کہا: اے خدا کے رسول! میں آپ سے عمل کی بابت پوچھتا ہوں اور آپ علم کی بابت جواب دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

ان قلیل العمل ینفع مع العلم وان کثیر العمل لا ینفع مع الجہل جامع بیان العلم وفضلہ جزء اول صفحہ ۴۹

علم کے ساتھ تھوڑا عمل زیادہ نفع دیتا ہے۔ جہل کے ساتھ زیادہ عمل بھی نفع نہیں دیتا۔

دین میں اصل اہمیت کی چیز کردار ہے

طبرانی نے عبد الرحمٰن بن حارث بن ابی مرداس سلمی رضؓ سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے۔ آپ نے وضو کا پانی منگایا، اس میں ہاتھ ڈالے اور وضو کیا۔ ہم نے اس پانی کو لیا اور اس کو پی گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس فعل پر تمھیں کس چیز نے آمادہ کیا۔ ہم نے کہا: اللہ اور رسول کی محبت۔ آپ نے فرمایا: اگر تم چاہتے ہو کہ تم اللہ اور رسول کے محبوب بنو تو تم یہ کرو کہ جب تم کو امانت سونپی جائے تو اس کو ادا کرو۔ جب بات کرو تو سچ بولو اور جو لوگ تمھارے پڑوس میں ہیں ان کے لیے اچھے پڑوسی ثابت ہو (فان احببتم ان یحبکم اللہ ورسولہ فادوا اذا ائتمنتم واصدقوا اذا حدثتم واحسنوا جوار من جاورکم)

شعوری عبادت مطلوب ہے نہ کہ بے روح عملیات

عن ابن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الرجل لیکون من اہل الصلاۃ والصوم والزکاۃ والحج والعمرۃ حتی ذکر سہام الخیر کلہا وما یجزیٰ یوم القیامۃ الا بقدر عقلہ (احمد)

ابن عمر کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آدمی نماز، روزہ، زکاۃ، حج، عمرہ کے عمل کرتا ہے۔ حتیٰ کہ آپ نے تمام اعمال خیر کا ذکر کیا پھر فرمایا: مگر قیامت کے دن وہ صرف اپنی عقل کے بقدر بدلہ پائے گا۔

سب سے افضل عمل یہ ہے کہ اللہ کی یاد دل میں سمائی ہوئی ہو

ابو نعیم (حلیۃ الاولیاء جلد ۱) نے سالم بن ابی جعد سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کہ

ابوسعد بن منبہ نے ایک سو غلام آزاد کئے ہیں۔ انھوں نے کہا: بے شک یہ ایک بڑی بات ہے کہ آدمی اپنے مال سے سو غلاموں کو آزاد کرے۔ اور اگر تو چاہے تو میں تجھ کو ایسی چیز بتاؤں جو اس سے بھی زیادہ افضل ہے۔ پھر انھوں نے کہا: وہ ایمان جو رات دن لپٹا ہوا ہو اور تمھاری زبان کا ہمیشہ اللہ کی یاد سے تر رہنا (ایمان ملزوم باللیل والنہار ولا یزال لسانک رطبا من ذکر اللہ عز وجل، ترغیب وترہیب جلد ۴ صفحہ ۵۵)

ذکر ہر وقت کی نماز ہے

عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ قال لایزال الفقیہ یصلی۔ قالوا وکیف یصلی۔ قال: ذکر اللہ تعالی علی قلبہ ولسانہ جامع بیان العلم وفضلہ، جزء اول، ۴۳

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ عالم آدمی ہر وقت نماز میں رہتا ہے۔ لوگوں نے پوچھا وہ کیسے ہر وقت نماز میں رہتا ہے۔ انھوں نے جواب دیا: اللہ کی یاد اس کے دل پر اور اس کی زبان پر

نماز ادا کرنے والا اللہ کی ذمہ داری میں آجاتا ہے

سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا کہ مجھ کو نصیحت کیجئے۔ آپ نے فرمایا: اے سلمان! اللہ سے ڈرو۔ جان لو کہ جلد ہی فتوحات ہوں گی۔ اس میں سے تمھارا حصہ وہی ہے جو تم اپنے پیٹ میں رکھ لو یا اپنے جسم پر ڈال لو۔ اور جان لو کہ جس نے پانچوں نمازیں ادا کیں وہ اللہ کی ذمہ داری میں صبح کرتا ہے اور اللہ کی ذمہ داری میں شام کرتا ہے۔ اور تم کسی اللہ کے بندے کو قتل نہ کرنا ورنہ اللہ اپنی ذمہ داری کو توڑ دے گا اور اللہ تم کو منھ کے بل اوندھا کرکے جہنم میں ڈال دے گا۔ (طبقات ابن سعد جلد ۳ صفحہ ۱۳۷)

مسلمان کی حاجت پوری کرنا بہت بڑی عبادت ہے

طبرانی اور بیہقی نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ وہ مدینہ کی مسجد نبوی میں معتکف تھے۔ ان کے پاس ایک آدمی آیا اور سلام کرکے بیٹھ گیا۔ عبداللہ بن عباس رض نے کہا: اے فلاں! تم مجھ کو افسردہ اور غمگین دکھائی دیتے ہو۔ اس نے کہا، ہاں اے رسول اللہ کے چچازاد بھائی، میرے اوپر فلاں شخص کا حق ہے اور اس صاحب قبر کی عزت کی قسم، میں اس کی ادائگی پر قادر نہیں۔ عبداللہ بن عباس رض نے کہا: کیا میں تمھارے بارے میں اس سے بات کروں۔ آدمی نے کہا ہاں اگر آپ پسند کریں۔ اس کے بعد عبداللہ بن عباس رض نے اپنے جوتے پہنے اور مسجد سے نکل کر روانہ ہوئے۔ آدمی نے کہا: شاید آپ بھول گئے کہ آپ حالت اعتکاف میں ہیں۔ عبداللہ بن عباس رض نے کہا نہیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے (اور یہ کہتے ہوئے عبداللہ بن عباس رض کی آنکھوں میں آنسو آگئے) کہ:

من مشی فی حاجۃ اخیہ وبلغ فیہا کان خیرا لہ من اعتکاف عشر سنین (الترغیب والترہیب جلد ۲)

جو شخص اپنے بھائی کی حاجت کے لئے چلا اور اس میں کوشش کی تو یہ اس کے لئے دس سال کے اعتکاف سے بہتر ہے۔

مفلس وہ ہے جو آخرت میں مفلس ٹھہرے

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک روز ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے کہا: کیا تم

جانتے ہو کہ مفلس کون ہے۔ لوگوں نے کہا: ہم میں مفلس وہ ہے جس کے پاس نہ درہم ہو نہ کوئی پونجی۔ آپ نے فرمایا: میری امت میں مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن نماز، روزہ، زکوٰۃ کے ساتھ آئے۔ مگر وہ اس حال میں آئے کہ اس نے کسی کو گالی دی ہے، کسی پر تہمت لگائی ہے، کسی کا مال کھایا ہے، کسی کا خون بہایا ہے، کسی کو مارا ہے۔ تو اس کی کچھ نیکیاں اِس کو، کچھ نیکیاں اُس کو دے دی جائیں گی۔ اور جب اس کی تمام نیکیاں ختم ہو جائیں گی اور ادائگی باقی رہے گی تو دوسروں کی برائیاں لے کر اس پر ڈال دی جائیں گی اور پھر اِس کو آگ میں جھونک دیا جائے گا (مسلم)

مشکل وقتوں میں نماز کی طرف دوڑنا

حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ غزوۂ خندق میں ہماری تعداد تقریباً تین سو تھی۔ یہ ایک نہایت سخت رات تھی۔ اوپر کی جانب ابوسفیان اور ان کی فوج تھی۔ نیچے کی جانب بنو قریظہ تھے جن کی طرف سے ہم اپنے بال بچوں کو بالکل غیر محفوظ سمجھتے تھے۔ بے حد شدید سردی تھی۔ اس کے بعد تیز ہوا چلنے لگی جس میں کڑک چمک تھی۔ پتھر اڑ اڑ کر گر رہے تھے۔ اندھیرے کا یہ عالم تھا کہ کوئی چیز سجھائی نہ دیتی تھی۔ ایسے حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو حکم دیا کہ خندق کے پار مشرکین کے پڑاؤ کی طرف جاؤ اور ان کی خبر لاؤ (کہ وہ واپس جانے کی باتیں کر رہے ہیں یا ابھی جمے ہوئے ہیں) میں لوگوں میں سب سے زیادہ ڈرنے والا تھا اور سردی بھی مجھ کو بہت لگتی تھی (انا من اشد الناس فزعا و اشدهم قرا) مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم پا کر اٹھا۔ آپ نے میرے لئے حفاظت کی دعا فرمائی۔ میں اپنے مشن پر روانہ ہوا۔ اور ابوسفیان کی فوج میں گھوم پھر کر خبر لایا۔ وہ لوگ الرحیل الرحیل (واپس چلو واپس چلو) کہہ رہے تھے۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا تو آپ چادر اوڑھے ہوئے نماز میں مشغول تھے:

وكان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا حزبه امر صلى (البداية والنهاية جلد ۴)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ کوئی سخت معاملہ پیش آتا تو آپ نماز پڑھتے۔

قرآن سے اپنے دلوں کو حرکت دو

شعبہ کہتے ہیں کہ مجھ سے ابوحمزہ نے بیان کیا۔ انھوں نے عبداللہ بن عباس رضؓ سے کہا کہ میں تیز پڑھنے والا آدمی ہوں۔ بعض اوقات ایک ہی رات میں ایک بار یا دو بار پورا قرآن پڑھ لیتا ہوں۔ حضرت ابن عباس رضؓ نے جواب دیا: ایک سورہ پڑھنا مجھے اس سے زیادہ پسند ہے جو تم کرتے ہو۔ اگر تم کو پڑھنا ہے تو اس طرح پڑھو کہ تمھارے کان اس کو سنیں اور تمھارا دل اس کو لے سکے۔ پھر انھوں نے کہا: قرآن اس طرح پڑھو کہ اس کے عجائب پر ٹھیرو اور اس سے دلوں کو حرکت دو۔ تمھاری کوشش یہ نہ ہو کہ بس کسی طرح آخر سورہ تک پہنچ جاؤ (فاقرأ قرأة تسمع اذنيك ويعيه قلبك، وقفوا عند عجائبه وحركوا به القلوب ولا يكن هم احدكم اخر السورة)

نماز آدمی کو اللہ کی حفاظت میں رکھتی ہے

معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے ایک طویل روایت منقول ہے۔ اس کا ایک جزء یہ ہے: لَا تَتْرُكَنَّ صلاةً مكتوبةً فَإِنَّ مَنْ ترك صلاةً مكتوبةً متعمدًا فقد برئت منه ذمة الله (ترغیب وترہیب بحوالہ طبرانی) تم ہرگز

کوئی فرض نماز نہ چھوڑنا۔ کیوں کہ جو شخص فرض نماز جان بوجھ کر چھوڑ دے تو وہ اللہ کی حفاظت سے نکل جاتا ہے۔

نماز جمعہ کا مقصد اللہ کی قربت حاصل کرنا ہے

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت سے پہلے مصعب بن عمیر رض کو اجتماعی عبادت قائم کرنے کی بابت تحریری ہدایت روانہ فرمائی تھی۔ دارقطنی کی روایت کے مطابق اس کا ایک فقرہ یہ تھا: فاذا مال النھار عن شطرہ عند الزوال من یوم الجمعۃ فتقربوا الی اللہ تعالیٰ برکعتین (جمعہ کے دن جب سورج نصف النہار سے ڈھل جائے تو دو رکعت نماز کے ذریعہ اللہ کی نزدیکی حاصل کرو)

دنیا طلبی خدا سے دور کرتی ہے

دنیا طلب علمار کی بابت ایک حدیث قدسی میں آیا ہے: ان ادنی ما انا صانع بھم ان انزع حلاوۃ المناجاۃ من قلوبھم (جامع بیان العلم وفضلہ، جزء اول، صفحہ ۱۹۲) سب سے ادنیٰ بات جو میں ان کے ساتھ کرنے والا ہوں وہ یہ کہ دعا کی مٹھاس کو ان کے دلوں سے چھین لوں۔

ان کی عبادت تھی سوچنا اور عبرت پکڑنا

ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کے سامنے سے دو بیل گزرے۔ دونوں پر بوجھ لدا ہوا تھا۔ ایک کھڑا رہا، دوسرا بیٹھ گیا۔ اس کو دیکھ کر ابو درداء رض نے کہا: اس میں بھی عبرت ہے (ان فی ھذا المعتبرا، صفۃ الصفوۃ، جلد ا صفحہ ۲۵۸) عون بن عبداللہ بن عتبہ کہتے ہیں کہ میں نے ام الدرداء سے پوچھا کہ ابوالدرداء کا سب سے افضل عمل کیا ہوتا تھا۔ انھوں نے جواب دیا تفکر اور عبرت (التفکر والاعتبار، ابونعیم فی الحلیۃ) محمد بن داسع کہتے ہیں کہ ابوذر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد بصرہ سے ایک شخص آیا اور ام ذر سے ملا۔ اس نے پوچھا کہ حضرت ابوذر کی عبادت کا حال بتائیے۔ ان کی اہلیہ نے جواب دیا وہ اکثر سارے دن تنہا بیٹھے ہوئے غور وفکر کرتے رہتے تھے (کان اجمع النھار خالیا یتفکر، ابونعیم)

خشوع ظاہری آداب کا نام نہیں

حضرت عائشہ رض نے ایک بزرگ کو دیکھا۔ وہ بہت مضمحل حالت میں چل رہے تھے۔ آپ نے پوچھا ان کا کیا حال ہے۔ جواب دیا گیا یہ قراء میں سے ہیں (یعنی قرآن پڑھنے پڑھانے والے اور تعلیم و عبادت میں مشغول رہنے والے ہیں) یہ سن کر حضرت عائشہ رض نے کہا: "عمر سید القراء تھے۔ مگر ان کا یہ حال تھا کہ جب چلتے تو زور سے چلتے۔ جب بولتے تو قوت کے ساتھ بولتے اور جب پیٹتے تو خوب پیٹتے۔"

جائز چیزوں سے روزہ رکھ کر ناجائز چیزوں سے افطار کرنا

انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ دو عورتوں نے روزہ رکھا اور دونوں ساتھ بیٹھ کر دوسروں کی غیبت و شکایت کرتی رہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی بابت معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا:

انھما لم یصوما وکیف صام من ظل ھذا الیوم یاکل لحوم الناس (ابوداؤد، بیہقی)

ان دونوں نے روزہ نہیں رکھا۔ اس کا روزہ کیسے ہو گیا جو روزہ رکھ کر لوگوں کے گوشت کھاتا رہا۔

ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں:

ان ھاتین صامتا عما احل اللہ لھما وافطرتا علیٰ ما حرم اللہ علیھما۔ جلست احداھما الی الاخری فجعلتا تاکلان من لحوم الناس (ترغیب وترہیب جلد ۳)

ان دونوں عورتوں نے اس چیز سے روزہ رکھا جو اللہ نے ان کے لئے حلال کیا تھا اور پھر دونوں نے اس چیز سے افطار کرلیا جو اللہ نے دونوں کے لئے حرام کیا تھا۔ ایک ان میں سے دوسری کے پاس بیٹھ گئی اور دونوں لوگوں کے گوشت کھاتی رہیں۔

نماز کے بعد کچھ دیر نماز کی کیفیت طاری رہنا چاہئے

ابورمثہ رضؓ کہتے ہیں میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی۔ آپ نے نماز پوری کرکے سلام پھیرا۔ ایک شخص جو شروع سے نماز میں شریک تھا۔ فوراً سنت پڑھنے کے لئے کھڑا ہوگیا۔ عمر فاروق رضؓ کود کر اس شخص کے پاس پہنچے اس کے مونڈھوں کو پکڑ کر جھنجھوڑا اور کہا کہ بیٹھو "اہل کتاب اسی لئے ہلاک ہوئے کہ ان کی نمازوں میں فصل نہیں ہوتا تھا" (یعنی ایک نماز ختم کرکے فوراً دوسری نماز شروع کردیتے تھے) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نگاہ اوپر اٹھائی اور فرمایا: ابن خطاب! اللہ نے تمھارے ذریعہ سے حق وثواب تک پہنچایا (ابوداؤد)

خدا کو سنانے کے لئے بلند آواز کی ضرورت نہیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں نے سوال کیا: اقریب ربنا فنناجیہ ام بعید فنناديہ ہمارا رب ہم سے قریب ہے کہ اس سے ہم سرگوشی کریں یا دور ہے کہ ہم اس کو پکاریں۔ اس کے جواب میں قرآن میں آیت اتری: جب میرے بندے میرے متعلق پوچھیں تو ان کو بتادو کہ میں ان سے قریب ہوں۔ پکارنے والا جب مجھ کو پکارتا ہے تو میں اس کی پکار کو سنتا ہوں اور اس کا جواب دیتا ہوں" (بقرہ - ۱۸۶) صحیحین میں ابوموسیٰ اشعری سے منقول ہے:

رفع الناس اصواتھم بالدعاء فی بعض الاسفار، فقال لھم النبی صلی اللہ علیہ وسلم یا ایھا الناس اربعوا علیٰ انفسکم فانکم لا تدعون اصم ولا غائبا ان الذی تدعونہ سمیع قریب، اقرب الی احدکم من عنق راحلتہ

ایک سفر میں دعا کے موقع پر لوگوں نے اپنی آوازیں بلند کیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے لوگو اپنے اوپر نرمی کرو کیوں کہ تم کسی بہرے یا غیر حاضر کو نہیں پکار رہے ہو۔ تم جس کو پکار رہے ہو وہ سننے والا قریب ہے۔ وہ تمھاری سواری کی گردن سے بھی زیادہ تم سے قریب ہے۔

دین بے فائدہ ہے اگر اس کا مقصد دنیا حاصل کرنا ہو۔

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: مَن تعلَّمَ عِلماً مِمَّا یُبْتَغیٰ بِہ وَجْہُ اللہِ عزوجلَّ لا یَتَعَلَّمُہ اِلّا لِیُصِیبَ بہ عرضاً من الدنیا لم یَجِدْ عَرْفَ الجنۃِ یومَ القیامۃ (ابوداؤد)

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ وہ علم جس سے اللہ کی رضا چاہی جاتی ہے اس کو جس شخص نے دنیا حاصل کرنے کے لئے سیکھا تو وہ قیامت کے دن جنت کی خوشبو بھی نہ پائے گا۔

جب دلوں پر اوٹ رکھ دی جائے

اور جب تم قرآن پڑھتے ہو تو ہم تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان جو آخرت کو نہیں مانتے ایک چھپا ہوا پردہ کر دیتے ہیں۔ اور ان کے دلوں کے اوپر اوٹ رکھ دیتے ہیں کہ اس کو نہ سمجھیں۔ اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دیتے ہیں۔ اور جب قرآن میں تم اپنے ایک ہی رب کا ذکر کرتے ہو تو وہ بدک کر اور پیٹھ پھیر کر چل دیتے ہیں (بنی اسرائیل ۴۶-۴۵)

زندگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک وہ زندگی جو خدا پرستی اور آخرت پسندی کے تحت ہے اور دوسری وہ جو خود پسندی اور دنیا پرستی کے تحت بنے۔ دونوں زندگیاں ایک دوسرے سے بالکل الگ الگ ہیں۔ ممکن ہے دونوں کے درمیان ظاہری طور پر زیادہ فرق نظر نہ آئے۔ مگر باعتبار حقیقت دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ ایک کے تحت آخرت رخی زندگی پیدا ہوتی ہے اور دوسرے کے تحت دنیا رخی زندگی۔ ایک صورت میں آدمی کا خدا اس کے اوپر غالب رہتا ہے اور دوسری صورت میں اس کا اپنا نفس۔ ایک اس فکر میں مبتلا ہوتا ہے کہ آخرت کے دن اس کی رسوائی نہ ہو اور دوسرے کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے درمیان اس کی عزت اور مقام محفوظ رہے۔ ایک اپنے خلاف تنقید سن کر اپنا احتساب کرنے لگتا ہے اور دوسرا اپنے خلاف تنقید سن کر بپھر اٹھتا ہے۔ ایک خدا و رسول کے حکم کے آگے جھکنے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے اور دوسرا خود اپنی ذات کو خدا و رسول کے مقام پر رکھ دیتا ہے۔ ایک ظاہری دنیا سے گزر کر حقائق کو اپنے سامنے رکھتا ہے اور دوسرا ہمیشہ ظاہری چیزوں میں اپنے کو الجھائے ہوئے ہوتا ہے۔ ایک کا ذہن یہ ہوتا ہے کہ "حقیقت مجھ سے ماوراء ہے اور مجھے اپنے آپ کو حقیقت کے مطابق بنانا چاہئے" اس کے برعکس دوسرا خود اپنے کو حقیقت اعلیٰ کا مقام دئے ہوئے ہوتا ہے، وہ اپنی ذات کو معیار حق سمجھتا ہے نہ کہ اپنے سے باہر کسی چیز کو۔

جو لوگ خود پسندی اور دنیا پرستی کی بنیاد پر اپنی زندگیاں بنائے ہوئے ہوں، ان کے سامنے جب بے لاگ حق کا پیغام آتا ہے تو ان کا عجیب حال ہوتا ہے۔ ان کی مخصوص نفسیات ان کے لئے ایک قسم کا روک بن جاتی ہے۔ حق کو ماننے میں ان کو محسوس ہوتا ہے کہ ان کے مفادات پر ضرب پڑ رہی ہے۔ ان کو اپنی دنیا ویران ہوتی نظر آتی ہے۔ ان کو ایسا لگتا ہے گویا حق کا اعتراف کرتے ہی ان کے سر سے برتری کا تاج اتر جائے گا۔ حق کو ماننا اپنی زندگی کے پورے ڈھانچہ کو بدلنے کے ہم معنی نظر آنے لگتا ہے۔ ایسے شخص کو محسوس ہوتا ہے کہ اپنی بنائی ہوئی دنیا میں تو میں عزت کامیابی کے تخت پر بیٹھا ہوا ہوں۔ اگر میں اس کو چھوڑ کر حق کا طریقہ اختیار کروں تو میں لوگوں کے درمیان بے حیثیت ہو کر رہ جاؤں گا ——— یہ نفسیات ایک قسم کا پردہ بن کر اس کے اور حق کے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔ اپنی مخصوص ذہنی کیفیت کی وجہ سے وہ حق کو اس کی اصل صورت میں دیکھ نہیں پاتا اور اس کی آواز کو اس کی پوری معنویت کے ساتھ سن نہیں پاتا۔ اپنی اس نفسیات کے زیر اثر وہ حق کو نظر انداز کر دیتا ہے، کبھی شعوری طور پر اور زیادہ تر غیر شعوری طور پر۔

وہ آدمی جو اپنے رب پر راضی رہا

" انسان کو جب اس کا رب آزماتا ہے اور اس کو عزت اور نعمت دیتا ہے تو انسان کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھ کو سرفراز کیا۔ اور جب اس کو دوسری طرح آزماتا ہے اور اس کی روزی اس پر تنگ کر دیتا ہے تو انسان کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھ کو بے قدر کر دیا۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ تم یتیم سے عزت کا سلوک نہیں کرتے۔ اور محتاج کو کھانا کھلانے کی تاکید نہیں کرتے۔ اور مردہ کا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو۔ اور مال سے بے حد محبت رکھتے ہو۔ ہرگز نہیں، جب زمین توڑ کر ریزہ ریزہ کر دی جائے گی۔ اور آئے گا تیرا رب اور فرشتے آئیں گے قطار در قطار۔ اس دن جہنم سامنے لائی جائے گی۔ اس دن آدمی سوچے گا۔ مگر اب سوچنے کا موقع کہاں۔ وہ کہے گا۔ کاش میں نے اپنی زندگی کے لئے کچھ بھیج دیا ہوتا۔ اس دن اللہ جو عذاب دے گا ویسا عذاب دینے والا کوئی نہیں اور اللہ جیسا باندھے گا ویسا باندھنے والا کوئی نہیں۔ اے اطمینان والی روح چل اپنے رب کی طرف۔ تو اس سے راضی، وہ تجھ سے راضی۔ پھر مل جا میرے بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں۔ (الفجر)

دنیا میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کا رویہ جہنم کو یاد کر کے بنے۔ دوسرے وہ جن کا رویہ جہنم سے بے خوف ہو کر بنے۔ کون جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ سے ڈر کر جی رہا ہے اور کون اس سے بے پروا ہو کر جی رہا ہے، اس کا اظہار زندگی کے معاملات میں ہوتا رہتا ہے۔ ہر بار جب زندگی کے مواقع میں سے کوئی موقع پیش آتا ہے تو آدمی اپنے ردعمل سے بتا دیتا ہے کہ دونوں میں سے کون سی حالت ہے جس میں اس کے صبح و شام گزر رہے ہیں۔

ایک وہ لوگ ہیں کہ جب ان کو عزت اور دولت ملتی ہے تو ان کے اندر اپنی بڑائی کا جذبہ جاگ اٹھتا ہے۔ اس کے برعکس اگر انھیں تنگی اور سختی پیش آجائے تو وہ احساس کمتری کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ اس طرح وہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک ساری اہمیت دنیا کی عزت اور بے عزتی کی ہے، وہ دنیا کے آرام اور تکلیف کو سب سے زیادہ قابل توجہ سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا سابقہ جب کمزور سے پیش آتا ہے تو اس کے ساتھ حقارت کا سلوک کرتے ہیں۔ کیوں کہ اس کے پاس وہ چیز نہیں جو ان کی نظروں میں لحاظ کے قابل ہے۔ ان کے سامنے کوئی ضرورت مند آجائے تو اس کی ضرورت پوری کرنے کا جذبہ ان کے اندر نہیں بھڑکتا۔ ان کو دنیوی مال و متاع کی اتنی حرص ہوتی ہے کہ اخلاقی حدود کو توڑ کر اور حرام و حلال کی تمیز سے آزاد ہو کر اس کو سمیٹنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ وہ اس قدر سخت دل ہو جاتے ہیں کہ کوئی شخص جو بزور اپنا حصہ وصول کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو، وہ ان سے اپنا حصہ پانے کی امید نہیں کر سکتا۔

دوسرے لوگ وہ ہیں جو قیامت سے پہلے قیامت کے اندیشوں سے کانپتے رہتے ہیں۔ کوئی معاملہ کرتے وقت ان کے اندر یہ سوچ ابھر آتی ہے کہ بات یہیں دنیا میں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ آخرت تک جاتی ہے۔ نعمت ان کے لئے شکر کا موقع ہوتا ہے اور سختی آتی ہے تو ان کے اندر صبر کا جذبہ جاگتا ہے۔ بے طاقت انسان کے پیچھے ان کو خدا اپنی طاقتوں کے ساتھ کھڑا ہوا نظر آتا ہے۔ خدا کے یہاں اپنی بے عزتی کا اندیشہ ان کو روکتا ہے کہ وہ دنیا میں کسی پر ظلم

پا جائیں تو اس کو بے عزت کرنے کی کوشش کریں۔ ان کو کوئی بھوکا مل جاتا ہے تو اس کو کھلاتے ہیں تاکہ خدا انھیں آخرت کے دن کھلائے۔ وہ کسی ضرورت مند کو پالیتے ہیں تو اس کی ضرورت پوری کرتے ہیں تاکہ جب وہ خدا کے یہاں پہنچیں تو خدا ان کی ضرورتیں پوری کرے۔ ان کو ایک ایسا نفس حاصل ہوتا ہے جو ہر وقت خدا میں اٹکا ہوا ہو۔ جس کا ہر رویہ آخرت کی مصلحت کے تحت ظاہر ہو نہ کہ دنیا کی مصلحت کے تحت۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا سے راضی ہوئے، اس لئے خدا بھی ان سے راضی ہو گا۔ ان کے ہاتھ اور پاؤں خدا کے لئے رکے۔ ان کی زبان خدا کے لئے بند ہوئی۔ انھوں نے اپنے جی کو خدا کے لئے تھاما۔ انھوں نے اپنی مصلحتوں کو خدا کے لئے قربان کیا۔ وہ آسمان کی سطح پر جئے جب کہ دوسرے لوگ زمین کی سطح پر جی رہے تھے۔ یہی لوگ خدا کے سچے بندے ہیں۔ موجودہ دنیا کو توڑ کر جب نیا عالم بنے گا اور وہ خدا کے پاس پہنچیں گے تو خدا ان کو نہال کر دے گا۔ ان کو اپنے وفاداروں کے گروہ میں شامل کرے گا۔ ان کے لئے ان جنتی مکانوں کے دروازے کھول دے گا جو ابدی باغات میں بنے ہوں گے جہاں ہر قسم کی نعمتیں بے حساب مقدار میں جمع ہوں گی جہاں نہ موت ہے اور نہ کوئی حادثہ۔ جہاں نہ غم ہے نہ تکلیف۔ جہاں نہ تکان ہے اور نہ اکتاہٹ۔ آدمی اپنے رب کی اس لازوال دنیا کا باشندہ بن جائے گا جس کو دیکھے بغیر اس نے اپنی پوری زندگی کو اس کے اوپر ڈال دیا تھا۔

حافظ ابن عساکر نے حضرت امامہؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو یہ دعا سکھائی:
اللهم انى اسألك نفسا بك مطمئنة تؤمن بلقائك وترضى بقضائك وتقنع بعطائك (اے اللہ میں تجھ سے ایسا نفس مانگتا ہوں جو تیرے اوپر مطمئن ہو، تجھ سے ملاقات کا یقین رکھتا ہو، تیرے فیصلہ پر راضی ہو۔ تیرے دئے ہوئے پر قانع ہو) جو شخص دنیا کی ناخوش گواریوں پر اللہ کے لئے راضی ہو جائے، آخرت میں خوش گوار عیش پر رضامندی اسی کے حصہ میں آتی ہے۔

نفس مطمئن کا مطلب غم سے پاک دل نہیں ہے بلکہ نفسیاتی گرہوں سے پاک دل ہے۔ مومن کی زندگی دنیا میں کبھی غم سے خالی نہیں ہوتی۔ اس کے لئے غم سے خالی زندگی کا مقام جنت ہے۔ مومن سے دنیا کی زندگی میں جو چیز مطلوب ہے وہ یہ کہ دنیا میں وہ دنیا کے غم کو لے کر نہ جئے بلکہ آخرت کے غم کو لے کر جئے۔ دنیوی چیزوں کا حرص، کسی کے پاس دنیا زیادہ ہو تو اس سے جلنا اور کسی کے پاس دنیا کم ہو تو اس کو حقیر سمجھنا، خوشامد اور تعریف کرنے والوں سے خوش رہنا اور تنقید اور اختلاف کرنے والوں کو بری نظر سے دیکھنا۔ یہ چیزیں جس شخص کے اندر ہوں اس کا سینہ تاریکیوں سے بھر جاتا ہے۔ وہ منفی نفسیات کے اندھیرے میں بھٹکتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اسی حال میں مر جاتا ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ دنیوی محرکات سے اوپر اٹھ جائیں، جن کا سینہ حرص، گھمنڈ، انانیت، نفرت، انتقام، خود پسندی اور بے انصافی سے خالی ہو، ان کے دل کو خدا کی طرف سے اطمینان و سکینت کا نور پہنچتا ہے۔ آخرت کی عظمت ان کے ذہن پر اس قدر چھا جاتی ہے کہ دنیا کی راحت اور تکلیف دونوں ان کو بالکل حقیر نظر آتی ہے۔ وہ اپنے مداح اور اپنے ناقد کو ایک نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ یہی نفوسِ مطمئنہ ہیں اور انھیں کے لئے آخرت میں جنت کے دروازے کھولے جائیں گے۔

امت مسلمہ کا مقصد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں اس لئے آئے کہ اللہ کے بندوں کو اللہ کی طرف بلائیں۔ آپ کے بعد یہی آپ کے پیروؤں کا مشن بھی ہے (قل ھذہ سبیلی ادعوا الی اللہ علیٰ بصیرۃ انا ومن اتبعنی، یوسف ۱۰۸) قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی نظر میں سب سے زیادہ اہم معاملہ آخرت کا معاملہ ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ موت سے پہلے آدمی اس حقیقت سے باخبر ہو جائے کہ اگر وہ اللہ والا بن کر نہیں مرا تو اس کے لئے خطرہ ہے کہ وہ ابدی بربادی کے جہنم میں دھکیل دیا جائے۔ موجودہ دنیا کے خاتمہ کے بعد جب اگلی دنیا بنائی جائے گی تو سارے لوگوں کا مقدمہ خدا کے یہاں پیش ہوگا۔ اس وقت لوگوں کے مستقل انجام کا فیصلہ کرنے کے لئے جو طریق عمل اختیار کیا جائے گا وہ یہ ہوگا کہ وہ داعیان حق وہاں گواہ بنا کر کھڑے کئے جائیں گے جنھوں نے دنیا کی زندگی میں ان قوموں تک اللہ کے دین کو پہنچایا تھا۔ پچھلے زمانوں کے لئے اس زمانہ کے انبیاء گواہ بنیں گے۔ بعد کے زمانے میں جب کہ نبوت ختم ہو چکی ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام فرمایا ہے کہ نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت پر دین کی مکمل گواہی دے دی اور اس کے بعد اس امت کی یہ ذمہ داری قرار پائی کہ یہ قیامت تک دنیا کی قوموں کے اوپر داعی بن کر کھڑی ہوتی رہے تاکہ آخرت کے دن وہ قوموں کے مقدمے میں اللہ کی گواہ بن سکے۔ پیغمبر جس طرح ہمارے اور خدا کے درمیان واسطہ ہے اسی طرح یہ امت پیغمبر اور قوموں کے بیچ میں کھڑی ہوئی ہے اور پیغمبر کی طرف سے بالواسطہ طور پر تمام قوموں تک دعوت پہنچانے کے لئے مامور ہے:

وکذالک جعلنٰکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا (بقرہ ۱۴۳)

اور اس طرح ہم نے بنا دیا تم کو بیچ کی امت تاکہ تم گواہ ہو لوگوں پر اور رسول ہو گواہ تمھارے اوپر

دوسری قوموں کے مستقبل کا انحصار اس پر ہے کہ وہ اللہ کے دین کو اپناتی ہیں یا نہیں۔ اسی طرح امت مسلمہ کا مستقبل تمام تر اس سوال پر معلق ہے کہ وہ اللہ کے دین کی گواہ بننے کے لئے اٹھتی ہے یا نہیں۔ جس طرح دوسری قوموں کی نجات کسی اور دین کو اختیار کر کے نہیں ہو سکتی، اسی طرح امت مسلمہ کی نجات کسی اور میدان میں عمل کر کے نہیں ہو سکتی، خواہ اس میں وہ کتنے ہی بڑے بڑے کارنامے دکھا رہی ہو۔ حتیٰ کہ صرف نماز روزہ بھی اس کی نجات کے لئے کافی نہیں ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام کو جب مچھلی نے نگل لیا تو یہ "نماز روزہ" میں کوتاہی کی بنا پر نہ تھا۔ ان چیزوں میں آنجناب نے کبھی کوئی کمی نہیں کی تھی۔ ان کی کمی صرف یہ تھی کہ اپنی مدعو قوم پر دعوت کا حق ادا کرنے میں اجتہادی بنا پر ان کی طرف سے کوتاہی واقع ہو گئی۔ اتنی بات بھی اللہ کو پسند نہیں آئی۔ حقیقت یہ ہے کہ امت مسلمہ کی کامیابی، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، تمام تر اس پر منحصر ہے کہ وہ دعوت الی اللہ کے لئے اٹھے اور اس کے تمام تقاضوں کے ساتھ اس کو انجام دے۔ بصورت دیگر اس کے لئے بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔ امت مسلمہ کے ساتھ اللہ کے تمام وعدے اسی قیمت پر ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو وہ اللہ کے یہاں بے قیمت ہو جائے گی۔ خواہ کسی اور میدان میں بزعم خود وہ کتنے ہی بڑے کارنامے انجام دے رہی ہو۔

اسلامی معاشرہ کیسا ہوتا ہے

"معاشرہ" کا لفظ ایسے انسانی مجموعہ کے لئے بولا جاتا ہے جو فطری تنوع کے باوجود کسی خاص مشترک بندھن کے تحت یکساں حالات میں زندگی گزار رہا ہو۔ آج کی دنیا میں معاشرہ کے بہت سے نمونے پائے جاتے ہیں۔ روایتی معاشرہ، جس کا ایک نمونہ عیسائیت ہے۔ نسلی معاشرہ، جو یہود کے یہاں پایا جاتا ہے۔ سیاسی معاشرہ، جیسا کہ جمہوری نظاموں میں ہم دیکھتے ہیں۔ اسی طرح میکانیکی معاشرہ، جس کو ظہور میں لانے کی کوشش کمیونسٹ دنیا میں بہت بڑے پیمانہ پر ہو رہی ہے۔

معاشرہ کی ان تمام قسموں میں، ظاہری فرق کے باوجود، ایک چیز مشترک ہے۔ ان کو جو چیز ایک مخصوص اور متعین روپ دیتی ہے وہ خارجی اسباب ہیں۔ روایت، نسل، سیاسی اور قانونی ڈھانچہ، میکانکی حالات سب خارجی چیزیں ہیں۔ گویا ان معاشروں کو معاشرہ بنانے والی چیز ان سے باہر کے عوامل ہیں نہ کہ خود ان کے اندر کے عوامل۔ اسلامی معاشرہ کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اسلامی معاشرہ افراد معاشرہ کے اپنے اندرونی محرک کے تحت ظہور میں آتا ہے۔ اسلامی معاشرہ کو جو چیز اسلامی معاشرہ بناتی ہے وہ کوئی خارجی ناگزیریت نہیں بلکہ افراد کا اپنا اندرونی ارادہ ہے۔ وہ اپنے آزاد ارادہ کی طاقت سے اپنے آپ کو ایک خاص شکل میں ڈھالتے ہیں اور ارادی کوشش کے ذریعہ اس پر قائم رہتے ہیں۔

اسلامی معاشرہ کو کسی دوسرے معاشرہ کی مثال سے سمجھا نہیں جا سکتا۔ اسلامی معاشرہ، تمام دوسرے معاشروں کے برعکس، خوف خدا کا معاشرہ ہے۔ اسلامی معاشرہ وہ ہے جس کا ہر فرد، یا کم از کم اس کے افراد کی مؤثر تعداد، ایسے لوگوں پر مشتمل ہو جو ہر معاملہ میں صرف خدا کی خوشی اور ناخوشی کو دیکھتے ہوں۔ اس کے سوا دوسرے مصالح و محرکات ان کے لئے ناقابل لحاظ بن جائیں۔ خدا جو ساری کائنات کی اصل ہے، وہی اسلامی معاشرہ کی بھی اصل ہے۔ اسلامی معاشرہ خدا کے مرکزی عقیدہ کے گرد بنتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام خوبیاں اور کمالات "بیج روپ" میں عقیدۂ خدا کے اندر موجود ہیں۔ حدیث میں کہا گیا ہے رأس الحكمة مخافة الله (اللہ کا خوف حکمت کا سرا ہے) جب آدمی خدائے واحد کے عقیدہ کو اس کی صحیح شکل میں اختیار کرتا ہے تو تمام اعلیٰ اوصاف اس کے اندر سے اگنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اسلامی معاشرہ خدائی معاشرہ ہے۔ اور اسی لئے وہ مثالی معاشرہ بھی ہے۔ کیونکہ ہر قسم کے کمالات اور خوبیوں کا واحد سرچشمہ صرف خدا ہی کی ذات ہے۔ اس سے باہر کسی کمال کا کوئی وجود نہیں۔

اسلامی معاشرہ اصلاً افراد کی اسلامیت کا اجتماعی ظہور ہے۔ تاہم اس کو مسلسل برقرار رکھنے کے لئے باہمی نگرانی کا خصوصی حکم دیا گیا ہے جس کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہا جاتا ہے۔ اسلام اپنے افراد کے اندر یہ مزاج پیدا کرتا ہے کہ وہ ایک دوسرے پر خیر خواہانہ نظر رکھیں۔ اسلامی معاشرہ کے ہر فرد سے یہ مطلوب ہے کہ وہ دوسرے افراد کو بھلائی کی تلقین کرے اور برائی سے روکے۔ یہ کام اسی دل سوزی اور خیر خواہی کے ساتھ ہو جس طرح ایک باپ اپنے عزیز بچوں کی اصلاح کے لئے کرتا ہے۔ یہی چیز جب زیادہ منظم صورت اختیار کرتی ہے تو اسی کا نام اسلامی خلافت ہے۔ اسلامی معاشرہ افراد کے اندرونی احساس ذمہ داری کے تحت وجود میں آتا ہے اور نصیحت اور احتساب کا خارجی نظام اس کی حفاظت کرتا ہے۔ ●

موت
کا
سبق

انسان کی محدودیت

پوپ جان پال اول ۲۹ ستمبر ۱۹۷۸ کو ویٹیکن میں انتقال کر گئے۔ ان کی عمر ۶۵ سال تھی اور ان کو پوپ کے عہدے پر فائز ہوئے ابھی صرف ۳۳ دن ہوئے تھے۔ وہ دنیا بھر کے سات سو ملین کیتھولک عیسائیوں کے روحانی بادشاہ تھے۔ ۲۸ ستمبر کو ان کی صحت بالکل ٹھیک تھی۔ معمول کے مطابق رات کو وہ اپنی خواب گاہ میں گئے۔ اگلی صبح کو جب وہ مقررہ وقت پر اپنے کمرہ سے باہر نہیں نکلے تو ان کے سکریٹری نے معلوم کیا۔ اس نے دیکھا کہ پوپ جان پال اول اپنے بستر پر مردہ پڑے ہوئے ہیں۔

کمرہ کی روشنی جل رہی تھی اور ان کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی جو کھلی ہوئی تھی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ رات کو وہ کتاب پڑھتے ہوئے اچانک ختم ہو گئے۔ آخر وقت میں ان کے ہاتھ میں جو کتاب تھی اس کا نام تھا: مسیح کی محدودیت

(The Limitation of Christ)

زندگی سے دور، موت سے قریب

مسٹر ہیم رائے (۱۹۷۹-۱۹۲۲) ایک نہایت ذہین آدمی تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانہ میں انھوں نے حکومت ہند کے اشتہارات کے شعبہ میں مشیر کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ وہ ترقی کرتے رہے اور ۱۹۶۲ میں کالگیٹ پامولیو میں منیجنگ ڈائرکٹر ہو گئے۔ ان کے زمانہ میں کمپنی نے کافی ترقی کی۔ ۱۹۷۸ میں اس کمپنی کے حصہ داروں کی تعداد تیس ہزار ہو گئی اور وہ ایک پبلک لمیٹڈ کمپنی قرار دے دی گئی۔ مسٹر ہیم رائے کو جائز طور پر اس کا چیرمین بنا دیا گیا۔

اب موصوف ترقی کی چوٹی پر پہنچ چکے تھے۔ مگر چیرمین کی کرسی پر بیٹھے ہوئے ایک سال بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ ان کی موت کا وقت آ گیا۔ وہ تیراکی کے شوقین تھے اور بمبئی کے قریب اپنے فارم میں کبھی کبھی تفریح کے لئے جایا کرتے تھے۔ ۲۱ جنوری کو وہ گوا گئے۔ وہاں وہ سمندر کے ساحل پر تیراکی کر رہے تھے کہ اچانک موجوں کی زد میں آ گئے اور ڈوب کر مر گئے۔ موت کے وقت ان کی عمر ۵۶ سال تھی (ٹائمس آف انڈیا ۹ فروری ۱۹۷۹)

یوم الحساب کا آنا ضروری ہے

مسٹر سی۔ آر۔ گوئل (دہلی) کا جوان لڑکا ڈاکٹر راجندر گوئل ۲۷ مئی ۱۹۷۸ کو ایک حادثہ کا شکار ہو گیا۔ وہ پوسا روڈ (دہلی) میں اپنے اسکوٹر پر جا رہا تھا کہ سامنے سے آتی ہوئی ڈی ٹی سی بس اس سے ٹکرا گئی۔ وہ فوراً مر گیا۔ اب اس کا مقدمہ عدالت میں ہے۔ ڈرائیور کا کہنا ہے کہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ حادثہ کی وجہ یہ تھی کہ بس کا بریک فیل ہو گیا

مقتول کے والد کا ایک خط ٹائمس آف انڈیا (۱۹ جون ۱۹۷۸) میں چھپا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

میرا نقصان ناقابل تلافی ہے۔ اب میری خواہش صرف اتنی ہے کہ اس قسم کے غیر ذمہ دار کو ضرور سزا ملے۔ وہ بچ کر نہ جا سکے۔

ناکامی ناقابل برداشت

مسٹر ودیا ساگر منن نے ایم ایس سی کیا۔ اس کے بعد انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایگریکلچرل ریسرچ میں ڈاکٹریٹ

کے لئے داخلہ لیا۔ ان کا مضمون (Entomology) تھا۔
ابھی ان کی تعلیم مکمل نہیں ہوئی تھی کہ انھوں نے خودکشی کرلی۔ ۱۱ دسمبر ۱۹۷۸ کو انسٹی ٹیوٹ کے ہاسٹل میں ان کا کمرہ کھولا گیا تو ان کا مردہ جسم ایک رسی کے پھندے میں پھنسا ہوا لٹک رہا تھا۔ خودکشی کے وقت ان کی عمر ۲۴ سال تھی ۔
مسٹر منن کے ساتھیوں نے بتایا کہ دو مہینے پہلے ٹسٹ ہوا تھا اس میں اگرچہ اکثر مضامین میں ان کے نمبر اچھے تھے مگر آرگینک کیمسٹری میں ان کے نمبر کافی کم تھے۔ اس سے وہ بہت متاثر تھے۔ اندازہ ہے کہ اسی کی وجہ سے انھوں نے اپنی جان دے دی۔

ایک معمولی ناکامی آدمی کو اتنے شدید غم میں مبتلا کردیتی ہے۔ اس وقت انسان کا کیا حال ہوگا جب وہ مکمل ناکامی اور ابدی ذلت کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھے گا۔

پھولوں کا سفر آگ کا سفر بن گیا

ستیہ نارائن گپتا (۱۹۷۹-۱۹۵۲) جے پور کے ایک جواہرات کا کاروبار کرنے والے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ یہ خاندان افریقہ اور برازیل سے قیمتی پتھر درآمد کرتا ہے اور اس کو تیار کرکے دنیا بھر میں فروخت کرتا ہے۔ مسٹر گپتا نے بی اے کیا اور قانون کی ڈگری لی۔
اب وہ امریکہ گئے تاکہ وہ اپنے برآمدی کاروبار کو مزید ترقی دے سکیں۔ امریکہ میں ان کو مستقل قیام کا ویزا (گرین کارڈ) مل گیا۔ ۱۰ مارچ کو وہ اسٹریٹ نمبر ۴۷ (نیویارک) میں اپنے فلیٹ سے نکلے۔ ان کے ہاتھ میں ایک سوٹ کیس تھا جس میں ۱۰ لاکھ سے ۲۰ لاکھ تک مالیت کے جواہرات تھے۔ وہ نیویارک کے ایک بڑے جوہری کے یہاں اس کے بلاوے پر جا رہے تھے مگر وہ اس سفر سے واپس نہ آسکے۔ اگلے دن صرف ان کی لاش ملی۔ کسی نامعلوم شخص نے ان کو خود ان کی ٹائی سے گلا گھونٹ کر مار ڈالا تھا۔ (۳۰ اپریل ۱۹۷۹)

آٹھ مہینے امریکہ میں قیام کرنے کے بعد وہ اپنے عزیزوں سے ملنے کے لئے گھر آنے والے تھے۔ وہ واپس آئے مگر اپنے منصوبہ کے مطابق فرسٹ کلاس سیٹ پر بیٹھ کر نہیں بلکہ بوئنگ ۷۴۷ کے لگیج میں جہاں ان کی لاش ایک تابوت میں بند کرکے رکھ دی گئی۔ وہ جے پور پہنچے تو یہاں ان کے استقبال کے لئے ان کے عزیزوں کے مسکراتے ہوئے چہرے نہ تھے بلکہ چتا کی آگ تھی۔ دوست اور عزیز ان کے گلے میں ہار ڈالتے۔ چتا نے بھی ان پر ہار ڈالے۔ مگر یہ پھولوں کا نہیں بلکہ آگ کا ہار تھا۔ دوست اور عزیز اپنے محبوب کو جلتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ مگر وہ ان کے لئے کچھ نہ کرسکے۔ ۲۷ سال کے خوبصورت مسکراتے ہوئے چہرے کو آگ نے اس طرح نگل لیا جیسے کہ اس کی کوئی حقیقت ہی نہ تھی۔ مسٹر گپتا کے مکان میں آگ لگتی تو فائر بریگیڈ کی گاڑیاں منٹوں میں اس کو بجھانے کے لئے پہنچ جاتیں۔ مگر یہاں خود مکان کا مالک جل رہا تھا اور کوئی نہیں تھا جو اس کو بچائے، دوبارہ اس کو اس کے شاندار روپ میں کھڑا کرسکے۔

اچانک موت

موجودہ زمانہ میں حادثات کے ذریعہ اچانک موتیں بہت بڑھ گئی ہیں۔ ۲۷ مارچ ۱۹۷۷ کو ٹینیریف (Tenerife) کے ہوائی اڈہ پر رن وے پر دو جمبو جیٹ ٹکرا گئے۔ اس کے نتیجہ میں ۵۸۱ مسافر یک لخت جل کر مر گئے۔ آدمی دنیا میں اس طرح رہتا ہے جیسے وہ مستقل جئے گا۔ حالانکہ وہ اچانک ایک روز اس دنیا سے چلا جاتا ہے۔

لاہور (پاکستان) کی ایک خاتون کینسر اور ذیابیطس کے مرض میں مبتلا تھی۔ اس کے بھائی نے بی بی سی ریڈیو پر سنا کہ ہندستانی وزیر اعظم مسٹر مرارجی ڈیسائی نے اس قسم کے مریضوں کا مجرب قدرتی علاج یہ بتایا ہے کہ وہ کثرت سے انگور کھائیں۔ مذکورہ پاکستانی کو یہ نسخہ پسند آگیا۔ تاہم چند باتیں اس کو وضاحت طلب معلوم ہوئیں: تازہ انگور نہ ملنے کی صورت میں کیا خشک انگور کھایا جا سکتا ہے، کیا انگور کے طریق علاج پر عمل کرتے ہوئے انسولین (دوا) بھی مریضہ کو دی جا سکتی ہے۔ مذکورہ پاکستانی نے مسٹر مرارجی ڈیسائی کو خط لکھا کہ وہ ان امور کے بارے میں اس کو ہدایات دیں۔ چند دن بعد ہندستانی وزیر اعظم کی میز پر جو ڈاک رکھی گئی اس میں مذکورہ خط بھی شامل تھا۔ وزیر اعظم اس کو پڑھ کر فوراً حرکت میں آگئے۔ مگر خط کے مطابق پاکستانی خاتون کی حالت بہت نازک تھی۔ اس کو فی الفور "امداد" پہنچانا ضروری تھا۔ اگر خط کے ذریعہ جواب بھیجا جاتا ہے تو اس کو منزل مقصود تک پہنچنے میں کئی دن لگ جائیں گے۔ مذکورہ پاکستانی کے لیٹر ہیڈ نے اس مسئلہ کو حل کر دیا جس پر اس کا لاہور کا ٹیلی فون نمبر درج تھا۔ وزیر اعظم نے فیصلہ کیا کہ وہ خط کے بجائے ٹیلی فون سے اپنا جواب پہنچائیں گے۔

عام حالات میں ہندوستان سے پاکستان ٹیلی فون ملانے میں کئی روز لگ جاتے ہیں۔ مگر اس وقت صورت حال مختلف ہوتی ہے جب کہ وزیر اعظم ہندستان خود ٹیلی فون کر رہا ہو۔ اگلے ہی لمحہ لاہور میں مذکورہ شخص کے ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ ہندستان کے وزیر اعظم نے بسرعت اپنا قیمتی مشورہ پڑوسی ملک کے شہری تک پہنچا دیا تھا۔ تاہم یہ تیز رفتار امداد کام نہ آئی۔ پاکستانی خاتون اس سے پہلے دنیا سے رخصت ہو چکی تھی۔

پاکستانی مریضہ کے بھائی کو ہندستانی وزیر اعظم کی اس عنایت نے بہت متاثر کیا۔ اس نے وزیر اعظم کو شکریہ کا خط لکھا۔ خط میں درج تھا:

> I am much obliged and overwhelmed by your nobility. You are every inch a gentleman. The members of my family and I are all appreciation for you. I do not tire of telling my friends: here is the finest specimen of humanity and humanism The Times of India, May 22, 1979

"میں آپ کی شرافت سے بہت زیادہ متاثر ہوا ہوں اور آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ آپ ایک ایک انچ ایک اعلیٰ انسان ہیں۔ میں اور میرے گھر کے سب لوگ آپ کے بے حد قدر داں ہیں۔ میں اپنے دوستوں کو یہ بتاتے ہوئے نہیں تھکتا: یہ انسان اور انسانیت کی ایک اعلیٰ ترین مثال ہے۔" (ٹائمس آف انڈیا ۲۲ مئی ۱۹۷۹)

ایک وزیر اعظم کے اپنے ملک میں انتہائی وحشیانہ طور پر بے گناہ مردوں اور عورتوں کو قتل کیا جاتا ہے۔ ان کی معاشیات کو منظم طور پر برباد کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ان کو دوسرے درجہ کا شہری بنا دیا جاتا ہے مگر وزیر اعظم کو ان امور میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ البتہ باہر کے ایک شخص کی مصیبت کو سن کر وہ بے تاب ہو جاتا ہے

اور "بجلی کی سرعت" کے ساتھ اس کو اپنی امداد پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ملک کے اندر ہونے والے ظلم کو مٹانے کے لئے اٹھنا بہت زیادہ محنت اور قربانی مانگتا ہے۔ جب کہ باہر کے ایک شخص کی مدد کرنے کے لئے چند لفظ بول دینے کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔

اسی واقعہ میں آپ مسلم قائدین کی تصویر بھی دیکھ سکتے ہیں۔ آج ہمارے تمام قائدین کا یہ حال ہے کہ اگر ان کے قریب کا ایک آدمی اپنا ایک حقیقی مسئلہ لے کر ان کے پاس جائے تو اس کو حل کرنے سے انھیں کوئی دل چسپی نہ ہوگی۔ کیونکہ اس قسم کے ایک عملی مسئلہ کو حل کرنے میں طرح طرح کی قربانیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مسئلہ کو گہرائی کے ساتھ سمجھنا، اس کی تمام نزاکتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مسلسل عملی جد و جہد کرنا، ان تمام لوگوں کی دشمنی مول لینا جنھوں نے مذکورہ شخص کو مصیبت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ حتیٰ کہ خود اپنے نفس پر لگام لگانا، کیونکہ اکثر اوقات مسئلہ پیدا کرنے میں خود یہ مسلم قائد بھی براہ راست یا بالواسطہ طور پر شریک ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا قائد اس قسم کے مسئلہ پر کبھی دھیان نہیں دیتا۔ البتہ "دور" پیدا ہونے والے مسئلہ پر وہ فوراً حرکت میں آجاتا ہے۔ کیوں کہ یہاں لفظوں کے ذریعہ اس کو وہ کریڈٹ مل رہا ہے جو مذکورہ مثال میں عمل اور قربانی کے ذریعہ ملتا۔ اس کی یہ انسانی ہمدردی فوراً ایک شان دار بیان کی صورت میں اخبار کے صفحہ اول کی زینت بنتی ہے۔ اس کو موقع ملتا ہے کہ وہ بڑے بڑے لوگوں سے ٹیلی فون پر رابطہ قائم کرے۔ وہ ہوائی جہاز میں اڑ کر جائے واردات پر پہنچے۔ وہ ایک شان دار کانفرنس کر کے اس کے اسٹیج پر ہیرو کے روپ میں نمایاں ہو۔ وہ ریلیف فنڈ کھولے اور دوسروں کی جیب سے پیسے نکال کر اس کا کچھ حصہ اپنی شان قیادت قائم کرنے میں خرچ کرے اور کچھ حصہ کو تقسیم کر کے اعانت مظلومین کا کریڈٹ لے۔ مزید یہ کہ ان کارناموں میں لیڈر کو اپنے پاس سے کچھ خرچ کرنا نہیں پڑتا۔ ٹیلی فون اور پٹرول اور ہوائی سفر سے لے کر پر تکلف دعوتوں اور عالی شان کانفرنسوں تک سارا بل قوم کی جیب سے ادا ہوتا ہے۔ شاید پوری انسانی تاریخ میں سستی قیادت کا اتنا کامیاب نسخہ کبھی کسی نے دریافت نہیں کیا تھا جو ہمارے قائدین کو خوش قسمتی سے موجودہ زمانہ میں ہاتھ آگیا ہے۔

یہ کیفیت جب مزید ترقی کرتی ہے تو حال یہ ہو جاتا ہے کہ اخلاقی دیوالیہ پن میں مبتلا ہونے والے لوگ "طاقتور اخلاقی قیادت" کا نعرہ لگاتے ہیں۔ جن کے دل کے دروازے حق کو قبول کرنے کے لئے بند ہو چکے ہوتے ہیں وہ عوام کے دلوں پر دستک دینے کے لئے دوروں اور تقریروں کا طوفان برپا کرتے ہیں، جو اپنے دائرہ اختیار میں بدترین ظلم کو جائز کئے ہوئے ہوتے ہیں وہ خدا کی زمین کو ظلم سے پاک کرنے کا جھنڈا لے کر کھڑے ہوتے ہیں۔ جن کی روحیں شرپسندی سے معمور ہوتی ہیں وہ خیر پسندوں کو منظم کر کے ملک کی کایا پلٹ دینے کا منصوبہ بناتے ہیں۔ جن کے سینے اپنے مخالفین کے خلاف نفرت اور انتقام سے بھرے ہوتے ہیں وہ دوسروں کو یہ پیغام دینے کے لئے قافلہ در قافلہ نکلتے ہیں کہ اپنے مخالفین کے ساتھ انصاف اور انسانیت کا برتاؤ کرو۔

یہ جھوٹی قیادت صرف اس وقت تک ہے جب تک دنیا کی بساط الٹی نہیں جاتی۔ جب صور پھونکا جائے گا اور موجودہ دنیا کی بساط الٹ دی جائے گی تو تمام جھوٹی رونقیں اس طرح باطل ہو جائیں گی جیسے کہ ان کی کوئی حقیقت ہی نہ تھی۔

اہم اعلان

مولانا وحید الدین خاں کی کتابوں کے بعض عربی ترجمے (مطبوعہ قاہرہ) محدود تعداد میں مکتبہ الرسالہ کے پاس موجود ہیں جن کی تفصیل یہ ہے

۱۔ الاسلام یتحدیٰ (ساتواں ایڈیشن) ۲۶۳ صفحات قیمت ۲۰ روپے

۲۔ الدین فی مواجهة العلم (چوتھا ایڈیشن) ۱۱۲ صفحات 〃 ۱۰ روپے

۳۔ حکمة الدین (دوسرا ایڈیشن) ۸۷ صفحات 〃 ۸ روپے

۴۔ الاسلام والعصر الحدیث (دوسرا ایڈیشن) ۷۷ صفحات 〃 ۸ روپے

۵۔ مسئولیات الدعوة (تیسرا ایڈیشن) ۳۹ صفحات 〃 ۲ روپے

۶۔ نحو تدوین جدید للعلوم الاسلامیة ۲۶ صفحات 〃 ۲ روپے

۷۔ امکانات جدیدة للدعوة ۳۴ صفحات 〃 ۲ روپے

محصول ڈاک بذمہ خریدار — قیمت مکمل سٹ معہ محصول ڈاک ۵۵ روپے — پوری رقم پیشگی روانہ فرمائیں

ہم زندگی کے مقابلہ میں موت سے زیادہ قریب ہیں

ہمارا اصل مسئلہ کیا ہے۔ ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم انسانوں کے درمیان اپنی جگہ بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔ حالاں کہ عنقریب ہم خدا سے دوچار ہونے والے ہیں۔ ہم دنیا میں عزت اور کامیابی ڈھونڈ رہے ہیں۔ حالاں کہ بہت جلد ہم آخرت میں داخل ہونے والے ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص زندگی کے مقابلہ میں موت سے زیادہ قریب ہے مگر ہر شخص زندگی کے مسائل میں الجھا ہوا ہے، موت کے مسائل کے لئے فکرمند ہونے کی ضرورت کوئی محسوس نہیں کرتا۔ وہ اسلام جس نے اصحاب رسول کو سراسیمہ بنا دیا تھا وہ اسلام آج لوگوں کو صرف قناعت اور بے فکری کا تحفہ دے رہا ہے۔

ایسا کیوں ہے۔ قرآن کے الفاظ میں اس کی وجہ تزئین (فاطر ۸) ہے۔ ہر آدمی کو کچھ ایسے الفاظ مل گئے ہیں جن سے وہ اپنی غیر اسلامیت کی خوبصورت اسلامی توجیہ کر سکے۔ ہر آدمی نے اپنے گرد خوش خیالیوں کا ایک گھروندا بنا لیا ہے اور اس کے اندر وہ جی رہا ہے۔ اس کو یہ احساس نہیں کہ موت کا دھماکہ اچانک اس کے گھروندے کو توڑ دے گا اور اس کے بعد اس کے پاس ایک تنکا بھی نہ ہوگا جس سے وہ خدا کے غضب کے مقابلہ میں اپنا بچاؤ کر سکے۔

ایک قائد ملت ایک مسلمان کے اوپر ظلم کرتا ہے مگر اس کو اپنے ظالم ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔ کیوں کہ وہ جلسوں میں اور اخبارات کے صفحات میں اپنے کو اسلام کا چیمپین بنا ہوا دیکھتا ہے۔ اس کے لئے ناقابل قیاس ہو جاتا ہے کہ ایک شخص جو دنیا میں ناخدائے ملت بنا ہوا دکھائی دے رہا ہو وہ آخرت میں ظالم ملت کی حیثیت سے اٹھایا جائے۔ ایک لیڈر مسلمانوں کے درمیان ایسی سیاست چلاتا ہے جس سے مسلمان دو گروہوں میں بٹ کر ایک دوسرے کا خون بہاتے ہیں۔ ملک کی دینی اور تعمیری سرگرمیاں تہس نہس ہو جاتی ہیں۔ دنیا کی نظر میں اسلام کی یہ تصویر قائم ہوتی ہے کہ اسلام وحشیوں کا مذہب ہے جو آپس میں لڑائی جھگڑے کے سوا اور کچھ نہیں سکھاتا۔ اس کے باوجود لیڈر کی راتوں کی نیند نہیں اچٹتی۔ اس کا دن کا سکون غارت نہیں ہوتا۔ کیوں کہ وہ دیکھتا ہے کہ اپنی زبان و قلم کے ذریعہ اس نے جو اشاعتی کارنامے انجام دئے ہیں وہ اس کو لاکھوں معتقدین کے درمیان نجات دہندۂ اسلام بنائے ہوئے ہیں۔ اپنی علمی اور تقریری خدمات کی بدولت وہ ایک اسلامی ہیرو کی سی زندگی گزار رہا ہے۔ ایسی حالت میں اس کے لئے ناقابل فہم بن جاتا ہے کہ خدا کے یہاں اس کو بے قیمت قرار دے دیا جائے، دنیا میں اعزازات پانے والا آخرت میں صرف محرومی کی خندق میں ڈال دیا جائے۔ اسی طرح ایک شخص وعدہ خلافی کرتا ہے، اپنے پڑوسی کو ستاتا ہے، اپنے رشتہ داروں کے حقوق ادا نہیں کرتا۔ لین دین میں اس کے معاملات لوگوں سے صاف نہیں ہیں۔ اس کے باوجود وہ سمجھتا ہے کہ جنت اس کے لئے ریزرو ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دیکھتا ہے کہ میں نماز روزہ کا اہتمام کر رہا ہوں۔ حج کی سعادت بھی میں نے حاصل کر لی ہے۔ مسجد اور مدرسہ کے چندہ دہندگان میں بھی میرا نام چھپا ہوا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے ایک دین دار آدمی کا کیا یہ انجام ہو سکتا ہے کہ آخرت میں وہ بے دین قرار دے کر خدا کی رحمتوں سے دور پھینک دیا جائے۔

حقیقی خداپرستی جو آخرت میں آدمی کے کام آئے گی وہ یہ ہے کہ آدمی اس طرح اللہ سے ڈرنے لگے کہ وہ

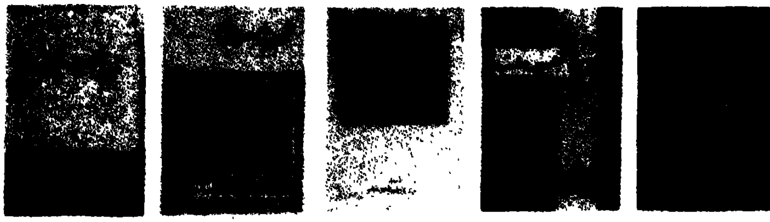
اس کے صبح و شام کا نگراں اور حاکم بن جائے۔ وہ جو کچھ کرے یہ سمجھ کر کرے کہ وہ خدا کے سامنے ایسا کر رہا ہے۔ اس کو دنیا سے زیادہ آخرت کی فکر ستانے لگے۔ جب آدمی اس طرح خدا پرست بنتا ہے تو اس کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ وہ ایک فرد کے معاملہ میں بے انصافی کرنے سے اس طرح ڈرتا ہے جیسے وہ ساری دنیا کے ساتھ بے انصافی کر رہا ہے۔ وہ مسلمانوں کے درمیان تخریب کا ایک واقعہ دیکھ کر اس طرح سہم جاتا ہے جیسے اس نے سارے مسلمانوں کو تہ تیغ کر دیا ہے۔ کسی شخص کے ساتھ ایک بار بدمعاملگی ہو تو وہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس کی تمام عبادات اور قربانیاں باطل ہو گئی ہیں ـــ لوگ خوش فہمیوں میں جی رہے ہیں۔ حالاں کہ یہ صرف حقائق ہیں جو آدمی کے کام آتے ہیں، خواہ دنیا کا معاملہ ہو یا آخرت کا معاملہ۔

۳ جون ۱۹۷۹ کو راقم الحروف میرٹھ میں تھا۔ شام کے وقت صدر بازار کی سڑک پر میں اور مولانا شکیل احمد قاسمی ایک ساتھ جا رہے تھے۔ اچانک ایک مکان کے آگے کا حصہ ہمارے سامنے گر پڑا۔ اینٹ اور پتھر سڑک پر ڈھیر ہو گئے۔ ہم دونوں بمشکل اس سے پانچ سکنڈ کی مسافت پر تھے۔ اگر ہم پانچ سکنڈ آگے ہوتے یا مکان پانچ سکنڈ بعد گرتا تو یقیناً ہم دونوں اس کی زد میں آجاتے۔ میں نے سوچا: آدمی اور اس کی موت کے درمیان صرف پانچ سکنڈ کا فاصلہ ہے۔ کسی بھی آدمی کے لئے ہر لمحہ یہ اندیشہ ہے کہ اس کا "پانچ سکنڈ" کا سفر پورا ہو جائے اور اچانک وہ اپنے آپ کو دوسری دنیا میں پائے۔

آدمی کے ذہن پر اگر یہ بات چھا جائے کہ اس کے اور موت کے درمیان صرف "پانچ سکنڈ" کا فاصلہ ہے تو اس کی دنیا بدل جائے۔ وہ بالکل دوسرے قسم کا انسان بن جائے۔ وہ دنیا میں رہتے ہوئے آخرت میں جینے لگے۔ زندگی کا راز یہ ہے کہ آدمی اس بات کو جان لے کہ وہ ہر وقت موت کے کنارے کھڑا ہوا ہے، ایسی موت جس کے مابعد آدمی، حدیث کے لفظوں میں، یا تو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ میں داخل ہو جاتا ہے یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھے میں جا گرتا ہے۔ آدمی کا ہر قدم اس کو دو انتہائی انجام میں سے کسی ایک انجام کے قریب پہنچا رہا ہے۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے





- **دین کیا ہے**
  صفحات ۳۲ قیمت ۵۰/۱ روپے
- **تجدید دین**
  صفحات ۴۸ قیمت ۲/- روپے
- **مذہب اور جدید چیلنج**
  صفحات ۲۲۴ قیمت ۱۳/۵۰ روپے
- **تعمیر ملت**
  صفحات ۴۸ قیمت ۲/- روپے
- **الاسلام**
  صفحات ۱۷۶ قیمت ۱۲/- روپے
- **اسلام دین فطرت**
  صفحات ۴۸ قیمت ۲/- روپے
- **ظہور اسلام**
  صفحات ۲۰۰ قیمت ۱۲/- روپے
- **زلزلۂ قیامت**
  صفحات ۶۴ قیمت ۳/- روپے
- **اسلامی دعوت**
  صفحات ۴۸ قیمت ۲/- روپے
- **تاریخ کا سبق**
  صفحات ۴۸ قیمت ۲/- روپے
- **عقلیات اسلام**
  صفحات ۴۸ قیمت ۲/- روپے
- **قرآن کا مطلوب انسان**
  صفحات ۸۰ قیمت ۴/۵۰ روپے
- **مذہب اور سائنس**
  صفحات ۷۲ قیمت ۴/-
- **پیغمبر اسلام**
  صفحات ۴۸ قیمت ۲/-
- **سبق آموز واقعات**
  صفحات ۴۸ قیمت ۲/-

مکتبہ الرسالہ جمعیتہ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶

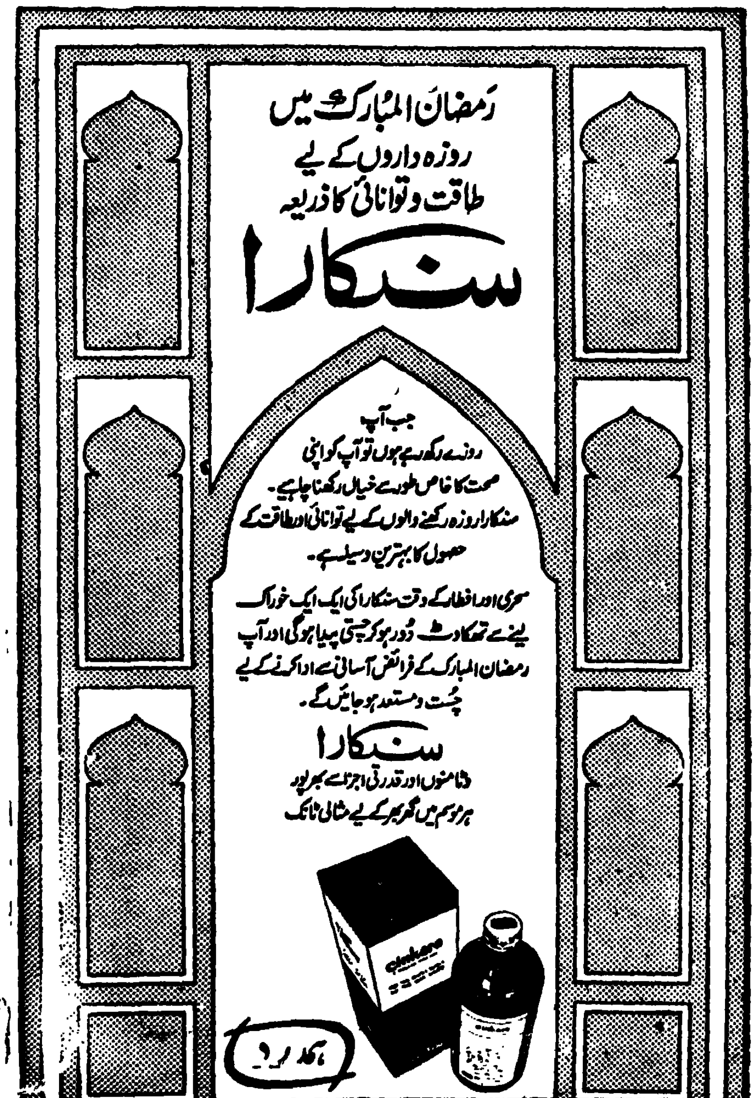

بھارت بھاگیہ ودھاتا
15 اگست 1947 کو ہم بھارت کے لوگ اپنے مقدر کے مالک۔ (بھارت بھاگیہ ودھاتا) خود بنے۔
آیئے آزادی کی 32 ویں سالگرہ پر آج :-
اپنی کامیابیوں سے قوت اور تحریک حاصل کریں۔
مستقبل کو بہتر بنانے کے لئے تازہ دم ہو کر کام کریں۔
آزادی کے 32 برسوں میں.....
ہم نے سب بیرونی حملوں کو پچھاڑ کر ملک کی سالمیت کی حفاظت کی ہے۔
ہماری متوقع اوسط عمر 32 سے بڑھ کر 52 سال ہو گئی ہے۔
ہم نے اناج کی پیداوار دوگنی سے بھی زیادہ بڑھائی ہے۔
ہماری صنعتی پیداوار میں چارگنا سے زیادہ اضافہ ہوا ہے۔
ہمارے بدیشی سکے کے ذخائر 5,000 کروڑ روپے سے زائد ہیں۔
"قوم بجا طور پر ناز کر سکتی ہے کہ ہماری معیشت جو جامد اور دوسروں کی دست نگر تھی جدید اور خود کفیل بن گئی ہے" یہ ہمارے رواں پانچسالہ منصوبے کے ڈرافٹ کا اقتباس ہے۔
آزادی اور خوشحالی کی خاطر اتحاد اور یکجہتی قائم رکھیں۔

Regd. D. (D 532
Regd. R.N. No. 28822/76
Issue No. XXXIIII

September 1979

Al-Risala Monthly

JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET, DELHI-110006



ثانی اثنین خان، پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی سے شائع کیا

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

شکست خواہ کتنی ہی بڑی ہو، ہمیشہ وقتی ہوتی ہے اور دوبارہ
زیادہ بہتر منصوبہ بندی کے ذریعہ اس کو فتح میں تبدیل کیا جاسکتا ہے

شمارہ ۳۵
اکتوبر ۱۹۷۹

زرتعاون سالانہ ۲۴ روپے
خصوصی تعاون سالانہ ایک سو روپے
بیرونی ممالک سے ۱۵ ڈالر امریکی

قیمت فی پرچہ
۲ دو روپے

شمارہ ۴۵ □ اکتوبر ۱۹۷۹

جمعیتہ بلڈنگ □ قاسم جان اسٹریٹ □ دہلی 110006

فہرست

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیتہ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

روس نے اپنے خلائی جہاز (Salyut 6) پر دو خلا باز ولادیمیر لیا خوف اور ویلری ریومین اوپر بھیجے۔ پروگرام کے مطابق ان کو تقریباً چھ ماہ تک خلا میں رہنا تھا۔ آخری ایام میں جب کہ وہ اپنے خلائی سفر کی مدت پوری کرکے اپنے وطن واپس آنے والے تھے، زمینی اسٹیشن سے بات کرنے والے نے ان سے پوچھا: آج کل آپ لوگوں کے احساسات کیا ہیں۔ ایک خلا باز نے خبر رساں ایجنسی اے پی کے مطابق، فوراً کہا:

> What are we dreaming about. Well, we want very much just to put our feet on the ground again.
>
> The Indian Express, August 16, 1979

ہم آجکل کیا خواب دیکھ رہے ہیں۔ ہاں، وہ یہ ہے کہ ہم بس یہ چاہتے ہیں کہ جلد سے جلد وہ وقت آئے جب کہ ہم زمین پر دوبارہ اپنا قدم رکھیں۔ یہ دونوں روسی خلا باز ۱۷۵ دن خلا میں چکر لگانے کے بعد زمین پر واپس آئے ہیں۔ تقریباً نصف سال تک بے وزنی کی حالت میں رہنے کے بعد وہ دونوں مدہوش اور سراسیمہ سے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کی نیند غائب ہوگئی ہے۔ خلا میں خوف و دہشت کی وجہ سے وہ بہت کم سو سکے تھے۔

زمین کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح بنایا ہے اور اس پر ہمارے لئے جو موافق حالات جمع کئے ہیں وہ ہمارے لئے بہت بڑی نعمت ہیں۔ ساری معلوم کائنات میں انسان جیسی مخلوق کے لئے کوئی بھی دوسرا ٹھکانا نہیں۔ اللہ کی اس عظیم نعمت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ آدمی زمین سے محروم کر دیا گیا ہو، ٹھیک ویسے ہی جیسے فاقہ گزرنے کے بعد آدمی صحیح طور پر جانتا ہے کہ کھانا آدمی کے لئے کیسی قیمتی چیز ہے۔

۱۸ اگست ۱۹۷۹ کی خبر ہے کہ چک مگلور سے ۳۰ کیلو میٹر کے فاصلہ پر ایک گاؤں میں جنگلی ہاتھیوں کا ایک ریوڑ گھس آیا اور چنگھاڑنے لگا۔ ان کی ہیبت ناک چنگھاڑ کو سن کر قصبہ کی تین عورتیں مر گئیں۔ بہت سے لوگ جو بچنے کے لئے بھاگ رہے تھے، راستہ میں ٹکرا کر زخمی ہو گئے۔

یہ ہاتھی کے چنگھاڑ کا حال ہے جو خدا کی ایک ادنیٰ مخلوق ہے۔ پھر اللہ رب العالمین کی چنگھاڑ کا حال کیا ہوگا جب وہ اپنے جلال کے ساتھ ظاہر ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی اگر اس آنے والے دن کو سوچ لے تو اس کی چلتی ہوئی زبان بند ہو جائے جس کے الفاظ کا ذخیرہ آج بظاہر ختم ہونے والا نظر نہیں آتا۔ اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ رک جائیں جس کو اخلاق اور انسانیت کا ہر وعظ روکنے میں ناکام ثابت ہو رہا ہے۔

خدا کی پکڑ سے نہ خوش خیالیاں بچا سکتی ہیں اور نہ تقریری مشاعرے

دنیوی چیزوں کو مقصود بنانے کا نام بے دینی اور آخرت کو مقصود بنانے کا نام دین ہے۔ عام قومیں دنیا کو دنیا کے نام پر کرتی ہیں۔ مسلمان کا بگاڑ یہ ہے کہ وہ دنیا کو دین کے نام پر کرنے لگے۔

مسلمانوں کا بگاڑ اس قسم کا کبھی نہیں ہوگا کہ وہ دین کا نام لینا چھوڑ دیں۔ ایسا بگاڑ نہ پچھلی امتوں میں کبھی ہوا اور نہ مسلمانوں میں کبھی ہونے والا ہے۔ مسلمانوں کا بگاڑ یہ ہے کہ وہ دنیا پرستی کی راہ پر چل پڑیں اور اس کو دین کا عنوان بتائیں — دین حقیقۃً آخرت رخی زندگی کا عنوان ہے نہ کہ دنیا رخی زندگی کا۔

مسلمانوں کا بگاڑ یہ ہے کہ وہ دین کو اپنی آل اولاد اور کاروبار میں برکت کا سستا آسمانی نسخہ سمجھنے لگیں۔ وہ دوسری قوموں کی طرح اپنے قومی اور معاشی مسائل پر ہنگامے کھڑے کریں اور اعلان کریں کہ ہم خیر امت کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ وہ سیاسی اکھیڑ پچھاڑ کی تحریکیں چلائیں اور دعویٰ کریں کہ وہ اس خدائی مشن کے لئے متحرک ہوئے ہیں جس کے لئے اللہ تعالےٰ نے اپنے پیغمبر دنیا میں بھیجے تھے۔

دوسری قومیں جو کام دنیاداری کے نام پر کر رہی ہیں، اسی کو مسلمان دین داری کے نام پر کرنے لگیں تو اس کی وجہ سے وہ کام دین کا کام نہیں بن جائے گا۔ دنیا کا فائدہ، دنیا کی عزت اور دنیا کے اقتدار کے پیچھے دوڑنا اور اپنی ان سرگرمیوں کو دینی الفاظ میں بیان کر کے اس کو دین کا کام ظاہر کرنا، مسلمانوں کو خدا کے یہاں کسی انعام کا مستحق نہیں بناتا۔ بلکہ ان کی ذمہ داریوں میں اضافہ کرتا ہے۔ اپنی اس قسم کی سرگرمیوں کے ذریعہ وہ دہرے مجرم بن رہے ہیں۔ ایک دنیا پرستی کو اختیار کرنا، دوسرے دینی تعلیمات کو غلط معنی پہنانا اور اس طرح اہل عالم کے سامنے دین کی غلط گواہی دینا۔

دین اصل میں خدا پرستی اور آخرت طلبی کا نام ہے۔ دین داری یہ ہے کہ آدمی کی زندگی آخرت رخی زندگی بن جائے۔ وہ جن حالات میں ہو اور جن ذمہ داریوں کے درمیان اپنے آپ کو پائے ان میں وہ خدا پرستی اور انصاف کے طریقہ پر قائم رہے۔ وہ ہمیشہ اللہ کو یاد رکھے۔ اور دنیا میں جو معاملہ کرے یہ سوچ کر کرے کہ بالآخر اس کو اپنی تمام کارروائیوں کے لئے اللہ کے سامنے جواب دینا ہے۔ کسی بھی قسم کی خوش اعتقادی ہم کو آخرت میں خدا کی پکڑ سے بچا نہیں سکتی اور نہ اسلام کے نام پر تقریری مشاعرے ہم کو خدا کے یہاں خادم اسلام کا مقام عطا کر سکتے ہیں۔

کیا وہ بدکے ہوئے جانور ہیں جو واپس آنا نہیں جانتے ــــــ

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ ۝ كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ۝ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ۝ بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَن يُؤْتَىٰ صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ۝ كَلَّا بَل لَّا يَخَافُونَ الْآخِرَةَ ۝ كَلَّا إِنَّهُ تَذْكِرَةٌ ۝ فَمَن شَاءَ ذَكَرَهُ ۝ (مدثر، آخر)

ان کو کیا ہوا کہ نصیحت سے منہ پھیرتے ہیں۔ جیسے کہ وہ بدکے ہوئے گدھے ہیں جو شور سن کر بھاگ کھڑے ہوئے ہیں۔ بلکہ ان میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ اس کو کھلے ہوئے ورق دے دئے جائیں۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ وہ آخرت سے نہیں ڈرتے۔ ہرگز نہیں، یہ تو یہ ایک نصیحت ہے۔ پھر جو چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے۔

اللہ اپنے دین کی پیغام بری کے لئے ہمیشہ ایسے شخص کو چنتا ہے جس کے جاننے والے اس کو ایک پسندیدہ شخص کی حیثیت سے جانتے ہوں۔ جس کی صلاحیت اور صالحیت کی وجہ سے اس کے لوگوں نے اس کے بارے میں اونچی اونچی امیدیں باندھ رکھی ہوں (ہود ۶۲) مگر جب وہ حق کی دعوت لے کر اٹھتا ہے تو اچانک لوگ اس سے بدک جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی دعوت بے آمیز حق کی دعوت ہوتی ہے اور بے آمیز حق انسان کے لئے ہمیشہ سب سے زیادہ مبغوض چیز رہا ہے۔ پیغمبر کی بے آمیز دعوت ان تمام لوگوں کو متوحش کر دیتی ہے جو ملاوٹی دین یا خود ساختہ مذہب کے اوپر اپنی زندگی کی تعمیر کئے ہوئے تھے۔

انسان کی گمراہی کبھی یہ نہیں رہی ہے کہ وہ ناحق کا علم بردار بن کر کھڑا ہوا ہو۔ انسان کی گمراہی یہ ہے کہ وہ حق کے ساتھ ناحق کو ملائے ہوئے ہو۔ وہ حق کا نام لے مگر اسی کے ساتھ اپنی عقیدتوں اور وفاداریوں کو اس نے ناحق کے لئے خاص کر رکھا ہو۔ پیغمبر کی بے آمیز دعوت اٹھتی ہے تو ہر ایک کو اس میں اپنا حقیقی چہرہ نظر آنے لگتا ہے۔ ہر ایک کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس کے اس نازک مقام پر ضرب لگا رہی ہے جہاں وہ حقیقۃً جی رہا تھا ـــــ کسی کو اپنی شخصیت کا بت گرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ کسی کو اپنے دلائل کا غبارہ ٹوٹتا ہوا نظر آتا ہے۔ کسی کو اپنی شان و شوکت بے رونق ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ کسی کو ایسا لگتا ہے کہ اگر اس نے اس حق کو مان لیا تو اس کو اپنے بنے بنائے ڈھانچہ کو اجاڑ دینا پڑے گا۔ ان وجوہ سے لوگ اس کی آواز سے اس طرح بدک جاتے ہیں جیسے کوئی تصویری شیر اچانک زندہ ہو کر کھڑا ہو جائے اور لوگ اس کے مہیب وجود کو دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوں۔

تاہم بدکے ہوئے لوگ اپنے کو برسرِ حق ثابت کرنے کے لئے طرح طرح کی باتیں نکالتے ہیں: سچائی کے اعلان کے لئے کیا اسی معمولی شخص کا انتخاب کیا جانا تھا، اس کے بجائے ان "اکابر" کا انتخاب کیوں نہ کیا گیا

جن کی کبریائی مسلم ہو چکی ہے۔ اگر یہ سچائی ہے تو وہ ایک ہی شخص پر کیوں اتری، ہم میں سے ہر شخص کے پاس خدا کا ایک کھلا خط کیوں نہ آگیا۔ وغیرہ۔ مگر یہ سب کوئی واقعی مطالبہ نہیں۔ اصل یہ ہے کہ حق اور ناحق کو جانتے کے معاملہ میں وہ سنجیدہ نہیں ہیں۔ ان کے حالات نے ان کو جس مذہب تک پہنچا دیا ہے، اس کو وہ پکڑے ہوئے ہیں۔ اپنے ذوق اور مزاج کے لحاظ سے انھوں نے ایک دین گھڑ لیا ہے اور کچھ ہم خیال لوگوں کو اپنے گرد جمع کر کے اس کے چیمپین بنے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے مفاد اور اپنی حیثیت کو باقی رکھنے کے معاملہ میں سنجیدہ ہیں اس لئے اس کے تقاضے وہ خوب سمجھ لیتے ہیں۔ اس کے برعکس حقیقی سچائی کے معاملہ میں وہ سنجیدہ نہیں، اس لئے روشن دلائل اور واضح تصدیقات کے باوجود وہ ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ دنیا کے اندیشہ کو وہ جس طرح محسوس کرتے ہیں اسی طرح وہ آخرت کے اندیشے کو محسوس کرتے تو صورت حال بالکل مختلف ہوتی۔

کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو فوراً نہیں بدکتے۔ وہ ابتداءً دعوت کو پسند کرتے ہیں۔ وہ داعی کے اعلیٰ اسلوب اور اس کے پیغام کی عمومی کشش کی وجہ سے اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ مگر وہ اپنی نفسیاتی کمزوریاں سے اوپر اٹھے ہوئے نہیں ہوتے۔ چنانچہ کوئی نہ کوئی وقت ایسا آجاتا ہے جب کہ وہ کسی چیز کو اپنے خلاف مزاج پاکر بدک جاتے ہیں اور پھر ایسا بھاگتے ہیں کہ واپسی کا نام نہیں لیتے۔ جب کبھی ان کے ان تعصبات پر زد پڑتی ہے جن کو انھوں نے عرصے سے پال رکھا ہے۔ جب ان کی چھپی ہوئی وفاداریوں میں سے کسی وفاداری کو ٹھیس پہنچ جاتی ہے۔ جب دعوت ان کی اس "انا" کو چھو دیتی ہے جس کو وہ خدا پرستی کے ظاہری پردہ کے پیچھے چھپائے ہوئے تھے تو اچانک وہ متوحش ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے اوپر نظر ثانی کرنے کے بجائے خود دعوت کو قابل نظر ثانی سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ کسی شخص کی زندگی میں بہت نازک لمحہ ہوتا ہے۔ اگر اس کی فطرت زندہ ہے تو وہ نعرہ کرے گی اور ابتدائی توحش کے بعد دوبارہ وہ حق کی رسی کو پہلے کی طرح مضبوطی سے پکڑنے لگا اور اگر فطرت کی چنگاری بجھ چکی ہے تو وہ ایک بار بدکنے کے بعد بدکتا ہی جائے گا اور پھر کبھی واپس نہیں ہوگا۔

اللہ نے یہ دنیا امتحان کے لئے بنائی ہے۔ اس لئے حق کو یہاں بالکل عریاں شکل میں پیش نہیں کیا جاتا بلکہ اس پر شبہ کا پردہ رکھ کر اس کو پیش کیا جاتا ہے۔ وہ ایسے شخص کی زبان سے بلند ہوتا ہے جو خود انھیں جیسا ایک انسان ہوتا ہے۔ پیغام کو انسانی زبان میں بیان کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے ہمیشہ یہ امکان رہتا ہے کہ آدمی اس کو رد کرنے کے لئے کچھ خوبصورت الفاظ تراش لے۔ اس آواز کو ہمیشہ ظاہری حیثیت سے غیر اہم حلقوں سے اٹھایا جاتا ہے تاکہ یہ جانچا جا سکے کہ آدمی معنوی حقیقتوں کو اہمیت دیتا ہے یا ظاہری تماشوں کو۔ حق کا پیغام ایک نصیحت ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ نصیحت ہی کی زبان میں سامنے لایا جاتا ہے نہ کہ کسی مجبور کر دینے والے اسلوب میں۔ بہت سے دلائل محض غافل قلب سے نکلے ہوئے بے معنی الفاظ ہوتے ہیں نہ کہ حقیقۃً دلائل۔ جو آخرت سے ڈرنے والے ہیں وہ اس احساس کے تحت بولتے ہیں کہ ان کی ہر بات کا سننے والا سب سے پہلے خدا ہے۔ وہ الفاظ رکھتے ہوئے بھی بے الفاظ ہو جاتے ہیں۔ کجا کہ اپنی ظالمانہ روش کو درست ثابت کرنے کے لئے الفاظ کا قاموس دہرانے لگیں۔

سابق صدر امریکہ جان ایف کنیڈی نے ایک بار لاوٹے (Lyautay) کا حوالہ دیتے ہوئے اس کا اپنا ایک قصہ نقل کیا تھا۔ اس کے الفاظ یہ تھے:

> (I) once asked (my) gardener to plant a tree. The gardener objected that the tree was slow growing and would not reach the maturity for a hundred years. (I) replied : "In case there is no time to loose, plant it in the afternoon..............."
>
> Chartered Accountant (Supplement)
> New Delhi, June 1979

میں نے ایک بار اپنے باغبان سے ایک درخت کا پودا لگانے کے لئے کہا۔ باغبان نے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ یہ درخت بہت دھیرے دھیرے بڑھتا ہے اور اس کو پورا درخت بننے میں ایک سو سال لگ جائیں گے۔ میں نے جواب دیا: ایسی حالت میں تو ہم کو بالکل وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ تم آج ہی دوپہر بعد اس کا پودا لگا دو۔

اسلام کا احیاء اور ملت کی تعمیر ایک طویل المدت منصوبہ ہے۔ فرداً اور اجتماع کی سطح پر بے شمار اسباب فراہم کرنے کے بعد وہ وقت آتا ہے جب کہ اسلام اپنی پوری شان کے ساتھ زندہ ہو اور ملت ایک طاقتور قوم کی حیثیت سے زمین پر اپنی جگہ حاصل کرے۔ مگر جب اس قسم کا منصوبہ پیش کیا جاتا ہے تو کہنے والے فوراً کہہ دیتے ہیں: یہ تو بڑا لمبا منصوبہ ہے۔ اس کو پورا ہونے میں سو سال لگ جائیں گے۔ ایسے لوگوں کو ہمارا جواب صرف ایک ہے: جب ایسا ہے تو ہمیں ایک لمحہ کے لئے بھی اپنا وقت کھونا نہیں چاہئے۔ ہم کو چاہئے کہ ہم آج ہی پہلی فرصت میں اپنا "درخت" نصب کر دیں۔

ایک طاقتور درخت ہمیشہ "سو سال" ہی میں تیار ہوتا ہے۔ اس لئے جو شخص طاقتور درخت کا مالک بننا چاہتا ہو اس کے لئے سو سالہ باغبانی کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اگر وہ ایسا کرنے کے بجائے سڑکوں پر نکل کر "درخت ستیہ گرہ" شروع کر دے۔ یا کسی میدان میں جمع ہو کر "باغ اسلام زندہ باد" کے نعرے لگانے لگے تو یہ ایک احمقانہ حرکت ہوگی جس سے نہ کوئی درخت اگے گا اور نہ وہ باغ والا بنے گا۔ اس کا واحد انجام صرف یہ ہے کہ وہ اس وقت کو مزید ضائع کر دے جو درخت اگانے کے لئے اس کو قدرت کی طرف سے حاصل تھا۔ آپ کے پاس مکان نہ ہو اور آپ سڑک پر کھڑے ہو کر پھلجھڑی چھوڑنے لگیں تو اس سے آپ شہر میں ایک مکان کے مالک نہیں بن جائیں گے۔ اسی طرح ملت کا نام لے کر کچھ لوگ سیاسی شعبدہ بازی کرنے لگیں تو اس قسم کے شعبدوں سے ایسا نہیں ہو سکتا کہ زمین پر ملت کا قلعہ کھڑا ہو جائے۔ اشعار کی دنیا میں صرف تک بندیوں کے ذریعہ بڑے بڑے انقلاب لائے جا سکتے ہیں۔ ایک خطیب اپنے پرجوش الفاظ کے ذریعہ آناً فاناً ایک پنڈال کو شاندار کامیابیوں کے آسمان پر پہنچا سکتا ہے۔ مگر ایک حقیقی واقعہ کو ظہور میں لانا ایسا صبر آزما کام ہے جو طویل منصوبہ بندی اور مسلسل جد و جہد کے بغیر ممکن نہیں۔

آخری سین کا انتظار کیجئے

قدیم یونان میں جو ڈرامے لکھے گئے، وہ اکثر پانچ ایکٹ (باب) پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اور ان کا ایک کردار کوئی ظالم اور سفاک آدمی ہوتا ہے۔ ایک شخص ایک ڈرامے کو پڑھ رہا ہے۔ اس نے تین ایکٹ ختم کرلئے۔ وہ دیکھتا ہے کہ ظالم اپنے سارے ظلم کے باوجود کامیاب ہوتا جارہا ہے۔ وہ گھبرا اٹھتا ہے۔ مگر جو شخص ڈرامے کی پوری کہانی جانتا تھا، اس نے کہا:

WAIT FOR THE LAST ACT

آخری ایکٹ (باب) کا انتظار کرو ــــ چنانچہ پڑھنے والا جب آخری ایکٹ پر پہنچتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ حالات ظالم کے خلاف ہوگئے۔ اور اس کا خاتمہ بالآخر اسی برے حال میں ہوا جو انسان کا ضمیر ایک ظالم انسان کے لئے چاہتا تھا۔

یہی بات اس طویل تر کہانی کے لئے بھی صحیح ہے جو زمین پر دہرائی جارہی ہے۔ جن لوگوں کے اندر اخلاقی احساس زندہ ہے، وہ زمین کے حالات کو دیکھ کر تڑپ اٹھتے ہیں ــــ یہاں استحصال کرنے والے پھلتے پھولتے ہیں۔ یہاں بے انصافی کرنے والے انصاف اور انسانیت کا کریڈٹ لے رہے ہیں، یہاں ظاہر دار اور مصلحت پرست کامیابی کے منازل طے کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہاں آدمی اپنی ہر بیہودگی کو جائز ثابت کرنے کے لئے شاندار الفاظ پالیتا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ کہہ اٹھتے ہیں: "یہ دنیا کیا ظالموں اور بے انصافوں کے لئے بنائی گئی ہے"۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ــ ڈرامے کے آخری سین کا انتظار کیجئے۔ دنیا آج جیسی کچھ بھی نظر آتی ہو مگر اس کا خاتمہ یقیناً کامل انصاف پر ہوگا۔ اور اس وقت کے آنے میں زیادہ دیر نہیں۔

آدمی بدل جاتا ہے

ترکی کے ابتدائی سلاطین بہت سادہ زندگی گزارتے تھے۔ حتیٰ کہ دربار میں بھی کسی غیر معمولی اہتمام کے بغیر بیٹھتے تھے۔ سلطان محمد ثانی (۱۴۵۱-۱۴۸۱) جو فتح قسطنطنیہ کے عظیم کارنامہ کی وجہ سے سلطان محمد فاتح کے نام سے مشہور ہوا، ایک بار اپنے وزیروں کے ساتھ مجلس میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس اثنا میں ایک کسان کچھ فریاد لے کر حاضر ہوا۔ یکساں قسم کے لوگوں کے درمیان وہ سمجھ نہ سکا کہ وہ کس سے مخاطب ہو۔ اس نے کہا: "تم میں سے سلطان کون ہے" یہ واقعہ سلطان پر شاق گزرا۔ اس کے بعد اس نے مجلس وزرار میں بیٹھنا بند کردیا۔ وہ دریچہ کے پیچھے بیٹھ کر اپنے وزیروں کی بحثیں سننے لگا۔ بعد میں یہ اصول بھی برقرار نہ رہ سکا۔ سلیمان اعظم (۱۵۲۰-۱۵۶۶) کے دور سے سلاطین ترکی نے مجلس وزرار میں شرکت بالکل بند کردی۔ اس کے بعد یہ ہونے لگا کہ صدر اعظم مجلس وزرار کے فیصلے کو سلطان تک پہنچا دیتا اور پھر سلطان اپنا حکم سنا دیتا جو آخری ہوتا ــــــ آدمی بظاہر اچھا ہوتا ہے مگر جب کوئی جھٹکا پڑتا ہے تو وہ بدل کر دوسرا انسان بن جاتا ہے۔

آنے والا طوفان

۱۱ اگست ۱۹۷۹ کو موروی (گجرات) میں اچانک ایک سیلاب آیا جس نے پوری بستی کو تہس نہس کر دیا۔ بستی کے کنارے ایک بڑا بند تھا۔ غیر معمولی بارش سے اس کا پانی بہت اونچا ہو گیا۔ یہاں تک کہ اس نے بند کو توڑ ڈالا۔ ایک مشاہد کے الفاظ میں "تقریباً ۲۰ فٹ اونچی پانی کی دیوار" اتنی تیزی کے ساتھ بستی کے اندر داخل ہوئی کہ کوئی اس سے بچ نہ سکتا تھا۔ چند گھنٹوں کے اندر پانی کا یہ طوفان بستی کی تمام چیزوں کو برباد کر کے نکل گیا۔ اندازہ ہے کہ تقریباً ۲۵ ہزار آدمی اس اچانک سیلاب میں مر گئے۔ جب کہ بستی کی کل آبادی تقریباً ۴۰ ہزار تھی۔ بربادی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ دیگر چندوں کے علاوہ صرف مرکزی حکومت نے فوری امداد کے طور پر پانچ کرور روپے حکومت گجرات کو دئے ہیں۔

ایک انگریزی اخبار کے نامہ نگار ارن کمار نے جو چشم دید رپورٹ (ہندستان ٹائمس ۱۹ اگست ۱۹۷۹) شائع کی ہے اس میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ بچے ہیں ان میں سے ہر شخص کے پاس بتانے کے لئے ایک پُر درد کہانی ہے۔ ان کو جو صدمہ اور تکلیف پہنچی ہے اس کے احساس سے وہ ابھی تک نکل نہیں سکے ہیں۔ کچھ کا حال یہ ہے کہ انھوں نے اپنی گویائی کھو دی ہے۔ وہ بالکل سراسیمہ اور ہکا بکا دکھائی دیتے ہیں:

Some have lost their speech and look absolutely dazed and blank.

ایک اور خبر میں بتایا گیا ہے کہ ایک تباہ حال زمیں دار کو اس وقت حیرت ناک خوشی ہوئی جب سرکاری ذمے داروں نے اس کو ۱۰۸ ہزار روپے نقد اور ۲۲۵ گرام سونے کے زیورات یہ کہہ کر دئے کہ یہ تمھارے گھر کے اندر سے دستیاب ہوئے ہیں (ہندستان ٹائمس ۲۰ اگست ۱۹۷۹)

اس طرح کے واقعات جو زمین پر روزانہ ہوتے رہتے ہیں، وہ اس لئے ہوتے ہیں تاکہ آدمی آخرت کے دن کو یاد کرے۔ آخرت کا عظیم تر سیلاب بھی بالکل اچانک آئے گا۔ بہت سے لوگ اس دن اس طرح برباد ہوں گے کہ ان کے الفاظ کے ذخیرے تک ختم ہو جائیں گے جو دنیا میں ہر آدمی کو نہایت وافر مقدار میں حاصل ہیں۔ ان کی چلتی ہوئی زبانیں بند ہو جائیں گی۔ وہ سراسیمہ نظروں سے اپنی ہولناک بربادی کو دیکھیں گے اور کچھ بول نہ سکیں گے۔ دوسری طرف کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کو یہ خوش خبری دی جائے گی کہ ہلاکت اور بربادی کے عمومی طوفان نے تم کو کچھ نقصان نہیں پہنچایا۔ تمھارا بہترین اثاثہ اللہ کے مزید انعام کے ساتھ آج تمھارے حوالے کیا جائے گا۔ ایک ہی سیلاب کچھ لوگوں کو جہنم میں دھکیل دے گا اور کچھ لوگوں کے لئے وہ جنت کی ابدی خوشیوں میں داخلہ کا دن بن جائے گا۔ "سیلاب" سے پہلے آدمی کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی ہر ظالمانہ روش کو درست ثابت کرنے کے لئے شان دار الفاظ پا لیتا ہے۔ مگر "سیلاب" کی ہولناکی کو دیکھتے ہی اس کا سارا زور ختم ہو جائے گا اور ایسا معلوم ہوگا گویا اس کے پاس الفاظ ہی نہیں ہیں جن سے وہ اپنی روش کی صفائی پیش کر سکے۔

آسانی ہمیشہ مشکلوں کے بعد آتی ہے

گرمیوں کے موسم میں گرد و غبار سے بھری ہوئی آندھی جب اٹھتی ہے تو بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مصیبت کے سوا اور کچھ نہیں۔ مگر روس کے ماہرین موسمیات نے قراقرم کے ریگستانوں میں تحقیقات کے بعد بتایا ہے کہ گرد بھری ہوئی آندھیاں زمین پر موسم کی سختی کو کنٹرول کرنے کا ایک قدرتی ذریعہ ہیں۔ جب آندھیاں چلتی ہیں تو ان کی وجہ سے گرد اٹھ کر اوپر چھا جاتی ہے اور فضا میں ایک غلاف کی صورت بنا لیتی ہے۔ اس طرح یہ آندھیاں زمین کی سطح کو گرمی کی تپش سے محفوظ رکھتی ہیں۔ روسی سائنس دانوں نے مختلف آلات اور جہازوں کا استعمال کر کے آندھیوں کی خصوصیات کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ سخت گرمی کے دنوں میں بھی ریگستان کی تپتی ہوئی سطح اس وقت ٹھنڈی ہو جاتی ہے جب گرد سے بھری ہوئی آندھیاں چلنا شروع ہوتی ہیں۔ گرد کے یہ سایہ دار بادل محدود فضا میں بھی چھا سکتے ہیں اور کافی دور تک بھی، جیسے عرب سے جنوبی امریکا تک اور وسط ایشیا سے بحر آرکٹک تک۔

قدرت کا نظام کچھ اس طرح بنا ہے کہ ہر مفید واقعہ کسی پُرمشقت عمل کے بعد ظہور میں آتا ہے۔ یہ ایک سبق ہے جو بتاتا ہے کہ ہم جب اپنی زندگی کے بارے میں کوئی منصوبہ بنائیں تو اس حقیقت کو بھی ضرور سامنے رکھیں کہ مطلوبہ نتیجہ کو حاصل کرنے کے لئے ہم کو جد و جہد کے پُرمشقت دور سے گزرنا ہوگا۔ موجودہ دنیا کو اس کے بنانے والے نے اسی ڈھنگ پر بنایا ہے۔ اور اس سے مطابقت کر کے ہی ہم کوئی مفید نتیجہ برآمد کر سکتے ہیں۔ اگر ہم یہ چاہیں کہ ہم کو "آندھی" کی تکلیف نہ اٹھانی پڑے اور اس کے بغیر ہی ہمارے سروں پر ٹھنڈا بادل سایہ کرے تو ایسے نتیجہ کو پانے کے لئے ہمیں دوسری کائنات بنانی پڑے گی۔

وہ بڑھاپے کی منزل میں تھا۔ مگر اس نے شادی نہیں کی تھی، اس لئے کہ اس کو ایک آئیڈیل رفیقۂ حیات کی تلاش تھی۔ لوگوں نے پوچھا: کیا آپ کو زندگی بھر کوئی ایسی خاتون نہیں ملی جو آئیڈیل رفیقۂ حیات بن سکتی ہو۔ اس نے جواب دیا: ایک خاتون ایسی ملی تھی مگر مشکل یہ تھی کہ وہ بھی اپنے لئے ایک آئیڈیل شوہر تلاش کر رہی تھی — اور بدقسمتی سے میں اس کے معیار پر پورا نہ اتر سکا۔

لوگ عام طور پر دوسروں کی کمیوں کو جاننے کے ماہر ہوتے ہیں اس لئے ان کا کسی سے نباہ نہیں ہوتا۔ اگر آدمی اپنی کمیوں کو جان لے تو اس کو معلوم ہو کہ وہ بھی اسی بشری مقام پر ہے جہاں وہ دوسرے کو کھڑا ہوا پاتا ہے۔ اپنی کمیوں کا احساس آدمی کے اندر تواضع اور اتحاد کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ صرف دوسروں کی کمیوں کو جانتا ہو تو اس کے اندر گھمنڈ پیدا ہوگا اور کسی سے نباہ کرنا اس کے لئے مشکل ہو جائے گا۔

اللہ کے ذکر سے ان کے دل دہل جاتے ہیں

انما المومنون الذین اذا ذکر اللہ وجلت قلوبھم واذا تلیت علیھم اٰیٰتہ زادتھم ایماناً وعلیٰ ربھم یتوکلون (انفال ۲)

ایمان والے وہی ہیں کہ جب اللہ کا نام آئے تو ان کے دل ڈر جائیں اور جب اللہ کا کلام ان کو سنایا جائے تو ان کا ایمان زیادہ ہو جائے اور وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں

یہ آیت ہجرت کے دوسرے سال جنگ بدر کے بعد اتری ہے۔ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ بدر کی فتح کے بعد جو مال غنیمت ملا تھا اس کی تقسیم کے سوال پر مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہو گیا ——— یہ مال اسلامی حکومت کا ہے یا لشکریوں کا۔ اس میں مہاجرین کا زیادہ حصہ ہے یا انصار کا۔ رسول اللہؐ کی حفاظت کرنے والوں کو زیادہ ملنا چاہیے یا دشمن کا پیچھا کرنے والوں کو۔ وغیرہ۔ اس قسم کی اختلافی بحثیں جاری تھیں کہ یہ آیت اتری۔

جب بھی باہمی معاملات پیش آتے ہیں تو لوگوں کو ایک دوسرے سے شکایت اور اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک شخص معاملہ کو اپنے ذہن سے دیکھتا ہے اور دوسرا اپنے ذہن سے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں میں ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ جیسے جیسے بات بڑھتی ہے، مسئلہ کو غیر جانب دارانہ انداز سے دیکھنے کا مزاج ختم ہوتا چلا جاتا ہے۔ اولاً اگر اصولی اختلاف تھا تو آخری مرحلہ میں وہ ضد، عصبیت، نفرت اور انانیت کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ مومن وہ ہے جو شیطان کی طرف سے اس قسم کی فضا پیدا کئے جانے کے باوجود اصلاح حال کے لئے تیار رہے۔ مومن کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک شخص سے وقتی تاثر کے تحت جھگڑ اٹھتا ہے۔ اس کے بعد جب اس کو خدا کی یاد دلائی جاتی ہے تو اچانک اس کا دل دہل جاتا ہے۔ وہ شخص جو ایک "انسان" کے مقابلہ میں اپنے کو قوی محسوس کر کے اس کو دبانے پر تلا ہوا تھا، خدا کی عظمتوں اور قوتوں کو سوچ کر سہم جاتا ہے۔ اب اس کا سر جھک جاتا ہے۔ اس کے الفاظ کے ذخیرے ختم ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے دلائل کو بھولنے لگتا ہے۔ جو شخص ایک لمحہ پہلے تک اپنے حق پر زور دے رہا تھا، اب اس کو صرف اپنی ذمہ داریاں یاد رہ جاتی ہیں۔ اس سے جب کہا جاتا ہے کہ خدا سے ڈر اور خدا کی زمین میں متکبر نہ بن، تو اس کو فوراً محسوس ہو جاتا ہے کہ فی الواقع بڑائی صرف ایک اللہ کے لئے ہے۔ اس کے سوا جتنے ہیں سب چھوٹے ہیں۔ اس کا دل پکار اٹھتا ہے کہ کہنے والے نے صحیح کہا۔ میرے لئے تواضع کے سوا کوئی دوسرا رویہ درست نہیں۔ حق و انصاف پر قائم رہنے میں دنیوی نقصانات کا خطرہ سامنے آتا ہے یا اپنی ساکھ گرتی ہوئی نظر آتی ہے تو اللہ کی مدد کا یقین اس کے اندر نیا عزم پیدا کر دیتا ہے۔ وہ تمام مصالح کو اس بھروسہ پر نظر انداز کر دیتا ہے کہ اس کا خدا اس کی مدد کرے گا، اس کا خدا اس کو بے عزت ہونے سے بچائے گا۔

اللہ کی آیتوں کو سن کر ایمان بڑھ جانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی آیت جو حکم دے رہی ہے اسی میں اس کو زندگی کا راز دکھائی دینے لگتا ہے۔ ایک بظاہر مصلحت کے خلاف بات خدا کی طرف منسوب ہونے کے بعد

عین مصلحت نظر آتی ہے، ایک بظاہر نقصان کا طریقہ خدا کا حکم بننے کے بعد عین فائدہ کی چیز معلوم ہوتا ہے۔ ایک بظاہر نفس پر شاق گزرنے والا معاملہ خدا کی مرضی کا درجہ پانے کے بعد عین مطلوب چیز بن جاتا ہے۔ وہ دنیوی بھروسوں کو نظر انداز کرکے خدا کے بھروسہ پر چل پڑتا ہے۔ وہ ظاہری مصالح سے بے پروا ہو کر اپنے آپ کو خدا کے حوالے کر دیتا ہے۔

ایمان کا مطلب ہے کسی چیز کو ماننا، اس کا یقین کرنا۔ اگر آپ کے سامنے ایک پنسل پڑی ہو اور آپ اس کو دیکھ کر کہیں کہ یہ پنسل ہے، تو گویا کہ آپ نے پنسل کے وجود کا اقرار کیا۔ مگر پنسل کی موجودگی کا اقرار آپ کے دل کے اندر کوئی ہل چل نہیں پیدا کرے گا۔ آپ "یہ پنسل ہے" کہہ کر بھی ویسے ہی رہیں گے جیسے آپ اس کے کہنے سے پہلے تھے۔ لیکن اگر آپ کے کمرہ میں اچانک ایک بڑا سانپ نکل آئے اور آپ اس کو دیکھ کر کہیں کہ "یہ سانپ ہے" تو یہ دوسرا جملہ بھی اگرچہ محض اقرار کا جملہ ہے، مگر یہ آپ کے تمام شعور کو متحرک کر دے گا اور آپ کی شخصیت کو ہلا دے گا۔ کیوں کہ پنسل ایک بے ضرر لکڑی ہے۔ جب کہ سانپ ایک خوفناک جانور ہے اور آپ کی ذرا سی غفلت بھی آپ کو اس کا شکار بنا سکتی ہے۔

"ایمان" بظاہر منھ سے کچھ الفاظ بولنے کا نام ہے۔ مگر ایمان کا تعلق جس چیز سے ہو اس کی مناسبت سے دل میں اثر پیدا ہونا ضروری ہے۔ جب آپ یہ کہتے ہیں کہ میں نے خدا کے وجود کا اقرار کیا، میں اس پر ایمان لایا، تو آپ تمام طاقتوں سے زیادہ بڑی طاقت کا اقرار کر رہے ہوتے ہیں۔ آپ اس مالک کائنات کو جاننے اور ماننے کا اعلان کر رہے ہوتے ہیں جس کا انعام بھی بہت بڑا ہے اور جس کی سزا بھی بے حد سخت ہے، ایسے خدا کا اقرار، اگر وہ فی الواقع اقرار ہو، تو آپ کی پوری شخصیت کو ہلا دے گا۔ اس کا نام سن کر آپ کا دل دہل اٹھے گا۔ اس کے کلام کے آگے آپ ڈھ جائیں گے۔

مذکورہ آیت مال غنیمت کا حکم بیان کرنے کے ذیل میں اتری ہے۔ مسئلہ یہ تھا کہ مال غنیمت میں کس کا کتنا حصہ ہے۔ مگر اس کا حکم بتلانے سے پہلے کہا جاتا ہے کہ — "اللہ سے ڈرو" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرہ یا اسلامی نظام قائم ہونے کا انحصار سب سے زیادہ کس چیز پر ہے۔ وہ اس پر ہے کہ معاشرہ میں ایسے لوگ بڑی تعداد میں پیدا ہو جائیں جو اللہ سے ڈرنے والے ہوں۔ اگر لوگوں کے اندر اللہ کا ڈر سمایا ہوا نہ ہو تو کسی قسم کا قانونی نفاذ یا کوئی بھی سیاسی یا غیر سیاسی تدبیر معاشرہ کے اندر اسلامی نظام برپا کرنے کی ضامن نہیں ہو سکتی۔

اگر آپ مینڈکوں کی پنسیری بنانا چاہیں تو وہ کبھی نہیں بنے گی۔ کیوں کہ آپ چند مینڈک پکڑ کر ترازو کے پلہ میں رکھیں گے تو دوسرے چند مینڈک پھدک کر باہر جا چکے ہوں گے۔ یہی حال انسان کا ہے۔ انسان ایک بے حد سرکش مخلوق ہے جو کسی طرح اپنے کو قابو میں آنے نہیں دیتا۔ جو بھی خارجی تدبیر اس کو قابو میں لانے کی کی جاتی ہے اس سے وہ کسی نہ کسی طرح نکل بھاگتا ہے۔ آدمی کو قابو میں لانے والی واحد چیز یہ ہے کہ وہ اللہ سے ڈرتا ہو، اس کو یہ اندیشہ لگا ہوا ہو کہ اگر اس نے بے انصافی کی تو موت کے بعد خدا کا عذاب اس کو پکڑ لے گا۔

■ دشمن اچنبھے میں پڑ گیا

غزوۂ خندق (۵ ھ) کے موقع پر مشرکین کی ۱۰ ہزار فوج نے ابوسفیان کی سرداری میں مدینہ پر چڑھائی کی تھی۔ جب وہ لوگ مدینہ کے قریب پہنچے اور وہاں شہر کے کنارے گہری خندق کھدی ہوئی دیکھی تو ابوسفیان نے کہا:
واللہ ان ھذہ لمکیدۃ ما کانت العرب تکیدھا خدا کی قسم یہ ایک ایسی تدبیر ہے جیسی تدبیر کرنا ابھی تک عرب نہ جانتے تھے۔

گویا اس زمانہ کے مسلمان تدبیر اور طریق عمل میں اتنا زیادہ آگے تھے کہ ان کے مخالفین ان کی تدبیروں کو دیکھ کر پکار اٹھتے تھے: ہم تو ابھی تک ایسی تدبیروں سے واقف بھی نہ تھے۔

■ جو آگے تھا وہ پیچھے ہوگیا

فرانسیسی مورخ والٹیر نے لکھا ہے کہ پہلی گھڑی جس سے یورپ واقف ہوا وہ مسلم خلیفہ ہارون الرشید کی گھڑی تھی جو اس نے ۸۰۷ء میں بطور تحفہ فرانس کے بادشاہ شارلیمان کو بھیجی۔ یورپ کے لئے وہ اس زمانہ میں بالکل نئی چیز تھی۔ دربار کے لوگوں نے جب اس کو دیکھا تو وہ حیران ہو کر رہ گئے۔ مگر سترھویں صدی میں جب مشینی دور شروع ہوا اور اسپرنگ کلاک وجود میں آیا تو اس کا موجد یورپ تھا۔ اب صورت حال بالکل بدلی ہوئی تھی۔ یورپ کے تاجر اسپرنگ دار گھڑیاں یورپ سے لے آتے اور ہندوستان کے مغل شہزادے ان کو شوق کے ساتھ خریدتے اور کثرت سے استعمال کرتے۔ یورپ کے حکمرانوں نے بغداد کے مسلم کاریگروں کی بنائی ہوئی گھڑیوں کو نہ صرف حیرت کے ساتھ لیا بلکہ ان کو سمجھ کر ان کو ترقی دینے کی کوشش میں لگ گئے۔ اس کے برعکس مغل حکمرانوں نے کبھی یہ سمجھنے کی کوشش نہ کی کہ اسپرنگ کلاک کیا چیز ہے۔ وہ صرف اتنا ہی جانتے تھے کہ یورپی تاجروں کے ذریعہ ان کو مہنگے داموں خرید لیں یا بطور تحفہ وصول کر کے ان کو اپنے محل کی زینت بنائیں۔

■ تاریخ جو انقلاب نہ بن سکی

میں اپنے ایک رفیق کے ساتھ دہلی کے لال قلعہ کے پاس پارک میں بیٹھا ہوا تھا۔ ہمارے ایک طرف شاہجہاں (۱۵۹۲ — ۱۶۶۶) کا تعمیر کردہ قلعہ اپنی سرخ دیواروں کے ساتھ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ دوسری طرف جامع مسجد کی سرخ عمارت کھڑی ہوئی تھی۔ ان دونوں کے درمیان وسیع دو طرفہ سڑک پر ٹریفک کا طوفان برپا تھا۔ "یہاں تاریخ سرخ پتھروں میں ڈھل گئی ہے" میری زبان سے نکلا۔ میں ابھی دوسرا جملہ سوچ رہا تھا کہ سامنے کی مصروف سڑک پر دوڑتی ہوئی مشینی سواریوں نے اپنی پرشور زبان میں اس کو پورا کر دیا: "مگر یہ تاریخ متحرک انقلاب کی صورت اختیار نہ کر سکی"۔ اور میں نے دیکھا کہ دوڑتی ہوئی سواریوں کے کنارے سرخ پتھروں کی کھڑی ہوئی عمارتیں خاموش زبان سے اس کا اقرار کر رہی ہیں۔

اصل وجہ: شکایت پر ایکشن نہ لینا

ہندستان کی سپریم کورٹ کے جج مسٹر جسٹس وی۔ آر۔ کرشنا ائر اور مسٹر جسٹس پی۔ این سنگھل نے حال میں قتل کے ایک مقدمہ میں اپیل پر اپنا فیصلہ دیا ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے دہلی پولس پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے فیصلہ میں لکھا ہے:

> One blackguardly policeman is worse than ten notorious criminals. — When the agencies of law entrusted with the high duty of prevention of crime, protection of victims, and tracking down of violent offenders themselves became a party to the plot and betray the public, the rule of law hangs limp and the people stand scandalised.
>
> The Hindustand Times, August 15, 1979

ایک شریر سپاہی دس بدنام مجرموں سے زیادہ تباہ کن ہے۔ قانون کے ادارے جن کو جرم روکنے، ستم زدہ کی حفاظت کرنے اور ظالموں کو پکڑنے کی عظیم ذمہ داری سونپی جاتی ہے، وہ خود مجرمانہ سازش میں ایک فریق بن جائیں اور عوام سے غداری کریں تو قانون کی حکومت بے اثر ہو جاتی ہے اور عوام ذلیل و رسوا ہو کر رہ جاتے ہیں۔

پولس اور انتظامیہ کی نااہلی کے بارے میں اس قسم کے تبصرے بار بار اعلیٰ شخصیتوں کی طرف سے آتے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود انتظامی خرابیوں کی اصلاح کیوں نہیں ہوتی۔ اس کا جواب معلوم کرنا نہایت آسان ہے۔ بدعنوانی کے واقعات، جو روزانہ اور ہر جگہ ہوتے رہتے ہیں، ان میں سے کسی واقعہ کو لے کر آپ متعلقہ افسر یا وزیر محکمہ کے پاس جائیں۔ بار بار دوڑنے کے باوجود آپ کی کوشش بالکل بے نتیجہ رہے گی۔ اس وقت آپ جان لیں گے کہ صورت حال کی اصلاح نہ ہونے کی وجہ صرف ایک ہے: اعلیٰ ذمہ داروں کا معاملات پر کوئی کارروائی نہ کرنا۔ شکایتوں پر اگر فوراً کارروائی کی جانے لگے تو چند دن میں جرائم کا خاتمہ ہو جائے۔

ایک تاثر

اللہ کی زمین پر شاید کوئی اللہ کا پرستار نہیں رہا۔ ہر ایک نے اپنے سینہ میں کوئی نہ کوئی بت چھپا رکھا ہے۔ ہر ایک کسی نہ کسی غیر اللہ کی عقیدت و محبت میں مبتلا ہے۔ وہ اسی وقت تک خدا پرست نظر آتا ہے جب تک اس کی نازک نفسیات کو چھیڑا نہ گیا ہو۔ جب بھی ایسا ہوتا ہے کہ اس کے چھپے ہوئے بت پر زد پڑتی ہے۔ جب اس کی عقیدتوں کا غبارہ مجروح ہوتا ہے تو وہ بلبلا اٹھتا ہے۔ وہ طیش میں آکر اپنا لبادہ اتار پھینکتا ہے۔ اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ وہ حقیقۃً خدا کا پرستار نہ تھا بلکہ غیر اللہ کی پرستش میں مبتلا تھا۔ اگرچہ اوپر سے خدا پرستی کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھا۔ (۴ ستمبر ۱۹۷۹)

تقویٰ کی حقیقت

قل لا یستوی الخبیث والطیب ولو اعجبک کثرۃ الخبیث ۃ فاتقوا اللہ یا اولی الالباب لعلکم تفلحون (مائدہ ۱۰۰)

کہہ دو، ناپاک اور پاک برابر نہیں ہو سکتے۔ اگرچہ ناپاک کی کثرت تم کو خوش لگے۔ اے عقل والو اللہ سے ڈرو تاکہ تم کامیاب ہو۔

غیر خدائی بنیادوں پر بظاہر کتنی ہی شان دار ترقی حاصل کرلی جائے وہ بے حقیقت ہے۔ کیوں کہ بالآخر ایسی تمام ترقیاں ڈھ جائیں گی اور وہی انسان کامیاب انسان ہوگا جو خدائی بنیادوں پر کھڑا ہو۔ دنیا میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص حقیقی اوصاف رکھنے کے باوجود لوگوں کی نظر میں حقیر بن جاتا ہے کیوں کہ وہ دنیوی زور کو اپنے گرد جمع نہ کرسکا۔ اسی طرح کچھ لوگ حقیقی اوصاف نہ رکھتے ہوئے بھی عزت خوش حالی اور اقتدار کے مالک بن جاتے ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے دنیوی اہمیت کی چیزوں، مثلاً دولت عہدہ، اعوان وانصار کو اپنی پشت پر اکٹھا کرلیا تھا۔ تاہم ایک طیب ہے اور دوسرا خبیث اور خبیث اور طیب دونوں یکساں نہیں ہوسکتے۔ موجودہ مصنوعی صورت حال صرف اس لئے ہے کہ زمین کے مالک نے لوگوں کو آزاد چھوڑ رکھا ہے۔ مگر یہ صورت حال یقینی طور پر عارضی ہے۔ جلد ہی ایسا ہوگا کہ زمین کا مالک اپنے جلال وکمال کے ساتھ ظاہر ہو جائے گا۔ اس وقت تمام لوگ اپنے اپنے حقیقی مقام پر آجائیں گے۔ مالک کائنات کے ظاہر ہوتے ہی تمام مصنوعی عظمتیں اچانک مٹ جائیں گی۔ ہر آدمی اس اصل مقام پر پہنچ جائے گا جو فی الواقع اس کا مقام ہے۔ اس وقت کتنے لوگ، جو دنیا میں شہرت اور عزت کی جنتوں میں بس رہے تھے اپنے آپ کو ذلت اور ناکامی کے جہنم میں جلتا ہوا پائیں گے۔ کیوں کہ حقیقت کے اعتبار سے وہ اسی مقام پر تھے۔ اور کتنے لوگ جو مسکینی اور بے بسی کے جہنم میں گرفتار دکھائی دیتے تھے، ہر قسم کی عزتوں اور ترقیوں کی بہشت میں باغ باغ ہو رہے ہوں گے۔ کیوں کہ حقیقت کے اعتبار سے وہ جس مقام پر تھے وہ یہی تھا۔

اللہ کا خوف آدمی کو آنے والے وقت سے پہلے اُس حقیقت واقعہ کا احساس کرا دیتا ہے جس کو بے خود انسان صرف اس وقت جانے گا جب کہ وہ اس سے دوچار ہو چکا ہوگا۔ جب حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اس دنیا کا مالک اللہ ہے تو عزت اسی کو حاصل ہوگی جس کو خدا عزت دے اور ذلت اس کے لئے ہوگی جس کو خدا ذلیل کرے۔ یہ احساس جس کے دل میں بیٹھ جائے اس کو دنیا کی تمام شان وشوکت حقیر معلوم ہونے لگتی ہے۔ وہ اقتدار کی کرسی پر بیٹھ کر بھی اپنے کو بے زور پاتا ہے۔ وہ دولت کے انبار کو پاکر بھی اپنے کو محتاج سمجھتا ہے۔ وہ مکمل معنوں میں حقیقت پسند بن جاتا ہے وہ ہر چیز کو اس شکل میں دیکھنے لگتا ہے جیسی کہ وہ حقیقتہً ہے۔

یہ اہل تقویٰ کی کامیابی کا وہ پہلو ہے جو اخروی اعتبار سے ہے۔ وہ حساب کا دن آنے سے پہلے

کو حساب کی ترازو میں کھڑا کر لیتے ہیں۔ خدا کے مقابلہ میں اپنی عاجزانہ حیثیت کو اس وقت سے پہلے تسلیم کر لیتے ہیں جب کہ خدا اپنے جلال و جبروت کے ساتھ ظاہر ہو جائے گا اور کسی کے لیے ماننے کے سوا چارہ نہ ہوگا۔ حالت غیب میں جو شخص اس طرح اللہ کا اقرار کرے وہ امتحان میں پورا اترا۔ آخرت میں جب اللہ اپنے جلال کے ساتھ ظاہر ہوگا تو ایسے بندوں کو وہ اپنی رحمتوں سے مالا مال کر دے گا اور یہی اصلی اور حقیقی کامیابی ہے۔

مگر اللہ نے اس دنیا کا نظام اس طرح بنایا ہے کہ اگر خدا کے بندوں کی کوئی قابل لحاظ تعداد تقویٰ کی اس روش کو عملاً اختیار کرلے تو اس کی کامیابیوں کا آغاز اسی موجودہ دنیا سے شروع ہو جاتا ہے۔ کیونکہ دونوں دنیائیں خدا کی دنیائیں ہیں اور جو حقیقت پسندانہ اوصاف آدمی کی آخرت کی کامیابی کی ضمانت ہیں، وہی حقیقت پسندانہ اوصاف دنیا کی کامیابی کو بھی یقینی بناتے ہیں۔ انسان کو ذاتی طور پر کوئی اختیار حاصل نہیں۔ یہ دراصل اللہ کی نصرت ہے جو کسی کو کامیاب بناتی ہے۔ اللہ کی نصرت ہی آدمی کو آخرت میں کامیاب بنائے گی اور وہی آدمی کی دنیا کو بھی کامیاب بنانے والی ہے۔ فرق یہ ہے کہ آخرت میں آدمی کے انفرادی عمل کے مطابق اس کو کامیابی دی جائے گی۔ ایک شخص اگر ذاتی طور پر سچا مومن ہے تو محض اپنے ذاتی ایمان کی بدولت وہ آخرت کی کامیابی کا مستحق قرار پا جائے گا۔ مگر دنیا میں اہل ایمان کی کامیابی (غلبہ) کا انحصار اجتماعی ایمان پر ہے۔ یعنی دنیا کی زندگی میں اہل ایمان کو اسی وقت غلبہ اور سربلندی حاصل ہوتی ہے جب کہ وہ قابل لحاظ تعداد میں سچی خدا پرستی کی شرائط کو پورا کر رہے ہوں۔

دنیا میں سربلندی حاصل کرنے کے لئے کس قسم کے افراد کا مجموعہ درکار ہے۔ اس کے لئے ایسے افراد درکار ہیں جو اپنے آپ کو اس مقام پر رکھنے کے لئے راضی ہو جائیں جو کہ باعتبار حقیقت ان کا مقام ہے۔ اللہ کے مقابلہ میں آدمی کا مقام عجز ہے۔ اس لئے ہر آدمی اللہ کے مقابلہ میں اپنے آپ کو مکمل طور پر عاجز محسوس کرے۔ وہ گھمنڈ اور خود رائی سے اپنے کو پاک کرلے۔ بندے کے مقابلہ میں آدمی کا مقام برابری کا ہے۔ ہر آدمی کا باعتبار حقیقت وہی درجہ ہے جو کسی دوسرے آدمی کا ہے۔ عزت، دولت، اقتدار یا نسلیت اور قومیت کی بنا پر ایک آدمی اور دوسرے آدمی میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے دو آدمیوں میں اس قسم کا فرق کتنا ہی زیادہ پایا جائے مگر دونوں آدمی اپنے کو یکساں درجہ کا انسان سمجھیں۔ کوئی شخص نہ احساس کمتری کا شکار ہو اور نہ احساس برتری کا۔

ان اوصاف کے پیدا ہونے کا سرچشمہ صرف ایک ہے اور وہ اللہ کا خوف ہے۔ اللہ سے ڈرنے والوں میں یہ خصوصیات سب سے زیادہ ہوتی ہیں۔ اسی لئے وہ دنیا کا نظام بھی سب سے زیادہ بہتر طور پر سنبھال سکتے ہیں۔ اور اس لئے وہ سب سے زیادہ اللہ کی نصرت کے مستحق بنتے ہیں۔ ان کا تقویٰ ان کو عجلت پسندی، ذاتی نمود و نمائش، باہمی عداوت اور بے انصافی سے پاک کر دیتا ہے۔ ان کے حوصلے اور تمنائیں دنیوی چیزوں کے بجائے اخروی چیزوں میں لگ جاتی ہیں۔ اور جن لوگوں کے اندر یہ اوصاف پیدا ہو جائیں ان کو خدا کی اس دنیا میں کوئی چیز کامیاب ہونے سے روک نہیں سکتی۔

توبہ وہی ہے جو سنجیدہ فیصلہ بن جائے

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْآنَ وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۝ (نساء ۱۷-۱۸)

اللہ پر صرف ان کی توبہ قبول کرتا ہے جو نادانی سے برا کر بیٹھتے ہیں پھر جلد ہی توبہ کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر اللہ توجہ فرماتا ہے اور اللہ خوب جانتا ہے، حکمت والا ہے۔ اور ان لوگوں کی توبہ نہیں جو برائی کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ جب اُن میں سے کسی کے سامنے موت آجاتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں۔ اور نہ ان لوگوں کی توبہ جن کو حالتِ کفر پر موت آتی ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

توبہ کے اصل معنی متوجہ ہونے کے ہیں۔ آدمی سے کوئی برائی ہو جائے اور پھر اللہ کے سامنے حاضری کا احساس اس کے اندر شدید ندامت کا جذبہ پیدا کرے۔ وہ بیتابانہ طور پر چاہنے لگے کہ دوبارہ اس سے ایسی برائی سرزد نہ ہو، تو اس کو شریعت میں توبہ کہتے ہیں۔ قرآن کے مطابق مطلوب توبہ وہ ہے جو توبہ نصوح ہو۔ نصوح کے معنی ہیں خالص۔ عربی میں کہتے ہیں نَصَحَ العسلَ یعنی شہد کو صاف کرکے اصلی شہد بنایا۔ توبہ نصوح وہ توبہ ہے جو سچی توبہ ہو جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت پیدا ہوئی ہو۔

حدیث میں آیا ہے: الندم توبة (اخرجہ احمد و ابن ماجہ عن عبداللہ بن مسعود مرفوعاً) اس سے معلوم ہوا کہ توبہ کی اصل ندامت و شرمندگی ہے۔ شرمندگی کا احساس جتنا شدید ہوگا، آدمی کی توبہ اتنی ہی سچی اور خالص ہوگی۔ جب آدمی غلطی کرکے تڑپ اٹھے اور خدا کے یہاں بازپرس کا احساس اس کو بے چین کردے تو اس کی توبہ محض چند الفاظ کو زبان سے بول دینا نہیں ہوتا بلکہ یہ اس کی پوری ہستی کے لئے ایک نئی زندگی کے ہم معنی ہوتا ہے۔ وہ احساسِ گناہ سے شدید طور پر شرمندہ ہوتا ہے، وہ بے تابانہ اللہ سے معافی مانگتا ہے۔ وہ عزم کرتا ہے کہ آئندہ کبھی ایسا نہ کرے گا۔ وہ فوراً اپنی اصلاح میں لگ جاتا ہے۔ وہ اپنی کوتاہیوں کی تلافی کرتا ہے۔ جو حقوق پامال ہوئے تھے ان کی ادائگی کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ اس کی ساری توجہ اس ایک سوال پر لگ جاتی ہے کہ وہ کس طرح اپنے آپ کو سابقہ غلطیوں سے مکمل طور پر پاک کر ڈالے۔ امام حسن بصری نے فرمایا: التوبة النصوح ان تبغض الذنب كما احببته وتستغفر منه اذا ذكرته یعنی سچی توبہ یہ ہے کہ برائی سے تم کو نفرت ہو جائے جس طرح اس سے پہلے اس سے محبت تھی اور جب برائی یاد آئے تو اللہ سے اس کے لئے مغفرت مانگو (ابن کثیر)

توبہ کا سب سے نازک امتحان وہ ہے جب کہ ایک آدمی کو دوسرے سے شکایت ہو جائے اور

انتقامی جذبہ کے تحت وہ اپنے بھائی کے خلاف کوئی کارروائی کرگزرے۔ اس قسم کے معاملات میں اپنے کو توبہ کی طرف لے جانا کسی آدمی کے لئے مشکل ترین جہاد ہے۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کے ذہن کا گھوڑا اگر ایک بار بدک جائے تو پھر وہ واپس آنے کا نام نہیں لیتا۔ وہ بس مخالف سمت ہی میں دوڑتا رہتا ہے۔ کسی شکایت کے باعث اگر اس نے کسی کے خلاف ایک بار بری رائے قائم کرلی تو ہزار دلائل کے بعد بھی وہ دوبارہ اپنے ذہن کو صاف نہیں کرتا۔ اگر اس نے انتقامی جذبہ کے تحت کسی کو اجاڑنے کا اقدام کر دیا تو قرآن وسنت کی تمام تصریحات بھی اس کو اس اقدام سے روکنے والی ثابت نہیں ہوتیں۔ اگر کسی غلط فہمی کی وجہ سے کسی کے نقطۂ نظر کی بابت ایک بار کوئی الٹی بات ذہن میں آگئی تو وہ دوبارہ ذہن سے نکلنے کا نام نہیں لیتی —— لوگوں نے توبہ کا ایک روایتی مفہوم بنالیا ہے اور کچھ خاص طرح کی چیزوں کے بارے میں "توبہ توبہ" کرکے سمجھتے ہیں کہ انھوں نے توبہ کے بارے میں شریعت کے حکم کی تعمیل کرلی، وہ توبہ کرنے والوں میں شامل ہوگئے۔ حالاں کہ وہ نازک مواقع جہاں اصلاً ان کی "توبہ" کا امتحان لیا جا رہا ہے وہاں وہ گناہ سے توبہ کے بجائے گناہ پر اصرار کو اپنا دین بنائے ہوئے ہیں۔

ایسی غلطی سے توبہ کرنا آسان ہوتا ہے جو صرف ایک غلطی ہو، اس کے ساتھ کوئی نفسیاتی پیچیدگی شامل نہ ہوئی ہو۔ مثلاً کسی وراثت کے ذریعہ آپ کے پاس کوئی ایسی زمین آگئی جو حقیقۃً غصب کی زمین تھی۔ ایسی زمین کو اس کے جائز مالکوں کی طرف لوٹانا بھی توبہ ہے۔ اس توبہ کی راہ میں جو چیز حائل ہوتی ہے وہ صرف مفاد پرستی ہے اور اس کے مقابلہ میں اپنے کو توبہ پر آمادہ کرنا نسبتاً آسان ہے — مگر غلطی کی ایک اور قسم ہے اور یہ غلطی وہ ہے جب کہ اس کے ساتھ ضد اور انتقام کے جذبات شامل ہو جائیں۔ مثلاً کسی کے پیغام کو رد کرنے کے بعد اس کی صداقت ظاہر ہونے پر دوبارہ اس کو ماننا، کسی کے خلاف غصہ اور تلخی کی حالت میں کوئی اقدام کر دینے کے بعد اپنے اقدام کو واپس لینا۔ کسی کو حقیر سمجھ کر نظر انداز کر دینے کے بعد دوبارہ اس کا اعتراف کرنا۔ نفرت کے جذبہ کے تحت کسی کو نقصان پہنچا دینے کے بعد پھر اس کی تلافی کرنا، وغیرہ —— اس دوسری قسم کی توبہ آدمی کے لئے ہمیشہ مشکل ترین ہوتی ہے۔ مگر یہی وہ توبہ ہے جس سے آدمی اپنے رب کے قریب آتا ہے۔ اور یہی وہ "قربانی" ہے جس کے بعد نصرت خداوندی کے دروازے اس کے لئے اس طرح کھول دئے جاتے ہیں کہ پھر کبھی بند نہیں ہوتے۔

توبہ، یعنی حق کے راستہ سے ہٹ جانے کے بعد دوبارہ حق کی طرف آنا، زندگی کے تمام معاملات سے تعلق رکھتا ہے۔ اور یہی ایمان واسلام کی سب سے بڑی پہچان ہے۔ آدمی جب ایک بار کسی حق کا انکار کر دے تو خواہ اس کے حق میں کتنے ہی دلائل ظاہر ہوں وہ اس کو اپنے لئے عزت کا سوال بنا لیتا ہے، وہ اس کی طرف لوٹنے کے لئے تیار نہیں ہوتا — ایسی حالت میں اپنی عزت کو خطرہ میں ڈال کر دوبارہ حق کی طرف لوٹنا ایک ایسا عمل ہے جو اللہ کو بہت پسند ہے — ایک شخص کسی کے خلاف ظلم کر بیٹھے اور حالات کی موافقت کی وجہ سے ظلم میں کامیاب ہو جائے تو اس کے بعد حقائق سامنے آنے کے بعد اپنی غلطی پر متنبہ ہونا اور اپنی بڑائی کی پروا نہ کرتے ہوئے صحیح رویہ کی طرف پلٹ آنا انسان کے لئے ایسی ترقیات کے دروازے کھولتا ہے جس کو کسی بھی دوسرے طریقے سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

کون لوگ جہنم میں جائیں گے

جنت والے جہنم والوں سے کہیں گے: تم کو کس چیز نے جہنم میں پہنچایا۔ وہ جواب دیں گے — ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور نہ محتاج کو کھانا کھلاتے تھے اور ہم بحث کرنے والوں کے ساتھ بحث کرتے تھے اور ہم انصاف کے دن کو جھٹلاتے تھے — یہاں تک کہ آپہنچی ہم پر موت۔ (مدثر ۴۷-۴۲)

ان آیات میں چار چیزوں کو جہنم میں جانے کا سبب بتایا گیا ہے: نمازی نہ ہونا، محتاجوں کا سہارا نہ بننا، حق کی دعوت کے خلاف فضول بحثیں نکالنا، روز جزا کو نہ ماننا۔ اس کے برعکس انجام ان لوگوں کا ہوگا جنھوں نے اپنی زندگیوں میں نماز کو داخل کیا ہو، کمزور اور بے سہارا لوگ جن کے دلوں میں اپنے لئے نرم گوشہ پاتے ہوں، جن کا سینہ حق کی آواز کے لئے ہمیشہ کھلا رہتا ہو۔ جو یہ سمجھ کر دنیا میں زندگی گزارتے ہوں کہ ایک روز ان کو عالم الغیب کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ ایسے لوگوں کو جہنم کی آگ نہیں چھوئے گی۔ وہ خدا کے باغوں میں ہمیشہ کے لئے داخل کردئے جائیں گے۔

نماز کیا ہے۔ اللہ کے آگے جھک جانا، اللہ کو اپنا سب کچھ بنا لینا۔ جب آدمی اس طرح اپنے رب کو پالیتا ہے تو وہ روزانہ پانچ وقت متعین صورت میں اور دیگر اوقات میں غیر متعین صورت میں "نماز" پڑھتا رہتا ہے۔ اللہ کی یاد اس کے دل میں سما جاتی ہے۔ وہ ہر وقت اللہ کی باتوں میں ڈوبا رہتا ہے۔ اس کی پوری زندگی اور اس کے تمام معاملات میں اللہ کا رنگ اس طرح چھا جاتا ہے کہ کسی وقت اس سے جدا نہیں ہوتا۔

"محتاج کو کھانا کھلانا" اس تعلق کی ایک علامت ہے جو ایک بندۂ خدا کو دوسرے انسانوں سے ہونی چاہیے۔ ایمان آدمی کے اندر جو گھلاوٹ اور اخروی جواب دہی کا جو احساس پیدا کرتا ہے اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کمزوروں اور محتاجوں کے لئے اس کا دل نرم پڑ جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو خدا کے سامنے ہمہ تن عاجز محسوس کرتا ہے اس لئے ہر وہ شخص جو اس کو عجز کی حالت میں نظر آئے، اس سے اس کو ہمدردی ہو جاتی ہے۔ وہ بے تابانہ طور پر چاہتا ہے کہ اس کا خدا اس کا سہارا بنے اس لئے اس کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ اس سے مختلف سلوک کرے جو وہ اپنے رب سے اپنے لئے چاہتا ہے۔

دعوت حق کے خلاف ایسی بحثیں نکالنا جس سے لوگ اس کی صداقت کے بارہ میں شبہ میں پڑ جائیں، اللہ کے نزدیک بدترین جرم ہے۔ دعوت حق کا ظہور دراصل خدا کا ظہور ہے۔ جو لوگ حق کی آواز کو نہ پہچانیں، انھوں نے گویا خدا کو نہیں پہچانا۔ جنھوں نے حق کی دعوت کے خلاف بحث و تکرار کی، انھوں نے گویا خدا کے ساتھ زبان درازی کی جرأت کی۔ ایسے لوگوں پر خدا سخت غضب ناک ہوتا ہے۔ وہ خدا کی رحمتوں سے سب سے زیادہ دور کر دئے جاتے ہیں۔

روز جزا کا یقین تمام نیکیوں کا سب سے بڑا محرک ہے۔ اور روز جزا پر یقین نہ ہونا تمام برائیوں کی اصل جڑ ہے۔ جنت اس کے لئے ہے جو دنیا میں اس طرح رہے گویا کہ وہ آخرت کو دیکھ رہا ہے اور جہنم اس کے لئے جو دنیا میں اس طرح زندگی گزارے گویا کہ وہ آخرت کو کوئی سنجیدہ معاملہ نہیں سمجھتا۔ وہ دنیا کو اپنی دنیا سمجھتا ہے نہ کہ خدا کی دنیا۔

جب اعمال اکارت ہو جائیں

قرآن میں اللہ تعالیٰ کے جو قوانین بتائے گئے ہیں، ان میں سے ایک قانون حبط اعمال ہے۔ حبط کے معنی ہیں اکارت جانا۔ پانی والا کواں ہو اور اس کا پانی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے تو کہیں گے حبط ماء البئر۔ دین میں حبط اعمال سے مراد یہ ہے کہ آدمی بظاہر نیکیاں کر رہا ہو۔ خوش نما اعمال اس سے ظاہر ہو رہے ہوں۔ مگر آخرت میں وہ بے قیمت ٹھہریں۔ وہاں ان کا کوئی وزن نہ کیا جائے۔ قرآن میں مختلف مقامات پر حبط اعمال کے جو اسباب بتائے گئے ہیں وہ یہ ہیں:

دین کو اختیار کرنے کے بعد دین سے پھر جانا۔ بقرہ ۲۱۷

اللہ کی نشانیوں سے انکار، بے انصافی پر روک ٹوک کرنے والوں کے مارنے کے درپے ہو جانا۔ آل عمران ۲۱

ایمان کے تقاضوں کو تسلیم کرنے سے انکار کرنا۔ مائدہ ۵

اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا۔ انعام ۸۸، زمر ۶۵

دنیا کا نفع اور دنیا کی رونق چاہنا۔ ہود ۱۶

دنیوی نقصان کے اندیشہ سے اسلامی جدوجہد کا ساتھ نہ دینا۔ مائدہ ۵۳

آخرت میں اللہ سے ملاقات کے معاملہ کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دینا۔ اعراف ۱۴۷

کافرانہ روش پر قائم رہتے ہوئے ظاہری عبادتیں کرنا۔ توبہ ۱۷

دنیا کی چیزوں میں غرق ہونا۔ توبہ ۶۹

دنیا کو سب کچھ سمجھنا اور اپنی تمام کوششیں اس میں صرف کر دینا۔ کہف ۱۰۶

اسلام کی ضرورت کے موقع پر بخیلی اور بزدلی دکھانا۔ احزاب ۱۹

اللہ کی ناراضی والے راستہ پر چلنا اور اس کی رضا کا حریص نہ ہونا۔ محمد ۲۸

اللہ کے کام میں رکاوٹ ڈالنا اور اس کا مخالف بن کر کھڑا ہونا۔ محمد ۳۲

یہ ایک نہایت سخت معاملہ ہے جو آخرت میں کچھ لوگوں کے ساتھ پیش آئے گا۔ بظاہر وہ "اعمال" کا ڈھیر لے کر آئیں گے۔ انھوں نے دینی عمل کے نام پر دنیا میں بہت کچھ کیا ہوگا۔ حتیٰ کہ بہت سے ظاہر بینوں کی نظر میں وہ دین و مذہب کے چیمپین بنے رہے ہوں گے۔ مگر آخرت کی دنیا میں ان کے اعمال کی کوئی قیمت نہ ہوگی۔ کیوں کہ انھوں نے ظاہری دھوم دھام والے دین کو تو خوب اپنایا مگر حقیقی دین سے انھیں دل چسپی نہیں ہوئی۔ وہ نمائشی دین کے عامل رہے۔ مگر جب نفس پر زد پڑی۔ جہاں مصالح مجروح ہوتے نظر آئے۔ جب ان دیکھی آخرت کی خاطر سامنے کے فوائد کو چھوڑنا ہوا تو ایسے مواقع پر انھوں نے دین کے تقاضوں کو نظر انداز کر دیا۔ انھوں نے اپنی پسند کا دین اپنایا نہ کہ خدا کی پسند کا۔

تذکیر القرآن

اور جب ہم نے تم سے یہ عہد لیا کہ تم اپنوں کا خون نہ بہاؤ گے۔ اور اپنے لوگوں کو اپنی بستیوں سے نہ نکالو گے۔ پھر تم نے اقرار کیا اور تم اس کے گواہ ہو۔ پھر تم ہی وہ ہو کہ اپنوں کو قتل کرتے ہو اور اپنے ہی ایک گروہ کو ان کی بستیوں سے نکالتے ہو۔ ان کے مقابلہ میں ان کے دشمنوں کی مدد کرتے ہو گناہ اور ظلم کے ساتھ۔ پھر اگر وہ تمہارے پاس قید ہو کر آتے ہیں تو تم فدیہ دے کر ان کو چھڑاتے ہو۔ حالاں کہ خود ان کا نکالنا تمہارے اوپر حرام تھا۔ کیا تم کتاب الٰہی کے ایک حصہ کو مانتے ہو اور ایک حصہ کا انکار کرتے ہو۔ پس تم میں سے جو لوگ ایسا کریں ان کی سزا اس کے سوا کیا ہے کہ ان کو دنیا کی زندگی میں رسوائی ہو اور قیامت کے دن ان کو سخت عذاب میں ڈال دیا جائے۔ اور اللہ اس چیز سے بے خبر نہیں جو تم کر رہے ہو۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی خریدی۔ پس نہ ان کا عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو مدد پہنچے گی ۸۶ — ۸۴

قدیم مدینہ کے اطراف میں یہود کے تین قبیلے آباد تھے۔ بنو نضیر، بنو قریظہ اور بنو قینقاع۔ یہ سب موسوی شریعت کو مانتے تھے۔ مگر ان کے جاہلی تعصبات نے ان کو الگ الگ گروہوں میں بانٹ رکھا تھا۔ اپنی دنیوی سیاست کے تحت وہ مدینہ کے مشرک قبائل — اوس اور خزرج کے ساتھ مل گئے تھے۔ بنو نضیر اور بنو قریظہ نے قبیلہ اوس کا ساتھ پکڑ لیا تھا۔ بنو قینقاع قبیلہ خزرج کے حلیف بنے ہوئے تھے۔ اس طرح دو گروہ بن کر وہ آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ جنگ بعاث اسی قسم کی ایک جنگ تھی جو ہجرت نبوی سے پانچ سال پہلے واقع ہوئی۔ ان لڑائیوں میں یہود مشرک قبائل کے ساتھ مل کر دو محاذ بنا لیتے۔ ایک محاذ میں شامل ہونے والے یہودی دوسرے محاذ میں شامل ہونے والے یہودیوں کو قتل کرتے اور ان کو ان کے گھروں سے بے گھر کرتے۔ پھر جب جنگ ختم ہو جاتی تو وہ تورات کا حوالہ دے کر اپنے ہم مذہبوں سے چندہ کی اپیلیں کرتے تاکہ اپنے گرفتار بھائیوں کو فدیہ دے کر مشرک قبائل کے ہاتھ سے چھڑایا جا سکے۔ انسان کے جان و مال کے احترام کے بارے میں وہ خدا کے حکم کو توڑتے اور پھر اپنی ظالمانہ سیاست کا شکار ہونے والوں کے ساتھ نمائشی ہمدردی کر کے ظاہر کرتے کہ وہ بہت دیندار ہیں۔

یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص کو ناحق قتل کر دیا جائے اور اس کے بعد شرعی طریقہ پر اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے — شریعت کے اصلی اور اساسی احکام آدمی سے جاہلی زندگی چھوڑنے کے لئے کہتے ہیں۔ وہ اس کی خواہش نفس سے ٹکراتے ہیں۔ وہ اس کی دنیادارانہ سیاست پر روک لگاتے ہیں، اس لئے آدمی ان احکام کو نظر انداز کرتا ہے۔ وہ حقیقی دین داری کے جوئے میں اپنے کو ڈالنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ البتہ کچھ معمولی اور نمائشی چیزوں کی دھوم مچا کر یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ خدا کے دین پر پوری طرح قائم ہے۔ مگر یہ خدا کے دین کا خود ساختہ ایڈیشن تیار کرتا ہے۔ یہ دین کے اخروی پہلو کو نظر انداز کرتا ہے اور دین کے بعض وہ پہلو جو اپنے اندر دنیوی رونق اور شہرت رکھتے ہیں ان میں دین داری کا کمال دکھاتا ہے۔ دین میں اس قسم کی جسارت آدمی کو اللہ کے غضب کا مستحق بناتی ہے نہ کہ اللہ کے انعام کا۔

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس کے بعد پے در پے رسول بھیجے۔ اور عیسیٰ بن مریم کو کھلی کھلی نشانیاں د
اور روح پاک سے اس کی تائید کی۔ تو جب بھی کوئی رسول تمھارے پاس وہ چیز لے کر آیا جس کو تمھارا دل نہ
چاہتا تھا تو تم نے تکبر کیا۔ پھر ایک جماعت کو جھٹلایا اور ایک جماعت کو مار ڈالا۔ اور یہود کہتے ہیں کہ ہمارے قلو
محفوظ ہیں۔ نہیں بلکہ اللہ نے ان کے انکار کی وجہ سے ان پر لعنت کر دی ہے۔ اس لئے وہ بہت کم ایمان لاتے
اور جب آئی اللہ کی طرف سے ان کے پاس ایک کتاب جو سچا کرنے والی ہے اس کو جو ان کے پاس ہے اور وہ
سے کافروں پر فتح مانگا کرتے تھے۔ پھر جب آئی ان کے پاس وہ چیز جس کو انھوں نے پہچان رکھا تھا تو انھو
اس کا انکار کر دیا۔ پس اللہ کی لعنت ہے انکار کرنے والوں پر۔ کیسی بری ہے وہ چیز جس سے انھوں نے اپنی جانوں
مول کیا کہ وہ انکار کر رہے ہیں اللہ کے اتارے ہوئے کلام کا اس ضد کی بنا پر کہ اللہ اپنے فضل سے اپنے بن
میں سے جس پر چاہے اتارے۔ پس وہ غصہ پر غصہ کما کر لائے اور انکار کرنے والوں کے لئے ذلت
عذاب ہے ۹۰-۸۷

تورات اللہ کی کتاب تھی جو یہود پر اتری۔ مگر دھیرے دھیرے تورات کی حیثیت ان کے یہاں قومی
کی ہو گئی۔ قومی عظمت اور نجات کی علامت کے طور پر یہود اب بھی اس کو سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ مگر رہنمائ
کے مقام سے اس کو انھوں نے ہٹا دیا تھا۔ حضرت موسیٰ کے بعد بار بار ان کے درمیان انبیاء اٹھے ہٹلا یو
داؤد نبی، زکریا نبی، یحییٰ نبی، وغیرہ۔ ان کے آخری نبی حضرت عیسیٰؑ تھے۔ یہ تمام انبیاء یہود کو یہ نصیحت ا
کے لئے آئے کہ تورات کو اپنی عملی زندگیوں میں شامل کرو۔ مگر تورات کے تقدس پر ایمان رکھنے کے باوجود یہ آ
ان کے لئے تمام آوازوں سے زیادہ ناقابل برداشت ثابت ہوئی۔ وہ خدا کے نبیوں کو نبی ماننے سے انکار ک
حتیٰ کہ ان کو قتل کر ڈالتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تورات کے نام پر وہ جس زندگی کو اختیار کئے ہوئے تھے وہ خ
نفسانیت اور دنیا پرستی کی ایک زندگی تھی جس کے اوپر انھوں نے خدا کی کتاب کا لیبل لگا لیا تھا۔ خدا کے
جب بے آمیز حق کی دعوت پیش کرتے تو ان کو نظر آتا کہ یہ دعوت ان کی مذہبی حیثیت کی نفی کر رہی ہے۔ اب ان
اندر گھمنڈ کی نفسیات جاگ اٹھتیں۔ وہ نبیوں کے اعتراف کے بجائے ان کو ختم کرنے کے درپے ہو جاتے۔

یہی معاملہ عرب کے یہود نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا۔ وہ اپنی کتابوں میں آخری رسولؐ
پیشین گوئی کو دیکھ کر کہتے کہ جب وہ نبی آئے گا تو ہم اس کے ساتھ مل کر کافروں اور مشرکوں کو زیر کریں گے۔ مگر ا
یہ بات محض ایک جھوٹی تقریر تھی جو اپنے کو مذہب کا پاسبان ظاہر کرنے کے لئے وہ کرتے تھے۔ چنانچہ "وہ نبی" آ
ان کی حقیقت کھل گئی۔ ان کے جاہلی تعصبات اپنے گروہ سے باہر کے ایک نبی کا اعتراف کرنے میں رکاوٹ بن
قرآن میں آپؐ کی صداقت کے بارے میں جو واضح دلائل دیئے جا رہے تھے، ان کے جواب سے وہ عاجز تھے۔ ا
وہ کہنے لگے کہ تمھاری ظاہر فریب باتوں سے متاثر ہو کر ہم اپنے اسلاف کا دین نہیں چھوڑ سکتے۔

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کلام پر ایمان لاؤ جو اللہ نے اتارا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں جو ہمارے اوپر اترا ہے۔ اور وہ اس کا انکار کرتے ہیں جو اس کے پیچھے آیا ہے۔ حالاں کہ وہ حق ہے اور سچا کرنے والا ہے اس کا جو ان کے پاس ہے۔ کہو، اگر تم ایمان والے ہو تو تم اللہ کے پیغمبروں کو اس سے پہلے کیوں قتل کرتے رہے ہو۔ اور موسیٰ تمھارے پاس کھلی نشانیاں لے کر آیا۔ پھر تم نے اس کے پیچھے بچھڑے کو معبود بنا لیا اور تم ظلم کرنے والے ہو۔ اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور کوہ طور کو تمھارے اوپر کھڑا کیا —— جو حکم ہم نے تم کو دیا ہے اس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑو اور سنو۔ انھوں نے کہا: ہم نے سنا اور ہم نے نہیں مانا۔ اور ان کے کفر کے سبب سے بچھڑا ان کے دلوں میں رچ بس گیا۔ کہو اگر تم ایمان والے ہو تو کیسی بری ہے وہ چیز جو تمھارا ایمان تم کو سکھاتا ہے۔ کہو اگر اللہ کے یہاں آخرت کا گھر خاص تمھارے لئے ہے دوسروں کو چھوڑ کر تو تم مرنے کی آرزو کرو اگر تم سچے ہو۔ مگر وہ کبھی اس کی آرزو نہ کریں گے بہ سبب اس کے جو وہ اپنے آگے بھیج چکے ہیں۔ اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو۔ اور تم ان کو زندگی کا سب سے زیادہ حریص پاؤ گے، ان لوگوں سے بھی زیادہ جو مشرک ہیں۔ ان میں سے ہر ایک چاہتا ہے کہ ہزار برس کی عمر پائے۔ حالاں کہ اتنا جینا بھی اس کو عذاب سے بچا نہیں سکتا۔ اور اللہ دیکھتا ہے جو کچھ وہ کر رہے ہیں ۹۱—۹۶

یہود جو قرآن کی دعوت کو ماننے کے لئے تیار نہ ہوئے، اس کی وجہ ان کا یہ احساس تھا کہ وہ پہلے سے حق پر ہیں اور حق پرستوں کی سب سے بڑی جماعت (اسرائیل) سے وابستگی رکھتے ہیں۔ مگر یہ دراصل گروہ پرستی تھی جس کو انھوں نے حق پرستی کے ہم معنی سمجھ رکھا تھا۔ وہ گروہی حق کو خالص حق کا مقام دیے ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حق جب اپنی بے آمیز صورت میں ظاہر ہوا تو وہ اس کو لینے کے لئے آگے نہ بڑھ سکے۔ اگر خالص حق ان کا مقصود ہوتا تو ان کے لئے یہ جاننا مشکل نہ ہوتا کہ قرآن کا آنا خود ان کی مقدس کتاب تورات کی پیشین گوئیوں کے مطابق ہے اور یہ کہ قرآن کے نزول کے بعد اب قرآن ہی کتاب حق ہے نہ کہ ان کا اپنا گروہی مذہب۔

ان کا معاملہ فی الواقع حق پرستی کا معاملہ نہیں، اس کا ثبوت ان کی اپنی تاریخ میں یہ ہے کہ انھوں نے خود اپنے گروہ کے نبیوں (مثلاً حضرت زکریا، حضرت یحییٰ) کو قتل کیا جنھوں نے ان کی زندگیوں پر تنقید کی، جو "ان کے خلاف گواہی دیتے تھے تاکہ ان کو خدا کی طرف پھر لائیں (نحمیاہ ۹ : ۲۶) حضرت موسیٰؑ نے جو معجزات پیش کئے اس کے بعد ان کی نبوت میں کوئی شبہ نہیں رہ گیا تھا۔ مگر کوہ طور کے چالیس روزہ قیام کے زمانہ میں جب حضرت موسیٰ کا شخصی دباؤ ان کے سامنے نہ رہا تو انھوں نے بچھڑے کو معبود بنا لیا۔ ان کے سر پر پہاڑ کھڑا کر دیا گیا تب بھی صرف وقتی طور پر جان بچانے کے لئے انھوں نے کہہ دیا کہ ہاں ہم نے سنا۔ مگر اس کے بعد ان کی اکثریت بدستور نافرمانی کی زندگی پر قائم رہی۔ اگر وہ سچ مچ خدا پرست ہوتے تو ان کی ساری توجہ خدا کی اس دنیا کی طرف لگ جاتی جو موت کے بعد آنے والی ہے۔ مگر ان کا حال یہ ہے کہ وہ موجودہ دنیا کی محبت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

کہو کہ جو کوئی جبریل کا مخالف ہے تو اس نے اِس کلام کو تمھارے دل پر اللہ کے حکم سے اتارا ہے، وہ سچا کرنے والا ہے اس کا جو اس کے آگے ہے اور وہ ہدایت اور خوش خبری ہے ایمان والوں کے لئے۔ جو کوئی دشمن ہو اللہ اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے رسولوں کا اور جبریل و میکائیل کا تو اللہ ایسے کافروں کا دشمن ہے۔ اور ہم نے تمھارے اوپر واضح نشانیاں اتاریں اور کوئی ان کا انکار نہیں کرتا مگر وہی لوگ جو فاسق ہیں۔ کیا جب بھی وہ کوئی عہد باندھیں گے تو ان کا ایک گروہ اس کو توڑ پھینکے گا۔ بلکہ ان میں سے اکثر ایمان نہیں رکھتے۔ اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے ایک رسول آیا جو سچا کرنے والا تھا اس چیز کا جو ان کے پاس ہے تو ان لوگوں نے جن کو کتاب دی گئی تھی، اللہ کی کتاب کو اس طرح پیٹھ پیچھے پھینک دیا گویا وہ اس کو جانتے ہی نہیں ۱۰۱ — ۹۷

قدیم زمانہ میں یہود کی سرکشی کے نتیجہ میں بار بار ان کو سخت سزائیں دی گئیں۔ سنت اللہ کے مطابق ہر سزا سے پہلے پیغمبروں کی زبان سے اس کی پیشگی خبر دی جاتی۔ یہ خبر اللہ کی طرف سے جبریل فرشتہ کے ذریعہ پیغمبر کے پاس آتی اور وہ اس سے اپنی قوم کو آگاہ کرتے۔ اس قسم کے واقعات میں اصل سبق یہ تھا کہ آدمی کو چاہئے کہ وہ اللہ کی نافرمانی سے بچے تاکہ وہ عذاب الٰہی کی زد میں نہ آجائے۔ مگر یہود ان واقعات سے اس قسم کا سبق نہ لے سکے اس کے بجائے وہ کہنے لگے کہ جبریل فرشتہ ہمارا دشمن ہے۔ وہ ہمیشہ آسمان سے ہمارے خلاف احکام لے کر آتا ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کیا کہ اللہ نے جبریل کے ذریعہ مجھ پر وحی کی ہے تو یہود نے کہنا شروع کیا کہ جبریل تو ہمارا پرانا دشمن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبوت جو صرف اسرائیلی گروہ کا حق تھا، اس کو اس نے ایک اور قبیلہ کے فرد تک پہنچا دیا۔

اس قسم کی بے معنی باتیں وہی لوگ کرتے ہیں جو فسق اور بے قیدی کی زندگی گزار رہے ہوں۔ یہود کا حال یہ تھا کہ وہ نفس پرستی، آبائی تقلید، نسلی اور قومی عصبیت کی سطح پر جی رہے تھے۔ اور کچھ نمائشی قسم کے مذہبی کام کر کے ظاہر کرتے تھے کہ وہ عین دین خداوندی پر قائم ہیں۔ جو لوگ اس قسم کی جھوٹی دین داری میں مبتلا ہوں وہ سچے اور بے آمیز دین کی دعوت سن کر ہمیشہ بگڑ جاتے ہیں۔ کیوں کہ ایسی دعوت ان کو ان کے مقام افتخار سے اتارنے کے ہم معنی نظر آتی ہے۔ وہ مشتعل نفسیات کے تحت ایسی باتیں بولنے لگتے ہیں جو نحو و صرف کے اعتبار سے درست ہونے کے باوجود حقیقت کے اعتبار سے بالکل بے معنی ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ فرشتوں کا آنا اور رسولوں کا مبعوث ہونا سب مکمل طور پر خدائی منصوبہ کے تحت ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں جب دلائل یہ ظاہر کر رہے ہوں کہ پیغمبر عربی کے پاس وہی چیز آئی ہے جو ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ پر آئی تھی اور وہ پچھلے آسمانی صحیفوں کی پیشین گوئیوں کے عین مطابق ہے تو یہ صریح طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے —— آدمی بہت سی باتیں یہ ظاہر کرنے کے لئے بولتا ہے کہ وہ ایمان پر قائم ہے۔ حالاں کہ وہ باتیں صرف اس کا ثبوت ہوتی ہیں کہ آدمی کا ایمان اور خدا پرستی سے کوئی تعلق نہیں۔

اور وہ اس چیز کے پیچھے پڑ گئے جس کو شیاطین سلیمان کی سلطنت پر لگا کر پڑھتے تھے۔ حالاں کہ سلیمان نے کفر نہیں کیا بلکہ یہ شیاطین تھے جنھوں نے کفر کیا۔ وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ اور وہ اس چیز میں پڑ گئے جو بابل میں دو فرشتوں، ہاروت اور ماروت پر اتاری گئی، جب کہ ان کا حال یہ تھا کہ جب بھی کسی کو اپنا یہ فن سکھاتے تو اس سے کہہ دیتے کہ ہم تو آزمائش کے لئے ہیں۔ پس تم کافر نہ ہو۔ مگر وہ ان سے وہ چیز سیکھتے جس سے مرد اور اس کی عورت کے درمیان جدائی ڈال دیں۔ حالاں کہ وہ اللہ کے اذن کے بغیر اس سے کسی کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تھے۔ اور وہ ایسی چیز سیکھتے جو ان کو نقصان پہنچائے اور نفع نہ دے۔ اور وہ جانتے تھے کہ جو کوئی اس چیز کا خریدار ہوا آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ کیسی بری چیز ہے جس کے بدلے انھوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا۔ کاش وہ اس کو سمجھتے۔ اور اگر وہ مومن بنتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو اللہ کا بدلہ ان کے لئے بہتر تھا، کاش وہ اس کو سمجھتے ۱۰۲ — ۱۰۳

آسمانی کتاب کے حامل کسی گروہ کا بگاڑ ہمیشہ صرف ایک ہوتا ہے: نجاتِ آخرت جس کا انحصار تمام تر عمل صالح پر رکھا گیا ہے، اس کا راز بے عملی میں تلاش کر لینا۔ اللہ کا کلام حقیقۃً عمل کی پکار ہے۔ مگر جب قوم پر زوال آتا ہے تو اس کے افراد مقدس کلام کے لکھ لینے یا زبان سے بول دینے کو ہر قسم کی برکتوں کا پراسرار نسخہ سمجھ لیتے ہیں۔ یہی وہ نفسیاتی زمین ہے جس کے اوپر سحر اور کہانت اور عملیات وجود میں آتے ہیں۔ چھومنتر جیسی چیزوں سے جنت حاصل کرنے والے دنیا کو بھی چھومنتر کے ذریعے حاصل کرنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ بزرگوں سے عقیدت کو نجات کا ذریعہ سمجھنے والے ارواح سے تعلق قائم کرکے اپنے دنیوی مسائل حل کرنے لگتے ہیں۔ اوراد و وظائف کے طلسماتی اثرات پر یقین کرنے والے سیاسی چمتکار دکھا کر ملت کی تعمیر اور اسلام کے احیاء کا منصوبہ بناتے ہیں۔

یہود اپنے زوال کے بعد جب بے عملی اور توہم پرستی کی اس کیفیت میں مبتلا ہوئے تو ان کے درمیان ایسے لوگ پیدا ہوئے جو سحر و کہانت کی دکان لگا کر بیٹھ گئے۔ ان ظالموں نے اپنے کاروبار کو چمکانے کے لئے اپنے اس فن کو حضرت سلیمانؑ کی طرف منسوب کر دیا۔ انھوں نے کہنا شروع کیا کہ سلیمانؑ کو جنوں اور ہواؤں تک پر جو غیر معمولی اقتدار حاصل تھا وہ سب علم سحر کی بنا پر تھا اور یہ سلیمانی علم بعض جنوں کے ذریعہ ہم کو حاصل ہو گیا ہے۔ اس طرح حضرت سلیمان کی طرف منسوب ہو کر عملیات کا فن یہود کے اندر بڑے پیمانہ پر پھیل گیا۔

حضرت لوطؑ کی قوم مباشرت ہم جنس کی برائی میں مبتلا تھی، اس لئے ان کے یہاں خوبصورت لڑکوں کی صورت میں فرشتے آئے۔ اسی طرح یہود کی آزمائش کے لئے بابل میں دو فرشتے بھیجے گئے جو درویشوں کے بھیس میں عملیات سکھاتے تھے۔ تاہم وہ کہتے رہتے تھے کہ یہ تمہارا امتحان ہے۔ مگر اس انتباہ کے باوجود وہ اس فن پر ٹوٹ پڑے۔ حتیٰ کہ انھوں نے اس کو ناجائز مقاصد میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔

اے ایمان والو تم راعنا نہ کہو بلکہ اُنظرنا کہو اور سنو۔ اور کفر کرنے والوں کے لئے دردناک سزا ہے۔ جن لوگوں نے انکار کیا، خواہ اہل کتاب ہوں یا مشرکین، وہ نہیں چاہتے کہ تمھارے اوپر تمھارے رب کی طرف سے کوئی بھلائی اترے۔ اور اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے لئے چن لیتا ہے۔ اللہ بڑے فضل والا ہے۔ ہم جس آیت کو موقوف کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس کے مثل دوسری لاتے ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہی کے لئے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور تمھارے لئے اللہ کے سوا نہ کوئی دوست ہے اور نہ کوئی مددگار۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے سوالات کرو جس طرح اس سے پہلے موسیٰ سے سوالات کئے گئے۔ اور جس شخص نے ایمان کو کفر سے بدل لیا وہ یقیناً سیدھی راہ سے بھٹک گیا ۱۰۴ — ۱۰۸

کسی کو خدا کی طرف سے سچائی ملے اور وہ اس کا داعی بن کر کھڑا ہو جائے تو لوگ اس کے مخالف بن جاتے ہیں۔ کیوں کہ اس کی دعوت میں لوگوں کو اپنی حیثیت کی نفی دکھائی دینے لگتی ہے۔ یہود کے لئے مخالفت کا یہ سبب مزید شدت کے ساتھ موجود تھا۔ کیوں کہ وہ پیغمبری کو اپنا قومی حق سمجھتے تھے۔ ان کے لئے یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ ان کے گروہ کے سوا کسی اور گروہ میں خدا کے پیغمبر کا ظہور ہو۔ یہود آپ کی دعوت کے بارے میں طرح طرح کی مذہبی بحثیں چھیڑتے تاکہ لوگوں کو اس شبہ میں ڈال دیں کہ آپ جو کچھ پیش کر رہے ہیں وہ محض ایک شخص کی ذاتی اپج ہے۔ وہ خدا کی طرف سے آئی ہوئی چیز نہیں ہے۔ ان میں سے ایک یہ تھا کہ قرآن میں بعض قانونی احکام تورات سے مختلف تھے۔ ان کو دیکھ کر وہ کہتے کہ کیا خدا بھی حکم دینے میں غلطی کرتا ہے کہ ایک بار ایک حکم دے اور اس کے بعد اسی معاملہ میں دوسرا حکم بھیجے۔ اس طرح کے شبہات یہود نے اتنی کثرت سے پھیلائے کہ خود مسلمانوں میں کچھ سادہ مزاج لوگ ان کی بابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کرنے لگے۔ مزید یہ کہ یہود جب آپ کی مجلس میں بیٹھتے تو ایسے الفاظ بولتے جن سے آپ کا بے حقیقت ہونا ظاہر ہوتا۔ مثلاً "ہماری طرف توجہ کیجئے" کے لئے عربی زبان میں ایک محفوظ لفظ اُنظرنا تھا۔ مگر وہ اس کو چھوڑ کر راعنا کہتے۔ کیونکہ تھوڑا سا کھینچ کر اس کو راعینا کہہ دیا جائے تو اس کے معنی "ہمارے چرواہے" کے ہو جاتے ہیں، اسی طرح کبھی الف کو دبا کر وہ اس کو راعِنَ کہتے جس کے معنی احمق کے ہوتے ہیں

ہدایت کی گئی کہ (۱) گفتگو میں صاف الفاظ استعمال کرو، مشتبہ الفاظ مت بولو جس میں کوئی برا پہلو نکل سکتا ہو (۲) جو بات کہی جائے اس کو غور سے سنو اور اس کو سمجھنے کی کوشش کرو (۳) سوال کی کثرت آدمی کو سیدھے راستہ سے بھٹکا دیتی ہے، اس لئے سوال و جواب کے بجائے عبرت اور نصیحت کا ذہن پیدا کرو (۴) اپنے ایمان کی حفاظت کرو۔ ایسا نہ ہو کہ کسی غلطی کی بنا پر تم اپنے ایمان ہی سے محروم ہو جاؤ (۵) دنیا میں کسی کے پاس کوئی خیر دیکھو تو حسد اور جلن میں مبتلا نہ ہو، کیوں کہ یہ اللہ کا ایک عطیہ ہے جو اس کے فیصلہ کے تحت اس کے ایک بندے کو پہنچا ہے۔

بہت سے اہل کتاب دل سے چاہتے ہیں کہ تمھارے مومن ہو جانے کے بعد وہ کسی طرح پھر تم کو کافر بنا دیں، اپنے حسد کی وجہ سے، باوجودیکہ حق ان کے سامنے واضح ہو چکا ہے۔ پس معاف کرو اور درگزر کرو یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ آ جائے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ اور جو بھلائی تم اپنے لئے آگے بھیجو گے اس کو تم اللہ کے پاس پاؤ گے۔ جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ یقیناً اس کو دیکھ رہا ہے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ جنت میں صرف وہی لوگ جائیں گے جو یہودی ہوں یا عیسائی ہوں، یہ محض ان کی آرزوئیں ہیں۔ کہو کہ لاؤ اپنی دلیل اگر تم سچے ہو۔ بلکہ جس نے اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دیا اور وہ مخلص بھی ہے تو ایسے شخص کے لئے اجر ہے اس کے رب کے پاس، ان کے لئے نہ کوئی ڈر ہے اور نہ کوئی غم ۱۱۲ — ۱۰۹

قرآن کی آواز اگرچہ بہت سے لوگوں کے لئے ناموس آواز تھی۔ تاہم انھیں میں ایسے لوگ بھی تھے جو اس کو اپنے دل کی آواز پاکر اس کے دائرہ میں داخل ہوتے جا رہے تھے۔ یہ صورت حال یہود کے لئے ناقابل برداشت بن گئی۔ کیوں کہ یہ ایک ایسی چیز کی ترقی کے ہم معنی تھی جس کو وہ بے حقیقت سمجھ کر نظرانداز کئے ہوئے تھے۔ انھوں نے یہ کیا کہ ایک طرف مشرکین کو ابھار کر ان کو اسلام کے خلاف جنگ پر آمادہ کر دیا۔ دوسری طرف وہ نئے اسلام لانے والوں کو طرح طرح کے شبہات اور مغالطے میں ڈالتے تاکہ وہ قرآن اور صاحب قرآن سے بدظن ہو جائیں اور دوبارہ اپنے آبائی مذہب کی طرف واپس چلے جائیں۔ اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے اندر یہود کے خلاف اشتعال پیدا ہونا فطری تھا۔ مگر اللہ نے اس سے ان کو منع فرما دیا۔ حکم ہوا کہ یہود سے بحث مباحثہ یا ان کے خلاف کوئی جارحانہ کارروائی موجودہ مرحلہ میں ہرگز نہ کی جائے۔ اس معاملہ میں تمام تر اللہ پر بھروسہ کیا جائے اور اس وقت کا انتظار کیا جائے جب اللہ تعالیٰ حالات میں ایسی تبدیلی کر دے کہ ان کے خلاف کوئی فیصلہ کن کارروائی کرنا ممکن ہو جائے۔ بر وقت مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ صبر کریں اور نماز اور زکوٰۃ پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جائیں۔ صبر آدمی کو اس سے بچاتا ہے کہ وہ ردعمل کی نفسیات کے تحت منفی کارروائیاں کرنے لگے۔ نماز آدمی کو اللہ سے جوڑتی ہے۔ اور اپنے مال میں دوسرے بھائیوں کو حق دار بنانا وہ چیز ہے جس سے باہمی خیر خواہی اور اتحاد کی فضا پیدا ہوتی ہے۔

نئے اسلام لانے والوں سے وہ کہتے کہ تم کو اپنا آبائی مذہب چھوڑنا ہے تو یہودیت اختیار کر لو یا پھر عیسائی بن جاؤ۔ کیونکہ جنت تو یہودیوں اور عیسائیوں کے لئے ہے جو ہمیشہ سے نبیوں اور بزرگوں کی جماعت رہی ہے۔ فرمایا کہ کسی گروہ سے وابستگی کسی کو جنت کا مستحق نہیں بناتی۔ جنت کا فیصلہ آدمی کے اپنے عمل کی بنیاد پر کیا جاتا ہے نہ کہ گروہی فضیلت کی بنیاد پر۔ احسان کے معنی ہیں کسی کام کو اچھی طرح کرنا۔ اسلام میں اچھا ہونا یہ ہے کہ اللہ کے لئے آدمی کی حوالگی اتنی کامل ہو کہ ہر دوسری چیز کی اہمیت اس کے ذہن سے حذف ہو جائے۔ گروہی تعصبات، شخصی وفاداریاں اور دنیوی مصالح کوئی بھی چیز اس کے لئے اللہ کی آواز کی طرف دوڑ پڑنے میں رکاوٹ نہ بنے۔

اور یہود نے کہا کہ نصاریٰ کسی چیز پر نہیں اور نصاریٰ نے کہا کہ یہود کسی چیز پر نہیں۔ اور وہ سب آسمانی کتاب پڑھتے ہیں۔ اسی طرح ان لوگوں نے کہا جن کے پاس علم نہیں، انھیں کا سا قول۔ پس اللہ قیامت کے دن اس بات کا فیصلہ کرے گا جس میں یہ جھگڑ رہے تھے۔ اور اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو اللہ کی مسجدوں کو اس سے روکے کہ وہاں اللہ کے نام کی یاد کی جائے اور ان کو اجاڑنے کی کوشش کرے۔ ان کا حال تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ مسجدوں میں اللہ سے ڈرتے ہوئے داخل ہوں۔ ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لئے بھاری سزا ہے۔ اور مشرق اور مغرب اللہ ہی کے لئے ہے۔ تم جدھر رخ کرو اسی طرف اللہ ہے۔ یقیناً اللہ وسعت والا ہے، علم والا ہے۔ اور کہتے ہیں کہ اللہ نے بیٹا بنایا ہے۔ وہ اس سے پاک ہے۔ بلکہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے۔ اسی کے حکم بردار ہیں سارے۔ وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ وہ جب کسی کام کا کرنا ٹھہرالیتا ہے تو بس اس کے لئے فرما دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے

۱۱۷ — ۱۱۳

یہود نے نبیوں اور بزرگوں سے وابستگی کو حق کا معیار بنایا۔ اس وجہ سے ان کو اپنی قوم حق پر اور دوسری قومیں باطل پر نظر آئیں۔ نصاریٰ نے اپنے اندر یہ امتیاز دیکھا کہ اللہ نے اپنا "اکلوتا بیٹا" ان کے پاس بھیجا۔ مکہ کے مشرکین اپنی یہ خصوصیت سمجھتے تھے کہ وہ اللہ کے مقدس گھر کے پاسبان ہیں۔ اس طرح ہر گروہ نے اپنے حسب حال حق و صداقت کا ایک خود ساختہ معیار بنا رکھا تھا اور جب وہ اس معیار کی روشنی میں دیکھتا تو لامحالہ اس کو اپنی ذات برسر حق اور دوسروں کی برسر باطل نظر آتی۔ مگر ان کی عملی حالت جس چیز کا ثبوت دے رہی تھی وہ اس کے بالکل برعکس تھی۔ وہ گروہ گروہ بنے ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی کو جب بھی موقع ملتا، وہ عبادت کے لئے بنے ہوئے خدا کے گھر کو اپنے گروہ کے علاوہ دوسرے گروہ پر بند کر دیتا اور اس طرح خدا کے گھر کی ویرانی کا باعث بنتا۔ عبادت خانہ تو وہ مقام ہے جہاں انسان اللہ سے ڈرتے ہوئے اور کانپتے ہوئے داخل ہو۔ اگر یہ لوگ واقعۃً خدا والے ہوتے تو کیسے ممکن تھا کہ وہ عبادت کے لئے آنے والے کسی بندے کو روکیں یا اس کو ستائیں۔ وہ تو اللہ کی عظمت کے احساس سے دبے ہوئے ہوتے، پھر ان سے اس قسم کی سرکشی کا صدور کیوں کر ہو سکتا تھا۔

انھوں نے اللہ کو انسان کے اوپر قیاس کیا۔ ایک انسان اگر مشرق میں ہو تو اسی وقت وہ مغرب میں نہیں ہوگا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ خدا بھی اسی طرح کسی خاص سمت میں موجود ہے۔ یقیناً اللہ نے اپنی عبادت کے لئے رخ کا تعین کیا ہے مگر وہ عبادت کی تنظیمی ضرورت کی بنا پر ہے نہ اس لئے کہ خدا اسی خاص رخ میں ملتا ہے۔ اسی طرح انسانوں پر قیاس کرتے ہوئے انھوں نے خدا کا بیٹا فرض کر لیا۔ حالاں کہ خدا اس قسم کی چیزوں سے بلند و برتر ہے۔ جو لوگ اس طرح خود ساختہ دین کو خدا کا دین بتائیں، ان کے لئے خدا کے یہاں رسوائی اور عذاب کے سوا اور کچھ نہیں

تنقید کبھی وہم کا نتیجہ ہوتی ہے

مولانا محمود حسن دیوبندیؒ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا (نساء ۸۲) کی تفسیر کے ذیل میں لکھتے ہیں: اس میں اس کی طرف بھی اشارہ ہوگیا کہ جو تدبر اور فہم سے کام نہ لے وہ قرآن میں شبہات اور اختلافات کا وہم چلا سکتا ہے۔ مگر فہیم ایسا نہیں کرسکتا۔ دیکھو قرآن کے اسی مقام میں جو تدبر نہ کرے وہ کہہ سکتا ہے کہ اول تو فرما دیا قُل کُلٌّ مِّنْ عِندِ اللہ (کہو کہ سب اللہ کی طرف سے ہے) پھر فرما دیا وما اصابک من سیئۃ فمن نفسک (اور جو تجھ کو برائی پہنچے سو وہ تیرے نفس کی طرف سے ہے) سو یہ تو تناقض اور اختلاف ہوگیا (تفسیر قرآن صفحہ ۱۱۷)

جب لفظوں میں معرکے سر ہونے لگیں

"پندرہ اگست ۱۹۴۷ کو آنے والے آزادی کے انقلاب نے ملک کی قسمت بدل دی" اس جملہ کو ایک حقیقی واقعہ بنانے کے لئے طویل مدت تک بے حساب جدوجہد کی ضرورت ہے۔ اس قسم کی سنجیدہ کوشش اور دیانت دارانہ عمل کے فقدان ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ یہ جملہ آزادی کے ۳۲ سال بعد بھی واقعہ نہ بن سکا۔ مگر شاعر کو نہ صورت واقعہ سے بحث ہے اور نہ جدوجہد کی زحمت میں پڑنے کی ضرورت۔ دو ہم قافیہ الفاظ کا مل جانا شاعر کو وہ سب کچھ دے دیتا ہے جس سے وہ اس عظیم واقعہ کو، آناً فاناً ظہور میں لاسکے۔ ایک اردو شاعرہ ۱۵ اگست کے مشاعرہ میں پڑھی جانے والی نظم میں کہتے ہیں:

آج کے دن ہی غلامی کی کٹیں زنجیریں — آج ہی پائی تھیں خوابوں نے حسیں تعبیریں

مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں بہت بڑی تعداد میں ایسے ماہرین انقلاب پیدا کئے ہیں جو الفاظ کے ذریعہ ہر روز بڑے بڑے معرکے سر کر رہے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ انقلاب کے بعد بھی حالات نہ بدلیں اور مسائل ویسے ہی کے ویسے باقی رہیں جو انقلاب سے پہلے تھے۔

اسلام ہر زمانہ کے انسان کے لئے

اسلام آج کے زمانہ میں قابل عمل نہیں ہے، اسلام جدید حالات میں رہنمائی نہیں دے سکتا — اس قسم کے شبہات کی ایک وجہ غیر اسلامی تہذیب سے مرعوبیت ہے۔ مگر اسی درجہ کی ایک اور وجہ بھی ہے جو خود اسلام کے داعیوں کی پیدا کی ہوئی ہے۔ یہ ہے اسلام کو ایک تمدنی اور سیاسی نظام کی حیثیت سے پیش کرنا۔ اس میں شک نہیں کہ اہل اسلام جب غالب ہوں تو ان کا اپنا ایک تمدنی نظام بھی بنتا ہے۔ مگر تمدنی اور سیاسی نظام قائم کرنے کی بات اسلام کا دعوتی اشو نہیں ہے، وہ صرف اس کی ایک تنظیمی ضرورت ہے۔ اسلام اپنی اصلی اور ابتدائی حیثیت میں یہ ہے کہ انسان، نہ کہ اسٹیٹ، اللہ کے آگے جھک جائے۔ انسان اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔ اللہ کی یاد اور اللہ کی عبادت گزاری اس کا وظیفہ بن جائے۔ اور یہ کہ ہر انسان اپنے معاملات اور تعلقات میں اپنی خواہش نفس کی پیروی کرنا چھوڑ دے۔ اس کے بجائے وہ اللہ کی مرضی کو اپنا رہنما بنالے۔ اس قسم کے انسان کو وجود میں لانا اسلام کا اصل مقصد ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کی نظامی تحریکوں نے یہ کیا کہ اسلامی تمدنی نظام قائم کرنے کو دعوت کا عنوان قرار دیا۔ انھوں نے فرد کے بجائے سماج کو اپنا نشانہ بنالیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارا معاملہ بالکل الٹ گیا۔

اسلام کا اصل نشانہ فرد ہے۔ مگر اسلام کی نظامی تعبیر میں فطری طور پر اجتماع یا اسٹیٹ اسلام کا اصل نشانہ بن جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسلام ایک ایسی چیز نظر آنے لگتا ہے جس کے وقوع میں آنے کے لئے عوامی سطح پر اتفاق رائے ضروری ہے۔ کیوں کہ اسٹیٹ کی سطح پر کسی نظام کا قیام عوامی تائید کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اب چوں کہ موجودہ زمانہ میں عام طور پر مذہبی ریاست کے بارہ میں تعصب پایا جاتا ہے، اس لئے پہلے ہی مرحلہ میں یہ غیر ضروری بحث چھڑ جاتی ہے کہ اسلام قابل عمل ہے یا نہیں۔ بالفاظ دیگر عوامی اکثریت اس کو قبول کرے گی یا نہیں۔ حالاں کہ اگر فرد کو اسلامی دعوت کا نشانہ بنایا جائے تو اس قسم کے شکوک پیدا ہونے کا کوئی سوال نہیں۔ فرد کو مخاطب کرنے کا مطلب ایک انسان کی سطح پر ایک واقعہ کو ظہور میں لانے کی کوشش کرنا ہے۔ جب کہ اسٹیٹ کو نشانہ بنانے کا مطلب یہ ہے کہ آپ ایک ایسا واقعہ ظہور میں لانا چاہتے ہیں جو اس وقت تک ممکن نہیں جب تک عوام کی بڑی اکثریت اس کی حمایت پر کھڑی نہ ہو جائے، بلکہ ضروری ہے کہ دنیا بھر میں اس کے حق میں عمومی اعتراف کی فضا پیدا ہو جائے۔ کیوں کہ آج کی دنیا میں کسی ایک ملک میں کوئی سیاسی جزیرہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔

اسلامی دعوت کا کام اگر اس طرح کیا جائے کہ شرک کی تردید کرتے ہوئے توحید کو پیش کیا جائے۔ ایک اللہ کی عبادت پر زور دیا جائے۔ دنیا کی زندگی کے مقابلہ میں آخرت کی زندگی کی اہمیت کو بتایا جائے۔ انسان کی اس حیثیت کی وضاحت کی جائے کہ وہ اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ اپنے اندر قلب سلیم اور نفس مطمئنہ کی پرورش کرے تاکہ وہ جنت کی دنیا کا شہری بن سکے — یہ بتایا جائے کہ انسان کو چاہئے کہ وہ دوسرے انسانوں کے درمیان

یہ سمجھ کر رہے کہ اس کو اپنے کارنامۂ حیات کا حساب اللہ کو دینا ہے، تو یہ بات انسان کو اپنی فطرت کی آواز معلوم ہوگی۔ اس پیغام کے بارے میں اس کے اندر یہ شک نہیں ابھرے گا کہ موجودہ زمانہ میں وہ چلنے والی چیز نہیں۔ ایسی حالت میں اسلام کو وہ ایک ایسی چیز سمجھے گا جو عین اس وقت ظہور میں آجاتا ہے جب کہ ایک فرد ذاتی طور پر اس کا اعتراف کرے۔ جب کہ دوسری صورت میں اسلام ایک ایسی چیز معلوم ہوتا ہے جو کسی ایک شخص کے ارادہ سے ظہور میں نہیں آسکتا، اس کے لئے ضروری ہے کہ ساری دنیا اس کی حمایت پر کھڑی ہو جائے۔ اللہ کا مطلوب انسان بننے کا معاملہ تمام تر ایک ذاتی ارادہ کا معاملہ ہے۔ آدمی کا اسلام اسی وقت کامل و مکمل ہو جاتا ہے جب کہ اپنی ذاتی زندگی کی سطح پر وہ اسلام کو پوری طرح اختیار کر لے۔

جس طرح پانی ایک گلاس میں ٹھہرتا ہے نہ کہ بسیط فضا میں۔ اسی طرح اسلام ایک فرد انسانی کی روح میں متمکن ہوتا ہے نہ کہ حقیقۃً کسی آفاقی اجتماعیت میں۔ افراد انسانی کی کوئی قابل لحاظ تعداد جب اسلام کو اپنا سرمایۂ زندگی بنائے تو ان کے مجموعہ سے بالآخر وہ چیز وجود میں آتی ہے جس کو اسلامی نظام کہا جاتا ہے، تاہم اسلامی نظام کا قیام اسلامی تحریک کا اصل مقصود نہیں ہے۔ اسلام کا اصل مقصد فرد فرد کی روح کو خدائی نور سے روشن کرنا ہے تاکہ موت کے بعد جب وہ آخرت کی دنیا میں پہنچے تو وہاں اس کو جنت میں داخلہ مل سکے۔ اسلام کا اصل مقصود انسان کو جنتی دنیا کا شہری بنانا ہے نہ کہ کسی قسم کے دنیوی نظام کا شہری بنانا۔

دنیا میں بہتر نظام قائم کرنے کا تعلق حقیقۃً بہتر نظام سے نہیں بلکہ بہتر انسان سے ہے۔ کسی نظام کو چلانے والے حقیقۃً آدمی ہوتے ہیں نہ کہ کوئی قانونی ڈھانچہ۔ سرکاری عملہ اگر سست ہو تو ایک عمدہ منصوبہ اپنا نشانہ پورا کرنے سے رہ جائے گا۔ رشوت لینے والے سرکاری ملازمین کسی بھی قانونی نفاذ کے عمل درآمد کو رشوت لے کر ناکام بنا دیں گے۔ بدعنوان افسران کسی بھی اصلاحی اسکیم کو ایسی تاویلات و توجیہات کے خانہ میں ڈال دیں گے جس سے اس کو نکالنا صدر اور وزیر اعظم کے لئے بھی ممکن نہ ہوگا۔ ایک مشین کو آپ بٹن دبا کر چلا سکتے ہیں۔ مگر انسان کو چلانے کے لئے ایسا کوئی بٹن نہیں ہے۔ انسان ایک خود مختار مخلوق ہے۔ وہ اسی وقت کسی کام کو حسن و خوبی کے ساتھ ادا کرتا ہے جب کہ وہ خود بھی اس کو کرنا چاہتا ہو۔

اس لئے نظام بنانے کا اصل کام افراد بنانا ہے۔ لوگوں کے اندر خدا کا خوف اور آخرت کی فکر پیدا کرنا بظاہر ایک اخروی کام ہے۔ مگر یہی نظام دنیا کی تعمیر بھی ہے۔ حقیقی معنوں میں آخرت پسند انسان جب قابل لحاظ تعداد میں پیدا ہو جاتے ہیں تو انھیں کے شخصی اوصاف کے دنیوی ظہور کا نام اسلامی نظام ہے۔ جن لوگوں کا شعور اتنا بیدار ہو جائے کہ وہ سورج کی روشنی اور ہوا کے جھونکے میں خدا کا پیغام سننے لگیں، انھیں سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ کھلے اور چھپے ہر حال میں انصاف پر قائم رہیں اور وہی کریں جو حق کی رو سے انھیں کرنا چاہئے ——— یہ اسلام ایک ابدی حقیقت ہے، وہ ہر زمانہ کے انسان کے لئے ہے خواہ وہ پہلی صدی کا انسان ہو یا بیسویں صدی کا انسان۔

منافقین کے بارے میں

منافق وہ ہے جو بظاہر مسلمانوں میں شامل ہو (حدید ۱۴) مگر حقیقۃً وہ اسلام پر یقین نہ رکھتا ہو۔ منافق دنیا کی زندگی میں مسلمانوں سے ملا ہوا رہتا ہے مگر آخرت میں اس کا حشر کافروں کے ساتھ ہوگا (نساء ۱۴۰) حتی کہ بتایا گیا ہے کہ منافقین جہنم کے سب سے پچھلے درجے میں ہوں گے (نساء ۱۴۵)۔ منافق کی خصوصیات کیا ہیں۔ قرآن سے اس سلسلہ میں حسب ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

اسلام کا نام لیتے ہوئے غیر اسلام کو اختیار کرنا۔ نساء ۶۱

زبان سے خوب اسلام ظاہر کرنا مگر اندر سے خالی ہونا۔ منافقون ۱

اسلامی فرائض خدا کے بجائے لوگوں کو دکھانے کے لئے ادا کرنا۔ نساء ۱۴۲

اسلام اور غیر اسلام کے درمیان مذبذب رہنا۔ نساء ۱۴۳

دنیوی تکلیفوں سے ڈرنا اور خدا کے عذاب سے نہ ڈرنا۔ عنکبوت ۱۰

اسلام کے لئے قربانی کا سوال ہو تو عذرات پیش کرکے اس سے الگ ہو جانا۔ آل عمران ۱۶۷

اللہ کی راہ میں پیسہ خرچ کرنے میں بخیل ہونا۔ توبہ ۷۷

سچے اہل ایمان کو دوست بنانے کے بجائے ریاکاروں کو دوست بنانا۔ توبہ ۶۷

اللہ کی مدد کا یقین نہ ہونا اور اپنی تدبیروں پر زیادہ بھروسہ کرنا۔ فتح ۶

دین کی راہ میں سماج کے دباؤ سے دینا نہ کہ خدا کے خوف سے۔ توبہ ۹۸

اپنے ساتھیوں سے مدد کے جھوٹے وعدے کرنا۔ حشر ۱۱

نفع کے وقت اسلام کا ساتھ دینا اور نقصان کا اندیشہ ہو تو دور ہٹ جانا۔ حدید ۱۴

خدا کے بھروسہ پر اپنی زندگی ڈال دینے کو بے وقوفی سمجھنا۔ بقرہ ۱۳

زمین میں اصلاح کے بجائے فساد پیدا کرنا۔ بقرہ ۱۱

بظاہر مسلمانوں میں رہنا مگر اندر اندر اسلام دشمنوں سے ملا ہونا۔ بقرہ ۱۴

منافق کی پوری زندگی دو عملی کی زندگی ہوتی ہے۔ وہ اندر سے بالکل کھوکھلا ہوتا ہے۔ مگر اپنی دنیا پرستی کی وجہ سے وہ اپنے گرد و پیش ایسی ظاہری رونقیں جمع کر لیتا ہے کہ عام لوگ اس کے بارے میں دھوکے میں آجاتے ہیں۔ اس کا سب کو خوش کرنے کا مزاج اس کی باتوں میں ایک مصنوعی خوبصورتی پیدا کر دیتا ہے (منافقون ۴) حتی کہ بعض اوقات وہ اپنی حقیقت کو چھپانے میں اتنا زیادہ کامیاب ہو جاتا ہے کہ خدا کے سوا کوئی بھی اس کی غیر اسلامی حالت سے باخبر نہیں ہوتا (توبہ ۱۰۱) مگر اس قسم کی کوئی بھی چیز منافق کے کام آنے والی نہیں۔ ظاہری کامیابیوں کے باوجود اس کو دنیا میں حقیقی اطمینان نصیب نہیں ہوتا (منافقون ۴) اور آخرت میں اس کو بدترین عذاب میں ڈال دیا جائے گا (حدید ۱۵)

اجتماعی زندگی کے آداب

مسلمان سب بھائی ہیں۔ تمہارے دو بھائیوں میں جھگڑا ہو تو ان میں صلح کرادو اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔ اے ایمان والو نہ مرد دوسرے مردوں پر ہنسیں، ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ عورتیں دوسری عورتوں پر ہنسیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور ایک دوسرے کو طعنہ نہ دو۔ اور نہ ایک دوسرے کو برے لقب سے پکارو۔ ایمان لانے کے بعد گناہ کا نام لگنا برا ہے۔ جو لوگ اس سے باز نہ آئیں وہی ظالم ہیں۔ اے ایمان والو بہت سے گمانوں سے بچو۔ کیوں کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ اور بھید نہ ٹٹولو کسی کا اور نہ پیٹھ پیچھے برائی کرو۔ کیا تمہارے اندر کوئی ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے۔ اس کو تو تم ناگوار سمجھتے ہو۔ اور اللہ سے ڈرو۔ اللہ معاف کرنے والا مہربان ہے (حجرات)

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے دنیا میں جن رحمتوں کا وعدہ کیا ہے، ان سب کا انحصار اس پر ہے کہ وہ بھائیوں کی طرح مل جل کر رہ رہے ہوں اور اگر اتفاقی سبب سے دو مسلمانوں میں کوئی نزاع برپا ہو جائے تو سارے مسلمان اس کی اصلاح کے لئے اس طرح دوڑ پڑیں جیسے کوئی اپنے گھر میں آگ لگتی ہوئی دیکھتا ہے تو اس کو بجھانے کے لئے دوڑ پڑتا ہے۔

اسی کے ساتھ ضروری ہے کہ ان تمام چیزوں سے بچنے کا مکمل اہتمام کیا جائے جو میل ملاپ کی فضا کو بگاڑتی ہیں ——— کسی میں کوئی کمی نظر آئے تو لوگ اس کا مذاق نہ اڑائیں۔ جب عزت اور ذلت خدا کے ہاتھ میں ہے تو آدمی کو ہمیشہ ڈرتے رہنا چاہئے کہ کیا معلوم دوسرا شخص خدا کے نزدیک مجھ سے بہتر ہو۔ کوئی کسی کا کچھ کام بگاڑ دے تو اس کو طعنہ نہ دینے لگے۔ بلکہ یہ سمجھے کہ خدا نے ایک مسلمان کی مدد کے لئے اس کو ذریعہ بنایا ہے۔ کسی کو بدنام کرنے کے لئے اس کا نام نہ بگاڑو، ایمان کے ساتھ اس قسم کی روش صحیح نہیں ہوتی۔ ناکافی معلومات کے ساتھ کسی سے بدگمانی ہو جائے تو آدمی اس کو دل میں رکھ نہ لے بلکہ تحقیق کرے یا اس کو دل سے نکال دے۔ کوئی کسی کا بھید جاننے کی کوشش نہ کرے۔ جس طرح آدمی اپنے بھید کو چھپانا پسند کرتا ہے اسی طرح اس کو پسند کرنا چاہئے کہ دوسرے کا بھید چھپا رہے۔ کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ غیر موجود آدمی کا برائی کے ساتھ تذکرہ کرنا اس پر ایسی حالت میں حملہ کرنا ہے جب کہ وہ دفاع کے لئے موجود نہیں ہے۔ اس سے آدمی کے اندر پست اخلاقیات پیدا ہوتی ہیں۔

ان تمام خرابیوں سے بچنے کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ خدا کا خوف ہے۔ آدمی کے اندر اگر اللہ کا خوف اور آخرت کا فکر پیدا ہو جائے تو گویا اس کے اندر سارے ضروری اوصاف پیدا ہو گئے۔ یہ احساس آدمی کی زندگی میں ایک قسم کا چوکیدار بن کر شامل ہو جاتا ہے۔ وہ ہر اس موقع پر آدمی کو روکتا ہے جب کہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ بے انصافی کرنے جا رہا ہو یا بے انصافی کر سکتا ہو۔

حضرت محمد گیان

۱

جب وقت حضرت محمدؐ صاحب کے ظہور کا ہوا، ملک عرب میں بہت سی مذہبی، مجلسی اور اخلاقی برائیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ انسانی زندگی کو لوگ کھلونوں کی طرح بے حقیقت سمجھتے تھے۔ ذرا سی بات پر کسی کی جان لے لینا ان کے لئے محض تماشا تھا۔ عورتوں کو بہت ذلیل سمجھا جاتا تھا۔ ایک ایک مرد آٹھ آٹھ دس دس بلکہ اس سے بھی زیادہ شادیاں کر سکتا تھا۔ لڑکیوں کا پیدا ہونا بہت برا خیال کیا جاتا تھا۔ لڑکیوں کو زندہ قبر میں دبا دیا جاتا تھا۔ غلاموں کی تجارت عام تھی۔ شراب خوری کی یہ حالت تھی کہ لوگوں کے گھروں میں گھڑے کے گھڑے بھرے رکھے رہتے تھے۔ لوگ شراب میں بدمست ہو کر بہت سی بے ہودہ کارروائیاں کرتے تھے۔ قمار بازی بہت زوروں پر تھی۔ بت پرستی کا یہ حال تھا کہ ہر ایک گھرانے اور خاندان میں علیحدہ علیحدہ بت موجود تھے۔

عرب کی اس افسوس ناک حالت کا نقشہ مولانا حالی صاحب نے اپنی مشہور نظم مسدس حالی میں خوب کھینچا ہے۔ جب عرب کی یہ حالت تھی تو ضروری تھا کہ اس کو دور کرنے کے لئے خداوند تعالیٰ کے اٹل قانون کے مطابق کوئی اس کا خاص بندہ آتا اور اس حالت کو دور کرتا۔

چنانچہ قریش قبیلے میں عبدالمطلب کے بیٹے عبداللہ کے ہاں ۲۹ اگست ۵۷۰ء کو حضرت محمد صاحب پیدا ہوئے مگر افسوس کہ ان کے باپ ان کی پیدائش سے چند ماہ پیشتر ہی چوبیس برس کی عمر میں اس جہان سے چل بسے تھے، اور ان کے دادا عبدالمطلب نے ان کی پرورش کا انتظام کیا۔ کچھ روز ان کی والدہ حضرت آمنہ نے انھیں اپنا دودھ پلایا پھر ان کو ایک دایہ حلیمہ نامی کے سپرد کر دیا۔ ابھی چھ سال کے ہونے نہ پائے تھے کہ والدہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اور کچھ عرصے بعد ان کے دادا بھی انتقال فرما گئے۔ اب ان کی پرورش ان کے چچا ابوطالب کے ذمے ہوئی۔

ان میں شروع سے ہی غور و فکر کی عادت تھی۔ اکثر چپ چاپ بیٹھے زندگی کے مختلف مسائل سوچا کرتے تھے۔ ان کے چچا ان کا دل بہلانے اور کچھ کاروبار سکھلانے کی غرض سے، جب وہ تجارت کے سلسلے میں باہر جاتے تو انھیں اپنے ساتھ لے جاتے۔ قدرت نے ان کے اندر شروع سے ہی راست بازی اور دیانت داری کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ بہت سے لوگ آ کر ان سے اپنے جھگڑوں اور تنازعوں کا فیصلہ کراتے تھے۔ ان سفروں میں پہاڑوں اور سمندروں کے نظاروں نے ان کے دل پر خدا کی قدرت کا سکہ خوب بٹھا دیا۔

۲

جب ان کی عمر پچیس برس کی تھی۔ تو انھیں خدیجہ نامی ایک بیوہ نے ان کی شہرت اور دیانت داری کا حال سن کر بلا بھیجا اور بہت سا مال دے کر تجارت کی غرض سے یمن کی طرف بھیجا۔ انھیں چچا کے ساتھ رہتے رہتے تجارت کا کافی تجربہ ہو گیا تھا۔ انھوں نے خدیجہ کے مال کو بہت نفع پر فروخت کیا۔ ان کو دوگنی تنخواہ پیش کی گئی۔ اور ان کی خوبیوں سے

متاثر ہوکر خدیجہ نے ان سے شادی کی درخواست کی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے چچا ابو طالب کے مشورہ سے خدیجہ کی درخواست منظور کر کے اس سے شادی کر لی۔ اس وقت خدیجہ کی عمر پینتالیس برس کی تھی۔ اور حضرت صاحب پچیس برس کے تھے۔ پندرہ سال کے بعد حضرت خدیجہ کا انتقال ہو گیا، اور انھیں بہت رنج ہوا۔ ان کی موت کے بعد اکثر حضرت صاحب بہت محبت اور شکر گزاری سے انھیں یاد کیا کرتے تھے۔ حضرت صاحب نے ایک غلام زید نامی کی حالت کمزور دیکھ کر اسے خدیجہ سے مانگ لیا اور فوراً آزاد کر دیا۔ آزادی ملنے پر زید نے اپنے گھر جانا پسند نہیں کیا، بلکہ تمام عمر حضرت محمدؐ صاحب کے پاس رہنے کا فیصلہ کر لیا۔

حضرت صاحب اپنے ہم وطنوں کی جہالت اور خرابیوں کو دیکھ کر ہر وقت اداس رہتے تھے۔ اکثر تنہائی میں اپنا وقت گزارتے اور گڑگڑا کر خدا کی درگاہ میں دعا کرتے کہ اے خدا، انھیں گناہوں سے بچا اور ان کا دل اپنی طرف پھیر۔ آخر خدا نے ان کے پاک دل کو اپنے نور سے بھر دیا۔ اور یہ محسوس کرنے لگے کہ خدا چاہتا ہے کہ میں اس کا رسول بن کر لوگوں کو اس کی پرستش کی طرف راغب کروں۔ جب ان کی عمر چالیس برس کی تھی۔ اور غار حرا میں بیٹھے ہوئے خدا کے دھیان میں محو تھے، تو اچانک ایک آواز ان کے کان میں پڑی کہ "اے محمدؐ! اٹھ اور خدا کا نام لے کر پڑھ، تجھ پر وہ راستہ کھولا گیا ہے، جس کی تو تلاش میں تھا۔" یہ آواز سن کر وہ کانپ اٹھے۔ گھبرائے ہوئے اور پسینوں میں تر گھر پہنچے اور سارا قصہ حضرت خدیجہؓ کو سنایا۔ انھوں نے حضرت کو تسلی دی اور کہا کہ آپ خدا کے رسولؐ ہیں اور آپ کو ضرور کامیابی حاصل ہوگی۔ یہ کہہ کر وہ ان پر ایمان لائیں۔ اور بعد میں حضرت علیؓ، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت زیدؓ اور چند لوگوں نے انھیں تسلیم کیا۔ اور ان پر ایمان لے آئے۔

تین سال تک تو حضرت محمدؐ صاحب چپکے چپکے اپنے چند دوستوں اور رشتے داروں کو خدا کا حکم سناتے رہے۔ آخر ایک دفعہ تمام اپنے رشتے داروں، دوستوں اور قبیلے والوں کو جمع کر کے ان کو بتلایا کہ میں خدا کی طرف سے تمھیں اس وحدہٗ لاشریک کی پرستش کی تلقین کرنے اور برائیوں سے بچانے کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ یہ سن کر لوگوں نے بہت شور مچایا۔ اور کہا کہ تو غلط کہتا ہے۔ مگر انھوں نے کچھ پرواہ نہیں کی اور باقاعدہ مختلف مقامات پر وعظ کرنا شروع کر دیا۔ لوگوں نے حضرت کے چچا ابو طالب کے پاس جا کر کہا تو اپنے بھتیجے کو سمجھا کہ اس کفر سے باز آئے ورنہ ہم اس کے ساتھ بہت برا سلوک کریں گے۔ ابو طالب نے بہت سمجھایا کہ بیٹا مفت میں تم کیوں لوگوں سے بیر باندھتے ہو۔ مزے سے زندگی بسر کرو۔ نہ جانے یہ لوگ غصہ میں آ کر کیا کر بیٹھیں۔ مگر محمدؐ صاحب نے کہا کہ چاہے ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے میں اپنے ارادے سے باز نہیں آ سکتا۔ خدا نے میرے سپرد یہ کام کیا ہے۔ اس کا بجا لانا میرا فرض ہے۔ چاہے ایسا کرنے میں میری جان تک بھی جاتی رہے۔ جب ابو طالب کو یہ معلوم ہوا کہ محمدؐ اپنے ارادے میں پہاڑ کی طرح مضبوط ہے تو کہا۔ اچھا کچھ ہی ہو میں تیری حفاظت کروں گا۔ چچا کی زبان سے یہ حوصلہ افزا الفاظ سن کر ان کا جوش بہت زیادہ بڑھ گیا۔ اور خوب زور سے اپنے مشن کا پرچار کرنا شروع کر دیا۔

اب حضرت صاحب کے پیروؤں کی تعداد روز بروز زیادہ ہوتی گئی اور ساتھ ہی ساتھ قریشیوں کی مخالفت بھی بڑھ گئی۔ انھوں نے ان کو طرح طرح کے لالچ دئے۔ دھمکیاں بھی دیں۔ ان کو قتل کرنے کا ارادہ بھی کیا۔ مگر انھوں نے ان کی

مخالفتوں کی مطلق پرواہ نہ کی۔ خود حضرت صاحب کے چچا ابولہب اور اس کی بیوی ان کے سخت مخالف ہوگئے۔ اور انھیں طرح طرح کی اذیتیں پہنچانے لگے یہاں تک کہ جب وہ صبح کو منھ اندھیرے عبادت کے لیے جنگل میں جاتے تو بیچی ان کے راستے میں کانٹے بچھا دیتی اور ان کے پاؤں اور پنڈلیاں زخمی ہو جاتے۔ ایک دفعہ جب یہ نماز پڑھ رہے تھے تو ایک شخص نے ان کے گلے میں پٹکا ڈال کر گلا گھونٹنا چاہا۔ مگر حضرت ابوبکر رضہ موقع پر پہنچ گئے اور انھوں نے ان کی جان بچائی۔ جب وہ کھانا کھانے بیٹھتے تو لوگ ان کے کھانے میں کوڑا کرکٹ گرا دیتے۔ کئی دفعہ ان پر گندگی پھینک دیتے۔ ان کی لڑکی کپڑوں پر پانی ڈالتی جاتی اور روتی جاتی۔ مگر یہ کہتے بیٹی کچھ پرواہ نہیں۔ خدا خود میری حفاظت کرے گا۔

اسی طرح ان کے پیروؤں کو بھی لوگ طرح طرح کی تکلیفیں دیتے تھے۔ ان کی چھاتیوں پر پتھر کی سلیں رکھ دیتے، ان کو گرم ریت پر لٹا دیتے۔ ان کی عورتوں کو ننگا کر کے بہت بے عزت کرتے۔ مگر یہ لوگ اعتقاد کے ایسے پکے تھے کہ ہر قسم کا دکھ اٹھا کر بھی اسلام کو نہ چھوڑتے اور ہر حالت میں خدا کا شکر کرتے۔

—— ۳ ——

قریش کے ظلم و ستم سے تنگ آکر بہت سے مسلمان حبش کے علاقے میں چلے گئے۔ اور وہاں کے عیسائی بادشاہ نجاشی کی پناہ لی لیکن وہاں بھی مخالفوں نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اور بادشاہ سے جا کر کہا کہ ان لوگوں نے اپنے باپ دادا کا دین چھوڑ دیا ہے۔ اور ایک نیا دین نکالا ہے۔ جو آپ کے دین کے بھی مخالف ہے۔ انھیں پناہ نہ دو۔ نجاشی نے مسلمانوں کو بلا کر سب حال دریافت کیا۔ اور جب جعفر نے بادشاہ کو بتلایا کہ ہم لوگ پہلے جاہل تھے۔ بت پرستی کرتے تھے۔ گندی اور فحش باتیں بکتے تھے۔ لڑکیوں کو مار ڈالتے تھے۔ شراب پیتے تھے۔ جوا کھیلتے تھے۔ غرض ہر قسم کی بدکاریوں میں مبتلا تھے۔ خدا نے ہمارے لئے رسولؐ بھیجا۔ اور اس نے ہمیں نیکی کی طرف مائل کیا۔ یہ سن کر نجاشی کے دل پر بہت اچھا اثر ہوا۔ اور اس نے کہہ دیا کہ یہ میری پناہ میں آئے ہیں، میں انھیں یہاں سے نکال نہیں سکتا۔ یہ سن کر مخالفین اپنا سا منھ لے کر واپس چلے گئے۔

مسلمانوں کے حبش میں چلے جانے کے بعد حضرت صاحبؐ مکہ میں برابر وعظ کرتے رہے۔ اس اثنا میں دو زبردست ہستیوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ایک تو خود ان کے چچا حمزہؓ جو بہت بارسوخ شخص تھے اور دوسرے عمر جو بعد میں حضرت عمر رضہ کہلائے۔ حضرت عمر رضہ پہلے ان کے جانی دشمن تھے۔ اور تلوار گلے میں ڈال کر ان کے قتل کو نکلے تھے۔ مگر قرآن شریف کی چند آیتیں سن کر ان کے پیرو بن گئے۔ اور چار یاروں میں شمار ہونے لگے۔ جب ان کے چچا ابو طالب کا انتقال ہو گیا تو لوگوں کی مخالفت اور بھی بڑھ گئی۔ انھوں نے مکہ چھوڑ کر طائف میں قیام کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر وہاں کے لوگ پہلے ہی ان کے مخالف تھے۔ جب ان کا وعظ سنا تو بہت برافروختہ ہوئے۔ اور انھیں وہاں سے نکال دیا۔ مکہ والوں نے انھیں شہر میں داخل نہ ہونے دیا۔ مگر ایک شخص مطعم نامی نے لوگوں کو بہت لعنت ملامت کی اور کہا کہ میں محمدؐ کو اپنی پناہ میں لیتا ہوں۔ اس طرح وہ مکہ میں رہنے لگے۔ مگر شریر لوگ مخالفت سے کب باز آتے تھے۔ انھوں نے مطعم کو بھی تنگ کرنا شروع کر دیا۔ حضرت صاحبؐ نے جب دیکھا کہ میری وجہ سے بے چارے مطعم کو بھی سخت تکلیف دی جاتی ہے۔ تو انھوں نے کہہ دیا کہ میں اب آپ کی پناہ میں رہنا نہیں چاہتا۔ خدا میرا محافظ ہے۔ جو ہوگا میں برداشت کروں گا۔ مجھے ہرگز یہ گوارا نہیں کہ میرے سبب سے آپ کو تکلیف ہو۔

اب ان کا وعظ سن کر بہت سے لوگ ان کے پیرو بن گئے۔ طفیل نامی رئیس جو اس ڈر سے کہ ان کا کلام اس کے کان میں نہ پڑ جائے اور اس پر اثر ہو جائے اپنے کان میں روئی ٹھونس لیتا تھا۔ ایک دفعہ جلدی میں ٹھونسنا بھول گیا اور ان کا وعظ سن کر ان کا پیرو بن گیا۔ ایک دفعہ جب وہ تاجروں اور جاتریوں کو وعظ کر رہے تھے۔ تو چند مدینے کے لوگ بھی وہاں موجود تھے۔ ان کا وعظ سن کر وہ ان کے پیرو بن گئے۔ اور اپنے ساتھ اسلام کا واعظ لے گئے۔ وہاں بہت لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ پھر ان کو مدینہ بلایا۔ چنانچہ بہت سے مسلمان مدینے چلے گئے۔ مدینہ والوں نے حضرت صاحب اور مسلمانوں کا بہت تپاک سے استقبال کیا۔ مسلمانوں کو اپنے گھروں پر ٹھیرایا۔ ان کو کاشت کے لئے اپنی زمینیں دے دیں اور ہر طرح پر ان کو برادرانہ حقوق عطا کئے۔

حضرت صاحبؐ نے کچھ روز مدینہ سے تین میل کے فاصلے پر قبا نامی آبادی میں قیام کیا۔ حضرت علیؓ بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہاں انھوں نے پہلی مسجد نماز کے لئے بنوائی۔ اس کے بنانے میں خود آپ نے صحابہ کے ساتھ مل کر مزدوروں کا کام کیا۔ مدینہ والوں کے زور دینے پر آپ مدینہ گئے۔ اور ارادہ کیا کہ جہاں میری اونٹنی ٹھیر جائے گی وہیں قیام کروں گا۔ چنانچہ حضرت ابوایوبؓ کے مکان کے پاس اونٹنی ٹھیر گئی اور آپ نے وہیں قیام کیا۔ وہاں اگرچہ زمین مفت ملتی تھی مگر آپ نے قیمت دے کر زمین خریدی اور یہاں انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ محنت مزدوری کرکے مسجد بنائی۔ اس وقت مسلمانوں کو آزادی کے ساتھ نماز پڑھنا نصیب ہوا۔ اور جمعہ کا دن جماعت کے ساتھ مل کر نماز پڑھنے کے لئے مقرر ہوا۔ مدینے میں مسلمانوں کی رہائش اور گزارے کا تسلی بخش انتظام کرکے آں حضرتؐ نے یہودیوں کے ساتھ عہدنامہ کرکے ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات پیدا کرلئے۔ اگرچہ افسوس ہے کہ یہودی لوگ اپنے اقرار پر قائم نہ رہے۔ اور بعد میں مسلمانوں کے مخالفوں کے ساتھ سازباز کرکے انھیں بہت تکلیف دیتے رہے۔

———— ۴ ————

گو اب مسلمان مدینے میں امن و امان سے رہتے تھے۔ لیکن ان کے دشمنوں کو یہ گوارا نہ تھا۔ کہ وہ اس طرح پر آزادی سے اپنا کام کرتے رہیں۔ وہ تو چاہتے تھے کہ اگر ان کا بس چلے تو مسلمانوں کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹادیں۔ انھوں نے عبداللہ نامی ایک شخص سے جو مدینے میں رہتا تھا اور دل ہی دل میں حضرت صاحب کا روز افزوں رسوخ دیکھ کر بہت جلتا تھا، خط و کتابت کرنی شروع کی اور اس سے کہا کہ حضرت صاحب کو مدینے سے نکال دے۔ مگر جب وہ کچھ نہ کرسکا تو اس نے اور مخالفوں نے آس پاس کے قبیلوں کو مسلمانوں کے برخلاف بہت بھڑکایا۔ اور یہ سب لوگ بہت سی جمعیت لے کر بدر کے مقام پر پہنچ گئے۔ آں حضرت جنگ نہ چاہتے تھے۔ مگر مسلمانوں کی حفاظت کے لئے خدا سے دعا کرکے تین سو آدمی لے کر آگے بڑھے اور ان جاں باز لوگوں نے ایک ہزار آدمیوں کو سخت شکست دی اور بہت سے آدمی قید کر لئے۔ حضرت محمدؐ صاحب نے ان کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا اور ضمانت لے کر انھیں چھوڑ دیا۔

اس شکست سے مخالفوں کو بہت صدمہ پہنچا۔ اور انھوں نے مسلمانوں سے بدلہ لینے کی زبردست تیاریاں شروع کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے تین ہزار آدمیوں کی زبردست فوج تیار کی اور بہت سا سامان جنگ جمع کیا بہت سی

عورتیں بھی فوج کے ساتھ ہولیں۔ یہ فوج مدینے کی طرف روانہ ہوئی۔ حضرت صاحبؐ نہیں چاہتے تھے کہ مقابلہ کیا جائے۔ مگر اور مسلمانوں کے زور دینے پر لڑائی کے لئے تیار ہو گئے۔ ان کے پاس صرف سات سو جوان تھے۔ خوب گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ دشمنوں کے بہت سے آدمی کام آئے۔ خود آنحضرت زخمی ہوئے۔ اس خبر سے مسلمان مایوس ہو گئے اور ان کی فوج میں کھلبلی مچ گئی۔ اس لڑائی کے متعلق تحقیق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ کس کو شکست ہوئی۔ بہرحال طرفین کا سخت نقصان ہوا۔ اس لڑائی میں حضرت صاحبؐ نے اپنے دشمنوں کے لئے دعا مانگی کہ اے خدا انھیں معاف کر کیونکہ یہ نہیں جانتے کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔

اس جنگ کے بعد مخالفوں کے حوصلے بڑھ گئے اور انھوں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ اب ہم اسلام کو بالکل نیست و نابود کر کے چھوڑیں گے۔ کئی قبیلوں کے لوگوں نے مسلمان بننے کا بہانہ کر کے مسلمانوں کے بہت سے واعظوں کو قتل کر ڈالا۔ یہودی لوگ بھی اسلام کے دشمنوں کے ساتھ مل گئے۔ چنانچہ چوبیس ہزار فوج تیار ہو گئی۔ مگر خدا کی غیبی طاقت مسلمانوں کی امداد کر رہی تھی اور ان کا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔ چنانچہ انھوں نے مدینے کے اس طرف جہاں پہاڑ نہ تھے۔ ایک خندق کھودنے کا ارادہ کیا۔ جس میں خود حضرت صاحبؐ نے ہاتھ میں پھاوڑہ لے کر مزدوروں کا کام کیا۔ خدا کی کرنی ایسی ہوئی کہ ایک رات سخت آندھی چلی اور موسلا دھار مینہ برسا۔ اور دشمنوں کے سب خیمے اکھڑ گئے۔ ان پر غضب کا خوف طاری ہو گیا۔ وہ سمجھے کہ خدا کی طرف سے قیامت نازل ہوئی ہے۔ ان میں سخت ابتری پھیل گئی اور سب لوگ اپنا بدھنا بوریا باندھ کر چلتے بنے۔ اس طرح پر میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ درحقیقت اسے غیبی امداد ہی سمجھنا چاہیے۔ ورنہ اگر لڑائی ہوتی تو ایک بھی مسلمان نہ بچ سکتا تھا۔

یہودیوں کی شرارتیں برابر جاری تھیں۔ حضرت صاحبؐ تو ہر چند چاہتے تھے کہ انھیں کسی قسم کی تکلیف نہ دی جائے اور وہ مسلمانوں کے ساتھ صلح کر کے چین سے مدینے میں رہیں۔ لیکن خندق کی لڑائی میں انھوں نے سخت غداری کا ثبوت دیا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی تقریر اور نظموں میں مسلمانوں اور خصوصاً حضرت صاحبؐ کی ہجو کرتے رہتے تھے۔ مسلمان عورتوں کو وہ آتے جاتے بہت تنگ کرتے تھے۔ ایک دفعہ زینب نامی یہودی عورت نے حضرت صاحبؐ اور بہت سے مسلمانوں کو دعوت دی اور کھانے میں زہر ملا دیا۔ حضرت صاحبؐ کو شبہ ہو گیا۔ اور خدا کی مہربانی سے سب کی جان بچ گئی۔ اس سازش میں بہت سے بڑے بڑے یہودی شامل تھے۔ اور کوئی ہوتا تو سب یہودیوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیتا۔ مگر آنحضرتؐ نے چند سرغنوں کو ہی سزا دینا کافی سمجھا۔

۵

اب سب کو یقین ہو گیا تھا کہ قریش اب خاموش ہو کر بیٹھ جائیں گے۔ کیوں کہ مسلمانوں کو نیست و نابود کرنا خالہ جی کا گھر نہ تھا۔ حضرت صاحبؐ کا بھی یہ خیال تھا کہ اب قریش دل چھوڑ بیٹھے ہیں۔ اس لئے انھوں نے حج کے ارادہ سے مکے جانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ تیرہ چودہ سو مسلمانوں کو ساتھ لے کر کعبے کی زیارت کو روانہ ہوئے۔ اپنے ساتھیوں کو پہلے ہی حکم دے دیا تھا کہ کوئی شخص ہتھیار یا لڑائی کا سامان اپنے ساتھ نہ لے جائے۔ اور صرف ایک تلوار میان میں

اپنی حفاظت کے لئے رکھے۔ جب وہ مکے کے قریب پہنچے تو قریش کو شبہ ہوا کہ مسلمان کے پر حملہ کرنے آئے ہیں۔ جب قریش کا قاصد ان کے پاس پہنچا تو انھوں نے کہا کہ ہم محض حج کی نیت سے یہاں آئے ہیں۔ اور ہم چاہتے کہ قریش کے ساتھ صلح ہو جائے۔ چنانچہ کچھ قیل و قال کے بعد صلح کی چند شرطیں طے ہو گئیں۔ اور مسلمان بغیر حج کئے واپس آ گئے۔ بعض مسلمانوں نے اس کو بہت برا سمجھا۔ حضرت صاحبؐ نے اس موقع پر صلح کرنا ہی مناسب سمجھا تھا۔ اگر لڑائی ہوتی تو ایک مسلمان بھی زندہ واپس نہ آتا۔ کیوں کہ وہ بالکل جنگ کے لئے تیار تھے۔ یہ واقعہ صلح حدیبیہ کہلاتا ہے۔

اس صلح کے بعد مسلمانوں کی طاقت دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرنے لگی۔ حضرت صاحبؐ نے مختلف مقامات پر اپنے واعظ بھیجے۔ اور مختلف سلطنتوں کے حکمرانوں کو دعوت اسلام دی۔ کئی سلطنتوں نے اسلام کی بہت قدر کی اور مسلمانوں کو وعظ کرنے کی کھلی اجازت مل گئی۔

قریش کے لوگ صلح تو ضرور کر چکے تھے۔ مگر اسلام کی ترقی انھیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھی اور وہ اسی تاک میں رہتے تھے کہ جب موقع ملے اسلام کا خاتمہ کر دیں۔ چنانچہ وہ برابر چھیڑ چھاڑ کرتے رہے۔ ایک دفعہ انھوں نے مسلمانوں کے حلیف بنو خزاعہ کے آدمی کو عین کعبے میں قتل کر ڈالا۔ آنحضرتؐ نے قاصد بھیجا کہ کیا آپ حدیبیہ کے صلح نامے کو برقرار رکھنا نہیں چاہتے۔ قریش نے ٹال مٹول کرنا چاہا۔ اور آخر کہہ دیا کہ وہ صلح نامہ قائم نہیں رہ سکتا۔

اب آنحضرتؐ نے فیصلہ کیا کہ روز روز کی جھک جھک ٹھیک نہیں ہے۔ اب قریش کو ایسا سبق سکھانا چاہئے کہ آئندہ سر اٹھانے کی جرأت نہ کریں۔ چنانچہ انھوں نے زور شور سے مکے پر چڑھائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اور دس ہزار جرار فوج لے کر ۸ ہجری میں مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ قریش پر مسلمانوں کا خوف طاری ہو جائے اور وہ بلا جنگ کئے اطاعت قبول کر لیں۔ چنانچہ مکے سے چند میل کے فاصلے پر ڈیرے ڈال دئے۔ اور سب نے اپنے اپنے خیمہ کے سامنے آگ جلا دی۔ قریش یہ دیکھ کر کہ اس قدر اسلامی لشکر مکے پر چڑھ آیا ہے ڈر گئے۔ ابوسفیان جو اسلام کا جانی دشمن تھا، گو وہ دل میں اسلام کی روحانی قوت کو محسوس کرتا تھا، قاصد بن کر گیا۔ لیکن حضرت صاحبؐ کے نیک سلوک سے متاثر ہو کر اس نے اپنے قصوروں کی معافی مانگ لی۔ حضرت صاحبؐ نے دریا دلی سے اسے معاف کر دیا۔ اور اس نے اسلام قبول کر لیا۔ اس نے واپس جا کر اعلان کر دیا کہ اب اسلام کا مقابلہ کرنا بے سود ہے جو شخص امان چاہتا ہے یا تو میرے گھر میں چلا آئے یا اپنا دروازہ بند کرے۔ کسی کو ایذا نہیں پہنچے گی۔

اب اسلامی لشکر مختلف طرفوں سے مکے میں داخل ہوا۔ حضرت صاحب نے فوج کے افسروں کو سخت حکم دے دیا کہ مکے والوں پر کسی قسم کی سختی نہ کی جائے۔ آنحضرتؐ نے اپنے رفیقوں کے ساتھ کعبہ میں جا کر نماز پڑھی۔ شہر کے لوگ تھر تھر کانپ رہے تھے کہ نہ جانے اب کیا ہوگا۔ شاید آنحضرتؐ قتل عام کا ہی حکم دے دیں۔ اس لئے بہت سے لوگ شہر سے بھاگ جانے کا انتظام کر رہے تھے۔ جب آپ کو معلوم ہوا کہ لوگ اس قدر خوف زدہ ہو رہے ہیں تو آپ نے اعلان کر دیا "کوئی مسلمان تلوار نہ چلائے۔ اور کوئی شخص شہر چھوڑ کر نہ جائے۔ آج لڑائی اور انتقام کا دن نہیں ہے بلکہ آج شفقت اور رحمت کا دن ہے۔ میں تمھارا دشمن ہو کر نہیں آیا ہوں۔ اور نہ تم سے کسی قسم کا بدلہ لینا چاہتا ہوں۔

میں تم سے وہی سلوک کروں گا۔ جو یوسفؑ نے مصر میں اپنے بھائیوں سے کیا تھا۔ میں تم کو جھڑکی تک بھی نہ دوں گا۔ یہ اعلان سن کر لوگوں کی جان میں جان آئی۔ اور انھوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب وہ واقعات پیش آئے جن کی مثال شاید ہی دنیا کی تواریخ میں کہیں ملتی ہو۔ ابو سفیان کو جو پہلے مسلمانوں کے خون کا پیاسا تھا، آنحضرتؐ نے مکے میں داخل ہونے سے پہلے ہی معاف کر دیا تھا۔ اس کی بیوی ہندہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس کے خاوند نے اسلام قبول کر لیا ہے تو وہ غصے میں آپے سے باہر ہو گئی۔ اور اپنے خاوند کی داڑھی پکڑ کر اسے جوتیوں سے خوب پیٹا۔ اور اس کے منہ پر تھوکا۔ وہ بہت ڈری ہوئی تھی۔ کہ نہ جانے مجھے کیا سزا ملے۔ کیوں کہ اس نے لڑائی میں آنحضرتؐ کے چچا حمزہؓ کی لاش کا پیٹ چاک کر کے اور کلیجہ نکال کر دانتوں سے چبایا تھا۔ جب وہ آں حضرتؐ کے سامنے آئی تو شرم کے مارے منھ پر نقاب ڈال کر آئی۔ آں حضرتؐ نے کہا۔ اے ہندہ میں خوش ہوں کہ تو اپنے اعمال پر پشیمان ہے۔ تو صرف ایک خدا کی پرستش کیا کر۔ ہرگز جھوٹ نہ بولا کر اور ہمیشہ بدکرداری سے پرہیز کیا کر۔ یہ کہہ کر اسے بالکل معاف کر دیا۔ وہ آنحضرتؐ پر ایمان لے آئی۔

عکرمہ کو جس نے مکے میں داخل ہوتے ہی دو بے گناہ مسلمانوں کو تیر مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ اس کی بیوی کی سفارش پر معاف کر دیا۔ اسی طرح ایک شخص ہبار نامی کو جس نے آں حضرتؐ کی لڑکی زینب کو جب کہ وہ حاملہ تھیں۔ پتھر مار کر ہلاک کر دیا تھا معاف کر دیا۔

طائف کے لوگوں نے جب آں حضرتؐ وہاں گئے تھے تو انھیں پتھر مار مار کر گھائل کر دیا تھا۔ پھر سر اٹھایا۔ ان پر چڑھائی کر کے ان کے قلعے فتح کر لئے۔ اور چھ ہزار فوجیوں کو قید کر لیا۔ لیکن وہاں کے لوگوں کی طرف سے یہ یقین دلانے پر کہ وہ ہمیشہ وفادار رہیں گے سب قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ اور کسی کو بھی مسلمان بننے پر مجبور نہ کیا۔ حالاں کہ اگر وہ چاہتے تو سب کو مسلمان بنا سکتے تھے۔

اب اسلام تمام عرب میں پھیل چکا تھا۔ اور عربوں نے آپ کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا تھا۔ آپ نے تمام صیغوں کے انتظام کی طرف توجہ کی۔ محصول اور لگان کی وصولی کے قواعد بنائے۔ فوجوں کی باقاعدہ ترتیب اور تربیت کا انتظام کیا۔ سرحد کی حفاظت کے لئے چھاؤنیاں بنائیں۔ ہر ایک کے لئے آمدنی کا خاص حصہ زکوٰۃ میں دینا ضروری قرار دیا۔ مختلف قبیلوں کی بغاوتوں کو رفع کرنے کا خاص انتظام کیا۔

آس پاس کی عیسائی حکومتوں کو اسلام کی ترقی بہت ناگوار گزرتی تھی۔ اور وہ اکثر کچھ نہ کچھ چھیڑ چھاڑ کرتی رہتی تھیں۔ ان کی سرکوبی کا بھی خوب انتظام کیا اور تمام ارد گرد کے حاکموں کے ساتھ عہد نامے کر لئے تاکہ تمام ملکوں میں امن و امان قائم رہ سکے۔ اب انھوں نے نہایت دھوم دھام سے حج کی تیاریاں کیں اور اس حج کے موقع پر ایک لاکھ چالیس ہزار مسلمان شامل ہوئے۔ چند ہی سال میں اسلام کا تمام عرب میں پھیل جانا اور مختلف مخالف فرقوں اور قبیلوں کا آں حضرتؐ کا پیرو بن جانا در اصل ایک معجزہ تھا۔ شاید ہی کسی اور پیغمبر کو اپنی زندگی میں اس قدر کامیابی نصیب ہوئی ہو۔ اس حج کے موقع پر ہر طرف بہشتی نظارہ دکھائی دیتا تھا۔ جہاں چھوٹے بڑے امیر و غریب کی کچھ تمیز نہ تھی۔ ہر طرف

انسانی مساوات کا دلکش اور دل فریب منظر تھا۔ اور سب اپنے محبوب کے گرد جمع ہو کر اپنے خالق خداوند تعالیٰ کی پرستش اور عبادت میں مصروف تھے۔

اب بیس بائیس سال کی لگاتار محنت اور مخالفوں کی سختیوں اور اذیتوں اور نیز جنگ و جدل و ملکی انتظام کی اہم ذمہ داریوں کی وجہ سے آپ کا جسم بہت کمزور ہو گیا تھا۔ اگر کوئی اور ہوتا تو شاید ان مشکلات کا کبھی کا شکار ہو گیا ہوتا۔ مگر انسان آخر انسان ہے اس کی جسمانی طاقتیں آخر جواب دینے لگتی ہیں

چنانچہ آپ ۱۱ھ میں بیمار ہو گئے۔ حضرت عائشہ رضؓ اور ان کے رفیقوں نے ان کی تیمارداری میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ آخری دن مسواک سے منہ صاف کیا اور دوشنبہ کے دن ۸ جون ۶۳۲ء کو اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔ مسلمانوں کو ان کی جدائی کا بے حد رنج ہوا۔ مگر حضرت ابوبکر رضؓ نے ان کو بہت بہت دلاسا دیا۔ آخر وہ سب اس واقعہ کو خدا کی مرضی سمجھ کر چھاتی پر پتھر رکھ کے بیٹھ گئے۔

— ۶ —

آں حضرتؐ کی عادات بہت سیدھی سادی تھیں۔ ہمیشہ موٹا کپڑا استعمال کرتے تھے۔ کرتہ، چادر اور تہ بند کے سوائے اور کپڑا نہ پہنتے تھے۔ خوراک کی سادگی کا تو یہ حال تھا کہ شاید غریب مزدور بھی آج کل ایسی سادہ خوراک نہ کھاتا ہو۔ جو کا آٹا ہانڈی میں آگ پر چڑھا دیا اور اوپر سے کچھ زیتون کا تیل، نمک اور کالی مرچیں ڈال دیں اور آپ کا کھانا تیار ہو گیا۔ اکثر کھجوریں کھا کر ہی گزارہ کر لیا کرتے۔ غرض جو سامنے آتا وہی خدا کا شکر کر کے کھا لیتے تھے۔

صفائی کا بہت خیال رکھتے تھے۔ خود اپنے ہاتھ سے اپنے مکان میں جھاڑو دے لیا کرتے تھے۔ اپنے کپڑے خود دھو لیا کرتے تھے اور پھٹے پرانے کپڑے خود سی لیا کرتے تھے۔ ان کے مکان میں ایک چارپائی، ایک پانی کی ٹھلیا اور ایک بورئے کے سوائے اور سامان موجود نہ رہتا تھا۔ ہمیشہ وہ اپنا کام خود اپنے ہاتھ سے کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اوائل عمر میں وہ بکریاں چرایا کرتے تھے۔ گھر بار کے کام کاج میں اپنی بیویوں کا ہمیشہ ہاتھ بٹاتے تھے۔ بکریوں کا دودھ دوہ لیتے تھے۔ جوتیاں خود گانٹھ لیتے تھے۔ بازار سے سودا سلف خرید لاتے۔ اونٹوں کو باندھ لیتے۔ اور ان کے آگے چارہ ڈالتے تھے۔ غرض کسی قسم کے کام سے انھیں عار نہ تھی۔ مسلمانوں کے ساتھ مل کر انھوں نے مسجدیں بنائیں۔ مزدوروں کا کام کیا۔ کھانے سے پہلے اور پیچھے ہاتھ دھوتے اور منہ کو خوب صاف کرتے تھے۔ داتن (مسواک) کیا کرتے تھے۔ بالوں میں ہمیشہ کنگھی کرتے اور کبھی کبھی تیل بھی لگایا کرتے تھے۔

انھوں نے اپنی سادہ زندگی سے یہ ثابت کر دیا کہ کسی قسم کا کام یا پیشہ ذلیل نہیں، بشرطیکہ راست بازی اور دیانت داری کو مدنظر رکھا جائے۔

مزاج میں انکساری غضب کی تھی۔ کوئی تعظیم کو کھڑا ہوتا تو اسے منع کر دیتے۔ خواہ کوئی غلام بھی کھانے کو بلاتا تو اس کے ہاں بلا تکلف چلے جاتے اور سب کے ساتھ مل کر کھانا کھاتے۔ جب کسی مجمع میں جاتے تو سب کے ساتھ مل کر بیٹھتے تھے۔ جب کوئی دوسرا بات کرتا تو اس میں ہرگز دخل نہ دیتے تھے۔ اگر کچھ کہنا ضروری ہوتا تو بہت حلیمی اور عاجزی

سے کہتے۔ آپ کا دل دشمنی عداوت، انتقام، سخت گیری اور درشت کلامی کے ناپاک جذبات سے پاک تھا۔ ہمیشہ معافی اور درگزر کے لئے تیار رہتے تھے۔ جیسا کہ مکے کی فتح کے وقت بہت سے واقعات سے ظاہر ہوا۔ سچائی، دیانت داری اور الطاف ان کی فطرت کے جزو بن گئے تھے ہر وقت اپنے پیروؤں کو راست بازی کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ ان کی فیاضی بے مثال تھی۔ حتی الامکان کسی کے سوال کو رد نہ کرتے تھے۔ خود تکلیف اٹھا کر اور بھوکا رہ کر دوسروں کے سوال کو پورا کرتے تھے۔ مال و دولت ہرگز جمع نہ کرتے تھے بلکہ جب تک مال تقسیم نہ کر دیتے ان کو چین نہ پڑتا تھا۔ غریب، یتیم اور محتاجوں کی امداد کو ہر وقت تیار رہتے تھے۔ انھوں نے غلاموں کے حقوق آقاؤں پر قائم کئے۔ اور عورتوں اور بچوں کے حقوق مردوں پر قائم کئے۔

جب کسی کی بیماری کی خبر سن لیتے تو اس کی بیمار پرسی کے لئے جاتے۔ جب کوئی فوت ہو جاتا تو اس کے جنازے کے ساتھ جاتے۔ انسان کا تو ذکر کیا وہ بے زبان جانوروں پر بھی بہت ترس کھاتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے جانوروں کی لڑائی کو عرب کے ہر مقام پر بالکل بند کر دیا تھا۔ لاغر جانوروں کو دیکھتے تو کہا کرتے اے لوگو! بے زبانوں کے بارے میں خدا سے ڈرو۔ مہمان نواز اول درجے کے تھے۔ جب کوئی مہمان آجاتا تو اپنا کھانا اس کو کھلا دیتے۔ آپ بہت شیریں زبان تھے، سب سے بہت نرمی اور ملائمت سے گفتگو کرتے تھے۔ آپ ہرگز کسی کو بد دعا نہیں دیتے تھے۔ خداوند تعالیٰ کی بخشش و رحمت پر ایسا زبردست اعتقاد رکھتے تھے کہ بڑی بڑی مصیبتوں میں حوصلہ نہ ہارتے تھے۔ اسی وجہ سے مٹھی بھر آدمیوں سے دشمنوں کے ٹڈی دل کا مقابلہ کامیابی سے کرتے رہے۔ غار ثور میں جب جا کر ابوبکرؓ کے ساتھ چھپے تھے تو دشمنوں کی آہٹ سن کر ابوبکرؓ گھبرا گئے اور کہا کہ اے رسول اب ہم دو ہیں۔ نذر سے کہا نہیں ہم تین ہیں۔ یعنی تیسرا خدا ہمارے ساتھ ہے۔ کیسا زبردست ایمان ہے۔

حضرتؐ کے چند واقعات

ہم ذیل میں حضرت صاحبؐ کے متعلق چند روایات درج کرتے ہیں جن سے صاف معلوم ہو جائے گا کہ خداوند تعالیٰ نے ان کو کیسی کیسی خوبیاں عطا کی تھیں۔

۱۔ ایک یہودی کا کسی مسلمان سے جھگڑا ہو گیا اور فیصلہ آں حضرت پر چھوڑ آگیا۔ حضرت نے بے رو رعایت تحقیقات کی اور فیصلہ یہودی کے حق میں دے دیا۔ اور مسلمانوں کی ناراضگی کی مطلق پروا نہ کی۔

۲۔ ایک شخص کو چوری کے الزام میں گرفتار کر کے ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ کئی بڑے بڑے آدمیوں نے اس کی سفارش کی مگر آں حضرتؐ نے انصاف کو مدنظر رکھ کر سفارشوں کی مطلق پروا نہ کی۔ اور حکم دے دیا کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کے لئے یہی حکم دیتا کہ اس کے ہاتھ کاٹ دئے جائیں۔

۳۔ ایک دفعہ ایک یہودی کا کچھ روپیہ حضرت کو دینا تھا۔ وہ یہودی تقاضا کرنے آیا اور سخت کلامی کرنے لگا۔ حضرت عمرؓ کو اس پر بہت غصہ آیا مگر حضرت صاحبؐ نے فرمایا۔ اے عمرؓ یہ بات ٹھیک نہیں۔ تجھے چاہئے تھا کہ ہم دونوں کو نصیحت کرتا کہ قرض خواہ کو نرمی سے مطالبہ کرنا چاہئے۔ اور مجھے نیکی سے روپیہ واپس کرنا چاہئے۔ حضرت نے یہودی

کو پاس بٹھایا اور اس کو قرضے سے کچھ زیادہ دے کر رخصت کیا۔ اس نیک سلوک کا یہودی پر ایسا اثر ہوا کہ وہ ان کا مرید بن گیا۔

۴۔ ایک دفعہ آپ اپنے احباب کے ساتھ کہیں دور جنگل میں سیر کو گئے۔ جب کھانا بنانے کی ضرورت پیش آئی تو آپ نے جنگل سے لکڑیاں لانے کا کام اپنے ذمے لیا۔ غرض وہ کبھی اپنے آپ کو بڑا نہیں سمجھتے تھے۔ اور ہمیشہ خواہ کیسا ہی چھوٹا کام ہو۔ کرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔

۵۔ ایک دفعہ ایک شخص کو کسی قصور کے عوض آپ کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ آپ کو دیکھ کر کانپنے لگا۔ آپ نے فرمایا۔ ارے ڈرتا کیوں ہے۔ میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں۔ میں تو ایک غریب قریش عورت کا لڑکا ہوں۔ جو کئی دفعہ غریبی کی وجہ سے سوکھا گوشت کھا کر ہی گزارہ کر لیتی تھی۔

۶۔ ایک دفعہ کئی صحابی جنگ پر گئے ہوئے تھے۔ ان کے گھر کوئی مرد نہ تھا اور عورتوں کو دودھ دوہنا نہ آتا تھا۔ آپ ہر روز ان کے گھر جا کر دودھ دوہ آیا کرتے تھے۔ اسی طرح غریب عورتیں ان کے پاس آ کر مختلف کام بتلا دیتی تھیں۔ اور وہ اٹھ کر سب کے کام کر آتے تھے۔

۷۔ ایک دفعہ مدینے کے چند بدو ان کے ہاں مہمان ہو کر آئے۔ ایک بدو کو زیادہ کھانے کی وجہ سے رات کو بہت دست آ گئے اور بستر خراب ہو گیا۔ وہ صبح ہی شرم کے مارے اٹھ کر چلا گیا۔ آپ نے اٹھ کر اس کی غلاظت کو اپنے ہاتھوں سے صاف کیا۔ لوگوں نے کہا ہمارے ہوتے ہوئے آپ ایسا کام کیوں کرتے ہیں۔ فرمایا اپنے مہمان کی ہر ایک قسم کی خدمت کا میں ہی ذمہ دار ہوں۔

۸۔ ایک دفعہ ایک رئیس نے چار اونٹوں پر غلہ لاد کر آپ کے پاس بھیجا۔ حضرت بلال رضؓ نے غلہ بیچ کر یہودیوں کا قرضہ ادا کیا۔ جب بلالؓ واپس آئے تو پوچھا کیا کچھ غلہ بچا ہے۔ جب یہ معلوم ہوا کہ ابھی غلہ باقی ہے۔ تو فرمایا کہ جب تک باقی غلہ غریبوں میں تقسیم نہ ہو جائے میں گھر میں نہیں جا سکتا۔ چنانچہ اس رات مسجد میں ہی قیام کیا۔ اور اگلے دن تمام غلہ تقسیم کرا کے گھر گئے۔

حضرت صاحب کی تعلیم

آپ نے مسلمانوں کے چار فرائض قائم کئے۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ۔ پچھلے دو ان لوگوں کے لئے ضروری قرار دئے جنھیں روپیہ خرچ کرنے کی طاقت ہو۔

انھوں نے ایک خدا اور صرف ایک ہی خدا کی پرستش کی تعلیم دی۔ وہ یہ تعلیم دیتے تھے کہ سب انسان برابر ہیں اور ان کے حقوق بھی برابر ہیں۔

ایسے شخص کو جو بدی کی زندگی بسر کرتا ہے نماز بھی نہیں بچا سکتی۔ تمھارا اچلن ہی ہے جس پر سزا اور جزا کا انحصار ہے۔

اے مسلمانو! تم دوسروں کے لئے وہی چاہو جو اپنے لئے چاہتے ہو۔ تب ہی تمھارا ایمان ٹھیک ہو سکتا ہے۔

کسی شخص کی ضرورت کو پورا کر دینا تمام عمر خدا کی عبادت کے برابر ہے۔

ایمان کے بعد سب سے بڑی نیکی خلقت کو آرام پہنچانا ہے۔

جو بڑوں کی تعظیم نہیں کرتا اور بچوں پر شفقت نہیں کرتا وہ میری امت میں نہیں ہے۔

جھگڑا کرنے والا انسان خدا کے نزدیک سب سے زیادہ قابل نفرت ہے۔

جس نے اپنی زبان اور خواہشات نفسانی کو قابو میں رکھا ہے میں اس کے واسطے جنت کا ضامن ہوتا ہوں۔

تمھارا ہمسایہ اگر تم سے امداد مانگے تو اس کی امداد کرو۔ قرض مانگے تو قرض دو۔ اگر تم سے اسے کوئی کام پڑے تو ا کرو۔ بیمار ہو تو اس کی مزاج پرسی کرو۔ اور مر جائے تو اس کے جنازے کے ساتھ جاؤ۔ جب کوئی خوشی کا موقع ہو تو سے مبارک باد دو۔ جب اس پر کوئی مصیبت نازل ہو تو اس کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرو۔

کچھ پرواہ نہیں۔ اگر دنیا کی اور چیزیں تیرے پاس نہ ہوں۔ مگر یہ چیزیں ضرور ہونی چاہئیں (۱) راست گفتاری ۲) دیانت داری (۳) خوش خلقی (۴) حلال کی کمائی۔

خادم کا قصور دن میں ستر دفعہ معاف کرو۔

اللہ تعالے تمھاری صورتوں اور دولت کو نہیں دیکھتا۔ بلکہ تمھارے کاموں اور دلوں کو دیکھتا ہے۔

ہر ایک نیک کام خیرات ہے۔ کسی کو نیک کام کی ہدایت کرنا بھی خیرات ہے۔ بھولے بھٹکے کو راستہ دکھانا۔ اندھے ا مدد کرنا۔ راستہ میں سے پتھر اور کانٹے اٹھا دینا۔ پیاسے کو پانی پلا دینا۔ یہ سب خیرات کے کام ہیں۔

اے مسلمانو! یاد رکھو۔ ایک بھائی کو دوسرے بھائی کی عزت کرنا لازمی ہے۔ پرائے مال پر نگاہ رکھنا حرام ہے۔ جیسا کرے گا۔ ویسا بھرے گا۔ عورتوں کے ساتھ ہمیشہ نیک برتاؤ کرنا۔ کسی کی حق تلفی نہ کرنا۔ اور کسی پر کسی قسم کا ظلم نہ کرنا۔

خدا ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ وہ سارے جہانوں کا مالک ہے۔ اسی کے قبضے میں سب کچھ ہے۔ وہ قادر مطلق ہے۔

جو چیز اولاد کے لئے بازار سے لاؤ سب سے پہلے لڑکی کو دو۔

جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے وہ بدلہ نہیں لیتا۔

ایسا اشارہ کرنا بھی حرام ہے جس سے دوسروں کو رنج پہنچے۔

ٹ: یہ مضمون رائے صاحب شری لالہ رگھو ناتھ سہائے بی اے کا لکھا ہوا ہے۔ وہ تقسیم سے پہلے انجمن اتحاد مذاہب (لاہور) کے صدر تھے۔ انھوں نے ۱۹۴۰ء میں پنجاب آرٹ پریس، بیرون موری دروازہ، لاہور سے ایک کتاب شائع کی تھی۔ اس کے ۱۰۳ صفحات تھے اور اس کا نام تھا: "روشن ستارے"۔ اس کتاب میں دس "نامور مذہبی بزرگوں کے حالات" درج تھے۔ اس کا ایک باب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر تھا۔ یہ باب مکمل طور پر یہاں نقل کیا گیا ہے۔

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ساڑھے سات روپیہ ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ نوے روپے یا ماہانہ ساڑھے سات روپے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

عصری اسلوب میں



دین کیا ہے

صفحات ۳۲ قیمت ۱/۵۰



ظہورِ اسلام

صفحات ۲۰۰ قیمت ۱۲/-



تاریخ کا سبق

صفحات ۴۸ قیمت ۲/-



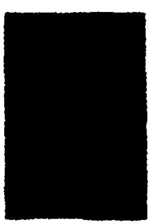
تعمیرِ ملت

صفحات ۴۸ قیمت ۲/-



عقلیاتِ اسلام

صفحات ۴۸ قیمت ۲/-



الاسلام

صفحات ۱۷۶ قیمت ۱۲/-

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶

سنکارا 200 فی صد ٹانک

اس کا نصف
100 فی صد
دوسرے
ٹانکوں کے برابر

سنکارا سے آپ کو
تمام ضروری وٹامن اور
معدنی اجزا ملتے ہیں،
جو آپ کی تندرستی اور
توانائی کے لیے ضروری ہیں۔

اس میں وٹامن اے،
بی ۱، بی ۲، سی، ڈی ۳،
نیاسیناماءڈ،
کیلشیم گلیسروفاسفیٹ اور
سوڈیم وغیرہ شامل ہیں۔



اور دوسرا نصف
100 فی صد
اپنی مثال آپ

ضروری وٹامنوں وغیرہ کے ساتھ
سنکارا کی خاص بات یہ ہے کہ
اس میں چھوٹی الائچی،
بڑی الائچی، لونگ، دھنیا،
دارچینی، تیزپات، گلاب کے پھول،
بابچھڑ اور تلسی جیسے اجزا بھی
شامل ہیں جو نظامِ ہضم کو طاقتور
بناتے ہیں اور جن کی مدد سے
آپ کی روزمرّہ خوراک کی تمام
غذائیت جسم میں پہنچ کر آپ کی
صحت اور طاقت کو بڑھاتی ہے۔
اِس طرح آپ سنکارا سے
دوہرا فائدہ حاصل کرتے ہیں۔

سنکارا
آپ کے جسم کو
۲۰۰ فی صد طاقت پہنچاتا ہے

ہمدرد

Regd. D. (D) No. 532
Regd. R.N. No. 28822/76

October 1979
Issue No. 35

AL-RISALA MONTHLY

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحیدالدین خاں

[redacted]

شمارہ ۳۶ □ نومبر ۱۹۷۹

جمعیۃ بلڈنگ □ قاسم جان اسٹریٹ □ دہلی 110006 □

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ثمین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

ایسا کیوں ؟

انجیل کے مطابق، فلسطین کے یہودیوں نے جب حضرت مسیح کی پیغمبری کو ماننے سے انکار کر دیا تو آخر میں انھوں نے آپ کو کافر قرار دے کر مار ڈالنے کی سازش کی۔ ان کے مذہبی سردار نے کہا: وہ قتل کے لائق ہے۔ اس پر انھوں نے اس کے منھ پر تھوکا اور اس کے مکے مارے۔ جب صبح ہوئی تو سب سردار کاہنوں اور قوم کے بزرگوں نے یسوع کے خلاف مشورہ کیا کہ اسے مار ڈالیں۔ وہ اسے باندھ کر لے گئے اور پیلاطس حاکم کے حوالے کیا۔ رومی حاکم کا دستور تھا کہ عید پر لوگوں کی خاطر ایک قیدی جسے وہ چاہتے تھے چھوڑ دیتا تھا۔ اس وقت برابا نام کا ان کا ایک مشہور ڈاکو قیدی تھا۔ پس جب وہ اکھٹے ہوئے تو پیلاطس نے ان سے کہا: تم کسے چاہتے ہو کہ میں تمھاری خاطر چھوڑ دوں۔ برابا ڈاکو کو یا یسوع کو جو مسیح کہلاتا ہے۔ کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ انھوں نے اس کو حسد سے پکڑوایا ہے۔ انھوں نے کہا برابا کو۔ پیلاطس نے ان سے کہا پھر یسوع کو جو مسیح کہلاتا ہے کیا کروں۔ سب نے کہا وہ مصلوب ہو۔ اس نے کہا کیوں۔ اس نے کیا برائی کی ہے۔ مگر وہ اور بھی چلا چلا کر کہنے لگے وہ مصلوب ہو۔ جب پیلاطس نے دیکھا کہ کچھ بن نہیں پڑتا بلکہ الٹا بلوا ہوا جاتا ہے تو پانی لے کر لوگوں کے روبرو اپنے ہاتھ دھوئے اور کہا: میں اس راست باز کے خون سے بری ہوں۔ تم جانو۔ سب لوگوں نے جواب میں کہا: اس کا خون ہماری اور ہماری اولاد کی گردن پر۔ اس پر اس نے برابا کو ان کی خاطر چھوڑ دیا اور یسوع کو کوڑے لگوا کر حوالہ کیا کہ مصلوب ہو۔ اس پر حاکم کے سپاہیوں نے یسوع کو قلعہ میں لے جا کر ساری پلٹن اس کے گرد جمع کی اور اس کے کپڑے اتار کر اسے قرمزی چوغہ پہنایا اور کانٹوں کا تاج بنا کر اس کے سر پر رکھا اور ایک سرکنڈا اس کے ہاتھ میں دیا اور اس کے آگے گھٹنے ٹیک کر اسے ٹھٹھوں میں اڑانے لگے کہ اے یہودیوں کے بادشاہ آداب۔ اور اس پر تھوکا اور وہی سرکنڈا لے کر اس کے سر پر مارنے لگے۔ اور جب اس کا ٹھٹھا کر چکے تو چوغہ کو اس پر سے اتار کر پھر اس کے کپڑے اسے پہنائے اور مصلوب کرنے کو لے گئے۔
(متی باب ۲۸)

یہود نے اپنی تاریخ کے مطابق، یسعیاہ نبی، یرمیاہ نبی، زکریا نبی، یحییٰ نبی کو قتل کیا۔ عیسیٰ مسیح کو بھی اپنے خیال کے مطابق قتل کر ڈالا۔ تاہم اللہ نے آنجناب کو بچا لیا۔ اسی طرح انھوں نے سیکڑوں کی تعداد میں اپنی قوم کے صالحین کو قتل کیا۔ یہ غیر معمولی سنگ دلی ان سے کیوں ظاہر ہوئی۔ اس کی وجہ صرف ایک تھی: تنقید کو برداشت نہ کرنا۔ انبیاء اور ان کے سچے پیرو یہود کی برائیوں پر ٹوکتے تھے اور ان کو انصاف کی تلقین کرتے تھے (وَیقتلون الذین یأمرون بالقسط، آل عمران ۲۱) یہود نے اپنی بے دین زندگی پر دین کا لیبل لگا رکھا تھا۔ داعیان حق جب اس کی حقیقت کھولتے تو وہ بگڑ جاتے۔ یہی صورت حال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے وقت پیش آئی۔ یہود اپنے کو اس حیثیت سے پیش کرتے تھے کہ وہ آسمانی ہدایت کے حامل ہیں۔ وہ نبیوں کی اولاد ہیں۔ وہ دین خداوندی کے نمائندے ہیں۔ ایسی حالت میں ان کو محسوس ہوا کہ قرآن کی دعوت ان کی دینی حیثیت کو بے اعتبار بنا رہی ہے۔ وہ ان کو دینی پیشوائی کی گدی سے

آمادہ ہوئی ہے۔ وہ آپ کی دعوت کے سخت مخالف ہوگئے۔ حتی کہ مشرکین سے بھی زیادہ (مائدہ۔ ۸۲) مکہ کے مشرکین نے یہودی علماء سے پوچھا: دیننا خیر ام دین محمد (ہمارا دین اچھا ہے یا محمد کا دین) یہودیوں نے جواب دیا بل دینکم خیر من دینہ (تمھارا دین محمد کے دین سے اچھا ہے) انھوں نے آپ کو اور آپ کی دعوت کو ختم کرنے کے لئے ہر ناجائز کو اپنے لئے جائز کرلیا۔ سازش، ظلم، عہدشکنی، بے انصافی، قتل یہ سب چیزیں ان کی شریعت میں حرام تھیں مگر اسلام کی دعوت کو مٹانے کے لئے یہ سب چیزیں ان کے لئے حلال بن گئیں۔

آسمانی کتاب کے حامل گروہ میں یہ قساوت (سخت دلی) کیسے آتی ہے کہ وہ ڈاکوؤں کو گوارا کرے اور ایک بے ضرر بندۂ خدا کو عدالت میں گھسیٹے۔ وہ کفار و مشرکین کا استقبال کرے اور اللہ کی طرف بلانے والے شخص کا بدترین دشمن بن جائے۔ وہ خدائی ہدایت کے نام پر قیادت حاصل کرے اور جب خدائی ہدایت پر عمل کرنے کے لئے کہا جائے تو وہ کہنے والے کے لئے بھیڑیے سے زیادہ بے رحم ثابت ہو۔ وہ دین خداوندی کو دنیوی کاروبار بنائے اور جب اس پیاسے ٹوکا جائے تو وہ اس کو ذبح کرنے پر آمادہ ہوجائے۔ اس کے سامنے کھلے کھلے دلائل اور نشانیاں آئیں مگر وہ بے پروائی کے ساتھ ان کو نظرانداز کردے۔ اس بدترین قساوت کی وجہ، قرآن کے مطابق، وہ خود ساختہ عقیدہ ہے جو اس کو خدا کی پکڑ سے بے خوف بنا دیتا ہے:

ذٰلک بانھم قالوا لن تمسنا النار الا ایاما معدودات وغرھم فی دینھم ما کانوا یفترون (آل عمران۔ ۲۴)

یہ اس سبب سے کہ انھوں نے کہا کہ ہم کو آگ نہیں چھوئے گی بجز چند گنے ہوئے دنوں کے۔ جو کچھ یہ گھڑتے رہتے ہیں اس نے ان کو ان کے دین کے بارے میں دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔

دینی تعلیمات کا خود ساختہ مطلب نکال کر یہود نے یہ عقیدہ بنا لیا تھا کہ جنت ان کے لئے لکھی جاچکی ہے۔ ان کے انبیاء اور بزرگ اس وقت تک جنت میں نہ جائیں گے جب تک تمام اسرائیلیوں کو جنت میں داخل نہ کرلیں۔ ان کا کہنا تھا کہ "جہنم کی آگ اسرائیلی گنہ گاروں پر کوئی قدرت نہیں رکھتی" اور بالفرض کسی بداعمالی کی وجہ سے دوزخ میں جانا ہوا تو وہ صرف چند دن (زیادہ سے زیادہ چالیس دن) کے لئے ہوگا۔ اس قسم کا عقیدہ جب کسی گروہ میں پیدا ہوجائے تو اس کے اندر سے عذاب آخرت کا کھٹکا نکل جاتا ہے۔ وہ ظلم اور سرکشی کے لئے بے حد جری ہوجاتا ہے۔ اس کو جب کسی سے عداوت ہوتی ہے تو اس کو ذلیل اور ناکام کرنے کے لئے وہ کسی حد پر نہیں رکتا۔ کیوں کہ آدمی کو روکنے والی چیز جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ کا اندیشہ ہے اور اس سے وہ پہلے ہی محفوظ ہوچکا ہے۔

آدمی ہمیشہ ایسی آواز کا دشمن ہوجاتا ہے جس میں اس کو اپنی حیثیت کی نفی ہوتی ہوئی دکھائی دے۔ اور جب معاملہ دینی حیثیت کی نفی کا ہو تو آدمی کا ردعمل اور بھی زیادہ شدید ہوتا ہے۔ کیوں کہ ایسی صورت میں نہ صرف دنیوی حیثیت مجروح ہوتی بلکہ آخرت کا انجام بھی مشتبہ ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔

حکمت کے موتی کون پاتا ہے

قرآن میں جو کردار بیان ہوئے ہیں، ان میں سے ایک قارون ہے۔ وہ ایک اسرائیلی تھا اور موسیٰ علیہ السلام کا ہم عصر تھا۔ مصر کے قبطی حکمرانوں کا ساتھ دے کر اس نے بے حساب دولت اپنے پاس جمع کر لی تھی۔ ایک روز وہ اپنی پوری شان کے ساتھ لوگوں کے سامنے نکلا۔ اسرائیلیوں میں سے کچھ لوگ اس کو دیکھ کر مرعوب ہوگئے۔ انھوں نے کہا: قارون بھی کیسا خوش قسمت ہے۔ کاش ہم کو بھی وہ چیز حاصل ہوتی جو اس کو ملی ہوئی ہے۔

اسرائیلیوں میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو سچائی کو پائے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا: قارون کی دنیوی شان وشوکت پر رشک نہ کرو۔ ان چیزوں کی کوئی حقیقت نہیں۔ اصل خوش قسمتی تو یہ ہے کہ آدمی کو آخرت کی کامیابی حاصل ہو۔ اور آخرت کی کامیابی کا کوئی تعلق دنیا کی چمک دمک سے نہیں ہے۔ وہ تو صرف انھیں کو ملے گی جو سچے مومن ہوں اور وہ کام کریں جو اللہ کو پسند ہے۔ اسرائیلی علماء کا یہ جواب نقل کرنے کے بعد قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

ولا یلقٰھا الا الصٰبرون (قصص ۸۰) اور یہ بات انھیں کو دی جاتی ہے جو صبر کرنے والے ہیں

یعنی حقیقت کا یہ مقام کہ آدمی دنیا کی شان وشوکت سے اوپر اٹھ کر حقیقت کو دیکھ سکے، بڑے تپ کا مقام ہے۔ یہ انھیں لوگوں کے حصہ میں آتا ہے جو دنیا کی زینتوں کی طرف دوڑنے سے اپنے کو بچائیں۔ جو اپنی سوچ اور اپنی دلچسپیوں کو نمائشی چیزوں میں نہ الجھائیں۔ جو وقتی ہنگاموں میں کھونے کے بجائے ابدی کائنات میں مصروف رہتے ہوں۔ جو دنیا سے گزر کر آخرت میں جینے لگے ہوں۔ یہ بڑے تپ کا کام ہے۔ اس میں اپنے آپ کو جانتے بوجھتے ذبح کر دینا پڑتا ہے۔ مگر اعلیٰ سچائی کو پانے کا دوسرا کوئی راستہ نہیں۔ رجھانے والی دنیا میں رہ کر جو اپنے آپ کو ریجھنے سے بچا سکے۔ اسی پر بالاتر حقیقتوں کا راز کھلتا ہے۔ جو سامنے کی چمک دمک میں کھو گیا وہ کبھی آگے کی اعلیٰ تر چیزوں سے آشنا نہیں ہو سکتا۔ دنیوی ہوشیاری دکھانا بلاشبہ دنیا میں آدمی کو عزت اور ترقی عطا کرتا ہے۔ مگر یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ "دنیوی ہوشیاری" ہی وہ چیز ہے جو آدمی کو آخرت کی ہوشیاری سے محروم کر دیتی ہے۔ آخرت کی عقل اسی کے حصہ میں آتی ہے جو دنیا کی محرومیوں کو جھیلنے کے لئے تیار ہو، جو دنیوی مصلحتوں کو حق کی خاطر قربان کر سکے، جو ظاہری عزتوں پر گم نامی کی زندگی کو ترجیح دے سکے، جو عوامی مقبولیت کو عوامی نامقبولیت کے بدلے میں دے سکے، جو ملتے ہوئے مفادات کی قیمت دے کر ذاتی نقصان کو خرید سکے، جو نفس کی تسکین کو چھوڑ کر نفس کو دبانے کے راستہ پر چلنے کے لئے تیار ہو۔ دنیا کی رونقوں میں نہ بہنا بڑا پرمشقت عمل ہے مگر اسی شخص پر معرفت حق کے دروازے کھلتے ہیں جو اس مشقت کو برداشت کرے۔ دنیا کی محرومی پر قانع ہونا بڑے صبر کا کام ہے مگر جو دنیا کی محرومیوں پر صبر کرتا ہے وہی وہ شخص ہے جس کو اس لئے چنا جاتا ہے کہ حکمت کے موتیوں سے اس کے دامن کو بھر دیا جائے۔

جب بادشاہ بھی تنقید سن کر برہم نہیں ہوتے تھے

سلطان بایزید ایک ترک بادشاہ گزرا ہے۔ اس کے زمانہ میں مولانا شمس الدین رومی حاکم عدالت تھے۔ ان کے یہاں ایک مقدمہ آیا جس میں خود سلطان بایزید گواہ تھا۔ جب مقدمہ پیش ہوا اور بادشاہ گواہی دینے کے لئے آیا تو مولانا شمس الدین رومی نے کہا: سلطان بایزید کی شہادت معتبر نہیں ہے، اس لئے ان کی شہادت قبول نہیں کی جاسکتی۔ بادشاہ کو غصہ آگیا۔ اس نے پوچھا اس کا سبب کیا ہے۔ مولانا شمس الدین رومی نے کہا کہ آپ نماز میں جماعت کے پابند نہیں ہیں اور جو شخص باجماعت نماز کی ادائگی میں کوتاہ ہو اس کی گواہی معتبر نہیں۔

سلطان بایزید نے اپنی غلطی کا فوراً اعتراف کرلیا۔ بادشاہ وقت کی حیثیت سے سارا اقتدار اس کے پاس تھا اور وہ قاضی کے خلاف کارروائی کرسکتا تھا۔ مگر اس نے قاضی صاحب کی اس صاف گوئی پر خوشی کا اظہار کیا اور اس کے بعد پابندی کے ساتھ نماز کے لئے مسجد میں حاضر ہونے لگا۔ سلطان نے ایک موقع پر کہا: مجھے فخر ہے کہ میری سلطنت میں ایسے ایمان دار اور انصاف پسند قاضی موجود ہیں جو بادشاہ کے آگے بھی حق کا اظہار کرنے سے نہیں رکتے۔

زندگی کھیل تماشا نہیں

لارڈ ماؤنٹ بیٹن (۱۹۰۰ — ۱۹۷۹) ملکہ وکٹوریہ کی پوتی کے لڑکے تھے۔ ان کو اپنی زندگی میں ہر قسم کی کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ ان کو شاہ سمندر (Sea Lord) کا خطاب ملا۔ مگر سمندر کی لہریں ہی ان کے لئے موت کا پیغام ثابت ہوئیں۔ وہ ایک خصوصی کشتی کے ذریعہ آئرلینڈ اور انگلینڈ کے درمیان سفر کررہے تھے کہ ان کی کشتی میں دھماکا ہوا اور وہ فوراً ہی مرگئے۔ اپنی عمر کے آخری حصہ میں انھوں نے ایک بار بی بی سی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا:

> I've enjoyed the fun of life, and I'm only sorry I won't be there to see the fun of the funeral.

میں نے زندگی کے تماشے کا لطف اٹھایا۔ اب مجھ کو صرف یہ افسوس ہے کہ میں اپنے جنازہ کے جلوس کو دیکھنے کا لطف نہ اٹھا سکوں گا (ٹائمس آف انڈیا ۹ ستمبر ۱۹۷۹) لوگ زندگی اور موت کو بس ایک قسم کا کھیل تماشا سمجھتے ہیں۔ کاش ان کو معلوم ہوتا کہ زندگی ایک انتہائی سنجیدہ معاملہ ہے اور موت اس سے بھی زیادہ سنجیدہ معاملہ۔

● خدا کے آگے جھکنے کی علامت یہ ہے کہ آدمی معقولیت کے آگے جھک جائے۔ جو شخص معقولیت کے آگے نہ جھکے، وہ خدا کے آگے بھی جھکا ہوا نہیں ہے۔ خواہ بظاہر وہ کتنا ہی خدا پرستی کی نمائش کرتا ہو۔

وہ ہماری خوراک ہیں

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو مصر سے نکالا اور ان کو لے کر صحرائے سینا میں پہنچے۔ یہاں وہ چالیس سال (۱۴۰۰۔۱۴۴۰ ق م) تک رہے۔ یہاں کے قیام کے ابتدائی زمانہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم آیا کہ فلسطین اور اس کے آس پاس کی زمین تمھارے لئے لکھ دی گئی ہے۔ تم وہاں داخل ہو جاؤ اور اس کو فتح کر لو۔ (استثنا ۱: ۸) اس وقت حضرت موسیٰ اپنی قوم کے ساتھ دشت فاراں میں خیمہ لگائے ہوئے تھے۔ آپ نے قوم کے بارہ سرداروں کو فلسطین و شام کی طرف بھیجا تاکہ وہ "زمین کنعان کی جاسوسی کریں"۔ یہ علاقہ اس وقت عمالقہ کے قبضہ میں تھا۔ یہ لوگ چالیس دن تک سفر کرتے رہے اور اس کے بعد آکر بتایا کہ وہ لوگ بڑی طاقت والے اور قدآور ہیں۔ ہم اپنی نظروں میں ان کے سامنے ایسے تھے جیسے ٹڈے (گنتی ب ۱۳) یہ سن کر ساری جماعت چلا اٹھی کہ ہم ان سے لڑنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ انھوں نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ تم اور تمھارا خدا جا کر لڑیں۔ ہم تو یہیں رہیں گے (مائدہ ۲۵) اس وقت بنی اسرائیل کی تحقیق کرنے والی جماعت میں سے دو آدمی اٹھے۔ بائبل کی روایات میں ان کا نام یوشع بن نون اور کالب بن یوفنا بتایا گیا ہے۔ انھوں نے کہا: اگر خدا ہم سے راضی ہے تو ہم کو اس زمین پر لے جائے گا اور یہ زمین جس پر دودھ اور شہد بہہ رہا ہے، ہم کو عنایت کرے گا۔ مگر تم خداوند سے بغاوت نہ کرو اور نہ تم اس زمین کے لوگوں سے ڈرو۔ وہ تو ہماری خوراک ہیں۔ ان کا سایہ ان سے جا چکا ہے۔ پر خداوند ہمارے ساتھ ہے (گنتی ب ۱۴)

ان دونوں آدمیوں کی بابت قرآن میں جو الفاظ آئے ہیں، وہ یہ ہیں:

قال رجلٰن من الذین یخافون انعم اللہ علیھما ادخلوا علیھم الباب فاذا دخلتموہ فانکم غلبون وعلی اللہ فتوکلوا ان کنتم مومنین (مائدہ ۲۴)

کہا دو آدمیوں نے جو کہ ڈرنے والوں میں تھے، جن پر اللہ نے انعام کیا تھا، تم ان پر چڑھائی کر کے شہر کے دروازہ تک چلو۔ جب تم دروازہ میں قدم رکھو گے اسی وقت غالب آجاؤ گے۔ اور اللہ کے اوپر توکل کرو، اگر تم اس پر یقین رکھتے ہو

قرآن کے اس بیان سے توکل کی حقیقت واضح ہوتی ہے۔ توکل یہ نہیں ہے کہ آدمی کوئی کام نہ کرے۔ وہ بے کار پڑا رہے اور کہے کہ خدا خود ہی بھیج دے گا۔ توکل اپنی ذات کے بجائے اللہ پر اعتماد کرنے کا نام ہے۔ توکل یہ ہے کہ آدمی کوشش کو اپنی ذمہ داری قرار دے اور نتیجہ کو اللہ کا حق سمجھے۔ وہ اللہ کی ہدایت کی روشنی میں اپنے لئے صحیح راستہ کا انتخاب کرے اور اس پر پوری طرح جم جائے۔ اس کے بعد جدوجہد کی راہ میں مشکلات و مصائب پیش آئیں تو اس یقین کے ساتھ اس پر جما رہے کہ اللہ ضرور اس کا ساتھ دے گا اور اس کو اس منزل تک پہنچائے گا جو اس کی دنیا و آخرت کے لئے بہتر ہے —— جو اللہ سے ڈرتا ہے اس کے دل سے ہر چیز کا ڈر نکل جاتا ہے۔ اللہ جس کے ایمان کو قبول کر لیتا ہے اس پر اس کی یہ خصوصی عنایت ہوتی ہے کہ وہ چیزوں کو ان کی حقیقی صورت میں دیکھنے لگتا ہے۔ وہ اللہ کو پا لیتا ہے اور اسی کے ساتھ اللہ کی حکمت کو بھی۔

کل اور آج کا فرق

فرانس کے شہر رائن (Rouen) میں ۱۲۰۰ اور ۱۲۲۵ء کے درمیان چھ بار آگ لگی۔ ہر بار پورا شہر جل کر خاک ہوگیا۔ کیوں کہ اس وقت فرانس میں آگ بجھانے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ۱۲۰۰ء تک یورپ کے کسی شہر میں پختہ سڑکیں نہیں پائی جاتی تھیں۔ لوگ گھر کا کوڑا سڑکوں پر ڈال دیا کرتے تھے جس کی صفائی کے لئے کوئی سرکاری انتظام موجود نہ تھا۔ رات کے وقت کوئی آدمی گھر سے نکلتا تو وہ لالٹین لے کر نکلتا۔ کیوں کہ شہروں میں روشنی کا رواج نہ تھا۔ آج کی طرح پولس کا انتظام نہ تھا۔ ہر شخص کو اپنی حفاظت خود کرنی پڑتی تھی۔ یہ دور جس کو "قرون وسطیٰ" کا دور کہا جاتا ہے، اس وقت یورپ کے شہروں میں بدنظمی عام تھی۔ مکانات معمولی مٹی کے ہوتے تھے۔ اس قسم کی تفصیلات پیش کرنے کے بعد عالمی انسائیکلوپیڈیا کا مقالہ نگار لکھتا ہے:

"یہاں قرون وسطیٰ کے شہروں کی بابت جو کچھ لکھا گیا اس کا کوئی جزء اس شان دار تہذیب پر چسپاں نہیں ہوتا جو اس زمانہ میں مسلمانوں نے اسپین میں قائم کی تھی۔ مسلمانوں کا شہر قرطبہ قرون وسطیٰ میں یورپ کا سب سے بڑا شہر تھا، اس کے باشندے اعلیٰ ترین معیار زندگی پر فخر کرسکتے تھے جو یورپ میں کہیں بھی سیکڑوں برس تک موجود نہ تھا"

World Book Encyclopedia (1963) Vol. 12(M) p. 429

مسلمان جو کسی وقت ساری دنیا میں سب سے آگے تھے، آج دنیا بھر میں سب سے پیچھے کیوں ہوگئے۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ ان کے اندر تعمیری ذہن نہیں۔ موجودہ زمانہ میں مسلمان اگرچہ بہت بڑے پیمانہ پر سرگرمیاں دکھا رہے ہیں۔ مگر یہ سرگرمیاں منفی ذہن کی پیداوار ہیں نہ کہ مثبت ذہن کی پیداوار۔ دور اول کے مسلمانوں کو قرآن کے ایجابی فکر نے متحرک کیا تھا، موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو جس چیز نے متحرک کیا ہے وہ صرف وہ شکایتیں ہیں جو ان کو دوسری قوموں سے پیدا ہوئی ہیں۔ شکایتی ذہن کے تحت کبھی تعمیری سرگرمیاں وجود میں نہیں آتیں۔ شکایت اور احتجاج کی زمین پر صرف شور وغل اور منفی ہنگاموں کی فصل اگتی ہے اور وہی آج بہت بڑے پیمانہ پر ہمارے یہاں اگی ہوئی ہے۔

توہم پرستی کہاں تک لے جاتی ہے

اہل کارتھیج اور رومیوں کی مشہور جنگ میں جب کارتھیج کے باشندوں کو شکست ہوئی تو انھوں نے سمجھا یہ اس غلطی کا نتیجہ ہے جو مولوک دیوتا کی عبادت کے سلسلہ میں ان سے ہوتی رہی ہے۔ یہ دیوتا ان کے عقیدے کے مطابق ان کے اشراف کے لڑکوں کی قربانی پسند کرتا تھا۔ مگر کارتھیج کے اعلیٰ خاندانوں نے اپنے لڑکوں کو بچانے کے لئے کئی سال یہ کیا کہ وہ قربانی کے دن چپکے سے کسی معمولی لڑکے کو پکڑ کر اسے قربان کر دیتے تھے۔ جب انھیں شکست ہوئی تو انھوں نے سمجھا کہ ان کی اس بدعنوانی کی وجہ سے دیوتا ناراض ہوگیا ہے۔ چنانچہ اعلیٰ خاندان کے کئی لڑکے مقدس آگ میں جھونک دئے گئے۔

عبرت کے لئے

اخبار الاہرام (قاہرہ) کے سابق ایڈیٹر محمد ہیکل کی ایک ۲۸۵ صفحات کی کتاب ہے۔ اصل کتاب انگریزی میں دی روڈ ٹو رمضان کے نام سے چھپی ہے اور اس کا عربی ترجمہ الطریق الی رمضان کے نام سے شائع ہوا ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں اکتوبر ۱۹۷۳ کی مصر۔ اسرائیل جنگ اور اس سے چھ سال پہلے کے حالات پر اپنی معلومات پیش کی ہیں۔ پوری کتاب دل چسپ واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ اس سلسلہ میں چند واقعات یہاں عبرت کے لئے نقل کئے جاتے ہیں

وہ ایٹم بم خریدنے گئے

(لیبیا کے فوجی انقلاب ستمبر ۱۹۶۹ کے بعد صدر معمر قذافی قاہرہ آئے) ایک موقع پر جب کہ صدر ناصر ان کو بتا رہے تھے کہ اسرائیل اور عربوں کے درمیان ٹینک، ہوائی جہاز وغیرہ میں طاقت کی نسبت کیا ہے۔ قذافی نے بھڑک کر کہا: نہیں، نہیں۔ ہمیں سیدھے ایک بھرپور جنگ کرنا چاہئے اور اسرائیل کا خاتمہ کر دینا چاہئے۔ ناصر نے ضبط کرتے ہوئے کہا یہ ناممکن ہے۔ بین اقوامی صورت حال ہم کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں دے گی۔ نہ روس اور نہ امریکہ ایسی صورت حال پیدا ہونے کی اجازت دیں گے جس سے ایٹمی جنگ چھڑ سکتی ہو۔ قذافی نے پوچھا: "کیا اسرائیل کے پاس ایٹم بم ہیں"۔ ناصر نے کہا: ہاں اس کا غالب امکان ہے۔ قذافی نے دوبارہ پوچھا: کیا ہمارے پاس بھی ایٹم بم ہیں۔ ناصر نے کہا: نہیں۔ ہمارے پاس نہیں ہیں۔

دو یا تین ماہ بعد لیبیا کی دوسرے درجہ کی بڑی شخصیت میجر جالود اچانک مصر آئے اور ناصر سے ملے۔ انھوں نے کہا کہ ان کا یہ سفر بہت خفیہ ہے اور ان کا واحد مقصد صدر ناصر سے ملنا ہے۔ صدر ناصر نے ملاقات کے وقت پوچھا کہ ان کو کیا مشورہ درکار ہے۔ جالود نے کہا: ہم ایک ایٹم بم خریدنے جا رہے ہیں۔ ناصر نے پوچھا وہ کہاں سے اس کو خریدنے جا رہے ہیں۔ جالود نے کہا کہ ان کو معلوم ہے کہ امریکی اور روسی ہمارے ہاتھ ایٹم بم بیچنے کے لئے تیار نہ ہوں گے۔ مگر امید ہے کہ چینی اس کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ ناصر نے کہا کہ جہاں تک وہ جانتے ہیں ایٹم بم خرید کر کبھی حاصل نہیں کئے جا سکتے۔ جالود نے کہا: ہم کوئی بڑا ایٹم بم نہیں چاہتے۔ بس جنگی تدبیر کے طور پر ایک (اوسط درجہ کا) بم کافی ہوگا۔ ہم نے چینیوں سے رابطہ قائم کیا اور ان سے کہا کہ ہم اپنا ایک آدمی وہاں ملاقات اور گفتگو کے لئے بھیجنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم خیر مقدم کے لئے تیار ہیں۔ اب میں چین جا رہا ہوں۔

جالود بھیس بدل کر روانہ ہوئے۔ انھوں نے لیبی پاسپورٹ کے بجائے مصری پاسپورٹ لیا اور پاکستان اور ہندوستان کے راستے سے سفر کر کے پیکنگ پہنچے۔ چینیوں کو خبر نہ تھی کہ اس سفر کا مقصد کیا ہے۔ مگر چو این لائی کے ساتھ ملاقات کا ایک وقت مقرر ہو گیا۔ اس ملاقات میں لیبیا کی انقلابی کونسل کے نائب صدر نے بتایا کہ وہ ایک بہت ضروری معاملہ کے لئے پیکنگ آئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ چین تمام ایشیائی ملکوں کے لئے باعث فخر ہے۔

آپ لوگوں نے پس ماندہ ملکوں کی مدد کے لئے بہت کچھ کیا ہے اور دنیا کے سامنے یہ ثابت کر دیا ہے کہ آپ لوگ اتنے ہی طاقت ور ہیں جتنا کہ مغرب۔ اس لئے ہم لیبیا سے آپ کی مدد حاصل کرنے کے لئے آئے ہیں۔ ہم آپ کے اوپر بوجھ بننا نہیں چاہتے اور ہم جانتے ہیں کہ یہ چیزیں بہت زیادہ داموں میں تیار ہوتی ہیں۔ ہم ایک ایٹم بم خریدنا چاہتے ہیں۔ چاؤ این لائی نے اس کے جواب میں نہایت نرم لہجہ اختیار کیا۔ انھوں نے معیاری چینی اخلاق کے ساتھ کہا کہ ایٹم بم فروخت نہیں کئے جاتے۔ چین کو یقیناً اس سے خوشی ہوگی کہ وہ ریسرچ کے کام میں لیبیا کی مدد کرے جس طرح چند سال پہلے چین نے مصر کو تحقیقاتی مدد دینے کے لئے آمادگی ظاہر کی تھی۔ ایٹمی ہتھیار بنانے کی تیاری کا لیبیا کو خود اپنے آپ کرنی ہوگی۔ ہر قوم کو خود کفیل بننے کی کوشش کرنا چاہئے۔ وغیرہ۔ چنانچہ میجر جلود چین سے خالی ہاتھ واپس آگئے (صفحہ ۷۷ـ۷۶)

کہا جاتا ہے کہ صدر ناصر جب مصر میں برسر اقتدار آئے تو انھوں نے بھی ایٹم بم کی خریداری کے لئے ایک وفد روس بھیجا تھا اور وہاں ان کو وہی جواب دیا گیا جو لیبی وفد کو چین میں جواب دیا گیا۔

ایک تسبیح کے بدلے ۲۰ ملین پونڈ

لیبیا میں یکم ستمبر ۱۹۶۹ کے انقلاب کے نتیجہ میں شاہ ادریس کی حکومت ختم ہو گئی اور موجودہ حکومت قائم ہوئی۔ اس واقعہ کی خبر جب پہلی بار صدر جمال عبد الناصر کو دی گئی تو حاضرین نے اس پر مختلف انداز سے تبصرہ شروع کیا۔ صدر ناصر نے اس موقع پر اپنا ایک واقعہ بیان کیا۔ انھوں نے کہا: مجھے یاد ہے کہ ایک موقع پر جب کہ ہم کو ہتھیار خریدنے کے لئے رقم کی فوری ضرورت تھی۔ میں نے حسن صبری الخولی کو شاہ ادریس کے پاس بھیجا اور ان سے اس موقع پر تعاون کی درخواست کی۔ شاہ ادریس نے فوراً وعدہ کر لیا کہ وہ ہم کو ۲۰ ملین پونڈ دے دیں گے، صرف ایک شرط پر۔ وہ یہ کہ ہم ان کو وہ تسبیح واپس کر دیں جو ان کے خاندان کے ایک بزرگ نے الازہر کی مسجد کے لئے دی تھی اور جس کے متعلق ان کا خیال تھا کہ وہ اب بھی مسجد کی کسی کھونٹی پر لٹکی ہوئی ہے۔ میں نے حسن الخولی سے کہا کہ وہ الازہر جائیں اور مذکورہ تسبیح حاصل کریں اور اس کو شاہ ادریس تک پہنچا دیں۔ حسن الخولی نے فوراً ایسا کیا اور شاہ ادریس نے وعدہ کے مطابق ہم کو ۲۰ ملین پونڈ کی رقم پیش کر دی (صفحہ ۱۹ـ۱۸)

ہارنے والے کو خوش آمدید!

۱۹۶۷ کی مصر۔ اسرائیل جنگ میں مصر کو بری طرح شکست ہوئی۔ اس کے بعد ہی اگست ۱۹۶۷ میں خرطوم کانفرنس ہوئی۔ ناصر کانفرنس میں شرکت کے لئے پہنچے تو خرطوم کے ہوائی اڈے پر تقریباً پانچ لاکھ آدمی ان کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ امریکی میگزین نیوز ویک نے اپنی رپورٹ میں اس کا عنوان قائم کیا: مفتوح کو خوش آمدید (Hail to the Conquered) تاہم اسی اجلاس میں شرکت کے لئے اگلے دن شاہ فیصل مرحوم آئے تو ہوائی اڈہ پر ان کا استقبال کرنے کے لئے کوئی بھیڑ موجود نہ تھی۔ تھوڑے سے لوگ جو آئے انھوں نے بھی جو نعرہ لگایا وہ یہ تھا "ناصر کا ساتھ دو" (صفحہ ۵۲)

مسلمان .. کل اور آج

آج کل کسی بڑے قومی ادارہ کا ذکر ہو تو مشکل ہی سے اس کے ذیل میں کسی مسلمان کا نام آتا ہے۔ مگر آزادی سے قبل صورت حال بالکل مختلف تھی۔ اس وقت قومی اداروں کے ساتھ مسلمانوں کے نام اتنی کثرت سے وابستہ تھے کہ کسی ادارہ کے تذکرہ کے ذیل میں کچھ نہ کچھ مسلمانوں کا تذکرہ آجانا ضروری تھا۔ مسٹر ڈی۔ ڈی لکھن پال (سابق صدر ریڈیو مینوفیکچررس ایسوسی ایشن آف انڈیا) پچھلے دور میں لمبی مدت تک آل انڈیا ریڈیو سے متعلق رہے ہیں۔ انھوں نے قومی نشریاتی ادارہ سے متعلق اپنی یادداشت شائع کی ہے (ٹائمس آف انڈیا ۳ جولائی ۱۹۷۵) اس مضمون میں آل انڈیا ریڈیو کے سابقہ حالات کا ذکر کرتے ہوئے جن شخصیتوں کے نام آئے ہیں ان کی تعداد کل آٹھ ہے جن میں سے چار مسلمان ہیں:

سر ابراہیم رحمت اللہ، وائی اے فضل بھائی، حاجی حسن علی، سر اکبر حیدری

اسی طرح سوتنتر لیڈر مسٹر مینو مسانی (۱۹۰۵ —) سے ایک اخبار نویس نے پوچھا "آپ اپنی زندگی میں سب سے زیادہ کس سے متاثر ہوئے ہیں" انھوں نے جواب دیا: یوسف مہر علی نے میری زندگی کو نئے افکار سے دوچار کیا، میرا کردار بدلا اور میری قوت فکر کو جلا دی۔ وہ میرے کالج کے ساتھی تھے اور میں اپنی زندگی میں سب سے زیادہ انھیں سے متاثر ہوا ہوں (شبستان)

انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں کثرت سے اس قسم کی مثالیں ملتی ہیں۔ بوڑھے غیر مسلموں میں کتنے ہی ایسے ملیں گے جو اپنی زندگی کی سب سے زیادہ قابل ذکر شخصیت کی حیثیت سے کسی مسلمان کا نام لیں گے۔ مگر اب یہ صورت حال بدل چکی ہے۔ اب اس ملک کے مسلمان زندگی کی سرگرمیوں میں قائدانہ مقام سے ہٹ کر پیچھے کی صفوں میں جا چکے ہیں۔

اس فرق کی وجہ کوئی ظلم یا تعصب نہیں ہے۔ اس کی وجہ تمام تر اقتصادی ہے۔ قدیم ہندوستان کی اقتصادی بنیاد زراعت پر قائم تھی۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کے قبضہ میں بڑی بڑی زمینداریاں تھیں۔ یہ صورت حال ان کو نہ صرف حوصلہ اور اعتماد دیتی تھی بلکہ وہ مالی قیمت بھی ادا کرتی تھی جو کسی شعبہ میں آگے بڑھنے کے لئے ضروری ہے۔ قدیم زمیندار خاندانوں ہی سے عام طور پر وہ لوگ نکلتے تھے جو علم و عمل کے مختلف شعبوں میں ترقی کرتے تھے۔ آزادی کے بعد اقتصادیات کی بنیاد زمین کے بجائے صنعت و تجارت ہو گئی۔ مسلمان نئے اقتصادی نظام میں اپنی جگہ نہ بنا سکے اس لئے وہ زندگی کے تمام شعبوں میں بھی پیچھے رہ گئے۔

گزرے ہوئے "کل" کو واپس لانے کے لئے احتجاج اور مطالبات کی مہم چلانا اپنی محرومی کی مدت کو مزید لمبا کرنا ہے۔ ہمارے لئے کرنے کا واحد کام یہ ہے کہ محنت اور لیاقت کے ذریعہ اقتصادیات کی زمین کو دوبارہ حاصل کریں۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ آج کی دنیا میں ہم کو اپنا کھویا ہوا مقام حاصل ہو سکے۔

الفاظ پالینا کافی نہیں

چند دوست کسی جنگل میں ٹہل رہے تھے۔ اتنے میں ایک تیتر کی آواز آئی جو اپنی مخصوص بولی نکال رہا تھا۔ ان میں ایک مولوی صاحب تھے، فوراً کہنے لگے، دیکھو تیتر آواز لگا رہا ہے: "سبحان تیری قدرت" صوفی بولا نہیں، وہ کہہ رہا ہے: "ورفعنا لک ذکرک" پنڈت نے کہا نہیں۔ وہ تو صاف کہہ رہا ہے: "سیتا رام دسرت" پہلوان بولا، تم لوگ نہیں سمجھتے۔ وہ کہہ رہا ہے: "کھا گھی کر کسرت" قصائی نے کہا نہیں، وہ کہہ رہا ہے: "سر پائے ڈھکڈھکا" کنجڑے نے کہا، تم میں سے کوئی نہیں سمجھا۔ وہ تو کہہ رہا ہے: "لہسن پیاز ادرک"

یہ لطیفہ بتاتا ہے کہ آدمی اگر کسی بات کو بیان کرنے کے لئے خوبصورت الفاظ پالے تو اس کو اس دھوکے میں نہ پڑنا چاہئے کہ اس نے لازمی طور پر حق کو بھی پالیا ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس نے جو کچھ کہا وہ محض الفاظ کا مجموعہ ہو، حقیقت واقعہ سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔

جنت کے باشندے کون ہوں گے

قرآن کے مطابق، جنت کی فضا الحمد للہ رب العالمین کے کلمات سے معمور ہوگی۔ یعنی جنت کی دنیا وہ آئیڈیل دنیا ہے جہاں صرف اللہ کی بڑائی کے چرچے ہوں گے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جنت میں ہر طرف "سلام سلام" کا ماحول ہوگا۔ یعنی جنت میں جو لوگ آباد کئے جائیں گے ان کا حال یہ ہوگا کہ ایک انسان کے دل میں دوسرے انسان کے لئے سلامتی کے سوا اور کچھ نہ ہوگا ——— پھر جنت میں وہ روح کیونکر داخلہ پائے گی جس کے اندر حمد الٰہی کے نغمے نہ جاگے ہوں۔ وہاں وہ شخص کس طرح بسایا جائے گا جس کے دل میں انسان کے لئے سلامتی کے چشمے نہ پھوٹے ہوں۔

ایک تاثر

ہر آدمی اپنے سینہ میں ایک بت لئے ہوئے ہے۔ یہ وہ چھپی ہوئی وفاداریاں ہیں جو اللہ کے بالمقابل لوگوں نے قائم کرلی ہیں۔ آدمی اسی وقت تک شریف اور معقول ہے جب تک اس کی چھپی ہوئی شیفتگیوں اور وفاداریوں پر زد نہ پڑے۔ جہاں اس کے اس چھپے ہوئے بت پر زد پڑی وہ فوراً بھڑک اٹھتا ہے۔ اس وقت وہ اپنے ناقد کے خلاف ہر اس ناانصافی کو جائز ٹھہرا لیتا ہے جو اس کے خدا نے اس کے لئے حرام قرار دیا تھا ——— شکایت اور برہمی کے وقت انصاف پر قائم رہنا تقویٰ کی واحد یقینی پہچان ہے۔ مگر یہی وہ کسوٹی ہے جس پر کوئی پورا اترتا ہوا نظر نہیں آتا۔ لوگوں نے حق پرستی کے اپنے اپنے معیار بنا رکھے ہیں اور اپنے آپ کو اس خود ساختہ معیار کے مطابق پاکر مطمئن ہیں کہ وہ ضرور خدا کے یہاں بھی حق پرست قرار پائیں گے۔

نیا جنم لینا پڑتا ہے

ہیلن کلر (۱۸۸۰ — ۱۹۶۸) ایک امریکی خاتون تھی۔ ابھی وہ ۱۹ مہینے کی تھی کہ سخت بیمار ہوئی۔ اس بیماری سے وہ اٹھی تو وہ اندھی اور بہری ہو چکی تھی۔ ہیلن کے لئے دنیا تاریک بھی تھی اور خاموش بھی۔ مگر اس کی خوش قسمتی سے اس کو ایک لائق خاتون استاد مل گئی۔ اس خاتون نے مسلسل اور ان تھک محنت سے ہیلن کو پڑھایا۔ وہ پڑھنے اور بولنے والی ہو گئی۔ اس نے اپنی خود نوشت سوانح عمری لکھی ہے جس کا نام ہے The Story of my life ہیلن اپنی اس کتاب میں لکھتی ہے کہ سات سال کی عمر میں جب کہ میری ملاقات میری ٹیچر سے ہوئی، وہ میری روح کا جنم دن تھا:

The Birthday of my soul ---

یہی بات دینی معاملہ میں بھی صحیح ہے۔ اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے والا آدمی جب دین کی پہچان حاصل کرتا ہے اور خدا و آخرت کو اپنی زندگی میں شامل کرتا ہے تو یہ اتنا بڑا واقعہ ہوتا ہے کہ اس کو "نیا جنم" سے کم کسی لفظ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔

وہ انسان کون ہے جو اس طرح دوسری بار جنم لیتا ہے۔ یہ وہ انسان ہے جو اپنی پیدا شدہ روح کو دوبارہ ایک ایسے انسان کی صورت میں تخلیق کرتا ہے جو خود آگہی کی صلاحیت رکھتا ہو۔ جو روایتی عقیدہ کے بجائے شعوری فیصلہ کے تحت بنا ہو۔ جو پورے معنوں میں ایک سنجیدہ انسان ہو۔ جو اپنے ذہن کو نفسیاتی پیچیدگیوں کے گھیرے سے نکال کر حقیقت کی براہ راست روشنی میں لے آئے۔ جس کا فکر خارج رخی فکر کے بجائے اندر رخی فکر بن گیا ہو۔ خلاصہ یہ کہ جو اپنی تلاش سے اپنے پیدا کرنے والے کو پا لے۔ جس کی فکر کی گہرائی اس نوبت کو پہنچ جائے کہ وہ دنیا میں رہتے ہوئے آخرت کو دیکھنے لگا ہو۔

ایسا انسان جب چڑیوں کے چہچے سنتا ہے تو اس میں اس کو حمد الٰہی کے نغمے سنائی دینے لگتے ہیں۔ جب وہ درخت کے پتوں کو ہلتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ جنت کی فضاؤں میں لہلہا رہے ہیں۔

کسی کو خدا کی مدد ملنے کا یہ مطلب نہیں کہ اس کو مادی چوٹ نہیں لگے گی۔ اگر ایسا ہوتا تو رسول ﷺ اور آپ کے اصحاب پر فاقے نہ گزرتے اور تلواروں کے زخم نہ لگتے۔

اس میں شک نہیں کہ مادی چوٹ انسان کے اوپر بہت سخت ہے، اور اس بنا پر بندہ کو اپنے رب سے ہمیشہ راحت و عافیت ہی کی دعا کرنی چاہئے۔ مگر مادی چوٹ ہی وہ چیز ہے جو آدمی کی روحانیات کو زندہ کرتی ہے۔ دنیا کی زندگی میں یہی وہ واحد تجربہ ہے جو لطیف احساسات کو بیدار کر کے انسان کو اس نفسیاتی مقام پر پہنچاتا ہے جہاں وہ ملا اعلیٰ کا مشاہدہ کر سکے اور عرفان و آگہی کے اس قیمتی خزانہ کو پا سکے جو ہمارے مالک نے مادی دنیا کے ماورا ہمارے لئے چھپا رکھا ہے۔

کامیابی کا راز

کامیابی کا راز یہ ہے کہ آپ اپنے اندر کوئی امتیازی خصوصیت پیدا کریں، خواہ وہ خصوصیت کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو۔ ایک ڈاکٹر نے مطب شروع کیا اور تھوڑے ہی دنوں میں کامیاب ہو گیا۔ انھوں نے یہ خصوصیت دکھائی کہ وہ ہر آنے والے مریض کو سلام میں پہل کرتے۔ عام طور پر ڈاکٹر لوگ اس کے منتظر رہتے ہیں کہ مریض ان کو سلام کرے۔ یہاں ڈاکٹر نے خود مریض کو سلام کرنا شروع کر دیا۔ یہ طریقہ کامیاب رہا اور جلد ہی ان کا مطب خوب چلنے لگا۔ حالانکہ وہ باقاعدہ سند یافتہ نہیں تھے۔ صرف "آر۔ ایم۔ پی" تھے۔

ایک دکان دار نے دیکھا کہ گاہک کے پاس اگر کئی نوٹ ہیں تو عام طور پر وہ میلے اور پھٹے ہوئے نوٹ دکان دار کو دیتا ہے اور اچھے اور صاف نوٹوں کو بچا کر جیب میں رکھتا ہے۔ اس سے دکان دار نے سمجھا کہ گاہک صاف نوٹ کو پسند کرتا ہے۔ اس نے گاہک کی اس نفسیات کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے یہ اصول بنایا کہ جب کوئی گاہک اس سے سامان خریدے گا اور قیمت ادا کرنے کے لیے بڑا نوٹ دے گا تو وہ حساب کرتے وقت ہمیشہ گاہک کو نئے اور صاف نوٹ لوٹائے گا۔ دکان دار کے بکس میں ہر طرح کے نوٹ ہوتے۔ مگر جب وہ گاہک کو دینے کے لیے اپنا بکس کھولتا تو پرانے اور پھٹے ہوئے نوٹوں کو الگ کرتا جاتا اور نئے نوٹ چھانٹ کر گاہک کو دیتا۔ نئے نوٹ حاصل کرنے کے لیے اس نے یہ کیا کہ اپنے تمام پرانے نوٹ جمع کر کے اپنے بینک کو دے دیتا اور اس کے بدلے بینک سے چھوٹے نئے نوٹ حاصل کر لیتا۔ وہ نئے نوٹوں کو اپنے بکس کے پرانے نوٹوں میں ملا دیتا تاکہ گاہک کے سامنے دونوں قسم کے نوٹ ہوں اور وہ دیکھے کہ اس کا دکان دار بکس سے خراب نوٹوں کو الگ کرتا جا رہا ہے اور صاف نوٹوں کو چھانٹ چھانٹ کر اسے دے رہا ہے۔

دکان دار کی یہ تدبیر بظاہر معمولی اور بے قیمت تھی۔ مگر اس نے گاہکوں کو بے حد متاثر کیا۔ وہ سمجھے کہ ان کا دکان دار ان کا بہت خیال کرتا ہے۔ دھیرے دھیرے اس نے اس معمولی تدبیر سے گاہکوں کے دل جیت لیے۔ اس کی دکان اتنی کامیاب ہو گئی کہ ہر وقت اس کے یہاں بھیڑ لگی رہتی۔ (۲۸ جون ۱۹۷۹)

جب کھرا اور کھوٹا الگ کیا جائے گا

جھوٹی انسانیت اور نقلی بہادری کسی کے کام آنے والی نہیں۔ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جبکہ پردہ پھٹ جائے گا اور ہر آدمی اپنی اصلی صورت میں سامنے آ جائے۔ اس وقت کتنے عزت والے ذلت کے گڑھے میں پڑے ہوئے دکھائی دیں گے۔ کتنے انصاف اور انسانیت کا نعرہ لگانے والے انصاف اور انسانیت کے قاتل قرار دئے جائیں گے۔ کتنے بہادری کا ٹائٹل لینے والے بزدلی کی کالک سے روسیاہ ہو رہے ہوں گے۔ کتنے اسلام اور ملت اسلام پر فدا ہونے والے اس حال میں نظر آئیں گے گویا کہ اسلام اور ملت اسلام سے ان کا کوئی تعلق ہی نہ تھا۔

دعوتِ حق کے مقابلہ میں مختلف ردعمل

دعوتِ حق کے مقابلہ میں مختلف انسانوں کی طرف سے جو ردعمل سامنے آتا ہے، اس کو تین بڑی قسموں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ ایک وہ لوگ جن کی فطرت زندہ ہوتی ہے۔ سچائی کو قبول کرنے کے لئے جن کے سینے کھلے ہوتے ہیں۔ تعصب، کج فہمی، مصلحت پرستی کا کوئی پردہ ان کے دل و دماغ کو گھیرے ہوئے نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کے سامنے جب سچائی آتی ہے تو وہ ان کو بالکل اپنے دل کی بات نظر آنے لگتی ہے۔ وہ بے اختیار اس کی طرف کھنچ اٹھتے ہیں۔ ان کی طرف سے فی الفور سچائی کی آواز کو مثبت جواب دیا جاتا ہے۔ وہ اتنی جلد اس کی حقیقت کو پا لیتے ہیں اور اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں جیسے وہ پہلے ہی سے اس کے انتظار میں تھے:

یکاد زیتہا یضیئ ولولم تمسسہ نار (نور) قریب ہے کہ اس کا تیل روشن ہو جائے اگرچہ اس میں آگ نہ لگی ہو

دوسرے لوگ وہ ہیں جن کی نفسیاتی پیچیدگیاں ان کو ابتدائی مرحلہ میں حق کو سمجھنے نہیں دیتیں۔ وہ اس کو "حق کا مسئلہ" نہیں سمجھتے۔ اپنی ضد اور ٹیڑھ کی وجہ سے حق کی آواز ان کو عجیب عجیب روپ میں دکھائی دیتی ہے۔ وہ اس کے مخالف بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس کو کچل دینا چاہتے ہیں۔ تاہم وہ وقت آتا ہے جب کہ ان کی فطرت ان کی ضد پر غالب آتی ہے۔ سچائی کے خلاف اپنے دلائل کا بے وزن ہونا ان پر کھل جاتا ہے۔ ان کی اندرونی آواز بول پڑتی ہے کہ وہ سراسر غلطی پر تھے، اور بات وہی صحیح ہے جو حق کے داعی کی طرف سے کہی جارہی تھی۔ اس وقت وہ تحفظ ذہنی اور مصلحت پرستی کے تمام لبادے اتار کر سچائی کا اعتراف کر لیتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں کہ یہ حق ہے:

قالت امرات العزیز الآن حصحص الحق (یوسف) وزیر مصر کی عورت نے کہا: اب کھل گئی سچی بات

تیسرا گروہ وہ ہے جو سچائی کی آواز پر اندھے بہرے کی طرح ٹوٹ پڑتا ہے۔ اس کا مصلحت پرستانہ ذہن، اس کی متعصبانہ نفسیات اور اس کی بڑھی ہوئی انانیت اس کے مزاج کو اتنا زیادہ بگاڑ دیتے ہیں کہ حق بات اپنی سیدھی اور صاف شکل میں اس کے ذہن کے خانہ میں نہیں بیٹھتی۔ وہ ہر بات کا الٹا مطلب نکالتا ہے۔ اور ہر دلیل کو رد کرنے کے لئے کچھ دل فریب الفاظ تلاش کر لیتا ہے۔ اس کا یہ مزاج اتنا پختہ ہو چکا ہوتا ہے کہ ابتداءً اگر وہ غلط فہمی کی وجہ سے حق کی طرف نہ بڑھا ہو تو بعد کو اس کی نوعیت واضح ہو جانے پر بھی اس کو قبولیت کی توفیق نہیں ہوتی۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سوال اس کے لئے رکاوٹ بن جاتا ہے کہ اگر میں نے اعتراف کر لیا تو میرا وقار باقی نہیں رہے گا:

واذا قیل لہ اتق اللہ اخذتہ العزۃ بالاثم (بقرہ) اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈر تو اس کا غرور اس کو گناہ پر آمادہ کر دیتا ہے۔

اللہ کے یہاں سب سے افضل وہ لوگ ہیں جو حق کے اعلان کو سنتے ہی اس کی طرف دوڑ پڑیں۔ اسی طرح وہ لوگ بھی اللہ کی رحمت میں حصہ دار ہوں گے جو ابتدائی رکاوٹ کے بعد اس کی آواز کو پہچان لیں اور اس کے آگے جھک جائیں۔ باقی وہ جو اپنی برتری کی خاطر حق کی پکار کو نہ مانیں وہ اللہ کے نزدیک جانور ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ بدتر۔

ایک ستارہ — ایک ارب سورج سے بھی زیادہ روشن

برسات کے موسم میں جب فضا بالکل صاف ہوتی ہے، آسمان پر لمبے نور کے بادل دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ہماری کہکشاں ہے جس کے اندر ہمارا سورج واقع ہے۔ نور کے بادل حقیقۃً بادل نہیں ہیں بلکہ بے شمار ستاروں کے مجموعے ہیں جو دور ہونے کی وجہ سے ملے ملے دکھائی دیتے ہیں۔ اگر آپ دوربین سے دیکھیں تو بادل کے بجائے آپ کو الگ الگ ستارے دکھائی دیں گے۔ زمین سے بارہ لاکھ گنا بڑا سورج بظاہر بہت بڑا نظر آتا ہے۔ مگر کہکشاں کے اکثر ستارے اس سے بھی زیادہ بڑے ہیں۔ اس طرح کے بے شمار کہکشانی مجموعے کائنات کی وسعتوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

فلکیات کی حیران کن دریافتوں میں سے ایک وہ ہے جس کو کوئیسار (Quasar) کہا جاتا ہے۔ کائنات کے انتہائی بعید کناروں پر واقع یہ ستارے بے حد روشن ہیں۔ ایک پوری کہکشاں جس میں سورج یا اس سے بڑے بڑے ایک ارب ستارے ہوں، جتنی انرجی (روشنی اور حرارت) خارج کرتی ہے، اتنی زیادہ انرجی تنہا ایک کوئیسار خارج کرتا ہے۔ اس قسم کے ستارے وسیع خلا میں سیکڑوں کی تعداد میں معلوم کئے گئے ہیں۔ مزید عجیب بات یہ پائی گئی ہے کہ یہ ستارے اکثر جوڑے جوڑے ہیں جو ایک دوسرے کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔ کائنات میں انرجی پیدا ہونے کا سب سے طاقت ور عمل جو اب تک سائنس دانوں نے دریافت کیا ہے وہ تھرمونیوکلیر ری ایکشن (Thermonuclear Reaction) ہے۔ مگر کوئیسار سے خارج ہونے والی بے پناہ طاقت کی توجیہ کے لئے وہ ناکافی ہے۔ قیاس ہے کہ کوئیسار میں انرجی پیدا ہونے کا طریقہ مکمل طور پر کوئی دوسرا طریقہ ہے جو دیگر ستاروں میں نہیں پایا جاتا۔

نعمتوں سے بھری ہوئی یہ زمین اللہ کے جمال کی مظہر ہے اور خلا کے دہشت ناک ستارے اللہ کے جلال کا مظہر ہیں۔ زمین اگر جنتی زندگی کی علامت ہے تو ستاروں کی شکل میں دہکتے ہوئے شعلے جہنم کی یاد دلاتے ہیں۔ آدمی اگر زمین و آسمان کی ان نشانیوں پر غور کرے تو اس کا سینہ خدا کی یاد سے بھر جائے گا۔

ظاہری بڑائی دیکھ کر بڑا سمجھ لینا

قدیم زمانہ میں انسان کا حال یہ تھا کہ جس چیز کو بھی کچھ نمایاں دیکھا، اس کو معبود بنالیا۔ بشار بن برد (م ۱۶۷ھ) آگ کا مٹی پر تفوق ظاہر کرتے ہوئے کہتا ہے:

الارض مظلمة والنار مشرقة　　والنار معبودة مذ كانت النار

زمین تاریک ہے اور آگ روشن، اور آگ جب سے وجود میں آئی ہے، وہ معبود ہی ہے

یہ ذہن آج بھی موجود ہے۔ آج بھی انسان کا یہ حال ہے کہ جس کو کچھ نمایاں دیکھتا ہے اس کو اپنا سب کچھ بنالیتا ہے۔

ایک سفر

۱۷ ستمبر سے ۲ اکتوبر ۱۹۷۹ تک تقریباً دو ہفتے ریاست جموں و کشمیر میں گزرے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل مقامات پر جانے کا اتفاق ہوا: جموں، راجوری، دودا سن بالا، بکوری، بدھل، سموٹ، تھنہ منڈی، ڈنہ، راجدھانی، بہروٹ۔ دلی کی کثافتوں سے نکل کر جب میں ہمالیہ کی اس سرزمین میں پہنچا تو ایسا محسوس ہوا جیسے میں جہنم کے پڑوس سے نکل کر جنت کے پڑوس میں آگیا ہوں۔ بیشتر وقت راجوری ضلع کے پہاڑی علاقوں میں گزرا۔ دینی موضوعات پر گفتگوؤں اور تقریروں کا سلسلہ ہر جگہ روزانہ جاری رہا۔ ضلع کے مختلف مقامات سے لوگ آآکر ملتے رہے۔ دو مقامات پر جمعہ کے اجتماعات میں تقریر کی گئی۔

نردجال سے ہم نے سڑک چھوڑی تو سامنے پہاڑی کے اوپر ایک بڑا درخت اور اس کے پاس مکان دکھائی دے رہا تھا۔ یہ دودا سن بالا تھا جو ہمارے اس سفر کی پہلی منزل تھی۔ کھلے ہوئے سرسبز ماحول کے درمیان ہم نے اوپر چڑھنا شروع کیا۔ "وہ بستی کہاں ہے جہاں ہم کو پہنچنا ہے" میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔ "یہی تو وہ بستی ہے جہاں آپ کھڑے ہوئے ہیں" ساتھی نے جواب دیا۔ "مگر یہ تو صرف ایک گھر ہے" میں نے دوبارہ پوچھا۔ "یہاں اسی طرح کی بستیاں ہوتی ہیں"۔ اس کے بعد اس نے دکھایا تو سبز پوش پہاڑوں میں دور دور بکھرے ہوئے بہت سے گھر دکھائی دئے۔ یہاں ہر گھر مستقل ہوتا ہے۔ اپنی زمینوں کے ساتھ لوگ گھر بنا لیتے ہیں۔ خاص وضع کے مکانات، اس سے متصل درخت اور کھیت۔ گویا ہر گھر کی اپنی الگ دنیا ہے۔ یہاں بستی مکانات کے مجموعہ کا نام نہیں ہوتی بلکہ دور دور بکھرے ہوئے مکانات کا نام ہوتی ہے۔ اس طریقے کے بہت سے فائدے ہیں۔ اسی طرح آپس کے جھگڑے کے مواقع بہت کم ہو جاتے ہیں۔ شہری برائیاں پیدا نہیں ہوتیں۔ کھیت اور مکان ساتھ ساتھ ہونے کی وجہ سے کھیتی اور نگرانی بہت آسان ہو جاتی ہے۔ مزید یہ کہ قدرت کا ماحول باقی رہتا ہے۔ گھنی آبادی کی صورت میں پیدا ہونے والی مصنوعی کثافتیں پیدا نہیں ہوتیں۔ وغیرہ

اس علاقہ میں گھر بنانے کا طریقہ عام طور پر یہ ہے کہ دیواریں بنا کر اوپر لکڑی کا فریم بناتے ہیں اور اس کے اوپر مٹی بچھا دیتے ہیں۔ یہ ان کی چھت ہے۔ مٹی کی ان چھتوں کے لئے سب سے زیادہ نقصان کی چیز موتھا گھاس ہے۔ موتھا گھاس کی جڑیں بہت گہرائی تک اتر جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس چھت پر موتھا جم جائے وہ بارش میں ٹپکنے لگتا ہے۔ اس کا علاج یہاں کے لوگوں نے بتھوا کی شکل میں پایا ہے۔ بتھوا کی جڑیں اوپر اوپر رہتی ہیں۔ چھت کے اوپر کی مٹی میں بتھوا کے چند پودے لگا دیتے ہیں اور اس کے بعد موتھا گھاس دھیرے دھیرے ختم ہو جاتی ہے۔ ہر مسئلہ کا ایک قدرتی حل ہے اور بہترین طریقہ یہ ہے کہ کسی مسئلہ کے قدرتی حل کو برسرِ کار آنے کا موقع دیا جائے۔

جموں و کشمیر ایک سرحدی ریاست ہے اس لئے یہاں فوجیں کثرت سے رکھی گئی ہیں۔ سفر کرنے والا دیکھتا ہے کہ حکومت نے زمین کے بڑے بڑے ٹکڑے فوجی مراکز قائم کرنے کی خاطر اپنے قبضہ میں لے لئے ہیں۔ اس کی وجہ سے یہاں کا زرعی رقبہ پہلے کے مقابلہ میں کم ہو گیا ہے۔ مگر اس نقصان نے ریاست کے لوگوں کے لئے ایک نیا عظیم تر

امکان کھول دیا ہے۔ فوجی ضرورت کے تحت سارے علاقہ میں کثرت سے سڑکیں بنائی گئی ہیں جن کا تقسیم سے پہلے یہاں کے لوگوں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ سڑکوں کے اس جال نے تجارت کے زبردست مواقع کھول دئے ہیں۔ زرعی زمین کم ہو کر تجارتی زمین بڑھ گئی ہے۔ مگر مسلمان اکثریت میں ہونے کے باوجود، اس نئے امکان سے فائدہ اٹھانے میں سب سے پیچھے ہیں۔

اس علاقہ میں یہ بات عجیب نظر آئے گی کہ شہروں میں مسلمان غیر معمولی اقلیت میں ہیں۔ جب کہ ان شہروں کے اردگرد پھیلے ہوئے دیہاتوں میں مسلمانوں کی غیر معمولی اکثریت ہے۔ اور اکثر زراعتی رقبے ان کے قبضہ میں ہیں۔ اس فرق کی وجہ مسلمانوں کا تعلیم اور تجارت میں پیچھے ہو جانا ہے۔ شہری علاقے تعلیم اور تجارت کے علاقے ہوتے ہیں۔ اس لئے شہروں میں انھیں لوگوں کو جگہ ملتی ہے جو تعلیمی لیاقت اور تجارتی سرگرمیوں کا ثبوت دے سکیں۔ "زمینوں" کا مالک ہونے کے باوجود مسلمان جدید دنیا میں بے زمین ہو رہے ہیں۔

وادیٔ کشمیر میں سفر کرنے والے کو ہر طرف سیب اور دوسری چیزوں کے باغات نظر آتے ہیں۔ مگر جموں کے علاقہ میں زیادہ تر دھان اور مکئی کی فصلیں ہی دکھائی دیتی ہیں۔ جہاں تک راقم الحروف کا اندازہ ہے جموں کا علاقہ پھلوں کے باغات کے لئے کم موزوں نہیں۔ پھر اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ آزادی سے پہلے "کشمیر" کے حصہ میں انگریز آباد ہوئے اور انھوں نے باغات لگائے۔ اس سے اس علاقہ میں باغ کی روایت چل پڑی اس کے برعکس "جموں" کے علاقہ میں یہ روایت قائم نہ ہو سکی۔ اس لئے یہ علاقہ قدیم طرز کی زراعت پر قائم رہا۔ اور باغات کے معاملہ میں پیچھے ہو گیا۔ جموں کا پورا علاقہ پہاڑی نباتات سے بھرا ہوا ہے اور یہاں شہد کی مکھی پالنے کا زبردست امکان موجود ہے۔ مگر اس امکان سے بھی اب تک برائے نام ہی فائدہ اٹھایا جا سکا ہے۔ حکومت کی طرف سے شہد کی مکھی اور اس کے بکس معمولی قیمت پر فراہم کئے جاتے ہیں۔ آدمی کو صرف اتنا کرنا ہے کہ وہ اس قسم کا ایک بکس حاصل کرے اور اس کو اپنے مکان کے پاس رکھ دے۔ بقیہ تمام کام مکھیاں خود اپنے نظام کے تحت انجام دیتی ہیں یہ کام ہر گھر والا انجام دے سکتا ہے۔ مگر یہاں کے لوگ ابھی تک اس امکان سے بھی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ یہی حال دوسری بہت سی صنعتوں کا بھی ہے۔ جو یہاں بہت آسانی سے قائم کی جا سکتی ہیں۔

کشمیر کا مزدور سر کے بجائے پیٹھ پر سامان لادتا ہے۔ بسا اوقات وہ اپنے اوپر اتنا زیادہ سامان لاد لیتا ہے کہ دیکھنے والے کو اس کے اوپر چھوٹی موٹی گاڑی کا گمان ہونے لگتا ہے۔ حال اور مستقبل سے بے خبر یہ لوگ محنت کو اپنا کام سمجھتے ہیں اور باقی تمام امور کو حالات کے حوالے کئے ہوئے ہیں۔ تاہم خوش قسمت غیر مزدور طبقہ کا معاملہ بھی اس سے بہت زیادہ مختلف نہیں۔ مزدور اگر جاہلانہ بے خبری کا پشتارہ اپنے اوپر لادے ہوئے ہے تو غیر مزدور لوگ اپنی عالمانہ بے شعوری کا۔ دونوں اپنے خیال کے مطابق ایک ایسے حسین مستقبل کی طرف بڑھ رہے ہیں جو ان کے گمان کے مطابق خود بخود ان کی طرف آ جائے گا، اگرچہ اس کے لئے انھوں نے وہ کوشش نہ کی جو دنیا کے پیدا کرنے والے نے اس دنیا کے لئے مقدر کی ہے۔

چند بزرگ آئے۔ سلام اور مصافحہ کے بعد میرا ہاتھ اپنے سر پر رکھا اور دعا کے لئے کہا۔ جب میں آگے بڑھا ان کی آواز میرے کان میں آئی: "عالم دا دیدار کرنا ستر سال دی عبادت کے برابر ہے"۔ اس سے اس علاقہ کے ؤں کی سادگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ لوگوں کی اس سادگی اور بے خبری نے ان کو بعض سماجی فصلوں کے لئے نہایت ۔خیز زمین بنا دیا ہے۔ جموں و کشمیر کی زمین میں ہندوستان کے بہترین پھل پیدا ہوتے ہیں، اسی کے ساتھ وہ چند اؤ یزوں کی پیداوار کے لئے موزوں ترین ثابت ہوئی ہے۔ ان میں سے تین چیزیں خاص ہیں۔ مذہبی بدعات، موت اور ادی وغیرہ کے مواقع پر مسرفانہ رسوم، اور انتہائی بے فائدہ قسم کی جذباتی سیاست۔ یہ دوسری فصلیں اس نت نظیر سرزمین میں اتنے بڑے پیمانہ پر اگی ہیں کہ ملک کی دوسری ریاستوں میں اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ ں قسم کے سماجی جھاڑ جھنکاڑ ہمیشہ جہالت کی زمین پر اُگتے ہیں اور ان کو ختم کرنے کی واحد کامیاب صورت یہ ہے قوم کو تعلیم یافتہ بنا کر اس قسم کی تمام فصلوں کو ان کی زمین سے محروم کر دیا جائے۔

ایک بستی میں میری قیام گاہ کے اوپر ایک پہاڑی ٹیلہ تھا۔ میں نے سوچا کہ اس کے اوپر جا کر بیٹھوں۔ جب ں چڑھ کر وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ اس کے آگے ایک اور ٹیلہ ہے۔ اب میں نے پھر چڑھنا شروع کیا۔ جب دوسرے یلہ پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ اس کے اوپر ایک اور ٹیلہ ہے۔ میں پھر چڑھا۔ مگر جب اوپر پہنچا تو معلوم ہوا کہ اس کے پر ایک اور اس سے اونچا ٹیلہ ہے۔ "انسان آخری بلندی پر پہنچنا چاہتا ہے مگر وہ آخری بلندی پر نہیں پہنچ کتا۔" میں نے سوچا اور وہیں ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد ایک آدمی آیا جو وہاں اپنے کھیتوں کی دیکھ بھال ر رہا تھا۔ اس نے کہا: آپ یہاں کیسے آئے۔ میں نے کہا کہ میں دہلی میں رہتا ہوں۔ دہلی کی کثافت اور ہنگامے مجھ کو چھے نہیں لگتے۔ اس لئے میں یہاں آگیا تاکہ قدرت کی کھلی فضا میں سکون حاصل کروں۔" اس نے سامنے پھیلی ہوئی سبز وادی پر ایک نظر ڈالی اور پھر بولا: "پیداوار اگر وقت وقت پر ہوتی رہے تو اس جیسی کوئی جگہ نہیں۔ یہاں نہ ت گرمی ہوتی ہے اور نہ سخت سردی۔ بارہ مہینے موسم خوش گوار رہتا ہے۔ اس وقت جو سرسبزی آپ دیکھ رہے ہیں یہاں سال بھر رہتی ہے"۔ —— یہاں کے لوگ اگر صرف کھیتی پر انحصار نہ کریں بلکہ اسی کے ساتھ باغبانی یں اور تعلیم و تجارت میں بھی حصہ لیں تو ان کو حالات سے اس قسم کی شکایت نہ رہے۔

میدانی علاقوں میں نہروں کے ذریعہ آب پاشی ہوتی ہے۔ مگر پہاڑی علاقوں میں نہریں نکالنا اور نالیاں انا ممکن نہیں، کیوں کہ پانی کو نیچے سے اوپر کی طرف چڑھایا نہیں جا سکتا۔ اس مسئلہ کا حل قدرت نے پہاڑی علاقوں ں بارش کی زیادتی سے کیا ہے، قدرت حالات سے مطابقت کر کے مسئلہ کو حل کرتی ہے مگر ہمارے "لاؤڈ اسپیکر" رف ایک ہی بات چیخنا جانتے ہیں: حالات سے لڑ کر اپنا مسئلہ حل کرو۔

ایک پہاڑ پر لمبی تھکا دینے والی چڑھائی چڑھنے کے بعد ہم ہموار میدان میں پہنچے تو اس پر چلنا ایسا معلوم ہوا یسے آدمی چل ہی نہ رہا ہو۔ یہی معاملہ زندگی کی جدوجہد کا ہے۔ زندگی کی جدوجہد اپنی ابتدا میں ایک مشکل سفر ہے۔ اس سفر کی ابتدائی مشکلوں کو برداشت کر لیا جائے تو بعد کا سفر اسی طرح آسان ہو جاتا ہے جیسے مشکل چڑھائی کے

بعد ہموار میدان میں چلنا۔ مگر عام طور پر لوگ ابتدائی مشکلات سے گھبرا کر اپنا سفر چھوڑ دیتے ہیں۔ اس لئے "ہموار میدان" کبھی ان کے حصہ میں نہیں آتا۔

میں نے ایک کشمیری نوجوان منظور گلشن بی اے (پیدائش ۱۹۵۶) سے کہا کہ شر ایک منفی کارروائی ہے اور منفی کارروائی ہمیشہ کسی ردعمل کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔ اگر آپ ایسا عمل نہ کریں جو اپنا کوئی ردعمل پیدا کرنے والا ہو تو یقینی طور پر آپ دوسروں کے شر سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔" پھر میں نے گلشن صاحب سے پوچھا: "یہ بتائیے، کیا مسلمان اس نقطۂ نظر کو قبول کر سکتے ہیں۔" وہ فوراً بولے: "نہیں۔" میں نے پوچھا کیوں۔ انھوں نے کہا: اس لئے کہ مسلمان کا مزاج ڈکٹیٹرانہ ہوتا ہے اس لئے اس قسم کی باتیں اس کو اپیل نہیں کرتیں۔ کشمیری نوجوان نے جو بات اپنی سادگی میں کہہ دی وہی دراصل مسلمانوں کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں شاعر اور مقرر قسم کے لیڈروں نے مسلمانوں کا مزاج انتہائی حد تک بگاڑ دیا ہے۔ شاعر اور خطیب کو حقائق سے بحث نہیں ہوتی۔ وہ پرشور الفاظ اور ردیف و قافیہ کی تک بندیوں سے معرکے سر کرتا رہتا ہے۔ اس قسم کی تقریباً سو سالہ ذہنی تربیت نے مسلمانوں کو حد درجہ جذباتی بنا دیا ہے۔ خیالی احساس برتری کے سوا ان کے پاس کوئی اور سرمایہ نہیں۔ وہ کسی طرح حقائق کے ڈھانچہ میں اپنے کو دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ یہ مزاجی بگاڑ مسلمانوں کی تمام انفرادی اور اجتماعی ناکامیوں کا واحد سبب ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس مزاج کی اصلاح ہو سکتی ہے یا نہیں۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس مزاج کی اصلاح کے بغیر آگے کا کوئی کام نہیں کیا جا سکتا۔ اس مزاج کی درستی کے بغیر جو اقدام بھی کیا جائے گا وہ صرف ملت کی بربادی میں اضافہ کا باعث ہوگا۔ قوم کی اسی بے شعوری کا یہ نتیجہ ہے کہ جو شخص بھی اسلام یا ملت اسلام کے نام پر کوئی شور و شر کرنے کے لئے اٹھتا ہے اس کو بہت سے ساتھ دینے والے مل جاتے ہیں۔ حالانکہ ہونا یہ چاہئے کہ بے معنی شور و شر کرنے والے اکیلے رہ جائیں اور قوم کے اندر صرف ان آوازوں کو تعاون ملے جو حقیقی تعمیر کی طرف پکارنے والی ہوں۔

میں سطح سمندر سے چھ ہزار فٹ کی بلندی پر گھاس کی قدرتی مخمل پر بیٹھا ہوں۔ ہر طرف آفاقی مناظر پھیلے ہوئے ہیں۔ سبزہ سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں، قدرتی چشموں کی موسیقی، فرحت بخش ہوا کے جھونکے، سورج کی سہانی کرنیں، نیلا آسمان اور اس میں سفید بادل کی گلکاریاں۔ چڑیوں کے چہچہانے کی آوازیں، تمدن کے ہنگاموں سے دور قدرت کی خاموش دنیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کائنات کا حسین چہرہ اپنے حسین تر خالق کا آئینہ بن گیا ہو۔ میری زبان سے بے اختیار نکلا: خدایا تو اس سے زیادہ ہے کہ میں اپنے لفظوں میں تجھ کو بیان کر سکوں۔ میں نے تیری حمد میں جو کچھ کہا وہ جھوٹ تھا، کیوں کہ میں نے تجھ کو بیان نہیں کیا بلکہ تجھ کو گھٹا دیا۔ میں نے تیری عبادت کی مگر میں نے تیری عبادت نہیں کی کیونکہ تو اس سے برتر ہے کہ کوئی تیری عبادت کا حق ادا کر سکے۔

یہاں کا آفاقی ماحول خدا کے جلال و جمال کو اس طرح نمایاں کر رہا تھا کہ اس کے مقابلہ میں اپنی ہر چیز حقیر اور بے قیمت نظر آئی۔ یہاں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آدمی خدا کی آفاقی دنیا میں ہے۔ تمام منفی جذبات اور

سطحی دینیات خدا کی وسیع دنیا میں تحلیل ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ خود پرستی کائنات کی عظمتوں کے سامنے اپنا وجود کھوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اللہ کے سوا دوسری تمام عقیدتیں اور پرستاریاں ایسی ہو جاتی ہیں جیسے رب العالمین کی بارگاہ میں ان کو جگہ نہ مل رہی ہو۔ دنیا پرستی یہاں کی جنتی فضاؤں میں ایک ایسی حقیر چیز بن جاتی ہے جس پر آدمی خود شرم محسوس کرنے لگے۔

میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا: جی چاہتا ہے کہ یہاں ایک تربیتی نظام قائم ہو جس میں لوگ دس دس، بیس بیس کی تعداد میں آکر شریک ہوں۔ یہاں کی آفاقی فضا ہی میں وہ تربیت گاہ بن سکتی ہے جس میں وہ انسان پیدا کرنے کی کوشش کی جائے جو خدا میں جیتے ہوں۔ جو انسانی پستیوں کے بجائے خدائی بلندیوں میں اپنے شعور کی غذا پا رہے ہوں۔ جو فانی دنیا کے بجائے خدا کی ابدی دنیا میں سانس لیتے ہوں —— کائنات میں غور و فکر آدمی کو خدا سے جوڑتا ہے۔ جب کہ احکام میں خوض سے صرف ذہنی موشگافیاں وجود میں آتی ہیں۔ ایک کے اندر معرفتِ خداوندی کی غذا ہے اور دوسرے کے اندر اختلاف و انتشار کا سامان۔ یہ ایک موزوں ترین مقام ہے جہاں خدا کے بندوں کو خدا پرستی کا درس دیا جا سکتا ہے۔ یہاں ہر طرف قدرتی چشمے ہیں جن سے سال بھر شفاف پانی ابلتا رہتا ہے۔ ایسے ماحول میں جب کوئی کہنے والا کہے کہ اللہ کا فیضان ہدایت ہر وقت برس رہا ہے، اس میں سے اپنا حصہ لو تو بہتے ہوئے چشمے اپنی دھیمی موسیقی کے ساتھ اس کی تائید کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جب آپ کہیں کہ اللہ سب سے بڑا ہے اس کی بڑائی کو مان کر اس کے آگے جھک جاؤ تو پہاڑوں کی بلندیاں اپنی خاموش زبان میں بول پڑتی ہیں کہ کہنے والے نے سچ کہا۔ جب آپ کہیں کہ ایمان کو اس طرح اپناؤ کہ وہ تمھاری پوری ہستی کو تر و تازہ کرنے کے ہم معنی بن جائے تو چاروں طرف اُگے ہوئے سرسبز و شاداب درخت اس قول کی مجسم تفسیر بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جب آپ کہیں کہ اختلاف اور شکایت سے اوپر اٹھ کر رہو تو آسمان کی بلندیاں اپنے آفاقی پھیلاؤ کے ساتھ اس کی خاموش تصدیق بن جاتی ہے —— خدا سے قریب ہونے کی جگہ خدا کی کھلی ہوئی کائنات ہے مگر لوگ خدا کی قربت کو تنگ و تاریک حجروں میں تلاش کر رہے ہیں۔

مقابلہ کا ایک طریقہ یہ بھی ہے

نپولین (۱۸۲۱ - ۱۷۶۹) جب پہلی قید کے بعد جزیرہ البا (Elba) سے بھاگا تو اس کے ساتھ اس کے وفادار سپاہیوں کی صرف ایک مختصر جماعت تھی۔ اس معزول تاجدار کے عزائم یہ تھے کہ وہ فرانس کے تخت پر دوبارہ قبضہ کرے۔ مگر پہلے ہی معرکہ میں اس کو فرانس کے ۲۰ ہزار جوانوں کا سامنا کرنا پڑا۔

نپولین دنیا کے انتہائی بہادر جرنلوں میں سے ایک ہے۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا کہ اپنی فوجی کمی کا لحاظ نہ کرتے ہوئے حریف سے ٹکرا جائے۔ جب دونوں فریق آمنے سامنے ہوئے تو وہ اکیلا بالکل غیر مسلح حالت میں اپنی جماعت سے نکلا اور نہایت اطمینان کے ساتھ فریق مخالف کی صفوں کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے کوٹ کے بٹن کھولے اور اپنے سینہ کو ننگا کر دیا۔ اس کے بعد جذباتی انداز میں اپنے مخالف سپاہیوں سے، جن میں سے اکثر اس کے ماتحت رہ چکے تھے، خطاب کر کے بولا:

"تم میں سے کون وہ سپاہی ہے جو اپنے باپ کے ننگے سینہ پر فائر کرنے کو تیار ہو"

اس کا اثر یہ ہوا کہ ہر طرف سے "کوئی نہیں، کوئی نہیں" کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ تمام سپاہی مخالف جماعت کو چھوڑ کر نپولین کے جھنڈے کے نیچے آگئے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ نپولین اپنی بے سروسامانی کے باوجود فاتح ہوا۔ اس نے ملک فرانس کے تخت پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ حالاں کہ اس وقت وہ جس بے سروسامانی کی حالت میں تھا، اس کے ساتھ اگر وہ فرانس کی فوجوں سے لڑ جاتا تو میدان جنگ میں شاید اس کی لاش تڑپتی ہوئی نظر آتی۔

ایک واقعہ

ڈاکٹر محمد اقبال کے پاس ایک بزرگ وراثت کے معاملہ میں قانونی مشورہ کے لئے آیا کرتے تھے۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب داڑھی نہیں رکھتے تھے، وہ اکثر داڑھی کی اہمیت پر وعظ کہتے۔ آخر ایک دن ڈاکٹر اقبال نے کہا: آپ کی وعظ و تلقین کا میرے اوپر بہت اثر ہوا ہے۔ اب میں نے طے کیا ہے کہ آپ سے ایک معاہدہ کروں۔ جس طرح داڑھی نہ رکھنا ایک شرعی کوتاہی ہے، اپنی بہن کو وراثت سے محروم کرنا بھی اسی طرح شریعت کی خلاف ورزی ہے۔ پہلے گناہ میں میں مبتلا ہوں تو دوسرے میں آپ مبتلا ہیں۔ آیئے طے کیجئے۔ آج سے میں داڑھی رکھ لیتا ہوں اور آپ اپنی بہن کا وراثتی حصہ دے دیں۔ بزرگ اس معاہدہ کے لئے تیار نہ ہوئے۔ انھوں نے نہ اپنی بہن کو وراثت کا حصہ دیا اور نہ ڈاکٹر اقبال کے چہرہ پر داڑھی اگ سکی۔

آدمی کو اپنی غلطیوں کا پتہ نہیں ہوتا۔ البتہ وہ دوسرے کی غلطیوں سے خوب باخبر ہوتا ہے۔ حالاں کہ آدمی کو جو چیز سب سے زیادہ جاننا چاہئے وہ خود اپنی غلطی ہے۔ کیوں کہ اپنی غلطیوں کا جاننا ہی آخرت میں کسی کے کام آئے گا نہ کہ دوسروں کی غلطیوں کو جاننا۔

برائیوں سے بچ کر نکل جانے کا نام تقویٰ ہے

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا "تقویٰ کیا ہے"۔ انھوں نے پوچھنے والے سے کہا: "کیا تم کبھی کانٹے دار راستے سے گزرے ہو"۔ اس نے کہا ہاں۔ انھوں نے پوچھا: تم نے کیا کیا۔ سائل نے کہا: جب میں نے کانٹے کو دیکھا تو میں کنارے ہو گیا اور اس سے بچ کر نکل گیا۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، ذاك التقویٰ (یہی تقویٰ ہے)

اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کرنا اور بندوں کے لئے خیر خواہ ہونا

جریر رضی اللہ عنہ اسلام قبول کرنے کے لئے آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اے جریر: بیعت کے لئے ہاتھ بڑھاؤ۔ انھوں نے کہا کس چیز پر۔ آپ نے فرمایا:

ان تسلم وجهك لله والنصيحة لكل مسلم (طبرانی) اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کردو اور مسلمانوں کی خیر خواہی

انھوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ وہ بہت سمجھ دار آدمی تھے۔ بیعت کرنے لگے تو کہا: یا رسول اللہ فیما استطعت (اے خدا کے رسول: جتنا مجھ سے ہو سکے گا) اس کے بعد سب کے لئے یہی رخصت ہو گئی۔

دنیا کی حرص آدمی کو ہلاک کر دیتی ہے

عمرو بن عوف انصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کو جزیہ لانے کے لئے بحرین بھیجا۔ وہ بحرین سے مال لے کر آئے۔ انصار نے سنا کہ ابوعبیدہ رضؓ آگئے تو وہ صبح کی نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہوئے۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو وہ سامنے آئے۔ آپ ان کو دیکھ کر مسکرائے۔ آپ نے فرمایا: میرا خیال ہے کہ تم نے سن لیا کہ ابوعبیدہ بحرین سے کچھ لے کر آئے ہیں۔ انھوں نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا:

أبشروا و أمّلوا ما يسرّكم۔ فوالله ما الفقر اخشى عليكم ولكني اخشى ان تبسط الدنيا عليكم كما بسطت على من كان قبلكم فتنافسوها كما تنافسوها فتهلككم كما اهلكتهم
(متفق علیہ)

بشارت ہو اور خوشی کی امید رکھو۔ خدا کی قسم میں تمھارے فقر کو نہیں ڈرتا۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ تمھارے اوپر دنیا اسی طرح پھیلا دی جائے جس طرح تم سے اگلوں کے لئے پھیلائی گئی تھی۔ تو تم اس میں حرص کرو جس طرح انھوں نے حرص کی اور اس نے جس طرح ان کو ہلاک کیا تم کو بھی ہلاک کر دے۔

سب سے زیادہ عقل مند، سب سے زیادہ کمزور

حسن بن علی رضی اللہ عنہ جب امیر معاویہ رضؓ کے حق میں خلافت سے دست بردار ہو گئے تو کوفہ کی مسجد میں آپ نے ایک تقریر کی اس میں دست برداری کے اسباب بتاتے ہوئے فرمایا:

الا ان اكيس الكيس التقى واعجز العجز الفجور
(الاستیعاب لابن عبدالبر، جلد ۱ صفحہ ۳۷۴)

سن لو، سب سے زیادہ دانا وہ ہے جو متقی ہے اور سب سے زیادہ عاجز وہ ہے جو فاجر ہے۔

اقربا نوازی نہیں

ابن ابی شیبہ، احمد، ابن ابی الدنیا، ابن ابی حاتم اور ابن عساکر نے اسلم سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ عبداللہ بن ارقم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا: اے امیرالمومنین! بیت المال میں جلولا کے آئے ہوئے کچھ زیور اور چاندی کے برتن ہیں۔ آپ ان کو دیکھ لیجئے اور ان کے سلسلہ میں ہم کو ہدایات دیجئے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا جب مجھ کو فارغ دیکھنا تو مجھ کو بتانا۔ عبداللہ بن ارقم رض ایک روز آئے اور کہا: آج میں آپ کو فارغ دیکھ رہا ہوں۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ پھر آپ بیت المال گئے اور زیوروں اور برتنوں کو نکلوایا۔ سامان نکال کر آپ کے سامنے رکھا گیا۔ آپ نے ان کو دیکھ کر سورہ آل عمران کی آیت ۱۴ پڑھی اور فرمایا:

انالا نستطیع الا ان نفرح بما زینت لنا، اللھم! فاجعلنا ننفقہ فی حق و اعوذ بك من شرہ

یہ چیز جو ہمارے لئے مزین کی گئی ہے، ہمارے بس میں نہیں کہ ہم ان کو دیکھ کر خوش نہ ہوں۔ خدایا! تو ہم کو ایسا بنا دے کہ ہم اس کو حق میں خرچ کریں اور میں تیری پناہ چاہتا ہوں اس کے شر سے۔

راوی کہتے ہیں کہ اسی دوران میں عمر رضی اللہ عنہ کا ایک بچہ آگیا جس کو عبدالرحمٰن بن بہیہ کہا جاتا تھا۔ بچے نے کہا میرے باپ! ایک انگوٹھی مجھ کو دے دیجئے۔ آپ نے فرمایا:

اذھب الی امك تسقیك سویقا (اپنی ماں کے پاس جاؤ، وہ تم کو ستو پلائے گی) راوی کہتے ہیں: پس خدا کی قسم انھوں نے بچہ کو کچھ نہیں دیا۔

دوسروں سے پہلے اپنی فکر کرو

قاسم کہتے ہیں کہ ایک شخص نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کہا کہ مجھے نصیحت کیجئے۔ آپ نے فرمایا: تو اپنے گھر میں رہ۔ اپنی زبان کو روک لے اور اپنی غلطیوں کو یاد کرکے رویا کر۔ (لیسعك بیتك واکفف لسانك و ابك ذکر خطیئتك، حلیۃ الاولیا، جلد ۱ صفحہ ۱۳۵)

حیثیت سے کوئی فائدہ نہ اٹھانا

مالک بن اوس بن حدثان بتاتے ہیں کہ شاہ روم کا قاصد عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا۔ عمر رضی اللہ عنہ کی بیوی نے ایک دینار قرض لیا۔ اس سے عطر خریدا اور اس کو شیشہ کے برتنوں میں رکھا اور قاصد کے ذریعہ اس کو شاہ روم کی بیوی کے پاس بھیجا۔ قاصد یہ تحفہ لے کر ملکۂ روم کے پاس پہنچا تو اس نے ان برتنوں کو خالی کیا اور ان کو جواہرات سے بھر کر قاصد سے کہا: ان کو عمر بن خطاب کی بیوی کے پاس لے جاؤ۔ جب آپ کی بیوی کے پاس وہ برتن آئے تو انھوں نے جواہرات کو نکال کر بستر پر رکھا۔ عمر رضی اللہ عنہ گھر میں آئے تو انھوں نے پوچھا یہ کیا ہے۔ بیوی نے آپ کو واقعہ کی خبر دی۔ عمر رضی اللہ عنہ نے وہ جواہرات لئے اور ان کو بیچا۔ ان میں سے ایک دینار اپنی بیوی کو دیا اور باقی کو بیت المال میں جمع کر دیا۔ (اخرجہ الدینوری فی المجالسہ)

موت کے اس پار

موریس رالنگز جو ایک بڑے امریکی ڈاکٹر ہیں، انھوں نے اپنے تجربات کی بنیاد پر اعلان کیا ہے کہ موت کے دروازے کے دوسری طرف جنت اور جہنم ہیں۔ ہم کو چاہئے کہ ہر قیمت پر اپنے کو جہنم سے بچانے کی کوشش کریں۔ ڈاکٹر موریس رالنگز نے یہ رائے ان تین سالہ تجربات کی بنا پر قائم کی ہے جو ان کو مریضوں کے آپریشن کے سلسلے میں ہوئے ہیں۔ ان کے تجربہ میں تقریباً ایک سو ایسے مریض آئے جن کے دل کی حرکت آپریشن کے دوران بند ہو گئی۔ تاہم چند منٹ کے بعد دوبارہ ان کا دل حرکت میں آگیا — ایسے لوگ گویا موت کے بعد کی دنیا میں داخل ہو کر دوبارہ موجودہ دنیا میں واپس آگئے۔ ان مریضوں میں سے ۵۰ فی صد نے بتایا کہ وہ ایک بے حد اندھیرے مقام پر پہنچے۔ وہاں ناقابل برداشت تکلیف تھی۔ بہت سے لوگ چیخ رہے تھے کہ مجھے بچاؤ، مجھے بچاؤ۔ ان مریضوں کو "موت کے بعد" جو تجربات ہوئے ان میں ہر ایک نے اپنے کو ایک ایسی تاریک سرنگ سے گزرتے ہوئے دیکھا جو بالآخر ایک بہت بڑے عذاب خانہ پر ختم ہوتی تھی۔ مگر وہاں کسی نے ان سے کہا کہ "واپس جاؤ" اور وہ فوراً اپنے جسموں میں لوٹ آئے۔ ڈاکٹر رالنگز کے مریضوں میں ایک شخص اپنے اس تجربہ سے اتنا دہشت زدہ ہوا کہ اس نے اپنی ملازمت چھوڑ دی اور پادری بن گیا۔ ڈاکٹر رالنگز کا کہنا ہے کہ ایسے واقعات بہت عام ہیں۔ مگر ڈاکٹر لوگ اس کو "روحانی معاملہ" کہہ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر رالنگز نے اس موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے: موت کے دروازہ کے اس پار (Beyond Death's Door)

He was able to escape only after a loud voice boomed, "Come out!" He instantly "found himself back in his hospital bed, being shocked back to life."

One patient was so shaken by his experience that he quit his job to join the ministry.

Such incredible experiences are more frequent than is generally believed, according to Dr. Rawlings, who maintais that they are often not reported because people are too embarrassed to admit them.

Dr. Rawlings added that their doctors are embarrassed "to make inquiries into such spiritual matters." Instead, we hear mostly of heavenly life-after-death experiences.

"But nobody can afford to ignore the reports of these patients," he cautioned.

"I'm convinced that there is a hell and that we must conduct ourselves in such a way as to avoid being sent there at all costs."

The above article appeared in *National Enquirer*, published weekly by National Enquirer, Inc., Lantana, FLA 33464.

MONTHLY NUR,

BERKELEY,

USA,

January—February 1979

As Many Go to Hell as Heaven

"I'm thoroughly convinced that there is life after death — and that there are at least as many going to hell as to heaven!" declared Dr. Maurice Rawlings, a top cardiologist who has talked to patients who have "died" and been resuscitated.

Dr. Rawlings — a fellow of the American College of Cardiology, and a clinical associate professor of medicine at the University of Tennessee at Chattanooga — told that until he began collecting accounts three years ago he could find no support for the Biblical accounts of heaven or hell.

But the incredible expreiences and too vivid accounts of about 100 patients whose hearts had stopped dramatically changed all that and led Dr. Rawlings to write the soon-to-be-published book, "Beyond Death's Door."

"About 50 percent of the revived persons told of having gone to a place of great darkness, filled with grotesque moaning and writhing bodies, crying out to be rescued from this place with an overwhelming feeling of eerie and nightmarish terror." he said.

"Patients also described things that had gone on in the emergency room during the time they were dead — able to give precise information as to what had been said and done while they were gone!"

Typical of the chilling reports of the afterlife was the grim recollection of a man who was "clinically dead of a heart attack for four or five minutes."

"I was at his side when he revived," Dr. Rawlings recalled, "and he immediately began telling me of his visit to hell. He said he felt as if his body was falling down a shaft until he emerged into an enormous cave. He saw a lake of fire and brimstone. All around him, he said, were the bony bodies of people moaning helplessly."

It wasn't until the patient was able to momentarily draw the attention of a robed, Christ-like figure that he was able to escape. "He told me, 'The next thing I knew, I was back in my body.' " Dr. Rawlings said.

Another man reportedly had three life-after-death experiences. "The first time he 'died' he found himself in hell," Dr. Rawlings remembered. Summoned out of the hospital emergency room by a giant and several imp-like figures," the patient said he "descended through a tunnel-like passageway which eventually emptied into a cavern, piled high with glowing-hot rocks." He told Dr. Rawlings that he experienced "unbearable heat and felt oozing, slimy, writhing creatures slithering all over his feet."

تذکیرالقرآن

اور جو لوگ علم نہیں رکھتے، انھوں نے کہا: اللہ کیوں نہیں کلام کرتا ہم سے یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی۔ اسی طرح ان کے اگلے بھی انھیں کی سی بات کہہ چکے ہیں، ان سب کے دل ایک جیسے ہیں، ہم نے پیش کر دی ہیں نشانیاں ان لوگوں کے لئے جو یقین کرنے والے ہیں۔ ہم نے تم کو ٹھیک بات لے کر بھیجا ہے، خوش خبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر۔ اور تم سے دوزخ میں جانے والوں کی بابت کوئی پوچھ نہیں ہوگی۔ اور یہود اور نصاریٰ ہرگز تم سے راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کی ملت کے پیرو نہ بن جاؤ۔ تم کہو کہ جو راہ اللہ دکھاتا ہے وہی اصل راہ ہے۔ اور اگر بعد اس علم کے جو تم کو پہنچ چکا ہے تم نے ان کی خواہشوں کی پیروی کی تو اللہ کے مقابلہ میں نہ تمھارا کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی مددگار۔ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کو پڑھتے ہیں جیسا کہ حق ہے پڑھنے کا۔ یہی لوگ ایمان لاتے ہیں اس پر۔ اور جو اس کا انکار کرے تو وہی گھاٹے میں رہنے والے ہیں ۱۲۱ — ۱۱۸

اللہ کے وہ بندے جو اللہ کی طرف سے اس کے دین کا اعلان کرنے کے لئے آئے، ان کو ہر زمانہ میں ایک ہی قسم کے ردعمل سے سابقہ پیش آیا۔ "اگر تم خدا کے نمائندے ہو تو تمھارے ساتھ دنیا کے خزانے کیوں نہیں" یہ شبہ ان لوگوں کو ہوتا جو اپنے دنیا پرستانہ مزاج کی وجہ سے مادی بڑائی کو بڑائی سمجھتے تھے، اس لئے وہ خدا کی نمائندگی کرنے والے میں بھی یہی بڑائی دیکھنا چاہتے تھے۔ جب داعیٔ حق کی زندگی میں ان کو اس قسم کی بڑائی دکھائی نہ دیتی تو وہ اس کا انکار کر دیتے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا کہ ایک "معمولی آدمی" کیوں کر وہ شخص ہو سکتا ہے جس کو زمین و آسمان کے مالک نے اپنے پیغام رسانی کے لئے چنا ہو۔ اللہ کے ان بندوں کی زندگی اور ان کے کلام میں اللہ اپنی نشانیوں کی صورت میں شامل ہوتا، بالفاظ دیگر معنوی بڑائیاں پوری طرح ان کے ساتھ ہوتیں۔ مگر اس قسم کی چیزیں لوگوں کو نظر نہ آتیں، اس لئے وہ ان کو "بڑا" ماننے کے لئے بھی تیار نہ ہوتے۔ دلیل اپنی کامل صورت میں موجود ہو کر بھی ان کے ذہن کا جزر نہ بنتی، کیوں کہ وہ ان کے مزاجی ڈھانچہ کے مطابق نہ ہوتی۔

یہود و نصاریٰ قدیم زمانہ میں آسمانی مذہب کے نمائندے تھے مگر زوال کا شکار ہونے کے بعد دین ان کے لئے ایک گروہی طریقہ ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ اپنے گروہ سے وابستہ رہنے کو دین سمجھتے اور گروہ سے الگ ہو جانے کو بے دینی۔ ان کے گروہ میں شامل ہونا یا نہ ہونا ہی ان کے نزدیک حق اور ناحق کا معیار بن گیا تھا۔ دین جب اپنی بے آمیز صورت میں ان کے سامنے آیا تو ان کا گروہی دین داری کا مزاج اس کو قبول نہ کر سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ بے آمیز دین کو وہی اختیار کرے گا جس نے اپنی فطرت کو زندہ رکھا ہے۔ جن کی فطرت کی روشنی بجھ چکی ہے ان سے کسی قسم کی کوئی امید نہیں۔ دین کو ایسے لوگوں کے لئے قابل قبول بنانے کی خاطر دین کو بدلا نہیں جا سکتا۔

اے بنی اسرائیل میرے اس احسان کو یاد کرو جو میں نے تمھارے اوپر کیا اور اس بات کو کہ میں نے تم کو تمام اقوام عالم پر فضیلت دی۔ اور اس دن سے ڈرو جس میں کوئی شخص کسی شخص کے کچھ کام نہ آئے گا اور نہ کسی کی طرف سے کوئی معاوضہ قبول کیا جائے گا اور نہ کسی کو کوئی سفارش فائدہ دے گی اور نہ کہیں سے ان کو کوئی مدد پہنچے گی۔ اور جب ابراہیم کو اس کے رب نے کئی باتوں میں آزمایا تو اس نے پورا کر دکھایا۔ اللہ نے کہا میں تم کو سب لوگوں کا امام بناؤں گا۔ ابراہیم نے کہا: اور میری اولاد میں سے بھی۔ اللہ نے کہا: میرا عہد ظالموں تک نہیں پہنچتا

۱۲۲ — ۱۲۴

بنی اسرائیل کو اس کارِ خاص کے لئے چنا گیا تھا کہ وہ اقوام عالم کو اللہ کی طرف بلائیں اور ان کو اس حقیقت سے آگاہ کریں کہ ان کے اعمال کے بارے میں ان کا مالک ان سے سوال کرنے والا ہے۔ اس کام کی رہنمائی کے لئے ان کے درمیان مسلسل پیغمبر آتے رہے۔ حضرت ابراہیم، یعقوب، یوسف، موسیٰ، داؤد، سلیمان، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ علیہم السلام وغیرہ۔ مگر بعد کے زمانہ میں جب بنی اسرائیل پر زوال آیا تو انھوں نے اس منصبی فضیلت کو نسلی اور گروہی فضیلت کے معنی میں لے لیا۔ اور اس طرح اس کی بابت اپنے استحقاق کو کھو دیا۔ اسماعیلی خاندان میں نبی عربی کا آنا دراصل بنی اسرائیل کی مقام فضیلت سے معزولی اور اس کی جگہ بنی اسماعیل کے تقرر کا اعلان تھا۔ بنی اسرائیل میں جو لوگ فی الواقع خدا پرست تھے ان کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ نبی عربی جو کلام پیش کر رہے ہیں وہ خدا کی طرف سے آیا ہوا کلام ہے۔ مگر جو لوگ گروہی تعصبات کو دین بنائے ہوئے تھے ان کے لئے اپنے سے باہر کسی فضیلت کا اعتراف کرنا ممکن نہ ہو سکا۔

پیغمبر عربی کے ذریعہ ان کو متنبہ کیا گیا کہ یاد رکھو آخرت میں حقیقی ایمان اور سچے عمل کے سوا کسی بھی چیز کی کوئی قیمت نہ ہوگی۔ دنیا میں ایک شخص دوسرے شخص کا بار اپنے سر لے لیتا ہے۔ کسی معاملہ میں کسی کی سفارش کام آجاتی ہے۔ کبھی معاوضہ دے کر آدمی چھوٹ جاتا ہے۔ کبھی کوئی مددگار مل جاتا ہے جو پشت پناہی کر کے بچا لیتا ہے۔ مگر آخرت میں اس قسم کی کوئی چیز کسی کے کام آنے والی نہیں۔ آخرت کسی گروہ کی نسلی وراثت نہیں، وہ اللہ کے بے لاگ انصاف کا دن ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کو جو درجۂ فضیلت ملا اس کا فیصلہ اس وقت کیا گیا جب وہ کڑی جانچ میں خدا کے سچے فرماں بردار ثابت ہوئے۔ اللہ کی یہی سنت ان کی نسل کے بارے میں بھی ہے کہ جو عمل میں پورا اترے گا وہ اس وعدۂ الٰہی میں شریک ہوگا۔ اور جو عمل کے ترازو پر اپنے کو سچا ثابت نہ کر سکے اس کا وہی انجام ہوگا جو اس قسم کے دوسرے مجرمین کے لئے اللہ کے یہاں مقدر ہے —— حضرت ابراہیمؑ کو نہایت کڑی آزمائشوں کے بعد پیشوائی کا مقام دیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ امامت و قیادت کے منصب کا استحقاق قربانیوں کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ قربانی کی قیمت پر کسی مقصد کو اختیار کرنے والا اس مقصد کی راہ میں سب سے آگے ہوتا ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر وہی اس کا قائد بنتا ہے۔

اور جب ہم نے کعبہ کو لوگوں کے اجتماع کی جگہ اور امن کا مقام ٹھہرایا۔ اور حکم دیا کہ مقام ابراہیم کو نماز پڑھنے کی جگہ بنالو۔ اور ابراہیم اور اسماعیل کو تاکید کی کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے پاک رکھو۔ اور جب ابراہیم نے کہا کہ اے میرے رب اس شہر کو امن کا شہر بنادے اور اس کے باشندوں کو، جو ان میں سے اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھیں، پھلوں کی روزی عطا فرما۔ اللہ نے کہا جو انکار کرے گا میں اس کو بھی تھوڑے دنوں فائدہ دوں گا۔ پھر اس کو آگ کے عذاب کی طرف دھکیل دوں گا اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے ۱۲۶ — ۱۲۵

ساری دنیا کے اہل ایمان ہر سال اپنے وطن کو چھوڑ کر بیت اللہ آتے ہیں۔ یہاں کسی کے لئے کسی ذی حیات پر زیادتی کرنا جائز نہیں۔ حرم کعبہ کو دائمی طور پر عبادت کی جگہ بنا دیا گیا ہے۔ اس مقام کو ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک رکھا جاتا ہے۔ کعبہ کا طواف کیا جاتا ہے۔ دنیا سے الگ ہو کر اللہ کی یاد کی جاتی ہے اور اللہ کے لئے رکوع و سجود کیا جاتا ہے۔ قدیم زمانہ میں یہ دنیا کا سب سے زیادہ خشک علاقہ تھا جہاں ریتلی زمینوں اور پتھریلی چٹانوں کی وجہ سے کوئی فصل پیدا نہیں ہوتی تھی۔ مزید یہ کہ وہ انتہائی طور پر غیر محفوظ تھا۔ چار ہزار برس پہلے حضرت ابراہیمؑ کو حکم ہوا کہ اپنے خاندان کو اس علاقہ میں لے جاؤ اور اس کو وہاں بسا دو۔ حضرت ابراہیمؑ نے ادنیٰ تامل کے بغیر اس کی تعمیل کی۔ اور جب خاندان کو اس بے آب و گیاہ مقام پر پہنچا چکے تو دعا کی کہ خدایا میں نے تیرے حکم کی تعمیل کر دی۔ اب تو اپنے بندے کی پکار کو سن لے اور اس بستی کو امن و امان کی بستی بنا دے۔ اور اس خشک زمین پر ان کے لئے خصوصی رزق کا انتظام فرما۔ دعا قبول ہوئی اور اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ یہ علاقہ آج تک امن اور رزق کی کثرت کا نمونہ بنا ہوا ہے۔

مومن کو دنیا میں اس طرح رہنا ہے کہ وہ بار بار یاد کرتا رہے کہ خواہ وہ دنیا کے کسی گوشہ میں ہو اس کو بہر حال ایک روز لوٹ کر خدا کے یہاں جانا ہے۔ وہ جن انسانوں کے درمیان رہے، بے ضرر بن کر رہے۔ وہ زمین کو خدا کی عبادت کی جگہ سمجھے اور اس کو اپنی کثافتوں سے پاک رکھے۔ اس کی پوری زندگی خدا کے گرد گھومتی ہو۔ وہ بظاہر دنیا میں رہے مگر اس کا دل اپنے رب میں اٹکا ہوا ہو۔ وہ ہمہ تن اللہ کے آگے جھک جائے۔ پھر یہ کہ دین جس چیز کا تقاضا کرے، خواہ وہ ایک "چٹیل میدان" میں بیوی بچوں کو لے جا کر ڈال دینا ہو، بندہ پوری وفاداری کے ساتھ اس کے لئے راضی ہو جائے۔ اور جب تعمیل حکم کر چکے تو خدا سے مدد کی درخواست کرے۔ عجب نہیں کہ خدا اپنے بندے کی خاطر چٹیل بیابان میں رزق کے چشمے جاری کر دے۔

دنیا کی رونق، خواہ کسی کو دین کے نام پر ملے، اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ اللہ نے اس کو امامت و پیشوائی کے منصب کے لئے قبول کر لیا ہے۔ دنیا کی چیزیں صرف آزمائش کے لئے ہیں جو سب کو ملتی ہیں۔ جبکہ امامت یہ ہے کہ کسی بندے کو قوموں کے درمیان خدا کی نمائندگی کے لئے منتخب کر لیا جائے۔

اور جب ابراہیم اور اسماعیل بیت اللہ کی دیواریں اٹھا رہے تھے اور یہ کہتے جاتے تھے : اے ہمارے رب قبول کر ہم سے، یقیناً تو ہی سننے والا جاننے والا ہے ۔ اے ہمارے رب ہم کو اپنا فرماں بردار بنا اور ہمار نسل میں سے اپنی ایک فرماں بردار امت اٹھا اور ہم کو ہمارے عبادت کے طریقے بتا اور ہم کو معاف فرما معاف کرنے والا رحم کرنے والا ہے ۔ اے ہمارے رب اور ان میں ان ہی میں کا ایک رسول اٹھا جو ان کو تیر آیتیں سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے ۔ بے شک تو زبردست ۔ حکمت والا ہے ۱۲۹ — ۱۲۷

اللہ کا یہ فیصلہ تھا کہ وہ حجاز کو اسلام کی دعوت کا عالمی مرکز بنائے ۔ اس مرکز کے قیام اور انتظام لیے حضرت ابراہیم اور ان کی اولاد کا انتخاب ہوا ۔ بیت اللہ کی تعمیر کے وقت حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ زبان سے جو کلمات نکل رہے تھے وہ ایک اعتبار سے دعا تھے اور دوسرے اعتبار سے وہ دو روحوں کا اپنے آ کو اللہ کے منصوبے میں دے دینے کا اعلان تھا ۔ ایسی دعا خود مطلوب الٰہی ہوتی ہے ۔ چنانچہ وہ پوری طر قبول ہوئی ۔ عرب کے خشک بیابان سے اسلام کا ابدی چشمہ پھوٹ نکلا ۔ بنی اسماعیل کے دل اللہ تعالیٰ ۔ خصوصی طور پر اپنے دین کی خدمت کے لئے نرم کر دیئے ۔ ان کے اندر سے ایک طاقت ور اسلامی دعوت برپا ہو ان کے ذریعہ سے اللہ نے اپنے بندوں کو وہ طریقے بتائے جن سے وہ خوش ہوتا ہے اور اپنی رحمت کے ساتھ ا طرف متوجہ ہوتا ہے ۔ پھر انھیں کے اندر سے اس آخری رسول کی بعثت ہوئی جس نے تاریخ میں پہلی بار یہ کا رنبوت کو ایک مکمل تاریخی نمونہ کی صورت میں قائم کر دیا ۔

نبی کا پہلا کام تلاوت آیات ہے ۔ آیت کے معنی نشانی کے ہیں یعنی وہ چیز جو کسی چیز کے اوپر دلیل بنے انسان کی فطرت میں اور باہر کی دنیا میں اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت کی بے شمار نشانیاں رکھ دی ہیں ۔ یہ اشارا کی صورت میں ہیں ۔ پیغمبر ان اشارات کو کھولتا ہے ۔ وہ آدمی کو وہ نگاہ دیتا ہے جس سے وہ ہر چیز میں ا رب کا جلوہ دیکھنے لگے ۔ کتاب سے مراد قرآن ہے ۔ نبی کا دوسرا کام یہ ہے کہ وہ اللہ کی وحی کا مہبط بنتا ہے ا اس کو خدا سے لے کر انسان تک پہنچاتا ہے ۔ حکمت کا مطلب ہے بصیرت ۔ جب آدمی خدا کی نشانیوں کو دیکھنے کی پیدا کر لیتا ہے، جب وہ اپنے ذہن کو قرآن کی تعلیمات میں ڈھال لیتا ہے تو اس کے اندر ایک فکری روشنی جل ہے ۔ وہ اپنے آپ کو حقیقت اعلیٰ کے ہم شعور بنا لیتا ہے ۔ وہ ہر معاملہ میں اس صحیح فیصلہ تک پہنچ جاتا ہے جو اللہ کو مطلوب ہے ۔ تزکیہ کا مطلب ہے کسی چیز کو غیر موافق عناصر سے پاک کر دینا تاکہ وہ موافق فضا میں اپنے فط کمال کو پہنچ سکے ۔ نبی کی آخری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ایسے انسان تیار ہوں جن کے سینے اللہ کی عقیدت کے سوا عقیدت سے خالی ہوں ۔ ایسی روحیں وجود میں آئیں جو نفسیاتی پیچیدگیوں سے آزاد ہوں ، ایسے افراد پیدا جو کائنات سے وہ ربانی رزق پا سکیں جو اللہ نے اپنے مومن بندوں کے لئے رکھ دیا ہے ۔

اور کون ہے جو ابراہیم کے دین کو پسند نہ کرے مگر وہ جس نے اپنے آپ کو احمق بنا لیا ہو۔ حالاں کہ ہم نے اس کو دنیا میں چن لیا تھا اور آخرت میں وہ صالحین میں سے ہوگا۔ جب اس کے رب نے کہا کہ اپنے آپ کو حوالے کردو تو اس نے کہا: میں نے اپنے آپ کو رب العالمین کے حوالے کیا اور اسی کی نصیحت کی ابراہیم نے اپنی اولاد کو اور اسی کی نصیحت کی یعقوب نے اپنی اولاد کو۔ اے میرے بیٹو! اللہ نے تمھارے لئے اسی دین کو چن لیا ہے۔ پس اسلام کے سوا کسی اور حالت پر تم کو موت نہ آئے۔ کیا تم موجود تھے جب یعقوب کی موت کا وقت آیا۔ جب اس نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ میرے بعد تم کس کی عبادت کروگے۔ انھوں نے کہا: ہم اسی خدا کی عبادت کریں گے جس کی عبادت آپ اور آپ کے بزرگ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق کرتے آئے ہیں، وہی ایک معبود ہے اور ہم اس کے فرماں بردار ہیں۔ یہ ایک جماعت تھی جو گزر گئی۔ اس کو ملے گا جو اس نے کمایا اور تم کو ملے گا جو تم نے کمایا۔ اور تم سے ان کے کئے ہوئے کی پوچھ نہ ہوگی ۱۳۴ - ۱۳۰

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت عین وہی تھی جو حضرت ابراہیمؑ کی دعوت تھی۔ مگر یہود، جو حضرت ابراہیمؑ کا پیرو ہونے پر فخر کرتے تھے، آپؐ کی دعوت کے سب سے بڑے مخالف بن گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پیغمبر عربیؐ جس دین ابراہیمی کی طرف لوگوں کو بلاتے تھے وہ "اسلام" تھا۔ یعنی اللہ کے لئے کامل حوالگی و سپردگی۔ قرآن کے مطابق یہی حضرت ابراہیمؑ کا دین تھا اور اپنی اولاد کو انھوں نے اسی کی وصیت کی۔ اس کے برعکس یہود نے حضرت ابراہیمؑ کی طرف جو دین منسوب کر رکھا تھا اس میں حوالگی و سپردگی کا کوئی سوال نہ تھا۔ اس میں آزادانہ زندگی گزارتے ہوئے محض سستے تخیلات کے تحت جنت کی ضمانت حاصل ہوجاتی تھی۔ پیغمبر عربیؐ کے لائے ہوئے دین میں نجات کا دار و مدار تمام تر عمل پر تھا، جب کہ یہود نے "اللہ کے مقبول بندوں" کی جماعت سے وابستگی اور عقیدت کو نجات کے لئے کافی سمجھ لیا تھا۔ اول الذکر کے نزدیک دین آسمانی ہدایات کا نام تھا اور ثانی الذکر کے نزدیک محض ایک گروہی مجموعہ کا جو نسلی روایات اور قومی تخیلات کے تحت ایک خاص صورت میں بن گیا تھا۔

ماضی یا حال کے بزرگوں سے اپنے کو منسوب کرکے یہ اطمینان حاصل ہوتا ہے کہ ہمارا انجام بھی انھیں کے ساتھ ہوگا۔ ہمارے عمل کی کمی ان کے عمل کی زیادتی سے پوری ہو جائے گی۔ یہود اس خوش فہمی کو یہاں تک لے گئے کہ انھوں نے "نجات متوارث" کا عقیدہ وضع کر لیا۔ انھوں نے اپنی تمام امیدیں اپنے بزرگوں کے تقدس پر قائم کرلیں۔ مگر یہ نفسیاتی فریب کے سوا اور کچھ نہیں۔ ہر ایک کے آگے وہی آئے گا جو اس نے کیا۔ ایک سے نہ دوسرے کے جرائم کی پوچھ ہوگی اور نہ ایک کو دوسرے کی نیکیوں میں سے حصہ ملے گا۔ ہر ایک اپنے کئے کے مطابق اللہ کے یہاں بدلہ پائے گا۔ "تم نہ مرنا مگر اسلام پر"، یعنی اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کرنے میں رکاوٹیں آئیں گی۔ تمھاری تمناؤں کی مخالفت کرے گی۔ پھر بھی تم آخر وقت تک اس پر قائم رہنا۔

اور کہتے ہیں کہ یہودی یا نصرانی بن جاؤ تو ہدایت پاؤ گے۔ کہو کہ نہیں، بلکہ ہم تو پیروی کرتے ہیں ابراہیم کے دین کی جو اللہ کی طرف یکسو تھا اور وہ شریک کرنے والوں میں نہ تھا۔ کہو ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس چیز پر ایمان لائے جو ہماری طرف اتاری گئی ہے اور اس پر بھی جو ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اس کی اولاد پر اتاری گئی اور جو ملا موسیٰ اور عیسیٰ کو اور جو ملا سب نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے۔ ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ ہی کے فرماں بردار ہیں۔ پھر اگر وہ ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو بے شک وہ راہ پا گئے اور اگر وہ پھر جائیں تو اب وہ ضد پر ہیں۔ پس تمہاری طرف سے اللہ ان کے لئے کافی ہے اور وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ کہو ہم نے لیا اللہ کا رنگ اور اللہ کے رنگ سے کس کا رنگ اچھا ہے اور ہم اسی کی عبادت کرنے والے ہیں۔ کہو کیا تم اللہ کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو حالاں کہ وہ ہمارا رب ہے اور تمہارا رب بھی۔ ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال ہیں اور ہم خالص اسی کے لئے ہیں۔ کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اس کی اولاد سب یہودی یا نصرانی تھے۔ کہو کہ تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ۔ اور اس سے بڑا ظالم اور کون ہوگا جو اس گواہی کو چھپائے جو اللہ کی طرف سے اس کے پاس آئی ہوئی ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں۔ یہ ایک جماعت تھی جو گزر گئی۔ اس کو ملے گا جو اس نے کمایا اور تم کو ملے گا جو تم نے کمایا۔ اور تم سے ان کے کئے ہوئے کی پوچھ نہ ہوگی ۱۴۱ — ۵

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس دین کی طرف بلاتے تھے وہ وہی ابراہیمی دین تھا جس سے یہود اپنے کو منسوب کئے ہوئے تھے۔ پھر وہ آپ کے مخالف کیوں ہو گئے۔ وجہ یہ تھی کہ پیغمبر عربی کی دعوت کے مطابق دین یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی کو اللہ کے رنگ میں رنگ لے، وہ ہر طرف سے یکسو ہو کر اللہ والا بن جائے۔ اس کے برعکس یہود کے یہاں دین بس ایک قومی فخر کے نشان کے طور پر باقی رہ گیا تھا۔ پیغمبر عربیؐ کی دعوت سے ان کی پُر فخر نفسیات پر زد پڑتی تھی، اس لئے وہ آپ کے دشمن بن گئے۔

جو لوگ گروہی فضیلت کی نفسیات میں مبتلا ہوں وہ اپنے سے باہر کسی صداقت کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ وہ اپنے گروہ کے پیغمبرانِ خدا کو تو مانیں گے مگر اسی خدا کا ایک پیغمبر اُن کے گروہ سے باہر آئے تو وہ اس کا انکار کر دیں گے۔ دین کے نام پر وہ جس چیز سے واقف ہیں وہ صرف گروہ پرستی ہے۔ اس لئے وہی شخصیتیں ان کو شخصیتیں نظر آتی ہیں جو ان کے اپنے گروہ سے تعلق رکھتی ہوں۔ مگر جس شخص کے لئے دین خدا پرستی کا نام ہو وہ خدا کی طرف سے آنے والی ہر آواز کو پہچان لے گا اور اس پر لبیک کہے گا۔ یہود کے علماء کے لئے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ پیغمبر عربیؐ اللہ کے آخری رسول ہیں اور ان کی دعوت سچی خدا پرستی کی دعوت ہے۔ مگر اپنی بڑائی کو باقی رکھنے کی خاطر انھوں نے لوگوں کے سامنے ایک ایسی حقیقت کا اعلان نہیں کیا جس کا اعلان کرنا ان کے اوپر خدا کی طرف سے فرض کیا گیا تھا۔

اب بے وقوف لوگ کہیں گے کہ مسلمانوں کو کس چیز نے ان کے قبلہ سے پھیر دیا۔ کہو کہ مشرق اور مغرب اللہ ہی کے ہیں۔ وہ جس کو چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔ اور اس طرح ہم نے تم کو بیچ کی امت بنا دیا تاکہ تم ہو بتانے والے لوگوں پر اور رسول ہو تم پر بتانے والا۔ اور جس قبلہ پر تم تھے، ہم نے اس کو صرف اس لئے ٹھیرایا تھا کہ ہم جان لیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون اس سے اُلٹے پاؤں پھر جاتا ہے۔ اور بیشک یہ بات بھاری ہے مگر ان لوگوں پر جن کو اللہ نے ہدایت دی ہے۔ اور اللہ ایسا نہیں کہ تمھارے ایمان کو ضائع کردے۔ بے شک اللہ لوگوں کے ساتھ شفقت کرنے والا مہربان ہے ۱۴۲—۱۴۳

قبلہ کا تعلق مظاہرِ عبادت سے ہے نہ کہ حقیقت عبادت سے۔ قبلہ کا اصل مقصد عبادت کی تنظیم کے لئے ایک عمومی رخ کا تعین کرنا ہے۔ ہر سمت اللہ کی سمت ہے۔ وہ اپنے بندوں کے لئے جو سمت بھی مقرر کردے وہی اس کی پسندیدہ عبادتی سمت ہوگی، خواہ وہ مشرق کی طرف ہو یا مغرب کی طرف۔ مگر لمبی مدت تک بیت المقدس کی طرف رُخ کرکے عبادت کرنے کی وجہ سے قبلۂ اول کو تقدس حاصل ہوگیا تھا۔ چنانچہ ۲ ہ میں جب قبلہ کی تبدیلی کا اعلان ہوا تو بہت سے لوگوں کے لئے اپنے ذہن کو اس کے مطابق بنانا مشکل ہوگیا۔ یہود نے اس کو بہانہ بنا کر آپ کے خلاف طرح طرح کی باتیں پھیلانی شروع کیں —— بیت المقدس ہمیشہ سے نبیوں کا قبلہ رہا ہے۔ پھر اس کی مخالفت کیوں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ساری تحریک یہود کی ضد میں چلائی جارہی ہے۔ کوئی کہتا کہ یہ مدعیٔ رسالت خود اپنے مشن کے بارے میں متحیر و متردد ہیں، کبھی کعبہ کی طرف رخ کرکے عبادت کرنے کو کہتے ہیں اور کبھی بیت المقدس کی طرف۔ کسی نے کہا: اگر کعبہ ہی اصل قبلہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے پہلے جو مسلمان بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے رہے ان کی نمازیں بے کار گئیں، وغیرہ۔ مگر جو سچے خدا پرست تھے، جو مظاہر میں اٹکے ہوئے نہیں تھے، ان کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اصل چیز قبلہ کی سمت نہیں، اصل چیز خدا کا حکم ہے۔ اللہ کی طرف سے جس وقت جو حکم آجائے وہی اس وقت کا قبلہ ہوگا۔ روایات میں آتا ہے کہ ہجرت کے تقریباً سترہ ماہ بعد جب قبلہ کی تبدیلی کا حکم آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کی ایک جماعت کے ساتھ مدینہ میں نماز ادا کررہے تھے۔ حکم معلوم ہوتے ہی آپ نے اور مسلمانوں نے عین حالت نماز میں اپنا رخ بیت المقدس سے کعبہ کی طرف کرلیا۔ یعنی شمال سے جنوب کی طرف۔

قبلہ کی تبدیلی ایک علامت تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو امامت سے معزول کرکے امتِ محمدی کو اس کی جگہ مقرر کردیا ہے۔ اب قیامت تک بیت المقدس کے بجائے کعبہ خدا کے دین کی دعوت اور خدا پرستوں کے باہمی اتحاد کا عالمی مرکز ہوگا۔ "وسط" کے معنی بیچ کے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اللہ کے پیغام کو اس کے بندوں تک پہنچانے کے لئے درمیانی وسیلہ ہیں۔ اللہ کا پیغام رسول کے ذریعہ ان کو پہنچا ہے۔ اب اس پیغام کو انھیں قیامت تک تمام قوموں کو پہنچاتے رہنا ہے، اسی پر دنیا میں بھی ان کے مستقبل کا انحصار ہے اور اسی پر آخرت کا بھی۔

ہم تمھارے منھ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا دیکھ رہے ہیں۔ پس ہم تم کو اسی قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جس کو تم پسند کرتے ہو، اب اپنا رخ مسجد حرام کی طرف پھیر دو۔ اور تم جہاں کہیں بھی ہو، اپنے رُخ کو اسی کی طرف کرو۔ اور اہلِ کتاب خوب جانتے ہیں کہ یہ حق ہے اور ان کے رب کی جانب سے ہے۔ اور اللہ بے خبر نہیں اس سے جو وہ کر رہے ہیں اور اگر تم ان اہلِ کتاب کے سامنے تمام دلیلیں پیش کر دو تب بھی وہ تمھارے قبلہ کو نہ مانیں گے اور نہ تم ان کے قبلہ کی پیروی کر سکتے ہو۔ اور نہ وہ خود ایک دوسرے کے قبلہ کو مانتے ہیں۔ اور اس علم کے بعد جو تمھارے پاس آچکا ہے، اگر تم ان کی خواہشوں کی پیروی کروگے تو یقیناً تم ظالموں میں ہو جاؤگے جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ اور ان میں سے ایک گروہ حق کو چھپا رہا ہے حالاں کہ وہ اس کو جانتا ہے۔ حق وہ ہے جو تیرا رب کہے۔ پس تم ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ بنو۔

۱۴۴ — ۱۴۷

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یہ تھی کہ جن امور میں ابھی وحی نہ آئی ہو ان میں آپ پچھلے انبیاء کے طریقہ کی پیروی کرتے تھے۔ اسی بنا پر آپ نے ابتداءً بیت المقدس کو قبلہ بنا لیا تھا جو حضرت سلیمانؑ کے زمانہ سے بنی اسرائیل کے پیغمبروں کا قبلہ رہا ہے۔ یہود کو جب اللہ تعالیٰ نے دین کی امامت و پیشوائی سے معزول کیا تو اس کے بعد یہ بھی ضروری ہو گیا کہ دین کو یہود کی روایات سے جدا کر دیا جائے تاکہ خدا کا دین ہر اعتبار سے اپنی خالص شکل میں نمایاں ہو سکے۔ اسی مصلحت کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تبدیلیٔ قبلہ کے حکم کا انتظار رہتا تھا۔ چنانچہ ہجرت کے دوسرے سال یہ حکم آگیا۔ یہود کے انبیاء جو یہود کو خبردار کرنے کے لئے آئے، وہ پہلے ہی اس فیصلۂ الٰہی کی بابت یہود کو بتا چکے تھے اور ان کے علماء اس معاملہ کو اچھی طرح جانتے تھے۔ تاہم ان میں صرف چند لوگ (جیسے عبد اللہ بن سلام اور مخیریق رضی اللہ عنہما) ایسے نکلے جنھوں نے آپ کی تصدیق کی اور اس بات کا اقرار کیا کہ آپ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اپنے سچے دین کا اظہار فرمایا ہے۔ یہود کے نہ ماننے کی وجہ محض ان کی خواہش پرستی تھی۔ وہ جن گروہی خوش خیالیوں میں جی رہے تھے، ان سے وہ نکلنا نہیں چاہتے تھے۔ اور جو انکار محض خواہش پرستی کی بنا پر پیدا ہوا اس کو توڑنے میں کبھی کوئی دلیل کامیاب نہیں ہوتی۔ ایسا آدمی دلائل کے انکار سے اپنے لئے وہ رزق حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے خالق نے صرف دلائل کے اعتراف میں رکھا ہے۔

اللہ کی طرف سے جب کسی امرِ حق کا اعلان ہوتا ہے تو وہ ایسے قطعی دلائل کے ساتھ ہوتا ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ اس کی صداقت کو پہچاننے سے عاجز نہ رہے۔ ایسی حالت میں جو لوگ شبہ میں پڑیں وہ صرف یہ ثابت کر رہے ہیں کہ وہ خدا سے آشنا نہ تھے اس لئے وہ خدا کی بولی کو پہچان نہ سکے۔ اسی طرح وہ لوگ جو حق کے خلاف کچھ الفاظ بول کر سمجھتے ہیں کہ انھوں نے حق کا اعتراف نہ کرنے کے لئے مضبوط استدلالی سہارے دریافت کر لئے ہیں، بہت جلد ان کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ محض فرضی سہارے تھے جو ان کے نفس نے اپنی جھوٹی تسکین کے لئے وضع کر لئے تھے۔

ہر ایک کے لئے ایک رخ ہے جدھر وہ منھ کرتا ہے۔ پس تم بھلائیوں کی طرف دوڑو۔ تم جہاں کہیں ہوگے اللہ تم سب کو لے آئے گا۔ بے شک اللہ سب کچھ کرسکتا ہے۔ اور تم جہاں سے بھی نکلو اپنا رخ مسجد حرام کی طرف کرو۔ بے شک یہ حق ہے، تمھارے رب کی طرف سے ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں۔ اور تم جہاں سے بھی نکلو اپنا رخ مسجد حرام کی طرف کرو اور تم جہاں بھی ہو اپنے رخ اسی کی طرف رکھو تاکہ لوگوں کو تمھارے اوپر کوئی حجت باقی نہ رہے، سوا ان لوگوں کے جو ان میں بے انصاف ہیں۔ پس تم ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو۔ اور تاکہ میں اپنی نعمت تمھارے اوپر پوری کردوں۔ اور تاکہ تم راہ پاجاؤ۔ جس طرح ہم نے تمھارے درمیان ایک رسول تم ہی میں سے بھیجا جو تم کو ہماری آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور تم کو پاک کرتا ہے اور تم کو کتاب کی اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اور تم کو وہ چیزیں سکھا رہا ہے جن کو تم نہیں جانتے تھے۔ پس تم مجھ کو یاد رکھو میں تم کو یاد رکھوں گا۔ اور میرا احسان مانو، میری ناشکری مت کرو ۱۴۸ - ۱۵۲

کعبہ کو قبلہ مقرر کیا گیا تو یہودیوں اور عیسائیوں نے اس قسم کی بحثیں چھیڑ دیں کہ مغرب کی سمت خدا کی سمت ہے یا مشرق کی سمت۔ وہ اس مسئلہ کو بس رخ بندی کے مسئلہ کی حیثیت سے دیکھ رہے تھے۔ مگر یہ ان کی ناسمجھی تھی۔ کعبہ کو قبلہ مقرر کرنے کا معاملہ سادہ طور پر ایک عبادتی رخ مقرر کرنے کا معاملہ نہیں تھا بلکہ یہ ایک علامت تھی کہ اللہ کے بندوں کے لئے اس سب سے بڑے خیر کے اترنے کا وقت آگیا ہے جس کا فیصلہ بہت پہلے کیا جاچکا تھا۔ یہ ابراہیم و اسماعیل (علیہما السلام) کی دعا کے مطابق نبی آخر الزماں ﷺ کا ظہور ہے۔ اب وہ آنے والا آگیا ہے جو انسان کے اوپر اللہ کی ابدی ہدایت کا دروازہ کھولے اور اس کی نعمت ہدایت کو آخری حد تک کامل کردے —— جو دین اللہ کی طرف سے بار بار بھیجا جاتا رہا مگر انسانوں کی غفلت و سرکشی سے ضائع ہوتا رہا، اس کو اس کی پوری صورت میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کردے۔ خدا کا دین جو اب تک محض روایتی افسانہ بنا ہوا تھا اس کو ایک حقیقی واقعہ کی حیثیت سے انسانی تاریخ میں شامل کردے۔ وہ دین جس کا کوئی مستقل نمونہ قائم نہیں ہوسکا تھا اس کو ایک زندہ عملی نمونہ کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے رکھ دے۔ یہ ہدایت الٰہی کی تکمیل کا معاملہ ہے نہ کہ مختلف سمتوں میں سے کوئی زیادہ "مقدس سمت" مقرر کرنے کا۔

کعبہ کی تعمیر کے وقت ہی یہ مقدر ہوچکا تھا کہ آخری رسول کے ذریعہ جس دین کا ظہور ہوگا اس کا مرکز کعبہ ہوگا پچھلے انبیاء لوگوں کو مسلسل اس کی خبر دیتے رہے۔ اس طرح اللہ کی طرف سے کعبہ کو تمام قوموں کے لئے قبلہ مقرر کرنا گویا نبی آخر الزماں کی حیثیت کو ثابت شدہ بنانا تھا۔ اب جو سنجیدہ لوگ ہیں ان کے لئے اللہ کا یہ اعلان آخری حجت ہے۔ اور جو لوگ آخرت سے بے خوف ہیں ان کی زبان کو کوئی بھی چیز روکنے والی ثابت نہیں ہوسکتی۔ جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں وہی ہدایت کا راستہ پاتے ہیں۔ اللہ کو یاد رکھنا ہی کسی کو اس کا مستحق بناتا ہے کہ اللہ اس کو یاد رکھے۔ اللہ سے خوف رکھنا ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ اللہ اس کو دوسری تمام چیزوں سے بے خوف کردے۔

اے ایمان والو، صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو۔ یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں ان کو مردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں مگر تم کو خبر نہیں۔ اور ہم ضرور تم کو آزمائیں گے کچھ ڈر اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے۔ اور ثابت قدم رہنے والوں کو خوش خبری دے دو جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں: ہم اللہ کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے اوپر ان کے رب کی شاباشیاں ہیں اور رحمت ہے۔ اور یہی لوگ ہیں جو راہ پر ہیں ۱۵۷-۱۵۳

دین یہ ہے کہ آدمی اپنے خالق کو اس طرح پالے کہ اس کی یاد میں اور اس کی شکر گزاری میں اس کے صبح و شام بسر ہونے لگیں۔ اس قسم کی زندگی ہی تمام خوشیوں اور لذتوں کا خزانہ ہے۔ مگر یہ خوشیاں اور لذتیں اپنی حقیقی صورت میں آدمی کو صرف آخرت میں ملیں گی۔ موجودہ دنیا کو اللہ تعالیٰ نے انعام کے لئے نہیں بنایا بلکہ امتحان کے لئے بنایا ہے، یہاں ایسے حالات رکھے گئے ہیں کہ خدا پرستی کی راہ میں آدمی کے لئے رکاوٹیں پڑیں تاکہ معلوم ہو کہ کون اپنے اظہار ایمان میں سنجیدہ ہے اور کون سنجیدہ نہیں ——— نفس کے محرکات، بیوی بچوں کے تقاضے، دنیا کی مصلحتیں، شیطان کے وسوسے، سماجی حالات کا دباؤ، یہ چیزیں فتنہ کی صورت میں آدمی کو گھیرے رہتی ہیں۔ آدمی کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ ان فتنوں کو پہچانے اور ان سے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے ذکر و شکر کے تقاضے پورا کرے۔

ان امتحانی مشکلات کے مقابلہ میں کامیابی کا واحد ذریعہ نماز اور صبر ہے۔ یعنی اللہ سے لپٹنا اور ہر قسم کی ناخوش گواریوں کو برداشت کرتے ہوئے بالارادہ حق کے راستہ پر جمے رہنا۔ جو لوگ ناموافق حالات سامنے آنے کے باوجود نہ بدکیں اور بظاہر غیر اللہ میں نفع دیکھتے ہوئے اللہ کے ساتھ اپنے کو باندھے رہیں وہی وہ لوگ ہیں جو سنتِ الٰہی کے مطابق کامیابی کی منزل تک پہنچیں گے۔

حق کی راہ میں مشکلات و مصائب کا دوسرا سبب مومن کا تبلیغی کردار ہے۔ تبلیغ و دعوت کا کام نصیحت اور تنقید کا کام ہے۔ اور نصیحت اور تنقید ہمیشہ آدمی کے لئے سب سے زیادہ مبغوض چیز رہی ہے، ان میں بھی نصیحت سننے کے لئے سب سے زیادہ حساس وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے دنیا کے کاروبار کو دین کے نام پر کر رہے ہوں۔ داعی کی دعوات اور اس کے پیغام میں ایسے تمام لوگوں کو اپنی حیثیت کی نفی نظر آنے لگتی ہے۔ داعی کا وجود ایک ایسی ترازو بن جاتا ہے جس پر ہر آدمی تل رہا ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ داعی بھڑ کے چھتہ میں ہاتھ ڈالنے کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ ایسا آدمی اپنے ماحول کے اندر بے جگہ کر دیا جاتا ہے۔ اس کی معاشیات برباد ہو جاتی ہیں۔ اس کی ترقیوں کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس کی جان تک خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ مگر وہی آدمی راہ پر ہے جس کو بے راہ بتا کر ستایا جائے۔ وہی پاتا ہے جو اللہ کی راہ میں کھوئے۔ وہی جی رہا ہے جو اللہ کی راہ میں اپنی جان دے دے۔ آخرت کی جنت اسی کے لئے ہے جو اللہ کی خاطر دنیا کی جنت سے محروم ہو گیا ہو۔

صفا اور مروہ بے شک اللہ کی یادگاروں میں سے ہیں۔ پس جو شخص بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی حرج نہیں کہ وہ ان کا طواف کرے اور جو کوئی شوق سے کچھ نیکی کرے تو اللہ قدرداں ہے، جاننے والا ہے۔ جو لوگ چھپاتے ہیں ہماری اتاری ہوئی کھلی نشانیوں کو اور ہماری ہدایت کو، بعد اس کے کہ ہم اس کو لوگوں کے لئے کتاب میں کھول چکے ہیں تو وہی لوگ ہیں جن پر اللہ لعنت کرتا ہے اور ان پر لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں۔ البتہ جنھوں نے توبہ کی اور اصلاح کرلی اور بیان کیا تو ان کو میں معاف کردوں گا اور میں ہوں معاف کرنے والا مہربان۔ بے شک جن لوگوں نے انکار کیا اور اسی حال میں مرگئے تو وہی لوگ ہیں کہ ان پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور آدمیوں کی سب کی لعنت ہے۔ اسی حال میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ ان پر سے عذاب ہلکا نہ کیا جائے گا اور نہ ان کو ڈھیل دی جائے گی ۱۶۲ - ۱۵۸

حضرت ابراہیمؑ کا وطن عراق تھا۔ اللہ کے حکم سے وہ اپنی بیوی ہاجرہ اور چھوٹے بچے اسماعیل کو لاکر اس مقام پر چھوڑ گئے جہاں آج مکہ ہے۔ اس وقت یہاں نہ کوئی آبادی تھی اور نہ پانی۔ پیاس کا تقاضا ہوا تو ہاجرہ پانی کی تلاش میں نکلیں۔ پریشانی کے عالم میں وہ صفا اور مروہ نامی پہاڑیوں کے درمیان دوڑتی رہیں۔ سات چکر لگانے کے بعد ناکام لوٹیں تو دیکھا کہ ان کی قیام گاہ کے پاس ایک چشمہ پھوٹ نکلا ہے۔ یہ چشمہ بعد کو زمزم کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ ایک علامتی واقعہ ہے جو بتاتا ہے کہ اللہ کا معاملہ اپنے بندوں سے کیا ہے۔ اللہ کا کوئی بندہ اگر اللہ کی راہ میں بڑھتے ہوئے اس حد تک چلا جائے کہ اس کے قدموں کے نیچے ریگستان اور بیابان کے سوا کچھ نہ رہے تو اللہ اپنی قدرت سے ریگستان میں اس کے لئے رزق کے چشمے جاری کردے گا ——— حج اور عمرہ میں صفا و مروہ کے درمیان سعی کا مقصد اسی تاریخ کی یاد کو تازہ کرنا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور تعلیمات میں اللہ کی نشانیاں اتنی واضح تھیں کہ یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ آپ کی زبان پر اللہ کا کلام جاری ہوا ہے۔ مگر یہودی علماء نے آپ کا اقرار نہیں کیا۔ ان کو اندیشہ تھا کہ اگر وہ پیغمبر عربی کو مان لیں تو ان کی مذہبی بڑائی ختم ہوجائے گی۔ ان کی جمی ہوئی تجارتیں اجڑ جائیں گی۔ اپنی کامیابی کا راز انھوں نے حق کو چھپانے میں سمجھا، حالاں کہ ان کی کامیابی کا راز حق کے اعلان میں تھا۔ حق کی طرف بڑھنے میں وہ اپنے آپ کو بے زمین ہوتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ مگر وہ بھول گئے کہ یہی وہ چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ مطلوب ہے۔ جو بندہ حق کی خاطر بے زمین ہوجائے وہ سب سے بڑی زمین کو پالیتا ہے، یعنی اللہ رب العالمین کی نصرت کو۔

تاہم اللہ کی رحمت کا دروازہ آدمی کے لئے ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ ابتدائی طور پر غلطی کرنے کے بعد اگر آدمی کو ہوش آجائے اور وہ پلٹ کر صحیح رویہ اختیار کرلے۔ وہ اس امر حق کا اعلان کرے جس کو اللہ چاہتا ہے کہ اس کا اعلان کیا جائے تو اللہ اس کو معاف کردے گا۔ مگر جو لوگ عدم اعتراف پر قائم رہیں اور اسی حال میں مرجائیں تو وہ اللہ کی رحمتوں سے دور کردئے جائیں گے۔

اور تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ بڑا مہربان ہے، نہایت رحم والا ہے۔ بے شک آسمانوں اور زمین کی بناوٹ میں اور رات اور دن کے آنے جانے میں اور ان کشتیوں میں جو انسانوں کے کام آنے والی چیزیں لے کر سمندر میں چلتی ہیں اور اس پانی میں جس کو اللہ نے آسمان سے اتارا۔ پھر اس سے مردہ زمین کو زندگی بخشی۔ اور اس نے زمین میں سب قسم کے جانور پھیلا دئے۔ اور ہواؤں کی گردش میں اور بادلوں میں جو آسمان و زمین کے درمیان حکم کے تابع ہیں، ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں ۱۶۴–۱۶۳

انسان کا خدا ایک ہی خدا ہے اور وہی اس قابل ہے کہ وہ انسان کی توجہات کا مرکز بنے۔ ہمارا وجود اور وہ سب کچھ جو ہم کو زمین پر حاصل ہے وہ اسی لئے ہے کہ ہمارا یہ خدا رحمتوں اور مہربانیوں کا خزانہ ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ اس کو حقیقی معنوں میں اپنا معبود بنائے۔ وہ اسی کے لئے جئے اور اسی کے لئے مرے اور اپنی تمام امیدوں اور تمناؤں کو ہمیشہ کے لئے اسی کے ساتھ وابستہ کر دے۔ جس طرح ایک چھوٹا بچہ اپنا سب کچھ صرف اپنی ماں کو سمجھتا ہے اسی طرح خدا انسان کے لئے اس کا سب کچھ بن جائے۔

ہمارے سامنے پھیلی ہوئی کائنات اللہ کا ایک عظیم الشان تعارف ہے۔ زمین و آسمان کی صورت میں ایک اتھاہ کارخانہ کا موجود ہونا ظاہر کرتا ہے کہ ضرور اس کا کوئی بنانے والا ہے۔ طرح طرح کے ظاہری اختلاف اور تضاد کے باوجود تمام چیزوں کا حد درجہ ہم آہنگی کے ساتھ کام کرنا ثابت کرتا ہے کہ اس کا خالق و مالک صرف ایک ہے۔ کائنات کی چیزوں میں نفع بخشی کی صلاحیت ہونا گویا اس بات کا اعلان ہے کہ اس کی منصوبہ بندی کامل شعور کے تحت بالارادہ کی گئی ہے۔ بظاہر بے جان چیزوں میں قدرتی عمل سے جان اور تازگی کا آجانا بتاتا ہے کہ کائنات میں موت محض عارضی ہے، یہاں ہر موت کے بعد لازماً دوسری زندگی آتی ہے۔ ایک ہی پانی اور ایک ہی خوراک سے قسم قسم کے جان داروں کا ان گنت تعداد میں پایا جانا اللہ کی بے حساب قدرت کا پتہ دیتا ہے۔ ہوا کا مکمل طور پر انسان کو اپنے گھیرے میں لئے رہنا بتاتا ہے کہ انسان پوری طرح اپنے خالق کے قبضہ میں ہے۔ کائنات کی تمام چیزوں کا انسانی ضرورت کے مطابق سدھا ہوا ہونا ثابت کرتا ہے کہ انسان کا خالق ایک بے حد مہربان ہستی ہے، وہ اس کی ضروریات کا اہتمام اس وقت سے کر رہا ہوتا ہے جب کہ اس کا وجود بھی نہیں ہوتا۔

کائنات میں اس قسم کی نشانیاں گویا مخلوقات کے اندر خالق کی جھلکیاں ہیں۔ وہ اللہ کی ہستی کا، اس کے ایک ہونے کا، اس کے تمام صفاتِ کمال کا جامع ہونے کا اتنے بڑے پیمانہ پر اظہار کر رہی ہیں کہ کوئی آنکھ والا اس کو دیکھنے سے محروم نہ رہے اور کوئی عقل والا اس کو پانے سے عاجز نہ ہو —— دلائل کو وہی شخص پاتا ہے جو دلائل پر غور کرتا ہو۔ وہ سچائی کو جاننے کے معاملہ میں سنجیدہ ہو۔ وہ مصلحتوں سے اوپر اٹھ کر رائے قائم کرتا ہو۔ وہ ظاہری چیزوں میں الجھ کر نہ رہ گیا ہو بلکہ ظاہری چیزوں کے پیچھے چھپی ہوئی باطنی حقیقت کو جاننے کا حریص ہو۔

کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا برابر ٹھہراتے ہیں۔ ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی
ت اللہ سے رکھنا چاہئے۔ اور جو ایمان والے ہیں وہ سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھنے والے ہیں۔ اور اگر
ظالم اس وقت کو دیکھ لیں جب کہ وہ عذاب کو دیکھیں گے کہ زور سارا کا سارا اللہ کا ہے اور اللہ بڑا سخت
اب دینے والا ہے۔ جب کہ وہ لوگ جن کے کہنے پر دوسرے چلتے تھے ان لوگوں سے الگ ہو جائیں گے جو ان کے
ے پر چلتے تھے۔ عذاب ان کے سامنے ہوگا اور ان کے سب طرف کے رشتے ٹوٹ چکے ہوں گے۔ وہ لوگ جو پیچھے چلے
کہیں گے کاش ہم کو دنیا کی طرف لوٹنا مل جاتا تو ہم بھی ان سے الگ ہو جاتے جیسے یہ ہم سے الگ ہو گئے۔ اس
ح اللہ ان کے اعمال کو انھیں حسرت بنا کر دکھائے گا اور وہ آگ سے نکل نہ سکیں گے ۱۶۷-۱۶۵

آدمی اپنی فطرت اور اپنے حالات کے لحاظ سے ایک ایسی مخلوق ہے جو ہمیشہ ایک خارجی سہارا چاہتا ہے،
ے ایسی ہستی جو اس کی کمیوں کی تلافی کرے اور اس کے لئے اعتماد و یقین کی بنیاد ہو۔ کسی کو اس حیثیت سے اپنی
دگی میں شامل کرنا اس کو اپنا معبود بنانا ہے۔ جب آدمی کسی ہستی کو اپنا معبود بناتا ہے تو اس کے بعد لازمی طور
ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کے محبت و عقیدت کے جذبات اس کے لئے خاص ہو جاتے ہیں۔ آدمی عین اپنی فطرت
لحاظ سے مجبور ہے کہ کسی سے حُبِّ شدید کرے، اور جس سے کوئی حب شدید کرے وہی اس کا معبود ہے۔ موجودہ
یا میں چوں کہ خدا نظر نہیں آتا اس لئے ظاہر پرست انسان عام طور پر نظر آنے والی ہستیوں میں سے کسی ہستی کو وہ
نام دے دیتا ہے جو در اصل خدا کو دینا چاہئے۔ یہ ہستیاں اکثر وہ سردار یا پیشوا ہوتے ہیں جو کسی ظاہری خصوصیت
بنا پر لوگوں کا مرجع بن جاتے ہیں۔ آدمی کی فطرت کا خلا جو حقیقۃً اس لئے تھا کہ اس کو رب العالمین سے پُر
ا جائے وہاں وہ کسی سردار یا پیشوا کو بٹھا لیتا ہے۔

ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ کسی انسان کے گرد کچھ ظاہری رونق دیکھ کر لوگ اس کو "بڑا" سمجھ لیتے ہیں۔ کوئی
نے غیر معمولی شخصی اوصاف سے لوگوں کو متاثر کر لیتا ہے۔ کوئی کسی گدی پر بیٹھ کر سیکڑوں سال کی روایات کا
رث بن جاتا ہے۔ کسی کے یہاں انسانوں کی بھیڑ دیکھ کر لوگوں کو غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ وہ عام انسانوں سے بلند تر
ئی انسان ہے۔ کسی کے گرد پُر اسرار کہانیوں کا ہالہ تیار ہو جاتا ہے اور سمجھ لیا جاتا ہے کہ وہ غیر معمولی قوتوں کا
امل ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ خدا کی اس کائنات میں خدا کے سوا کسی کو کوئی زور یا بڑائی حاصل نہیں۔
نسان کو خدا کا درجہ دینے کا کاروبار اسی وقت تک ہے، جب تک خدا ظاہر نہیں ہوتا۔ خدا کے ظاہر ہوتے ہی
ورت حال اس قدر بدل جائے گی کہ بڑے اپنے چھوٹوں سے بھاگنا چاہیں گے اور چھوٹے اپنے بڑوں سے۔ وہ
ستی جس پر آدمی دنیا میں فخر کرتا تھا، جس سے وفاداری اور شیفتگی دکھا کر آدمی سمجھتا تھا کہ اس نے سب
سے بڑی چٹان کو پکڑ رکھا ہے وہ آخرت کے دن اس طرح بے معنی ثابت ہوگی جیسے اس کی کوئی حقیقت ہی نہ ہو۔
دمی اپنی گزری ہوئی زندگی کو حسرت کے ساتھ دیکھے گا اور کچھ نہ کر سکے گا۔

لوگو! زمین کی چیزوں میں سے حلال اور ستھری چیزیں کھاؤ اور شیطان کے قدموں پر مت چلو، بے شک وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ وہ تم کو صرف برے کام اور بے حیائی کی تلقین کرتا ہے اور اس بات کی کہ تم اللہ کی طرف وہ باتیں منسوب کرو جن کے بارے میں تم کو کوئی علم نہیں۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس پر چلو جو اللہ نے اتارا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا اس صورت میں بھی کہ ان کے باپ دادا نہ عقل رکھتے ہوں اور نہ سیدھی راہ جانتے ہوں۔ اور ان منکروں کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص ایسے جانور کے پیچھے چلا رہا ہو جو بلانے اور پکارنے کے سوا اور کچھ نہیں سنتا۔ یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں۔ وہ کچھ نہیں سمجھتے ۱۷۱ — ۱۶۸

شرک کیا ہے، جذباتِ عبودیت کی تسکین کے لئے خدا کے سوا کوئی دوسرا مرکز بنالینا۔ خدا انسان کی سب سے بڑی اور لازمی ضرورت ہے۔ خدا کی طلب انسانی فطرت میں اس طرح بسی ہوئی ہے کہ کوئی شخص خدا کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ انسان کی گم راہی خدا کو چھوڑنا نہیں ہے بلکہ اصلی خدا کی جگہ کسی فرضی خدا کو اپنا خدا بنالینا ہے۔ اس لئے شریعت میں ہر اس چیز کو حرام قرار دیا گیا ہے جو کسی بھی درجہ میں آدمی کی فطری طلب کو اللہ کے سوا کسی اور طرف موڑ دینے والی ہو۔

بت پرست قومیں بتوں کے نام پر جانور چھوڑتی ہیں اور ان جانوروں کو کھانا یا ان سے نفع اٹھانا حرام سمجھتی ہیں۔ جدید تہذیب میں بھی یہ رسم "قومی پرند" اور "قومی جانور" جیسی صورتوں میں رائج ہے۔ اس طرح کسی چیز کو اپنے لئے حرام کر لینا محض ایک سادہ قانونی معاملہ نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کے ساتھ شرک کرنا ہے۔ کیوں کہ جب ایک چیز کو اس طرح حرام ٹھہرایا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ کسی خود ساختہ عقیدہ کی وجہ سے اس کو مقدس سمجھ لیا جاتا ہے۔ یہ خدا کے حقوق میں غیر خدا کو ساجھی بنانا ہے، یہ احترام و تقدس کے ان فطری جذبات کو تقسیم کرنا ہے جو صرف خدا کے لئے ہیں اور جن کو صرف خدا ہی کے لئے ہونا چاہئے۔ شیطان اس قسم کے رواج اس لئے ڈالتا ہے تاکہ آدمی کے اندر چھپے ہوئے استعجاب و تقدس کے جذبات کو مختلف سمتوں میں بانٹ کر اللہ کے ساتھ اس کے تعلق کو کمزور کر دے۔

ایک بار جب کسی غیر اللہ کو مقدس مان لیا جائے تو انسان کی توہم پرستی اس میں نئی نئی برائیاں پیدا کرتی رہتی ہے۔ ایک "جانور" کو ان پُر اسرار اوصاف کا حامل گمان کر لیا جاتا ہے جو صرف خدا کے لئے خاص ہیں۔ اس کو خدا کی قربت حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھ لیا جاتا ہے۔ اس سے برکت اور کار برآری کی امید کی جاتی ہے۔ یہ چیز جب اگلی نسلوں تک پہنچتی ہے تو وہ اس کو آبا و اجداد کی مقدس سنت سمجھ کر اس طرح پکڑ لیتی ہیں کہ اب اس پر کسی قسم کا غور و فکر ممکن نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ وہ وقت آتا ہے جب کہ لوگ دلیل کی زبان سمجھنے سے اتنا زیادہ عاری ہو جاتے ہیں گویا کہ ان کے پاس نہ آنکھ اور کان ہیں جن سے وہ دیکھیں اور سنیں اور نہ ان کے پاس دماغ ہے جس سے وہ کسی بات کو سمجھیں۔

اے ایمان والو ہماری دی ہوئی پاک چیزوں کو کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو اگر تم اس کی عبادت کرنے والے ہو۔ اللہ نے تم پر حرام کیا ہے صرف مردار کو اور خون کو اور سور کے گوشت کو۔ اور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو۔ پھر جو شخص مجبور ہو جائے، وہ نہ خواہش مند ہو اور نہ حد سے آگے بڑھنے والا ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ بے شک اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔ جو لوگ اس چیز کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے اپنی کتاب میں اتاری ہے اور اس کے بدلے میں تھوڑا مول لیتے ہیں، وہ اپنے پیٹ میں صرف آگ بھر رہے ہیں۔ قیامت کے دن اللہ نہ ان سے ہم کلام ہوگا اور نہ ان کو پاک کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی کا سودا کیا اور بخشش کے بدلے عذاب کا، تو کیسی سہار ہے ان کو آگ کی۔ یہ اس لئے کہ اللہ نے اپنی کتاب کو ٹھیک ٹھیک اتارا مگر جن لوگوں نے کتاب میں کئی راہیں نکال لیں وہ ضد میں دور جا پڑے ۱۷۲-۱۷۶

کھانے پینے کی چیزوں کو استعمال کرتے ہوئے جو احساسات آدمی کے اندر ابھرنے چاہئیں وہ شکر اور اطاعت الٰہی کے احساسات ہیں۔ یعنی یہ کہ "ہم اللہ کی دی ہوئی چیز کو اللہ کے حکم کے مطابق کھا رہے ہیں"۔ یہ احساس آدمی کے اندر خدا پرستی کا جذبہ ابھارتا ہے۔ مگر خود ساختہ طور پر جو عقیدے بنائے جاتے ہیں اس میں یہ نفسیات بدل جاتی ہیں۔ اب انسان کی توجہ چیزوں کے مفروضہ خواص کی طرف لگ جاتی ہے۔ جن چیزوں کو پا کر اللہ کے شکر کا جذبہ ابھرتا ان سے خود ان چیزوں کے احترام و تقدس کا جذبہ ابھرتا ہے۔ آدمی مخلوق کو خالق کا درجہ دے دیتا ہے۔ کسی چیز کے حرام ہونے کی بنیاد اس کا مفروضہ تقدس یا اس کے بارے میں توہماتی عقائد نہیں ہیں۔ بلکہ اس کے اسباب بالکل دوسرے ہیں۔ یہ کہ وہ چیزیں ناپاک ہوں اور شریعت نے ان کی ناپاکی کی تصدیق کی ہو۔ جیسے مردار، خون، سور، یا خدا کے پیدا کئے ہوئے جانور کو خدا کے سوا کسی اور نام پر ذبح کرنا، وغیرہ۔ اضطرار کی حالت میں آدمی حرام کو کھا سکتا ہے۔ جبکہ بھوک یا بیماری یا حالات کا کوئی دباؤ آدمی کو اس کے استعمال پر مجبور کر دے۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ آدمی حرام چیز کو رغبت سے نہ کھائے اور نہ اس کو واقعی ضرورت سے زیادہ لے۔

اس قسم کے توہماتی عقائد جب عوامی مذہب بن جائیں تو علماء کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ اس کے بارے میں اللہ کا حکم جانتے ہوئے بھی وہ اس کے اعلان سے ڈرنے لگتے ہیں۔ کیوں کہ ان کو اندیشہ ہوتا ہے کہ اس طرح وہ عوام سے کٹ جائیں گے جن کے درمیان مقبولیت حاصل کر کے وہ "بڑے" بنے ہوئے ہیں۔ گمراہ عوام سے مصالحت اگرچہ دنیا میں ان کو عزت اور دولت دے دیتی ہے مگر اللہ کی نظر میں ایسے لوگ بدترین مجرم ہیں۔ حق کو مصلحت کی خاطر چھپانا ان لغزشوں میں نہیں ہے جن سے آخرت میں اللہ درگزر فرمائے گا۔ یہ وہ جرائم ہیں جو آدمی کو اللہ کی نظر عنایت سے محروم کر دیتے ہیں۔ ان میں بھی زیادہ برے وہ لوگ ہیں جن کے سامنے حق پیش کیا جائے اور وہ اعتراف کرنے کے بجائے اس میں بے معنی بحثیں نکالنے لگیں۔ ایسے لوگوں کے اندر ضد کی نفسیات پیدا ہو جاتی ہیں اور بالآخر وہ حق سے اتنا دور ہو جاتے ہیں کہ کبھی اس کی طرف نہیں لوٹتے۔

نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے منہ پورب اور پچھم کی طرف کرلو۔ بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی ایمان لائے اللہ پر اور آخرت کے دن اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور پیغمبروں پر۔ اور مال دے اللہ کی محبت میں رشتہ داروں کو یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو اور مانگنے والوں کو اور گردنیں چھڑانے میں۔ اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرے اور جب عہد کرلیں تو اس کو پورا کریں۔ اور صبر کرنے والے سختی اور تکلیف میں اور لڑائی کے وقت یہی لوگ جو سچے نکلے اور یہی ہیں ڈر رکھنے والے ۱۷۷

یہود نے مغرب کو اپنا قبلۂ عبادت بنایا تھا اور نصاریٰ نے مشرق کو۔ دونوں اپنی اپنی سمت کو مقدس سمجھتے تھے۔ دونوں کو بھروسہ تھا کہ انھوں نے خدا کی مقدس سمت کو اپنا قبلہ بنا کر خدا کے یہاں اپنا درجہ محفوظ کرلیا ہے۔ خدا پرستی یہ نہیں ہے کہ آدمی کسی مقدس ستون "کو تھام لے۔ خدا پرستی یہ ہے کہ آدمی خود اللہ کے دامن کو پکڑنے۔ اس عمل کی اگرچہ ایک ظاہری صورت ہوتی ہے۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے وہ اس اللہ کو پالینا ہے جو زمین و آسمان کا نور ہے، جو آدمی کی شہ رگ سے زیادہ قریب ہے۔ اللہ کے یہاں جو چیز کسی کو مقبول بناتی ہے وہ کسی قسم کی ظاہری چیزیں نہیں ہیں بلکہ وہ عمل ہے جو آدمی اپنے پورے وجود کے ساتھ خالص اللہ کے لئے کرتا ہے۔ اللہ کا بندہ وہ ہے جو اللہ کو اس طرح پالے کہ اللہ اس کی پوری ہستی میں اتر جائے۔ وہ آدمی کے شعور میں شامل ہوجائے۔ وہ اس کی کمائیوں کا مالک بن جائے۔ وہ اس کی یاد دل میں سما جائے۔ وہ اس کے کردار پر چھا جائے۔ آدمی اپنے رب کو اس طرح پکڑلے کہ سخت ترین وقتوں میں بھی اس کی رسی اس کے ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ اللہ کا حق اس کی سچی وفاداری سے ادا ہوتا ہے نہ کہ محض اِدھر یا اُدھر رُخ کرلینے سے۔

اللہ پر ایمان لانا یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اپنا سب کچھ بنا لے۔ آخرت کے دن پر ایمان یہ ہے کہ آدمی دنیا کے بجائے آخرت کو زندگی کا اصل مسئلہ سمجھنے لگے۔ فرشتوں پر ایمان یہ ہے کہ وہ خدا کے ان کارندوں کو مانے جو اس کے حکم کے تحت دنیا کا انتظام چلا رہے ہیں۔ کتاب پر ایمان یہ ہے کہ آدمی یہ یقین کرے کہ اللہ نے انسان کے لئے اپنا ہدایت نامہ بھیجا ہے جس کی اُسے لازماً پابندی کرنی ہے۔ پیغمبروں پر ایمان یہ ہے کہ اللہ کے ان بندوں کو اللہ کا نمائندہ تسلیم کیا جائے جن کو اللہ نے اپنا پیغام پہنچانے کے لئے چنا۔ پھر یہ ایمانیات آدمی کے اندر اتنی گہری اتر جائیں کہ وہ اللہ کی محبت اور شوق میں اپنا مال ضرورت مندوں کو دے اور انسانوں کو مصیبت سے چھڑائے۔ نماز قائم کرنا اللہ کے آگے ہمہ تن جھک جانا ہے۔ زکوٰۃ ادا کرنا اپنے مال میں خدا کے مستقل حصہ کا اقرار کرنا ہے۔ ایسا بندہ جب کوئی عہد کرتا ہے تو اس کے بعد وہ اس سے پھرنا نہیں جانتا۔ کیوں کہ وہ ہر عہد کو خدا سے کیا ہوا عہد سمجھتا ہے۔ اس کو اللہ کے اوپر اتنا بھروسہ ہوجاتا ہے کہ تنگی اور مصیبت ہو یا جنگ کی نوبت آجائے، ہر حال میں وہ خدا پرستی کے راستے پر جما رہتا ہے۔ یہ اوصاف جس کے اندر پیدا ہوجائیں وہی سچا مومن ہے اور سچا مومن اللہ سے اندیشہ رکھنے والا ہوتا ہے نہ کہ کسی جھوٹے سہارے پر اعتماد کرکے اس سے نڈر ہوجانے والا۔

سیاسی اختلاف ہمیشہ شدت پیدا کرتا ہے۔ قدریہ اور جبریہ فرقوں میں جو شدت نظر آتی ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ یہ دونوں فرقے سیاسی اسباب کے تحت پیدا ہوئے۔ خلافت راشدہ کے آخری دور میں سیاسی اقتدار بنو ہاشم کے ہاتھ میں تھا۔ بنو امیہ نے ان سے اقتدار چھین لیا۔ بنو ہاشم کی طرف سے کسی متوقع بغاوت کو کچلنے کے لئے انھوں نے ان کے اوپر سخت مظالم کئے۔ یہی وقت ہے جب کہ جبر و اختیار کے نظریات مسلمانوں میں پیدا ہوئے۔ بنو امیہ نے اپنی سیاست کی نظریاتی توجیہ کے لئے جبر کا سہارا لیا۔ انھوں نے کہا کہ اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے خدا کے حکم کے تحت ہوتا ہے۔ اس لئے بنو امیہ کا بنو ہاشم سے خلافت چھیننا اور ان کے افراد پر سختیاں کرنا سب خدا کی مرضی کے مطابق ہے۔ جو ہونا تھا وہی ہو رہا ہے، اس میں کسی انسان کی مرضی کا کوئی دخل نہیں۔ اس کے جواب میں ان کو غلط ثابت کرنے کے لئے دوسرے گروہ نے کہا کہ انسان آزاد ہے اور خود اپنی مرضی سے اپنے لئے کوئی راہ منتخب کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ اس طرح نظریہ اختیار کا مطلب، اس وقت کی فضا میں یہ ہو گیا کہ بنو امیہ ظالم ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے جو کچھ کیا ہے اپنے ارادہ سے کیا ہے خدا کے حکم کا اس سے کوئی تعلق نہیں ——— کوئی بحث اگر خالص علمی مقصد کے تحت نہ ہو بلکہ اس کے پیچھے دوسرے مفادات و محرکات کام کر رہے ہوں تو دونوں فریقوں کی طرف سے شدت اور مبالغہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہی قدریہ اور جبریہ کے ساتھ ہوا۔ قدیم کتابوں میں ان مباحث پر جو شدت پائی جاتی ہے وہ اسی سیاسی پس منظر کا نتیجہ ہے۔

یہی معاملہ دوسرے عنوان کے ساتھ خوارج کا تھا جنھوں نے ایمان و عمل کے بارے میں انتہا پسندانہ اعتقادی مباحث پیدا کئے۔ خوارج نے بنو امیہ کے خلاف بغاوت کا فتویٰ دیا۔ چوں کہ اسلام میں مسلمانوں کی قائم شدہ حکومت کے خلاف جنگ کو ناجائز قرار دیا گیا ہے، انھیں اپنے اقدام کے لئے ایک نظریاتی جواز درکار تھا۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے ایمان و عمل کے مسئلہ کا سہارا لیا۔ انھوں نے ایمان کی ایسی تعریف پر اصرار کیا جس میں عمل بھی لازمی طور پر داخل ہو، صرف ایمان کسی کو مسلمان قرار دینے کے لئے کافی نہ ہو، تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ وقت کے حکمراں مسلمان نہیں ہیں اور ان کے خلاف خروج کرنا جائز ہے۔ اس کے مقابلہ میں دوسری جانب کے لوگوں نے جوابی شدت اختیار کی۔ انھوں نے اس پر زور دیا کہ صرف ایمان کسی کے مسلمان ہونے کے لئے کافی ہے، اس کے لئے عمل لازمی شرط نہیں ہے۔ پہلے نظریہ کی صورت میں وقت کے حکمرانوں کے خلاف بغاوت جائز قرار پاتی تھی، دوسرے نظریہ کی صورت میں ان کے خلاف بغاوت کرنا حرام تھا۔ یہی سیاسی پس منظر تھا جس کی وجہ سے ایمان و عمل کی بحث نے وہ شدت اختیار کی جو ہم کو قدیم کتابوں میں دکھائی دیتی ہے۔

سیاسی اسباب کے تحت جو نظریہ پیدا ہو اس میں شدت کا پیدا ہونا یقینی ہے۔ طلاق المکرہ لیس بشیٔ کا فتویٰ اور قرآن کو غیر مخلوق کہنا حکومت کی نظر میں اس لئے سنگین بن گئے کہ وقت کے حالات نے ان میں سیاسی پہلو پیدا کر دیا تھا۔

بدگمانی سے بچئے

باہمی تعلقات کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ لوگوں کے درمیان بدگمانیاں پھیلی ہوئی ہوں (حجرات ۱۲) دوسرے یہ کہ ان کے تعلقات حسن ظن پر قائم ہوں (نور ۱۲) دو آدمی کا معاملہ ہو یا ایک خاندان کا یا پورے سماج کا، ہر جگہ تعلقات کی یہی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ شکایتی موقع پر اپنے بھائی کے خلاف بری رائے قائم کر لینا اور اس کے خلاف کدورت لے کر بیٹھ جانا سوء ظن ہے اور اس کو منافقانہ تعلقات کہا گیا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جب شکایت کی کوئی بات سامنے آئے یا کسی کی کوئی بات بری معلوم ہو تو اس کی اچھی تاویل کی جائے اور اس کو دل میں رکھنے کے بجائے اس کو بھلا دیا جائے۔ یہ حسن ظن ہے اور اس بنیاد پر جو تعلقات قائم ہوتے ہیں انھیں کا نام مومنانہ تعلقات ہے۔

سوء ظن کی فضا عام طور پر ایسے معاشرہ میں پیدا ہوتی ہے جہاں مزاج یہ بن جائے کہ جو سنو اس کو مان لو۔ ایسے موقع پر بہترین طریقہ یہ ہے کہ دوسرے کی آبرو کو آدمی اپنی آبرو پر قیاس کرے "افک" کے قصہ میں آتا ہے کہ ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے ان کی بیوی نے کہا کہ لوگ عائشہ کی نسبت ایسا کہتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ کہنے والے جھوٹے ہیں۔ تم بتاؤ کیا تم ایسا کام کر سکتی ہو۔ خاتون نے کہا ہرگز نہیں۔ فرمایا: پھر عائشہ رضی تجھ سے بڑھ کر پاک وصاف اور طاہر و مطہر ہیں، ان کی نسبت بلا وجہ ایسا گمان کیوں کیا جائے۔

اسلامی زندگی

ایک اسلامی زندگی کا وجود میں آنا ایسا ہی ہے جیسے ایک درخت کا وجود میں آنا۔ ایک ہرا بھرا درخت زمین پر اس وقت کھڑا ہوتا ہے جب کہ اس نے اپنے آپ کو پوری طرح کائنات کے ہم آہنگ کر لیا ہو، جب وہ پوری کائنات کو اپنی غذا بنا چکا ہو۔

اسلامی زندگی نہ ملیاتی ورزشوں سے وجود میں آتی ہے اور نہ انقلابی نعروں سے۔ ایک بندہ اس وقت مومن و مسلم بنتا ہے جب کہ وہ تجلیات الٰہی کا جیسا بن جائے۔ خدا نے جس طرح مادی سطح پر درختوں کے لئے ایک عالمی دسترخوان پھیلا رکھا ہے۔ اسی طرح روحانی سطح پر انسانوں کے لئے ہر وقت اس کے فیضان کی بارش ہو رہی ہے۔ مادی کائنات سے اپنے آپ کو جوڑنے کے نتیجہ میں درخت وجود میں آتا ہے۔ اسی طرح الٰہی تجلیات کے سمندر میں نہانے سے وہ چیز وجود میں آتی ہے جس کو اسلامی زندگی کہتے ہیں۔ ایک درخت ہو یا ایک انسان دونوں ہی ایک وسیع تر نظام غذا سے اپنے کو جوڑ کر اپنی ہستی کو کمال کے مقام پر پہنچاتے ہیں ——— جو شخص آج اللہ کے رزق پر جی رہا ہے وہ آخرت میں نہایت شاداب اور تندرست حالت میں اٹھے گا۔ اور جو لوگ اللہ کے رزق سے محروم ہیں ان کا حال وہی ہوگا جو آج خراب غذاؤں پر پلنے والوں کا نظر آتا ہے۔ ... صورتوں کے ساتھ اٹھیں گے خواہ آج وہ کتنے ہی پُر رونق نظر آتے ہوں۔

 [redacted]

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ یک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت —— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔

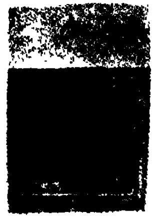
دوسری صورت —— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ساڑھے سات روپیہ ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ نوے روپے یا ماہانہ ساڑھے سات روپے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

عصری اسلوب



دین کیا ہے

صفحات ۳۲ قیمت ۱/۵۰



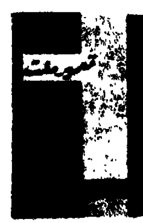
ظہورِ اسلام

صفحات ۲۰۰ قیمت ۱۲/-



تاریخ کا سبق

صفحات ۴۸ قیمت



تعمیرِ ملت

صفحات ۴۰ قیمت ۳/-



عقلیاتِ اسلام

صفحات ۴۸ قیمت ۳/-



الاسلام

صفحات ۱۶۹ قیمت

مکتبہ الرسالہ جمعیتہ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی۶

لامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں
کے قلم سے



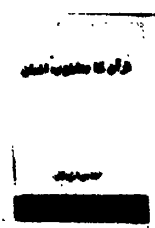
مذہب اور جدید چیلنج
صفحات ۲۲۴ قیمت ۱۲/۵۰



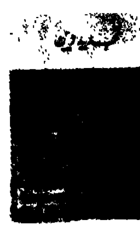
زلزلۂ قیامت
صفحات ۶۴ قیمت ۳/-



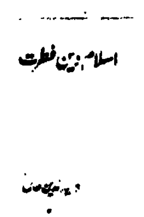
اسلامی دعوت
صفحات ۴۸ قیمت ۲/-



قرآن کا مطلوب انسان
صفحات ۸۰ قیمت ۴/۵۰



تجدید دین
صفحات ۴۸ قیمت ۲/-



اسلام دین فطرت
صفحات ۴۸ قیمت ۲/-

MAKTABA AL-RISALA, Jamiat Building, Qasimjan Street, Delhi-6

اہم اعلان

مولانا وحید الدین خاں کی کتابوں کے بعض عربی ترجمے (مطبوعہ قاہرہ) برائے فروخت مکتبہ الرسالہ میں موجود ہیں:

۱- الاسلام یتحدی	(ساتواں ایڈیشن)	۲۶۳	صفحات	قیمت	۲۰	روپے
۲- الدین فی مواجہۃ العلم	(چوتھا ایڈیشن)	۱۱۲	صفحات	〃	۱۰	روپے
۳- حکمۃ الدین	(دوسرا ایڈیشن)	۸۷	صفحات	〃	۸	روپے
۴- الاسلام والعصر الحدیث	(دوسرا ایڈیشن)	۷۷	صفحات	〃	۸	روپے
۵- مسئولیات الدعوۃ	(تیسرا ایڈیشن)	۳۹	صفحات	〃	۲	روپے
۶- نحو تدوین جدید للعلوم الاسلامیۃ		۲۶	صفحات	〃	۲	روپے
۷- امکانات جدیدۃ للدعوۃ		۳۴	صفحات	〃	۲	روپے
۸- الشریعۃ الاسلامیۃ وتحدیات العصر		۳۲	صفحات	〃	۲	روپے
۹- المسلمون بین الماضی والحال والمستقبل		۷۲	صفحات	〃	۵	روپے
۱۰- نحو بعث اسلامی		۳۲	صفحات	〃	۵۰	پیسے

REGD. R. N. NO. 28822/76
REGD. D. (D) NO. 532

November 1979
Issue No. 36

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET, DELHI 110006 INDIA PHONE 262331

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحیدالدین خاں

الرسالہ

دسمبر ۱۹۷۹ شمارہ ۳۷

جمعیۃ بلڈنگ ☐ قاسم جان اسٹریٹ ☐ دہلی 110006

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ اعلانِ آخرت کا مشن ہے

الرسالہ کا مقصد کیا ہے ——— یہ بتانا کہ اے لوگو! تم بہت جلد مرنے والے ہو۔ اس کے بعد دو انتہائی انجاموں میں سے کوئی ایک انجام تمھارے سامنے ہوگا: یا جنت یا جہنم۔ اس سنگین حقیقت کو سمجھ کر دنیا میں رہو، جو کچھ کر دیہ سمجھ کر کرو کہ تمھارا عمل تم کو یا تو آگ کی طرف لے جا رہا ہے یا باغوں والی زندگی کی طرف۔ الرسالہ کا ادارہ نہ اعلانِ برکت کے لئے قائم کیا گیا ہے اور نہ اعلانِ سیاست کے لئے۔ اس کا مقصد نہ اعلانِ ملت ہے اور نہ اعلانِ انسانیت۔ اس کو نہ اعلانِ شخصیت سے دل چسپی ہے اور نہ اعلانِ قومیت سے۔ الرسالہ کا مقصد صرف ایک ہے اور وہ آخرت کے آنے والے دن سے لوگوں کو باخبر کرنا ہے۔

آخرت کا اعلان وہ مقصد ہے جس کے لئے پیغمبر دنیا میں بھیجے گئے۔ الرسالہ کے ساتھ تعاون کرنا پیغمبرانہ مشن کے ساتھ تعاون کرنا ہے۔ الرسالہ کے ساتھ تعاون کیجئے۔ موجودہ زمانہ میں پیغمبرانہ مشن کو زندہ کیجئے۔

الرسالہ کے دفتر میں ٹیلی فون لگ گیا ہے۔ نمبر یہ ہے ۲۶۲۳۳۱

قربانی اسلام میں

روایات میں آتا ہے کہ صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: ماھذہ الاضاحی یارسول اللہ (اے خدا کے رسول یہ قربانیاں کیا ہیں) آپ نے جواب دیا: سنۃ ابیکم ابراھیم (یہ تمھارے باپ ابراہیم کا طریقہ ہے) گویا عید اضحیٰ میں جانور کو ذبح کرنا اس عظیم تاریخی واقعہ کی یاد تازہ کرنا ہے جو چار ہزار سال پہلے پیش آیا ۔ قربانی، حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کو اپنا آئیڈیل بنانے کا عزم ہے۔ یہ ایک وقتی قسم کی سالانہ رسم نہیں بلکہ مستقل زندگی کا ایک سالانہ مظاہرہ ہے۔ قربانی کی عبادت کو آدمی اگر اس کی اصلیت کے اعتبار سے سمجھ کر ادا کرے اسی وقت اس سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ سال بھر تک اس کے پیغام کو اپنی زندگی میں دہرائے گا۔ اور اگر وہ قربانی کے دن اس کے اصلی مفہوم کو سامنے نہ رکھے تو سال کے بقیہ دنوں میں کیسے امید کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کو اس کا نمونہ بنائے گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام ۲۱۶۰ ق م میں عراق کے ایک قدیم شہر اُر میں پیدا ہوئے۔ تورات کے بیان کے مطابق آپ نے ۱۷۵ سال کی عمر پائی۔ آپ کی قوم اس زمانہ میں سورج کو پوجتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس کو جو کچھ مل رہا ہے سورج سے مل رہا ہے۔ آپ نے کہنا شروع کیا کہ سورج اور ستارے سب ایک خدا کی مخلوق ہیں۔ تم لوگ خالق کو پوجو اور اسی سے لو لگاؤ۔ آدمی جس چیز کو مقدس سمجھ لے اس کے بارے میں وہ بہت حساس ہوجاتا ہے۔ چنانچہ قوم آپ کی دشمن ہوگئی۔ توحید کا داعی بننے کی آپ کو یہ قیمت دینی پڑی کہ آپ کے لئے اپنے وطن میں رہنا مشکل ہوگیا۔ دوست اور رشتہ دار سب آپ کے مخالف ہوگئے۔ وقت کے حکمراں طبقہ نے آپ کو آگ میں ڈال دیا۔ مگر خدا نے اپنی خصوصی مدد سے آپ کو بچالیا۔ جب پوری قوم نے آپ کو رد کر دیا تو بالآخر آپ اپنے وطن سے نکل پڑے۔ صرف آپ کی بیوی اور آپ کے بھتیجے (حضرت لوطؑ) نے آپ کا ساتھ دیا۔ آپ شام، فلسطین، شرق اردن، مصر اور عرب کے ملکوں میں پھرتے رہے۔ کوئی انسانی بستی ایسی نہیں ملی جو آپ کی دعوتِ توحید کو قبول کرے۔ بالآخر آپ حجاز کے ایک غیر آباد مقام (موجودہ مکہ) پر پہنچے اور خدا کے بھروسہ پر وہاں ریگستان میں اپنے بیوی بچوں کو بسا دیا۔

اب حضرت ابراہیم بوڑھے ہوچکے تھے وہ خدا کی راہ میں اپنی ہر چیز لٹا چکے تھے۔ گھر، خاندان، جائداد، مال، وطن، کوئی چیز نہ تھی جس کو انھوں نے خدا کے حضور پیش نہ کر دیا ہو۔ حتیٰ کہ آگ میں ڈالے جانے والے واقعہ کی صورت میں گویا اپنی جان بھی آپ قربان کر چکے تھے۔ تاہم ایک آخری قربانی ابھی باقی تھی۔ یہ عزیز بیٹے کی قربانی تھی۔ چھیاسی سال کی عمر میں آپ کو پہلی اولاد ملی تھی۔ فطری طور پر اکلوتا ہونہار بیٹا آپ کو ہر چیز سے زیادہ عزیز تھا۔ بوڑھے باپ کی تمناؤں کا یہ مرکز جب بڑا ہوا اور باپ کے ساتھ دوڑنے پھرنے کے قابل ہوگیا تو خواب کی صورت میں خدا کا حکم آیا کہ اپنے بیٹے کو ہماری راہ میں قربان کردو۔ تنہائی اور مشقت کی ایک پوری عمر گزارنے کے بعد جو ایک سہارا نصیب ہوا تھا اس کو بھی توڑ دینے کا حکم ہوگیا۔ اور وہ بھی اس طرح کہ خود اپنے ہاتھ سے اس کو توڑا جائے۔ بوڑھے باپ نے خدا کے حکم کی تعمیل

میں اپنے عزیز بیٹے کی گردن پر چھری رکھ دی۔ عین اس وقت خدا کی طرف سے آواز آئی کہ بس تم نے اپنا خواب پورا
کر دیا۔ اس کے بعد فرشتہ نے آپ کو ایک مینڈھا پیش کیا اور آپ نے اپنے بیٹے کے فدیہ میں مینڈھے کو خدا کی راہ
میں ذبح کیا۔ یہ واقعہ ہجری ماہ ذی الحجہ کی دس تاریخ کو پیش آیا۔ اس لئے دنیا بھر کے مسلمان اس تاریخ کو جانور
کی قربانی کرتے ہیں۔ یہ قربانی گویا خود اپنی جان کا فدیہ ہے۔ اس طرح قربانی کرنے والا گویا عمل کی زبان میں کہتا
ہے کہ خدایا ہماری جانیں تیرے لئے حاضر ہیں۔ آج ہم اپنی حوالگی کی علامت کے طور پر جانور کو پیش کر رہے ہیں اور
ہر وقت اس کے لئے تیار ہیں کہ جب بھی تیرا حکم ہو اپنے آپ کو اور اپنے اثاثہ کو تیری خدمت میں پیش کر دیں۔

ہر بالغ مسلمان جو صاحب نصاب ہو اس کے اوپر قربانی واجب ہے۔ قربانی کے لئے تندرست اور فربہ جانور
منتخب کرنا چاہیئے۔ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سمنوا ضحایاکم فانھا علی الصراط
مطایاکم (اپنی قربانی کے جانوروں کو فربہ کرو۔ کیوں کہ وہ پل صراط پر تمھاری سواری ہوں گے) یہ تمثیل کی زبان میں
اس بات کی تلقین ہے کہ قربانی کے لئے آدمی کو پورا اہتمام کرنا چاہئے۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے دنیا کے سفر میں آدمی
یہ کوشش کرتا ہے کہ اچھی سے اچھی سواری کو اپنے لئے منتخب کرے۔ دنیا کی چیزوں میں آدمی جس طرح اہتمام کرتا ہے
اسی طرح اس کو ان چیزوں میں بھی اہتمام کرنا چاہئے جو آخرت میں کام آنے والی ہیں۔ جس طرح دنیا کے سفر میں اچھی سواری
بخیر و خوبی منزل تک پہنچنے کی ضمانت ہوتی ہے اسی طرح آخرت کے سفر میں بھی وہی شخص سلامتی کے ساتھ منزل تک
پہنچے گا جس نے اس کے لئے اپنے امکان کے مطابق "اچھی سواری" کا انتظام کیا ہو۔ ناقص سواری کے ساتھ نہ دنیا
کا سفر کامیابی کے ساتھ طے ہو سکتا ہے اور نہ آخرت کا۔

مستحب یہ ہے کہ جانور کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرے۔ نذر یا تحفہ آپ کسی ہرکارہ کے ذریعہ بھی بھیج سکتے ہیں۔ مگر
وہ نذر جو کسی بڑی ہستی کے پاس بھیجی جا رہی ہو اس کو آدمی خود لے کر حاضر ہوتا ہے۔ ایسا نہیں کرتا کہ کسی کو چند روپے
دے اور کہے کہ بازار سے خرید کر اس کو فلاں صاحب تک پہنچا دینا۔ قربانی محض جانور کا ہدیہ نہیں بلکہ جذبات کا ہدیہ
ہے اور اپنے جذبات کا ہدیہ آدمی اپنی ذات ہی کے ذریعہ پیش کر سکتا ہے۔ قربانی کرتے وقت جو دعا پڑھی جاتی ہے
وہ یہ ہے: إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ إِنَّ صَلَاتِي
وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ لَا شَرِيكَ لَهُ وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ اللَّهُمَّ
مِنْكَ وَلَكَ (میں نے اپنا رخ کر لیا اس ذات کی طرف جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے، بالکل یکسو ہو کر۔
اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ بے شک میری نماز اور میری قربانی، میری زندگی اور میری موت خدا
ہی کے لئے ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے ایسا ہی کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور میں اپنے آپ کو اس کے حوالے کرتا
ہوں۔ خدایا تجھ ہی نے دیا ہے اور تیرے ہی لئے قربانی کر رہا ہوں) اس دعا کے الفاظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ قربانی
کے وقت قربانی کرنے والے کی کیفیات کیا ہونی چاہئیں۔ یہ دعا دراصل مومن کی نفسیاتی حالت کی تصویر ہے۔
قربانی کرنے والا حقیقت میں وہ ہے جو خود اپنی جان کو لے کر مذبح میں پہنچ گیا ہو، جیسے حضرت ابراہیمؑ نے اپنے

عزیز بیٹے کو ذبح کے لئے لٹا دیا تھا۔ اور جانور کو ذبح کرنا گویا یہ معنی رکھتا ہے کہ خدا نے از راہ کرم ایک جانور بھیج دیا ہے کہ اس وقت تم اپنی جان کے بدلے اس کو ذبح کر دو۔ قربانی حضرت ابراہیم کے واقعہ کی تمثیل ہے۔ کسی کی قربانی اللہ کی نظر میں اسی وقت قربانی ہے جب کہ وہ ابراہیمی روح کے ساتھ ادا کی گئی ہو۔

"میری نماز اور میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا اللہ کے لئے ہے"۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز آدمی کی زندگی کی علامت ہے اور قربانی آدمی کی موت کی علامت۔ نماز میں آدمی اللہ کی طرف رخ کرتا ہے۔ وہ اپنے جسم و خیال کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ یہی روح اس کی تمام سرگرمیوں میں مطلوب ہے۔ اس کو دنیا میں اس طرح رہنا ہے کہ اس کی زندگی خدا رخی زندگی بن گئی ہو، جس طرح اس کی نماز خدا رخی نماز ہوتی ہے۔ یہی معاملہ قربانی کا ہے آدمی پر موت اس طرح آنی ہے کہ اس کی موت قربانی کی موت بن گئی ہو۔ اس کا مرنا عام معنوں میں طبعی عمر پوری کر کے مر جانا نہ ہو بلکہ قربانیوں کی ایک مسلسل زندگی کی تکمیل ہو۔ جانور کی قربانی اس بات کا ایک علامتی عزم ہے کہ آدمی اللہ کی راہ میں اپنا سب کچھ کھپاتا رہے گا، یہاں تک کہ اسی حالت میں اس کا خاتمہ ہو جائے۔

جانور کے ذبح کے فوراً بعد یہ دعا پڑھی جاتی ہے: اَللّٰھُمَّ تَقَبَّلْ مِنِّیْ کَمَا تَقَبَّلْتَ مِنْ خَلِیْلِکَ اِبْرَاھِیْمَ وَحَبِیْبِکَ محمد علیہما الصلوٰۃ والسلام (خدایا میری طرف سے اس قربانی کو قبول فرما جس طرح تو نے اپنے خلیل ابراہیمؑ اور اپنے حبیب محمدؐ سے قبول فرمایا تھا) اس طرح ہم کو بہ شکل دعا یہ بتایا گیا کہ قربانی کی قبولیت کے لئے اسی جذبہ فدائیت کی ضرورت ہے جو سیدنا ابراہیمؑ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر پیدا ہوئی۔ قربانی کی قبولیت کا راز یہ ہے کہ اس کے پیچھے حقیقی فداکاری کی روح پائی جاتی ہو، وہ فداکاری جو اپنی کامل صورت میں خدا کے نبیوں نے پیش کی۔ قربانی اسی کی قربانی ہے جس نے روزانہ کی زندگی میں اپنے کو قربان کر رکھا ہو نہ کہ سال میں ایک دن جانور کو ذبح کر دینا۔ ابراہیمی قربانی یہ ہے کہ خدا کی راہ میں سب کچھ دے دینے کے بعد آدمی کے پاس صرف اس کی جان رہ گئی تھی جس کو لے کر وہ خدا کے یہاں حاضر ہو گیا۔ مگر خدا نے اپنی رحمت و شفقت کی بنا پر اس کی جان کے بدلے جانور کی قربانی قبول کر لی۔ قربانی کی حقیقت آخری متاع کو بھی اللہ کی راہ میں دے دینا ہے۔ نہ یہ کہ آدمی آخری متاع تک ہر چیز اپنے پاس بچائے رکھے اور سال میں صرف ایک جانور خدا کے نام پر ذبح کر دیا کرے۔

قربانی کی حقیقت کے بارے میں قرآن میں ارشاد ہوا ہے: لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَا دِمَاؤُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ (خدا کو قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا۔ خدا کو تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے) گویا خدا کے یہاں جس چیز کی قدر ہے وہ خدا سے ڈرنے والا دل ہے نہ کہ کوئی چوپایہ۔ چوپایہ کی قربانی تو محض دل کی اندرونی حالت کی ایک ظاہری علامت ہے۔ اگر دل کے اندر مطلوب حالت موجود نہ ہو تو اوپر اوپر جانور کو ذبح کر دینا ایسا ہی ہے جیسے دکان کے اندر سامان موجود نہ ہو اور اس کے باہر فرضی طور پر ایک سائن بورڈ لٹکا دیا جائے۔

نوٹ: یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۲۸ اکتوبر ۱۹۷۹ کو نشر کی گئی۔

نماز میں خشوع کیسے آتا ہے

"نماز دراصل وہی ہے جو خشوع کی نماز ہو" ایک صاحب نے کہا "میں جب نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہوں تو بہت کوشش کرتا ہوں کہ خشوع کے ساتھ نماز پڑھوں۔ مگر میری نماز خشوع کی نماز نہیں بنتی"

جواب یہ ہے کہ خشوع کی نماز اس طرح کسی کو حاصل نہیں ہوتی کہ جب وہ نماز کے لئے کھڑا ہو تو اپنے اوپر خشوع طاری کرنے کی کوشش کرے۔ نماز کا خشوع دراصل ایک مسلسل واقعہ کا وقتی ظہور ہے۔ آدمی جب نماز سے پہلے کی زندگی میں اللہ کے آگے اپنے کو جھکائے ہوئے ہو تو اس کا یہ جھکاؤ اس کی نماز میں مزید کیفیات کے ساتھ ابھر کر وہ چیز بن جاتا ہے جس کو خشوع کہتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر آدمی کا حال یہ ہو کہ وہ نماز سے باہر غیر خاشعانہ زندگی گزار رہا ہو تو نماز میں وقتی طور پر وہ خاشع نہیں بن سکتا۔ ایک شخص ہے جس سے کسی کو محبت ہے تو اس محبت کرنے والے کے ساتھ ہی یہ واقعہ پیش آئے گا کہ اس کی یاد سے اس کا دل بھر آئے۔ اس کے برعکس جس کو اس شخص سے کوئی لگاؤ نہ ہو وہ وقتی تدبیر سے اس کی خاطر رونے والا نہیں بن سکتا۔

ایک شخص لوگوں کے درمیان تواضع کا طریقہ اختیار کرتا ہے اور دوسرا شخص ڈھٹائی کا۔ ایک شخص معاملات میں انصاف کرتا ہے اور دوسرا بے انصافی سے پیش آتا ہے۔ ایک عاجزانہ نفسیات کے ساتھ جی رہا ہے اور دوسرا متکبرانہ نفسیات کے ساتھ۔ ایک شخص اعتراف و تسلیم کو اپنا طریقہ بنائے ہوئے ہے اور دوسرا ہٹ دھرمی اور انکار کو، تو یہ ناممکن ہے کہ دونوں کی نمازیں یکساں قسم کی ہوں۔ ان میں صرف پہلا شخص ہے جس کی نماز خشوع کی نماز بنے گی۔ دوسرا شخص خواہ کتنا ہی چاہے یہ ناممکن ہے کہ وقتی طور پر ہاتھ باندھ کر اور قبلہ رو ہو کر وہ اپنی نماز کو خشوع کی نماز بنا لے۔ خشوع کی نماز دراصل خاشعانہ زندگی کا ایک وقتی مظہر ہے۔ جو شخص اپنی زندگی میں خاشع نہ بنا ہو وہ کبھی خشوع کی نماز نہیں پڑھ سکتا۔

مجھے ایک بار معلوم ہوا کہ ایک محلہ کے دو مسلمانوں میں جھگڑا ہے۔ جھگڑا صرف شان کا تھا نہ کہ کسی واقعی مسئلہ کا۔ میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ ان میں سے ایک شخص کے پاس گیا جو حیثیت میں زیادہ بڑے تھے۔ ہم نے ان کی بنائی ہوئی شاندار مسجد میں مغرب کی نماز ادا کی۔ یہیں مسجد میں مذکورہ بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ وہ بہت خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آئے۔ مگر جب ہم نے بتایا کہ ہم اس لئے آئے ہیں کہ آپ سے درخواست کریں کہ آپ فلاں مسلمان سے اپنا جھگڑا ختم کر دیں تو اچانک ان کا لہجہ بدل گیا۔ وہ کسی قیمت پر اپنے مسلمان بھائی کے آگے "جھکنے" پر راضی نہ ہوئے۔ ان کی گفتگو سے ان کی جس نفسیات کا اندازہ ہو رہا تھا وہ یہ تھی کہ ——— میرے پاس پیسہ ہے۔ میرے ساتھ اعوان و انصار ہیں۔ میں نے ایک شاندار مسجد کھڑی کر کے جنت خرید لی ہے، پھر مجھے کسی کے آگے جھکنے کی کیا ضرورت۔ مگر یہی نفسیات سب سے زیادہ خشوع کی قاتل ہے جو شخص بندوں کے درمیان جھکی ہوئی زندگی گزار نہ رہا ہو وہ خدا کے سامنے بھی جھکنے والا نہیں بن سکتا۔ جو شخص اپنی صبح و شام کی زندگی میں خاشع نہ ہو وہ مسجد میں نماز پڑھتے ہوئے بھی خشوع کا تجربہ نہیں کر سکتا۔

اتنی عقل جانور کو بھی ہوتی ہے

قرآن میں آدم کے دو بیٹوں کا ایک واقعہ بیان ہوا ہے۔ ایک بھائی نے غصہ میں آکر دوسرے بھائی کو قتل کر دیا۔ یہ کسی انسان کے قتل کا پہلا واقعہ تھا۔ قاتل کی سمجھ میں نہ آیا کہ اپنے بھائی کی لاش کو کیا کرے۔ اس وقت اللہ نے ایک کوا بھیجا۔ اس نے مرے ہوئے کوے کو اس کے سامنے "دفن" کیا۔ اس نے اپنی چونچ اور پنجے سے زمین کھودی اور مردہ کوے کو اس کے اندر رکھ کر اوپر سے مٹی ڈال دی۔ یہ دیکھ کر قاتل بولا: افسوس ہے مجھ پر۔ میں اس کوے جیسا بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش کو زمین میں چھپانے کی تدبیر کرتا (مائدہ) یہ نسل انسانی کے ابتدائی زمانہ کا واقعہ ہے۔ اس وقت سے اب تک برابر خدا یہ کر رہا ہے کہ وہ حیوانات میں سے کسی حیوان کو "بھیج کر" ہم کو ہماری زندگی کے بارہ میں سبق دیتا ہے۔ مگر انسان مشکل ہی سے ایسا کرتا ہے کہ وہ اس قسم کے واقعات سے اپنے لئے سبق لے۔ یہاں ایک پرندے کا واقعہ نقل کیا جاتا ہے جس میں ہمارے آج کے لئے بہت بڑا سبق ہے۔

ابابیل نے چھت کی لکڑی میں گھونسلا بنایا۔ گھونسلا مٹی کا تھا۔ نر اور مادہ دونوں تھوڑی تھوڑی گیلی مٹی اپنی چونچ میں لاتیں اور اس سے گھونسلے کی تعمیر کرتیں۔ لگاتار محنت کے بعد چند دن میں گھونسلا تیار ہو گیا۔ اب ابابیل نے اس کے اندر انڈا دے دیا۔ ایک روز ابابیل کا جوڑا گھونسلے پر بیٹھا ہوا تھا، چار انڈے اور دو ابابیلوں کا بوجھ گھونسلے کے لئے ناقابل برداشت ثابت ہوا اور وہ لکڑی سے چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔ انڈے ٹوٹ کر برباد ہو گئے۔ اس کے بعد دیکھنے والوں نے دیکھا کہ دونوں ابابیلیں پوری چھت میں چاروں طرف اڑ رہی ہیں۔ وہ چھت کی لکڑیوں میں اپنے اگلے گھونسلے کے لئے زیادہ محفوظ جگہ تلاش کر رہی تھیں۔ بالآخر انھوں نے اپنے لئے ایک ایسی جگہ پالی جو غیر ہموار ہونے کی وجہ سے گھونسلے کو زیادہ سنبھال سکتی تھی۔

پہلی بار ابابیلوں نے خالی مٹی کا گھونسلا بنایا تھا۔ اب دوسری بار انھوں نے جو مٹی لانی شروع کی اس میں گھاس ملی ہوئی تھی۔ پہلے تجربہ کے بعد انھوں نے صاف گارے کو ناکافی پایا تو انھوں نے گھاس ملے ہوئے گارے سے گھونسلا بنانا شروع کیا۔ گویا پہلے اگر خالی مٹی تھی تو اب آہن بستہ (Reinforced) مٹی گھونسلے کے لئے منتخب کی گئی۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ دوسرا گھونسلا زیادہ مضبوط اور جما ہوا تھا۔ وہ اپنی جگہ پر قائم ہو گیا اور اس میں جو انڈے دئے گئے وہ محفوظ رہے یہاں تک کہ ان میں بچے نکل آئے۔ بچے اپنی ماں کے ساتھ اڑ کر فضا میں غائب ہو گئے۔ یہ واقعہ خورشید احمد بسمل صاحب (پیدائش ۱۹۴۷) کے اپنے مکان کا ہے جو تھنہ منڈی (راجوری) کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے ۱۹ ستمبر ۱۹۷۹ کو اپنا مذکورہ کمرہ دکھایا اور مجھ سے یہ واقعہ بیان کیا ——— جانور کی کوشش اگر پہلی بار ناکام ہو جائے تو دوسری کوشش سے پہلے وہ یہ معلوم کرتا ہے کہ اس کے عمل میں کون سی کمی تھی جس نے اس کے منصوبہ کو ناکام بنا دیا۔ اور پھر زیادہ کامل منصوبہ کے تحت دوسری تعمیر کرتا ہے۔ مگر ہمارا "آشیانہ" گرتا رہتا ہے اور کبھی ہم کو احساس نہیں ہوتا کہ اپنی کمی کو معلوم کر کے زیادہ مستحکم تعمیر کا منصوبہ بنائیں

دو قسم کی غذائیں

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ کا رسول اس لئے آیا ہے کہ وہ پاک چیزوں کو جائز بتائے اور گندی چیزوں کو حرام قرار دے (ویحل لھم الطیبٰت ویحرم علیھم الخبٰئث، اعراف ۱۵۷) گویا ایمان سے آدمی کے اندر ایسی روح پیدا ہوتی ہے جو خبیث چیزوں کو قبول نہ کرے، وہ صرف طیب چیزوں کو اپنی غذا بنائے۔ اس کے برعکس غیر مومن وہ ہے جو خبیث چیزوں پر جی رہا ہو اور طیب چیزیں اس کی روح کی غذا نہ بنتی ہوں۔

جانوروں میں دو قسم کے جانور ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو مردار اور غلیظ چیزیں تلاش کر کے کھاتے ہیں دوسرے وہ جو ستھری غذاؤں سے اپنی خوراک حاصل کرتے ہیں ــ اسی طرح انسانوں کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو خبیث جذبات پر جیتے ہیں۔ دوسرے وہ جو طیب جذبات پر پرورش پاتے ہیں۔ ایک انسان وہ ہے جو نفرت اور عداوت میں جی رہا ہے۔ جو ذاتی نمائش اور شخصی مصالح کی ہواؤں میں سانس لیتا ہے۔ جس کی روح کو اس سے غذا ملتی ہے کہ وہ حق کا اعتراف نہ کرے۔ جس کے قلب و دماغ کو انانیت، خود پرستی، اظہار برتری سے خوراک ملتی ہے۔ وہ کسی کو تکلیف پہنچا کر خوش ہوتا ہے۔ کسی کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس پر وار کرتا ہے اور پھر کامیابی کے قہقہے لگاتا ہے ــــ ایسے لوگ خدا کی دنیا میں طیب خوراک کو چھوڑ کر خبیث خوراک پر جی رہے ہیں۔

دوسرا انسان وہ ہے جو قلب سلیم کے ساتھ جی رہا ہے۔ اس کی روح دوسروں کی کامیابی سے خوش ہوتی ہے۔ وہ دوسرے پر قابو یافتہ ہو کر بھی اس کو چھوڑ دینے میں راحت محسوس کرتا ہے۔ اس کا دل دوسروں کے لئے خیر خواہی اور محبت کے جذبات سے بھرا ہوتا ہے۔ اس کی ہستی کو عجز اور تواضع میں لذت ملتی ہے۔ وہ خدا اور آخرت کی فضا میں سانس لیتا ہے۔ اختلاف کے وقت اپنے کو جھکا لینے میں اس کو سکون ملتا ہے۔ جب کوئی اس پر تنقید کرتا ہے تو تنقید کو قبول کر لینے میں اس کا دل ٹھیراؤ پاتا ہے۔ کسی کا حق اس کے ذمہ ہو تو جب تک وہ اس کا حق ادا نہ کرلے اس کو راتوں کو نیند نہیں آتی ــــــ ایسے لوگ خدا کی دنیا سے اس کی طیب خوراک لے رہے ہیں اور اس کی خبیث خوراک سے اپنے کو بچائے ہوئے ہیں۔

دنیا میں ایسا ہوتا ہے کہ ہر شخص کی زندگی میں بار بار غیر معمولی حالات آتے ہیں، کبھی کسی سے معاملہ پڑنے کی صورت میں، کبھی کسی سے شکایت پیدا ہو جانے کی صورت میں۔ یہ غیر معمولی مواقع وہ غیر معمولی لمحات ہیں جب کہ خدا دونوں قسم کی روحوں کو چھانٹتا ہے تاکہ ایک کے لئے جنت کا اور دوسرے کے لئے جہنم کا فیصلہ کرے۔ جنت پاک روحوں کی آبادی ہے جہاں وہ لوگ بسائے جائیں گے جنھوں نے دنیا کی جانچ میں تواضع اور انصاف کا ثبوت دیا اور جہنم ناپاک روحوں کا جیل خانہ ہے جہاں وہ لوگ داخل کئے جائیں گے جو معاملہ کے وقت بے انصاف ہو گئے اور خدا کے دئے ہوئے وسائل کو اس لئے خرچ کیا تاکہ اس کے ذریعہ سے اپنی متکبرانہ نفسیات کی تسکین حاصل کریں۔ جنتی اخلاقیات کے لوگ جنت میں ہوں گے اور جہنمی اخلاقیات کے لوگ جہنم میں۔

جب ذہن کے پردے ہٹ جائیں

ملک عبدالشکور بی اے (پیدائش ۱۹۴۶) بدھل (راجوری) کے رہنے والے ہیں۔ وہ سگرٹ کے عادی تھے اور روزانہ تین پیکٹ پی جاتے تھے۔ "سگرٹ پینا صحت کے لئے مضر ہے" "سگرٹ پینا اپنے کمائے ہوئے پیسہ کو آگ لگانا ہے" اس قسم کی کوئی بھی دلیل ان کو سگرٹ چھوڑنے پر آمادہ نہیں کر سکتی تھی۔ حتیٰ کہ وہ اپنے دوستوں کو بھی اصرار کرکے پلاتے۔ چائے پینے کے بعد وہ سگرٹ کا کش لینے کو اتنا ضروری سمجھتے تھے کہ وہ اپنے دوستوں سے کہتے "جو آدمی چائے پی کر سگرٹ نہ پئے اس کو چائے پینے کا حق نہیں"۔

مگر ایک چھوٹے سے واقعہ نے ان کی محبوب سگرٹ ان سے چھڑا دی۔ سگرٹ کے ٹکڑے جو وہ پینے کے بعد پھینکتے ان کو ان کا تین سالہ بچہ فاروق قیصر اٹھا لیتا اور منھ میں لگا کر پیتا۔ ملک عبدالشکور صاحب اس کو منع کرتے مگر وہ نہ مانتا۔ ایک روز ایسا ہوا کہ بچہ کی ماں نے سختی سے بچہ کو منع کیا تو بچہ نے کہا: "ابا بھی تو پیتے ہیں" ملک عبدالشکور صاحب نے بچہ کی زبان سے یہ سنا تو ان کو سخت جھٹکا لگا۔ اگرچہ وہ دوستوں کے سامنے اپنی سگرٹ نوشی پر قصیدہ پڑھتے تھے مگر ان کا دل خوب جانتا تھا کہ سگرٹ پینا ایک بری عادت ہے جس کا انجام نہ صرف صحت اور پیسہ کی بربادی ہے بلکہ وہ اخلاق کو بھی بگاڑنے والا ہے۔ جب کوئی شخص ان سے سگرٹ چھوڑنے کو کہتا تو وہ اس کے خلاف لفظی دلائل کا انبار لگا دیتے۔ مگر ان دلائل کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہ تھی کہ وہ اپنے ایک "نشہ" کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے اور اس کے لئے بھی تیار نہ تھے کہ اپنی غلطی کو مان لیں۔ اس لئے وہ لفظی تاویلات کے سہارے اپنے کو حق بجانب ثابت کرتے تھے۔ وہ اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے تھے کہ سگرٹ کے خلاف کسی دلیل پر سنجیدگی کے ساتھ غور کریں۔

مگر جب سگرٹ کا سوال بچہ کی زندگی کا سوال بن گیا تو اچانک وہ سنجیدہ ہو گئے۔ ان کے ذہن سے وہ تمام پردے ہٹ گئے جنھوں نے ایک سادہ سی حقیقت کو سمجھنا ان کے لئے ناممکن بنا دیا تھا۔ جو شخص مضبوط دلائل کے آگے ہتھیار ڈالنے پر تیار نہ ہوتا تھا وہ ایک بچے کے کمزور الفاظ کے آگے بالکل ڈھ گیا۔ "اگر میں خود سگرٹ پیتا رہوں تو میں اپنے بچہ کو سگرٹ پینے سے باز نہیں رکھ سکتا" انھوں نے سوچا۔ بچہ کا یہ کہنا کہ "ابا بھی تو پیتے ہیں" ان کے لئے ایک ایسا ہتھوڑا بن گیا جس کی ضرب کو برداشت کرنے کی طاقت ان کے اندر نہ تھی۔ بچہ کی زبان سے یہ الفاظ سن کر ان کو سخت جھٹکا لگا۔ انھوں نے ایک لمحہ کے اندر وہ فیصلہ کر لیا جس کے لئے ان کے دوستوں کی مہینوں اور سالوں کی کوشش بھی ناکافی ثابت ہوئی تھی۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا۔ انھوں نے طے کر لیا کہ وہ سگرٹ پینا بالکل چھوڑ دیں گے۔ انھوں نے نہ صرف اگلے دن سگرٹ نہیں پی بلکہ مستقل طور پر سگرٹ نوشی ترک کر دی۔

باپ کو سگرٹ سے محبت تھی۔ مگر بیٹے سے اس سے زیادہ محبت تھی۔ اس نے بیٹے کی خاطر سگرٹ کو چھوڑ دیا۔ اسی طرح ہر آدمی کو اپنے مفادات اور مصالح سے محبت ہوتی ہے۔ اسلام یہ ہے کہ خدا کی محبت اتنی بڑھ جائے کہ اس کی خاطر آدمی دنیا کے مفادات اور مصالح کو قربان کر دے۔ (۲۰ ستمبر ۱۹۷۹)

یہ محکم نظام

خلا میں بے شمار ستارے ہر وقت گردش کرتے رہتے ہیں۔ مگر ان میں ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ اگر خلا کا ایک کرہ دوسرے کرہ سے ٹکرا جائے تو زبردست تباہی برپا ہو۔ چاند انتہائی چھوٹا ہے۔ اس کی حقیقت عظیم خلا میں ایک ذرہ کے برابر بھی نہیں۔ پھر وہ ہماری زمین سے سب سے قریب ہے۔ اس کے باوجود وہ زمین سے نہیں ٹکراتا۔ جب کہ انسانی ساخت کے مصنوعی سیارے برابر اپنی عمر ختم کر کے زمین پر گرتے رہتے ہیں۔

چاند کا وزن ۷۳ کرور کھرب ٹن ہے۔ اس کا قطر ۳۵۰۰ کیلو میٹر ہے اور زمین سے اس کا فاصلہ ۳ لاکھ ۸۴ ہزار کیلو میٹر ہے۔ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے اور چاند زمین کے گرد۔ یہ سلسلہ اربوں سال سے جاری ہے۔ مگر ان کا نظام اتنا محکم ہے کہ وہ نہایت صحت کے ساتھ اپنے مدار پر باقی ہے۔ چاند کو زمین کی مقناطیسی قوت اپنی طرف کھینچتی ہے۔ مگر خود چاند کی حرکت کی قوت اس کو مسلسل زمین سے دور ہٹاتی ہے۔ کشش اور حرکت کی ان قوتوں کے باہمی عمل کے نتیجہ میں چاند کا راستہ ایک لمبے بیضاوی مدار کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ تمام آسمانی اجسام اسی طرح بیضاوی مدار میں گھومتے رہتے ہیں۔

اگر چاند اپنے مدار کو چھوڑ کر زمین پر گرنے لگے تو اس وقت اس کی رفتار گیارہ کیلو میٹر فی سکنڈ سے زیادہ ہوگی۔ اس تیز رفتاری سے جب وہ ہماری زمین سے ٹکرائے گا تو یہ اس سے بھی زیادہ بڑا حادثہ ہوگا جو دنیا کے تمام بموں کے یکبارگی پھٹ جانے سے ہو سکتا ہے۔

بربادی ترقی کا زینہ بن گئی

ایک انگریز عالم مسٹر آئن نیش (Ian Nish) جاپان گئے۔ انھوں نے وہاں گیارہ سال رہ کر جاپانی زبان سیکھی اور گہرائی کے ساتھ جاپانی قوم کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے مطالعہ اور تحقیق کے نتائج ۲۴۸ صفحات کی ایک کتاب میں شائع کیا ہے جس کا نام ہے جاپان کی کہانی (The Story of Japan) مصنف لکھتے ہیں:

جاپانی قوم کی زندگی کو جس چیز نے سب سے زیادہ گہرائی کے ساتھ متاثر کیا وہ سیاست نہیں تھی بلکہ کانٹو کا عظیم زلزلہ تھا۔ یکم ستمبر ۱۹۲۳ کو زلزلہ کے زبردست جھٹکوں نے مشرقی جاپان کو تہس نہس کر دیا جو کہ جاپان کا سب سے زیادہ آباد علاقہ تھا۔ دوسرا انسانی ساخت کا زلزلہ ۱۹۴۵ میں جاپان کی شکست تھی جب کہ دو ایٹم بموں نے جاپان کے دو انتہائی بڑے شہروں کو ملبہ کا ڈھیر بنا دیا۔

"زلزلہ" سے اگر تعمیر نو کا ذہن پیدا ہو تو زلزلہ ایک نئی ترقی کا زینہ بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس زلزلہ اگر صرف محرومی اور جھنجھلاہٹ کا احساس پیدا کرے تو اس کے بطن سے سیاسی چیخ پکار وجود میں آتا ہے جو نتیجہ کے اعتبار سے اتنا بے معنی ہے کہ اس سے زیادہ بے معنی کوئی چیز نہیں۔ (۲۱ جولائی ۱۹۷۲)

ایمان بالغیب

درخت کیا ہے۔ قدرت کا ایک عظیم الشان کارخانہ۔ انسانی کارخانے مزدوروں کے مسائل پیدا کرتے ہیں۔ درخت میں کھرب ہا کھرب کی تعداد میں بیکٹیریا رات دن کام کرتے ہیں۔ بے شمار تعداد میں پردار کیڑے اس کی تلقیح (Pollination) کے عمل میں مشغول رہتے ہیں۔ مگر محنت کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ ہمارے کارخانے شور اور دھواں اگلتے ہیں۔ پانی اور فضا کو گندہ کرتے ہیں۔ مگر درخت کا کارخانہ اس کے بالکل برعکس زمین کو خاموش حسن عطا کرتا ہے۔ وہ خراب ہوا (کاربن) کو خود لے کر عمدہ ہوا (آکسیجن) ہماری طرف لوٹا دیتا ہے۔ اس طرح حیرت انگیز اہتمام کے تحت ایک درخت بنتا ہے۔ بے شمار قسم کی ضمنی پیداوار کے علاوہ اس پر خوشنما پھول کھلایا جاتا ہے۔ پھر اس کے اندر پھل نکلتا ہے۔ ساری کائنات اس کو بڑھانے میں لگ جاتی ہے۔ اس کے اندر کمال کاریگری کے ساتھ غذا کا ذخیرہ جمع کیا جاتا ہے۔ پھر اس کو ایک قیمتی ڈھکن (چھلکے) میں پیک کیا جاتا ہے۔ اس کے اوپر رنگ چھڑکا جاتا ہے۔ خوشبو ڈالی جاتی ہے۔ مزہ پیدا کیا جاتا ہے۔ اور بالآخر نہایت اعلیٰ درجہ کی ڈبہ بند غذائی صورت میں اس کو انسان کے لئے ٹپکا دیا جاتا ہے۔

اسی طرح بے شمار قسم کے پھل، ترکاریاں، غلے، گوشت، دودھ، شہد وغیرہ کائناتی اہتمام کے ساتھ رات دن انسان کے لئے تیار کئے جا رہے ہیں۔ مگر حضرت مسیح کے حواریوں نے جب یہ کہا کہ ہمارے لئے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ آسمان سے کھانے کا ایک خوان اتارے تو جواب ملا کہ اگر تمہارے اس قسم کے مطالبہ پر خوان اتارا گیا تو تم سخت ترین آزمائش میں پڑ جاؤ گے۔ کیوں کہ اس کے بعد اگر تم نے ناشکری کی تو تم کو اتنا سخت عذاب دیا جائے گا جو کسی کو بھی نہ دیا گیا ہو (مائدہ ۱۱۵)

کیا وجہ ہے کہ عام حالات میں ہر وقت خدا کی طرف سے بے شمار تعداد میں غذا فراہم کی جا رہی ہے۔ مگر انھوں نے ایک بار آسمان سے غذا اتارنے کو کہا تو ان کو اتنا سخت انتباہ دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ روزانہ جو غذائیں اتر رہی ہیں وہ اسباب کے پردے میں اتر رہی ہیں۔ جب کہ حواریوں کا مطالبہ یہ تھا کہ اسباب کے پردہ کو ہٹا کر برہنہ انداز میں ان کے لئے غذا اتاری جائے۔ اس قسم کا واقعہ امتحان کی اس پوری اسکیم کو ختم کر دیتا ہے جس کے تحت انسان کو اس دنیا میں رکھا گیا ہے۔ اسی لئے حواریوں کے مطالبہ پر حضرت مسیح نے فرمایا:

اتقوا اللہ ان کنتم مومنین (مائدہ ۱۱۲) اللہ سے ڈرو اگر تم ایمان والے ہو

یعنی ایمان تو یہ ہے کہ بغیر دیکھے یقین کرو۔ جب تم کو دکھا دیا جائے تو اس کے بعد ایمان کی کیا قیمت ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں بندے کا سارا معاملہ غیب کا معاملہ ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ غیب کو نہیں کھولتا (آل عمران ۱۷۹) یہاں ہدایت کی شرط یہ ہے کہ آدمی حالت غیب میں ایمان لانے کے لئے تیار ہو (بقرہ ۳) وہ غیب میں رہتے ہوئے اللہ سے ڈرے (ق ۳۳) غیب کی جنت انھیں لوگوں کے لئے ہے جو غائبانہ طور پر اس کا

یقین کریں (مریم ۶۱) اللہ کے دین کی نصرت وہی معتبر ہے جو غیب میں رہ کر کی جائے (حدید ۲۵) اس طرح غائبانہ طور پر ایمان کا ثبوت دینے والوں ہی کے لئے خدا کے یہاں بخشش ہے اور عظیم مرتبے اور انعامات ہیں (ملک ۱۲)

حقیقت یہ ہے کہ انسان کا سارا امتحان اسی بات کا ہے کہ کون حالت غیب میں مومن بنتا ہے اور کون حالت شہود میں۔ جو لوگ شہود (حقائق کے کھل جانے کے بعد) مومن بنیں، ان کے ایمان کی کوئی قیمت اللہ کے نزدیک نہیں (یونس ۹۱) مومن دراصل وہی ہیں جو غیب کا پردہ پھٹنے سے پہلے غیب کی باتوں کو مان لیں ——— جو شخص خدا کی نعمتوں میں اپنا حصہ پانا چاہتا ہے اس کو خدا پر اس وقت یقین کرنا ہے جب کہ ابھی وہ غیب میں ہے۔ اس کو اس آخرت کے لئے جینا ہے جس کو اس نے دیکھا نہیں۔ اس کو دنیا کی ان نعمتوں کا اعتراف کرنا ہے جس میں اس کو حصہ نہیں دیا گیا۔ اس کو ان ذمہ داریوں کو ادا کرنا ہے جس کا فائدہ موجودہ زندگی میں نہیں ملتا۔ اس کو ان داعیان حق کا ساتھ دینا ہے جن کے داعیٔ حق ہونے کی گواہی دینے کے لئے ابھی فرشتے ظاہر نہیں ہوئے۔ اس کو ایک ایسی چیز کو اپنی منزل بنا کر سفر کرنا ہے جو موجودہ دنیا میں کبھی نہیں آتی۔

اس امتحان کا سب سے نازک پہلو اللہ کے داعی کو پہچاننا اور اس کا ساتھ دینا ہے۔ اللہ کا داعی اپنے زمانہ میں ایک "چھپی ہوئی حقیقت" ہوتا ہے۔ اللہ اپنی بے آمیز دعوت کے اعلان کے لئے جس شخص کا انتخاب کرتا ہے وہ ہمیشہ ایک ایسا شخص ہوتا ہے جس کے ساتھ دنیوی عظمتیں جمع نہ ہوئی ہوں۔ دنیوی عظمتیں جہاں ختم ہو جاتی ہیں وہاں سے حق کو پانے کا آغاز ہوتا ہے۔ اس لئے مخاطبین دعوت کو اس امتحان میں کھڑا ہونا پڑتا ہے کہ وہ ایک ایسی عظمت کو پہچان لیں جو ظاہری عظمتوں سے خالی ہو کر ان کے سامنے آئی ہے۔ وہ ایک ایسے انسان میں خدا کے ظہور کو دیکھ لیں جو چھپے ہوئے خدا کی تجلیاں لئے ہوئے ہے مگر دکھائی دینے والے انسانوں کی تجلیات سے خالی ہے۔

دنیوی عظمتیں ہمیشہ ایسے لوگوں کے حصہ میں آتی ہیں جو اپنی ساری طاقت دنیا کمانے میں لگا دیتے ہیں۔ جن کے اتفاقی حالات ان کو تاریخی گدیوں میں سے کسی گدی پر پہنچا دیتے ہیں۔ جو مروجہ آوازوں میں آواز ملا کر عوامی قیادت حاصل کر لیتے ہیں۔ جو حکومتی منصب یا سیاسی اقتدار کے مالک بن جاتے ہیں۔ مگر اس قسم کی چیزیں کسی کو بے آمیز سچائی سے محرومی کی قیمت پر ملتی ہیں۔ ایسے لوگ ہمیشہ اس لطیف نفسیات سے خالی ہوتے ہیں جس کے اندر خدا کا فیضان ہدایت اترے، اس لئے ایسے لوگ کبھی وہ شخص نہیں بنتے جن کو خدا اپنی نمائندگی کے لئے چنے اور ان کے ذریعہ سے اپنے دین کا اعلان کرائے۔

تاریخ کے ہر دور میں پیغمبروں کو جھٹلایا گیا اور یہ جھٹلانے والے ہمیشہ وہ لوگ تھے جو اپنے کو دین خداوندی کا علم بردار سمجھتے تھے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ ان لوگوں نے وقت کے ان دینی پیشواؤں کا دامن پکڑ رکھا تھا جو عظمت کی گدیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ عظمتوں والے دین میں خدا کو پا کر مطمئن تھے۔ حالاں کہ خدا جہاں ان کو اپنے سایۂ رحمت میں لینے کے لئے پکار رہا تھا وہ دین وہ تھا جو ظاہری عظمتوں اور رونقوں سے خالی تھا۔ وہ اس یقین میں تھے کہ انھوں نے خدا کا مضبوط دامن پکڑ رکھا ہے۔ حالاں کہ ان کے ہاتھ میں فرضی خوش خیالیوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

اسلام کا سرچشمہ

جس طرح آگ لگنے سے تیل بھڑک اٹھتا ہے اسی طرح انسانی کارروائیوں کے پیچھے بھی کوئی "آگ" ہوتی ہے جو اس کی شخصیت کو بھڑکا دیتی ہے اور اس کے اندرون کو مختلف شکلوں میں باہر لاتی ہے۔ فرد کی دوڑ دھوپ ہو یا کسی جماعت اور تحریک کی سرگرمیاں، دونوں کسی خاص محرک کے تحت ابھرتی ہیں اور اسی محرک کے بل پر چلتی رہتی ہیں۔

عمومی مطالعہ بتاتا ہے کہ افراد کو ضروریات زندگی کے تقاضے متحرک کرتے ہیں اور جماعتوں کو سیاسی حالات کے تقاضے۔ ایک عام آدمی سب سے پہلے جس مسئلہ سے دوچار ہوتا ہے وہ معاش کا مسئلہ ہے اور معاش کا مسئلہ حل ہو جائے تو ماحول کے اندر عزت کا مقام حاصل کرنے کا مسئلہ۔ عام انسان کی دوڑ دھوپ عموماً انھیں چیزوں کے گرد گھومتی ہے۔ وہ اپنی مادی ضرورتوں کو پورا کرنے یا سماج کے اندر اونچی حیثیت کو پانے کے لئے سرگرم رہتا ہے۔ اس کے تعلقات، اس کا لین دین، اس کی دوستی اور دشمنی سب اسی ایک چیز کے تابع ہو جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ اس کی شرافت اور اخلاق بھی۔ وہ ایسے مواقع پر خوب شرافت اور اخلاق دکھاتا ہے جہاں اس کے مذکورہ ذاتی مفادات کے تقاضے پورے ہوتے ہوں اور جہاں مفاد کا کوئی پہلو نہ ہو وہاں وہ ایسا بن جاتا ہے جیسے اس کو شرافت اور اخلاق سے کوئی واسطہ نہیں، ایسے مواقع پر وہ اخلاق، انصاف، علمی دیانت داری تک کو بھول جاتا ہے۔

جماعتوں کو عام طور پر جو چیز متحرک کرتی ہے وہ ان کے گرد و پیش کے سیاسی حالات ہیں۔ ایک قوم دوسری قوم کے اوپر قابض ہو گئی۔ ایک گروہ نے دوسرے گروہ کی زمین پر قبضہ کر لیا۔ ایک فرقہ اپنی بہتر پوزیشن سے فائدہ اٹھا کر دوسرے فرقہ پر ظلم کرنے لگا۔ اسی قسم کے حالات ہیں جنھوں نے ہماری تحریکوں اور جماعتوں کو جنم دیا ہے۔ وہ کسی نہ کسی سیاسی حالات کے ردعمل میں اٹھی ہیں۔ البتہ اپنے اپنے مزاج کے لحاظ سے ہر ایک الگ الگ الفاظ بول رہا ہے کوئی اپنی ردعمل کی تحریک کو سیکولر اصطلاحات میں بیان کر رہا ہے۔ کوئی اخلاق اور انسانیت کے نام پر اپنی اہمیت ثابت کر رہا ہے۔ کوئی دین اور مذہب کے الفاظ میں اپنے پروگرام کی تشریح کر رہا ہے۔ اگرچہ ظاہری طور پر ان میں بہت سے فرق بھی ہیں۔ مگر ابتدائی محرک کے اعتبار سے ان میں کوئی فرق نہیں۔

حقیقی اسلامی شخصیت یا حقیقی اسلامی تحریک ان سب سے بالکل مختلف چیز ہے۔ وہ کسی سیاسی یا غیر سیاسی ردعمل کے نتیجہ میں پیدا نہیں ہوتی۔ وہ خدا کی لامحدود تجلیات سے ربط کی پیداوار ہوتی ہے۔ وہ فطرت کے مثبت سرچشمہ سے ابلتی ہے۔ وہ آخرت کی ابدی دنیا کی تعمیر کے لئے حرکت میں آتی ہے۔ وہ ابدیت سے اتصال کا ظہور ہوتی ہے نہ کہ وقتی سیاست کا ردعمل۔ عام تحریکوں کی غذا سیاسی حالات میں ہوتی ہے اور حقیقی اسلامی تحریک کی غذا خدا اور فرشتوں کی سرگرمیوں میں۔ عام تحریکیں سیاسی ہنگاموں پر زندہ رہتی ہیں اور حقیقی اسلامی تحریک خدا کی خاموش کائنات کے اوپر۔ عام تحریکیں سیاسی اکھیڑ پچھاڑ کو جدوجہد سمجھتی ہیں اور حقیقی اسلامی تحریک کی جدوجہد یہ ہے کہ وہ خدائی دنیا کے لازوال قافلہ کی ہم سفر بن جائے۔

جب تمام کھمبے گر جائیں گے

۱۷ مارچ ۱۹۷۸ کو دہلی میں ایک شدید طوفان آیا جس نے صرف تین منٹ کے اندر اتری دلی کے علاقہ کو تہس نہس کر دیا۔ مسٹر تعریف سنگھ (سول ڈیفنس انسٹرکٹر) نے بتایا کہ سورج ڈوبنے سے آدھ گھنٹہ پہلے کالے بادل آئے اور بارش ہونے لگی۔ اچانک ایک سفید رنگ کا غبار تیزی سے ظاہر ہوا جس نے آناً فاناً ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ "ایسا لگتا تھا جیسے نرک زمین پر اتر آیا ہو" اس طوفان کا زور چھ کیلومیٹر کے رقبہ میں تھا۔ اندازہ ہے کہ اس تین منٹ کے طوفان میں، جانی نقصان کے علاوہ ایک کرور روپے کی جائداد کا نقصان ہوا۔ طوفان اتنا تیز تھا کہ اسکوٹر اور آدمی تنکے کی طرح ہوا میں تیرنے لگے بسیں اڑ کر کہیں سے کہیں جا ٹکرائیں۔

۲۱ جون ۱۹۷۹ کو اسی قسم کا مگر اس سے ہلکا طوفان آیا۔ اس طوفان کا زیادہ زور نئی دہلی کے علاقہ میں تھا۔ جہاں سنٹرل سکریٹریٹ کے پاس پتھر کے بھاری ستون ٹوٹ کر گر گئے۔ صفدر جنگ ہوائی اڈہ پر کھڑا ہوا ہیلی کاپٹر الٹ گیا۔ درخت اکھڑ گئے۔ ۱۲۰ کیلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے والی آندھی کی زد میں آکر کئی آدمی زخمی ہوئے اور دو آدمی مر گئے۔

ایسے واقعات بار بار مختلف مقامات پر ہوتے رہتے ہیں۔ اس طرح کائنات کا مالک اپنے بندوں کو یاد دلاتا ہے کہ وہ اس دنیا کے مالک نہیں ہیں۔ اس کا مالک وہ خدا ہے جس نے اس کو پیدا کیا ہے۔ انسانوں کے "کھمبے" صرف اس وقت تک کھڑے ہیں جب تک خدا انھیں مہلت دئے ہوئے ہے۔ جب وہ انھیں پکڑے گا تو اچانک تمام کھمبے گرے ہوئے نظر آئیں گے۔ جو ہوا آج خدا کے حکم سے ۱۲۰ کیلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چلی وہ اس کے حکم سے دس گنا اور بیس گنا زیادہ رفتار سے بھی چل سکتی ہے۔ جب خدا اس دنیا کو ختم کرنا چاہے گا تو اسی طرح وہ قیامت کا طوفان لائے گا۔ اس کے بعد یہ دنیا اپنی تمام تعمیرات کے ساتھ ڈھ پڑے گی۔ اس کے بعد دوسری زیادہ بہتر دنیا بنائی جائے گی۔ آج شریر انسان اور اچھے انسان ملے جلے ہیں۔ اس وقت دونوں ایک دوسرے سے الگ کر دئے جائیں گے۔ اپنے اچھے بندوں کو خدا ابدی مسرت کے باغوں میں جگہ دے گا اور شریر لوگوں کو اکھٹا کر کے جہنم کی آگ میں پھینک دے گا۔ پہلے لوگ ہر قسم کی تکلیف اور اندیشوں سے خالی ہو کر ہمیشہ کے لئے خوشیوں کی زندگی گزاریں گے اور دوسرے لوگ ہر قسم کے عذاب میں مبتلا ہو کر ہمیشہ کے لئے چیختے چلاتے رہیں گے۔

> زندگی کا سفر ———
> ہمیشہ ہموار نہیں ہوتا

اولیور وینڈل ہومز نے کہا ہے:

THE YOUNG MAN KNOWS THE RULES, BUT THE OLD MAN KNOWS THE EXCEPTIONS.
Oliver Wendell Holmes

نوجوان شخص عموم کو دیکھتا ہے اور عمر رسیدہ آدمی استثنار کو۔ زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی اتفاقی رکاوٹ سامنے آکر ہمارے سوچے ہوئے نقشہ کو بگاڑ دیتی ہے۔ اس لئے عقل مند وہ ہے جو صرف عام حالات پر بھروسہ نہ کرے بلکہ غیر متوقع امکانات کو ذہن میں رکھ کر اپنا منصوبہ بنائے۔

کائنات کی نشانیاں

"پتھر اور لکڑی کو کوٹ پیس کر ملا دو تو وہ پٹرول بن جائے گا" اس قسم کی بات بظاہر بالکل مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔ یقیناً انسان اس طرح کا کوئی واقعہ ظہور میں لانے پر قادر نہیں۔ مگر اسی قسم کے اس سے زیادہ عجیب واقعات اس دنیا میں ہر دن ظہور میں آرہے ہیں۔ قدرت کی کیمسٹری ہر دن ایسے بے شمار واقعات ظہور میں لاتی ہے جو انسان کے لئے صرف ایک ناقابل فہم عجوبہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

آکسیجن اور ہائڈروجن دو گیسیں ہیں۔ قدرت ان کو ایک خاص تناسب سے ملاتی ہے تو ان کا مجموعہ پانی جیسے سفید سیال کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ کاربن کے ساتھ کچھ نمکیات اور معدنیات جمع ہوتی ہیں تو زندگی وجود میں آجاتی ہے۔ مقناطیسی فیلڈ اور حرکت کو یکجا کیا جاتا ہے تو بجلی جیسی حیرت ناک طاقت پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح مقناطیسی فیلڈ اور بجلی کو اکھٹا کیا جاتا ہے تو انتہائی تیز حرکت وجود میں آجاتی ہے۔ ایک بیج کو مٹی میں ملا دیا جاتا ہے تو اس سے لکڑی اور پتی اور پھول اور پھل کا ایک مجموعہ نکل کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ وغیرہ، وغیرہ

اس قسم کے بے شمار کرشمے کائنات میں ہر لمحہ ظاہر ہو رہے ہیں۔ انسان ان کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ نہ خود ان چیزوں میں اپنے آپ کو ظہور میں لانے کی طاقت ہے اور نہ انسان اس پر قادر ہے کہ وہ بطور خود کسی واقعہ کو پیدا کر سکے۔ "پھر یہ سب کیسے ہو رہا ہے" اس سوال کے جواب میں وہ کہہ دیتا ہے کہ یہ سب خدا کا انش ہے۔ یہ خود خدا ہے جو ان گنت صورتوں میں اپنے آپ کو ظاہر کر رہا ہے۔

قرآن اس قسم کے جواب کو گمراہی قرار دیتا ہے۔ قرآن کے نزدیک یہ چیزیں خدا کا انش نہیں بلکہ خدا کا حکم ہیں۔ خدا نے اپنی قدرت سے ان کو پیدا کیا ہے۔ نہ کہ خود خدا ان کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔

"ستارے" قدیم زمانہ سے شعراء کے حسین تخیلات کا مرکز رہے ہیں۔ "چاند" کو انسان دیوتا کے روپ میں دیکھتا رہا ہے۔ مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ستارے ہیبت ناک آگ کے شعلے ہیں اور چاند اور دوسرے سیارے محض خشک چٹانیں جن پر پانی کا ایک قطرہ یا درخت کا ایک پتہ بھی نہیں۔ کائنات انتہائی وسیع ہونے کے باوجود انسان جیسی مخلوق کے لئے انتہائی طور پر غیر موافق ہے۔ ساری معلوم کائنات میں صرف زمین ہی ایک ایسا کرہ ہے جہاں انسان زندہ رہتا ہے اور تمدن کی تعمیر کرتا ہے۔ بے حد وسیع کائنات میں زمین کا استثناء واضح طور پر ایک ذی شعور ہستی کے وجود کا ثبوت ہے جس نے بالارادہ زمین پر استثنائی حالات پیدا کئے۔ سائنس داں تقریباً نصف صدی سے اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ خلا میں زمین سے ملتے جلتے دوسرے کرے دریافت کریں تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ ہماری زمین کائناتی استثناء نہیں ہے بلکہ اس طرح کے حالات کم یا زیادہ دوسرے کروں پر بھی پائے جاتے ہیں۔ بالفاظ دیگر، زمین کا خالق قانون ارتقاء ہے نہ کہ کوئی خدا۔ مگر یہ تلاش کھرب ہا کھرب ڈالر خرچ کرنے کے باوجود ابھی تک ناکامی کے سوا کسی اور مقام تک نہ پہنچ سکی۔

سنانے والے بہت ، سننے والا کوئی نہیں

آدمی اپنے کو نمایاں کرنا چاہتا ہے۔ یہی ہر دور میں آدمی کی سب سے بڑی خواہش رہی ہے۔ قدیم زمانہ میں اپنے کو نمایاں کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ "تلوار" تھا۔ اس لئے آدمی تلوار کے کارنامے دکھا کر اپنی جاہ پسندی کے جذبہ کی تسکین حاصل کرتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں پریس اور پلیٹ فارم اس کے ذریعے بن گئے ہیں، اس لئے آج لوگ لکھنے اور بولنے کے کمالات دکھا رہے ہیں۔ جس کو بھی کچھ موقع مل گیا ہے وہ چاہتا ہے کہ تحریر و تقریر کے میدان میں ظاہر ہو کر اپنے آپ کو نمایاں کرے۔ مزید یہ کہ تلوار کا کھیل بڑا جان جوکھم کا کھیل تھا۔ اس لئے نسبتاً کم لوگ اس میدان میں اترنے کا حوصلہ کرتے تھے۔ اس کے برعکس قلم کو حرکت میں لانا یا لاؤڈ اسپیکر پر الفاظ کے دریا بہانا بہت آسان کام ہے۔ اس لئے آج ہر آدمی جاہ اور شہرت کے میدان میں دوڑ لگانے کے لئے بے قرار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری انسانی آبادی "سنانے والوں" میں تبدیل ہو گئی ہے۔ زمین کی پشت پر "سننے والا" کوئی نہیں۔

جہاں بھی دیکھئے، ہر آدمی دوسرے کو درس دیتا ہوا نظر آئے گا۔ کوئی اپنے بھائیوں کے درمیان خطابت کے جوہر دکھا رہا ہے اور کوئی برادران وطن کے نام انسانیت کا پیغام نشر کر رہا ہے، کوئی عربوں کو نصیحت کر رہا ہے اور کوئی اہل مغرب کو کھری کھری باتیں سنا رہا ہے۔ کوئی اہل بدعت کے خلاف قلمی جہاد کا کارنامہ انجام دے رہا ہے اور کوئی فرق ضالہ کی حقیقت کھولنے میں مصروف ہے۔ خود اپنی کوتاہیوں اور لغزشوں کا محاسبہ کرنے کی فرصت کسی کو نہیں۔

ان لفظی سورماؤں کی حقیقی زندگیوں کو دیکھئے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ سب کچھ ذاتی نمائش کا کاروبار ہے نہ کہ دین وملت کی خدمت کا، ہر ایک زبان سے حق وانصاف کا پیغام دے رہا ہے اور عمل سے حق وانصاف کو پامال کر رہا ہے۔ ایک شخص قوم کی تعمیر کا نعرہ لگا رہا ہوگا۔ مگر خود اپنے زیر معاملہ فرد قوم کو برباد کر رہا ہوگا۔ ایک شخص دوسروں کو انسانیت کا پیغام سنا رہا ہوگا اور خود اس سے جس انسان کا معاملہ پڑے اس سے حیوانی سلوک کر رہا ہوگا۔ ایک شخص دوسروں سے انصاف قائم کرنے کا مطالبہ کر رہا ہوگا اور خود جب ایک شخص سے انصاف کرنے کا وقت آئے گا تو وہاں وہ بے انصافی کرنے لگے گا۔

قرآن میں شاعر اور نبی کا یہ فرق بتایا گیا ہے کہ شاعر ایسی بات کہتا ہے جس پر وہ خود عامل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس نبی جو کچھ کہتا ہے وہی کرتا بھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے قائدین شاعروں کے اسوہ پر چل رہے ہیں نہ کہ پیغمبروں کے اسوہ پر۔ مگر اللہ تعالیٰ کے یہاں جس چیز کی قیمت ہے وہ صرف عمل ہے۔ اگر آدمی زبان سے فساد اور ناانصافی کے خلاف آواز لگا رہا ہو مگر خود عملی اعتبار سے فساد اور ناانصافی کے مقام پر ہو تو آخرت میں اس کے ساتھ معاملہ اس کے عمل کے اعتبار سے کیا جائے گا نہ کہ اس کے قول کے اعتبار سے۔

ان کا مکمل انقلاب جزئی انقلاب بھی نہ بن سکا

جے پرکاش نارائن (۱۹۰۲–۱۹۷۹) اپنے علم اور صلاحیت کے اعتبار سے ہندستان کے چوٹی کے لیڈروں میں سے تھے۔ ان کو عام طور پر مخلص اور سنجیدہ انسان سمجھا جاتا تھا اور ہر طبقہ کے لوگ ان کا احترام کرتے تھے۔ پٹنہ میں ان کے مکان کے سونے کے کمرہ میں دیوار پر یہ شعر لگا ہوا تھا:

مالک تری رضا رہے اور تو ہی تو رہے　　باقی نہ میں رہوں نہ مری آرزو رہے

وہ اپنے دل میں سماجی اصلاح کا بے پناہ جذبہ رکھتے تھے اور اپنے الفاظ میں سمپورن کرانتی Total Revolution کے علم بردار تھے۔ انھوں نے سمجھا کہ ہندوستان کے لوگ ان کا مطلوبہ مکمل انقلاب لانے کے لئے بے قرار ہیں۔ صرف اندرا حکومت راستہ کی رکاوٹ ہے۔ اندرا حکومت ختم ہو جائے تو اس کے بعد مطلوبہ سماجی نظام نہایت آسانی سے قائم ہو جائے گا۔ ان کو اپنے اس اندازہ پر اتنا یقین تھا کہ وہ اس اعلیٰ مقصد کے حصول کی خاطر فوج اور پولس کو بغاوت پر ابھارنے کو بھی جائز سمجھنے لگے۔ اندرا گاندھی کی بعض غلطیوں نے ان کو موقع دیا اور وہ ۱۹۷۷ میں اس حکومت کو ختم کرنے میں شان دار طور پر کامیاب ہو گئے۔ تاہم اس "کامیابی" کے معنی صرف یہ تھے کہ اقتدار اندرا اور سنجے کے ہاتھ سے نکل کر مرار جی ڈیسائی اور کانتی ڈیسائی کے ہاتھ میں چلا گیا۔ مطلوبہ سماجی نظام کا قیام پھر بھی خیالی امید ہی بنا رہا۔ اقتدار کی تبدیلی کے بعد اگرچہ ذاتی طور پر جے پرکاش کا مقام اتنا بلند ہوا کہ ان کو "لوک نائک" کا پُرفخر خطاب دیا گیا۔ تاہم اپنی تمام ظاہری کامیابیوں کے باوجود ۸ اکتوبر ۱۹۷۹ کو وہ دنیا سے اس احساس کے ساتھ چلے گئے کہ ان کا مکمل انقلاب اپنی تمام تر دھوم کے باوجود، جزئی انقلاب بھی نہ بن سکا۔ مزید یہ کہ جنتا پارٹی میں بہت جلد پھوٹ پڑ گئی اور صرف ۲۸ ماہ بعد جنتا حکومت ٹوٹ گئی۔ اپنی محبوب جنتا پارٹی کا یہ انجام جب ان کے علم میں آیا تو ان کی زبان سے نکلا: "باغ اجڑ گیا" (ہندستان ٹائمس ۲۰ جولائی ۱۹۷۹) آخر میں وہ اتنے دل شکستہ ہو گئے تھے کہ موت سے ایک دن پہلے اچھوت پٹور دھن ان سے پٹنہ میں ملے اور ان کی خیریت پوچھی تو انھوں نے کہا: "میں کس طرح جی رہا ہوں، بس موت کا انتظار کر رہا ہوں۔" (ٹائمس آف انڈیا ۹ اکتوبر ۱۹۷۹)

جے پرکاش نارائن کا یہ واقعہ محض ایک واقعہ نہیں بلکہ وہ ایک عبرت کا آئینہ ہے جس میں آپ اسی قسم کی بہت سی دوسری تصویریں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ایک مصلح جب "ظالم حکومت" کو ہٹانے کا نعرہ لگاتا ہے تو مشترک دشمنی کا جذبہ بہت سے مختلف اخیال عناصر کو اکٹھا کر دیتا ہے۔ اس طرح مصلح کی جماعت اقلیت میں ہونے کے باوجود متحدہ محاذ میں شامل ہو کر اکثریت حاصل کر لیتی ہے۔ مگر جب ظالم حکومت ہٹ جاتی ہے تو سب کا مفاد الگ الگ ہو جاتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑنے لگتے ہیں۔ اب مصلح کی جماعت اکیلی ہو کر دوبارہ اسی اقلیت کے مقام پر چلی جاتی ہے جہاں وہ متحدہ محاذ بننے سے پہلے تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ "ظالم" کو ہٹا کر بھی عادل کو اقتدار کی گدی پر بیٹھا نہیں پاتی۔ جے پرکاش نارائن اور ان کی قسم کے دوسرے مصلحین کی شاندار کامیابی کے مابعد عبرتناک ناکامی کا سبب یہی ہے۔

سوئی کے کارخانہ میں لوہے کے ایک ٹکڑے کو تقریباً ۲۰ مرحلوں سے گزرنا ہوتا ہے تب وہ سوئی ہو کر تیار ہوتی ہے جس کو ایک آدمی سلائی کے کام میں استعمال کر سکے۔ اب اگر ایک جلد باز آدمی ہتھوڑے کی پہلی ہی ضرب سے سوئی بنانا چاہے تو مطلوبہ سوئی تو نہ بنے گی البتہ لوہے کا ٹکڑا ٹوٹ پھوٹ کر بے کار ہو جائے گا۔ ایسا ہی کچھ معاملہ موجودہ زمانہ میں تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی کوششوں کا ہوا ہے۔ ایک سو سال سے بھی زیادہ مدت کے پر شور ہنگاموں کے باوجود آج بھی ہمارا قافلہ اسی مقام پر ہے جہاں وہ ایک سو سال پہلے تھا۔ بلکہ شاید کچھ اور پیچھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے لیڈر پہلی ہی ضرب میں ایک عمدہ چمک دار "سوئی" تیار کر لینا چاہتے ہیں۔ وہ "۲۰ مرحلوں" کے صبر آزما دور سے گزرنا نہیں چاہتے۔

انیسویں صدی میں کچھ لوگوں نے دیکھا کہ مغربی قومیں مسلم ملکوں کے اوپر قابض ہو گئی ہیں۔ انھوں نے سمجھا کہ بس لڑ بھڑ کر کسی طرح ان اجنبی قوموں کو نکال دو اور اس کے بعد اسلام کی عظمت کا دور دوبارہ واپس آجائے گا۔ بے شمار جانی و مالی نقصان کے بعد یہ مہم کامیاب ہو گئی، مگر اسلام اور مسلمان جس مغلوبیت کی حالت میں پہلے تھے وہیں اب بھی باقی رہے۔ کیوں کہ جدید دنیا میں بالادستی کا مقام حاصل کرنے کے لئے بہت سی علمی و عملی تیاریوں کی ضرورت تھی اور اس کے لئے ہمارے پرجوش لیڈروں نے کچھ نہیں کیا تھا۔

غیر مسلم اکثریت کے ملکوں میں لوگوں نے دیکھا کہ برسر اقتدار پارٹی کے زیر انتظام مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہے۔ انھوں نے سمجھا کہ ہماری تمام مصیبتوں کی جڑ بس یہ پارٹی ہے جس کے ہاتھ میں بر وقت ملک کا اقتدار ہے۔ اگر اس پارٹی کو اقتدار سے ہٹا دیا جائے تو ہماری تمام مصیبتیں ختم ہو جائیں گی۔ الیکشن کے موقع پر دوسری پارٹیوں کے ساتھ مل کر انھوں نے سیاسی طوفان مچایا اور بالآخر برسر اقتدار پارٹی کو اقتدار سے ہٹا دیا۔ مگر اس کے بعد جو دوسری پارٹی منتخب ہو کر اقتدار کے منصب پر بیٹھی اس کے تحت بدستور اسلام اور مسلمان ظلم کا شکار ہوتے رہے۔ کیوں کہ نئی منتخب پارٹی بھی اسی غیر مسلم اکثریت کے افراد سے بنی تھی جس سے پہلی پارٹی بنی تھی۔ پھر وہ پہلی پارٹی سے مختلف کیوں ہوتی۔

یہی سیاسی ڈراما مسلم اکثریت کے ملکوں میں ایک اور شکل میں دہرایا گیا ہے۔ یہاں اسلامی مفکرین اور ملی قائدین نے دیکھا کہ جو مسلم شخصیت یا مسلم جماعت ان کے ملک میں حکومت کر رہی ہے اس کے زیر حکومت بہت سی غیر اسلامی چیزیں رائج ہو رہی ہیں۔ انھوں نے سمجھا کہ بس اس شخص کو کسی طرح مار ڈالو یا اس جماعت کو اقتدار سے ہٹا دو تو اس کے بعد ہر طرف نظام اسلام اور نظام مصطفیٰ کی ہوائیں چلنے لگیں گی۔ مختلف اندرونی و بیرونی عناصر کے اشتراک سے یہ مہم کامیاب ہو گئی۔ سب سے بڑے "مخالف اسلام" کو ختم کر دیا گیا۔ مگر اس کے بعد جو دوسرا نظام آیا وہ بھی پہلے ہی کی طرح غیر اسلامی نظام تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت کو چلانے والے افراد ہمیشہ اپنے سماج سے نکل کر آتے ہیں نہ کہ آسمان سے۔ اور جب سماج بگڑا ہوا ہو تو محض کسی فرد یا کسی سیاسی پارٹی کے بدلنے سے نظام نہیں بدل سکتا ——

اس کے نتیجہ میں قوم کے اندر حقیقت پسندی کے بجائے جذباتیت پیدا ہوتی ہے۔ تعمیری مزاج کے بجائے سیاسی مزاج بنتا ہے۔ پُرامن طریقوں کے بجائے تخریبی طریقے پرورش پاتے ہیں، اور جو مقصد ہے وہ بھی حاصل نہیں ہوتا۔

تذکیر القرآن

البقرہ

اے ایمان والو تم پر مقتولوں کا قصاص لینا فرض کیا جاتا ہے۔ آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام، عورت کے بدلے عورت۔ پھر جس کو اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معافی ہو جائے تو اس کو چاہئے کہ معروف کی پیروی کرے اور خوبی کے ساتھ اس کو ادا کرے۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے ایک آسانی اور مہربانی ہے۔ اب اس کے بعد بھی جو شخص زیادتی کرے اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔ اور اے عقل والو، قصاص میں تمہارے لئے زندگی ہے تاکہ تم بچو۔ تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجائے اور وہ اپنے پیچھے، مال چھوڑ رہا ہو تو وہ معروف کے مطابق وصیت کردے اپنے ماں باپ کے لئے اور اپنے قرابت داروں کے لئے۔ یہ ضروری ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لئے۔ پھر جو کوئی وصیت کو سننے کے بعد اس کو بدل ڈالے تو اس کا گناہ اسی پر ہوگا جس نے اس کو بدلا، یقیناً اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ البتہ جس کو وصیت کرنے والے کی بابت یہ اندیشہ ہو کہ اس نے جانب داری یا حق تلفی کی ہے اور وہ آپس میں صلح کرادے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ اللہ معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے ۱۷۸ —۸۲

قتل کے معاملہ میں اسلام میں قصاص کا اصول مقرر کیا گیا ہے۔ یعنی قاتل کے ساتھ وہی کیا جائے جو اس نے مقتول کے ساتھ کیا ہے۔ اس طرح ایک طرف آئندہ کے لئے قتل کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ کیوں کہ اپنی جان کا خوف آدمی کو دوسرے کی جان لینے سے روکتا ہے اور نتیجۃً سب کی جانیں محفوظ ہو جاتی ہیں۔ قاتل کے قتل سے پورے معاشرہ کے لئے زندگی کی ضمانت پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف مقتول کے ورثار کا انتقامی جذبہ ٹھنڈا ہو کر سماج میں کسی نئی تخریبی کارروائی کے امکان کو ختم کر دیتا ہے۔ تاہم قصاص کا معاملہ اسلام میں قابل راضی نامہ ہے۔ مقتول کے ورثار چاہیں تو قاتل کو قتل کر سکتے ہیں، چاہیں تو دیت (مالی معاوضہ) لے سکتے ہیں اور چاہیں تو معاف کر سکتے ہیں۔ اس گنجائش کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ میں ایک دوسرے کو بھائی سمجھنے کی فضا باقی رہے، ایک دوسرے کو حریف سمجھنے کی فضا کسی حال میں پیدا نہ ہو۔ نیز خون بہا کے اصول کا ایک خاص فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے مقتول کے وارثوں کو اپنے چلے جانے والے فرد خاندان کا ایک مالی بدل مل جاتا ہے

جب کوئی مر جاتا ہے تو یہ مسئلہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس کی وراثت کا کیا جائے۔ اس سلسلے میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ اس کی وراثت کو اس کے رشتہ داروں میں معروف طریقہ سے تقسیم کر دیا جائے۔ یہ گویا مال کا تقویٰ ہے۔ جب مرنے والوں کے رشتہ داروں تک حصہ بحصہ اس کا چھوڑا ہوا مال پہنچ جائے تو اس سے معاشرہ میں یہ فضا بنتی ہے کہ از روئے حق جس کو جو دیا جانا چاہئے وہ دیا جا چکا ہے۔ اس طرح خاندان کے اندر متروکہ مال یا جائداد کے حصول کے لئے باہمی نزاع پیدا نہیں ہوتی، خاندان کا جو شخص قانونی اعتبار سے وارث نہ قرار پاتا ہو، مگر اخلاقی اعتبار سے وہ مستحق ہو تو مرنے والے کو چاہئے کہ وصیت کے ذریعہ اس خلا کو پُر کر دے۔ (یہاں وراثت کے بارے میں معروف کے مطابق وصیت کرنے کا حکم ہے۔ آگے سورہ نسار میں ہر ایک کے حصہ کو قانونی طور پر متعین کر دیا گیا ہے)

اے ایمان والو تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے اگلوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم پرہیزگار بنو۔ گنتی کے چند دن۔ پھر جو کوئی تم میں بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں تعداد پوری کر لے۔ اور جن کو طاقت ہے تو ایک روزہ کا بدلہ ایک مسکین کا کھانا ہے۔ جو کوئی مزید نیکی کرے تو وہ اس کے لئے بہتر ہے۔ اور تم روزہ رکھو تو یہ تمھارے لئے زیادہ بہتر ہے، اگر تم جانو۔ رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اتارا گیا، ہدایت ہے لوگوں کے لئے اور کھلی نشانیاں راستہ کی اور حق و باطل کے درمیان فیصلہ کرنے والا۔ پس تم میں سے جو کوئی اس مہینہ کو پائے وہ اس کے روزے رکھے۔ اور جو بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں گنتی پوری کر لے۔ اللہ تمھارے لئے آسانی چاہتا ہے، وہ تمھارے ساتھ سختی کرنا نہیں چاہتا۔ اور اس لئے کہ تم گنتی پوری کر لو اور اللہ کی بڑائی کرو اس پر کہ اس نے تم کو راہ بتائی اور تاکہ تم اس کے شکر گزار بنو ۱۸۳—۸۵

روزہ بیک وقت دو چیزوں کی تربیت ہے۔ ایک شکر، دوسرے تقویٰ۔ کھانا اور پانی اللہ کی بہت بڑی نعمتیں ہیں۔ مگر عام حالات میں آدمی کو اس کا اندازہ نہیں ہوتا۔ روزہ میں جب وہ دن بھر ان چیزوں سے رکا رہتا ہے اور سورج ڈوبنے کے بعد شدید بھوک پیاس کی حالت میں کھانا کھاتا ہے اور پانی پیتا ہے تو اس وقت اس کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کھانا اور پانی اللہ کی کتنی بڑی نعمتیں ہیں۔ اس تجربہ سے اس کے اندر اپنے رب کے شکر کا بے پناہ جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ دوسری طرف یہی روزہ آدمی کے لئے تقویٰ کی تربیت بھی ہے۔ تقویٰ یہ ہے کہ آدمی دنیا کی زندگی میں خدا کی منع کی ہوئی چیزوں سے بچے۔ وہ ان چیزوں سے رکا رہے جن سے خدا نے روکا ہے اور وہی کرے جس کے کرنے کی خدا نے اجازت دی ہے۔ روزہ میں صرف رات کو کھانا اور دن کو کھانا پینا چھوڑ دینا گویا خدا کو اپنے اوپر نگراں بنانے کی مشق ہے۔ مومن کی پوری زندگی ایک قسم کی روزہ دار زندگی ہے۔ رمضان کے مہینے میں وقتی طور پر چند چیزوں کو چھڑا کر آدمی کو تربیت دی جاتی ہے کہ وہ ساری عمر ان چیزوں کو چھوڑ دے جو اس کے رب کو ناپسند ہیں ——— قرآن بندے کے اوپر اللہ کا انعام ہے اور روزہ بندے کی طرف سے اس انعام کا عملی اعتراف۔ روزہ کے ذریعہ بندہ اپنے آپ کو اللہ کی شکر گزاری کے قابل بناتا ہے اور یہ صلاحیت پیدا کرتا ہے کہ وہ قرآن کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق دنیا میں متقیانہ زندگی گزار سکے۔

روزہ سے دلوں کے اندر نرمی اور شکستگی آتی ہے۔ اس طرح روزہ آدمی کے اندر یہ صلاحیت پیدا کرتا ہے کہ وہ ان کیفیتوں کو محسوس کر سکے جو اللہ کو اپنے بندوں سے مطلوب ہیں۔ روزہ کی پُر مشقت تربیت آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ اللہ کی شکر گزاری میں اس کا سینہ تڑپے اور اللہ کے خوف سے اس کے اندر کپکپی پیدا ہو۔ جب آدمی اس نفسیاتی حالت کو پہنچتا ہے، اسی وقت وہ اس قابل بنتا ہے کہ وہ اللہ کی نعمتوں پر ایسا شکر ادا کرے جس میں اس کے دل کی دھڑکنیں شامل ہوں۔ وہ ایسے تقویٰ کا تجربہ کرے جو اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے کر دے۔ وہ اللہ کو ایسے بڑے کی حیثیت سے پائے جس میں اس کا اپنا وجود بالکل چھوٹا ہو گیا ہو۔

اور جب میرے بندے تم سے میری بابت پوچھیں تو میں نزدیک ہوں، پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔ تو چاہئے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر یقین رکھیں تاکہ وہ ہدایت پائیں۔ تمہارے لئے روزہ کی رات میں اپنی بیویوں کے پاس جانا جائز کیا گیا۔ وہ تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے لباس ہو۔ اللہ نے جانا کہ تم اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے تو اس نے تم پر عنایت کی اور تم کو معاف کر دیا۔ تو اب تم ان سے ملو اور چاہو جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے۔ اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ صبح کی سفید دھاری کالی دھاری سے الگ ظاہر ہو جائے۔ پھر پورا کرو روزہ رات تک۔ اور جب تم مسجد میں اعتکاف میں ہو تو بیویوں سے خلوت نہ کرو۔ یہ اللہ کی حدیں ہیں تو ان کے نزدیک نہ جاؤ۔ اس طرح اللہ اپنی آیتیں لوگوں کے لئے بیان کرتا ہے تاکہ وہ بچیں۔ اور تم آپس میں ایک دوسرے کے مال کو ناحق طور پر نہ کھاؤ اور ان کو حاکموں تک نہ پہنچاؤ تاکہ دوسروں کے مال کا کوئی حصہ تم کو مل جائے۔ حالاں کہ تم اس کو جانتے ہو ۸۸ – ۱۸۶

روزہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے صبر کا عمل ہے اور صبر، یعنی حکم الٰہی کی تعمیل میں مشکلات کو برداشت کرنا ہی وہ چیز ہے جس سے آدمی اس قلبی حالت کو پہنچتا ہے جو اس کو خدا سے قریب کرے اور اس کی زبان سے ایسے کلمات نکلوائے جو قبولیت کو پہنچنے والے ہوں۔ اللہ کو وہی پاتا ہے جو اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کرے، اللہ تک اسی شخص کے الفاظ پہنچتے ہیں جس نے اپنی روح کے تاروں کو اللہ سے ملا رکھا ہو۔

شریعت آدمی کے اوپر کوئی غیر فطری پابندی عائد نہیں کرتی۔ روزہ میں دن کے اوقات میں ازدواجی تعلق ممنوع ہونے کے باوجود رات کے اوقات میں اس کی اجازت، افطار و سحر کے اوقات جاننے کے لئے جنتری کا پابند کرنے کے بجائے عام مشاہدہ کو بنیاد قرار دینا اسی قسم کی چیزیں ہیں۔ جزئی تفصیلات میں بندوں کو گنجائش دیتے ہوئے اللہ نے عمومی حدیں واضح فرما دی ہیں۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ مقرر حدوں کا پوری طرح پابند رہے اور تفصیلی جزئیات میں اس روش کو اختیار کرے جو تقویٰ کی روح کے مطابق ہے۔

روزہ کے حکم کے فوراً بعد یہ حکم کہ "ناجائز مال نہ کھاؤ" بتاتا ہے کہ روزہ کی حقیقت کیا ہے۔ روزہ کا اصل مقصد آدمی کے اندر یہ صلاحیت پیدا کرنا ہے کہ جہاں خدا کی طرف سے رکنے کا حکم ہو وہاں آدمی رک جائے، حتیٰ کہ اگر حکم ہو تو جائز چیز سے بھی، جیسا کہ روزہ میں ہوتا ہے۔ اب جو شخص خدا کے حکم کی بنا پر حلال کمائی تک سے رک جائے وہ اسی خدا کے حکم کی بنا پر حرام کمائی سے کیوں نہ اپنے آپ کو روکے رکھے گا۔

مومن کی زندگی ایک قسم کی روزہ دار زندگی ہے۔ اس کو ساری عمر کچھ چیزوں سے "افطار" کرنا ہے اور کچھ چیزوں سے مستقل طور پر "روزہ" رکھ لینا ہے۔ رمضان کا مہینہ اسی کی تربیت ہے۔ پھر روزہ کی محتاط زندگی اور اس کا پُرمشقت عمل یہ سبق دیتا ہے کہ اللہ کا عبادت گزار بندہ وہ ہے جو تقویٰ کی سطح پر اللہ کی عبادت کر رہا ہو۔ اللہ کو پکارنے والا صرف وہ ہے جو قربانیوں کی سطح پر اللہ کی نزدیکی حاصل کرے۔

وہ تم سے چاندوں کی بابت پوچھتے ہیں۔ کہہ دو کہ وہ اوقات ہیں لوگوں کے لئے اور حج کے لئے۔ اور نیکی یہ نہیں کہ تم گھروں میں آؤ چھت پر سے۔ بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی پرہیزگاری کرے۔ اور گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم کامیاب ہو۔ اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو لڑتے ہیں تم سے۔ اور زیادتی نہ کرو۔ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور قتل کرو ان کو جس جگہ پاؤ اور نکال دو ان کو جہاں سے انھوں نے تم کو نکالا ہے۔ اور فتنہ سخت تر ہے قتل سے۔ اور ان سے مسجد حرام کے پاس نہ لڑو جب تک کہ وہ تم سے اس میں جنگ نہ چھیڑیں۔ پس اگر وہ تم سے جنگ چھیڑیں تو ان کو قتل کرو۔ یہی سزا ہے منکروں کی۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔ اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کا ہو جائے، پھر اگر وہ باز آجائیں تو اس کے بعد سختی نہیں ہے مگر ظالموں پر ۱۸۹ — ۹۳

چاند کا گھٹنا بڑھنا تاریخ جاننے کے لئے ہے نہ کہ توہم پرستوں کے خیال کے مطابق اس لئے کہ بڑھتے چاند کے دن مبارک ہیں اور گھٹتے چاند کے دن منحوس۔ یہ آسمان پر ظاہر ہونے والی قدرت کی جنتری ہے تاکہ اس کو دیکھ کر لوگ اپنے معاملات اور اپنی عبادات کا نظام مقرر کریں۔ اسی طرح بہت سے لوگ ظاہری رسوم کو دینداری سمجھ لیتے ہیں۔ قدیم عربوں نے یہ فرض کر لیا تھا کہ حج کا احرام باندھنے کے بعد اپنے اور آسمان کے درمیان کسی چیز کا حائل ہونا آداب احرام کے خلاف ہے۔ اس مفروضہ کی بنا پر وہ ایسا کرتے کہ جب احرام باندھ کر گھر سے باہر آجاتے تو دوبارہ دروازہ کے راستہ سے گھر میں نہ جاتے بلکہ دیوار کے اوپر سے چڑھ کر صحن میں داخل ہوتے۔ مگر اس قسم کے ظاہری آداب کا نام دین داری نہیں۔ دین داری یہ ہے کہ آدمی اللہ سے ڈرے اور زندگی میں اس کی مقرر کی ہوئی حدوں کی پابندی کرے۔

مومن کو دین کا عامل بننے کے ساتھ دین کا مجاہد بھی بننا ہے۔ یہاں جس جہاد کا ذکر ہے وہ جہاد وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پیش آیا۔ عرب کے مشرکین اتمام حجت کے باوجود دعوت رسالت سے انکار کرکے اپنے لئے زندگی کا حق کھو چکے تھے، نیز انھوں نے جارحیت کا آغاز کرکے اپنے خلاف فوجی اقدام کو درست ثابت کر دیا تھا اس بنا پر ان کے خلاف تلوار اٹھانے کا حکم ہوا۔ "اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کا ہو جائے"۔ کا مطلب یہ ہے کہ سرزمین عرب سے شرک کا خاتمہ ہو جائے اور دین توحید کے سوا کوئی دین وہاں باقی نہ رہے۔ اس حکم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے عرب کو توحید کا دائمی مرکز بنا دیا۔

اہل ایمان کو جنگ کی اجازت صرف اس وقت ہے جب کہ فریق مخالف کی طرف سے حملہ کا آغاز ہو چکا ہو۔ دوسرے یہ کہ جب اہل ایمان غلبہ پالیں تو اس کے بعد ماضی پر کسی کے لئے کوئی سزا نہیں۔ ہتھیار ڈالتے ہی ماضی کے جرائم معاف کر دئے جائیں گے۔ اس کے بعد سزا کا مستحق صرف وہ شخص ہوگا جو آئندہ کسی قابل سزا جرم کا ارتکاب کرے۔ عام حالات میں قتل کا حکم اور ہے اور جنگی حالات میں قتل کا حکم اور۔

حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینہ کا بدلہ ہے اور حرمتوں کا بھی قصاص ہے۔ پس جس نے تم پر زیادتی کی تم بھی اس پر زیادتی کرو جیسی اس نے تم پر زیادتی کی ہے۔ اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔ اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ اور کام اچھی طرح کرو۔ بے شک اللہ پسند کرتا ہے اچھی طرح کام کرنے والوں کو ۱۹۴ - ۱۹۵

حرام مہینوں (محرم، رجب، ذی قعدہ، ذی الحجہ) میں یا حرم مکہ کے حدود میں لڑائی گناہ ہے۔ مگر جب مخالفین اسلام تمہارے خلاف کارروائی کرنے کے لئے اس کی حرمت کو توڑ دیں تو تم کو بھی حق ہے کہ قصاص کے طور پر تم ان کی حرمت کا لحاظ نہ کرو۔ مگر دشمن کے ساتھ دشمنی میں تم کو اللہ سے بے خوف نہ ہو جانا چاہئے۔ کسی حد کو توڑنے میں تم اپنی طرف سے ابتدا نہ کرو اور نہ کوئی ایسا اقدام کرو جو حد ضروری سے زیادہ ہو۔ اللہ کی مدد کسی کو اسی وقت ملتی ہے جب کہ وہ اشتعال کے اوقات میں بھی اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں کا پابند بنا رہے۔

قصاص اور ظلم میں یہ فرق ہے کہ قصاص فریق ثانی کی طرف سے کی ہوئی زیادتی کے برابر اور اس کے بقدر ہوتا ہے۔ جب کہ ظلم ان حد بندیوں سے باہر نکل جانے کا نام ہے۔ ایک شخص کو کسی سے تکلیف پہنچے تو وہ دوسرے کو اتنی ہی تکلیف پہنچا سکتا ہے جتنی اس کو پہنچی ہے اس سے زیادہ کی اجازت نہیں۔ نصیحت بری لگے تو گالی اور استہزار سے اس کا جواب دینا یا زبان و قلم کی شکایت کے بدلے میں جارحیت دکھانا تقویٰ کے سراسر خلاف ہے۔ اسی طرح مالی نقصان کے بدلے جانی نقصان، معمولی چوٹ کے بدلے زیادہ بڑی چوٹ، ایک قتل کے بدلے بہت سے آدمیوں کا قتل، اس قسم کی تمام چیزیں ظلم کی تعریف میں آتی ہیں۔ مسلمان کے لئے برابر کا بدلہ (قصاص) جائز ہے مگر ظلم کسی حال میں جائز نہیں۔

اللہ کی راہ میں جدوجہد سب سے زیادہ جس چیز کا تقاضہ کرتی ہے وہ مال ہے۔ اور مال کی قربانی بلاشبہ آدمی کے لئے سب سے زیادہ مشکل چیز ہے۔ اس لئے حکم دیا کہ اللہ کے کام کو اپنا کام سمجھ کر اس کی راہ میں خوب مال خرچ کرو اور اس کام کو اس کی بہتر سے بہتر صورت میں انجام دو۔ "اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو" سے مراد بخل ہے یعنی ایسا نہ ہو کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو، کیوں کہ خرچ میں دل تنگ ہونا دنیا و آخرت کی بربادی ہے۔ آدمی مال خرچ کردینے کو ہلاکت سمجھتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مال کو اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنا ہلاکت ہے۔ آدمی کے پاس جو کچھ ہے اگر وہ اس کو اللہ کے حوالے نہ کرے تو اللہ کے پاس جو کچھ ہے وہ کیوں اس کو آدمی کے حوالے کردے گا۔

آدمی اپنی دولت کا استعمال صرف یہ سمجھتا ہے کہ وہ اس کو اپنی ذات پر یا اپنے بیوی بچوں پر خرچ کرے۔ مگر اس ذہن کو قرآن ہلاکت بتاتا ہے۔ اس کے بجائے دولت کا صحیح استعمال یہ ہے کہ اس کو زیادہ سے زیادہ دین کی ضرورتوں میں خرچ کیا جائے۔ مال کو صرف اپنے ذاتی حوصلوں کی تکمیل میں خرچ کرنا فرد اور معاشرہ کو خدا کے غضب کا مستحق بناتا ہے۔ اس کے برعکس جب مال کو اللہ کے دین کی راہ میں خرچ کیا جائے تو فرد اور جماعت دونوں اللہ کی رحمتوں اور نصرتوں کے مستحق بنتے ہیں۔ خرچ کرنے والے کو اس کا فائدہ بے شمار صورتوں میں دنیا میں بھی حاصل ہوتا ہے اور آخرت میں بھی۔

اور پورا کرو حج اور عمرہ اللہ کے لئے۔ پھر اگر تم گھر جاؤ تو جو قربانی کا جانور میسر ہو وہ پیش کردو اور اپنے سروں کو نہ منڈاؤ جب تک کہ قربانی اپنے ٹھکانے پر نہ پہنچ جائے۔ تم میں سے جو بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو تو وہ فدیہ دے روزہ یا صدقہ یا قربانی کا۔ جب امن کی حالت ہو اور کوئی حج تک عمرہ کا فائدہ حاصل کرنا چاہے تو وہ قربانی پیش کرے جو اس کو میسر آئے۔ پھر جس کو میسر نہ آئے تو وہ حج کے ایام میں تین دن کے روزے رکھے اور سات دن کے روزے جب کہ تم گھروں کو لوٹو۔ یہ پورے دس ہوئے۔ یہ اس شخص کے لئے ہے جس کا خاندان مسجد حرام کے پاس آباد نہ ہو۔ اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔ حج کے متعین مہینے ہیں۔ پس جس نے حج کا عزم کر لیا تو پھر اس کو حج کے دوران نہ کوئی فحش بات کرنی ہے اور نہ گناہ کی اور نہ لڑائی جھگڑے کی۔ اور جو نیک کام تم کروگے اللہ اس کو جان لے گا۔ اور تم تقویٰ کا زادِ راہ لو۔ بہترین زاد راہ تقویٰ کا زادِ راہ ہے۔ اور اے عقل والو مجھ سے ڈرو ۹۷ — ۱۹۶

زمانہ جاہلیت کے عربوں میں بھی حج کا رواج تھا۔ مگر وہ ان کے لئے گویا ایک قومی رسم یا تجارتی میلہ تھا نہ کہ اللہ واحد کی عبادت۔ مگر حج و عمرہ ہو یا اور کوئی عبادت، ان کی اصل قیمت اسی وقت ہے جب کہ وہ خالصۃً اللہ کے لئے ادا کی جائیں۔ جو شخص اپنی روزانہ زندگی میں اللہ کا پرستار بنا ہوا ہو جب وہ اللہ کی عبادت کے لئے اٹھتا ہے تو اس کی ساری نفسیات سمٹ کر اسی کے اوپر لگ جاتی ہیں۔ وہ ایک ایسی عبادت کا تجربہ کرتا ہے جو ظاہری طور پر دیکھنے میں تو آداب و مناسک کا ایک مجموعہ ہوتی ہے۔ مگر اپنی اندرونی روح کے اعتبار سے وہ ایک ایسی ہستی کا اپنے آپ کو اللہ کے آگے ڈال دینا ہوتا ہے جو اللہ سے ڈرتا ہو اور آخرت کی پکڑ کا اندیشہ جس کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ بنا ہوا ہو۔

مومن وہ ہے جو شہوت کے لئے جینے کے بجائے مقصد کے لئے جینے لگے۔ وہ اپنے معاملات میں خدا کی نافرمانی سے بچنے والا ہو اور اجتماعی زندگی میں آپس کی لڑائی جھگڑے سے بچ رہا ہے۔ حج کا سفر ان اخلاقی اوصاف کی تربیت کے لئے بہت موزوں ہے، اس لئے اس میں خصوصی طور پر ان کی تاکید کی گئی۔ اسی طرح حج میں سفر کا پہلو لوگوں کو سامان سفر کے اہتمام میں لگا دیتا ہے۔ مگر اللہ کے مسافر کی سب سے بڑی زاد راہ تقویٰ ہے۔ ایک شخص سامان سفر کے پورے اہتمام کے ساتھ نکلے، دوسرا شخص اعتماد علی اللہ کا سرمایہ لے کر نکلے تو دوران سفر دونوں کی نفسیات یکساں نہیں ہو سکتیں۔

"اے عقل والو میرا تقویٰ اختیار کرو" سے معلوم ہوا کہ تقویٰ ایک ایسی چیز ہے جس کا تعلق عقل سے ہے۔ تقویٰ کسی ظاہری ہیئت کا نام نہیں، یہ عقل یا شعور کی ایک حالت ہے۔ انسان جب شعور کی سطح پر اپنے رب کو پالیتا ہے تو اس کا ذہن اس کے بعد خدا کے جلال و جمال سے بھر جاتا ہے۔ اس وقت روح کی لطیف سطح پر جو کیفیات پیدا ہوتی ہیں انھیں کا نام تقویٰ ہے۔

اس میں کوئی گناہ نہیں کہ تم اپنے رب کا فضل بھی تلاش کرو۔ پھر جب تم لوگ عرفات سے واپس ہو تو اللہ کو یاد کرو مشعر حرام کے نزدیک۔ اور اس کو یاد کرو جس طرح اللہ نے بتایا ہے۔ اس سے پہلے یقیناً تم راہ بھٹکے ہوئے لوگوں میں تھے۔ پھر طواف کو چلو جہاں سے سب لوگ چلیں اور اللہ سے معافی مانگو۔ یقیناً اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔ پھر جب تم اپنے حج کے اعمال پورے کر لو تو اللہ کو یاد کرو جس طرح تم پہلے اپنے باپ دادا کو یاد کرتے تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ پس کوئی آدمی کہتا ہے: اے ہمارے رب ہم کو اسی دنیا میں دے دے اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں۔ اور کوئی آدمی ہے جو کہتا ہے کہ اے ہمارے رب ہم کو دنیا میں بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور ہم کو آگ کے عذاب سے بچا۔ اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔ اور اللہ کو یاد کرو مقرر دنوں میں۔ پھر جو شخص جلدی کر کے دو دن میں مکہ واپس آجائے اس پر کوئی گناہ نہیں اور جو شخص ٹھہر جائے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ یہ اس کے لئے ہے جو اللہ سے ڈرے۔ اور تم اللہ سے ڈرتے رہو اور خوب جان لو کہ تم اسی کے پاس اکٹھا کئے جاؤ گے

۱۹۸ ـ ۲۰۳

اصل چیز اللہ کا تقویٰ ہے۔ کسی کے اندر یہ مطلوب حالت موجود ہو تو اس کے بعد حج کے دوران معاشی ضرورت کے تحت اس کا کچھ کاروبار کر لینا یا بعض مراسم حج کی ادائگی میں کسی کا آگے یا کسی کا پیچھے ہو جانا کوئی حرج پیدا نہیں کرتا۔ حج کے دوران جو فضا جاری رہنا چاہئے وہ ہے اللہ کا خوف، اللہ کی یاد، اللہ کی نعمتوں کا شکر، اللہ کے لئے حوالگی کا جذبہ۔ حج کے دوران کوئی ایسا فعل نہیں ہونا چاہئے جو ان کیفیات کے خلاف ہو۔ مثلاً کسی شخص یا گروہ کے لئے عبادت کی ادائگی میں امتیاز، آباؤ اجداد کے کارنامے بیان کرنا جو گویا بالواسطہ طور پر اپنے کو نمایاں کرنے کی ایک صورت ہے۔ یہ چیزیں ایک ایسی عبادت کے ساتھ بے جوڑ ہیں جو یہ بتاتی ہو کہ تمام انسان یکساں ہیں، جس میں اس بات کا اعلان کیا جاتا ہو کہ تمام بڑائی صرف اللہ کے لئے ہے۔ حج کے زمانہ میں بھی اگر آدمی ان چیزوں کی تربیت حاصل نہ کرے تو زندگی کے بقیہ لمحات میں وہ کس طرح ان پر قائم ہو سکے گا۔

دعائیں، خاص طور پر حج کی دعائیں، آدمی کی اندرونی حالت کا اظہار ہیں۔ کوئی شخص آخرت کی عظمتوں کو اپنے دل میں لئے ہوئے جی رہا ہو تو حج کے مقامات پر اس کے دل سے آخرت والی دعائیں ابلیں گی۔ اس کے برعکس جو شخص دنیا کی چیزوں میں اپنا دل لگائے ہوئے ہو، وہ حج کے مواقع پر اپنے خدا سے سب سے زیادہ جو چیز مانگے گا وہ وہی ہوگی جس کی تڑپ لئے ہوئے وہ وہاں پہنچا تھا۔ اور سب سے بہتر دعا تو یہ ہے کہ آدمی اپنے رب سے کہے کہ خدایا دنیا میں تیرے نزدیک جو چیز بہتر ہو وہ مجھ کو دنیا میں دیدے اور آخرت میں تیرے نزدیک جو چیز بہتر ہو وہ مجھ کو آخرت میں دے دے اور اپنے عذاب سے مجھ کو بچالے۔

"تم اسی کے پاس اکٹھا کئے جاؤ گے" یہ حج کا سب سے بڑا سبق ہے جو عرفات کے میدان میں دنیا بھر کے لاکھوں انسانوں کو یک وقت جمع کر کے دیا جاتا ہے۔ عرفات کا اجتماع قیامت کے اجتماع کی ایک تمثیل ہے۔

اور لوگوں میں سے کوئی ہے کہ اس کی بات دنیا کی زندگی میں تم کو خوش لگتی ہے اور وہ اپنے دل کی بات پر اللہ کو گواہ بناتا ہے۔ حالاں کہ وہ سخت جھگڑالو ہے۔ اور جب وہ پیٹھ پھیرتا ہے تو وہ اس کوشش میں رہتا ہے کہ زمین میں فساد پھیلائے اور کھیتیوں اور جانوں کو ہلاک کرے۔ حالاں کہ اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈر تو وقار اس کو گناہ پر جما دیتا ہے۔ پس ایسے شخص کے لئے جہنم کافی ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ اور لوگوں میں کوئی ہے کہ اللہ کی خوشی کی تلاش میں اپنی جان کو بیچ دیتا ہے اور اللہ اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے ۲۰۴ - ۲۰۷

جو شخص مصلحت کو اپنا دین بنائے اس کی باتیں ہمیشہ لوگوں کو بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ کیوں کہ وہ لوگوں کی پسند کو دیکھ کر اس کے مطابق بولتا ہے نہ کہ یہ دیکھ کر کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا۔ اس کے سامنے کوئی مستقل معیار نہیں ہوتا اس لئے وہ مخاطب کی رعایت سے ہر وہ انداز اختیار کر لیتا ہے جو مخاطب پر اثر ڈالنے والا ہو۔ حق کا وفادار نہ ہونے کی وجہ سے اس کے لئے یہ مشکل نہیں رہتا کہ دل میں کوئی حقیقی جذبہ نہ ہوتے ہوئے بھی وہ زبان سے خوبصورت باتیں کرے۔

ایسا کیوں ہوتا ہے کہ بات کے اسٹیج پر وہ مصلح کے روپ میں نظر آتا ہے اور عمل کے میدان میں اس کی سرگرمیاں فساد کا باعث بن جاتی ہیں۔ اس کی وجہ اس کا تضاد ہے۔ عملی نتائج ہمیشہ عمل سے پیدا ہوتے ہیں نہ کہ الفاظ سے۔ وہ اگرچہ زبان سے حق پرستی کے الفاظ بولتا ہے۔ مگر عمل کے اعتبار سے وہ جس سطح پر ہوتا ہے وہ صرف ذاتی مفاد ہے۔ یہ چیز اس کے قول و عمل میں فرق پیدا کر دیتی ہے۔ بات کے مقام سے ہٹ کر جب وہ عمل کے مقام پر آتا ہے تو اس کے مفاد کا تقاضا کھینچ کر اس کو ایسی سرگرمیوں کی طرف لے جاتا ہے جو صرف تخریب پیدا کرنے والی ہیں۔ یہاں وہ اپنے ذاتی فائدے کی خاطر دوسروں کا استحصال کرتا ہے۔ وہ عوامی مقبولیت حاصل کرنے کے لئے لوگوں کو جذباتی باتوں کی شراب پلاتا ہے۔ وہ اپنی قیادت قائم کرنے کی خاطر پوری قوم کو داؤ پر لگا دیتا ہے۔ وہ تعمیر کے بجائے تخریب کی سیاست چلاتا ہے کیوں کہ اس طرح زیادہ آسانی سے عوام کی بھیڑ اپنے گرد اکٹھا کی جا سکتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے دنیا کے مفاد اور مصلحت کے ساتھ اپنی زندگی کا سودا کیا۔ حق واضح ہو جانے کے بعد بھی وہ اس کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے کیوں کہ اس میں ان کو اپنے وقار کا بت ٹوٹتا ہوا نظر آتا ہے۔ ظاہری طور پر نرم باتوں کے پیچھے ان کی متکبرانہ نفسیات ان کو ایک ایسے داعیٔ حق کے سامنے جھکنے سے روک دیتی ہے جس کو وہ اپنے سے چھوٹا سمجھتے ہیں۔

دوسرے لوگ وہ ہیں جو اللہ کی رضا کے ساتھ اپنی زندگی کا سودا کرتے ہیں۔ ایسا شخص اپنے عادات و خیالات سے دست بردار ہو کر خدا کی باتوں کو قبول کرتا ہے۔ وہ اپنے مال کو خدا کے حوالے کر کے اس کے بدلے بے مال بن جانے کو گوارا کر لیتا ہے۔ وہ رواجی دین کو رد کر کے خدا کے بے آمیز دین کو لیتا ہے، خواہ اس کی وجہ سے اس کو غیر مقبولیت پر راضی ہونا پڑے۔ وہ مصلحت پرستی کے بجائے اعلانِ حق کو اپنا شیوہ بناتا ہے، اگرچہ اس کے نتیجہ میں وہ لوگوں کے عتاب کا شکار ہوتا رہے۔

اے ایمان والو اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں پر مت چلو، وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ اگر تم پھسل جاؤ بعد اس کے کہ تمہارے پاس واضح دلیلیں آچکی ہیں تو جان لو کہ اللہ زبردست ہے اور حکمت والا ہے۔ کیا لوگ اس انتظار میں ہیں کہ اللہ بادل کے سائبانوں میں آئے اور فرشتے بھی آجائیں اور معاملہ کا فیصلہ کر دیا جائے اور سارے معاملات اللہ ہی کی طرف پھیرے جاتے ہیں۔ بنی اسرائیل سے پوچھو، ہم نے ان کو کتنی کھلی کھلی نشانیاں دیں۔ اور جو شخص اللہ کی نعمت کو بدل ڈالے جب کہ وہ اس کے پاس آچکی ہو تو اللہ یقیناً سخت سزا دینے والا ہے۔ خوش نما کر دی گئی ہے دنیا کی زندگی ان لوگوں کی نظر میں جو منکر ہیں اور وہ ایمان والوں پر ہنستے ہیں۔ حالاں کہ جو پرہیزگار ہیں وہ قیامت کے دن ان کے مقابلہ میں اونچے ہوں گے۔ اور اللہ جس کو چاہتا ہے بے حساب روزی دے دیتا ہے ۲۰۸ - ۱۲

اسلام کو اختیار کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ تحفظات اور مصلحتوں کا لحاظ کئے بغیر اس کو اپنایا جائے۔ اسلام جس چیز کو کرنے کو کہے اس کو کیا جائے اور جس چیز کو چھوڑنے کو کہے اس کو چھوڑ دیا جائے۔ یہ کسی آدمی کا پورے کا پورا اسلام میں داخل ہونا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی اسلام کو اسی حد تک اختیار کرے جس حد تک اسلام اس کی زندگی سے ٹکراتا نہ ہو۔ وہ اس اسلام کو لے لے جو اس کے لئے مفید یا کم از کم بے ضرر ہو اور اس اسلام کو چھوڑے رہے جو اس کے محبوب عقائد، اس کی پسندیدہ عادات، اس کے دنیوی فائدے، اس کے شخصی وقار، اس کی قائدانہ مصلحتوں کو مجروح کرتا ہو۔ آدمی ابتداءً پوری طرح ارادہ کر کے اسلام کو اختیار کرتا ہے۔ مگر جب وہ وقت آتا ہے کہ وہ اپنے فکری ڈھانچہ کو توڑے یا اپنے مفاد کو نظر انداز کر کے اسلام کا ساتھ دے تو وہ پھسل جاتا ہے۔ وہ ایسے اسلام پر ٹھہر جاتا ہے جس میں اس کے مفادات بھی مجروح نہ ہوں اور اسلام کا تمغہ بھی ہاتھ سے جانے نہ پائے۔

اسلام کے پیغام کی صداقت پر یقین کرنے کے لئے اگر وہ دلائل چاہتے ہیں تو دلائل پوری طرح دئے جا چکے ہیں۔ اگر وہ چاہتے ہیں کہ ان کو معجزات دکھائے جائیں تو جو شخص کھلے کھلے دلائل کو نہ مانے اس کو چپ کرنے کے لئے معجزات بھی ناکافی ثابت ہوں گے۔ اس کے بعد آخری چیز جو باقی رہتی ہے وہ یہ کہ خدا اپنے فرشتوں کے ساتھ سامنے آجائے۔ مگر جب ایسا ہوگا تو وہ کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔ کیوں کہ وہ فیصلہ کا وقت ہوگا نہ کہ عمل کرنے کا۔ انسان کا امتحان یہی ہے کہ وہ دیکھے بغیر محض دلائل کی بنیاد پر مان لے۔ اگر اس نے دیکھ کر مانا تو اس ماننے کی کوئی قیمت نہیں۔

وہ لوگ جو مصلحتوں کو نظر انداز کر کے اسلام کو اپنائیں اور وہ لوگ جو مصلحتوں کی رعایت کرتے ہوئے مسلمان بنیں، دونوں کے حالات یکساں نہیں ہوتے۔ پہلا گروہ اکثر دنیوی اہمیت کی چیزوں سے خالی ہو جاتا ہے جب کہ دوسرے گروہ کے پاس ہر قسم کی دنیوی رونقیں جمع ہو جاتی ہیں۔ یہ چیز دوسرے گروہ کو غلط فہمی میں ڈال دیتی ہے۔ وہ اپنے کو برتر خیال کرتا ہے اور پہلے گروہ کو حقیر سمجھنے لگتا ہے۔ مگر یہ صورت حال انتہائی عارضی ہے۔ موجودہ دنیا کو توڑ کر جب نیا بہتر نظام بنے گا تو وہاں آج کے بڑے پست کر دئے جائیں گے اور وہی لوگ بڑائی کے مقام پر نظر آئیں گے جن کو آج چھوٹا سمجھ لیا گیا تھا۔

لوگ ایک امت تھے۔ انھوں نے اختلاف کیا تو اللہ نے پیغمبروں کو بھیجا خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے۔ اور ان کے ساتھ اتاری کتاب حق کے ساتھ تاکہ وہ فیصلہ کردے ان باتوں کا جن میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں۔ اور یہ اختلافات انھیں لوگوں نے کئے جن کو حق دیا گیا تھا، بعد اس کے کہ ان کے پاس کھلی کھلی ہدایات آچکی تھیں، آپس کی ضد کی وجہ سے۔ پس اللہ نے اپنی توفیق سے حق کے معاملہ میں ایمان والوں کو راہ دکھائی جس میں وہ جھگڑ رہے تھے اور اللہ جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ دکھا دیتا ہے۔ کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تم پر وہ حالات گزرے ہی نہیں جو تمھارے اگلوں پر گزرے تھے۔ ان کو سختی اور تکلیف پہنچی اور وہ ہلا مارے گئے۔ یہاں تک کہ رسول اور ان کے ساتھ ایمان لانے والے پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔ یاد رکھو، اللہ کی مدد قریب ہے　۲۱۳-۱۴

دین میں اختلاف تعبیر و تشریح کے اختلاف سے شروع ہوتا ہے۔ ہر ایک اپنے ذہنی سانچہ کے مطابق خدا کے دین کا ایک تصور قائم کر لیتا ہے۔ ایک ہی کتاب ہدایت کو مانتے ہوئے بھی لوگوں کی رائیں الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ اس وقت اللہ اپنے چنے ہوئے بندے کے ذریعہ امر حق کا اعلان کراتا ہے۔ یہ آواز اگرچہ انسان کی زبان میں ہوتی ہے اور بظاہر عام آدمیوں جیسے ایک آدمی کے ذریعہ بلند کی جاتی ہے، تاہم جو سچے متلاشی حق ہیں وہ اس کے اندر شامل خدائی گونج کو پہچان لیتے ہیں اور اپنے اختلاف کو بھول کر فوراً اس کی آواز پر لبیک کہتے ہیں۔ دوسری طرف وہ طبقہ ہے جو اپنے خود ساختہ دین کے ساتھ اپنے کو اتنا زیادہ وابستہ کر چکا ہوتا ہے کہ اس کے اندر یہ جذبہ ابھر آتا ہے کہ میں دوسرے کی بات کیوں مانوں۔ اس کے اندر ضد کی نفسیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اسی چیز کا انکار کر دیتا ہے جس کا وہ اپنے خیال کے مطابق علم بردار بنا ہوا تھا۔

حق جب روشن دلائل کے ساتھ آجائے اور اس کے باوجود آدمی اس کا ساتھ نہ دے تو اس کی وجہ ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ آدمی کو نظر آتا ہے کہ اس کا ساتھ دینے میں اس کی خوش گمانیوں کا محل ڈھ جائے گا۔ اس کے مفادات کا نظام ٹوٹ جائے گا۔ اس کی آسودہ زندگی خطرہ میں پڑ جائے گی۔ اس کا وقار باقی نہیں رہے گا۔ مگر یہی وہ چیز ہے جو اللہ کو اپنے وفادار بندوں سے مطلوب ہے۔ جس راستہ کی دشواریوں سے گھبرا کر آدمی اس پر آنا نہیں چاہتا وہی وہ راستہ ہے جو جنت کی طرف لے جانے والا ہے۔ جنت کی واحد قیمت آدمی کا اپنا وجود ہے۔ آدمی اپنے وجود کو فکر و عمل کے جن نقشوں کے حوالے کئے ہوئے ہے وہاں سے اکھاڑ کر جب وہ اس کو خدا کے نقشہ میں لانا چاہتا ہے تو اس کی پوری شخصیت ہل جاتی ہے۔ اس میں اس وقت اور زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے جب کہ اس کے ساتھ وہ خدا کے دین کا داعی بن کر کھڑا ہو جائے۔ داعی بننا بالفاظ دیگر دوسروں کے اوپر ناصح اور ناقد بننا ہے اور اپنے خلاف نصیحت اور تنقید کو سننا ہر زمانہ میں انسان کے لئے مبغوض ترین امر رہا ہے۔ اس کے نتیجہ میں مدعو کی طرف سے اتنا شدید ردعمل سامنے آتا ہے جو داعی کے لئے ایک بھونچال سے کم نہیں ہوتا۔

لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں۔ کہہ دو کہ جو مال تم خرچ کرو تو اس میں حق ہے تمہارے ماں باپ کا اور رشتہ داروں کا اور یتیموں کا اور محتاجوں کا اور مسافروں کا۔ اور جو بھلائی تم کروگے وہ اللہ کو معلوم ہے۔ تم پر لڑائی کا حکم ہوا ہے اور وہ تم کو گراں معلوم ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناگوار سمجھو اور وہ تمہارے لئے بھلی ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے لئے بری ہو۔ اور اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے ۱۶-۲۱۵

انسان یہ سمجھتا ہے کہ اس کے جان اور مال کے استعمال کا بہترین مصرف اس کے بیوی بچے ہیں، وہ اپنے اثاثہ کو اپنے ذاتی حوصلوں اور تمناؤں میں لٹا کر خوش ہوتا ہے۔ اس کے برعکس شریعت یہ کہتی ہے کہ اپنے جان اور مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ یہ دونوں مدیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ ایک خود اپنے اوپر خرچ کرنا ہے اور دوسرا غیروں کے اوپر۔ ایک اپنی طاقت کو دنیا کی ظاہری چیزوں کے حصول پر لگاتا ہے اور دوسرا آخرت کی نظر نہ آنے والی چیزوں پر۔ مگر انسان کو جو چیز ناپسند ہے وہی اللہ کی نظر میں بھلائی ہے۔ کیوں کہ وہ اس کی اگلی وسیع تر زندگی میں اس کو نفع دینے والی ہے۔ اور انسان کو جو چیز پسند ہے وہ اللہ کی نظر میں برائی ہے۔ کیوں کہ اس کا جو کچھ فائدہ ہے اسی عارضی دنیا میں ہے، آخرت میں اس سے کسی کو کچھ ملنے والا نہیں۔

یہی اصول زندگی کے تمام معاملات کے لئے صحیح ہے —— آدمی آزاد اور بے قید زندگی کو پسند کرتا ہے، حالاں کہ اس کی بھلائی اس میں ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کی رسی میں باندھ کر رکھے۔ آدمی اپنی تعریف کرنے والے کو دوست بناتا ہے، حالاں کہ اس کے لئے زیادہ بہتر یہ ہے کہ وہ اس شخص کو اپنا دوست بنائے جو اس کی غلطیوں کو اسے بتاتا ہو۔ آدمی ایک حق کو ماننے سے انکار کرتا ہے اور خوش ہوتا ہے کہ اس طرح اس نے لوگوں کی نظر میں اپنے وقار کو بچا لیا۔ حالاں کہ اس کے لئے زیادہ بہتر یہ تھا کہ وہ اپنی عزت کو خطرہ میں ڈال کر کھلے دل سے حق کا اعتراف کرے۔ آدمی محنت اور قربانی والے دین سے بے رغبت رہتا ہے اور اس دین کو لے لیتا ہے جس میں معمولی باتوں پر جنت کی خوش خبری مل رہی ہو۔ حالاں کہ اس کے لئے زیادہ بہتر تھا کہ وہ محنت اور قربانی والے دین کو اختیار کرتا۔ آدمی "زندگی" کے مسائل کو اہمیت دیتا ہے، حالاں کہ زیادہ بڑی عقل مندی یہ ہے کہ آدمی "موت" کے مسائل کو اہمیت دے۔

"اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ان سطحی جذبات و محرکات سے بلند ہے جن سے بلند نہ ہونے کی وجہ سے انسان کی رائے متاثر رائے بن جاتی ہے، وہ صحیح رخ کو چھوڑ کر غلط رخ کی طرف مڑ جاتا ہے۔ اللہ کا فیصلہ ہر قسم کی غیر متعلق چیزوں کی ملاوٹ سے پاک ہے۔ وہ بے آمیز فیصلہ ہے۔ اس لئے اس کے برحق ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ انسان کے فیصلے طرح طرح کی نفسیاتی پیچیدگیوں سے مغلوب رہتے ہیں۔ وہ پست محرکات کے زیر اثر رائیں قائم کرتا ہے۔ اس لئے انسان کی رائے اکثر اوقات نہ مبنی برحق ہوتی ہے اور نہ مطابق واقعہ۔ خدا جو کہے اسی کو تم حق سمجھو اور اس کے مقابلہ میں اپنے خیال کو چھوڑ دو۔

لوگ تم سے حرمت والے مہینہ کی بابت پوچھتے ہیں کہ اس میں لڑنا کیسا ہے۔ کہہ دو کہ اس میں لڑنا بہت برا ہے۔ مگر اللہ کے راستہ سے روکنا اور اس کا انکار کرنا اور مسجد حرام سے روکنا اور اس کے لوگوں کو اس سے نکالنا، اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ برا ہے۔ اور فتنہ قتل سے بھی زیادہ بڑی برائی ہے۔ اور یہ لوگ تم سے برابر لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ تم کو تمہارے دین سے پھیر دیں اگر قابو پائیں۔ اور تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھرے گا اور کفر کی حالت میں مرجائے تو ایسے لوگوں کے عمل ضائع ہو گئے دنیا میں اور آخرت میں۔ اور وہ آگ میں پڑنے والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، وہ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے ۱۸ — ۲۱۷

رجب ۲ھ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ مسلمانوں کے ایک دستہ اور مشرکین قریش کی ایک جماعت کے درمیان ٹکراؤ ہو گیا۔ یہ واقعہ مکہ اور طائف کے درمیان نخلہ میں پیش آیا۔ قریش کا ایک آدمی مسلمانوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ مسلمانوں کا خیال تھا کہ یہ جمادی الثانی کی ۳۰ تاریخ ہے۔ مگر چاند ۲۹ کا ہو گیا تھا اور وہ رجب کی پہلی تاریخ تھی۔ رجب کا مہینہ ماہ حرام میں شمار ہوتا ہے اور صدیوں کے رواج سے اس معاملہ میں عربوں کے جذبات بہت شدید تھے۔ اس طرح مخالفین کو موقع مل گیا کہ وہ مسلمانوں کو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بدنام کریں کہ یہ لوگ حق پرستی سے اتنا دور ہیں کہ حرام مہینوں کی حرمت کا بھی خیال نہیں کرتے۔ جواب میں کہا گیا کہ ماہ حرام میں لڑنا یقیناً گناہ ہے۔ مگر مسلمانوں سے یہ فعل تو بھول سے اور اتفاقاً ہو گیا اور تم لوگوں کا حال یہ ہے کہ جان بوجھ کر اور مستقل طور پر تم اس سے کہیں زیادہ بڑے جرم کر رہے ہو۔ تمہارے درمیان اللہ کی پکار بلند ہوئی ہے مگر تم اس کو ماننے سے انکار کر رہے ہو اور دوسروں کو بھی اس کو اختیار کرنے سے روکتے ہو۔ تمہارے ضد اور عناد کا یہ حال ہے کہ اللہ کے بندوں کے اوپر اللہ کے گھر کا دروازہ بند کرتے ہو، ان کو ان کے اپنے گھروں سے نکلنے پر مجبور کرتے ہو۔ حتیٰ کہ جو لوگ اللہ کے دین کی طرف بڑھتے ہیں ان کو طرح طرح سے ستاتے ہو تاکہ وہ اس کو چھوڑ دیں۔ حالاں کہ کسی کو اللہ کے راستہ سے ہٹانا اس کو قتل کر دینے سے بھی زیادہ برا ہے ——— اللہ کے نزدیک یہ بہت بڑا جرم ہے کہ آدمی خود بڑی بڑی برائیوں میں مبتلا ہو اور دوسرے کی ایک معمولی خطا کو پا جائے تو اس کو شہرت دے کر اس کو بدنام کرے۔

مخالفتوں کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ اہل ایمان کو اپنے گھروں کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ دین پر قائم رہنے کے لئے ان کو جہاد کی حد تک جانا پڑتا ہے۔ مگر موجودہ دنیا میں ایسا ہونا ضروری ہے۔ یہ ایک دو طرفہ عمل ہے جو خدا پرستوں اور خدا دشمنوں کو ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے۔ اس طرح ایک طرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو اللہ کے نہیں بلکہ اپنی ذات کے پجاری ہیں۔ جو اپنے ذاتی مفاد کے لئے اللہ سے بے خوف ہو کر اللہ کے بندوں کو ستاتے ہیں۔ دوسری طرف اسی واقعہ کے درمیان ایمان اور ہجرت اور جہاد کی نیکیاں ظہور میں آتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جنھوں نے حالات کی شدت کے باوجود اللہ پر اپنے بھروسہ کو باقی رکھا اور کس نے اس کو کھو دیا۔

کچھ تفسیر کے بارے میں

حضرت مسیح ایک انسان تھے، وہ اللہ نہ تھے۔ اس بات کو منطقی انداز میں ثابت کرنا ہو تو اہل منطق قضیے قائم کریں گے۔ مثلاً وہ کہیں گے:

پہلا قضیہ: خدا مادہ یا جسم نہیں۔ جو جسم نہ رکھتا ہو وہ کھانا نہیں کھاتا، اس لئے خدا کھانا نہیں کھاتا۔

دوسرا قضیہ: خدا کھانا نہیں کھاتا۔ مسیحؑ کھانا کھاتے تھے۔ اس لئے مسیح خدا نہیں تھے۔

یہ منطقی انداز میں بات کو ثابت کرنے کی ایک مثال ہے، مگر اسی بات کو قرآن میں ان لفظوں میں کہا گیا ہے:

مسیح ابن مریم صرف ایک رسول ہیں ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں اور ان کی ماں ایک صدیقہ تھیں دونوں کھانا کھاتے تھے (مائدہ ۷۵)

قرآن اگرچہ اعلیٰ ترین علمی کتاب ہے مگر اس میں کسی بات کو ثابت کرنے کے لئے معروف علمی وفنی انداز نہیں اختیار کیا جاتا۔ قرآن کا طریقہ یہ ہے کہ فنی آداب اور علمی تفصیلات کو چھوڑ کر اصل بات کو مؤثر اسلوب میں بیان کیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کا مقصد تذکیر ونصیحت ہے اور تذکیر ونصیحت کے لئے ہمیشہ سادہ اسلوب کارآمد ہوتا ہے نہ کہ فنی اسلوب۔

تاہم یہ ایک طالب علمانہ ضرورت ہے کہ قرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک آدمی قرآن کے بیانات کی علمی تفصیلات اور اس کے فنی پہلوؤں کو جاننا چاہے۔ ایسی حالت میں یہ سوال ہے کہ قرآن کی تفسیر کے لئے کیا انداز اختیار کیا جائے۔ اگر قرآن کے اپنے سادہ اسلوب میں تفسیر کی جاتی ہے تو اس کا یہ فائدہ ہوگا کہ تفسیر میں نصیحت و تذکیر کی فضا باقی رہے گی۔ مگر علمی تقاضوں کی رعایت نہ ہو سکے گی۔ دوسری طرف اگر علمی پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے تفسیر لکھی جائے تو خاص طبائع کو وہ پسند آسکتی ہے مگر یہ صرف قرآن کے اصل مقصد — تذکیر و موعظت — کو مجروح کرنے کی قیمت پر ہوگا۔

اس مسئلہ کا ایک حل یہ ہے کہ قرآن کے ساتھ جو تفسیر شائع کی جائے وہ خود تو نصیحت اور تذکیر کے انداز میں ہو۔ اس کے بعد ایک مستقل کتاب قرآنی انسائیکلوپیڈیا یا قاموس القرآن کے طور پر شائع کی جائے۔ اس دوسری کتاب میں وہ تمام علمی، تاریخی اور فنی بحثیں ہوں۔ مثلاً حضرت ابراہیم سے متعلق آیات کے ذیل میں اصل تفسیر میں آپ کی زندگی کے انھیں پہلوؤں کی وضاحت ہو جن کی طرف قرآن میں اشارے کئے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ آپ کے بارے میں جو تاریخی اور اثریاتی تحقیقات ہیں ان کو قرآنی انسائیکلوپیڈیا میں لفظ "ابراہیم" کے ذیل میں جمع کیا جائے۔ اسی طرح فقہی، کلامی اور لسانی مسائل کی تفصیلات بھی انسائیکلوپیڈیا میں درج ہوں نہ کہ قرآن کی تفسیر میں۔

ہم نے اسی نہج پر قرآن کی خدمت کا ارادہ کیا ہے۔ اولاً تذکیر القرآن کے نام سے تفسیر مرتب کی جا رہی ہے۔ اس کے بعد ان شاء اللہ قرآنی انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب کا کام کیا جائے گا۔ اللہ اس مقصد کو تکمیل تک پہنچائے۔ آمین

اپنے خلاف تنقید کو پسند کرنا

ابن المبارک نے موسیٰ بن ابو عیسیٰ سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بنی حارثہ کے پانی (مشربہ) پر آئے۔ وہاں انھوں نے محمد بن مسلمہ کو پایا۔ آپ نے پوچھا: اے محمد! تم میری بابت کیسا خیال کرتے ہو۔ انھوں نے کہا: "آپ کو خدا کی قسم میں ویسا ہی خیال کرتا ہوں جیسا کہ مجھے پسند ہے اور جیسا کہ وہ آدمی پسند کرے گا جو آپ کے لئے بھلائی کو پسند کرتا ہو۔ میں دیکھتا ہوں آپ مال کے جمع کرنے میں قوی ہیں۔ خود اس سے پرہیز کرتے ہیں۔ اس کی تقسیم میں انصاف کرتے ہیں۔" اس کے بعد محمد بن مسلمہ نے کہا: "اور اگر آپ کجی اختیار کریں گے تو ہم آپ کو اسی طرح سیدھا کر دیں گے جس طرح تیر سوراخ میں ڈال کر سیدھا کیا جاتا ہے۔" خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر فرمایا:

الحمد للہ الذی جعلنی فی قوم اذا املت عدلونی — اللہ کا شکر ہے جس نے مجھ کو ایسی قوم میں بنایا کہ اگر میں کج روی کروں تو وہ مجھ کو سیدھا کر دیں

(کنز العمال)

نفرت اور محبت سے اوپر اٹھ کر معاملہ کرنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے ہجرت کی تو اس وقت کعبہ کی کلید (کنجی) عثمان بن طلحہ کے پاس تھی جو قدیم زمانہ سے ان کے خاندان میں چلی آرہی تھی۔ ہجرت سے پہلے آپؐ نے ایک بار کعبہ کی کلید عثمان بن طلحہ سے مانگی تو انھوں نے دینے سے انکار کیا اور آپؐ کو سخت سست کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تمام ناگوار باتوں کو برداشت کر لیا اور صرف یہ فرمایا: اے عثمان! شاید تم دیکھوگے کہ یہ کلید ایک روز میرے ہاتھ میں ہوگی اور میرے اختیار میں ہوگا کہ میں جس کو چاہوں اسے دوں۔" عثمان بن طلحہ نے کہا: "وہ دن قریش کی ذلت و ہلاکت کا دن ہوگا جب کعبہ کی کلید تمھارے جیسے آدمی کے ہاتھ میں آجائے۔" فتح مکہ کے بعد جب آپ کو غلبہ حاصل ہوگیا، آپ نے کعبہ کی کلید منگوائی کلید آپ کے ہاتھ میں تھی کہ آپ کے چچا زاد بھائی اور داماد علی بن ابی طالب کھڑے ہوئے اور کہا کہ یہ کلید آپ مجھ کو دے دیں۔ آپؐ نے علی بن ابی طالب کو کوئی جواب نہیں دیا۔ آپؐ نے کہا: عثمان بن طلحہ کہاں ہیں۔ وہ آئے تو آپ نے فرمایا:

ھاک مفتاحک یا عثمان۔ الیوم یوم بر و وفاء — اے عثمان! یہ اپنی کلید لو۔ آج کا دن نیکی کا اور وعدہ پورا کرنے کا دن ہے۔

(زاد المعاد)

جہالت کے مقابلہ میں صبر اور بردباری

زید بن سعنہ رضؓ مدینہ کے ایک یہودی عالم تھے جو بعد کو مسلمان ہو گئے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو میں نے ان کے چہرہ پر نبوت کی تمام علامتیں پالیں۔ تاہم دو علامت باقی رہ گئی تھی۔ یہ کہ ان پر بردباری غالب رہے گی۔ کسی کا جہالت میں زیادتی کرنا آپ کی بردباری کو اور زیادہ بڑھائے گا۔ زید بن سعنہ کہتے ہیں کہ ایک روز میں نے دیکھا کہ آپ نکل رہے ہیں اور آپؐ کے ساتھ علی بن ابی طالبؓ بھی ہیں۔ اتنے میں ایک آدمی اونٹ پر سوار ہو کر آیا۔ وہ بظاہر بدوی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے کہا اے خدا کے رسولؐ، میری جماعت فلاں قریہ میں اسلام لا چکی ہے۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ

اگر تم اسلام لاؤ گے تو تم پر رزق کی وسعت ہو جائے گی۔ اب وہاں قحط پڑ گیا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ لالچ میں اسلام کو چھوڑ نہ دیں جس طرح لالچ میں انھوں نے اس کو اختیار کیا تھا۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو ان کی طرف کچھ بھیج دیجئے تاکہ ان کی اعانت ہو۔ آپؐ نے علی بن ابی طالبؓ کی طرف دیکھا۔ انھوں نے کہا: اے خدا کے رسولؐ اس مال میں سے تو کچھ باقی نہیں رہا۔ زید بن سعنہ کہتے ہیں کہ میں نے قریب جاکر کہا "اے محمدؐ! اگر آپ چاہیں تو کھجوروں کے معاوضہ میں مجھ سے رقم لے لیں۔" آپ نے اتفاق فرمایا اور میں نے ۸۰ مثقال سونا آپ کو ادا کیا جو آپ نے سارا کا سارا اس آدمی کے حوالہ کر دیا۔ آپ نے فرمایا: ان کی مدد کرو اور انصاف کے مطابق ان کے درمیان تقسیم کر دو۔

زید بن سعنہ کہتے ہیں کہ میعاد سے دو تین دن پہلے میں نے پھر آپ کو ایک دیوار کے قریب پالیا۔ آپ کے ساتھ آپ کے بہت سے اصحاب بھی تھے۔ میں آپ کے پاس پہنچا۔ میں نے آپ کا کپڑا پکڑ لیا اور سختی کے ساتھ بولا: اے محمدؐ! میرا حق کیوں نہیں ادا کرتے۔ خدا کی قسم جہاں تک میں جانتا ہوں سارے بنو عبدالمطلب ٹال مٹول کرنے والے ہیں۔" عمر رضی اللہ عنہ اس وقت آپ کے ساتھ تھے۔ یہ سن کر سخت غصہ میں آگئے انھوں نے کہا: اے خدا کے دشمن! تم رسول اللہ ؐ کے لئے وہ کلمات کہہ رہے ہو جو میں سن رہا ہوں۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ اگر آپؐ کا لحاظ نہ ہوتا تو میں اپنی تلوار سے تیرا سر توڑ دیتا۔" تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالکل سکون کے ساتھ مجھے دیکھتے رہے۔ پھر آپؐ نے عمر رضی اللہ عنہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

یاعمر، انا وھو کنا احوج الی غیر ھذا، ان تأمرنی بحسن الاداء وتامرہ بحسن التقاضی۔ اذھب بہ یاعمر، فاعطہ حقہ وزدہ عشرین صاعا من تمر مکان مارعتہ

اے عمر! میں اور زید دونوں کسی اور رویہ کے زیادہ مستحق تھے۔ تم مجھ سے بہتر ادائگی کے لئے کہتے اور زید سے بہتر تقاضے کے لئے۔ اے عمرؓ! ان کو لے جاؤ۔ ان کا حق ادا کردو اور ۲۰ صاع کھجور زیادہ دینا کیوں کہ تم نے ان کو ڈرایا دھمکایا ہے۔ (طبرانی، ابن ماجہ)

غصہ پی جانا ایمان کو بڑھاتا ہے

عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مامن جرعۃ احب الی اللہ من جرعۃ غیظ یکظمھا عبد۔ ماکظم عبدللہ الامـلأ اللہ جوفہ ایمانا (احمد)

اللہ کے نزدیک سب سے بہتر گھونٹ یہ ہے کہ بندہ اپنے غصہ کو پی جائے۔ جب بھی کوئی بندہ اللہ کے لئے غصہ کو پی جاتا ہے تو اللہ اس کے باطن کو ایمان سے بھر دیتا ہے

خوشامد اور تعریف سے کوئی اثر نہ لینا

ابونعیم نے جبیر بن نفیر کے واسطہ سے نقل کیا ہے۔ کچھ لوگوں نے عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے کہا: خدا کی قسم ہم نے کسی کو نہیں دیکھا جو آپ سے زیادہ انصاف کرنے والا ہو، حق بات کہنے والا ہو اور منافقین کے اوپر سخت ہو۔ اے امیرالمومنین! آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے بہتر انسان ہیں۔" عوف بن مالک رضی اللہ عنہ بھی

مجلس میں موجود تھے۔ انھوں نے یہ سن کر کہا: خدا کی قسم تم لوگوں نے جھوٹ کہا۔ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان سے زیادہ بہتر کو دیکھا ہے۔" انھوں نے پوچھا: اے عوف وہ کون ہے۔ عوف بن مالک رضی نے کہا: "ابوبکر" عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "عوف نے سچ کہا اور تم لوگ جھوٹ بولے۔ خدا کی قسم۔ ابوبکر مشک سے زیادہ خوشبودار تھے اور میں اپنے گھر کے اونٹوں سے بھی زیادہ بھٹکا ہوا ہوں (واللہ لقد کان ابوبکر اطیب من ریح المسک و انا اضل من بعیرا ھلی، ابن کثیر)

منھ پر تعریف کرنا ہلاکت ہے

ابن ابی الدنیا نے حضرت حسن رضی سے نقل کیا ہے۔ ایک شخص عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور آپ کی تعریف کرنے لگا آپ نے فرمایا: تھلکنی و تھلک نفسک تو مجھ کو ہلاک کرتا ہے اور خود بھی ہلاک ہوتا ہے (کنز العمال جلد ۲)

تعریف سے غلط فہمی میں نہ پڑنا

ضبہ بن محصن غنوی تابعی کہتے ہیں۔ میں نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے کہا: انت خیر من ابی بکر (آپ ابوبکر رضی سے بہتر ہیں) یہ سن کر وہ رو دیے۔ انھوں نے کہا: خدا کی قسم ابوبکر کی ایک رات اور ان کا ایک دن عمر کی تمام زندگی سے بہتر ہے کیا میں تم کو بتاؤں کہ وہ رات اور دن کون سے ہیں۔ میں نے کہا: ہاں اے امیر المومنین۔ انھوں نے کہا۔ ان کی رات تو وہ ہے جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ والوں سے بھاگ کر رات کو نکلے اور ابوبکر ان کے ساتھ تھے۔ ان کا دن وہ ہے جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی اور عرب مرتد ہو گئے۔ انھوں نے کہا، ہم نماز پڑھیں گے مگر زکوٰۃ نہ دیں گے۔ میں ابوبکر رضی کے پاس آیا اور کہا، اے خلیفہ رسول! ان لوگوں سے نرمی کا برتاؤ کیجیے۔ انھوں نے جواب دیا: تم زمانۂ جاہلیت میں بہادر تھے، اب تم زمانۂ اسلام میں بزدل ہو گئے۔ خدا کی قسم میں اس وقت تک ان سے جہاد کروں گا جب تک میرے ہاتھ میں تلوار پکڑنے کی طاقت ہے اگر انھوں نے ایک رسی دینے سے بھی انکار کیا۔" (کنز العمال جلد ۳)

صاحب حق کی سختی کو برداشت کرنا برکت کا باعث ہے

ابن ماجہ نے ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک اعرابی آیا۔ اس نے آپ سے اپنے قرض کا مطالبہ کیا جو آپ کے ذمہ تھا۔ اس نے تقاضہ کرتے ہوئے کہا: اگر آپ نے ادا نہ کیا تو میں آپ کے ساتھ سختی کروں گا۔ آپ کے اصحاب نے اس اعرابی کو ڈانٹا اور کہا: تجھ پر افسوس ہے۔ کیا تو جانتا نہیں کہ تو کس سے بات کر رہا ہے۔ اس نے کہا: انی اطلب حقی (میں تو اپنا حق مانگ رہا ہوں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ھلا مع صاحب الحق کنتم تم لوگ صاحب حق کے ساتھ کیوں نہ ہوئے۔ پھر آپ نے خولہ بنت قیس کے پاس آدمی بھیج کر کہلایا کہ اگر تمھارے پاس کھجوریں ہوں تو ہم کو ادھار دے دو۔ ہمارے پاس کھجوریں آئیں گی تو ہم ادا کر دیں گے۔ چنانچہ ان سے کھجوریں لے کر اعرابی کو دیں اور اس کو کھانا بھی کھلایا۔ اعرابی نے کہا: آپ نے وفا کی، اللہ بھی آپ کے ساتھ وفا کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ لوگ سب سے بہتر ہیں جو حق کو خندہ

پیشانی سے ادا کرتے ہیں۔ پھر فرمایا:

لا قدس اللہ امۃ لا یاخذ ضعیفھا حقہ من شدیدھا ولا یتعتعہ (الترغیب والترہیب)	اللہ اس امت کو بابرکت نہیں کرتا جس میں اس کا کمزور اس کے قوی سے اپنا حق بلا زحمت نہ لے سکے۔

تعریف سے خود پسندی کے بجائے تواضع پیدا ہونا

ابونعیم نے نافع رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ ایک شخص عبد اللہ بن عمر رض کے سامنے ان کی تعریف کرنے لگا اور کہا: یا خیر الناس، یا ابن خیر الناس (اے لوگوں میں بہتر، اے لوگوں میں بہتر کے بیٹے) ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

ما انا بخیر الناس ولا ابن خیر الناس۔ ولکنی عبد من عباد اللہ ارجو اللہ تعالیٰ واخافہ۔ واللہ لن تزالوا بالرجل حتی تھلکوہ (حلیۃ الاولیاء جلد ۱)	میں لوگوں میں بہتر نہیں ہوں نہ لوگوں میں بہتر کا بیٹا ہوں۔ بلکہ اللہ کے بندوں میں سے ایک بندہ ہوں۔ اللہ سے امید لگائے ہوئے ہوں اور اس سے ڈرتا ہوں۔ خدا کی قسم تم آدمی کی تعریف کر کر کے اس کو ہلاک کر دوگے۔

اس معاشرہ میں کوئی بھلائی نہیں جہاں نصیحت کو برا مانا جائے

ابن عساکر نے عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ انھوں نے کہا: تمہارا آج کا معروف گزرے ہوئے زمانہ کا منکر ہے۔ اور تمہارا آج کا منکر آنے والے زمانہ کا معروف ہوگا۔ بے شک تم لوگ اس وقت تک حق پر رہوگے جب تک تم منکر کو پہچانتے رہوگے اور معروف کا انکار نہ کروگے۔ اور جب تک تمہارا یہ حال رہے گا کہ تمہارا عالم کھڑا ہو کر تم کو نصیحت کرے گا اور اس کو ہلکا نہ سمجھا جائے گا۔ (وما قام عالمکم یتکلم بینکم غیر مستخف، کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۱۴۰)

حکمراں سے ٹکرانے کے بجائے اپنے دائرہ میں کام کرنا

ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا: ابوذر! جب ایسا ہوگا کہ تمہارے امیر عام لوگوں سے زیادہ حصہ لیں گے، اس وقت تم کیا کروگے۔ حضرت ابوذر رض نے جواب دیا: اے خدا کے رسولؐ میں تلوار سے کام لوں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم تلوار سے کام لینے کے بجائے صبر سے کام لینا۔ یہاں تک کہ تم (آخرت میں) میرے پاس آجاؤ" حضرت ابوذر رض اگرچہ حق گوئی سے کبھی نہ رکے مگر انھوں نے حاکم وقت کے خلاف کبھی تلوار نہیں اٹھائی۔ یہاں تک کہ وہ اس دنیا سے چلے گئے۔

نصیحت کی بات کہنے میں کسی کا خوف نہ کرو

تم میں سے کوئی اپنے آپ کو اس امر میں حقیر نہ سمجھے کہ وہ کسی بات کو دیکھے جس کے متعلق اس کا فرض ہو کہ وہ امر حق کو ظاہر کرے، مگر اپنی کمزوری کے خیال سے وہ چپ رہے۔ قیامت میں جب وہ خدا کے سامنے حاضر ہوگا اور وہ اس موقع کو بھول چکا ہوگا، خدا اس سے پوچھے گا: تو نے سچائی کی بات کیوں نہ کہی۔ وہ کہے گا کہ پروردگار لوگوں کے ڈر سے۔ خدا فرمائے گا: کیا خدا تیرے سامنے نہ تھا جس سے تو ڈرتا۔ (ابن ماجہ)

پیغمبر اسلام
(انگریزی سے ترجمہ)

مسلم مورخین کے مطابق، محمدؐ ۲۰ اپریل ۵۷۱ کو عرب کے صحرا میں پیدا ہوئے۔ آپ کے نام کا مطلب ہے "بہت تعریف کیا ہوا"۔ میرے نزدیک وہ تمام فرزندانِ عرب میں سب سے زیادہ عالی دماغ انسان تھے۔ سرِ زمینِ عرب کے اس ناقابلِ عبور صحرا میں جتنے شاعر اور بادشاہ ان سے پہلے یا ان کے بعد ہوئے، ان سب پر وہ بدرجہا زیادہ فوقیت رکھتے تھے۔ محمدؐ کا ظہور ہوا تو عرب ایک صحرا تھا، وہ کچھ بھی نہ تھا۔ خالی صحرائے محمدؐ کی طاقتور روح نے ایک نئی دنیا بنائی۔ نئی زندگی، نیا کلچر، نئی تہذیب اور نئی سلطنت پیدا کی جو مراکش سے انڈیز تک پھیلی ہوئی تھی اور جس نے تین براعظموں (ایشیا، افریقہ، یورپ) کے خیالات اور زندگی کو متاثر کیا۔

میری اس تحریر کا موضوع ایک ایسے مذہب کے اصولوں کی بابت لکھنا ہے جو کہ تاریخی ہے اور اس کا پیغمبر بھی ایک تاریخی شخصیت ہے۔ سرولیم میور جیسا ایک معاند ناقد بھی قرآن کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"دنیا میں غالباً قرآن کے سوا کوئی دوسری کتاب نہیں ہے جس کا متن بارہ سو سال گزرنے کے بعد بھی اس درجہ خالص صورت میں محفوظ ہو۔" میں یہ بھی اضافہ کروں گا کہ حضرت محمدؐ ایک تاریخی شخصیت ہیں۔ آپ کی زندگی کا ہر واقعہ نہایت احتیاط سے منضبط کیا گیا ہے حتیٰ کہ چھوٹی چھوٹی تفصیلات بھی آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ کر دی گئی ہیں۔ آپ کی زندگی اور آپ کا کام پُراسراریت کے پردہ میں چھپا ہوا نہیں ہے۔ یہ ضرورت نہیں ہے کہ ایک شخص صحیح معلومات کے لئے اس مشکل مہم کو سر کرے کہ وہ بھُس کے ڈھیر میں سے چھان کر سچائی کے دانے نکالے۔

میرا کام اس لئے بھی ہلکا ہو چکا ہے کہ وہ زمانہ اب بہت تیزی سے رخصت ہو رہا ہے جب کہ کچھ ناقدین سیاسی اور غیر سیاسی وجوہ سے اسلام کو بہت بگاڑ کر پیش کرتے تھے۔ پروفیسر بیوان "کیمبرج میڈیول ہسٹری" میں لکھتے ہیں "محمدؐ اور اسلام کے بارے میں کتابیں جو یورپ میں ۱۹ویں صدی کے آغاز سے پہلے چھپتی تھیں آج ان کو محض قلمی عجوبے سمجھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اسلام اور تلوار کا نظریہ آج کہیں بھی قابلِ لحاظ نہیں سمجھا جاتا۔ اسلام کا یہ اصول کہ مذہب میں کوئی زبردستی نہیں، آج سب کو پوری طرح معلوم ہے۔ مشہور مورخ گبن نے لکھا ہے "مسلمانوں کی طرف ایک مجرمانہ اصول منسوب کیا جاتا رہا ہے کہ ہر مذہب کو تلوار کے زور سے ختم کر دیا جائے۔" مگر گبن کہتا ہے کہ جہالت اور تعصب کا یہ الزام قرآن سے، مسلم فاتحین کی تاریخ سے نیز مسلم عوام کے رویہ سے غلط ثابت ہوتا ہے جو کہ ہمیشہ قانونی اور سماجی طور پر مسیحی عبادت کے ساتھ رواداری کا طریقہ اختیار کرتے رہے ہیں۔ محمدؐ کی زندگی کی عظیم کامیابی صرف اخلاقی طاقت کے ذریعہ ہوئی، تلوار کی کسی مار کے بغیر۔

— ۲ —

قدیم زمانہ میں عربوں کا یہ حال تھا کہ اتنی معمولی سی بات پر وہ چالیس سال تک لڑتے رہتے کہ ایک قبیلہ کا ایک اونٹ بھٹک کر دوسرے قبیلہ کی چراگاہ میں چلا گیا۔ اس جنگ میں دونوں قبیلوں کے ستر ہزار آدمی مارے گئے

اور خطرہ پیدا ہوگیا کہ دونوں قبیلوں کی نسل ختم ہو جائے گی۔ ایسے جھگڑالو عربوں کو پیغمبر اسلام نے خود انضباطی اور تنظیم کی تعلیم یہاں تک دی کہ میدان جنگ میں بھی ان کو نماز پڑھنے کا حکم دیا۔

صلح کے لئے آپ کا منصوبہ جب بار بار کوشش کے باوجود ناکام ہوگیا تو ایسے حالات پیدا ہوئے جو آپ کو کھینچ کر میدان جنگ میں لے آئے۔ آپ کا یہ اقدام محض دفاع کے لئے تھا۔ تاہم انھوں نے میدان جنگ کے پورے طریق عمل کو بالکل بدل دیا۔ ان کی پوری زندگی میں جو لڑائیاں ہوئیں، ان سب میں مرنے والوں کی مجموعی تعداد، جب کہ پورا جزیرہ نمائے عرب ان کے جھنڈے کے نیچے آگیا، چند سو سے زیادہ نہیں۔ انھوں نے عرب وحشیوں کو نماز پڑھنا سکھایا، محض انفرادی طور پر نہیں، بلکہ اجتماعی طور پر، حتیٰ کہ انھوں نے ہدایت کی کہ جنگ کے طوفان میں بھی اپنے خدا کے آگے سجدہ کرو۔ جب بھی عبادت کا وقت آجائے، اور یہ روزانہ پانچ وقت آتا ہے، تو اجتماعی عبادت چھوڑی نہیں جاسکتی، حتیٰ کہ ملتوی بھی نہیں کی جاسکتی۔ لشکر کا ایک حصہ اگر دشمنوں سے مقابلہ میں مصروف رہے تو اس کا دوسرا حصہ اپنے خدا کے سامنے اپنے سروں کو جھکا دے۔ جب ایک فریق اپنی عبادت ختم کرلے تو وہ مورچہ سنبھال لے اور دوسرا فریق آکر اپنی عبادت کرے۔

وحشت و بربریت کے زمانہ میں میدان جنگ تک پر انسانیت کا اصول جاری کیا گیا۔ سخت ہدایات جاری کی گئیں کہ خیانت نہ کی جائے۔ دھوکا نہ دیا جائے۔ عہد کو توڑا نہ جائے۔ ہاتھ پاؤں نہ کاٹے جائیں۔ عورتوں اور بچوں اور بوڑھوں کو قتل نہ کیا جائے۔ پھل دار درختوں کو نہ کاٹا جائے اور نہ جلایا جائے۔ عبادت گاہوں میں عبادت کرنے والے لوگوں پر زیادتی نہ کی جائے۔ پیغمبر کا خود اپنا طرز عمل اپنے سخت ترین دشمنوں کے ساتھ نمونہ کا طرز عمل تھا۔ مکہ کی فتح کے بعد ان کو پورا اقتدار حاصل ہوگیا تھا، وہ شہر جس نے آپ کا پیغام سننے سے انکار کر دیا تھا۔ جس نے آپ کے اوپر اور آپ کے ساتھیوں کے اوپر شدید ظلم کئے تھے۔ جس نے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ جب آپ اپنا وطن چھوڑ کر دو سو میل دور (مدینہ) چلے گئے، اس وقت بھی انھوں نے آپ کا بائیکاٹ کرنے اور آپ کو تکلیفیں پہنچانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ آج وہ شہر مکہ آپ کے قدموں کے نیچے تھا۔ جنگ کے مسلمہ قوانین کے مطابق وہ ان تمام مظالم کا بدلہ لے سکتے تھے جو آپ پر اور آپ کے لوگوں پر کئے گئے تھے۔ مگر آپ نے ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ محمدؐ کا دل رحم اور محبت کے دودھ سے بھر گیا۔ آپ نے اعلان کیا :

آج تمھارے اوپر کوئی الزام نہیں۔ آج تم سب آزاد ہو۔

یہ ان مقاصد میں سے ایک اہم مقصد تھا کہ کیوں آپ نے دفاع میں جنگ کرنے کی اجازت دی ـــــ اس لئے تاکہ انسانوں کو متحد کیا جاسکے۔ اور جب یہ مقصد حاصل ہوگیا تو آپ کے بدترین دشمن تک معاف کر دیئے گئے۔ وہ لوگ جنھوں نے آپ کے محبوب چچا حمزہؓ کو قتل کیا تھا، ان کے مردہ جسم کا مثلہ کیا تھا وہ بھی آپ کی مہربانیوں سے محروم نہ رہے۔

عالمی اخوت اور انسانی مساوات کا اصول جس کی آپ نے تبلیغ کی وہ انسانیت کی سماجی ترقی میں بہت بڑا درجہ رکھتے ہیں۔ تمام بڑے مذاہب نے اس قسم کے اصولوں کی تبلیغ کی ہے مگر پیغمبر اسلام نے اس نظریہ کو حقیقی عمل کی صورت

دے دی اور اس کی اہمیت شاید کچھ دنوں بعد پوری طرح سمجھی جا سکے جب کہ بین اقوامی شعور جاگے گا، نسلی تعصبات ختم ہو جائیں گے اور انسانی اخوت کا ایک طاقت ور نظریہ وجود میں آجائے گا۔ سروجنی نائیڈو اسلام کے اس پہلو پر بولتی ہوئی کہتی ہیں: "وہ پہلا مذہب تھا جس نے جمہوریت کی تبلیغ کی اور اس کو عمل کی صورت دی۔ کیوں کہ مسجد میں جب اذانیں بلند ہوتی ہیں اور نمازی ایک ساتھ جمع ہوتے ہیں تو اسلام کی جمہوریت روزانہ پانچ بار مجسم ہوتی ہے جب کہ معمولی آدمی اور بادشاہ ایک صف میں شامل ہو کر جھکتے ہیں اور کہتے ہیں: "خدا سب سے بڑا ہے"۔ ہندوستان کی یہ مشہور شاعرہ مزید لکھتی ہے: "میں اسلام کی اس ناقابل تقسیم وحدت کو دیکھ کر بار بار حیران ہوتی ہوں جو کہ آدمی کو طبعی طور پر بھائی بھائی بنا دیتی ہے۔ جب آپ ایک مصری، ایک الجیریائی، ایک ہندستانی یا ترکی سے لندن میں ملتے ہیں تو ان میں جو فرق ملے گا وہ صرف اتنا سا کہ ایک کی پیدائش مصر میں ہوئی اور دوسرے کی ہندستان میں"۔

مہاتما گاندھی اپنے ناقابل تقلید انداز میں لکھتے ہیں "کسی نے کہا ہے کہ جنوبی افریقہ کے لوگ اسلام کے ظہور سے ڈر رہے ہیں —— وہ اسلام جس نے اسپین کو مہذب بنایا، وہ اسلام جو روشنی کی شمع کو مراکش تک لے گیا اور دنیا کو اخوت کا مقدس پیغام دیا۔ جنوبی افریقہ کے یورپی لوگ اسلام کے ظہور سے ڈر رہے ہیں کیوں کہ اسلام آئے گا تو وہ کالوں اور گوروں میں برابری کا اعلان کرے گا۔ ان کو اس سے ڈرنا ہی چاہئے۔ اگر اخوت ایک گناہ ہے۔ اگر مختلف نسلوں میں برابری وہ چیز ہے جس سے وہ ڈرتے ہیں تب ان کا ڈر بالکل بجا ہے۔"

ہر سال حج کے موسم میں دنیا اسلام کے اس حیرت ناک بین اقوامی مظاہرہ کو دیکھتی ہے جو کہ نسل، رنگ اور رتبہ کے تمام فرق کو برابر کر دیتا ہے۔ نہ صرف یورپی، افریقی، ایرانی، ہندستانی، چینی سب کے سب ایک خدائی خاندان کے ممبر کی حیثیت سے مکہ میں ملتے ہیں۔ بلکہ سب کے سب ایک قسم کے لباس پہنے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہر آدمی معمولی سفید بغیر سلے ہوئے کپڑے کے دو ٹکڑے لپیٹے ہوئے ہوتا ہے۔ ایک ٹکڑا کمر کے گرد اور دوسرا ٹکڑا کندھے کے اوپر۔ اسی کے ساتھ ننگے سر، بغیر کسی رسم اور کسی دھوم دھام کے اور یہ آواز لگاتے ہوئے "میں حاضر ہوں، خدایا میں حاضر ہوں، تو ایک ہے، تیرا کوئی شریک نہیں۔ حکم صرف تیرا ہی ہے"۔ اس طرح یہاں ایسی کوئی چیز باقی نہیں رہتی جو چھوٹے اور بڑے کے درمیان فرق کرے اور ہر حاجی یہ احساس لے کر گھر واپس آتا ہے کہ اسلام ایک بین اقوامی اہمیت رکھنے والا دین ہے۔

پروفیسر ہرگرونجی کے الفاظ میں "اقوام کی جمعیت جو پیغمبر اسلام نے بنائی، اس نے بین اقوامی اتحاد اور انسانی اخوت کے اصول کو ایسی عالمی سطح پر قائم کیا ہے جو دوسری قوموں کو روشنی دکھانے والا ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ دنیا کی کوئی بھی دوسری قوم اتحاد اقوام کے لئے اس کے برابر کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔

پیغمبر اسلام نے جمہوری حکومت کو اس کی بہترین صورت میں قائم کیا۔ خلیفہ عمر رض، خلیفہ علی رض، جو پیغمبر کے داماد بھی تھے، خلیفہ منصور عباسی جو خلیفہ مامون کے بیٹے تھے اور دوسرے بہت سے خلفاء اور سلاطین اسلامی عدالتوں میں معمولی آدمی کی طرح حاضر ہوئے۔ آج بھی ہم سب جانتے ہیں کہ کالے نیگروؤں کے ساتھ مہذب سفید نسلوں کا سلوک کیا ہوتا ہے۔ اب بلال رض کی بابت غور کرو جو چودہ سو سال پہلے پیغمبر اسلام کے زمانے میں ایک نیگرو غلام تھے۔ نماز کے

لئے اذان دینے کا کام ابتدائی اسلام کے زمانے میں ایک عزت کا کام سمجھا جاتا تھا اور یہ باعزت کام اس نیگرو غلام کے سپرد کیا گیا تھا۔ مکہ فتح ہونے کے بعد، پیغمبر نے ان کو حکم دیا کہ وہ نماز کے لئے اذان دیں۔ اور یہ نیگرو غلام، اپنے کالے رنگ اور اپنے موٹے ہونٹوں کے ساتھ مقدس کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوا، جو کہ اسلامی دنیا میں سب سے زیادہ تاریخی اور سب سے زیادہ مقدس جگہ ہے۔ اس وقت کچھ مغرور عرب تکلیف کے ساتھ بولے: "اف، یہ کالا حبشی غلام، برا ہو اس کا۔ وہ مقدس کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوا ہے اذان دینے کے لیے۔"

غرور اور تعصب کا یہ مزاج پیغمبر اسلام ختم کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے آپ نے اس کا جواب دیتے ہوئے اپنی ایک تقریر میں کہا: ساری حمد اور شکر اللہ کے لئے ہے جس نے ہم کو جاہلیت کے زمانہ کے فخر اور بڑائی سے نجات بخشی۔ اے لوگو یاد رکھو، تمام انسان صرف دو قسموں میں بٹے ہوئے ہیں، متقی اور اللہ سے ڈرنے والے جو اللہ کے پسندیدہ بندے ہیں۔ دوسرے گنہگار اور سخت دل جو اللہ کے نزدیک حقیر اور بے قیمت ہیں۔ تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم کو خدا نے مٹی سے پیدا کیا تھا۔" یہی بات قرآن میں اس طرح کہی گئی ہے: اے لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنا دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ یقیناً اللہ کے نزدیک تمھارا سب سے باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔ اللہ خوب جاننے والا پوری طرح خبردار ہے (حجرات)

پیغمبر اسلام نے اس طرح اتنی زبردست تبدیلی پیدا کی کہ وہ لوگ جو خالص عرب تھے اور اعلیٰ ترین خاندان سے تعلق رکھتے تھے، انھوں نے اپنی لڑکیاں اس نیگرو غلام کے لئے شادی میں پیش کیں۔ اسلام کے دوسرے خلیفہ جو عمر فاروق کے نام سے مشہور ہیں، جب وہ اس نیگرو غلام کو دیکھتے تو وہ فوراً ان کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو جاتے اور ان الفاظ کے ساتھ ان کا استقبال کرتے: یہ ہمارے معلم آگئے، یہ ہمارے سردار آگئے۔" قرآن اور محمدؐ کے ذریعہ کیسا حیرت ناک انقلاب تھا جو عربوں کے درمیان آیا، وہ عرب جو اس زمانہ میں سب سے زیادہ مغرور قوم کی حیثیت رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ عظیم ترین جرمن شاعر گوئٹے نے قرآن پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا: "یہ کتاب تمام زمانوں میں سب سے زیادہ مؤثر کتاب کی حیثیت سے باقی رہے گی۔" اور یہی وجہ ہے کہ برنارڈ شا کو یہ کہنا پڑا "اگر کوئی مذہب ہے جو انگلینڈ، نہیں بلکہ یورپ پر اگلے.. ۱ سال کے اندر حکومت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو وہ اسلام ہے۔"

اسلام کی یہی جمہوری اسپرٹ ہے جس نے عورت کو مرد کی غلامی سے نکالا ـــــ سر چارلس ایڈورڈ آرچیبالڈ ہملٹن نے کہا ہے: "اسلام بتاتا ہے کہ انسان پیدائشی طور پر بے گناہ ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ مرد اور عورت دونوں ایک ہی جوہر سے پیدا ہوئے ہیں، دونوں کے اندر ایک ہی روح ہے اور دونوں ذہنی، روحانی اور اخلاقی ترقی کی یکساں قابلیت رکھتے ہیں۔" عربوں کے یہاں یہ زبردست روایت چلی آرہی تھی کہ وراثت کا حق دار وہی ہے جو برچھا چلاتا ہے اور تلوار کے قبضہ کو پکڑنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مگر اسلام صنف نازک کا حامی بن کر ظاہر ہوا اور عورتوں کو یہ حق دیا کہ وہ اپنے سرپرستوں کی وراثت میں حصہ دار بن سکتی ہیں۔ اسلام بہت پہلے عورت کو یہ حق دے چکا تھا کہ وہ جائداد کی مالک بن سکتی ہیں۔ اس کے بارہ صدیوں بعد ایسا ہو سکا کہ ۱۸۸۱ میں انگلستان نے، جو کہ جمہوریت کا گہوارہ سمجھا جاتا ہے، اسلام کی اس تعلیم کو

اختیار کیا اور وہاں ایک قانون پاس ہوا جس کا نام تھا شادی شدہ عورتوں کا قانون (دی میرڈ ویمنز ایکٹ) مگر صدیوں پہلے پیغمبر اسلام یہ اعلان کر چکے تھے کہ "عورتیں مرد کا نصف ثانی ہیں۔ عورتوں کا حق ہر حال میں محترم ہے۔" "نگرانی رکھو کہ عورتوں کو وہ حق ملتا ہے جو ان کو دیا گیا ہے۔"

۳

اسلام براہ راست طور پر سیاسی اور اقتصادی نظام سے تعلق نہیں رکھتا۔ مگر بالواسطہ طور پر اور، جہاں تک سیاسی اور اقتصادی معاملات انسان کے طور طریقے اور اخلاقیات کو متاثر کرتا ہے، وہ اقتصادی زندگی کے لئے کچھ نہایت اہم اصول مقرر کرتا ہے۔ پروفیسر میسی نن کے مطابق، اسلام مبالغہ آمیز انتہاؤں کے درمیان توازن کو برقرار رکھتا ہے اور ہمیشہ کردار کی تعمیر پر زور دیتا ہے جو کہ تہذیب کی بنیاد ہے۔ اس کی ضمانت چند بنیادی احکام کے ذریعہ کی گئی ہے ـــــ اس کا وراثت کا قانون، زکوٰۃ کا نظم اور لازمی نظام، اقتصادی میدان میں تمام سماج دشمن طریقوں کو غیر قانونی قرار دینا جیسے اجارہ داری، سود، پیشگی طور پر طے کی ہوئی اور بغیر کمائی ہوئی آمدنیاں، بازار کا سب سامان خرید لینا، ذخیرہ اندوزی، کسی چیز کی مصنوعی قلت پیدا کرنا تاکہ قیمتوں میں اضافہ ہو۔ اسی طرح جوا غیر قانونی ہے۔ اس کے برعکس تعلیم گاہوں، عبادت خانوں، اسپتالوں، کنووں، یتیم خانوں کو امداد دینا بہت بڑی نیکی قرار دیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پہلی بار ایسا ہوا کہ پیغمبر اسلام کی تعلیم کے تحت یتیم خانے قائم ہوئے۔ دنیا اپنے یتیم خانوں کے لئے اسی پیغمبر اسلام کی احسان مند ہے جو خود بھی ایک یتیم تھے۔ کارلائل نے محمدؐ کے بارے میں لکھا ہے: "یہ تمام خوبیاں، انسانیت کی فطری آواز، پارسائی اور مساوات، فطرت کے اس صحرائی فرزند کے دل میں جاگزیں ہونے کی وجہ سے، آشکارا تھیں۔"

ایک مورخ نے کہا ہے کہ کسی عظیم انسان کا امتحان تین باتوں کی روشنی میں لینا چاہئے۔ کیا وہ اپنے معاصرین کی رائے میں حقیقی طور سے اونچے اخلاق کا حامل تھا؟ کیا وہ واقعتہً اتنا عظیم تھا کہ اپنے زمانہ کے معیاروں سے بھی بلند ہو گیا ہو؟ کیا اس نے اپنے بعد آنے والی دنیا کے لئے کوئی مستقل میراث چھوڑی؟ اس فہرست کو مزید بڑھایا جا سکتا ہے لیکن یہ بات اپنی جگہ واضح ہے کہ پیغمبر محمدؐ عظمت کے اس معیار پر اعلیٰ ترین درجہ میں پورے اترتے ہیں۔ آخری دو باتوں کے بارے میں پہلے ہی اشارہ کیا جا چکا ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ کیا پیغمبر اسلام کو ان کے معاصرین نے حقیقتہً اونچے اخلاق کا حامل پایا۔ تاریخی دستاویز بتاتی ہیں کہ محمد کے تمام معاصرین، دوست ہوں یا دشمن، سبھی نے ان کی پاک خوبیوں، بے داغ امانت داری، عظیم اچھائیوں، زندگی کے تمام شعبوں میں کامل اخلاص اور امانت کو تسلیم کیا ہے۔ یہاں تک کہ یہودی، اور وہ لوگ بھی جو کہ آپ کے پیغام کو نہ مانتے تھے، وہ بھی اپنے ذاتی اختلافات کے سلسلے میں آپ کی انتہائی غیر جانب داری کی وجہ سے آپ کو ثالث مانتے تھے۔ یہاں تک کہ جو آپ کے پیغام کو تسلیم نہیں کرتے تھے وہ بھی یہ کہنے پر مجبور تھے: "اے محمدؐ ہم تم کو جھوٹا نہیں کہتے، بلکہ جس نے آپ کو کتاب اور پیغام دیا ہے اس کا انکار کرتے ہیں۔" ان کا خیال تھا کہ آپؐ

یہ کسی چیز کا سایہ ہے۔ انھوں نے آپ کے علاج کے لئے تشدد کو بھی اپنایا۔ لیکن ان میں جو عمدہ ترین لوگ تھے انھوں نے دیکھا کہ ایک نیا نور آپ پر نازل ہوا ہے اور انھوں نے اس نور کو پانے کے لئے پیش قدمی کی۔ پیغمبر اسلام کی تاریخ کا قابل ذکر واقعہ ہے کہ آپ کے قابل ترین رشتہ دار، چچازاد بھائی، آپ کو قریب سے جاننے والے عزیز دوست، سب پر آپ کے پیغام کا گہرا اثر ہوا اور سب آپ کے خدائی الہام کی صداقت سے متاثر ہوئے۔ اگر یہ شریف ذی عقل، صاحب علم اور آپ کی ذاتی زندگی کو قریب سے جاننے والے مرد اور عورت آپ کے اندر ذرہ برابر بھی حیلہ سازی، دھوکہ، دنیا داری یا ایمان کی کمی پاتے تو اخلاقی زندگی، روحانی بیداری اور اجتماعی اصلاح کے بارے میں محمدؐ کا منصوبہ ناکام ہو گیا ہوتا اور ساری عمارت چند لمحوں میں ٹوٹ کر زمین پر آرہتی۔ اس کے برعکس ہم پاتے ہیں کہ آپ کے ماننے والے آپ پر اتنا زیادہ فدا تھے کہ خود اختیاری طور پر انھوں نے آپ کو اپنی زندگی کا قائد مان لیا تھا۔ انھوں نے آپ کی خاطر ظلم اور بھوک کا مقابلہ کیا۔ شدید ترین تشدد اور قبیلہ سے اخراج کی وجہ سے انتہائی ذہنی کرب کے باوجود آپ کے لئے ان لوگوں کا ایمان، بھروسہ، اطاعت اور تعظیم برقرار رہی۔ اگر انھوں نے اپنے لیڈر میں ذرا سی بھی خامی دیکھی ہوتی تو کیا ایسا ہو سکتا تھا۔

اسلام کے ابتدائی مومنین کی تاریخ پڑھئے تو بے گناہ مردوں اور عورتوں پر ہونے والے ظلم سے ہر دل پگھل اٹھے گا۔ معصوم عورت سمیہ کو نیزے مار مار کر ٹکڑے کر دیا گیا۔ خباب بن ارت کو جلتے ہوئے کوئلے پر لیٹنے پر مجبور کیا گیا۔ اور وہ بھی اس حال میں کہ بے رحم ظالم اپنا پیر ان کے سینے پر رکھے ہوئے تھا، تاکہ وہ حرکت نہ کر سکیں جس کی وجہ سے ان کی جلد کے اندر کی چربی پگھل گئی۔ خباب بن عدی کو ظالمانہ طور سے جسم کے ایک حصہ کو کاٹ کر اور ان کا زندہ گوشت تراش کر ہلاک کیا گیا اور جب اس ظلم کے درمیان ان سے پوچھا گیا کہ کیا وہ یہ تمنا نہیں کرتے کہ خود محمدؐ ان کی جگہ ہوتے جو کہ اس وقت اپنے گھر میں اپنے خاندان کے ساتھ تھے۔ اس حالت میں بھی مظلوم نے چیخ کر کہا کہ اگر محمدؐ کو کانٹا بھی چبھے تو وہ خود کو اور اپنے پورے خاندان کو قربان کر دیں گے تاکہ آپ کو کانٹے کی تکلیف نہ ہو۔ اس قسم کے درجنوں دل سوز واقعات بیان کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن یہ واقعات کیا ظاہر کرتے ہیں؟ ایسا کیوں ہوا کہ اسلام کے ان مرد عورت جاں نثاروں نے نہ صرف اپنا ایمان محمدؐ کے حوالے کر دیا، بلکہ انھوں نے اپنے جسموں، دلوں اور روحوں کو بھی آپ پر نچھاور کر دیا۔ کیا محمدؐ کے قریب ترین معتقدین کا یہ مضبوط ایمان و یقین اس بات کی اعلیٰ ترین گواہی نہیں ہے کہ آپ اپنے پیغام کے بارے میں مخلص تھے اور اپنے کام میں انتہائی حد تک خود کو کھپائے ہوئے تھے۔

اور یہ لوگ معمولی حیثیت یا کمتر ذہنی سطح کے لوگ نہیں تھے۔ بالکل ابتدائی دور سے ہی، آپ کے گرد کہ کا کمن جمع ہو گیا تھا۔ یہ شریف ترین لوگ تھے جو کہ منصب، جاہ، ثروت اور ثقافت کے مالک تھے۔ ان میں آپ کے قریبی رشتہ دار بھی تھے جو کہ آپ کی زندگی کے داخلی اور خارجی پہلوؤں سے خوب واقف تھے۔ اور آپ کے بعد اسلام کے پہلے چار خلیفہ بھی اسی ابتدائی زمانہ کے مومنین میں سے تھے جنھوں نے عظیم ذمہ داریاں اٹھائیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا کا کہنا ہے کہ "محمدؐ تمام نبیوں اور دینی شخصیات میں سب سے زیادہ کامیاب رہے" (کے۔ ایس۔ راما کرشنا راؤ)

جب الفاظ کے ذخیرے ختم ہو جائیں گے

فرشتے جن کی جان اس حالت میں لیتے ہیں کہ وہ اپنے حق میں برا کر رہے ہیں، وہ اطاعت ظاہر کریں گے کہ ہم تو کچھ برائی نہ کرتے تھے۔ کیوں نہیں، اللہ خوب جانتا ہے جو تم کرتے تھے۔ اب جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ ہمیشہ کے لئے۔ کیسا برا ٹھکانا ہے غرور کرنے والوں کا۔ اور جو لوگ پرہیزگار ہیں ان سے کہا جاتا ہے کہ تمہارے رب نے کیا اتارا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نیک بات۔ جنھوں نے بھلائی کی ان کے لئے اس دنیا میں بھلائی ہے اور آخرت کا گھر اور زیادہ بہتر ہے۔ کیا خوب گھر ہے پرہیزگاروں کا۔ باغ ہیں ہمیشہ رہنے کے جن میں وہ جائیں گے۔ ان باغوں کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی۔ ان کے واسطے وہاں ہے جو وہ چاہیں۔ اس طرح اللہ بدلا دیتا ہے پرہیزگاروں کو جن کی روح فرشتے اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ وہ پاکیزہ ہیں۔ فرشتے ان سے کہتے ہیں: تم پر سلامتی ہو، تم داخل ہو جاؤ بہشت میں، بدلہ اس کا جو تم کرتے تھے (نحل ۲۲ — ۲۸)

انسان دیکھنے میں تو سب بظاہر ایک ہی قسم کے دکھائی دیتے ہیں۔ وہی جسم اور ہاتھ پاؤں جو ایک میں ہے وہی دوسرے میں بھی ہے۔ مگر ظاہری جسم کے اندر جو چھپی ہوئی روح ہے وہ دو انسانوں میں اتنی مختلف ہوتی ہے کہ ایک شخص جہنم کا مستحق ہو جاتا ہے اور دوسرا جنت کا۔

ایک وہ انسان ہے جس کے اندر طیب اور متقی روح ہے۔ اس کے کانوں میں حق کی آواز پڑتی ہے تو وہ فوراً اس کو پہچان لیتا ہے۔ یہ آواز اگرچہ انسانی لفظوں میں ہوتی ہے مگر اس میں شامل ربانی گونج کو وہ سن لیتا ہے۔ وہ اس کو اپنے پورے وجود کے ساتھ اپنا لیتا ہے۔ اپنے آپ کو پوری طرح اس کے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔ دوسرا انسان وہ ہے جس کے اندر ظالم اور متکبر روح ہے۔ اس کے سامنے حق کی آواز آتی ہے تو وہ بالکل مختلف ردعمل کا اظہار کرتا ہے، اس کی متکبرانہ نفسیات کسی دوسرے کے آگے جھکنے پر راضی نہیں ہوتی وہ اپنی ظالمانہ زندگی کی اصلاح کرنا نہیں چاہتا اس لئے وہ حق کی آواز کو طرح طرح سے مشتبہ بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

دنیا کی زندگی میں اس بات کا فیصلہ نہیں ہو پاتا کہ دونوں میں سے کون حق پر ہے اور کون ناحق پر۔ حق کا داعی اپنی بات کو لفظوں میں کہتا ہے اور دوسرا شخص نہایت آسانی سے ایسے الفاظ پا لیتا ہے جن کو بول کر وہ حق کے داعی کی حیثیت کو مشتبہ ظاہر کر سکے۔ مگر موت کے آتے ہی اچانک یہ صورت حال ختم ہو جاتی ہے۔ وہ ظالم اور متکبر لوگ جن کے الفاظ کے ذخیرے موت سے پہلے ختم نہ ہوتے تھے، وہ موت کے فرشتوں کو دیکھتے ہی سارے پچھلے الفاظ بھول جاتے ہیں اور فوراً اطاعت کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔ مگر یہ اطاعت ان کے کام نہیں آتی۔ وہ جہنم میں دھکیل دئے جاتے ہیں تاکہ وہاں ہمیشہ جلتے رہیں۔ اس کے برعکس طیب اور متقی انسانوں کے لئے موت کے فرشتوں کا آنا اس بات کی خدائی تصدیق بن جاتا ہے کہ جس چیز کو حق سمجھ کر وہ اس کے لئے اپنے کو ہلکان کر رہے تھے وہ فی الواقع حق تھی۔ اللہ ان کی زندگی کو قبول کر لیتا ہے اور ان کے لئے جنت کے دروازے کھول دئے جاتے ہیں تاکہ وہ اس میں ابدی عیش کریں۔

ایجنسی: ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہوجاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔

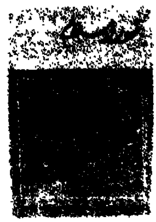
دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ساڑھے سات روپیہ ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ نوے روپے یا ماہانہ ساڑھے سات روپے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

عصری اسلوب میں



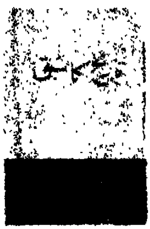
دین کیا ہے

صفحات ۳۲ قیمت ۱/۵۰



ظہورِ اسلام

صفحات ۲۰۰ قیمت ۱۲/-



تاریخ کا سبق

صفحات ۴۸ قیمت ۲/-



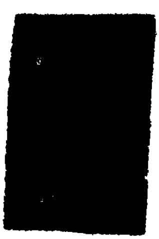
تعمیرِ ملت

صفحات ۴۸ قیمت ۲



عقلیاتِ اسلام

صفحات ۴۸ قیمت ۲/-



الاسلام

صفحات ۱۷۶ قیمت ۱۲/-

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶

عربی مطبوعات

مولانا وحید الدین خاں کی کتابوں کے بعض عربی ترجمے (مطبوعہ قاہرہ) برائے فروخت مکتبہ الرسالہ میں موجود ہیں:

۱- الاسلام یتحدی	(ساتواں ایڈیشن)	۲۶۳ صفحات	قیمت	۲۰	روپے
۲- الدین فی مواجہۃ العلم	(چوتھا ایڈیشن)	۱۱۲ صفحات	〃	۱۰	روپے
۳- حکمۃ الدین	(دوسرا ایڈیشن)	۸۷ صفحات	〃	۸	روپے
۴- الاسلام والعصر الحدیث	(دوسرا ایڈیشن)	۷۷ صفحات	〃	۸	روپے
۵- مسئولیات الدعوۃ	(تیسرا ایڈیشن)	۳۹ صفحات	〃	۲	روپے
۶- نحو تدوین جدید للعلوم الاسلامیۃ		۲۶ صفحات	〃	۲	روپے
۷- إمکانات جدیدۃ للدعوۃ		۳۴ صفحات	〃	۲	روپے
۸- الشریعۃ الاسلامیۃ وتحدیات العصر		۳۲ صفحات	〃	۲	روپے
۹- المسلمون بین الماضی والحال والمستقبل		۷۲ صفحات	〃	۵	روپے
۱۰- نحو بعث إسلامی		۳۲ صفحات	〃	۵۰	پیسے

REGD. R N. NO. 28822/76
REGD D (D.) NO. 532

December 1979
Issue No. 37

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING. QASIMJAN STREET. DELHI 110006 INDIA PHONE 262331